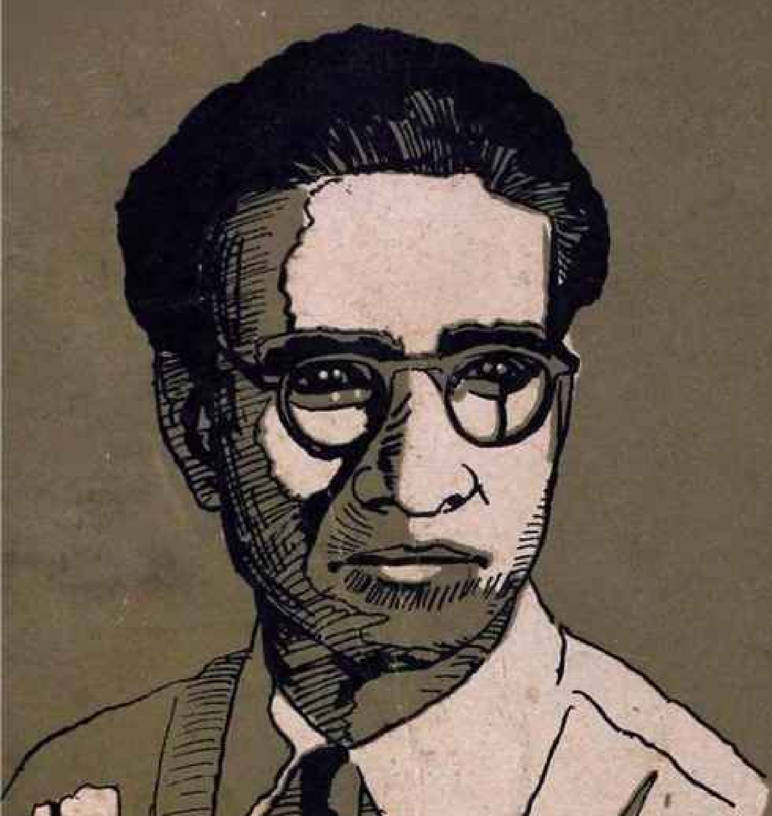

نقوش

شوکت نمبر

رجسٹرڈ ایل نمبر
۵۳۱۲

ٹیلیفون نمبر
۳۵۲۵
۶۴۸۹۸

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

شوکت نمبر

۹۹
ستمبر ۱۹۶۳ء

مدیر
محمد طفیل

سالانہ چندہ بیس روپے
غیر ممالک سے پچیس روپے

فی پرچہ
سات روپے

ادارۂ فروغِ اردو ۔ لاہور

ترتیب

طلوع محمد طفیل - ۶
قطعۂ تاریخ حفیظ ہوشیار پوری ، ۵
میری سرگزشت شوکت تھانوی ، ۷

(۱)

ہمعصروں کی نظریں

ڈاکٹر اقبال ، ۹ فرحت اللہ بیگ ، ۱۰
خواجہ حسن نظامی ، ۱۳ مرزا عظیم بیگ چغتائی ، ۱۷
رشید احمد صدیقی ، ۲۲ نیاز فتحپوری ، ۲۸
جعفر علی خاں اثر ، ۳۳ مولانا عبدالماجد دریا بادی ، ۳۸
سید وقار عظیم ، ۴۰ احمد جمال پاشا ، ۵۸۰

(۲)

منتخب مضامین

۱ — اپنے مضامین اپنی نظریں ، ۴۹
۲ — سودیشی ریل ، ۵۳
۳ — شاہین بچے ، ۶۰
۴ — تعزیت ، ۶۷
۵ — لکھنؤ کا نگرس سیشن ، ۷۱
۶ — پرابلم ، ۷۶
۷ — کچھ یادیں کچھ باتیں ، ۸۲
۸ — شیش محل (چند اسکیچ) ، ۹۱
۹ — بارِ خاطر (چند خطوط) ، ۹۶
۱۰ — قاضی جی ، ۱۰۷
۱۱ — منشی جی ، ۱۱۲
۱۲ — پہاڑ تلے ، ۱۱۹

(۳)

غیر مطبوعہ مضامین اور ڈرامے

۱ — رعنا ، ۱۴۵

۲ — دُردانہ ، ۱۵۱
۳ — جگر مراد آبادی ، ۱۶۵
۴ — ڈاکٹر صاحب ، ۱۶۹
۵ — دہی ، ۱۸۰
۶ — مرقع ، ۱۸۷
۷ — آم اور جامن ، ۱۹۵
۸ — نقش و نگار ، ۲۰۳
۹ — دوزخ ، ۲۱۳
۱۰ — ہم اور وہ ، ۲۲۲
۱۱ — قائدِ اعظم میموریل فنڈ ، ۲۲۸
۱۲ — گداگری ، ۲۳۴
۱۳ — نقوش کے نقاش ، ۲۴۸
۱۴ — خواہ مخواہ ، ۲۴۵
۱۵ — لاحول ولا قوۃ ، ۲۶۳
۱۶ — خالہ حیمنہ ، ۲۷۳

(۴)

بہ حیثیت مدیر

۱ — سرپنچ کی ایک جھلک ، ۲۷۵
۲ — طوفان (روزنامہ) ۲۸۷

(۵)

منظومات

۱ — ۲۵ غیر مطبوعہ غزلیں ، ۳۰۲

مزاحیہ نظمیں

۲ — شاعر کی بیوی ، ۳۲۷
۳ — مری ، ۳۲۹
۴ — آٹھا ، کراچی کی بسیں ، ۳۳۲
۵ — الوداع ، ۳۳۴

مرثیہ

۶ — شہادتِ عظمیٰ

(۶)

شخصیت

(الف) ۱ — بڑا سانحہ — چودھری خلیق الزمان ، ۳۳۹
۲ — شوکت تھانوی مرحوم — عبدالماجد دریابادی ، ۳۴۰

۳ — ایک مہذب ظرافت نگار — قرۃ العین حیدر، ۳۴۲
۴ — میرا رفیق — قدرت اللہ شہاب، ۳۴۷
۵ — باغ و بہار شخصیت — حفیظ جالندھری، ۳۴۸
۶ — شوکت تھانوی کی یاد میں — فیض احمد فیض، ۳۵۲
۷ — گوہرِ مخزنِ ظرافت — کنہیا لال کپور، ۳۵۳
۸ — صاحبِ طرز ادیب — سیّد ہاشم رضا، ۳۵۷
۹ — شوکت تھانوی، — شاہد احمد دہلوی، ۳۵۸
۱۰ — عجیب و غریب ادبی شخصیت — محمد شعیب، ۳۶۸
۱۱ — جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں — حجاب امتیاز علی، ۳۶۹
۱۲ — آہ شوکت — محمد عبدالرؤف عباسی، ۳۷۴
۱۳ — مسکراہٹوں کا سفیر — ماہر القادری، ۲۷۹
۱۴ — آہ شوکت تھانوی — ابن سلونوی، ۳۸۵
۱۵ — شوکت اور نسیم — نسیم انہونوی، ۳۹۰
۱۶ — شوکت تھانوی سودیشی ریل کے بعد — حکیم یوسف حسن، ۴۰۰

(ب) ۱۷ — بیگمات نے کہا (انٹرویو) — محمد طفیل، ۴۱۱
۱۸ — میرا بھیّا — خاتون ارشد، ۴۲۷
۱۹ — شوکت سلمہٗ — ارشد تھانوی، ۴۳۴
۲۰ — ابّا — رشید عمر، ۴۵۵
۲۱ — پیارے ابّا شوکت تھانوی — شوکیہ تھانوی، ۴۶۰
۲۲ — پیارے ابّا — خورشید (عمر) شوکت، ۴۶۳
۲۳ — جو نہ مرتا کوئی دن اور — عادل رشید، ۴۷۳
۲۴ — شوکت بھائی! — اقبال صفی پوری، ۴۸۸

(ج) ۲۵ — شوکت تھانوی — امتیاز علی تاج، ۵۰۳
۲۶ — شوکت تھانوی کے آخری ایام — فضل احمد کریم فضلی، ۵۱۱
۲۷ — چند یادیں — عشرت رحمانی، ۵۱۵
۲۸ — مرحوم — نادم سیتاپوری، ۵۲۷
۲۹ — مردِ خوش گفتار — نسیم ممتاز، ۵۳۶
۳۰ — میرے تاثرات — ڈاکٹر میمونہ انصاری، ۵۵۶
۳۱ — میں اور شوکت بھائی — بیگم خورشید (حفیظ جالندھری)، ۵۶۱
۳۲ — شوکت تھانوی جب قاضی جی ہوتے — اختر جہاں، ۵۶۶

(۷)

خطوط

بنام سعیدہ خاتون، زہرا شوکت، ۵۷۰

آرٹسٹ: اسلم کمال

محمد طفیل پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر دفتر نقوش ایبٹ روڈ لاہور سے شائع کیا

شوکت تھانوی

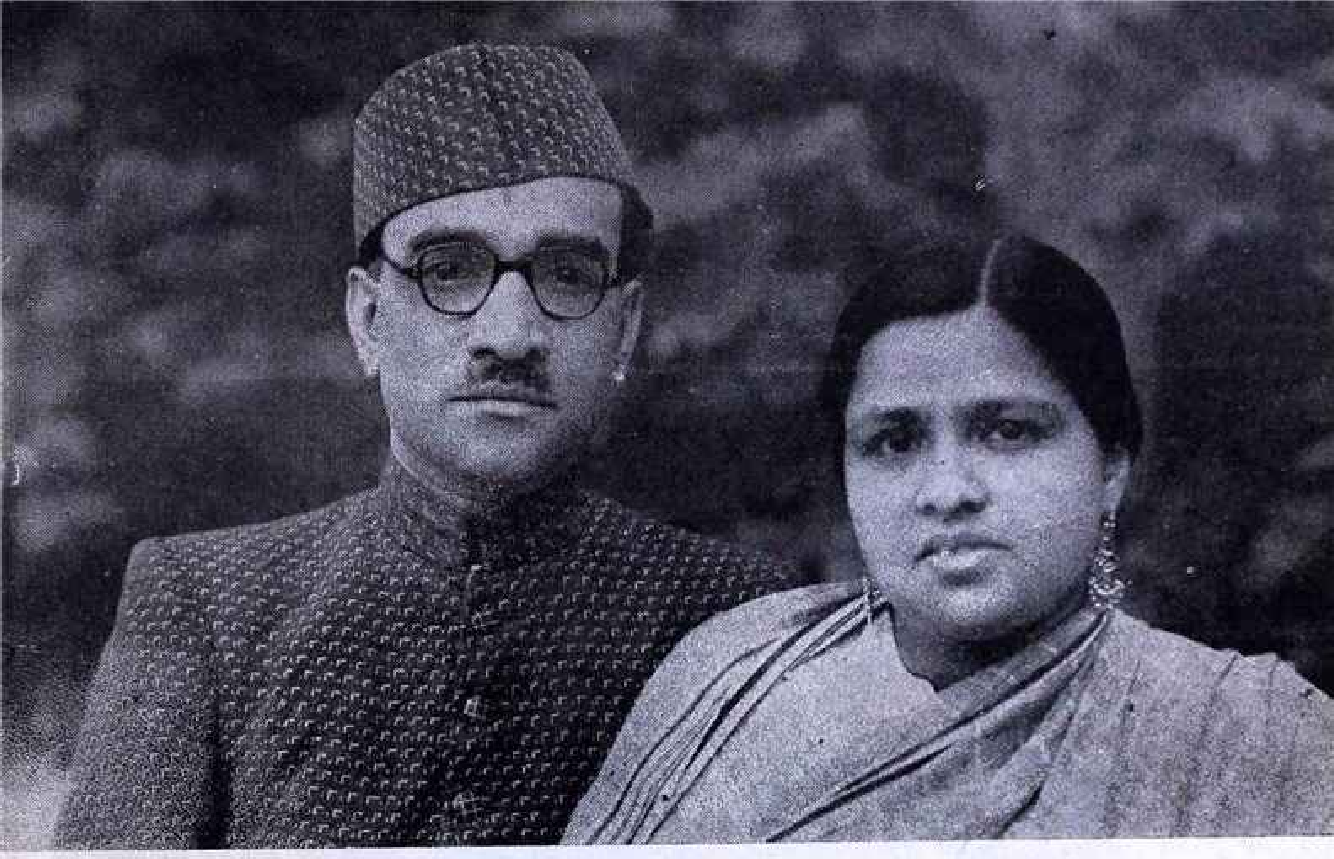

شوکت اپنی بیگمات کے ساتھ

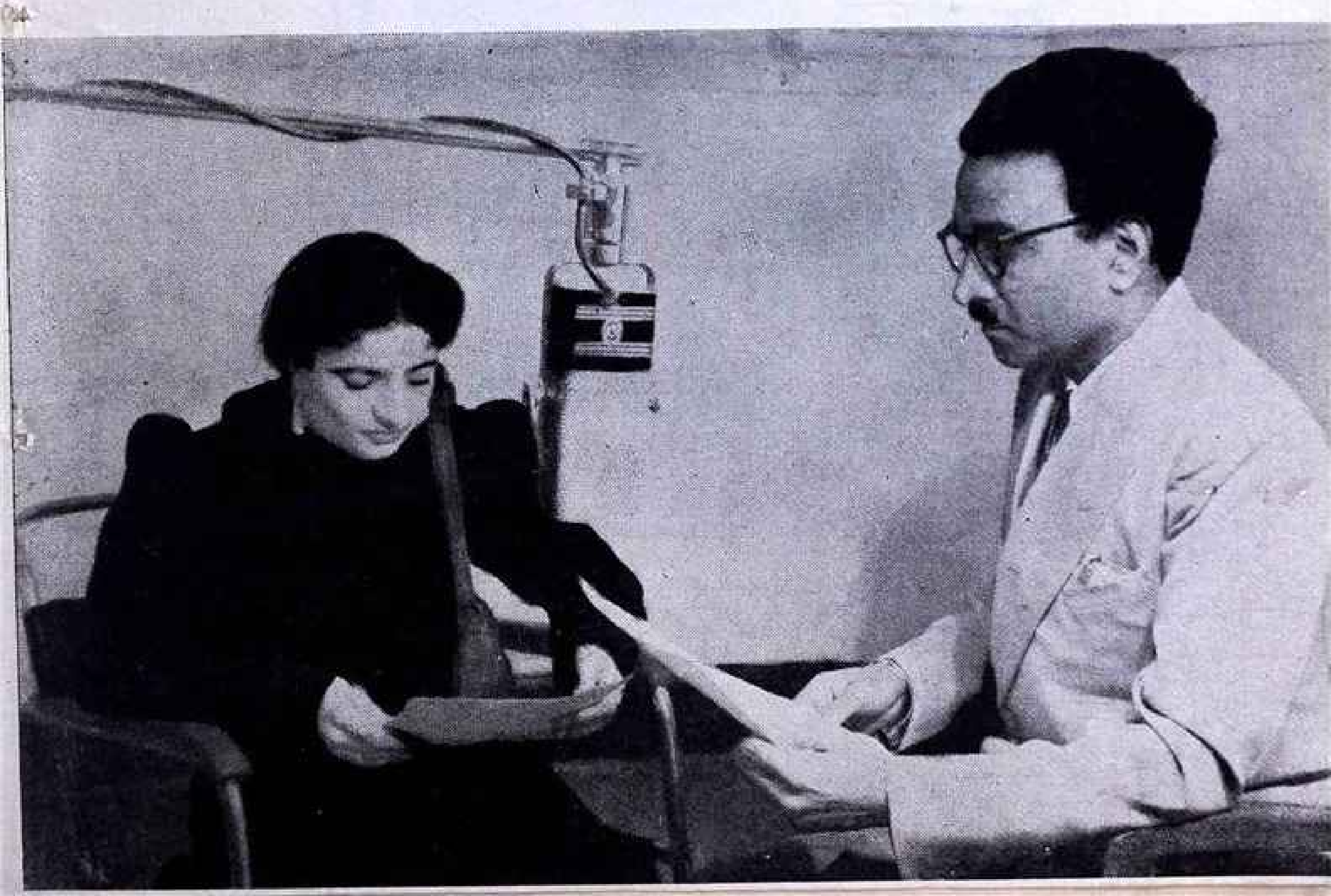

سعید عمر

شوکیه شوکت

خورشید عمر

فوزیه شوکت

مرحوم ادبی مجالس میں

مرحوم تفریحی موڈ میں

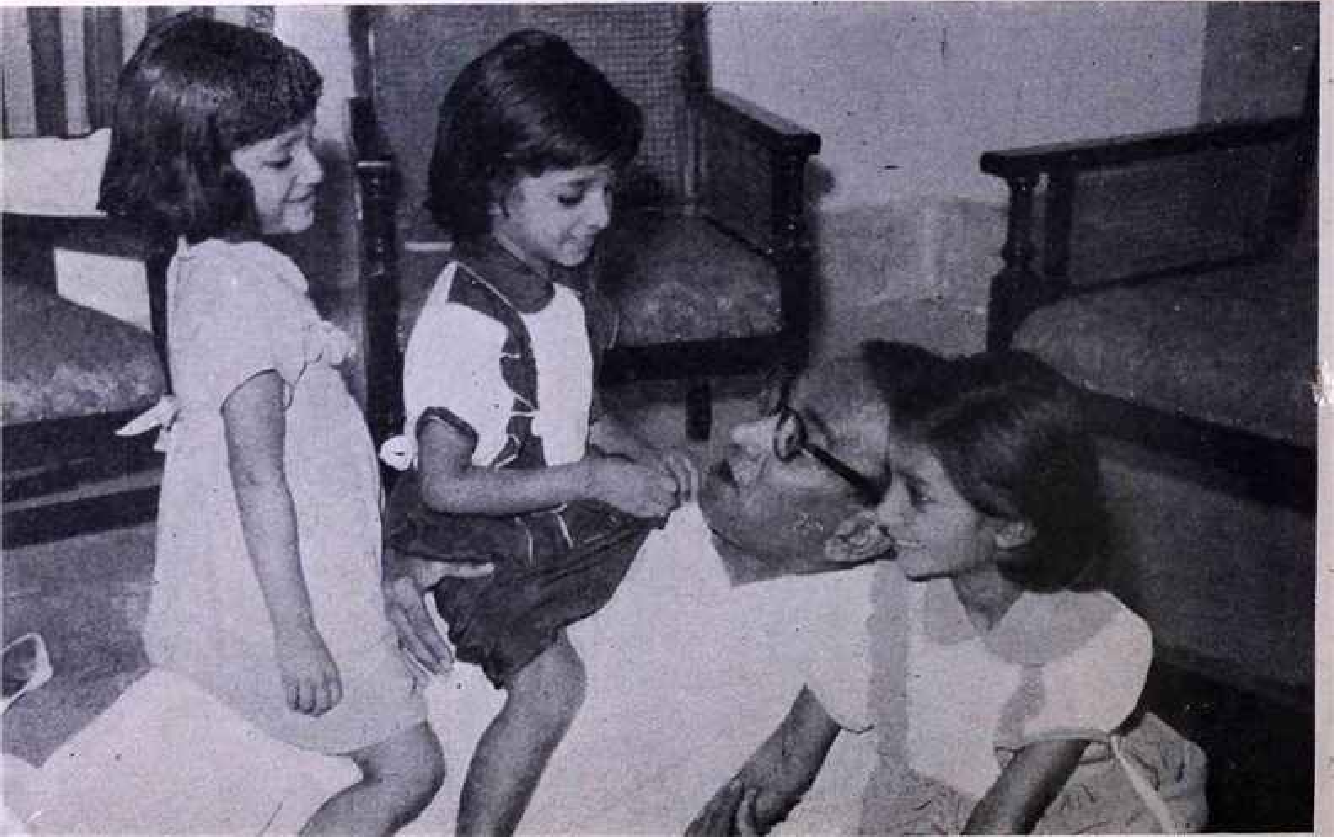

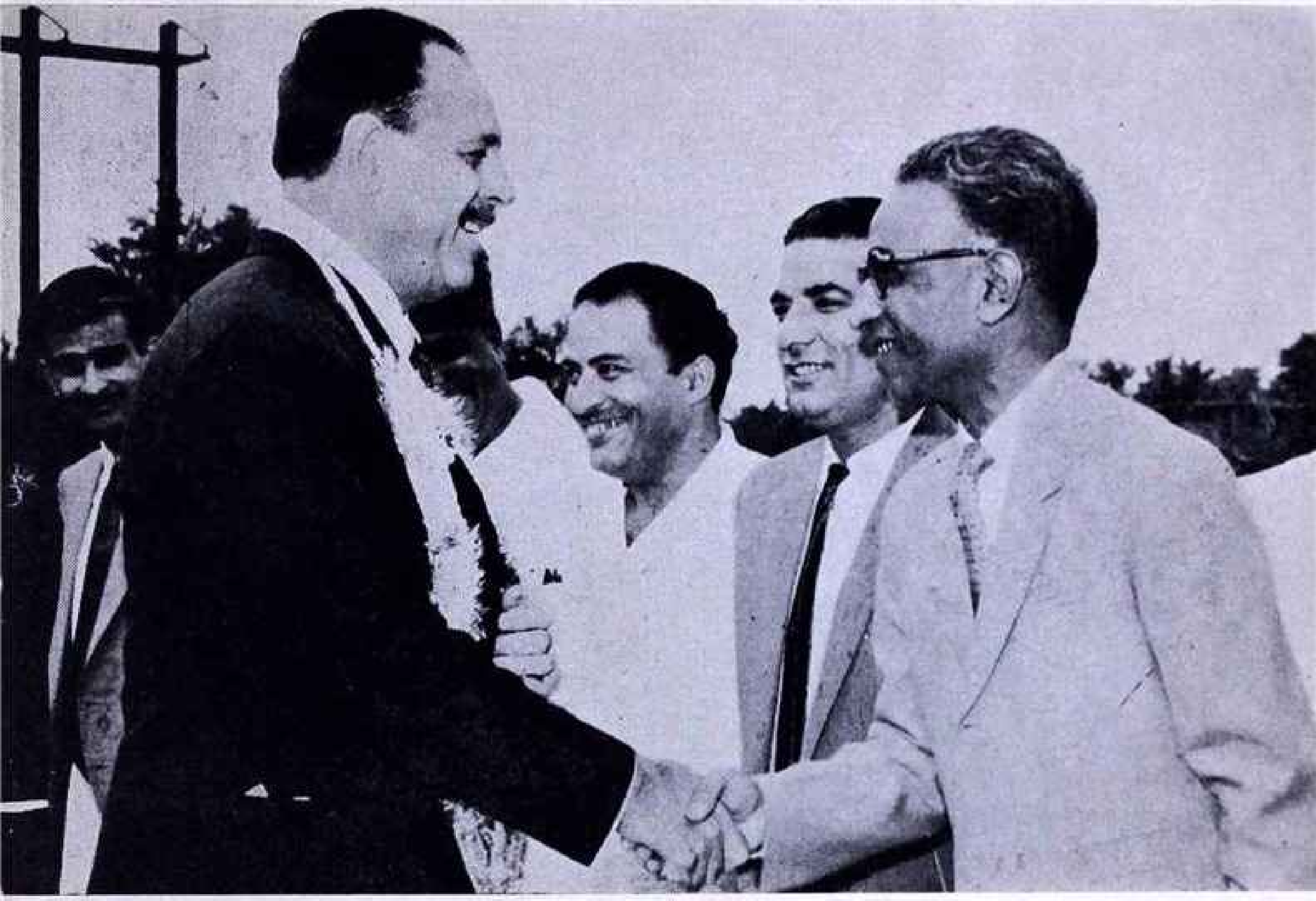

مرحوم صدر اور گورنر کے ساتھ

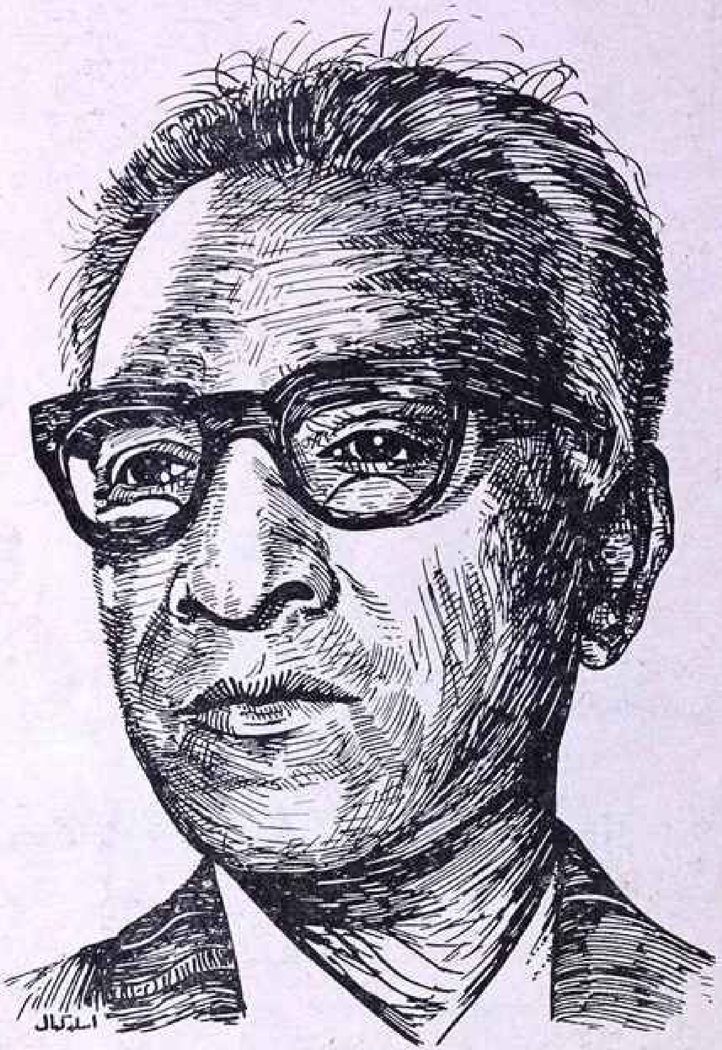
اسلم کمال

عکس تحریر

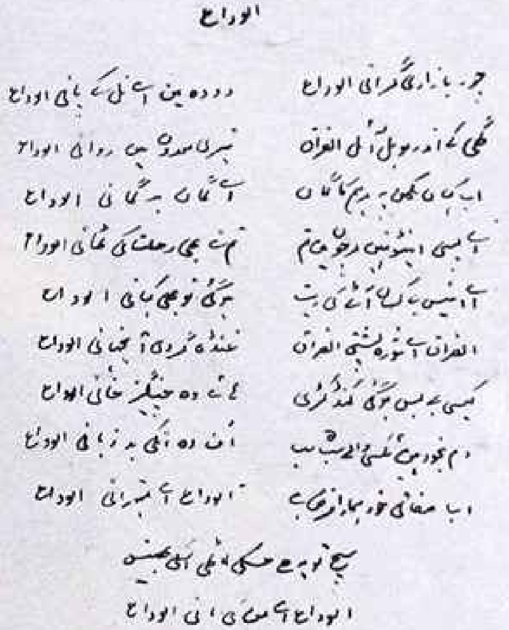

الوداع

جرس بازار گرانی الوداع   درد دل میں آج اٹھی بانی الوداع
گھل گئے اندر سو بولی آنی الفراق   تیری امیدوں کی بیں روانی الوداع
اب کہاں تک ہم بہ بزم کامگاراں   آہ ثنائی بہ گمانی الوداع
ہے بسی اے شعوتیں رنگ جام   تم نے بھی رحلت کی ٹھانی الوداع
اٹھ نہیں سکتا اٹھائی پیٹ   ہوگئی تو بھی کہانی الوداع
الفراق اے شورہ پشتی الفراق   خندہ گردی آہ جہانی الوداع
کیسی یہ بس ہوگئی گند گری   اے تو وہ چنگیز خانی الوداع
ام خود ہیں غلطی کا سبب   اف وہ ان کی بد زبانی الوداع
اب صفائی خود بیاں کرنی ہے   الوداع اے ہمزبانی الوداع

ہیچ تو ہے ملکی ملی اپنی جنس
الوداع اے معانی انی الوداع

قطعۂ تاریخ

وہ بزم کو جگمگانے والا نہ رہا   وہ غم میں بھی مسکرانے والا نہ رہا
یادِ شوکت میں عید کے دن روئیں   ہنسنے والا ہنسانے والا نہ رہا

۱۹۶۳ء

حفیظؔ ہوشیارپوری

طلوع

لیجیے، وہ صاحب بھی مرگئے۔ جو مجسّم زندگی تھے۔

شوکت صاحب کی شخصیت میں کچھ ایسی موہنی تھی کہ انھیں دیکھ کر اُپرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ جی چاہتا تھا کہ زندگی کی ساعتیں طویل تر ہو جائیں۔

گھر کی کوئی چیز ٹوٹ جاتی ہے تو اس کا بھی ہفتوں قلق رہتا ہے۔ پھر یہ تو شوکت تھانوی تھے۔ ایک ایسی بھرپور ہستی، جسے میں اس دُکھی دُنیا کیلیے خدا کی طرف سے عطیہ سمجھتا رہا۔ انھوں نے ہزاروں کو زندگی سے پیار کرنے کا درس دیا۔ مگر جب ان سے پیار کرنے والوں کی تعداد بڑھی تو یہ چپکے سے موت کی انگلی پکڑے دُور نکل گئے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ شوکت صاحب صرف میرے دوست تھے۔ نہ ہی یہ دعویٰ کروں گا کہ انھیں جتنا میں جانتا تھا اُتنا کوئی اور واقف نہ تھا۔ اتنی "بے تعلقی" پر بھی، میرا ان سے جتنا بھی ربط ضبط رہا۔ اُس کی بنا پر، مجھ سے اُداس ہونے کا حق کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔

بیماری کے دنوں میں، شوکت صاحب اپنے دوستوں کو دیکھ کر رو دیا کرتے تھے۔ زندگی بھر ہنسنے ہنسانے والا انسان یوں ٹپ ٹپ آنسو بہائے اچھا نہ لگتا تھا۔ مگر انسانی زندگی پر شوکت صاحب کا یہ خاموش طنز بھی بھولنے والی بات نہیں۔

ہم سب کتنے عاجز ہیں کہ زندگی رونے کی آواز سے شروع ہو کر، درد کی آواز پر ختم ہو جاتی ہے۔

شوکت صاحب کی عمر ۵۹ برس کی تھی۔ مگر عمروں کو برسوں کے اعتبار سے ناپنا نہیں چاہیے۔ عمر اُن کی زیادہ ہوتی ہے جو کام زیادہ کرتے ہیں۔ آپ اُن لوگوں کے بارے میں سوچیں، جو دفن ہونے سے پہلے مرجاتے ہیں اور ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں۔ جو دفن ہونے کے بعد بھی نہیں مرتے۔

محمد طفیل

میری سرگذشت

شوکت تھانوی

دس منٹ میں کوئی اپنی سرگزشت تو خیر کیا بیان کرے گا البتہ "سرسری سرگزشت" بیان کرے تو دوسری بات ہے۔ لہٰذا میں بھی اس صحرا کو ذرے میں سمیٹنے اور اس سمندر کو قطرے میں جذب کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس اختصار کی بدولت اور کچھ نہ سہی لوگ مجھ کو کم عمر تو سمجھ ہی لیں گے کہ کیا ننھی سی عمر کی ننھی سی تفصیل ہے۔

یہ حادثہ ۲ر فروری سنہ ۱۹۰۴ء کو بندرابن ضلع متھرا میں پیش آیا کہ میں نے بھی کرشن جی کی جنم بھومی کو اپنی جنم بھومی بنا لیا۔ کوئی مناسبت نہ سہی لیکن ایک عجیب و غریب نسبت تو ہے ہی اور اگر کوئی اس کو گستاخی کہے تو بھی اس بے ساختہ گستاخی کا میں ذمہ دار نہیں ہوں۔ ہوش سے پہلے میں گوش کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ بعض وہ باتیں جو میں نے اپنے متعلق سنی ہیں خود مجھ کو یاد نہیں ہیں کہ میں بچپن میں بے حد بیمار رہا کرتا تھا اور علاوہ دوسری وقتی بیماریوں کے ضعف معدہ کی شکایت نہایت تسلسل کے ساتھ جاری تھی اور اس کی وجہ سے نہایت سخت پرہیز ہوتا تھا۔ اتنا سخت پرہیز کہ میں والد صاحب کو کھاتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا اور اس کی وجہ سے خوش ہو جاتا تھا کہ میں نہ سہی میرا باپ تو کھانا کھاتا ہے اور اگر وہ کبھی شوربے میں ڈوبی ہوئی انگلی چٹا دیتے تو دیر تک چٹخارے لیتا تھا۔ سنا ہے کہ اسی زمانے میں سب سے پہلا شعر میں نے کہا تھا جس کا مطلع تھا کہ ع

نہ دانا نہ پانی میں کس سے کہوں
ارے میرے اللہ میں کیا کروں

اس وقت میری عمر پانچ سال کی تھی اور یہ واقعہ میں نے نہایت تواتر کے ساتھ کئی مرتبہ والد محترم اور والدہ محترمہ سے سنا اور کچھ سمجھ میں نہ آسکا کہ یہ شعر مجھ سے کیونکر سرزد ہو گیا۔

میں نے اپنے ہوش کی آنکھیں بھوپال میں کھولیں جہاں والد محترم یو۔پی پولیس سے مانگ لیے گئے تھے اور انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔ میں اس اسکول میں دو سال ہی رہنے پایا تھا کہ والد صاحب لکھنؤ آگئے۔ لکھنؤ میں میرا داخلہ چرچ مشن ہائی اسکول میں ہو گیا اور پھر گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد میں آگیا۔ جہاں میٹرک فیل ہونے تک رہا اس لیے کہ اس زمانے میں لکھنؤ میں فیل ہونے والے کلکتہ جا کر پاس ہوا کرتے تھے لہٰذا مجھ کو بھی کلکتہ جانا پڑا اور پھر لکھنؤ آگیا

اس زمانے میں میں نے شاعر ہونا شروع کر دیا تھا اور والد صاحب سے چھپ کر سگریٹ پینا اور شعر کہنا رہتا تھا۔ یہ طے تھا کہ اگر ان دونوں مشاغل میں سے کسی کی اطلاع والد صاحب کو ہو گئی تو طبیعت صاف کر دیں گے۔ مجھ کو اپنے اس زمانے کے اشعار میں سے صرف ایک شاہکار یاد ہے۔ ملاحظہ ہو۔

تمہارا شربتِ دیدار ہی ان کو شفا دے گا
جو عشقِ مرضِ مہلک کے بیمار ہو جائیں

"مرض" کی "ر" کو اگر ساکن کی بجائے متحرک کر لیتا تو بھی اس شعر پر کوئی آنچ نہ آتی۔ ایسا شعر باوجود کوشش کے میں نہیں کہہ سکتا۔ تمنا تھی تو صرف یہ کہ میرا کلام کسی رسالے میں چھپ جائے۔ آخر یہ حسرت بھی پوری ہو گئی اور لکھنؤ کے ایک رسالے میں جس کے نام ہی سے اس کا معیار ظاہر ہے یعنی "ترچھی نظر" میری ایک غزل چھپ گئی۔ کچھ نہ پوچھیے میری خوشی کا عالم میں نے وہ رسالہ کھول کر ایک میز پر رکھ دیا تھا کہ ہر آنے جانے والے کی نظر اس غزل پر پڑ سکے مگر شامتِ اعمال کہ سب سے پہلے نظر والد صاحب کی پڑی اور انھوں نے یہ غزل پڑھتے ہی ایسا شور مچایا کہ گویا چور پکڑ لیا ہو۔ والدہ محترمہ کو بلا کر کہا "آپ کے صاحبزادے فرماتے ہیں کہ

ہمیشہ غیر کی عزت تری محفل میں ہوتی ہے
ترے کوچے میں ہم جا کر ذلیل و خوار ہوتے ہیں

میں پوچھتا ہوں کہ یہ جاتے ہی کیوں ہیں۔ کس سے پوچھ کر جاتے ہیں۔ والدہ بیچاری سہم کر رہ گئیں اور خوفزدہ آواز میں بولیں "غلطی سے چلا گیا ہو گا"۔ مختصر یہ کہ اب میں شوکت تھانوی بن چکا تھا اور اب کوئی طاقت مجھ کو شوکت تھانوی سے باز نہ رکھ سکتی تھی۔ اسی زمانے میں علی گڑھ جا کر جھانکنے کا موقع بھی ملا۔ مگر ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ والد محترم کا انتقال ہو گیا اور مجھ کو تعلیم ادھوری چھوڑ کر فکرِ معاش میں مصروف ہو جانا پڑا۔ روزنامہ "ہمدم" اس دور کا بہت بڑا اخبار سمجھا جاتا تھا (بابائے صحافت سید جالب دہلوی اس کے ایڈیٹر تھے اور مجھ کو بحیثیت مترجم کے انہی کی تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا) سید جالب نے میرا سب سے پہلا مزاحیہ مضمون "میٹھے چاول" ایک رسالہ میں پڑھا اور دوسرے ہی دن مجھ کو حکم دیا کہ "ہمدم" کا فکاہیہ کالم "دو دو باتیں" لکھنے کی کوشش کرو۔ لہٰذا میں نے یہ مشق شروع کر دی۔ کچھ دن اور گزرنے کے بعد شذرات لکھوانا شروع کر دیے اور اب میں شعبۂ ترجمہ سے مستقلاً عملۂ ادارت میں آ گیا یہاں تک کہ پانچ سال بعد جب جالب دہلوی "ہمدم" سے رخصت ہوئے تو مجھ ہی کو ان کا چارج لینا پڑا۔ چند ہی دن بعد ملک نصر اللہ خاں سے آ کر چارج لے لیا اور میں روزانہ اودھ اخبار کی جو منشی نولکشور آنجہانی کا اخبار تھا ادارت پر آ گیا۔ اودھ اخبار کے بعد روزنامہ ہند کا ایڈیٹر رہا۔ خود اپنا روزنامہ طوفان کے نام سے جاری کیا۔

جب انقلابی حکومت نے راولپنڈی کو عبوری دار الحکومت بنایا تو جنگ نے بھی کراچی کے علاوہ راولپنڈی کو اپنا میدان بنایا اور میں جنگ راولپنڈی کی ادارتی ذمہ داریاں لے کر راولپنڈی آ گیا۔ جہاں اب تک موجود ہوں۔ اس تمام مدت میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ بچے تو خیر چند ہی ہیں مگر کتابیں تہتر ہو چکی ہیں۔ دس منٹ تو صرف ان ہی کے نام گنانے کے لیے درکار ہیں جو اب ختم ہو چکے ہیں۔

(ریڈیو کی ایک تقریر)

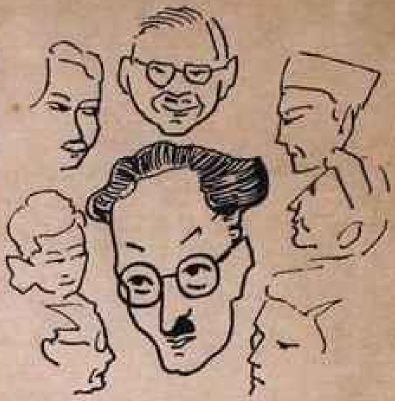

ہمعصروں کی نظر میں

(بہ حیثیت فن کار)

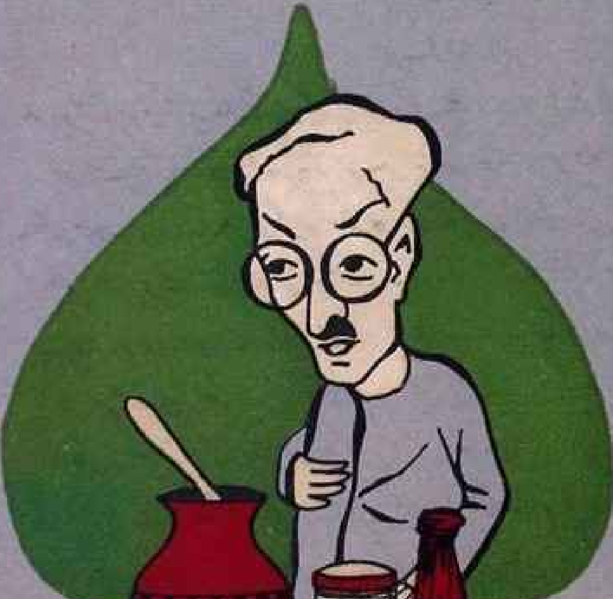

ڈاکٹر سر محمد اقبال

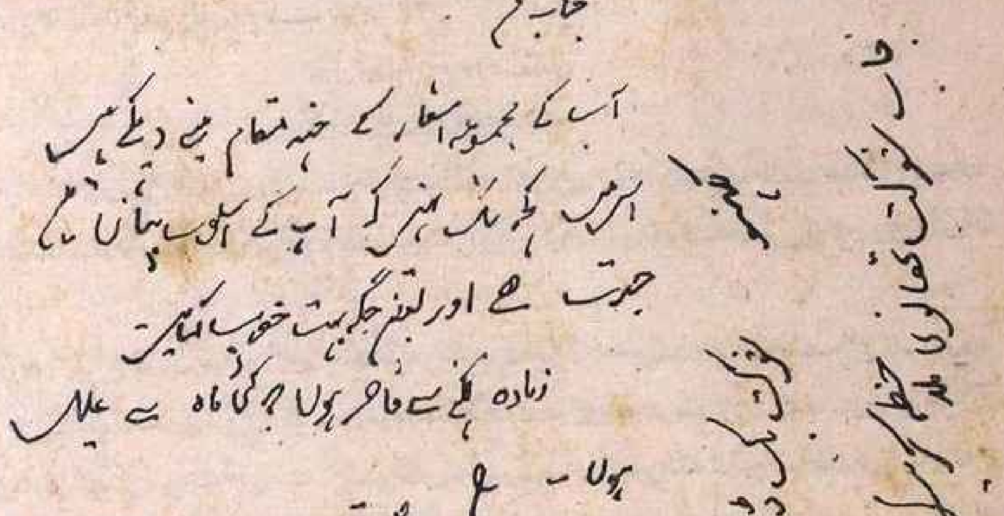

جناب من

آپ کے مجموعۂ اشعار کے چند مقامات میں نے دیکھے ہیں
اس میں مجھے شک نہیں کہ آپ کے اسلوب بیان میں
جدت ہے اور بعض جگہ بہت خوب لکھا ہے
زیادہ لکھنے سے قاصر ہوں۔ کئی ماہ سے علیل
ہوں۔

محمد اقبال ۲۴ اگست ۳۶ء

جناب شوکت تھانوی [illegible]
شوکت بک ڈپو
لکھنؤ

دیباچے

(۱)

مرزا فرحت اللہ بیگ

عدالتی مقدمات کی دو قسمیں ہیں، دیوانی اور فوجداری، اسی طرح کتابوں کے مقدمات بھی دو قسم کے ہوتے ہیں، تعریفی اور تعارفی، تعریفی مقدمات صرف گذشتہ اہلِ قلم کی کتابوں پر لکھے جاتے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خود اپنی تعریف کی جائے اور لوگوں کو بتایا جائے کہ

منم کردہ ام رستم داستاں
دگر نہ یلے بود در سیستاں

اس قسم کا مقدمہ لکھنے والے اللہ کے فضل سے ہندوستان میں بہت موجود ہیں۔ تعارفی مقدمہ اس لیے لکھا جاتا ہے کہ پبلک سے مصنّف کا تعارف کرا دیا جائے اور اس کی تحریر کی خوبیاں ظاہر کر کے لوگوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالا جائے۔

"طوفانِ تبسم" پر مقدمہ تعریفی لکھنے کی گنجائش ہی نہیں ہے کیونکہ بفضلِ خدا اس کے مصنّف ابھی تک بقیدِ حیات ہیں اور خبر نہیں کہ کب تک زندہ رہیں، رہا دوسرے قسم کا مقدمہ یعنی مقدمہ تعارفی تو مجھے کیا کسی کو بھی اس کتاب پر ایسی کوئی تحریر لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، ہندوستان کا کون پڑھا لکھا شخص ہے جو شوکت تھانوی کو نہ جانتا ہو اور ان کی تحریر کی خوبی سے واقف نہ ہو۔ ایسی صورت میں ان کے مجموعۂ مضامین پر کچھ لکھنا بجلی کے ہنڈے کے سامنے پیسہ کی دو والی موم بتیاں جلانا ہے ہاں اگر کچھ لکھا جا سکتا ہے تو اس پر لکھا جا سکتا ہے کہ آخر آج کل کے اہلِ قلم "لگا کر اور لے دوڑی" کیوں بنے ہوئے ہیں۔ ہماری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ زمانہ کے ہاتھوں اس میں سب پریشان ہیں۔ خاص کر اہلِ قلم کی تو یہ حالت ہے کہ:-

ہاتھ گلے نہ مٹھی   ہلبلاتی اٹھی

بیچارے ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتے ہیں جب رزق کا دروازہ کسی طرح نہیں کھلتا تو سوچتے ہیں کہ لاؤ پبلک کو ہم نے اپنی تحریر کا گرویدہ تو کر ہی لیا ہے اچھا انھیں سے ٹکے کمائیں، بس ان کی وہی کیفیت ہے کہ مداری پہلے تو ڈگڈگی بجا کر لوگوں کو اکٹھا کر لیتا ہے اس کے بعد اپنے کمال دکھا کر ان کو خوش کرتا ہے اور پھر چھڑی ہاتھ میں لے کر

ہر ایک سے کہتا پھرتا ہے کہ "لاچپیہ" اور سچ بھی ہے کہ بیچارے اہلِ قلم اس طرح نہ کریں تو کیا بھوکے مر جائیں، ان غریبوں کے پاس ہے ہی کہ اگر کوئی کار آمد چیز ہے تو وہ ان کا دماغ ہے۔ اس دماغ کو رسالہ والوں نے اپنی مِلک سمجھ لیا ہے۔ مضمون مانگنے کے لیے تو خط پر خط اور تار پر تار دیئے جاتے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ کسی خط کے ساتھ منی آرڈر بھی آ جائے اور اس طرح بیچارے کو تھوڑے ہی دنوں کے لیے روزی کی طرف سے اطمینان ہو جائے، جب یہ صورت ہو تو مضامین کے مجموعے کیوں نہ چھپیں اور کیوں نہ پبلک پر ظلم کیا جائے کہ اس کو خریدو، یہی وجہ ہے کہ آج کل اس قسم کی کتابوں کا بڑا زور ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض اہلِ قلم تو اپنی کتابوں میں یونہی الا بلا ٹھونس ٹھانس کر غلما غلمی ٹکے کھرے کر لیتے ہیں اور بعضوں کی کتابیں واقعی ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے خریدنے کو دل چاہتا ہے۔ "طوفانِ تبسم" بھی ایک ایسی کتاب ہے جس کو پڑھ کر شاید ہزاروں میں سے ایک بھی نہ کہے گا کہ "ہائے۔ پیسے ڈوب گئے"۔

"طوفانِ تبسم"؟ واللہ کیا عجیب و غریب نام ہے: "طوفانِ نوح" کے متعلق تو سنتے آئے ہیں کہ ایک بڑھیا کے تنور سے نکلا تھا لیکن یہ "طوفانِ تبسم" آخر کہاں سے اُٹھا، بڑی دیر تک سوچتا رہا۔ سوچتا رہا، آخر یہ سمجھ میں آیا کہ منہ بھی تنور کی شکل ہے اور "تبسم" ہمیشہ ہونٹوں ہی پر آتا ہے۔ شاید اسی مناسبت سے یہ نام تجویز کیا گیا ہے۔ اگر یہ بات ہے تو "واللہ بڑی دُور کی سوجھی"۔

اس مجموعے کے سارے مضامین خوش مذاقی میں ڈھلے ہوئے ہیں، میری ہمیشہ سے یہ رائے ہے کہ اس طرح کے مضامین لکھنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ شعر کی تعریف کی گئی ہے جب وہ پڑھا جائے تو ہر شخص سمجھے کہ میں بھی ایسا شعر کہہ سکتا ہوں لیکن جب لکھنے بیٹھیں تو بڑے بڑے معجز نگار ہزاروں دفعہ قلم دوات میں ڈبوئیں اور ویسا ایک شعر نہ لکھ سکیں، بس یہی حال خوش مذاقی کا ہے۔ ہر شخص پڑھتے وقت سمجھتا ہے کہ "یہی میرے دل میں ہے" لیکن دل کی اسی بات کو زبانِ قلم پر لانے والے ڈھونڈھنے ہی سے کچھ ملیں تو ملیں دُور کیوں جاؤ، خود اپنے ملک کی حالت ہی دیکھ لو یہاں ہزاروں اخبارات اور سینکڑوں رسالے چھپتے اور بکتے ہیں اور شاید ہی کوئی پرچہ ہو گا جس میں خوش مذاقی کا ایک آدھ مضمون نہ ہوتا ہو لیکن بس رہنے ہی دیجیے۔

ہے اب شرط منہ نہ کھلوائیں

یہ تو سب جانتے ہیں کہ تبسم دو طرح پیدا کیا جاتا ہے ایک تو "شخصیت" (کیرکٹر) پیدا کرنے سے، دوسرے واقعات کو اس طرح بیان کرنے سے کہ خواہ مخواہ پڑھ کر ہنسی آئے، پہلی صورت کی زندہ مثال چارلی چپلن اور دوسری کی ہیرلڈ لایڈ موجود ہے۔ ہر انسان میں ایسے پہلو موجود ہیں جن کا سلیقہ سے بیان کرنا لطف سے خالی نہیں ہوتا اور ہر واقعہ میں کوئی نہ کوئی صورت ایسی نکل سکتی ہے کہ اس کو خوش مذاقی کا رنگ دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً کسی کا بیچ بازار میں گرنا کوئی ہنسی کی بات نہیں ہے فطرت کا تقاضہ ہے کہ گرنے والے کی مصیبت پر اظہارِ ہمدردی کیا جائے لیکن اگر کوئی کالے صاحب سوٹ بوٹ سے آراستہ عینک لگائے، سگریٹ پیتے، سیٹی بجاتے، بینت ہلاتے اور تمام بازار والوں کو اپنا زر خرید غلام سمجھتے ہوئے جا رہے ہوں اور ایک دفعہ ہی بیچ سڑک میں ان کا پاؤں آم کی گٹھلی پر سے رپٹ

جائے اور وہ چاروں خانے چت آ پڑیں تو دیکھئے کہ یہی جذبۂ ہمدردی کس طرح جلد ہنسی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

غرض ہر واقعہ میں تبسم کا یہ پہلو موجود ہے شاید میرا ہی ایک شعر ہے ؎

ہجوم یاس میں بھی کچھ نہ کچھ امید رہتی ہے
جھلکتا غم میں بھی ہے اک نہ اک پہلو مسرت کا

اسی مسرت کے پہلو پر شوکت صاحب نے اپنے مضامین کی بنیاد رکھی ہے۔ اب رہی کامیابی تو حضرت مٹی سے سونا نکالنا اور پتھر سے ہیرا پیدا کرنا انہی جیسے اہل قلم کا کام ہے۔ ورنہ ہوتا تو یہ ہے کہ بعض احباب زرد مٹی کو سونا اور شیشے کو ہیرا سمجھ کر پبلک کے سامنے پیش کرتے اور طالب زر ہوتے ہیں لیکن پبلک کچھ ایسی اندھی تو ہے نہیں کہ مٹی اور سونے میں یا شیشہ اور ہیرے میں تمیز نہ کر سکے، وہ ان چیزوں کو دیکھتی اور ہنس کر خاموش ہو جاتی ہے، ہاں واقعی جو اہل کمال ہوتے ہیں ان کی قدر مرنے کے بعد ضرور کی جاتی ہے۔ شوکت صاحب بڑے خوش نصیب ہیں کہ ان کی زندگی ہی میں پبلک ان کی تحریر کی دلدادہ اور ان کی خوش مذاقی کی مداح ہے ورنہ عام طور پہ تو زمانہ کی یہ حالت ہے کہ ع

کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی

اس لیے میری یہ رائے ہے کہ شوکت صاحب مقدمات کے ذریعہ سے اپنا تعارف کرانا چھوڑ دیں اور محض اپنی تحریر کے جال میں لوگوں کو پھنسائے رکھیں ورنہ خدانخواستہ کہیں یہ صورت پیدا نہ ہو جائے کہ

برائے برتے کھیلا جوا
آج نہ ہوا کل ہوا

(۲)

خواجہ حسن نظامی

خدا رکھے منشی جی چالیس کے لگ بھگ ہیں مگر شیخ سعدیؒ کا سا رُتبہ خدا نے ان کو دیا ہے، کیونکہ شیخ سعدیؒ بھی چالیس برس کی عمر میں کریما پڑھتے تھے اور کہتے تھے۔

چہل سال عمرِ عزیزت گذشت
مزاجِ تو از حالِ طفلی نہ گشت

تم چالیس برس کے ہونے کو آئے مگر اب تک بچپن نہ گیا۔

پھر اگر منشی جی چالیس سال کی عمر میں بسم اللہ پڑھنے بیٹھے اور ان کی بیوی نے دلّی سے پیر جی کو بُلایا اور اس طرح بُلایا کہ خط لکھے۔ ٹیلی فون دیئے، تار بھیجے، ریڈیو میں گھڑی گھڑی پکارا، تب کہیں پیر جی نے لکھنؤ آنے کی تیاری کی۔ گرمی کا موسم تھا، لُو چل رہی تھی، لکھنؤ کے خربوزوں کی بہار تھی۔ پیر جی ریل سے اُترے اور سیدھے منشی جی کے گھر پہنچے۔ دروازے پر آواز دی۔ اجی میاں منشی جی لو ہم دلّی سے آ گئے۔ منشی جی نے اندر بیوی سے کہا۔ اجی بی سنتی ہو، لو وہ پیر جی آ گئے تم نے تو اب تک بلاوا بھی نہیں بھیجا نہ کاغذ والے آئے، نہ کاپی نویس آئے، نہ چھاپے خانے والے آئے۔ تم کہتی تھیں کہ ان سب کو بلاؤں گی۔ گھر میں شادی رچاؤں گی، اور تم کو پیر جی سے بسم اللہ پڑھواں گی۔

بیوی نے کہا تو باہر جاؤ، ایک کرسی دروازے پر ڈال دو، پیر جی بیٹھ جائیں پوچھو حقّہ پیتے ہیں، پیتے ہوں تو اپنا حقّہ لے جا کر سامنے رکھ دو، میں ابھی پان بنائے دیتی ہوں، اتنے وہ حقّہ پئیں، پان کھائیں، اتنے میں تم جا کر کاپی نویسوں کو بلا لاؤ جتنے بھی لکھنؤ میں مل سکیں۔ کاغذ والے بھی جہاں جہاں ملتے جائیں بلاوا دیتے جانا، اور چھاپے خانے بھی جتنے رستہ میں ملیں سب کو آواز دے دینا کہ بھئی آؤ ہماری بسم اللہ ہے، پیر جی دلّی سے آئے ہیں، ہماری بیوی نے بلایا ہے، دروازہ کے باہر بیٹھے حقّہ پی رہے ہیں، پان کھا رہے ہیں، جلدی سے آ جاؤ تو ہم سب کے سامنے بسم اللہ پڑھ لیں۔

منشی جی گھبرا کر اٹھے، کرسی باہر بچھائی، حقّہ تازہ کر کے چلم بھری، باہر لے جا کر پیر جی کے سامنے حقّہ رکھا، پانوں کا خاصدان بھی پیر جی کی گود میں رکھ دیا اور کہہ دیا کہ پان کی پیک دیوار پر نہ تھوکئے گا وہ جو سامنے دوری جاتی

ہے اس میں جا کر بھو کیے گا۔

منشی جی اس کام سے فارغ ہو کر بلاوا دینے چلے تو بیوی نے کہا، اے ہے میں تو بھول گئی، ایک بڑا ضروری بلاوا تو باقی رہ گیا، وہ جو ریڈیو والے ہیں ان کے ہاں بھی جانا اور کہہ دینا کہ ہم دونوں میاں بیوی تمہارے ہاں آ کر آپس میں باتیں کیا کرتے تھے اور تم ہماری باتوں سے خوش ہو کر لوٹن کبوتر بن جایا کرتے تھے اس وقت ہمارا نام سکونی تھا۔ کیونکہ ہم نے کیا نام اپنا غلط بتایا تھا، کچھ بات ہی ایسی تھی، یہ کہنا ٹھیک نہ تھا کہ ہمارا نام شوکت تھانوی ہے کیونکہ ہم کو ڈر تھا کہ ریڈیو والوں کی یا ریڈیو سننے والوں کی ہم کو نظر نہ لگ جائے، اس واسطے ہم نے ایسا نام بتایا جو پیر جی کے لکھے ہوئے سکوپے کا ہم نام سکونی تھا۔ اب ہم آ گئے ہیں اور آپ سب کو بلاوا دیتے ہیں اپنے اصلی نام سے کہ ہمارا نام حضرت مولانا شوکت صاحب تھانوی ہے۔ ہم مولوی بھی ہیں، ایڈیٹر بھی ہیں اور منشی بھی ہیں اور جی بھی ہیں اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہم کو ہماری بیوی نے بہت اللہ آمین کے ساتھ پالا پوسا ہے اور اب جبکہ ہم بیس اور بیس پورے چالیس برس کے ہو گئے ہیں تو ہماری بیوی نے ہم کو بسم اللہ پڑھانے کی شادی رچائی ہے اور دلّی سے ایک پیر جی کو بلایا ہے، ہم تم کو بھی بلاوا دینے آئے ہیں، اور بیوی نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ریڈیو والوں سے پوچھ بھی لینا کہ جو باتیں ہم دونوں نے ریڈیو میں سنائی تھیں وہ ہم کاپی نویس سے لکھوائیں گے اور چھاپے خانوں میں کاغذ پہ چھپوائیں گے اور وہ سب گیارہ رات کی باتیں ہوں گی۔ ایک یہ کہ منشی جی نے کہانی کہی، دوسرے یہ کہ منشی جی نے چائے بنائی، تیسرے یہ کہ منشی جی نے خط لکھا، چوتھے یہ کہ منشی جی نے دوا پی، پانچویں یہ کہ منشی جی نے صفائی کی، اپنی داڑھی کی نہیں، اپنے گھر کی، چھٹے یہ کہ منشی جی نے اپنی تصویر کھنچوائی، جرمنی کے بنے ہوئے فوٹو میں، ساتویں یہ کہ منشی جی خود بازار سے سودا لائے، آٹھویں یہ کہ منشی جی نے بسم اللہ پڑھنے سے پہلے دوسروں کو سبق پڑھایا، نویں یہ منشی جی نے لکھنؤ سے خبر نہیں کہاں کہاں کا سفر کیا، دسویں یہ کہ ایسی بے روزگاری کے زمانے میں منشی جی کو خدا نے نوکری دی اور وہ نوکر ہو گئے گیارہویں یہ کہ منشی جی نے پرانا مکان بدل دیا، بس گیارھویں شریف کی یاد میں پیر جی آئے ہیں تو یہ گیارہ راتوں کی بات چیت ہم چھاپ دینی چاہتے ہیں اور شائع بھی کر دینی چاہتے ہیں آپ سب لوگوں کی اجازت سے اور مہربانی سے جس کو ہندی زبان میں کرپا کرنا بھی کہتے ہیں۔ مگر دیکھنا جب تم کرپا کا لفظ بولو تو کرپا نہ کہہ دینا، نہیں تو بسم اللہ کے وقت بدشگونی ہو جائیگی کہہ دینا کہ اس شادی میں چاچا بھی آئیں، بدھو بھی آئیں، ماموں جان بھی آئیں، اور بھی جو وہاں بیٹھے ہوں، سوتے ہوں، جاگتے ہوں، چائے پی رہے ہوں، چرٹ پی رہے ہوں، مونچھوں والے ہوں، مونچھ منڈے ہوں، سبھی کو بلاوا دے دینا، گھر بدل ہی لیا ہے، جگہ کم سہی۔ بیٹھیں گے نہیں، کھڑے رہیں گے۔

آخر منشی جی سب کو بلا لائے اور لکھنؤ کے خربوزے بھی گیارہ ٹوکرے بھروا کر ساتھ لیتے ہوئے بیوی نے سنا تھا کہ اگلے زمانہ میں بادشاہوں اور پیروں کے لیے سوا لاکھ روپے کا چبوترا بنایا جاتا تھا آج انھوں نے خربوزوں کا چبوترا بنایا اور اس پہ پیر جی کو بٹھایا۔ پیر جی نے منشی جی کو پاس بٹھا کر یوں بسم اللہ پڑھائی۔

" پڑھو میاں بڈھے طوطے بسم اللہ۔ اَلرَّحمٰن۔ الرَّحیم، اللہ کا نام لے کے شروع کرتا ہوں چالیس برس کی عمر میں

لکھنا پڑھنا، اس اللہ کا نام لے کر جو بڑی رحمت والا ہے اور جو بڑی بندہ نوازی کرتا رہتا ہے۔ وہ اللہ جس نے توپیں پیدا کیں، بندوقیں بنوائیں، بم بنوائے، ہوائی جہاز بنوائے، ٹینک بنوائے اور پھر اس نے شیطان کو بھی پیدا کیا اور اس سے کہا تو نے آدمی کی دشمنی پر کمر باندھی تھی تو لے ہم یہ ہتھیار تجھ کو دیتے ہیں ان سے آدمیوں کو گن گن کر مار۔

"پڑھو منشی جی اپنے خدا کا نام لے کر جس نے آدمی کو علم دیا اور قلم دی۔ جب پیر جی نے کہا "قلم دی"، تو سب حاضرین چیخ چیخ کر کہنے لگے۔ پیر جی منشی جی کو پڑھا رہے ہو یا منشی جی کی بیوی کو، یوں کہو کہ "قلم دیا"۔ پیر جی بولے "ہاں ہاں قلم، قلم دیا، سر کنڈے کا بھی، اور لوہے کا بھی، اور وہ بھی جس کو جیبی قلم کہتے ہیں اور وہ بھی جو اُردو قلم کہلاتا ہے اور وہ بھی جس کو خسرو قلم، غالب قلم، اور شوکت قلم اور دلی قلم اور لکھنؤ قلم بھی کہتے ہیں اور ملیح آباد کے قلمی آم جن سے منسوب ہیں۔

اس کے بعد پیر جی نے کہا۔ لو بھئی بسم اللہ پڑھا دی۔ اندر منشی جی کی بیوی کو ہماری طرف سے مبارکباد دینا۔

منشی جی بولے ابھی بسم اللہ کہاں ہوئی، جو آپ مبارک سلامت کرنے لگے اجی جناب میری اور میری بیوی کی گیارہ رات کی بات چیت جو میں ریڈیو والوں سے چھاپنے اور شائع کرنے کے لیے بزبانِ خود و بقلم خود مانگ کر لایا ہوں تاکہ سند رہے اور ضرورت کے وقت کام آئے وہ بھی تو پڑھا دیجئے۔ پیر جی نے کہا اچھی بات ہے اور اس کے بعد پیر جی نے خربوزوں کے چبوترے پر بیٹھے بیٹھے یوں زبان کھولی۔

"منشی جی اور ان کی بیوی اور ریڈیو والوں اور کاپی نویسوں اور کاغذیوں اور چھاپے خانے والوں سے اگر مسلمان ہوں تو سلام اور ہندو ہوں تو رام رام کے بعد ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم دلی سے لکھنؤ میں آئے ہیں اور لکھنؤ سے یہ خربوزے کھاتے اور لٹانے کے بعد ہم پھر دلی براستہ کانپور طوفان میل میں واپس جانے والے ہیں، آج وہ دن ہے کہ یورپ میں لڑائی ہو رہی ہے، انگریز، فرانس، اٹلی اور خبر نہیں کون کون آپس میں لڑ رہے ہیں بہت گرمی ہے، بہت خاک ہے اور ہم کو بہت غصہ بھی آ رہا ہے، کیونکہ ہم اکے والے کو کرایہ دینے کے لیے پانچ روپے کا نوٹ بازار میں بھنانے گئے تو کسی نے روپے ہم کو نہیں دیئے اور ہم نے غصہ کے مارے پورا کا پورا نوٹ یکے والے کے منہ پر کھینچ مارا یعنی اس کو کچا ہی نوٹ دے دیا کیونکہ وہ کسی سے بھن نہ سکا۔

بہنو! اور بھائیو! ہم مولانا شوکت صاحب تھانوی کو جانتے ہیں اور ہم اس سے بھی آگاہ ہیں کہ انھوں نے لکھنؤ ریڈیو میں گیارہ رات تک سکونی کے نام سے جو باتیں اپنی بیوی سے کی تھیں وہ ہم نے اور سب بھارت ماتا کے سپوتوں نے اپنے اپنے گھروں اور دکانوں اور ہوٹلوں میں سنی تھیں اور وہ باتیں ہم کو بحیثیت گھر سدھار کا کام کرنے کے گھر سدھار کے لیے بہت ہی اچھی معلوم ہوئی تھیں۔ ہم کو ان کے سننے سے ہنسی بھی آئی تھی اور ہمارا مع آل اولاد و امجاد کے جی خوش بھی ہوا تھا اور ہم نے ان سے سبق بھی لیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب منشی جی کی بیوی نے ہم کو دلی سے بسم اللہ پڑھانے کے لیے بلایا تو ہم نے خود اپنے کان میں کہا کہ بھئی یہ الٹی گنگا کیوں بہنے لگی۔ ہم نے تو خود منشی جی سے گیارہ رات تک سبق پڑھا ہے، وہ ہم سے بسم اللہ کیا پڑھیں گے مگر خیر ہم کو عورت ذات کا کہنا ماننا ضروری تھا، اس واسطے ہم آ گئے اور اب ہم بسم اللہ پڑھانے کے بعد یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں اپنے عقل و حواس کی سلامتی کی حالت میں اس یقین کے ساتھ کہ اب ہم

کو پانچ روپے کا نوٹ نہ بھنے کا غصہ نہیں ہے اور ٹھنڈے دل اور ٹھنڈے دماغ کے ساتھ ہم یہ سب کچھ عرض بھی کر رہے ہیں اور فرما بھی رہے ہیں کہ جب یہ گیارہ کی گیارہ کہانیاں کتاب کی صورت میں چھپ کر تیار ہوں تو پہلے وائسرائے بیگم اس کو پڑھیں اور اپنے سب بچوں کو پڑھائیں۔ ان کے بعد گاندھی جی اور ان کی دھرم پتنی اور ان کے بچے اور مسٹر جناح اور ان کی بیٹی اور صوبہ سرحد اور صوبہ پنجاب اور سندھ اور مدراس اور بمبئی اور سی پی اور یو۔ پی اور بہار اور بنگال اور آسام اور برما کے سب گورنر اور وزیر اور اسکولوں اور کالجوں اور پاٹھ شالاؤں اور مکتبوں کے پڑھنے والے اور پڑھانے والے اور وہ سب جن کو اپنے اور اپنے بچوں کے اور اپنی بیوی کے خوش کرنے کی ضرورت ہو اور سلیقہ مند اور سگھڑ بنانے کی ضرورت ہو وہ سب ان گیارہ کہانیوں کو لفظاً پڑھیں، معناً پڑھیں، اشارتاً پڑھیں، کنایتہً پڑھیں اور چھاپہ خانے کے مشہور کالے قانون نے کہا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس کو پڑھیں پڑھائیں اور مولانا شوکت تھانوی سکونی دہقانی والشہری کے حق میں دعائے خیر کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو یہ بسم اللہ پڑھتی ایسا مبارک کرے کہ یہ ہمیشہ چالیس ہی برس کے رہیں۔ کیونکہ ہم جس کو بسم اللہ پڑھاتے ہیں تو صراطِ مستقیم بھی پڑھاتے ہیں اور مستقیم راستہ یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے راستہ میں ثابت قدم رہے یعنی نہ آگے بڑھے نہ پیچھے ہٹے بس ایک جگہ پاؤں جمائے کھڑا رہے۔ لہٰذا مولانا شوکت بھی جن کو ہم سب نے ابھی منشی جی کے روپ میں دیکھا ہے اور جن کی عمر مبارک چالیس سال ہے وہ نہ کبھی ۳۹ سال کی طرف جائیں اور نہ کبھی ۴۱ کی طرف قدم بڑھائیں۔ کہیں سب حاضرین! اے خدا، اے گاڈ، اے پربھو ایسا ہی کر۔

(۳)

مرزا عظیم بیگ چغتائی

ایک وکیل کو مقدموں سے کہاں تک دلچسپی ہو سکتی ہے اس کا اندازہ شاید کوئی وکیل ہی لگا سکے پھر نئے وکیل تو یہ نہیں دیکھتے کہ مقدمہ فوجداری کا ہے یا دیوانی کا یا کسی متفرقات صیغہ کا انھیں مقدمہ سے مطلب! لہٰذا مجھے چنداں ضرورت نہیں کہ اس "مقدمہ بازی" کے لیے کوئی معقول عذر تراشوں، بلکہ شاید میرے لیے یہ ناممکن ہو گا کہ اس نوعیت کے کسی "ادبی مقدمہ" کا وجود تو بڑی چیز ہے ذکر بھی اپنے رجسٹر مقدمات سے نکال کر پیش کر سکوں۔

جی ہاں، مجھے فخر ہے کہ میں حضرت شوکت تھانوی جیسے مسلّمہ ادیب اور مزاحیہ نگار کی ایک بہترین کتاب پر مقدمہ لکھ رہا ہوں کسی کتاب یا تحریر کا لطف خاص طور پر جب حاصل ہو سکتا ہے جب مصنّف کے ہم عصروں کے مضامین بھی پیشِ نظر ہوں۔ دراصل موازنہ ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعے سے مضامین کا اصل لطف حاصل ہو سکتا ہے۔

موجودہ دَور کے مزاحیہ نگاروں کی اگر فہرست تیار کی جائے تو حضرت ملّا رموزی سے لے کر ہر وہ شخص مزاحیہ نگار ثابت ہو جائے گا جس نے کوئی مزاحیہ مضمون دیکھا یا سُنا ہے لیکن اگر واقعی دیکھا جائے تو چوٹی کے مزاحیہ نگار صرف تین چار ہیں۔ آغا فرحت، حضرت پطرس، مسٹر رشید احمد صدیقی اور شوکت تھانوی اور بعد اس کے تو اللہ کے فضل سے سب ہیں چنانچہ ہم خود بھی کہتے ہیں کہ "ہم بھی ہیں پانچوں سواروں میں" یعنی اگر میرا نام یا حضرت ملّا رموزی کا نام اس میں اور جوڑ دیا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے میں خود اپنی ذات سے تنقید شروع کرتا ہوں یہ محض اس وجہ سے کہ پستی سے بلندی کی طرف چلنا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

قصّہ کو مختصر تو دو لفظوں میں اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ شوکت مجھ سے نہ صرف اچھا لکھتے ہیں بلکہ بہت اچھا لکھتے ہیں، بہت ممکن ہی نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ لوگ خیال کریں گے کہ میں یہ بات دل سے نہیں لکھ رہا ہوں محض اس لیے کہ شیطان ہر مزاحیہ نگار کے کان میں یہی پھونک گیا ہے کہ "بیٹا تجھ سے اچھا کوئی نہیں لکھ سکتا"، مگر امر واقعہ یہ ہے کہ مزاحیہ نگاری میں شوکت کی میں گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ اگر افسانہ نویسی اور مزاحیہ نگاری میں کوئی فرق ہے اور آپ اس کو محسوس کرنا چاہتے ہیں تو میرے افسانے اور شوکت کے مضامین دیکھیے۔ میرے مضامین مزاح کی صحیح چاشنی اور

زبان کی لطافت اور شگفتگی سے خالی نظر آئیں گے۔ دے دے کر میری تمام مزاحیہ نگاری کا دار و مدار محض "افسانویت" یعنی پلاٹ پر ہے۔ پلاٹ نکال دیجئے تو پھر کچھ نہیں رہ جاتا۔ لیکن شوکت بغیر پلاٹ کے ایسا مضمون لکھتے ہیں کہ میرا بہتر سے بہتر پلاٹ اس کے آگے کچھ نہیں۔ بطور نمونہ زیر نظر مجموعہ میں "بیوی کا پروپگینڈا" دیکھئے ملاحظہ ہو دوست کی حماقت کہ جورو تو دوستوں کے خلاف جوتی پہ "دھار" رکھے ہوئے ہے اور شوہر صاحب ہیں کہ خواہ مخواہ کا پروپگینڈا کرتے پھر رہے ہیں۔ کس قدر واہیات آم کھلاتے ہیں (پھر شوکت ہی کا حصہ ہے) اور کس خوبصورتی سے آموں کی تعریف کرتے ہیں "دیکھو یہ آم چھوٹے ضرور ہیں اور ان کا ریشہ بھی بہت بڑا ہے لیکن عجیب پر کیف آم ہیں تم ان کی کٹھاس پر نہ جاؤ (سبحان اللہ) اور نہ اس کی کمی پر غور کرو......" مزاحیہ نگاری اس کو کہتے ہیں۔

دراصل مزاحیہ نگاری کا یہاں کمال نظر آتا ہے اور یہی شوکت کا اصلی رنگ ہے پھر لطف یہ کہ آخری جملہ اس کا "اور اتنے سے آم میں گٹھلی تو دیکھو، ماشاءاللہ کتنی بڑی ہے......" بخدا میں تو دس جنم لوں جب بھی یہ بات ہرگز نہیں پیدا کر سکتا جو اس جملہ میں ہے بالفرض کوشش کروں یا کرتا تو لفظ "ماشاءاللہ" کا یہ استعمال؟ بخدا میری دانست میں شوکت اس سے بڑھ کر مزاحیہ نگاری کی خود اپنے یہاں سے بھی کوئی مثال مشکل سے پیش کر سکیں گے مضمون کی پوری کومیڈی اس لفظ "ماشاءاللہ" میں بند کر دی ہے ساتھ ہی لطف یہ ہے کہ گو ان کے مضامین کا محض پلاٹ پر دار و مدار نہیں ہوتا لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ شوکت کے یہاں پلاٹ کی خوبی ہی نہیں ملے گی بلکہ "شامت" کو ملاحظہ فرمائیے تو اس میں ایک معمولی سے واقعہ کے ساتھ قصہ کو کتنا عمدہ پلاٹ دیا ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ "بیوی کا پروپگینڈا" بھی کسی طرح پلاٹ سے خالی نہیں۔ مضمون کے آخری حصہ میں بہترین "ٹریجڈی" پیش ہے۔

قصہ مختصر یہاں تک میرا اور شوکت کا تقابل یا موازنہ ہو سکتا ہے میں ایک افسانہ نویس یا ناول نویس بن کر شوکت کے پایہ کو چھونے کی کوشش کر سکتا ہوں مگر بحیثیت مزاحیہ نگار کے شوکت کا رنگ میرے لیے قابلِ تقلید ہے نہ کہ قابلِ تنقید۔ دراصل مزاحیہ نگاری اور چیز ہے اور افسانوں میں عشقیہ معاملات اور شوخی و شرارت سے جان ڈالنا اور بات ہے۔ قصہ مختصر میری مزاحیہ نگاری میں عشق و محبت کی داستان زائد ہے اور اس چیز کو دوسرے مزاحیہ نگاروں نے بالخصوص نہیں چھوا ہے۔

اس کے بعد میں چوٹی کے ادیب کو لیتا ہوں یعنی آغا فرحت۔ لوگ کہتے ہیں کہ اردو ان کے گھر کی لونڈی ہے اور میں کہتا ہوں کہ ادب کے تمام صیغے اور تمام محکمے ان کے غلام ہیں۔ آغا فرحت کس گھر بند ہیں۔ مزاحیہ نگاری افسانہ نویسی اور حد ہو گئی شاعری بھی۔ لہٰذا ان کا شوکت کا مقابلہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ شوکت ایک خاص فلک ادب کے مالک ہیں مگر آغا فرحت کے یہاں تورہ چنگیزی پر عملدرآمد ہے۔ مگر ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ آغا فرحت کو زبان کی بڑی بھاری جیت ہے۔ جی میں آتا ہے پلاٹ سے مزاحیہ نگاری پیدا کر دیتے ہیں اور جی میں آتا ہے زبان سے۔ اور جی میں آتا ہے "یونہی" آغا فرحت کی زبانی مزاحیہ نگاری کا کمال "اصلاح سخن پر میرے خیالات" میں آتا ہے مضامین فرحت حصہ سوئم دیکھئے۔ اور اس ادب کے شاہکار اور زبان کی زبردستی کو دیکھئے کہ کس غضب کی مزاحیہ نگاری ہے۔ آغا فرحت کا مقابلہ شوکت

اپنے رنگ میں ضرور کرتے ہیں اور جہاں تک اپنے رنگ کا یا فکاہیہ مضامین کے لکھنے کا تعلق ہے شوکت بھی ان سے کم نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آکا فرحت یہ پڑھ کر ایک پھریری لیں اور دو ہتڑ گھسیٹیں کچھ کہ میں چھوٹا ہو جاؤں۔

حضرت پطرس کو لیجیے جو کچھ بھی چند مضامین ان کے موجود ہیں وہ مضمون نہیں بلکہ ادبی ہیرے ہیں۔ میں یہاں شوکت اور ان کے مضامین کا موازنہ کرنے سے قاصر ہوں۔ ایک عجیب ناقابلِ بیان خوبی پطرس کے جملوں میں ہے۔ شوکت کے یہاں اتنی ہی خوبصورت چیزیں ہیں مگر جنس اور ہے۔ دونوں کی مزاحیہ نگاری اپنے اپنے رنگ میں خوب ہے اور دونوں اپنے اپنے رنگ کے بادشاہ ہیں۔

حضرت ملّا رموزی کسی زمانہ میں ملک کے واحد اور بہترین مزاحیہ نگار رہ چکے ہیں اور اپنا نیا اور نرالا رنگ لے کر آئے اور بعض چیزیں پیش کیں اور جو ان کی قدر ہوئی وہ اس کے مستحق تھے مگر ان کے یہاں کی نئی چیز پرانی ہو کر رہ گئی۔ ان کی جدت قابلِ تعریف ہے مگر بار بار ایک ہی بات کا دہرانا ان کی مقبولیت کے لیے ستم ہو گیا۔ "ننھے میاں کی والدہ" ایک ایسا جملہ تھا کہ دنیا کی جدت اور مزاحیہ نگاری اس میں موجود تھی لیکن یہ جملہ خود حضرت ملّا رموزی نے معہ مبالغہ ہر مضمون میں کوئی سو دفعہ استعمال کیا۔ حتیٰ کہ اس کا استعمال بدمذاقی کا ثبوت ہو کر رہ گیا ہے۔ بجائے ہنسی کے اب اس جملہ کو پڑھ کر رونا آتا ہے۔ قصہ مختصر ملّا رموزی کی تمام مزاحیہ نگاری کا دارومدار چند جملوں پر تھا جو بار بار دہرائے جا چکے اور اب ان میں کچھ نہیں رہ گیا۔ پھر خیر سے ملّا صاحب از خود مزاحیہ نگاری کو چھوڑ کر لیڈری کے چکر میں پڑ گئے اور اپنی قسمت انھوں نے جمعیۃ العلماء سے وابستہ کر کے کچھ اور ہی کرنا شروع کر دیا۔ یعنی فی الحال بقول مسٹر رشید احمد صدیقی، ملّا صاحب اپنا نام اور دوسروں کی پگڑی اچھالنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ پھر اس سلسلہ میں انھوں نے غصّہ کا اتنا زیادہ استعمال شروع کر دیا ہے کہ کوئی شائستہ ادبی پرچہ ان کے اس سبّ و شتم کا متحمل نہیں ہو سکتا ہے جو وہ علی گڑھ کالج کے خلاف بالخصوص اور مہذّب اور انگریزی تعلیم یافتہ جماعت کے خلاف بالعموم اپنی قدامت پرستی کے رنگ میں کر جاتے ہیں اور پھر لطف یہ کہ مزاحیہ نگاری اور تجارت دونوں مقاصد کو انھوں نے مدغم کر کے رکھ دیا اور ساتھ ہی اپنے ذاتی پروپیگنڈے اور کتابوں کی اشاعت کا بار بھی مزاحیہ نگاری کی نازک کمر پر لاد دیا۔ نتیجہ یہ کہ "بدھیا کیچڑ میں بیٹھ گئی" اور ملّا صاحب کو "لاٹھی اور بھینس" کی فکر پڑی۔ مزاحیہ نگاری اور مزاحیہ نگار دونوں ملّا صاحب کے ہمیشہ ہمیشہ اگر شکر گزار اور مداح رہیں گے تو ان وجوہات کی بنا پر شاکی بھی رہیں گے۔ انھوں نے مزاحیہ نگاروں کی اگر توہین کی تو مزاحیہ نگاری کی تذلیل کی۔ شوکت تھانوی کو ملّا صاحب سے کوئی مناسبت نہیں۔ ملّا صاحب کے مقابلہ میں صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ شوکت ادیب اور مزاحیہ نگار ہیں اور ملّا صاحب محض ایک "غور طلب مصلح" نہ کہ مزاحیہ نگار۔

حضرت رشید احمد صدیقی کی اور شوکت کی مزاحیہ نگاری میں عجیب و دلچسپ مناسبت بھی ہے اور فرق بھی۔ فرق یہ کہ اگر مسٹر صدیقی بلاغت کے ساتھ مزاحیہ نگاری کے عجیب و غریب نمونہ پیش کر سکتے ہیں تو شوکت اپنی فصاحت اور شستگی میں جواب نہیں رکھتے۔ مسٹر صدیقی کے ریمارک غضب کے ہوتے ہیں پھر طنز کی شاید مزاحیہ نگاری میں ان کے برابر کوئی نظیر پیش ہی نہیں کر سکتا۔ ایک جگہ جامعہ ملّیہ کی "کھدر نگاری" کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "کچھ پتہ ہی یہاں

(جامعہ ملیہ میں) نہیں چلتا کہ پروفیسر کون ہے اور چپراسی کون ہے۔ در اصل یہ تعریفی جملہ بھی ہے کیونکہ وہاں پروفیسر بھی اسلامی خدمت کا نمونہ دکھانے میں بعض اوقات بستر درست کر دیتے ہیں۔ مناسبت دونوں میں یہ ہے کہ دونوں .... حضرات کے یہاں روزمرّہ کے واقعات سے لیجیے۔ میری طرح کسی غیر معمولی واقعہ یا پلاٹ کے قطعی محتاج نہیں۔ شوکت اور صدیقی میں ہجو یا طنز کا پہلو بعض جگہ یکساں ملے گا۔ مگر جیسا عرض کر چکا بلاغت کے ساتھ مزاحیہ نگاری کا کمال دکھانا اور حقائق نگاری اور مزاحیہ نگاری کو ملا کر ظرافت نگاری کا کمال دکھانا خاص مسٹر صدیقی کا رنگ ہے اور یہی بات ان کو شوکت سے مختلف کرتی ہے ورنہ دونوں اپنے اپنے رنگ میں لاجواب ہیں۔

قصہ مختصر زیرِ نظر مجموعہ میں دیکھیے کہ شوکت اپنے بہترین رنگ میں موجود ہے۔ "برقعہ" والا مضمون دیکھیے۔ کوئی کسر اس نالائق لباس کی ہجو میں اٹھا نہیں رکھی۔ برقعہ پوشی کے نام نہاد فوائد کی وہ پول کھولی ہے کہ خدا کی پناہ مگر لطف یہ کہ اپنی بیوی کے "برقعہ" میں خود بعد میں پناہ لے کر "سب کئے دھرے" کی حضرت نہایت ہی خوبصورتی سے تلافی بھی کر گئے۔ پھر ہر مضمون میں کوئی نہ کوئی نکتہ بھی ظرافت کے ساتھ موجود ہے۔ "چالیسواں" دیکھیے کس قدر عجیب و غریب رنگ میں شروع ہوا ہے اور اختتام پر کہنے والا سب کچھ کہہ گیا "ہم زلف" اپنی نوعیت کا نرالہ مضمون ہے۔ رہ گیا یہ اعتراض کہ یہ لکھا ہی کیوں گیا تو یہ تو کوئی بات نہ ہوئی خود حضرت معترض کے ایک بہت عمدہ افسانہ کو دیکھ کر مجھے بھی یہی کہنا پڑا اور نہ معلوم میرے کتنے افسانوں کو دیکھ کر خود بھی اعتراض وارد ہو چکے ہوں گے۔

شوکت کے یہاں معمولی واقعات اور باتوں کی بھی بعض جگہ عجیب دلچسپ اسٹڈی موجود ہے مضمون "گھاگرا پار" دیکھیے۔ ریل کے انٹر کلاس میں شوکت اور نسیم ایک ہی برتھ پر لیٹے ہیں مگر کیسے؟ جس طرح بکس میں جوتے رکھے جاتے ہیں یعنی ایک کی ایڑی ایک کا پنجہ اور ایک کا پنجہ اور ایک کی ایڑی۔ ......" یا پھر اسی مضمون میں صفحہ ۶۳ پر نسیم صاحب کے غزل پڑھنے کی مشق کا بیان جس کمال کے ساتھ کیا ہے کم از کم اور جگہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے اور یہی شوکت کا کمال ہے جو آپ کو کسی دوسرے مصنّف کے یہاں نہیں مل سکتا شوکت کی یہی مزاح نگاری ہے جس نے شوکت کو شوکت بنا دیا ہے اور اردو اس پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔

قصہ مختصر شوکت کا یہ مجموعۂ مضامین اس قابل ہے کہ اس کی قدر کی جائے اور مجھے امید ہے کہ جس طرح ان کی پہلی دو کتابیں مقبول ہوئیں یہ مجموعہ بھی مقبول ہوگا۔

اس مختصر مقدمہ میں ہندوستان کے سب کے سب مزاحیہ نگاروں کی فہرست دینا میرا مقصد ہرگز نہیں اور اسی وجہ سے میں نے ان مزاحیہ نگاروں کو نہیں لیا ہے جن کی مزاحیہ نگاری سے کہیں زیادہ بہتر خود ان کی سنجیدہ تحریریں ہیں اور ان کا اصل رنگ ہی اور ہے۔ ان کا ذکر نہ ہونے سے خدانخواستہ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ کسی طرح بھی مجھ سے کسی طرح کم ہیں یا میں نے محض تفریحاً ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔

سب کچھ تو میں نے لکھ دیا مگر آپ کہیں گے کہ شوکت کی خامیاں اور کمزوریاں بھی ہوں گی وہ آخر کہاں گئیں؟ تو عرض یہ ہے کہ کوئی ایسا لکھنے والا نہیں جس میں خامیاں نہ ہوں اور یقیناً شوکت کوئی دیوتا یا فرشتہ نہیں۔ مجھ میں

آپ ہیں، شوکت میں سب ہی ہیں خامیاں بھی ہیں اور ظاہر ہے کہ زیرِ نظر مجموعہ بھی ان خامیوں یا غلطیوں سے خالی نہ ہوگا وہ اور بات ہے کہ میرے لیے ان خامیوں کا پتہ چلانا دشوار ہے لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ جو کچھ بھی خامیاں ہیں وہ کہیں چھپا کر نہیں رکھدی گئی ہیں اور اسی مجموعہ میں ان کو تلاش کر لیجیے ذرا دقت ضرور ہوگی۔ مگر کوشش شرط ہے۔ خود شوکت تھانوی صاحب بھی میری دانست میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ (نعوذ باللہ) ان کا یہ مجموعہ مضامین بے عیب ہے مگر بوقت عیب جوئی اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ عیب زیادہ ہیں یا خوبیاں، اور اس معیار پر آپ اس مجموعہ کو انشاءاللہ کھرا پائیں گے۔

فقط

(۴)

پروفیسر رشید احمد صدیقی

پچھلی تعطیلوں میں شوکت صاحب نے فرمائش کی کہ میں ان کے زیرِ نظر مضامین (دنیائے تبسّم) پر کچھ لکھوں میں فوراً رضامند ہو گیا۔ لیکن تعطیل میں کام کرنے کا جو وعدہ کر لیا جاتا ہے اُسے تعطیل ہی میں پورا کر دینا نہ میرے بس کی بات ہے اور نہ میں اسے پسند کرتا ہوں، تعطیل میں وہ کام کرے جسے کام کرنے کا سلیقہ نہ ہو، یا جو کام نہ کرنے کے فن سے ناواقف ہو۔ میں نے اس فن پر بڑا ریاض کیا ہے۔ اوّل تو یہ کہ یہ بڑی کم ظرفی ہے کہ ادھر کام آیا، ادھر لگے اسے کرنے۔ میں پہلے تو ہر قسم کا کام اکٹھا کرتا جاتا ہوں اور جب سمجھ لیتا ہوں کہ کاموں کی اچھی خاصی مقدار جمع ہو گئی ہے تو پھر ان کی کھتونی شروع کرتا ہوں بڑے کام، اوسط کام، چھوٹے کام اس کے بعد اوسط کاموں کو چھوٹے کاموں سے ٹکراتا ہوں۔ اس میں سارے چھوٹے کام پاش پاش ہو کر ختم ہو جاتے ہیں اور اوسط کام بھی اچھی خاصی تعداد میں مجروح ہو جاتے ہیں، اب اوسط کو بڑے کاموں سے ٹکراتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ سارے اوسط کام، آ جاتے ہیں اور بڑوں میں بھی مقتولین و مجروحین کی تعداد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جو جانچ پڑتال کی جاتی ہے، تو صرف بعض سخت جان باقی ملتے ہیں۔ ان کو اپنی سہل انکاری، حیلہ پروازی، ناکسی و نااہلی اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی زد میں جن کا اعلان نامناسب ہے، ملاتا ہوں۔ نتیجہ اکثر خاطر خواہ نکلتا ہے۔ میرا کچھ نہیں بگڑتا لیکن کاموں کا مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ قرض کے معاملہ میں بھی یہی اصول بعض جزئی ترمیم کے ساتھ کام میں لاتا ہوں۔ لیکن میں کم سے کم یہاں خواہ مخواہ غیر متعلق مسائل چھیڑنا نہیں چاہتا۔

چنانچہ شوکت صاحب کی فرمائش رفتہ رفتہ فہمائش کی حد تک پہنچی اور آزردگی پر ختم ہونے والی ہی تھی کہ میں چونکا تو پانی سر سے گذر چکا، تعطیلیں ختم ہو چکی ہیں اور کچھ لکھنا تو درکنار پڑھنا اور سوچنا بھی ناممکن ہو گیا ہے لیکن ان باتوں کو خاطر میں کون لاتا ہے۔ شوکت صاحب میرے بڑے عزیز دوست سہی، لیکن میرے ہاتھوں ان کی دوستی کا جو حال ہوا ہے، اس سے میں یہ کیسے مان لوں کہ وہ مجھے معاف کر دیں گے اور اب تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں جو کچھ لکھوں گا اسے بھی وہ معاف نہ کریں گے۔

قبل اس کے کہ میں کچھ عرض کروں ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے جس کا اظہار کر دینا میں ضروری سمجھتا ہوں اوّل تو یہ کہ میرے اکثر دوستوں بزرگوں اور عزیزوں نے میرے ساتھ تصویریں کھنچوائیں لیکن خود مجھے وہ تصویریں کبھی دیکھنے کو

، نہ ملیں۔ میں نے اس واقعے کی تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ یا تو میری تصویر اچھی نہیں آئی تھی یا میں نے اپنی شرکت سے اپنے آس پاس والوں کی تصویر خراب کر دی تھی۔ اس لیے اس گروپ ہی کو گول کر دیا گیا۔ اسی طرح دوستوں بزرگوں اور عزیزوں نے اپنے مجموعہ ہائے نثر و نظم پر مقدمے بھی مجھ سے خوب خوب لکھوائے۔ لیکن کچھ دنوں بعد جب کتاب چھپ کر آئی تو معلوم ہوا کہ میرا مقدمہ چھپنے سے رہ گیا۔ دریافت حال پر معلوم ہوا کہ بعض مصالح کی بنا پر مقدمہ کا شائع کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ اس مضمون کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ بایں ہمہ لکھنا تو پڑ ہی رہا ہے، انجام کچھ بھی ہو۔

شوکت صاحب کے مضامین کم و بیش سات مجموعے شائع اور مقبول عام ہو چکے ہیں "موجِ تبسم" "بحرِ تبسم" "سیلابِ تبسم" "طوفانِ تبسم" ہاں ایک بات اور یاد آئی۔ شوکت صاحب نے یہ بھی فرمائش کی تھی کہ اس مجموعہ کا کوئی نام بھی تجویز کر دو۔ اتفاق سے اسی زمانے میں میرا گذر چاندنی چوک دہلی میں ہوا ایک جگہ سائن بورڈ پر نظر پڑی "چپّل ہی چپّل"، اچھل پڑا۔ چپّل کا لفظ اتنا قریب ہو تو اچھل پڑنے کے محل استعمال پر نظر ثانی کر لینا چاہیے تھا۔ لیکن برسر اولادِ آدم "لاحول ولاقوۃ" میں نے فوراً ہی شوکت صاحب کو لکھا کہ "تبسم ہی تبسم" کیسا رہے گا۔ لیکن شوکت صاحب نے "دنیائے تبسم" ہی موزوں سمجھا میں کیا کرتا اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

"چپّل ہی چپّل" اور "تبسم ہی تبسم" کے بعد اپنا سا منہ لے کر رہ جانے کا محاورہ بھی یہاں کچھ نامناسب ہی معلوم ہوتا ہے، لیکن کیا کیا جائے اب تو یہ چیز بندھ ہی گئی۔ آخر ہمارے اردو شعرا بھی تو ایسے مواقع پر یہی کرتے آئے ہیں، ان لوگوں نے کیا کر لیا۔

میرا خیال ہے کہ ناموں کے انتخاب میں شوکت صاحب نے اپنی فطری کسر نفسی سے کام لیا ہے، ان کے رنگ کی ترجمانی تبسم سے نہیں ہوتی اور ممکن ہے یہی سبب ہو کہ انھوں نے غیر شعوری طور پر "تبسم" کے ساتھ "سیلاب" اور "طوفان" کی ترکیبیں روا رکھیں، حالانکہ مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تبسم کا سیلاب طوفان بالکل متضاد نہ سہی، خلافِ آہنگ ضرور ہے اتنا لکھنے کے بعد مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ میں بعض باتیں قبل از وقت کہنے لگا ہوں اس لیے اسے میں فی الحال یہاں ختم کر دیتا ہوں اور دو چار دوسری باتیں عرض کرتا ہوں۔

میں عرض یہ کرنا چاہتا تھا کہ طنز و ظرافت کی ابتداً ایک طرح کی شب و شتم یا پھکڑ اور پھبتی سے ہوئی ہے، ابتدائی چھینٹے روم اور یونان کی رسوم و عبادات کی تاریخ کے اولین اوراق میں جہاں تہاں ملتے ہیں۔ لیکن مشکل اور مصیبت یہ ہے کہ ہمارے شاعر اور ادیب آج بھی طنز و ظرافت میں تاریخ کے انھیں ابتدائی اوراق سے سبق لیتے ہیں۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ ہمارا تمدن ترقی کرتے کرتے وہیں پہنچ گیا؟ جہاں اس کی ابتدا ہوئی تھی۔ لیکن یہاں میں تاریخی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ ہم اس حقیقت کو سمجھتے ہیں لیکن اس پر عمل کرنا نہیں چاہتے اور شاید عمل کر بھی نہیں سکتے۔ کہ ظرافت نگاری کا مقصود بالذات صرف ہنسانا ہی نہیں ہوتا بھی نہیں بعض مسخرے تو ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو ہنسانے سے پہلے خود قہقہے لگانے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں سننے والے کو رونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ یا پھر کوئی ایسا منچلا بھی نکل آتا ہے جو اس قسم کی حرکت پر ہنسانے والے کو زد و کوب کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے، اس میں شک نہیں کہ

بعض ظرافت نگار ہم میں ایسے بھی موجود ہیں جو تلخ یا گہری بات کو ہنسی ہنسی میں بنا دیتے ہیں اور سُننے یا پڑھنے والے کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اس نے کیا سنا اور کیونکر متاثر ہوا اس قسم کے کہنے والے بالعموم طنزیات سے لگاؤ رکھتے ہیں جس کے اُردو شاعری میں اکبر مرحوم امام تھے، جن کے بارے میں اقبال نے آخری بات کہہ دی ہے۔

گہے گریۂ او چو ابرِ بہارے
گہے خندۂ او چو تیغِ اصیلے

ہر قوم اپنے تمدنی عروج کے اعتبار سے مختلف مدارج پر فائز ہوتی ہے اور ایسا کبھی نہیں دیکھا گیا ہے۔ الّا خال خال کہ ایک اعتبار سے وہ نہایت درجہ متمدن ہو اور دوسرے اعتبار سے غیر متمدن، یہ ستم ظریفی بھی ہم ہندوستانیوں ہی کے حصّہ میں آئی ہے، شخصی اور جماعتی اعتبار سے ہماری قوم خاصی متمدن قوم ہے۔ لیکن شعر و ادب کی وادی میں پہنچ کر ہم اکثر گمراہ ورنہ واماندہ راہ ہو گئے ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارا شعر و ادب ابھی پورے طور پر مکمل نہیں ہوا ہے طنز و ظرافت کا فن نہایت مشکل ہے، نہایت خطرناک بھی، معمولی یا گھٹیا ظرافت ایسا حربہ ہے جس سے اس شخص کو کم نقصان پہنچتا ہے جس پر حملہ کیا جائے بلکہ اس کی سب سے کاری ضرب خود اس شخص پر پڑتی ہے جو اس حربہ سے حملہ آور ہوتا ہے۔ سب سے کاری اور سب سے مکمل وہ طنز یا ظرافت ہوتی ہے جو غیر شعوری طور پر برسرِ کار آ جائے اور یہ تمیز کرنا دشوار ہو جائے کہ مقصود طنز یا ظرافت تھی یا تلقینِ حقیقت، یہ بات بڑی دیر میں آتی ہے اور بہت کم لوگوں کے حصّہ میں آتی ہے۔ لیکن بجائے تو یہ بات جتنی مشکل ہے اتنی ہی دلکش ہے اور اس فن کی شاید یہ آخری منزل ہے۔ اس کی مثال اُردو میں قاضی عبدالغفار کے ہاں ملتی ہے۔ ان کے لیلیٰ کے خطوط میں تھوڑی بہت۔ نقشِ فرنگ میں بدرجۂ اتم اور مجنوں کی ڈائری میں بالکل نہیں۔

طنزیین میں بھی کئی گروہ ہیں اور ان کے مسالک بھی جداگانہ ہیں۔ بعض میں جوش و ہیجان و طغیانی ہے بعض میں تلخی و زہر ناکی۔ بعض میں شگفتگی و دلربائی۔ ادبیاتِ قدیم میں ان کے علمبردار ہورکیس، جووَنل اور پرسی اس تھے۔ ہمارے شعر و ادب میں ابوالکلام، عبدالماجد اور اکبر مرحوم ہیں۔ اس موضوع پر بالتفصیل میں نے علیحدہ بحث کی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ شوکت صاحب کی دنیائے تبسم کو اس قسم کی بحث سے گرانبار کروں۔

شوکت صاحب کو ممکن ہے یاد ہو کہ میں نے ایک بار ان سے عرض کیا تھا اور غالباً یہ وہ زمانہ تھا جب میں میڈیکل کالج لکھنؤ میں صاحبِ فراش تھا اور شوکت صاحب مجھے اکثر دیکھنے آیا کرتے تھے۔ ان کی مہربانی و مروّت میرے دل میں اب تک تازہ ہے۔ میں نے کہا تھا کہ شوکت صاحب آپ نے تحریر کا جو انداز اختیار کیا ہے اس کے بارے میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ روزمرّہ کی دُنیا میں جو چاہے دیکھیے، سُنیے، لیکن کہتے وقت اس دُنیا میں چلے جایا کیجیے جو تماشا اور تماشائی دونوں سے الگ ہو اور تنہا ہو۔ حالات و حوادث آپس میں اور دوسری چیزوں سے بھی اتنے ملے جلے یا گڈمڈ ہوتے ہیں کہ ان کو جوں کا توں بیان کر دینے سے نہ تو وہ اپنے اصلی خد و خال میں نمایاں ہوتے ہیں اور نہ ان میں کوئی لطافت یا جاذبیت ہوتی ہے سُننے یا پڑھنے والے اسی وقت مسرور یا متاثر ہوتے ہیں جب آپ ان کو حالات اور واقعات کی سیر اس طور پر کرائیں کہ وہ ہر چیز کو اس کے اصلی رنگ و آہنگ

میں دیکھ یا سُن سکیں، مثلاً راگ یا رنگ کو لے لیجئے، میں سمجھتا ہوں کہ راگ یا رنگ سے اس طور پر متاثر ہونا کہ کون گا رہا ہے یا کونسا پھل ہے، راگ رنگ کی ناقص تعبیر ہے۔ اصل چیز راگ رنگ ہے نہ کہ ان کے بعض سطحی مظاہر وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ باتیں شوکت صاحب کو بھائیں گی نہیں۔ وہ کہیں گے کہ یہ فلسفہ کی بد توفیقی ہے یا تصوّف کی فریب کاری میں بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ نوجوانوں سے اس قسم کی باتیں نہ کرنی چاہئیں۔ لیکن اس سے غالباً شوکت صاحب بھی اتفاق کریں گے، کہ فن جنسی یا عمر کی گراں باری سے آزاد ہوتا ہے اور اس کو آزاد رہنا چاہیئے۔ فن کی نہ کوئی جنسی ہے اور نہ عمر اور یہی سبب ہے کہ اس کے تنوعات کے مظاہر بے پایاں ہیں اور وہ فن کار کی انتہائی استعداد اور اس کی بلند یا نازک ترین پروازِ تخیل سے ہمعنان اور ہمکنار رہتا ہے۔ وہ صرف کائنات ہے، زمان و مکان سے ماورا، سب سے زیادہ برتر، سب سے محیط لیکن یہ بات بھی کچھ یونہی سی رہی۔ یعنی وہی فلسفہ اور تصوف والی جس سے میں شوکت صاحب کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

خیر اسے جانے ہی دیجئے۔ جہاں من شدی من تو شدم، کا گذر نہ ہو وہاں تُو تُو مَیں مَیں ہی سہی۔ شوکت صاحب گھریلو ظرافت کے بڑے دلدادہ ہیں، اس کے ماہر بھی۔ یہاں گھریلو سے مراد سطحی یا ادنیٰ قسم کی باتوں سے نہیں ہے گھریلو سے میری مراد خانگی زندگی سے ہے۔ شوکت صاحب اپنے قریبی رشتہ دار مثلاً بیوی بچے۔ بھائی بھاوج یا پھر بعض بے تکلف روز کے ملنے والے دوستوں اور ساتھیوں پر بہت جری ہیں ان کی خوب خوب خبر لی ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس وادی میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس معاملہ میں شوکت صاحب کے حریف چغتائی اور ملاّ رموزی بھی ہیں یہ بات اچھی بھی ہے اور بُری بھی اور بڑھ جانے پر بہت ہی بُری جس کا نمونہ ملاّ رموزی ہیں۔ ان کی ہر قسم کی ظرافت یا اس قسم کی تحریر پروپیگنڈے سے ملوث ہو کر کچھ سے کچھ ہو گئی ہیں۔

میں نے ابھی ابھی کہیں ذکر کیا تھا کہ ظرافت اور طنز کو کائناتی پس منظر میں رکھنا بہت ضروری ہے چہ جائیکہ پس منظر ذاتی حالات و حوادث کی زد میں آجائے۔ ملاّ رموزی جن حالات و حوادث کو اپنی طنز و ظرافت کا ہدف بناتے ہیں کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہدفِ ملامت محض اس لیے بنائے گئے ہیں کہ خود ملاّ رموزی ان میں مبتلا ہیں ورنہ وہ حالات و حوادث کبھی اس قابل نہ تھے کہ ان کے خلاف طنز و ظرافت کا حربہ استعمال کیا جاتا۔ وہ غربت فلاکت ناکسی و کس مپرسی وغیرہ وغیرہ کے اس لیے شاکی ہیں کہ وہ خود ان میں مبتلا ہیں ورنہ ان کے عقیدے میں یہ باتیں ایسی نہیں ہیں کہ ان کو ہدفِ ملامت بنایا جائے اس قسم کی کمزوریوں کا شمار طنز و ظرافت کی شریعت میں کبائر میں ہوتا ہے۔ جو شخص اپنی درمانہ کی حرمت نہ قائم رکھ سکے اس کو طنز و ظرافت کی وادی میں قدم نہ رکھنا چاہیئے۔ شوکت صاحب کو سوجھتی بہت اچھی ہے لیکن سوجھنے اور سمجھانے میں فرق ہے۔ ممکن ہے کسی کو سوجھتی اچھی ہو لیکن سوجھانے میں وہ قطعاً ناکامیاب ہے۔ سودیشی ریل گاڑی میں شوکت صاحب نے سوجھنے سوجھانے دونوں میں کمال کر دیا اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ شوکت صاحب کی سودیشی ریل گاڑی نے انھیں جس منزل اور منزلت پر پہنچا دیا ہے اس پر بڑے بڑوں کی بھی نظر رشک سے پڑے گی۔ "کانگریس" کا بھی یہی درجہ ہے، ہماری زندگی، ہمارے تمدن، ہمارے سیاسی رجحانات، ہمارا عزم و عمل، لکھنؤ کی فضا، ہندوستان کی ذہنیت کا ایسا بدیع نقشہ

کھینچا ہے کہ شوکت صاحب کا سخت سے سخت ناقد بھی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شوکت صاحب کی زبان اچھی ہے اور بیان بہت اچھا۔ اس موقع پر بعض لوگ کوثر و تسنیم کا لفظ استعمال کئے بغیر نہ رہتے لیکن محض اس ڈر سے کہ آجکل ہماری انشاپردازی پر سب سے بڑا جرم یہ لگایا جاتا ہے کہ ہم عرب و فارس و ترکستان وغیرہ سے لائے ہوئے تشبیہہ و استعاروں کے بڑے دلدادہ ہیں میں کوثر و تسنیم کے الفاظ سے ہاتھ دھوتا ہوں اور اپنے دوستوں کی خاطر یہ کہوں گا کہ شوکت صاحب کی زبان و بیان میں وہی لطف ہے جو لکھنؤ کی بالائی اور کھٹیوں میں ہے!

شوکت صاحب نے لکھنؤ کی زبان میں پورب کے بعض خاص الفاظ اور لہجے بڑے لطف و لطافت سے سموئے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے فقرے شعر و ادب کا مزا دے جاتے ہیں۔ ان کے مضامین میں لکھنؤ کے تمدّن اور وہاں کی روزانہ زندگی کے بعض بڑے مزے دار نمونے ملتے ہیں ایسے نمونے جو کسی اور تھانوی کو بمشکل نصیب ہو سکتے ہیں، بے موقع نہ ہوگا اگر ان میں سے بعض بعض کا تذکرہ یہاں کر دیا جائے مثلاً:

۱ - کانگریس کی صدارت لکھنؤ کے ایک نواب صاحب کر رہے ہیں۔ بہت کچھ تکلّف و تعظیم کے بعد جناب صدر صاحب خطبۂ صدارت پڑھنے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔ شوکت صاحب فرماتے ہیں۔

"آپ نے سب سے پہلے تو اپنا بٹیرا اپنے خدمت گار کو دیا!"

۲ - ایک مقام پر تکیہ کا غلاف بنانے کا مسئلہ درپیش ہے۔ بھائی اور بھاوج میں حجّت ہو رہی ہے شوکت صاحب فرماتے ہیں: "یہی غلاف باعث موازنہ انیس و دبیر بن جاتا۔"

۳ - لکھنؤ اور لاہور کے موازنہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں "ہم کو طائرانہ نظر سے مقابلہ کرنے کے لیے پہلے عمارتوں پر منڈلانا چاہیئے اس کے بعد شہر کی گلی کوچوں پر اُڑنا چاہیئے، پھر دونوں شہروں کے باشندوں کی ترکیب نحوی کرنا چاہیئے اور آخر میں دونوں کی عام حالت لکھ کر یہ کہہ دینا چاہیئے کہ یہ بھی جیتے اور وہ بھی جیتے، جیسے ان دونوں کے دن پھرے خدا سب کے پھیرے۔"

۴ - ایک ڈاکٹر کی خستہ حال موٹر کا خاکہ کھینچا ہے: "وہ موٹر ضرور تھا اور اگر اس میں پٹرول ڈال دیا جاتا تھا تو چلتا بھی تھا، یہ اور بات ہے کہ آواز و رفتار کے اعتبار سے وہ کسی لاری اور چھکڑے کی سول میرج کی زندہ یادگار نظر آتا تھا۔" انہیں ڈاکٹر صاحب اور مالک مکان کا تذکرہ کرتے ہوئے جس کے مکان میں ڈاکٹر صاحب کرایہ ادا کرکے رہتے تھے۔ مالک مکان کے باب میں لکھتے ہیں "مکان دار نے کچھ نامناسب طریقہ پر دروازہ پر کچھ غیر طبی کلمات کہے۔"

۵ - ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیوی کے درمیان گفتگو ہوتی ہے۔ بیوی سمجھتی تھیں کہ ڈاکٹری میں بڑی آمدنی ہوتی ہے انہوں نے اپنے اس خیال کا ثبوت یہ دیا کہ ڈاکٹر آخر دن رات موٹر میں کہاں کہاں پھرا کرتے ہیں۔ شوکت صاحب (یا ڈاکٹر صاحب) جواب دیتے ہیں، یہ لوگ فضول بھی اپنے موٹر کو ادھر اُدھر دوڑاتے رہتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ ڈاکٹری چل رہی ہے حالانکہ محض موٹر چلتا ہے۔"

۶ - ایک مقام پر ڈاکٹر صاحب بہت زچ ہوئے ہیں۔ شوکت صاحب نے ان کا یہ رخ یوں پیش کیا ہے: "ڈاکٹر صاحب نے اپنے

چہرہ پر خطرہ کی زنجیر لٹکاتے ہوئے کہا!"

یہ چند مثالیں میں نے جہاں تہاں سے اخذ کر لی ہیں ورنہ دنیائے تبسم میں ان کے جگہ جگہ ایسے دلچسپ اور بقول بعض مشاعرہ والوں کے "بھرپور" مصرعے کافی تعداد میں ملتے ہیں۔

ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ ایک رات میں شوکت صاحب کی وہ تقریر سُن رہا تھا جو انھوں نے ایک افیونی کے جنت کے تخیل پر کی تھی۔ ایک افیونی اپنے کسی مرحوم دوست سے جنت میں ملتا ہے اور جنت کے تمام لطائف و ظرائف کو مزے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ جہاں تک ریڈیو کا تعلق ہے ان کی تقریر یقیناً کامیاب تھی اور غالباً یہ بہانہ یا مجبوری بجائے خود ایک ایسی چیز ہے جس کو مدِّ نظر رکھ کر اس تقریر پر فنی رائے زنی بے سود اور بے محل دونوں ہے لیکن شوکت صاحب میرے چھوٹے ہیں۔ فنی پیشہ یا رتبے کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس اصول کے ماتحت جو مشرق میں خوردوں بزرگوں کے باہمی تعلقات پر حاوی ہوتا ہے۔ اس تقریر کے بارہ میں شوکت صاحب سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ صاحبِ فن اس مبحث پر ایک دوسری نوعیت سے اظہارِ خیال کرتا۔ افیونی کو ممکن ہے بہشت میں گنّے، دودھ، فیرینی، سوہن حلوا ہی نظر آتا ہو یا ملتا ہو لیکن افیونی اور افیونی کے وکیل کے نقطۂ نظر میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ جنت میں واقعات سے نہیں نقطۂ نظر سے بحث کرنا چاہیئے افیونی کی مرغوب خاطر نعمتیں اور چیز ہے اور افیونی کی شریعت دوسری چیز ہے۔ یہ بحث بڑی طویل ہے بصیرت افروز اور دلچسپ بھی لیکن یہاں اس کا موقع نہیں ہے ورنہ اس

دُر دیک ساغر ہے چہ دُنیا و چہ دیں

پھر کیا کچھ نہیں جا سکتا

ہاں شوکت صاحب ایک بات اور سُن لیجئے اور گو یہ کان میں کہنے کی ہے لیکن خیر کوئی حرج نہیں گوش ہم دیوار دارد! ہماری یہ کائنات ظرافت کی تاریخ کا اوّلین اور سب سے اہم باب ہے ملائک کی تخلیق سے جب یہ ـــ ؟ (بھول بھلیاں) فرسودہ اور بے مزہ ہونے لگی تو مشیتِ الٰہی نے اس میں طنز کا عنصر بھی شامل کر دیا اور اُس بزرگ کو عالمِ وجود میں لایا گیا جن کو ہمارے بزرگ شیطان کہتے ہیں۔ چنانچہ بقول امیر مینائی مرحوم جن کا پورا شعر مجھے یاد تو ہے لیکن ممکن ہے موزوں یاد نہ ہو اور میں نے بعض بڑی جان جوکھوں قسم کے استادوں کو بھی اسے ایسا ہی پڑھتے ہوئے سنا ہے جیسے کہ یہ شعر ناموزوں ہی موزوں ہو گیا تھا۔ پانی کی چند بوندیں جو کبھی انگور میں تھیں کھنچیں تو تلوار بن گئیں اور ظرافت ستم ظریفی میں تبدیل ہو گئی نتیجہ یہ ہُوا کہ اب ہماری کائنات وہ چیز بن گئی ہے جس پر میں آسانی سے اظہارِ خیال کر سکتا ہوں۔ لیکن مجھے ڈر ہے آپ اسی آسانی کے ساتھ اسے شائع نہ کر سکیں گے۔ اس لیے میں اس بحث کو یہیں ختم کر دینا چاہتا ہوں لیکن مجھے امید ہے اس کی بصیرتوں سے آپ کبھی نہ کبھی ضرور فیضیاب ہوں گے۔

اچھا شوکت صاحب خدا حافظ، میری دُعا ہے کہ آپ پر وہ مصیبت نازل نہ ہو جس نے اکبرؔ جیسے بے پناہ کو بھی بدحواس کر دیا تھا۔ ہر روز ایک نیا لطیفہ دریافت کرنا ممکن ہے آپکے نزدیک اتنا دشوار نہ ہو جتنا میں سمجھتا ہوں لیکن احتیاط شرط ہے۔ دنیائے تبسم میں سرپنچ کے ایڈیٹر کو کہاں جگہ ملے گی مجھے نہیں معلوم۔ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ چیسٹرٹن بھی اسی وادیٔ پرخار سے گزرے تھے ان کے دامن سے تو کانٹوں ہی کو گزند پہنچا۔ خدا کرے آپکے دامن کو کانٹے گزند نہ پہنچائیں۔

(۵)

نیاز فتحپوری

دنیا مصائب و آلام کی جگہ ہے یا لطف و مسرت کی، اس کا فیصلہ آج تک نہ ہو سکا، جو لوگ حور و قصور، کوثر و سلسبیل کے قائل ہیں وہ دنیا کو دارالمحن کہہ کر آخرت کی اُمید پر ہر تکلیف کو جھیل رہے ہیں اور اس کے دُور کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتے کہ مبادا یہاں کا ذرا سا آرام وہاں کے لذائذ میں کمی کر دے، جو زندگی کو صرف اسی دُنیا کی چیز سمجھتے ہیں وہ یہاں کے ہر ہر لمحہ کو "شاہد و شعر ست و شراب و شکر" میں بسر کر دینا چاہتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے اگر جنت کے وجود کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو کیا۔

نظر بازی و ذوق دیدار کو   بہ فردوس روزن بدیوار کو
کجا زہرۂ صبح و جام بلور   صبوحی خورم گہ شراب طہور

ایک زاہد شب زندہ دار کہتا ہے کہ اگر واقعی مرنے کے بعد حیات بعد الممات اور حور و قصور کا وجود ثابت ہوا، تو پھر دُنیا میں گناہ کرنے والے کیا کریں گے، ایک رند مے خوار بھی یہی کہتا ہے کہ اگر یہ سب کسی کا "وعدۂ فردا" نکلا تو پھر بتائیے "دادِ زندگی" کس نے دی اور کون خسارہ میں رہا، بہرحال یہ جھگڑا نہ کبھی طے ہوا نہ آئندہ طے ہوگا، مرنے کے بعد خدا ہی کو معلوم ہے کہ کیا ہوگا، اور کیا نہیں، اس لیے میرے نزدیک اس سے زیادہ حماقت کوئی نہیں کہ "شے حاصل" اور "امید موہوم" میں کوئی فرق نہ کیا جائے اور موجودہ زندگی کو صرف اس لیے رو رو کر گزار دیا جائے کہ کہیں اور جا کر ہنسنا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ "خوش باش دمے" کیا چیز ہے؟ وہ لوگ جو اپنی تمام تمناؤں کو پورا ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، جن کے یہاں کسی ارادہ کا پیدا ہو جانا اس کی تکمیل کا مترادف ہے، ان کے یہاں حقیقی لطف و مسرت کا وجود کبھی نہیں پایا جا سکتا ان کے لیے تو پہلے ضرورت اس کی ہے کہ

خارم کن و در رہ گزر چارہ گرم ریز

اس لیے نشاط کا مفہوم حقیقتاً الم سے پیدا ہوتا ہے اور اس شخص کو ہم مسرت کا جستجو کرنے والا پائیں گے جس کو یہ چیز حاصل نہیں ہے یا ہاتھ سے کھو چکا ہے، غالباً یہی وہ فلسفہ ہے جس کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ "وہ شخص جو تمھیں ہنساتا ہے بسا اوقات تم سے زیادہ مغموم ہوتا ہے۔" ہر چند یہ کلیہ نہیں قرار دیا جا سکتا لیکن اس میں کلام نہیں کہ اگر کوئی شخص ایسا ہے

جس کا دل غم سے معمور ہے اور چہرہ متبسم ہے تو اس سے ڈرنا چاہیئے کیونکہ یہ فطرت کا زہر خند ہے اور دنیا میں اس سے زیادہ سخت مہلک ٹریجڈی اور کوئی نہیں ہوتی، چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ دنیا کی بعض ہستیاں جو صرف ہنسنے اور ہنسانے ہی میں بسر ہو جاتی ہیں فی الواقع حد درجہ ملال و غمگین ہوتی ہیں۔ دنیا انھیں دیکھ کر ہنستی ہے، ان کی باتوں سے لطف و مسرت حاصل کرتی ہے، لیکن وہ ہیں کہ اندر ہی اندر غم سے گھلی جا رہی ہیں مثلاً چارلی چپلین کو دیکھیے کہ کون ہے جو اس کے حرکات پہ ہنسی سے بیتاب نہیں ہو جاتا، لیکن خود اس نے جو اپنے حالات لکھے ہیں وہ رُلا دینے کی حد تک دردناک ہیں۔

جب مجھ سے جناب شوکت تھانوی کے مجموعۂ مضامین (بحرِ تبسم) پر اظہار رائے کی خواہش کی گئی اور میں اس خیال کو لے کر میز پر آیا تو سب سے پہلے یہی جستجو مجھ میں پیدا ہوئی کہ آیا شوکت صاحب کی مزاحیہ نگاری صرف اس لیے ہے کہ واقعی وہ رنج و الم سے بالکل بیگانہ ہیں یا یہ کہ وہ اپنے ہمدم کو اس پردے میں چھپانا چاہتے ہیں، کہا جاتا ہے ایک نقاد کے لیے یہ بھی کم ضروری نہیں کہ وہ صاحب تصنیف کے اندرونی حالات سے واقف ہو، میں ہمیشہ اس قول کی حقیقت کو تسلیم کرتا ہوں، جب مجھے کسی واقف و شناسا کی تصنیف پر بحث کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ بحرِ تبسم پہ رائے زنی کرتے ہوئے بھی میری توجہ اس طرف منعطف ہوئی اور تصنیف سے قبل مصنّف کی صورت اور اس کے حالات میرے سامنے آئے۔

جہاں تک ظاہری خد و خال (خط و خال نہیں) کا تعلق ہے اس پر ایک حد تک ان کی تصویر سے روشنی پڑتی ہے جو اس مجموعہ کے ساتھ شامل ہے۔ لیکن جنھوں نے شوکت صاحب کو مختلف حالتوں میں نہیں دیکھا وہ کیا سمجھ سکتے ہیں کہ جب شوکت صاحب صرف تصویر کھنچوانے کے لیے بیٹھتے ہیں تو ان کے چہرہ میں کتنی غیر حقیقی و مصنوعی سنجیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو یقیناً “دلربائی” کا کام تو دے سکتی ہیں لیکن “دلکشائی” سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔

شوکت صاحب ایک جوان العمر ادیب ہیں، نوجوان میں اس لیے نہیں کہتا کہ ان کی شادی بھی ہو چکی ہے اور وہ ایک بچہ کے باپ بھی ہیں نوجوانی کے مفہوم میں جو اچھوتا پن پایا جاتا ہے وہ ان کے حالات پر منطبق نہیں ہوتا، اور بعض ایسی خصوصیات کے بھی مالک ہیں جن کے متعلق یہ فیصلہ دشوار ہے کہ آیا وہ مرد کے لیے زیادہ موزوں ہیں یا عورت کے لیے بہرحال فی الجملہ ان کی دلکشی سے انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ کیفیات صرف اسی وقت تک مؤثر ہوتی ہیں جب تک شوکت صاحب اپنے آپ کو نوجوان سمجھ کر کافی طور پر بنے رہتے ہیں، ورنہ اس کے بعد مختلف اوقات میں جو بے ساختہ کیفیات ان کے چہرے سے ظاہر ہوتی ہیں وہ البتہ ایسی حقیقتیں ہیں جن کا علم ان کے مجموعہ پر تنقید کرنے والے کے لیے ضروری ہے، افسوس کہ تفصیل سے کام لینے کے لیے اوراق مقدمہ بہت تنگ نظر آتے ہیں ورنہ شاید میں اپنی معلومات کو زیادہ بسط کے ساتھ بیان کرتا۔ تاہم اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے کہ شوکت صاحب ہمیشہ وہ نہیں رہتے جو اپنے مضامین میں نظر آتے ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں کہ “حقیقی شوکت صاحب” شاید وہی ہیں جب وہ خستہ و پریشان اپنے دفتر سے دوپہر کی گرمی میں گھبرائے ہوئے نسیم صاحب کی جستجو میں آتے ہیں اور یہ حضرت جو “با ما شراب خوردہ و بزاہد نماز کردہ” کی بہترین تفسیر ہیں یا تو ...... صاحب کے حجرہ میں ہوتے ہیں یا انعامی بسکٹ فیکٹری کی دکان پر۔ اس وقت شوکت صاحب کے نتھنوں کی کیفیت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، مدعا یہ ہے کہ شوکت صاحب کو غصہ بھی آتا

ہے اور بہت کافی، وہ زود رنج بھی ہیں اور خطرناک حد تک، وہ افکار و آلام سے بھی مغلوب ہو جاتے ہیں اور پوری شدت کے ساتھ ——— اس لیے میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں، کہ ان کی مزاحیہ نگاری ہمیشہ ایک پھول کی شگفتگی ہے اور اس سے "انشراحِ زخم" کا پتہ نہیں چلایا جا سکتا۔ بات میں بات بڑھتی جا رہی ہے حکایت لذیذ نہیں لیکن دراز تر ہوتی جا رہی ہے مجھے اظہار رائے کرنا تھا اس مجموعے کے متعلق، اور گفتگو شروع ہو گئی نفسیاتِ مزاح نگاری پر، شوکت صاحب کی ذاتی خصوصیات پر، بہر حال میں اس کو یہیں قطع کر کے بتا دینا چاہتا ہوں کہ جس حد تک ایک مصنف کی خصوصیات کا اس کی تصنیف سے تعلق ہوتا ہے، اس مجموعہ میں اس کی کافی جھلک پائی جاتی ہے مگر میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اس کے ہر مضمون میں وہ اپنے کو یا اپنی فطری کیفیات کو تکمیل کے ساتھ نمایاں کر سکے ہیں۔

شوکت فطرت کی طرف سے اس قسم کی حس لے کر آئے ہیں جو ہر چیز کا شیریں حصہ حاصل کر کے تلخ حصہ کو دوسروں کے لیے چھوڑ دینا پسند کرتی ہے اور اس لیے قدرتاً ان میں ایک لطیف قسم کی بے اعتنائی یا بے رحمی پیدا ہو جانا چاہیے چنانچہ آپ اس مجموعہ میں بعض مضامین ایسے پائیں گے جس میں یہ پُر لطف ایذا کوشی پورے طور پر نمایاں ہے۔

شوکت، ایک فطری ادیب و شاعر کی طرح جزئیات کے مطالعے کے بہت شائق ہیں، اور ان کے اظہار پر بھی قدرت رکھتے ہیں، لیکن کھلنڈرے پن کے ساتھ اور یہی وہ چیز ہے جس نے انھیں "مزاح نگار" بنا دیا ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو انھیں ملک کے دوسرے مزاح نگاروں سے جدا کرتی ہے۔ اس رنگ کے لکھنے والوں میں اس وقت، پطرس، رموزی رشید اور عظیم چغتائی بہت مشہور ہیں۔ لیکن جس طرح ان میں سے ہر ایک دوسرے سے ممیز ہے اسی طرح شوکت ان سب سے علیحدہ ہیں، چغتائی صاحب کی مزاح نگاری، اکثر و بیشتر منحصر ہوتی ہے پلاٹ یا واقعات پر یعنی وہ حالات ایسے پیش کرتے ہیں جو مشاہدے کے بعد یوں بھی ہر شخص کو ہنسا سکتے ہیں۔ رموزی کی مزاح نگاری منحصر ہے اس امر پر کہ وہ الفاظ یا فقروں کا استعمال ان کے عام متبادر معنی سے ہٹ کر کرتے ہیں، رشید صاحب کی مزاح نگاری دورِ اولین فلسفیانہ مزاح نگاری کا بہترین نمونہ تھا۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ان کا دماغ زیادہ تھک گیا ہے۔ اور وہ غور و تامل کی کلفت میں نہ خود مبتلا ہونا چاہتے ہیں نہ کسی اور کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں، تاہم کوئی نہ کوئی سنجیدہ نتیجہ ان کی تحریر سے ضرور پیدا ہوتا ہے۔ پطرس کی مزاح نگاری بڑی حد تک مغربی رنگ کی ہے جس میں واقعہ و اندازِ بیان دونوں سے مضحک کیفیات پیدا کی جاتی ہیں، لیکن نتیجہ کے لحاظ سے ہمارے لیے یہ کہنا دشوار ہو جاتا ہے کہ اس میں واقعی کسی تلخ حقیقت (G.R I M REALITY) کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ حالانکہ ایک مزاح نگار کا حقیقی کمال یہی ہے۔ شوکت کی مزاح نگاری بھی اس خصوصیت سے معرا ہے اور وہ بھی سطحی طور پر اپنے موضوع سے گزرنا چاہتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ان کے یہاں زبان کا لطف، مشاہدۂ جزئیات اور لطافتِ خیال یہ سب اس قدر خوبی کے ساتھ ملے ہوئے نظر آتے ہیں کہ وہ اپنی فضا خاص پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کی مزاح نگاری ہوا کا وہ ہلکا جھونکا ہے جو پانی کی سطح پر ننھی ننھی موجوں کا جال بچھا کر قلب و نگاہ کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور پھر سطح کو ساکن چھوڑ کر گزر جاتا ہے ان کے یہاں کبھی کوئی ایسی طوفانی ہوا نہیں پائی جاتی جو پانی کو تہ و بالا کر کے بھنور پیدا کر دیتی ہے۔ ان کا مقصود ایک غم آلودہ شخص کو ہنسا دینا ہے لیکن وہ غم کو

مسرت سے بدلنا نہیں چاہتے، اگر خود وہ کلفت کے برداشت کرنے کی کتنی ہی اہلیت کیوں نہ رکھتے ہوں لیکن دوسرے کی کلفت کو وہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت بنا کر اپنا لطف حاصل کرنے سے دریغ نہیں کرتے، اس لیے ان کے مزاح میں تھوڑی سی جارحانہ کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے جو کسی حد تک ”غیر پاکبازانہ تنقید کہلائی جا سکتی ہے“۔

میں نے شوکت صاحب کے اکثر مضامین سنجیدہ اور غیر سنجیدہ دونوں قسم کے دیکھے ہیں، اور ہمیشہ میں نے محسوس کیا کہ ان کی صحافی زندگی کا مستقبل شاید ان کی قوتِ نقد کے نشوونما میں پنہاں ہے، یعنی اگر ماحول نے ان کو گمراہ نہ کر دیا، یا یہ کہ وہ اپنی فطرت کے خلاف کسی اور رنگ کی طرف مائل نہ ہو گئے تو ان کو آخر کار ایک بہترین نقاد بننا ہے۔ یعنی وہ حقائق و شواہد کا مطالعہ کرنے میں اپنی ژرف نگاہی کو بڑی حد تک وسیع و عمیق بنا سکتے ہیں لیکن مفروضات پر وہ کسی نظریۂ تنقید یا اصولِ کار کی بنیاد قائم نہیں کر سکتے یا بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ وہ مشاہداتِ مادّی کی بنا پر کسی حقیقی واقعہ پر تنقید تو اچھی طرح کر سکتے ہیں لیکن کسی فساد یا رومان کی دنیا میں وہ اپنے قوائے فکر سے کام لے کر کوئی اختراعی، ابداعی یا تصوری نظریۂ تنقید پیدا نہیں کر سکتے، ہو سکتا ہے کہ یہ نتیجہ ہو اس حقیقت کا کہ ان کے حالاتِ زندگی میں کوئی ناگوار تغیر پیدا ہوا ہو اور وہ اس کے محو کرنے کی فکر میں ایسے مشغلہ کو جاری نہیں رکھ سکتے جو امکاناً اس ناگواری کو بڑھا دینے والا ہے یا یہ کہ فطرتاً وہ ”مکانکی“ قسم کا ذوقِ نشاط لے کر آئے ہیں۔

چونکہ شوکت صاحب ابھی پختہ عمر ادیب نہیں ہیں، اس لیے زمانہ کے ساتھ ساتھ ابھی ان کے رنگ میں بہت کچھ تغیر ہونا یقینی ہے۔ میں یہ پیشین گوئی تو کر نہیں سکتا کہ وہ کسی وقت اس مخصوص رنگ سے بالکل علیحدہ ہو کر کوئی جداگانہ روش اختیار کریں گے، اور اگر انھوں نے کبھی ایسا کیا تو سخت غلطی کریں گے لیکن یہ ضروری ہے کہ یا تو ان کی موجودہ مزاح نگاری کا معیار ”ادنیٰ“ ہو جائے گا یا ”اعلیٰ“ - یہ سطح قائم نہیں رہ سکتی۔ اگر انھوں نے ہر سال ایک مجموعہ شائع کرنے کا ارادہ کیا یا محض فرمائش پوری کرنے یا ہر رسالہ میں نظر آنے کی غرض سے لکھنا شروع کیا تو یقیناً وہ حال کے معیار سے بھی نیچے آ جائیں گے، لیکن اگر انھوں نے اس نکتہ کو سمجھ لیا کہ جس طرح بغیر کسی جذبۂ محبت کے غزل گوئی کوئی معنی نہیں رکھتی اسی طرح مزاح نگاری بھی بے روح ہے اگر وہ واقعی کسی کیفیتِ ابتہاج کا نتیجہ نہیں تو ان کے موجودہ رنگ کا اور زیادہ نکھر جانا یقینی ہے، لیکن میں مشورہ ضرور پیش کروں گا اور وہ یہ کہ جہاں تک ممکن ہو جارحانہ پہلو سے اعتراض کریں اور ضرورت سے زیادہ ”ذاتی چیز“ پیش نہ کریں۔ اس کے ساتھ یہ بھی عرض ہے کہ جب ان کی عمر چالیس سال سے زیادہ متجاوز ہو جائے تو وہ اس رنگ میں کبھی کبھی کچھ چھینٹیں خون کی بھی ملا دیا کریں تو زیادہ مناسب ہے جس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ اپنی نقاشی کے لیے جو بیک گراؤنڈ متعین کریں وہ ”متشائم و حزیں“ ہو، اس سے جو وزن ان کی مزاح نگاری میں پیدا ہو جائے گا، وہ بہت کچھ ہمارے ”سوشل مصالح“ کی چیز بن جائے گا اور بڑی حد تک غیر فانی۔

مزاح و مذاق کا فلسفہ یہ ہے کہ جب اس سلسلے میں کسی خاص شخص کا ذکر کیا جائے تو سچی بات کوئی نہ کہی جائے۔ ورنہ اس کا کسی وقت سنجیدگی میں تبدیل ہو کر ”بات کا بتنگڑ“ بن جانا بعید نہیں۔ نسیم صاحب لاکھ ان کے بے تکلف دوست ہوں لیکن غالباً ان کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ ان کی ”چہرہ نمائی“ میں اس قدر صحت و سچائی سے کام لیتے اور خواہ مخواہ

دوسروں کو یہ رشک کرنے کا موقع دیتے کہ "شوکت صاحب نسیم صاحب سے کیوں اس قدر بے تکلف ہیں"۔ اسی طرح آگرہ کے سفر کا ذکر کرتے ہوئے ساغر صاحب کے متعلق اظہارِ جذبات میں وہ زیادہ بہک گئے ہیں گو اس رشک اور اس "احساسِ لغزش" میں خود میرے جذبات کا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن یہ کہنے کا امکان ضرور ہے کہ

ایں نسبتے بہ من نیست اگر با دگرے ہست

بعض بعض مضامین اس مجموعہ کے حقیقتاً شوکت کے بہت بلند شاہکار ہیں "جس کے لیے کیا سفر"، "بیکاری"، "سودیشی عدالت" وغیرہ۔ ایک مضمون ان کا "مٹھو بیٹے" ایسا ہے جس کو شوکت صاحب کے سوا اور کوئی مزاح نگار یو۔ پی بلکہ لکھنؤ سے باہر کا نہیں لکھ سکتا۔

بہرحال ملک کو شوکت صاحب اور ان سے زیادہ نسیم صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے کہ پے در پے دو مجموعے ایسے دلچسپ مضامین کے ان کی وجہ سے شائع ہو گئے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ ضرور مشورہ دوں گا کہ تیسرا مجموعہ اب دو سال سے پہلے شائع نہ کیا جائے ورنہ "جہانپلزم" پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

"نیاز"

(۶)

نواب جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی

ذہین شخص جو کام کرتا ہے اس میں دلکشی کے ساتھ اپج اور انوکھا پن ہوتا ہے۔ شوکت کے زیر طبع دیوان کا جو حصّہ پیش نظر ہے ان صفات سے مالا مال ہے۔ ان کی طبیعت کا نمایاں رنگ شوخی و ظرافت ہے تاہم غزل کہتے وقت ان کا ہر خیال مجسمۂ متانت و سنجیدگی ہوتا ہے۔ شوکت نے اپنے ذوقِ سلیم کی رہبری میں سمجھ لیا ہے کہ تغزّل کسے کہتے ہیں۔ اس کا معیار کیا ہونا چاہیے اور اس میں دل آویزی کیونکر پیدا ہوتی ہے۔ ان کے تخیّل اور اسلوبِ ادا دونوں میں تازگی و ندرت پائی جاتی ہے۔ گفتگو منتخب حصّۂ کلام سے ہے ورنہ ؏

"شعر اگر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست"

عشق کو لے لیجئے۔ ان کے نزدیک معشوق سے طالبِ دیدار ہونا بھی ہوس ہے اور ایسی ہوسناکی کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان محویتِ خیال کی لذّت سے محروم ہو جاتا ہے ؎

ہوس جس کو سکھا دے طالبِ دیدار ہو جانا
اسے کیا آئے گا محوِ خیالِ یار ہو جانا

بزم شراب میں "شور اور شرابا" نیز رندانِ خرابات کی زاہدان ریائی سے نوک جھونک مشہور ہے مگر شوکت لکھتے ہیں ؎

خمارِ تشنہ لبی کو اثر دکھانا تھا
پہنچ کے ہاتھ میں ساغر کو ٹوٹ جانا تھا

یہ ایسی کیفیتیں ہیں جنھیں غیر شاعر یا متشاعر محسوس ہی نہیں کر سکتا نظم کرنا تو درکنار۔ وہ سطحی خیالات سے حتی الوسع اجتناب کرتے ہیں اور سامنے کی بات بھی اس طرح کہتے ہیں کہ گہرائی اور بانکپن پیدا ہو جائے ؎

وہ کس خطا پہ ہوئے دشمنی کو آمادہ
انھیں تو میں نے کبھی دوست بھی نہ جانا تھا

دوسرے مصرع کے انوکھے انداز نے شوخیوں میں بجلیاں پیس کر ملادی ہیں۔ معشوق سے جلی کٹی ہو تو اس لطف سے ہو۔

اس شعر نے اُن کو مومن سے بہت قریب کر دیا ہے ؎

جان دے دیں گے ہم اے ہمّتِ دشوار پسند
مرضِ عشق اگر قابلِ درماں نکلا

شرحِ مطالب کی گنجائش نہیں۔ اِسی غزل کا یہ شعر بھی عجیب آن رکھتا ہے ؎

موت برحق تھی مگر کاش نہ آتی شبِ غم
یہ تو کہنے کو نہ ہوتا کہ اک ارماں نکلا

رفتہ رفتہ اس اندازِ بیان نے بداعت اختیار کر لی ہے ؎

درد کیا جاتا دمِ آخر تسلّی سے مگر
زندگانی میں سکونِ موت شامل ہو گیا

غزل اِسی کا نام ہے اور مجھے بے حد مسرّت ہے کہ باوصف نوجوان ہونے کے شوکتؔ نے وہ غلط راستہ اختیار نہیں کیا جس کو بعض حضرات "رقصِ الفاظ" اور "رندی و مستی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر اہلِ نظر محض اس کو ڈھکوسلا سمجھتے ہیں۔ موسیقی اور سُریلے پن میں شوکتؔ آجکل کے بہترین خوش گلو (خوشگو نہ پڑھ جائیے گا) شاعروں کو مات کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ شاعر پہلے ہیں۔ زمزمہ پردازی وصف اضافی ہے۔ اُن کے شعر کی بنیاد کوئی خیال ہوتا ہے جس کے اظہار کو الفاظ لاتے ہیں نہ کہ الفاظ اور ردیف و قافیہ کی مدد سے کسی مبہم اور ناقص خیال کی تشکیل ہوئی، اُسے طبلہ کی تھاپ پر جانچا گیا، اگر پورا اُترا تو شعر ہے۔ تخیل کی ناداری، جذبات کی بے مائگی کچھ تو مستعار یا مسروقہ ترکیبوں میں کچھ گلے بازی میں دب گئی۔ مشاعرہ میں واہ واہ ہو گئی، یہی اُن کی شاعری کا مآل اور پوچ بانی کا صلہ ہے۔ مسیلمۂ کذاب کی طرح اُن کے متبعین بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ پروپیگنڈا مہمل اشعار کو الہام کا درجہ دیتا ہے یا فلسفہ و تصوّف کے سر تھوپتا ہے۔ زبان سے اُن کی بلا واقف ہو اگر کسی نے اس بنا پر گرفت کی تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ شعر میں اصل شئے تخیّل ہے۔ الفاظ چنداں اہمیت نہیں رکھتے بس اتنا ہو کہ خیال کی ایک جھلک نظر آ جائے، جو کچھ بھی ہے الفاظ کا رقص و موسیقی اور ترکیبوں کی خوبصورتی ہے۔ ممکن ہے کہ مجذوب کی طرح شاعر غیر ارادی طور پر غیب کی باتیں نظم کر گیا ہو۔ غرضکہ اس فرقہ کے نزدیک جو شعر جس قدر مغلق ہے اُسی قدر عمدہ ہے کیونکہ قیاس آرائی کی پوری آزادی ہے۔ شعر میں جو معنی چاہے پہنا دے۔ اگر کسی نے اعتراض کیا کہ الفاظ تو اس مفہوم کے متحمل نہیں تو ارشاد ہوا کہ اگر شعر کا یہی مطلب نہ ہوتا تو میرا ذہن اُدھر متبادر کیوں ہوتا! چلیے جھگڑا چُکا! ——

ایک گروہ مغرب زدہ ذہنیت والوں کا ایسا ہے جو غزل کو ایک سرے سے ناقابلِ التفات سمجھتا ہے اور "نظمیات" کا دلدادہ ہے جن میں جو چاہے بکتے چلے جاؤ کوئی بازپرس کرنے والا نہیں ملے گا۔ اور اگر کوئی شامت کا مارا اُلجھ پڑا تو اُس کو یہ جواب دے دیا گیا کہ حضرت مسلسل نظموں میں ایسی جزئیات سے بحث اصولاً غلط ہے۔ اس کی "تعمیری" خوبیوں اور "تخلیقی" رعنائیوں پر غور کیجئے اور داد دیجئے، الغرض ہرزہ سرائی و بے راہ روی کا ہنگامہ برپا ہے۔ لیجئے

برے کی تمیز اٹھ گئی ہے، زبان سے بیگانگی داخلِ ہنر سمجھی جاتی ہے، ناقدوں کا گلا گھونٹا جاتا ہے اور تعصب، حسد یا بدنفسی کا الزام لگا کر سر سے بلا ٹالی جاتی ہے۔ غزل کی مذمت کرنے والے نہیں جانتے کہ نفسیات کے نازک ترین مسائل کی بوقلموں مصوری کے لیے اردو میں یہی صنف موزوں ہے۔ علاوہ بریں زبان کو وسعت دینے والے اس کے سرمایہ میں اضافہ کرنے والے وہی شعر ہوتے ہیں جو زبانوں پر چڑھ کر ضرب الامثال کا درجہ حاصل کر لیں، یہ صلاحیت غزل کے سوا اور کسی کلام میں نہیں ہے اور اگر ہے تو برائے نام ہے، چنانچہ سر اقبال نے بہت کچھ کہا اور خوب خوب کہا، مگر انصاف کرو تو اُن کی شاعرانہ شہرت کا سنگِ بنیاد ایک غزل کا مطلع ہے، اگر کسی سے فرمائش کرو کہ سر اقبال کا کوئی شعر سناؤ تو پہلے یہی مطلع پڑھے گا ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

غزل کا ایک ایک شعر بشرطیکہ دل سے نکلا ہو طویل سے طویل نظم پر بھاری ہوتا ہے یا پوری نظم کا جوہر غزل کے ایک شعر میں کھنچ آتا ہے۔ شوکت کا یہ مطلع ؎

سچ ہے اُن کو مجھ سے کیا اور میرے افسانے سے کیا
کر دیا دیوانہ تو اب کام دیوانے سے کیا

اسی قبیل کا ہے۔ شاید ہی کوئی شخص ہو جس کی زندگی کے کسی نہ کسی تجربے سے اس شعر کے مفہوم کا تعلق نہ ہو اور اس کی سرگزشت کی ترجمانی نہ کرتا ہو۔

"ہوشمندوں" کی ایک اور جماعت غزل کو اس وجہ سے مردود قرار دیتی ہے کہ اس میں خیالی باتیں ہوتی ہیں کوئی ایسا پیغام نہیں ہوتا جو اُن کے مُردہ دلوں اور مضمحل بلکہ معطل قویٰ میں عمل کی رُوح پھونک دے اور خون کا سیلان بڑھا دے۔ میں نے ایسے ہی لوگوں کے باب میں کہا تھا۔ ع

"گرمِ اشعار سے کھلتا ہے پنجۂ شل"؟ یا ؎

کام کرنا ہے جنھیں کام کیا کرتے ہیں
مکتبِ شعر میں یا درس لیا کرتے ہیں

غالباً ایسے ہی لوگ شوکت کے ذہن میں تھے جس وقت انھوں نے یہ شعر کہا ؎

جس طرح گزری ہے اب تک اب بھی گزرے گی یونہی
ہم نہیں بدلے تو دنیا کے بدل جانے سے کیا!

غزل میں کیا کچھ نہیں ہوتا اور کیا کچھ نہیں ہو سکتا مگر مزدوروں اور سرمایہ داروں کو لڑا کر پیٹ ڈالنے والوں کے لیے نہیں، نہ جاہلوں اور نااہلوں کے لیے، بلکہ اہلِ ذوق اور اہلِ نظر کے لیے۔ ایسی غزل کی تمثیلی شاعری میں جسے بے درد گل و بلبل کی شاعری کے لیے ہنسی اڑاتے ہیں، ایک سچا شاعر سیاسی و اقتصادی گتھیاں سلجھا دیتا ہے اور طبائع کو غور و فکر اور حقیقی نفع و ضرر سمجھنے پر آمادہ کرتا ہے، سنئے ؎

یہ سچ ہے ایک حالت پر کبھی دنیا نہیں رہتی
قفس کو آج میں ترجیح دیتا ہوں گلستاں پر

مسلمانوں کی پوری تاریخ عروج و زوال پڑھ جائیے اسی شعر کی شرح ثابت ہوگی۔

مادہ پرست اور یورپ کی شیدائی نفس کے بندے جسمانی عیش و راحت کے حریص، روح کی تڑپوں سے غافل بلکہ روح کے وجود کے منکر اور دنیا و مآلِ کار دنیا سے بے خبر ہو گئے ہیں، مغربی ممالک کی مطلق العنانی و تباہ کاری شورش پسندی و پریشان حالی سے بھی درسِ عبرت نہیں لیتے اور نہیں سمجھتے کہ روحانیت کو چھوڑ کر مادیت کی طرف بڑھنا بہیمیت و درندگی کا پیش خیمہ ہے اور صحیح مفہوم آزادی سے کوسوں دُور ہوتا ہے۔ بیڑیاں بیڑیاں ہیں سونے کی ہوں یا لوہے کی، شوکت ساری دُنیا کو پیام دیتے ہیں اور متنبہ کرتے ہیں، لیکن وعظ و خطابت سے الگ ہو کر شیریں اور دل لبھانیوالے نغموں میں کہ —

محبت ہو گئی ہے چار دیوارِ عناصر سے
اسیرِ آب و گل عاشق ہوئے ہیں اپنے زنداں پر

مادیت سے رُوحانیت کی طرف رجحان کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ شوکت کی یہ پیشین گوئی مستقبل قریب میں پُوری ہو کہ —

ان سجدہ ریزیوں کا وہ دَور آ رہا ہے
جب بندگی کرے گی سجدے مری جبیں پر

خیر یہ دکھڑا کہاں تک رویا جائے، آئیے اب محض رُوحانی انبساط حاصل کریں، ادب کا اصلی منشا اور صحیح مفاد یہی ہے۔

زمانہ کے نشیب و فراز طے کرنے کے بعد انسان کو اُمید ہوتی ہے کہ اب اطمینان نصیب ہو گا مگر تقدیر ہنستی ہے اور کہتی ہے کہ اپنی سرنوشت کی تکمیل کی مشیت ایزدی کو نہ سمجھے ہو نہ سمجھو گے۔ اگر شعور ہے تو آرام کی خواہش کے بدلے اور محنت و جانکاہی کے صلے کا متوقع ہونے کے بجائے راضی برضا ہو اور سرِ تسلیم جھکا دو، اپنی سعی و جد و جہد پر نازاں ہو کر اصلی مقصد کو نہ بھول جاؤ —

میری قسمت کے پیچ و خم نکلے   میرے روندے ہوئے نشیب و فراز

خالص تغزل بے پناہ شعریت اور اثر انگیزی میں یہ شعر آپ اپنی نظیر ہے —

تاثیر ہی بیاں میں نہ ہو جب تو کیا کروں
کیا اپنا حال اُن کو سُناتا نہیں ہوں میں

صرف اندازِ بیان کی لطافت نے اس شعر میں کیا کیا مزہ بھرا ہے اور کس قدر معنوی اضافہ کیا ہے —

توبہ کرونگا واعظ، لیکن ذرا میں سن لوں
کچھ مجھ سے کہہ رہی ہیں اُمڈی ہوئی گھٹائیں

واقعاتِ "حسن و عشق" کی مصوری کس دلکش پیرایہ میں ہوئی ہے —

دھوکا تھا نگاہوں کا مگر خوب تھا دھوکا
مجھ کو تری نظروں میں محبت نظر آئی

اس شعر کی نشتریت، خدا کی پناہ ؎

جوابِ زمانہ میں فریاد بن کے پھرتی ہے
یہ وہ صدا ہے جو پابند تھی کسی دَر کی

سادگی میں پُرکاری دیکھئے ؎

گردش ہے تو گردش کی یہ صورت ہو الٰہی
میں جاؤں ادھر سے تو وہ آتے ہوں اُدھر سے

حُسن وعشق کے خصوصیات کو کتنے بلیغ الفاظ میں نمایاں کیا ہے ؎

حُسن محشر ہے مگر اک محشرِ خاموش ہے
عشق محویت ہے لیکن پھر سراپا جوش ہے

معرفت میں بھی ایک شعر سُن لیجئے ؎

جب وصل وجدائی میں تمیز نہیں رہ سکتی
تب جا کے کہیں تیرا جلوہ نظر آتا ہے

ہر شعر کے متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر یہی نہیں کہ میں عدیم الفرصت ہوں بلکہ شوکت کی بھی تاکید ہے کہ مضمون دس صفحوں سے زیادہ نہ ہو اور صفحے بھی بسم اللہ کی تختی کے برابر! چند ورق آرٹ پلیٹ کے مقدمہ "گھسیٹ دیا" یہ بھی شوکت کے حکم کی "حرف بحرف" تعمیل ہے۔

شوکت کا مجموعۂ غزلیات (جس کے نام کا بھی مجھے علم نہیں) انمول جواہر کا گنجینہ ہے۔

ہر صفحہ پر ۰ ۴

"کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست"

دعا ہے کہ اہلِ نظر میں شرفِ قبول پائے اور ان کی محنت ٹھکانے لگے۔ آمین۔

شیش محل

مولانا عبدالماجد دریابادی

شوخ نگاری و ظرافت دوسروں کے لیے پطرس بلکہ رشید صدیقی تک کے لیے ایک مشغلۂ تفریح رہی ہے۔ شوکت نے اسے اپنا مستقل فن بنالیا ہے اور قدرتاً ان کی نگاہ ایک فن کار کی نگاہ ہوگئی ہے، ان کا قلم ایک فن کار کا قلم ہے۔

”شیش محل“ ان کے مطالعۂ بشری کا ثمرہ ہے۔ اپنے ملنے والوں میں سے ۱۱۲ کے چہرے حروفِ تہجی کی ترتیب سے انھوں نے اس قلمی آئینہ میں دکھا دیئے ہیں، سب کے سب کسی نہ کسی حیثیت سے ادب ہی سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ افراطِ نازک خیالی سے کہیں صرف کتب فروشی کو بھی اس تعلق کے لیے کافی سمجھ لیا گیا ہے۔

یہ قلمی نگار خانہ، یوں کہیے کہ ایک عجائب خانہ ہے، بعض ان مشاہیر میں اتنے مشہور کہ ان کا تعارف بھی ان کی توہین۔ بعض ایسے گمنام کہ اتنی تعریف و تعارف کے بعد بھی مجہول کے مجہول۔ ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، بوڑھے بھی ہیں اور جوان بھی، بعض ایسے ہیں جو سب کچھ ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو کچھ بھی نہیں۔ ایسے بھی جن کا پیچھا شہرت نہیں چھوڑتی، ایسے بھی جو شہرت کی تلاش میں دوڑتے دوڑتے تھک چکے ہیں۔ غرض ریاض خیرآبادی، ڈاکٹر عبدالحق، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی سے لے کر افقر موہانی، اُمید امیٹھوی اور صدیق بک ڈپو تک، ہر ردیف، ہر قافیہ، ہر وزن، ہر بحر کے نمونے اس دیوان میں ہیں۔ شاعر کہیں تو خالی مصرعۂ طرح پڑھ کر چپ ہوگیا ہے اور کہیں دو غزلہ بلکہ سہ غزلہ چھیڑ دیتا ہے۔ نگار خانہ ظریف کا ہے، مزاح و شوخی ہر چیز پر مقدم ہے لیکن حقیقت و صداقت عموماً دوش بدوش۔ ”عموماً“ کا لفظ خیال میں رہے۔ ظرافت کی گلکاریاں، شوخ نگاری کی رنگ آمیزیاں، مورخ کے کیمرے اور فوٹوگرافی کی قائم مقام نہیں ہوسکتیں۔ چہرے یقیناً دلچسپ و دلکش سب کے ہیں اور یہی فن کار کا کمال ہے۔ البتہ کوئی چہرہ اُترا ہوا، کوئی ذرا لٹکا ہوا، کسی پر رعنائی و زیبائی کا نقاب پڑا ہوا۔ کسی پر روغن حسن افزا کا غازہ پھرا ہوا، کسی کی پیشانی پر شکن، کسی کے چشم و ابرو پر غضب کا بانکپن۔

ظریف نے ہنسنے ہنسانے کا سامان قدم قدم پر کیا ہے، لیکن کہیں کہیں اندازہ کرنے میں خود بھی غچا کھا گیا ہے، نازک خیال اور پھر لکھنؤ و جوارِ لکھنؤ کے نازک خیال، نازک مزاج بھی کچھ کم ہوتے ہیں۔

حسن اور اُس پہ حسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم

خوب کیا شوکت صاحب نے دیباچہ ہی میں سب سے معافی مانگ لی ورنہ عجب نہیں جو "بزم" "رزم" میں تبدیل ہو کر رہتی اور

اسد اور لینے کے دینے پڑے ہیں

کی شاعری حقیقت بن کر رہتی۔ (یہ اسد خدانخواستہ اسداللہ خاں غالب نہیں وہ دوسرے بزرگ ہیں جن کا یہ مصرعہ شہرت دوام حاصل کئے ہوئے ہے

مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

ص ۴۲ سے ص ۶۶ تک ایک بزرگوار کا ذکر جس رنگ میں ہے، یقین تو ہے کہ شوکت صاحب نے بازو پر امام ضامن باندھ کر لکھا ہو ——— شیش محل پر بے تحاشا پتھراؤ اس کے بعد کچھ بھی بعید نہیں رہ جاتا ہے!

یہ چیز محض تفریح اور دل لگی کی نہیں۔ کل اس سے بڑے بڑے سنجیدہ مورّخ خوشہ چینی کریں گے۔ آخر آج بھی کتاب الاغانی کے حوالے کس شدّ و مدّ کے ساتھ مغرب و مشرق کے بڑے بڑے سنجیدہ مورّخ دے رہے ہیں۔ پھر کیا یہ ادب اور شاعر، ان گویّوں کے سازندوں اور ڈھاڑیوں سے بھی گئے گزرے ہوئے ہیں۔

کمی اور بڑی کمی اس کتاب میں یہ ہے کہ نگارخانہ خود مصوّر کے مُرقّع سے خالی ہے ——— مجنوں کا ڈراما بغیر مجنوں کے پارٹ کے، یا بارات بغیر نوشہ کے! عرضِ دعویٰ بغیر بقلم خود؟ ظریف کی ستم ظریفی!

شخصیت نگار شوکت

(۸)

وقار عظیم

شوکت تھانوی دنیا سے رخصت ہو گئے اور دوستوں کی محفلیں سونی ہو گئیں۔ شوکت کی اکیلی ذات ایک انجمن تھی اور جب یہ چلتی پھرتی انجمن احباب کی محفلوں میں پہنچ جاتی تو ایک محفل میں کئی محفلوں کی چہل پہل شروع ہو جاتی تھی۔ بات بات پر فقرے اور لطیفے، ہر فقرے اور لطیفے میں ذہانت، شگفتگی، تازگی اور بھرپور زندگی، اور ان فقروں سے پیدا ہونے والی تبسم اور قہقہے کی پیہم اُٹھتی ہوئی اور گرد و پیش پر چھا جانے والی لہریں —— یہ سب کچھ شوکت کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ لیکن اس نے اپنے قلم کی شگفتگی و تازگی سے فقروں اور لطیفوں کی بے شمار ایسی محفلیں آباد کی ہیں کہ آدمی ان میں داخل ہو جائے تو نکلنے کو جی نہ چاہے۔ یہ عموماً محفلیں اُن کے ناولوں میں ہیں۔ مضامین میں ہیں اور اُن خاکوں میں ہیں جنھیں یکجا کر کے شوکت نے شخصیتوں کا آئینہ خانہ یا شیش محل تعمیر کیا ہے اور جنھیں اپنے ’بے قاعدہ قاعدے‘ کی زینت بنایا ہے۔

انسان کو معاشرتی حیوان کہا گیا ہے اور اُس کے اس وصف کو اُس کا ایسا امتیاز قرار دیا گیا ہے جس کی بدولت اُس کی جملہ خارجی اور داخلی صلاحیتیں ابھرتی، پرورش پاتی اور ارتقا کے مرحلوں سے گزر کر بام عروج تک پہنچتی ہیں۔ لیکن ہم میں سے اکثر کا یہ حال ہے کہ ’معاشرتی حیوان‘ ہونا ہم پر ایک بڑی تہمت ہے۔ ہم معاشرتی ہیں لیکن معاشرتی ہونے کا حق ہم میں سے بہت کم ادا کرتے ہیں۔ یہ حق زندگی میں جس جس طرح ادا کیا جاتا ہے، اُس کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی لوگوں میں مل کر بیٹھے تو اس کا شریک محفل ہونا سب کو بھلا معلوم ہو، لوگ اس بات کی آرزو کریں کہ یہ ’معاشرتی حیوان‘ اکثر ان کی بزموں میں آتا اور بزموں میں زندگی کا رنگ اور زندگی کا نور بھرتا رہے۔ شوکت تھانوی اسی قسم کے برگزیدہ ’معاشرتی حیوانوں‘ کی صف میں آتے ہیں۔ انھوں نے زندگی زندگی کی طرح بسر کی اور دوسروں کو یہ سبق دے گئے کہ ہزار الجھنوں میں پھنس کر بھی آدمی ہنستا ہے اور ہنساتے رہنے کو اپنی عادت اور معمول بنا سکتا ہے۔ شوکت کی زندگی میں اور شوکت کے ادب میں ہمارے لیے یہی بہت بڑا سبق ہے۔

شوکت کی زندگی کے مختلف رُخ ہیں لیکن زندگی کے ہر رُخ میں اُن کے کردار کا سب سے نمایاں پہلو یہی ہے کہ انھوں نے زندگی خوشدلی اور خوش مزاجی کے ساتھ بسر کی۔ خود ہنسے، دوسروں کو ہنسایا اور اس طرح زندگی بسر کرنے میں ان کی نظر ہمیشہ ایسی چیزوں پر پڑی جن کے مشاہدے اور بیان، دونوں میں لطفِ حیات کا سامان موجود ہے۔ گھریلو ماحول سے الگ ہٹ کر شوکت کی زندگی کے اُس پہلو پر نظر ڈالیے جسے میں نے زندگی کا معاشرتی رُخ کہا ہے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ شوکت کو ابتدائے شباب ہی سے ایسے مشاغل اپنانے اور اختیار

کرنے پڑے جن میں انھیں تقریباً نصف صدی تک ہندوستان و پاکستان کے بے شمار ادیبوں اور شاعروں کو قریب سے دیکھنے، ان سے بے تکلفی کے مراسم پیدا کرنے اور یوں ان کی شخصیت کے اچھے اور بُرے پہلوؤں سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ ان ادیبوں اور شاعروں سے اُن کے مراسم کی نوعیتیں مختلف اور گوناگوں ہیں۔ شیش محل اور قاعدہ بے قاعدہ کے تقریباً سوا سو خاکے یا مرقعے مراسم اور ربط کی انھیں مختلف گوناگوں شکلوں کے دلکش مرقعے ہیں، جن میں شوکتؔ کی باریک بین نظر کے علاوہ اُن کے جذبے نے زندگی کا رنگ بھرا ہے۔ اور یوں یہ خاکے ایک طرف تو اُردو کے سو سے زیادہ ادیبوں کی نجی اور ادبی حیثیت کا تعارف ہیں اور دوسری طرف بہ حیثیت مجموعی خود شوکت کی پسند و ناپسندیدگی کے معیاروں کے آئینے ہیں۔ ان خاکوں اور مرقعوں میں جابجا محبت، شفقت، ہمدردی اور جاں نثاری کا رنگ بھی ہے اور حفظِ مراتب کا پیدا کیا ہوا نازک اور لطیف فرق و امتیاز بھی۔

ان خاکوں کی بنیاد سر تا سر ذاتی تاثرات پر ہے اس لیے ان میں جذبے کی مختلف کیفیتوں اور اِن کیفیتوں کے اتار چڑھاؤ کا گہرا اثر ہے۔ اور اس حد درجہ ذاتی اور جذباتی بنیاد نے ان خاکوں میں سے بعض کو مبالغہ آمیز بنا دیا ہے اور بعض میں ایک ایسا ادھورا پن ہے جو شخصیت کے نقش کو پوری طرح واضح نہیں ہونے دیتا۔ بعض اوقات مصنف کے ذاتی تعلق نے ادب و شعر کی معمولی سے معمولی شخصیت کو اتنا نمایاں کر دیا ہے کہ بڑی سے بڑی ہستی بھی اُس کے سامنے ہیچ نظر آتی ہے اور کبھی بے تعلقی اور ذاتی ربط کی کمی بڑی سے بڑی شخصیت کے اظہار کے راستے میں حائل ہوئی ہے کہ یوں لفظوں کا بنایا ہوا نقش ادھورا بھی رہا ہے اور بے رنگ اور بے کیف بھی۔ یہ باتیں بظاہر عیب کی ہیں یا یوں کہنا چاہیے کہ شخصیت نگاری کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی ایک بات کہ ان خاکوں کی اساس میں شوکت تھانوی کی اپنی شخصیت اور مزاج کا بڑا گہرا اثر شامل ہے انھیں طرح طرح سے پڑھنے والوں کے لیے دلچسپ بناتی ہے۔

شوکتؔ بہ حیثیت انسان ایک خوش طبع اور خوش فکر انسان ہیں اور بہ حیثیت ادیب شگفتگی اور مزاح اُن کے اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ یہ شگفتگی کبھی واقعات کے بیان کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، کبھی اشخاص کے اوصاف کے ذکر میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ کبھی بے ساختہ کوئی دل کی کلی کو کھلا دینے والا فقرہ بن کر زبان پر آتی ہے، اور کبھی ایسے لطیفے کا روپ دھارتی ہے کہ محفل قہقہوں سے گونج اُٹھتی ہے۔

لفظوں نے اِن شخصی خاکوں میں کس طرح بہ یک وقت شخصیت کی مصوری کا حق اور منصب بھی ادا کیا ہے اور پڑھنے اور سننے والوں کے لیے انبساطِ خاطر کا سرمایہ بھی مہیا کیا ہے، اس کے لیے 'شیش محل' اور 'قاعدہ بے قاعدہ' کے چند خاکوں کی تھوڑی سی مثالیں ملاحظہ فرمائیے :۔

اقبال کا مصرع "کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں"

ایک زمانے میں زبان زدِ خلائق تھا۔ لکھنؤ میں ایک مشاعرے میں یہی مصرع طرح کے لیے دیا گیا۔ اس مشاعرے میں شوکت بھی شریک ہوئے اور غزل پڑھی۔ اس کا ذکر آرزو لکھنوی کے خاکے میں اس طرح کیا ہے "چھوٹی چھوٹی بحروں میں مصرعوں کے وزن کا سنبھالنا دوبھر تھا۔ یہ تو اچھی خاصی تندرست قسم کی بحر تھی"۔

ایک زمانے میں لکھنؤ سے "ترچھی نظر" نام کا ایک رسالہ نکلتا تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

"کیا تاریخی اسم مبارک تھا"

اصلفا خاں کے خاکے میں ڈبل کے دو جملے آئے ہیں اور ان کی شخصیت کے بعض پہلوؤں کو بڑی خوبی کے ساتھ واضح کرتے ہیں:

> ”ڈاڑھی اور پٹے اور اسکیٹنگ میں اپنی آپ نظیر“

> ”تجارت تحت اللفظ فرماتے ہیں اور شعر ترنم سے پڑھتے ہیں۔“

آشفتہ لکھنوی کے تذکرے میں کہتے ہیں:

> ”کیا مجال کہ انگرکھے کے چناؤ اور چوڑی دار پاجامے کی چوڑیوں میں ذرا بھی شتر گربہ پیدا ہو جائے۔“

احتشام حسین کا نئے ادب کے نقادوں میں جو مرتبہ ہے اُس کے پیش نظر اپنی اور اُن کی بے تکلفی کا حال اس طرح بیان کیا ہے:

> ”لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر اکثر ملاقاتیں ہو جاتی تھیں۔ نیا اور پرانا ادب تھوڑی دیر کے لیے درمیان سے اُٹھ جاتا تھا۔“

ایک دعوت میں مولانا احسن مارہروی کو صافہ باندھے دیکھا تو ان پر یوں پھبتی کہی:

> ”خدا کی قسم مولانا شبلی کے استفسار معلوم ہوتے ہیں آپ“

رفیع احمد خاں کے حال میں دوستوں کی عقل کی آبادی اور ویرانی کا تذکرہ کرتے کرتے لکھتے ہیں کہ:

> ”پکے گانے گائے جا رہے ہیں۔ کچے شعر پڑھے جا رہے ہیں“

کوئی سنجیدہ بزرگ آئے تو ان سے علمی مسائل پر تبادلۂ خیال ہونے لگا اور:

> ”اُن کے جاتے ہی پھر منہ سے پھول اور چہرے سے ٹھیکرے برسنے لگے۔“

شوکت نے ان خاکوں میں لفظوں کی مدد سے جو جادو جگایا ہے، اُس کی یہ تھوڑی سی مثالیں ہیں۔ ان مثالوں میں الفاظ کو کسی ایسے سیاق میں استعمال کر کے جہاں وہ عام طور پر استعمال نہیں ہوتا، کہیں انھیں آس پاس کے لفظوں کی مناسبت سے ایک نئے معنی اور نیا مفہوم دے کر، کہیں لفظ کے ایک مفہوم سے زیادہ دوسرے پر زور دے کر یا اُس کے دو مفہوموں میں سے دور کے مفہوم میں برت کر، کہیں لفظ کو پھبتی بنا کر، کہیں اضداد کو نگینوں کی طرح جملوں میں سجا کر، اور کہیں محاورے سے سیدھے سادے لفظ کا کام لے کر شوکت نے لطیف مزاح بھی پیدا کیا ہے اور موقع اور محل کے مطابق کوئی مؤثر بات بھی کہی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظوں کے استعمال کی یہ مثالیں الفاظ پر اُن کی قدرت اور اس قدرت سے بے ساختہ مزاح پیدا کرنے کی صلاحیت کی بڑی سیدھی سادی مثالیں ہیں۔ اُن کی مزاح نگاری کے زیادہ شگفتہ، زیادہ بلیغ اور زیادہ مؤثر نمونے اس وقت سامنے آتے ہیں، جب شوکت کی ذہانت اُن کی رنگینیٔ تخیل اور تازگیٔ فکر کو اُبھارتی اور ان کے میل جول سے لفظوں کا طلسم خانہ آباد کرتی ہے۔ لفظوں کے اس میل ملاپ کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ایک ہی جملہ اتنی بڑی بات کہہ جاتا ہے کہ پوری شخصیت کا پھیلاؤ اس میں سما جاتا ہے۔ اس طرح کے چند جملے سُن لیجیے:

> ”طبعاً فینلسٹ اور وضع قطع میں پیرس کا ڈھلا ہوا کھدر واقع ہوئے ہیں۔“ (یہ ہیں ساغر نظامی)

"نام تو عظیم بیگ تھا مگر اس قدر کمزور اور دبلے پتلے تھے کہ نام پھبتی معلوم ہوتا تھا۔"

"فطرت کی شارٹ ہینڈ میں مشاق کا جیتا جاگتا نمونہ" (یہ ہیں مجنوں گورکھپوری)

لفظوں کے مزاج میں تخیل کی کارفرمائی اس وقت اور بھی مزہ دیتی ہے جب وہ، اور بعض اوقات کئی اور کئی بے تعلق چیزیں اس طرح یکجا کر دی جاتی ہیں جیسے وہ ہمیشہ اس طرح ساتھ رہنے کے لیے بنائی گئی تھیں اور شوکت سے پہلے اب تک کسی کی نظر اس حقیقت تک نہیں پہنچی تھی۔ آج پہلی مرتبہ بچھڑے ہوئے لفظ ایک دوسرے سے ملے ہیں اور ان کا یہ ملاپ گردوپیش کی فضا کو باغ و بہار بنا رہا ہے۔ ایسے چند ٹکڑے پڑھ کر اپنا دل خوش کر لیجیے:

"آپ کی شہرت میں، آپ کے کلام کے علاوہ آپ کے گریبان اور اختری بائی فیض آبادی کو بھی دخل ہے۔"

(بہزاد لکھنوی — شیش محل)

"ان کو کم سے کم مولانا شوکت علی کے ڈیل ڈول، مالوی جی کے رکھ رکھاؤ اور کچھ نہیں تو نانا فرنویس کی عمر کا آدمی ہونا چاہیے تھا۔" (کرشن چندر — شیش محل)

"اخبار کے انتظار میں چشمہ لگائے، سوٹا بھرے، گنگا کنارے بیٹھے رہتے ہیں۔" (ارشد تھانوی - شیش محل)

"اسماً ہندو، مذہباً عیسائی، تخلصاً مسلمان اور صورتاً کچھ بھی نہیں۔" (پیارے لال شاکر - شیش محل)

"ان کو سب انسپکٹر پولیس بھی سمجھا جا سکتا ہے، میونسپل کمشنر بھی اور جنرل مرچنٹ بھی" (حافظ محمد عالم شیش محل)

"سر تیج بہادر سپرو سے ملاقات ہونے کی دو چار ہی صورتیں ممکن ہیں۔ مثلاً آدمی وائسرائے ہو یا مہاتما گاندھی یا شاعر یا کم سے کم جرائم پیشہ۔"

"حضرت بہزاد لکھنوی کے کلام کو ہندوستان میں صرف دو ہستیوں نے پھیلایا ہے۔ اختری بائی فیض آبادی نے گا کر اور شاہد احمد صاحب نے چھاپ کر۔" (شاہد احمد — شیش محل)

"سر میں دماغ اور پاؤں میں سنیچر۔ دماغ بھی چل رہا ہے اور خود بھی چل رہے ہیں۔ نہ وہ تھکتا ہے، نہ یہ تھکتے ہیں۔" (حکیم خواجہ شمس الدین — شیش محل)

"جوش صاحب کا پٹھان ہونا شاعر ہونے سے بھی زیادہ یقینی ہے، چنانچہ ان کے کلام میں بھی لٹھ بازی، مردانگی، جنگ جوئی، خونخواریت اور غیظ و غضب نظر آتا ہے جس کو لوگ انقلاب پسندی کہتے ہیں اور یہی جوش کی شاعری کی روح ہے۔"

"کلام سن کر عظمت کو اور صورت دیکھ کر شفقت کو دل چاہتا ہے۔ کلام نہایت وزنی اور خود نہایت ہلکے پھلکے۔ سناتے اس طرح ہیں گویا پھدک رہے ہیں۔ کلام کے زور میں اکثر خود اڑتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ آواز اونچی ہے اور گلے میں سُر بھی ہے مگر جوش میں آکر جب بے سُرے ہوتے ہیں اُس وقت معلوم ہوتا ہے کہ خلافت فنڈ کے لیے اپیل کرتے کرتے بالشتیوں کے مولانا شوکت علی کو غصہ آگیا ہے۔"

(روشن صدیقی۔ شیش محل)

"ظریف صاحب کے کلام میں قہقہے اور تازیانے کچھ اس طرح ملے جلے نظر آتے ہیں کہ آدمی ہنس ہنس کر تازیانے کھاتا اور تازیانے کھا کھا کر ہنستا ہے۔" (ظریف لکھنوی۔ شیش محل)

اب خالص ظریفانہ انداز کے تبصرے ملاحظہ کیجئے:۔

"اگر یہ کلام سمجھ میں آجائے تو دماغ کا علاج کراؤ اور اگر نہ سمجھ سکو تو اس دماغ کی قدر کرو۔ یہ ضرور کسی دن تمہارے کام آئے گا۔" (میراجی۔ قاعدہ بے قاعدہ)

"یہ پٹھان شاعر خدا سے بھی اکڑتا ہے۔" (جوش ملیح آبادی۔ قاعدہ بے قاعدہ)

"اُن کا اسلوب اُن کی سگی بہن حاجرہ مسرور کے اسلوب کا سگا بھائی معلوم ہوتا ہے اور بس!"

(خدیجہ مستور۔ قاعدہ بے قاعدہ)

"بچو! ان..... کا کلام اگر پڑھنا ہے تو ان کی غزلیں ڈھونڈو۔ نئی شاعری میں یہ پرانا شاعر تم کو مشکل سے ملے گا، اور ان کا کلام بھی سمجھنے کی کوشش نہ کرنا۔" (ن۔م۔ راشد۔ قاعدہ بے قاعدہ)

ادیبوں کے فن پر یہ ماہرانہ تبصرے اُس وقت اور بھی مؤثر معلوم ہوتے ہیں، جب ان کا مقصد ادبی مرتبے کے یقین کے بجائے شاعر یا ادیب کی شخصیت کا تعارف ہو۔ یہ تعارف عموماً واقعات کے بیان کی صورت اختیار کرتا ہے اور واقعات کا بیان اپنی تصویری خصوصیات کی بنا پر کسی شاعر یا ادیب کی زندگی کے ایک یا کئی پہلوؤں کو اس طرح اُجاگر کر دیتا ہے کہ اسکی شخصیت کا نقش ہمارے دل میں گہری اور دائمی جگہ بنا لیتا ہے۔ چند چھوٹے چھوٹے تعارفی جملے سن لیجئے:۔

"موٹے تازے لمبے تڑنگے آدمی ہیں۔ داڑھی قد سے کچھ ہی چھوٹی ہوگی۔" (خلیل احمد۔ شیش محل)

"اتحاد کی بہت سی قسمیں دیکھی ہیں۔ محمد علی شوکت علی، سپرو جیکر، اصغر علی محمد علی، نور الٰہی محمد عمر، احمد حسین دلدار حسین، لارنس اینڈ میو، غوری اور ڈگشت۔" (صادق — شیش محل)

شوکت تھانوی کے مزاح کی یہ مثالیں اُس بے ساختہ مزاح کے نمونے ہیں جہاں فکر، تخیل اور قدرتِ بیان، تینوں نے مل کر بڑی بے تکلفی سے کوئی نہ کوئی کام کی اور فکر انگیز بات کہی ہے اور ہر جگہ شخصیت نگاری کے صحیح منصب اور مقصد کی حدوں میں رہ کر دل اور دماغ کے لیے سچے لطف کا سرمایہ مہیا کرنے کی خدمت انجام دی ہے۔ یہی بات شوکت اکثر اوقات سیدھے سادے چلتے ہوئے فقروں اور معترضہ جملوں سے پیدا کرتے ہیں۔ بات کسی لفظ سے شروع ہوتی ہے اور آگے چلتی ہے۔ بظاہر بے محل ہوتی ہے لیکن جب ختم ہو چکتی ہے تو گہرا اثر چھوڑ کر جاتی ہے۔ ایک بات کہی جاتی ہے اور اس میں سے خود بخود ایک اور بات نکل آتی ہے جو پہلی بات سے زیادہ پُرمعنی بھی ہوتی ہے اور مزے دار بھی اور اس آورد میں ہر جگہ آمد کا لطف ہوتا ہے۔ کبھی کبھی بات شروع ہو کر بڑھتی چلی جاتی ہے لیکن اُس میں تکلف اور تصنع کا شائبہ تک نہیں پیدا ہوتا — اس بات میں بھی چند مثالوں کے ذریعہ لطف پیدا ہو گا:

"شاگردوں کی نہ پہلے کمی تھی نہ اب، باوجود اس جنگ کے۔" (آسی لکھنوی — شیش محل)

"شاعری میں بھوک کا اور اُن کی زندگی میں پیاس کا اظہار نمایاں ہے۔" (جوش ملیح آبادی — قاعدہ بے قاعدہ)

"روڈ ان کا تخلص نہ سمجھ لینا۔ یہ تو اُن کے نام کی سڑک ہے۔" (خواجہ دل محمد — قاعدہ بے قاعدہ)

"وہ منٹو جو مقدمہ چلوانے کے لیے افسانہ لکھتے ہیں۔" (منٹو — قاعدہ بے قاعدہ)

"جب مزاحیہ کلام سناتے ہیں تو لوگ عبرت پکڑتے ہیں۔ حالانکہ خود ان کو پکڑ لینا چاہیے۔" (شوکت — قاعدہ بے قاعدہ)

"اور آزادی ملنے کے بعد سے اگر غزل نہ بھی کہہ سکیں تو قومی ترانے کہتے رہتے ہیں۔" (ن۔ م۔ راشد — قاعدہ بے قاعدہ)

یہ معترضہ جملے کبھی کبھی بڑے پتے سے، معصومانہ رنگ میں ادیبوں اور شاعروں کی ادبی اور شاعرانہ حیثیت پر تبصرہ کر جاتے ہیں اور سننے والا سوچتا رہ جاتا ہے کہ ایک مزاح نگار کے چلتے ہوئے فقروں میں بھی کتنی معنویت اور گہرائی ہو سکتی ہے۔ ان معصومانہ اور بے تکلفانہ فقروں کو مطالعے کی گہرائی اور فکر کی سنجیدگی اور اس گہرائی اور سنجیدگی کے پردے میں چھپی ہوئی لطافت اور شگفتگی نے ہمیشہ زندہ رہنے والی تنقید کا ہم مرتبہ بنایا ہے۔ اس طرح کے چند جملے دیکھیے جن کی تنقیدی بصیرت ہر نقاد کے لیے قابلِ رشک ہونی چاہیے۔

اصغر گونڈوی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"جس شعر کے اعمال خداوند کریم کے نزدیک صالح ہوتے ہیں، اُس کو اصغر سے کہلوا دیتا ہے۔ تمام نشاطِ روح اسی قسم کے خوش اعمال اشعار کی جنت ہے۔"

"دوپہر کو چھڑی ہاتھ میں ہے اور پیدل اس طرح سڑک پر جا رہے ہیں گویا چھڑی کو بائیسکل سمجھ کر فراٹے بھر رہے ہیں۔" (حکیم شمس الدین ۔ شیش محل)

"ہم نے کبھی اُن کے کسی شعر کے مصرعۂ ثانی کا قافیہ اور ردیف نہیں سُنا۔ شعر کے آخر تک پہنچتے پہنچتے دونوں ہاتھ پھیلا کر داد مانگنے لگتے تھے۔ لوگ ہنستے تھے اور اسی ہنسی میں شعر کی خوبی بھی گُم ہو جاتی تھی۔"

(صفدر مرزا پوری ۔ شیش محل)

"صرف زبان سے نہیں سارے جسم سے شعر پڑھتے ہیں۔ نہ داد لینے کا ہوش ہوتا ہے نہ داد کی رسید دینے کا۔ خود ہی جس شعر کو جی چاہتا ہے پچاس دفعہ پڑھ جاتے ہیں اور جس شعر کو جی چاہتا ہے ایک ہی مرتبہ پڑھ کر رہ جاتے ہیں۔" (مجذوب ۔ شیش محل)

"آج کل حسیب تندرستی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ جسامت بڑھ رہی ہے اور خوراک گھٹتی جاتی ہے۔ ورزش کی ہمت نہیں۔ لہٰذا بے زبان معدے کو نفس کشی سکھا کر خود فاقہ کشی سیکھ رہے ہیں۔ اگر جسم بغاوت کرتا رہا تو مسٹر چرچل اور کامیاب ہو گئے تو مہاتما گاندھی بن کر رہیں گے۔" (فلک حسیب احمد ۔ شیش محل)

"انگریزی لباس کبھی نہیں پہنا مگر ہندوستانی لباس میں بھی تعلیم یافتہ نظر آتے ہیں۔" (آنند نرائن مُلّا ۔ شیش محل)

"شعر خواہ کسی بحر کا ہو پڑھتے مثنوی کے انداز سے ہیں لے سمجھ میں آجاتی ہے۔ الفاظ سمجھنے کی کوشش کرنا پڑتی ہے۔ اگر کوئی گفتگو سمجھ لیتا ہے تو اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس قدر شفقت میں ڈوبے ہوئے الفاظ فرما رہے ہیں۔ ورنہ عام طور پر گفتگو صرف یہ سمجھ میں آتی ہے گویا لوٹا بُھق بُھق بُھق کر کے کسی حوض میں ڈوب رہا ہے۔" (اُمید امیٹھوی ۔ شیش محل)

"پڑھنے کا انداز عدم تشدد کے منافی ہے، آواز بلند ہے مگر اس کو بھی انتہائی بلندی پر پہنچانے کی کوشش فرماتے ہیں۔ بیٹھ کر پڑھ رہے ہوں تو ہر وقت کھڑے ہو جانے کا امکان رہتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسپرنگ پر تشریف فرما ہیں۔ پڑھتے ترنم سے ہیں، مگر کچھ الفاظ دانتوں میں اور کچھ ناک میں آکر اپنی ساخت بدل دیتے ہیں، مثلاً آپ کا مصرع ہے ؏

موت آکے اُلٹ دیتی ہے نقابِ ہستی

اس کو آپ پڑھیں گے ؏

مونت آکے وولٹ دیں گی نقابنیں ہستی

(بسمل الہ آبادی ۔ شیش محل)

متین زبانوں کے شاعر ہونے کے باوجود اچھے آدمی ہیں۔" (صوفی تبسم - قاعدہ بے قاعدہ)

"فراق گورکھپوری پروفیسر ہیں، مگر مشاعروں میں جس انداز سے اپنا کلام سناتے ہیں، شبہ یہی ہوتا ہے کہ یہ کسی کالج کے پروفیسر نہیں بلکہ شعبدہ باز پروفیسر ہیں اور ابھی اپنے شعر کے دوسرے مصرعے سے کبوتر نکال کر اُڑا دیں گے۔" (قاعدہ بے قاعدہ)

ابھی میں نے کہا تھا کہ شوکت تھانوی کے بے تکلف اور بے ساختہ مزاحیہ اسلوب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کی گفتگو میں بات میں بات نکلتی ہے اور اس کے باوجود کہ وہ برابر بڑھتی چلی جاتی ہے اس کی لطافت اور شگفتگی میں فرق نہیں آتا، اور آورد آورد ہونے کے باوجود آمد کا مزہ دیتی ہے۔ اس مزے دار آمد میں ہر جگہ لفظوں کا طلسم اپنا کام کرتا ہے، کبھی لفظوں کا تضاد، کبھی ایہام اور رعایت، کبھی فقرہ بازی، کبھی پھبتی اور معترضہ جملے اور کبھی محض لفظوں کی اُلٹ پھیر۔ لفظوں کو پُرلطف اور پُرمعنی تبصرے اور تنقید کا ذریعہ بنانا شوکت کی شخصیت نگاری اور مزاح نگاری کی مشترک خصوصیت ہے۔ یہ خصوصیت اُس وقت اور بھی زیادہ مؤثر صورت اختیار کرتی ہے جب شوکت کسی شاعر یا ادیب کے کسی عمل کی ایسی توجیہہ پیش کرتے ہیں جو عام خیال سے بالکل مختلف اور اس لیے غیر متوقع ہوتی ہے۔ پڑھنے والے کے لیے اس توجیہہ، تاویل یا تعلیل میں غیر متوقع استعجاب کی بڑی سرور انگیز کیفیت ہوتی ہے۔ ایسے چند جملوں سے لطف حاصل کیجیے۔

احسان دانش کے متعلق لکھتے ہیں :-

"جیب میں گھڑی بھی نظر آتی ہے تاکہ تضیع اوقات کی گواہی دیتی رہے۔"

اکبر حیدری کے ذکر میں لکھتے ہیں :-

"سیماب صاحب اور اکبر حیدری صاحب میں ذرا تیز قسم کا تبادلۂ خیال ہو گیا تھا..... عشرت اور شوکت دونوں خاموش تماشائی تھے اس لیے کہ کھانا مزے دار تھا۔"

تاج صاحب کے متعلق لکھا ہے :-

"امتیاز علی ان کا نام ہے اور تاج تخلص، مگر شعر نہیں کہتے تاکہ تخلص خرچ نہ ہو جائے اور تخلص اس لیے رکھ چھوڑا ہے کہ دنیا کا کیا بھروسا، جانے کب شعر کہنا پڑ جائیں۔" (قاعدہ بے قاعدہ)

پطرس کے متعلق لکھا ہے :-

"یہ زندہ اُردو کے سب سے بڑے مزاح نگار ہیں، مگر مزاح نگاری نہیں کرتے تاکہ لوگ ترسیں اور اُردو زبان خدانخواستہ اتنی ترقی نہ کر جائے کہ وہ انگریزی زبان بھی منہ دیکھتی رہ جائے جس کے وہ مانے ہوئے ادیب ہیں۔"

(قاعدہ بے قاعدہ)

کرشن چندر اس لیے واجبی سے آدمی ہیں کہ وہ :-

"لکھتے زیادہ ہیں اور ورزش کم کرتے ہیں۔"

اور ن۔ م۔ راشد پہلے بہت اچھی غزلیں کہتے تھے :-

> "مگر جب اُن کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں اور شاعر بھی اچھی غزلیں نہ کہنے لگیں تو باقی شاعروں کو بہکانے کے لیے کچھ آزاد نظمیں بھی کہہ ڈالیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب آزاد نظمیں کہنے لگے۔" (قاعدہ بے قاعدہ)

شوکت تھانوی کے لکھے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کے یہ خاکے شوکت تھانوی کے اسلوب مزاج کی جملہ خصوصیتوں کے حامل ہونے کی وجہ سے پڑھنے والے کی تفریح اور انبساط کے بے شمار سامان مہیا کرتے ہیں۔ تفریح اور انبساط کا سرمایہ ایک طرف تو سیدھی سادی بامحاورہ سلیس اور صاف و شستہ نثر کی وجہ سے مہیا ہوتا ہے، دوسرے الفاظ کی اس بازی گری سے جس میں شوکت کو حد درجے کی مہارت حاصل ہے اور جس کی مثال میں اُن کے خاکوں کے بہت سے نمونے ابھی پیش کیے گئے۔ لیکن زبان و بیان کے لطف کے علاوہ ان خاکوں کی ایک تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی اہمیت بھی ہے۔ ان خاکوں سے بہ حیثیت مجموعی ہمارے معاشرے کے ایک خاص دور کا تہذیبی کردار ابھرتا ہے، اور ادیبوں اور شاعروں کے متعلق ہم جو کچھ پڑھتے ہیں اُس میں ایسی بہت سی اخلاقی اور معاشرتی قدروں کا رچاؤ نظر آتا ہے، جو رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہو رہی ہے۔ شاعروں کے لطائف و ظرائف کے یہ مرقعے حقیقت میں ان شاعروں کے تہذیبی طرزِ فکر اور طرزِ عمل کے دلکش مرقعے ہیں، جن کی تکمیل ایک طرف تو ان تمام ادیبوں اور شاعروں کے ذکر سے ہوئی ہے جو ان خاکوں کا موضوع ہیں اور دوسری طرف ان کے مصنف کے رنگِ طبیعت سے جس نے ان کرداروں کے تہذیبی مزاج کو اپنے مزاج میں جذب کر کے یہ زندہ رہنے والی تصویریں بنائی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان تصویروں میں سے بعض ادھوری اور نامکمل ہیں اور بعض رنگ اور نقش یا بہت ہلکے ہیں یا بہت تیز اور شوخ، اور رنگوں کا یہ فرق مصنف کے ذاتی مراسم کے رنگ کا پیدا کیا ہوا ہے۔

میرے نزدیک ان خاکوں کی ایک اہم خصوصیت اُن کا وہ خلوص اور دیانتداری ہے جس کی بنا پر انھیں ترتیب دیا گیا ہے، اس لیے ان میں کہیں کہیں قصیدے اور ہجو کا جو رنگ پیدا ہو گیا ہے اُس سے قطع نظر ان کے مطالعے سے ادیبوں اور شاعروں کی عظمت کے پہلو بھی سامنے آتے ہیں اور ان کی بعض کمزوریوں کا اظہار بھی ہوتا ہے اور اچھائیوں اور برائیوں کا یہ امتزاج انھیں مافوق الفطرت ہونے سے بچا لیتا ہے — وہ شاعر اور ادیب ہوتے ہوئے بھی انسان ہیں، جو اشرف المخلوقات ہو کر بھی خطا و نسیان کا مرکب اور مجموعہ ہے۔

منتخب مضامین

(مع غیر مطبُوعہ اَور نامکمّل مضامین)

اپنے مضامین اپنی نظر میں

شوکت تھانوی

اپنے مضامین کو میں نے مختلف حیثیتوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ مثلاً فرمائشی، فہمائشی، نمائشی، معاشی اور پیدائشی مضامین، ان میں سے ہر قسم ایسی ہے کہ جب تک میں خود اس پر روشنی نہ ڈالوں اس کی حیثیت کسی ایسے ڈاکٹر کے نسخہ کی رہے گی۔ جو دوا کا نام لکھنے کی بجائے دوا کا نمبر لکھا کرتا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے ضروری یہ ہے کہ میں اپنی اصطلاحات کا مفہوم خود بیان کروں۔

فرمائشی مضامین سے میری مراد ان مضامین سے ہے، جو کبھی عنوان دے کر، کبھی عنوان کے ساتھ موضوع بھی دے کر اور بعض اوقات مضمون کا نہایت تفصیلی خاکہ دے کر لکھوائے جاتے ہیں۔ کہ یہ مضمون پورا۔ اس طرح اور اس قسم کا لکھ دیجئے، گویا مضمون تو لکھا لکھایا ہوتا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہوتی ہے کہ اس حماقت کو میں کسی طرح قبول کر کے اس مضمون کو اپنا نام دے دوں۔ پھر خواہ خودکشی ہی کیوں نہ کر لوں۔ اب مثلاً میں نے ایک مضمون لکھا سودیشی ریل جو کسی رسالہ میں چھپ گیا۔ اور اس پر نظر پڑ گئی کسی اور رسالہ کے ایڈیٹر صاحب کی۔ اب یا تو ان کا نہایت تفصیلی خط آئے گا یا اگر مقامی قصبہ ہوا تو وہ خود نہایت تفصیلی طور پر تشریف لے آئیں گے کہ صاحب ایسا مضمون آپ مجھ کو بھی لکھ دیں۔ مثلاً دیکھئے نا کتنا اچھا موضوع ہے سودیشی ڈاک خانہ۔ اس مضمون کو اگر آپ اس طرح لکھیں کہ مثلاً آپ کوئی پارسل لے کر ڈاکخانے گئے ہیں اور وہاں پارسل کلرک آپ سے کہہ رہا ہے کہ وزن تو اس کا اتنا ہے مگر کہئے تو رعایت کر دیں اور جب آپ اس پارسل کے لیے ٹکٹ خریدتے ہیں تو اسٹیمپ کلرک مول تول کرتا ہے اور پھر بمشکل تمام آپ کو بارہ آنے کا ٹکٹ مل جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ بڑی گنجائش ہے اس موضوع میں عرض کیا ان سے کہ "بندہ نواز آخر آپ خود ہی کیوں نہیں لکھ لیتے" اپنے نزدیک وہ اس کو بھی لطیفہ سمجھ کر پہلے تو خوب ہنسے پھر جب اس لطیفہ سے لطف اندوز ہو چکے تو بڑی کسر نفسی سے فرمایا کہ میں لکھ سکتا تو آپ سے کیوں عرض کرتا۔

اب ان کو بتانا پڑا کہ وہ لکھ چکے ہیں ان کو سمجھاتے ہوئے عرض کیا۔

"دیکھئے نا جو کچھ آپ نے تجویز کی صورت میں اس مضمون کا خاکہ بنایا ہے۔ وہی دراصل مضمون ہے۔ بس اسی کو آپ لکھ دیجئے۔ میں اس لیے قاصر ہوں کہ میں اب آخر اس میں کیا لکھوں گا۔ مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی اور یہاں مصیبت یہ کہ ہم اپنا اخلاق کے حدود سے بھی نہ گذر سکتے تھے۔ مگر جب عاجز ہی آ گئے تو کہنا پڑا حضور والا آپ تو مضمون کا موضوع اس طرح لے کر آ گئے ہیں۔ جیسے کسی درزی کے یہاں کوئی شخص اپنا کپڑا اور اپنی جسامت لے کر پہنچ جاتا ہے کہ یہ کپڑا اس جسم کے لیے سی دو۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ پہلے گھر تشریف لے جائیے اور اطمینان سے بیٹھ کر درزی اور انشا پردازی میں جو لطیف سا فرق ہے۔ اس کو محسوس کرنے کی کوشش کیجئے۔

اس فرمائشی مضمون سے بظاہر یوں نجات مل گئی مگر دوسرے دن معلوم ہوا۔ اس نے فہمائشی صورت اختیار کر لی ہے۔ یعنی یہی حضرت ایک ایسے بزرگ محترم کے خطے کو پہنچ گئے جن کے اختیار میں اور کچھ نہ سہی تو یہ تو تھا ہی کہ اگر ناراض ہو جائیں تو والد صاحب کو لکھ بھیجیں کہ آپ کے صاحبزادے سخت نالائق ہیں اور ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ میں اپنی لڑکی کی قسمت ان سے جوڑوں۔ حالانکہ بڑے پیار سے خط لکھا گیا تھا اور بڑی شفقت برس رہی تھی۔ اس خط کے ہر دائرے سے اور ہر مرکز سے۔ مگر اس محبت اور اس شفقت کا نہایت ہولناک انجام بھی تو نظر کے سامنے تھا کہ اب انکار کر کے دیکھو کہ کیا ہوتا ہے۔ ہوتا کیا؟ ہوا یہی کہ ان حضرات کے لکھائے ہوئے مضمون پر گویا اپنا نام لکھ دیا اور اب تمام دنیا سے جواب دہی کرتے پھر رہے ہیں کہ یہ آخر کیا مار پڑ رہی تھی کہ سودیشی ریل کے بعد یہ حماقت کر بیٹھے، ظاہر ہے کہ ہر ایک کو تو نہیں سمجھایا جا سکتا کہ یہ حماقت کن راستوں سے گذر کر اپنے پاس آئی تھی۔ اور وہ کیا اسباب تھے کہ اس کو اوڑھنا ہی پڑا۔

اس قسم کے فہمائشی مضامین اکثر لکھنا پڑتے ہیں۔ اس لیے کہ عزت آبرو بڑی چیز ہے اور نہ لکھنے کی صورت میں یہی چیز خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ تعلقات کے انقطاع کی دھمکی دی جاتی ہے۔ دوستی کے دشمنی میں تبدیل ہو جانے کا خطرہ سامنے لا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اپنا نام اگر نہ اچھلوایئے تو ٹوپی اچھلوانے کی اجازت دیجیے، مگر اس فہمائشی سلسلہ کی سب سے خطرناک قسم حال ہی میں ایک دوست نے ایجاد کی ہے کہ پہلے تو وہ نہایت شرافت اور انسانیت کے ساتھ فرمائشی خطوط لکھتے رہے مگر جب کامیاب نہ ہوئے تو ایک فہمائشی خط اس مضمون کا لکھ بھیجا کہ حضرت اگر آپ نے اب بھی مضمون نہ بھیجا تو میں ایک ایسا مضمون لکھ کر آپ کے نام سے چھاپ دوں گا جس میں وہ تمام کمزوریاں ہوں گی۔ جن کے آپ متحمل نہ ہو سکیں گے۔ کوشش کرونگا کہ املا کی بھی غلطیاں ہوں، انشا کی بھی ہوں، مذاق اور بدمذاقی کا امتیاز اٹھ جائے اور جس کو آپ مزاح لطیف کہتے ہیں وہ پھکڑ بن بن کر آپ کے نام سے اس طرح منسوب ہو جائے کہ آپ کو مزاح نگار سمجھنے والے پھکڑ نگار تسلیم کر کے فاتحہ پڑھ لیں۔ ظاہر ہے کہ اس فہمائش کے بعد کچھ نہ لکھنا خواہ مخواہ اپنے کو خطرے میں ڈالنا تھا لہٰذا لکھا ان کے لیے اور جو کچھ لکھا اس کو آج کل فہمائشی مضامین کے ذیل میں لکھے ہوئے ہیں۔

نمائشی مضامین سے مراد ان مضامین سے ہے جو رسائل اور اخبارات کے نمائشی نمبروں کے لیے لکھنا پڑتے ہیں۔ یہ مضامین بنیادی طور پر فرمائشی اور دوہری طور پر معاشی ہوتے ہیں۔ یعنی ان کی فرمائش بھی کی جاتی ہے اور اگر وہ رسالہ یا اخبار کا خاص نمبر نکالنے کے سلسلہ میں جانبر ہو جائے، تو کچھ نہ کچھ معاوضہ بھی مل جاتا ہے۔ جب کہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ ہمارے رسائل اور اخبارات عام نمبر نکالنے سے عموماً کتراتے ہیں اور خاص نمبر نکالنے کے بہانے ڈھونڈھا کرتے ہیں۔ پہلے یہ جریدے اپنے سالانہ نمبر نکالا کرتے تھے۔ یا ایسا ہی کوئی اولوالعزم رسالہ ہوا، تو اس نے اپنا سالگرہ نمبر نکالنے کے علاوہ ایک نصف سالگرہ نمبر بھی نکال دیا۔ مگر اب عام نمبر خاص خاص موقعوں پر نکلتے ہیں، خاص نمبر تو نکلتے ہی رہتے ہیں، مثلاً اقبال نمبر، آزادی نمبر، قائداعظم نمبر، عید نمبر، بقرعید نمبر، میلاد نمبر، اردو نمبر اور خدا جانے کون کون نمبر۔ ان نمبروں کے لیے اگر آدمی لکھنے بیٹھے تو زندگی کی مہلتیں اس کو نہایت مختصر محسوس ہوں، مگر پھر بھی لکھنا ہی پڑتا ہے سب اخباروں اور سب رسالوں کے لیے تو خیر ناممکن ہے لکھنا مگر چند کے لیے تو لکھنا ہی پڑتا ہے، بات یہ ہے کہ اخبارات اور رسائل کی تعداد حدود و شمار سے باہر ہے۔ اور یہ سب بے شمار اخبار اور رسالے بے شمار خاص نمبر نکالتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ تین عزیز قریب ایک قسم کے رسالے یعنی اقبال نمبر نکال رہے تھے۔ اس لیے تینوں کے لیے مضامین لکھنا ازبس ضروری تھا۔ ایسا ضروری کہ زندگی اور موت کی قسم کا سوال آ پڑا تھا یعنی لکھیں تو خود مریں اور نہ لکھیں تو یقین یہ دلایا گیا تھا کہ لکھوانے والے خودکشی کریں گے لہٰذا

ایک مضمون لکھا مرکھپ کر۔ اب سوال یہ تھا کہ دوسرا اور تیسرا کیونکر لکھا جائے۔ آخر ایک ترکیب ذہن میں آئی کہ اس مضمون کا درمیانی حصہ اگر پہلے لکھ دیا جائے۔ آخری حصہ درمیان میں لکھ دیا جائے اور ابتدائی حصہ آخر میں آجائے تو معلوم ہوگا کہ جیسے نیا مضمون ہے۔ لیجئے دوسرا مضمون بھی ہوگیا۔ اب اسی فارمولا سے تیسرا مضمون تیار کر لیا۔ کہ تیسرے مضمون میں آخری حصہ شروع میں تھا۔ درمیانی حصہ آخر میں تھا اور آخری حصہ کی جگہ پہلا حصہ تھا۔ یہ تینوں مضامین تین مختلف اقبال نمبروں میں چھپ گئے اور زیادہ سے زیادہ یہ ہوا۔ ایک بہت بڑے نقاد قسم کے بزرگ نے صرف یہ لکھا کہ شوکت تھانوی کے یہاں خیالات و افکار کی تکرار اور تواتر کا غلبہ ہوتا جاتا ہے۔

مثلاً ان کے تین مضامین تین مختلف رسائل میں اقبال کے متعلق نکلے ہیں اور وہ تینوں معلوم ہوتا ہے ایک ہی سانچے میں ڈھالے گئے ہیں۔ کس قدر دور کی کوڑی لاتے ہیں یہ بزرگ مگر ایمان کی کہئے کہ خود ان سے بھی زیادہ دور کی کوڑی ہم لاتے سکتے یا نہیں۔

اب ذرا معاشی مضامین پر غور کر لیجئے۔ یہ وہ مضامین ہیں جن کو درزی کا ٹھیکہ کہنا چاہئے۔ یہ میرے مضامین کی بڑی زرخیز قسم ہے اور یہاں قائل ہونا پڑتا ہے کہ یہ ادب برائے ادب قسم کی باتیں محض ڈھکوسلے ہیں، اصل چیز ہے ادب برائے چیک اور چیک برائے بینک، یہ مضامین وہ بلند حوصلہ رسائل اور اخبارات لکھواتے ہیں جو خواہ فرمائشی رنگ اختیار کریں، خواہ فہمائشی صورت ان کو ہر قسم کا حق پہنچتا ہے اس لیے کہ وہ معاوضہ دیتے ہیں نہ وہ کوئی دھمکی لاتے ہیں نہ سفارشی خطوط نہ عزیزداری کا حوالہ دیتے ہیں نہ ہم وطنی کا حق جتاتے ہیں بلکہ صاف بات یہ کہتے ہیں کہ ــــ

کیا خوب سودا نقد ہے۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ اب اگر ان مضامین کو ادبی کسوٹی پر جانچیں تو یہ آپ کی زیادتی ہوگی۔ جو مضامین اس معاملت پر لکھے جائیں کہ جتنا گڑ ڈالو گے اتنا ہی میٹھا پاؤ گے۔ ان مضامین کو ادبی معیار پر جانچنا زیادتی نہیں تو اور کیا ہے آپ کو کیا معلوم کہ ان مضامین کے لکھتے وقت کیسے کیسے راحت جاں قسم کے خیالات کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ ذہن، قلم لکھ رہا ہے مضمون اور دماغ سوچ رہا ہے کہ جب اس کا روپیہ ملے گا تو ایک تو آئے گا ذرا فیشن ایبل قسم کا سگرٹ کیس اور اس پر بنوائیں گے اپنا مونوگرام تاکہ جب کسی کے سامنے سگرٹ نکال کر پیش کریں۔ تو وہ بھی مرعوب ہو جائے۔ اس قسم کی چیزیں آدمی کو خواہ مخواہ بھاری بھر کم بنا دیتی ہیں، سگریٹ چاہے ایک ہی ہو مگر سگریٹ کیس اگر شاندار ہے تو رعب پڑے بغیر نہیں رہتا۔ قلم چل رہا ہے اور دماغ میں ایک دوسرے خیال نے انگڑائی لی کہ سگریٹ کیس زیادہ ضروری ہے یا گھڑی۔ دوسرے سے وقت پوچھنا بڑے شرم کی بات ہے۔ یہ آلہ توضیح اوقات خود اپنے پاس ہونا چاہئے۔ زیور کا زیور اور پھر وقت ایک خود بھی کام کی چیز ہے۔ قلم چل رہا ہے اور دماغ میں ایک تیسرا خیال آیا کہ اس مضمون کا معاوضہ ملتے ہی سب سے پہلے تو دھوبی کا حساب چکانا چاہئے ورنہ یہ ساری سفید پوشی کسی دن دھری رہ جائے گی۔ اتنے بڑے ادیب سے وہ نہایت بے ادبی کے ساتھ تقاضے بھی کرنے لگتا ہے کسی دن کپڑے ہی نہ مارے۔ ان ہی خیالات میں مضمون مکمل ہو جاتا ہے اور معاوضہ مل جاتا ہے۔ مگر قیامت یہ ہے کہ ان مضامین کو بھی لوگ تنقیدی نظر سے پڑھتے ہیں۔ اب ان کو کیسے سمجھایا جائے کہ صاحب! اس قسم کی تنقید آخر آپ ترکاریوں پر کیوں نہیں کرتے جو بازار میں بکنے کے لیے ڈھیر ہوتی ہے۔ اس قسم کی تنقید آخر آپ کسی کباڑیے کے نیلامی فرنیچر پر کیوں نہیں کرتے۔ آخر یہ بھی تو بکاؤ مال ہے۔

فرمائشی، فہمائشی، نمائشی اور معاشی کے علاوہ مضامین کی ایک اور بھی قسم ہے یعنی آزمائشی، اس قسم کا میں نے اس لیے ذکر نہیں کیا ہے کہ ان مضامین سے میں ہمیشہ بھاگا ہوں اور اب تک خدا نے مجھ کو مضامین کی اس قسم سے بچایا ہے۔ یہ وہ مقابلے کے مضامین ہوتے ہیں جن کے اعلان کبھی سرکاری طور پر اور کبھی نجی طور پر اخبارات میں ہوتے ہیں کہ اس موضوع پر بہترین مضمون لکھنے والے کو پہلا انعام اتنا اور دوسرا

اتنا اور تیسرا اتنا دیا جائے گا۔ اور یہ کچھ نہیں لکھا جاتا کہ چوتھے نمبر پر آنے والے کو اور اس سے بھی بہترین پوزیشن حاصل کرنے والے والوں کو کیا کیا سزائیں دی جائیں گی۔ بس اعلان یہ ہوتا ہے کہ مضمون آٹھ صفحات کا ہو خواہ وہ چاول پر قل ہو اللہ" لکھنے والے ہوں یا آپ سائن بورڈ کے خط میں وہ آٹھ صفحے بھر دیں۔ فیصلہ کرنے والوں کی کمیٹی کا اعلان ہوتا ہے۔ اور آخری تاریخ کا بھی۔

پھر دوسری احتیاطیں کہ کاغذ کے صرف ایک طرف لکھئے۔ بائیں ہاتھ میں قلم پکڑ کر نہ لکھئے اور اگر آپ کا بایاں ہاتھ داہنا ہو تو داہنے ہاتھ سے جو آپ کا بایاں ہوگا قطعی پرہیز کریں۔ میں اس جھگڑے میں قطعی نہیں پڑا اور یہ بھی اتفاق ہے کہ انعام کی بڑی سے بڑی رقم بھی مجھ کو اس طرف متوجہ نہ کر سکی۔ اس لیے کہ میرا ہاتھ دیکھ کر فراست الید کا ایک ماہر یہ بات پہلے ہی بتا چکا ہے کہ تم کو کسی لاٹری، کسی معمہ اور اس قسم کے کسی مقابلے کا انعام کبھی نہ ملے گا۔ رہ گئی اب ایک آخری قسم یعنی پیدائشی مضامین'۔ یہ مضامین وہ ہیں جن کے متعلق مرزا غالب نے ایک دن مجھ سے کہا تھا کہ ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

یہ مضامین در اصل میں خود اپنے لیے لکھتا ہوں اور آپ سے زیادہ خود ہی خوش ہوتا ہوں، خود لکھتا ہوں اور خود ہی اپنے کو سناتا ہوں۔ خود ہی اپنے کو داد دیتا ہوں اور خود ہی کسرِ نفسی سے اس داد کو وصول کرتا ہوں۔ کہ میں کس قابل ہوں۔ مگر اس قسم کے مضامین بہت کم ہوتے ہیں۔ لوگ میرے مضمون "سودیشی ریل" کو لے اڑے اور میں محض اس خیال سے چپ ہو رہا کہ غلیبس نہ لگ جائے۔ اب اپنا مضمون شاہین بچے مجھ کو سودیشی ریل سے کہیں زیادہ پسند ہے اس لیے کہ اقبالیات کو لکھ کر مجھ کو وہ مسرت اور اطمینان حاصل نہیں ہوا جو خوشی شاہین بچے لکھ کر حاصل ہوئی۔ اسی طرح بے شمار ایسے مضامین ہیں جن کو دوسرے پسند کرتے ہیں، مگر میں ان کو اتنا پسند نہیں کرتا۔

اب اگر مجھ کو غمِ روزگار اور فکرِ معاش دونوں سے آزاد کر کے خود اپنے مضامین پر نظر ڈالنے کا موقع دیا جائے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بہت ہی کم سخت جاں مضامین ایسے نکلیں گے جن کو میں باقی چھوڑ دوں، باقی سب ردی کی ٹوکری میں نظر آئیں گے۔ لہٰذا خیریت اسی میں ہے کہ مجھ کو اس طرف متوجہ نہ کیجئے اور میرے مضامین کو میری نظرِ بد سے بچائیے۔

سودیشی ریل

دن بھر کے تھکے ماندے بھی تھے اور رات کو سفر بھی درپیش تھا مگر "بندے ماترم" کے نعروں پر کان کھڑے کر لینا ہماری ہمیشہ کی عادت ہے اور ان نعروں کو بھی یہ ضد ہے کہ ہمارا چاہے جو حال بھی ہو، بیمار ہوں، کسی ضروری کام سے باہر جا رہے ہوں یا اور کوئی مجبوری ہو مگر یہ کچھ نہیں دیکھتے اور اپنی طرف ہم کو کشاں کشاں کھینچ کر چھوڑتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی یہی ہوا کہ حقہ کا نیچہ اور صراحیاں ایک دکان پر یہ کہہ کر رکھ دیں کہ "بھائی ابھی آتے ہیں" اور سیدھے پنڈال میں گھس گئے جہاں ایک صاحب جو صورت سے لیڈر معلوم ہوتے تھے یعنی سر پر گاڑھے کی گاندھی کیپ، داڑھی مونچھ سے فارغ البال، ایک لمبا سا کھدر کا کرتہ، ٹانگوں میں وہی کھدر کی دھوتی اور چپل پہنے ہوئے تھے، ایک ہاتھ کو اپنی پشت پر رکھے ہوئے اور دوسرے ہاتھ کو مجمع کی طرف اٹھائے ہوئے اس طرح حرکت دے رہے تھے جیسے بینڈ ماسٹر اپنے بید کو حرکت دیتا ہے۔ وہ کچھ کہہ بھی رہے تھے مگر معلوم نہیں کیا، اس لیے کہ کبھی تو کہتے کہتے مشرق کی طرف گھوم جاتے تھے، کبھی مغرب کی طرف اور کبھی کبھی ایک دم سے پیچھے بھی مڑ جاتے تھے۔ بہرحال فیصلہ کرنا کہ ہم ان کی پشت کی طرف ہیں یا سامنے اس لیے مشکل تھا کہ ان کو خود قرار نہیں تھا۔ وہ تخت جس پر کھڑے ہوئے وہ گھوم رہے تھے مجمع کے وسط میں تھا اور تمام مجمع کا رخ تخت کی طرف۔ کبھی کسی کی طرف منہ کبھی کسی طرف پشت ہو جانے کا سلسلہ جاری تھا اور اسی طرح ان کے الفاظ کبھی نہایت صاف، کبھی دور کی آواز کی طرح اور کبھی بالکل نہیں، ہمارے کانوں میں پہنچ رہے تھے۔ ہاں ایک بات یہ بھی کہ ہماری طرف کے لوگ غل مچانے میں "اُتر" دکھن اور پچھم کے لوگوں سے زیادہ ماہر معلوم ہوتے تھے اس لیے ہم تقریر سننے کے معاملہ میں ذرا گھاٹے میں تھے۔ پھر بھی جو کچھ سنا وہ بہت کافی تھا اس لیے کہ شروع سے آخر تک الفاظ بدل بدل کر کبھی انگریزی میں کبھی اردو میں، کبھی نثر میں، کبھی نظم میں، کبھی ہنس کر، کبھی چیخ کر، کبھی ادھر مڑ کر، کبھی ادھر گھوم کر وہی الفاظ کہے جا رہے تھے جو ہم نے سن لیے تھے:۔

"بھائیو! اب وہ وقت نہیں ہے کہ ریزولیوشن پاس ہوں اور رہ جائیں......
تجاویز منظور ہوں اور شرمندۂ عمل نہ ہوں...... سرگریباں...... اب تیار
ہو جاؤ...... ہوشیار رہو...... کہ تم کو...... ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۹ء کے
بعد اپنا کام اپنے ہاتھوں انجام دینا ہے...... اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے

.... (دوسری طرف گھوم گئے) خوابِ غفلت سے بیداری کا وقت .... یہ
ہے .... اور وہاں تم .... برٹش گورنمنٹ .... سوراج سودیشی .....
چرخہ ..... کھدر .... " (چیرز کے بعد تقریر ختم)

دو گھنٹہ میں ہم نے حرف یہی سُنا اور سمجھ لیا کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کے بعد سوراج ضرور مل جائے گا۔ غالباً اس سے زیادہ انھوں نے کچھ کہا بھی نہیں ہوگا اور اگر کہا بھی ہو تو ہم کیا کریں۔ ہمارے لیے یہی بہت تھا کہ ۳۱ دسمبر کو سوراج ملے گا۔ ہم اسی خیال میں غرق مجمع کو دھکیلتے خود دھکے کھاتے کسی نہ کسی طرح باہر نکل آئے۔ دکان پر سے حقہ کا نیچہ لیا، مہراجاں ایکے پر لادیں اور گھر پہنچ گئے۔ اسباب باندھا، کھانا کھایا، حقہ بھرا، آرام کرسی پر لیٹ کر شوق فرمانے لگے۔ گاڑی کے وقت میں ابھی پورے دو گھنٹے تھے اس لیے اطمینان بھی نصیب تھا مگر احتیاطاً شیروانی نہیں اتاری تھی کہ جیسے ہی ڈیڑھ گھنٹہ باقی رہ جائے گا اسٹیشن روانہ ہو جائیں گے۔

لیکچر کا خیال اور ۳۱ دسمبر کے بعد سوراج کا مل جانا دماغ میں چکر لگا رہا تھا مگر ہماری سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی تھی کہ آخر سوراج کے لیے ۳۱ دسمبر کیوں مقرر کی گئی ہے۔ اگر آج ۳۱ دسمبر ہوتی تو ہم اپنی ریل پر سفر کرتے، نہ بدتمیز گارڈ ہوتا، نہ فالتو سامان کا محصول، نہ اینگلو انڈین کا علیحدہ درجہ ہوتا۔ ہم خود ہی ریل کے مالک ہوتے، چاہے تھرڈ میں بیٹھتے چاہے فرسٹ میں، ہم سے کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا۔ ہم خود فرسٹ میں بیٹھتے اور انگریزوں کو تھرڈ میں بٹھا کر خوش ہوتے ہوئے سفر کرتے ——— ہم یہ سوچ رہے تھے کہ یکدم سے کان میں پھر وہی "بندے ماترم" کی آواز آئی اور ہم ایکدم سے کھڑے ہو گئے۔ گھر سے باہر نکلے، دیکھتے کیا ہیں کہ ایک بڑا جلوس جھنڈوں، جھنڈیوں اور رنگینیوں سے سجا ہوا "بندے ماترم" کے نعروں سے آسمان اور زمین کو ٹکراتا ہوا ہمارے مکان کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ ہم نے لوگوں سے پوچھا کہ "بھائی یہ کیا ہے؟" جواب ملا کہ "کیا سو رہے تھے؟ خبر نہیں کہ سوراج مل گیا؟" ہم نے بڑا سا منہ کھول کر کہا "سوراج؟" جواب ملا "ہاں سوراج! سوراج!" ہم نے اپنے دل میں کہا کہ "واہ بھئی واہ! دعا تو قبول ہوئی ہماری اور سوراج مل گیا ان لوگوں کو، ارے ہم کو ملتا تو ایک بات بھی تھی۔ پھر سوچا کہ ہم اور یہ لوگ کچھ غیر تھوڑی ہیں۔ ان کو ملا یا ہم کو ایک ہی بات ہے مگر واللہ کمال ہوا کہ سوراج مل گیا۔ دل کو کسی طرح یقین ہی نہیں آتا تھا کہ سوراج مل گیا ہوگا حالانکہ ابھی تک جلوس نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ جب جلوس کی طرف نظریں جاتیں تو یقین ہو جاتا کہ سوراج مل گیا اور جب سوراج ملنے پر غور کرنا شروع کرتے تو دل کہتا کہ ابھی نہیں ملا ہے۔ لیکن آخر جب ہر شخص نے سوراج ملنے کی خوشخبری سنائی تو شک دور ہوا اور ایک آزادانہ و خودمختارانہ سانس لے کر ہم نے پہلی مرتبہ اپنے آپ کو آزاد سمجھا۔ ابھی ہم اپنے آپ کو آزاد سمجھ ہی رہے تھے کہ گھنٹے نے ٹن ٹن کر کے دس بجا دیے یعنی ہم کو خود اسٹیشن چلے جانے کا حکم دیا۔

ہمارے ایسے آدمی کے لیے سفر شروع کرنے کا یقین لوگوں کو اس وقت ہوتا ہے جب ہم ٹکٹ خرید لیں۔ چنانچہ ہم نے بھی اپنی یہ عادت ڈال رکھی ہے کہ سفر کرنے سے پہلے ٹکٹ ضرور خرید لیتے ہیں۔ چنانچہ ہم کو جو سب سے پہلا مرحلہ اسٹیشن پہنچ کر درپیش ہوتا ہے وہ بکنگ آفس کی کھڑکی میں جھانک کر ٹکٹ خریدنے کی درخواست پیش کرنا ہے۔ چنانچہ آج بھی ہم نے بالکل اسی پروگرام پر عمل کیا اور بکنگ آفس کی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"بابو جی! کانپور کا سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ دے دیجیے۔"

بابو جی نے بجائے اس کے کہ ٹکٹ دے دیتے پہلے تو ہم کو گھورا پھر نہایت اطمینان سے فرمانے لگے۔

"ایک بات کہہ دیں یا مول تول؟"

میں سمجھا بابو جی مذاق کر رہے ہیں اور میں ہنس دیا۔ میرے ہنسنے پر بابو جی نے پھر کہا۔

"جناب سنئے تین روپیہ ہوتے، لائیے روپے اور ٹکٹ لے لیجئے۔"

اب تو مجھے اور زیادہ تعجب ہوا اور میں نے کہا۔

"جناب تین روپے کیسے ہوتے، ایک روپیہ تیرہ آنہ تو کرایہ ہے آپ کہتے ہیں تین روپے۔ مجھے کانپور کا ٹکٹ چاہئے ہے کانپور کا سیکنڈ کلاس۔"

بابو جی نے ذرا ترش رو ہو کر جواب دیا۔

"جناب والا! میں بہرہ نہیں ہوں۔ سن لیا ہے کہ آپ کو کانپور کا سیکنڈ کلاس ٹکٹ چاہئے مگر اسی کے تین روپے ہوتے کوڑی کم نہ لوں گا۔ جی چاہے لیجئے ورنہ جانے دیجئے۔"

میں :۔ مگر بابو صاحب! ابھی پرسوں تک تو ایک روپیہ تیرہ آنہ کرایہ تھا، آج کیا ہو گیا کہ ایک دم بڑھ گیا۔

بابو :۔ کل کی بات کل کے ساتھ، آج دیش ہمارا ہے، ہم کو سوراج مل گیا ہے۔

میں :۔ یہ کہئے کہ سوراج ریل کو بھی ملا۔ اچھا خیر ٹکٹ دیجئے نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔

بابو :۔ لائیے روپے۔ اچھا نہ آپ کی بات نہ ہماری بات ڈھائی روپے دے دیجئے اور ٹکٹ لے لیجئے۔

بابو صاحب کی ان تمام باتوں پر کچھ تو ہنسی آ رہی تھی اور کچھ غصہ آ رہا تھا کہ فضول ان باتوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اگر گاڑی چھوٹ گئی تو اور مصیبت آئے گی۔ ٹکٹ وکٹ سب دھرا رہ جائے گا۔ آخر کار میں نے طے کر لیا کہ میں بغیر ٹکٹ کے سفر کروں گا اور یہ سوچ کر میں بکنگ آفس سے چلنے لگا۔ مجھ کو جاتا ہوا دیکھ کر بابو صاحب نے پھر آواز دی۔

"سنئے تو جناب! ٹھہریئے تو جناب! دیکھئے تو جناب! اچھا دو روپے دے دیجئے۔ آیئے وہی ایک روپیہ تیرہ دیجئے —— اب وہ بھی نہ دیجئے گا؟ اچھا آپ بھی کیا کہیں گے۔ لائیے ڈیڑھ روپیہ۔ اب اس سے زیادہ ہم کم نہیں کر سکتے۔ ہمارا نقصان ہو رہا ہے۔"

جب ہم نے ٹکٹ کے بازار کا بھاؤ اس طرح گرتے ہوئے دیکھا تو اور اکڑ گئے اور ناک بھوں چڑھا کر ذرا گردن ترچھی کر کے وہیں سے کہہ دیا۔ "ایک روپیہ دیں گے۔ ایک روپیہ کو دینا ہو تو دے دو۔"

ہم سمجھے تھے کہ بابو صاحب اس پر راضی نہ ہوں گے مگر واللہ کمال کیا انہوں نے کہ گردن لٹکا کر ذرا دھیمی آواز میں کہنے لگے۔

"لائیے صاحب لائیے۔ بوہنی کا وقت ہے۔ آپ ہی کے ہاتھوں بوہنی کرنا ہے۔"

ٹکٹ تو ہم نے لے لیا لیکن وہ ٹکٹ ریل کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ نہ اس پر تاریخ پڑی ہوتی تھی اور نہ اس پر کچھ چھپا ہوا تھا۔ بابو صاحب نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر "درجہ دوم کانپور" لکھ کر ایک ٹیڑھی سی لکیر کھینچ دی تھی جو غالباً ان کے دستخط تھے۔ ہم نے ٹکٹ کو ادھر سے دیکھا ادھر سے دیکھا اور دو تین مرتبہ غور سے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بابو صاحب کا منہ دیکھنے لگے۔ بابو صاحب بھی ذرا قیافہ شناس تھے۔ ہماری اس حرکت سے وہ ہمارا مطلب سمجھ گئے اور متبسم ہو کر کہنے لگے "جناب والا! رات کو سوراج ملی ہے،

ابھی نئے ٹکٹ نہیں چھپے ہیں وہ دو تین دن میں چھپ جائیں گے۔ آپ کو ٹکٹ سے کیا مطلب، آپ تو سفر کیجئے اب آپ سے کوئی کچھ نہ پوچھے گا۔ آپ اطمینان رکھئے۔"

بابو صاحب نے تسلی تو دے دی مگر ہم دیکھ رہے تھے کہ ٹکٹ پر نہ تاریخ ہے نہ کرایہ نہ فاصلہ اور فاصلہ ہوتا تو کہاں سے، انہوں نے تو یہ بھی نہ لکھا کہ ہم سفر آخر کہاں سے کر رہے ہیں۔ بہر حال یہ سمجھ کر کہ یا تو یہ روپیہ گیا یا ہم تیرہ آنے کے نفع میں رہے، اسٹیشن میں داخل ہو گئے۔

اسٹیشن میں حالانکہ سب کچھ وہی تھا جو آج سے قبل ہم دیکھ چکے تھے مگر اس سب کچھ کے باوجود بالکل یہ معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے اسٹیشن کو قلابازی کھلا دی ہے یا الٹا باندھ کر ٹانگ دیا ہے۔ وہی گھڑی تھی وہی گھڑیال مگر دس بجنے میں ہنوز پچیس منٹ باقی تھے حالانکہ اب گیارہ کا وقت تھا۔ اسباب کے ٹھیلے پر پان والا اپنی دکان لگائے بیٹھا تھا۔ قلیوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسباب کس طرح ریل میں پہنچائیں۔ بمشکل تمام ایک قلی ملا۔ لیکن جیسے ہی اس سے ہم نے اسباب اٹھانے کو کہا تو اس نے چیں بہ جبیں ہو کر جواب دیا۔

"اندھے ہو گئے ہو؟ دکھائی نہیں دیتا کہ ہم قلی ہیں یا اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر؟"

ہم "معاف کیجئے گا غلطی ہوئی"، کہہ کر پورے پورے ایک گز پیچھے ہٹ گئے۔ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب کو سر سے پیر تک بغور دیکھ کر سوچنے لگے کہ "یا اللہ! یہ کیا انقلاب ہے۔ پہلے تو اس صورت کے قلی ہوا کرتے تھے۔ اب اگر اس صورت کے اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ہونے لگے ہیں تو پھر قلی کس صورت کا ہوگا؟" مجبوراً ہم نے اپنا اسباب خود اٹھایا اور دو مرتبہ کر کے سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں رکھا جہاں پہلے سے ایک جنٹلمین بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ اسباب قرینہ سے رکھ کر جب ذرا اطمینان ہوا تو ہم نے سوچا کہ یہ تحقیقات کر لینا چاہئے کہ یہی گاڑی کانپور جائے گی یا کوئی اور۔ سب سے پہلے تو ہم نے انہی حضرت سے پوچھا جو ہمارے ڈبہ میں تشریف فرما تھے لیکن انہوں نے صرف یہ جواب دیا: "بانی بھیا ہم کا ناہیں مالوم۔" یہ خالص سودیشی ریل کے سیکنڈ کلاس کے معزز پسنجر تھے۔ ان سے بھلا کیا معلوم ہو سکتا تھا۔ مجبوراً ہم پلیٹ فارم پر آئے اور دو ایک آدمیوں سے پوچھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اگر مسافر کانپور کے زیادہ ہوئے تو وہاں جائے گی ورنہ جہاں کے مسافروں کی تعداد زیادہ ہوگی وہاں چلی جائے گی۔ اسی لیے اب تک انجن نہیں لگایا گیا ہے کہ خدا معلوم ٹرین کو مشرق کی طرف جانا پڑے یا مغرب کی طرف۔" ہم نے گھبرا کر پوچھا۔

"لیکن یہ فیصلہ کب ہوگا؟"

جواب ملا کہ "جب گاڑی بھر جائے گی اس وقت فیصلہ ہو سکتا ہے۔"

ہم نے پھر پوچھا: "لیکن گاڑی کا وقت تو ہو چکا؟"

جواب ملا کہ "ہو جایا کرے جب تک ریل نہ بھر جائے کس طرح چھوڑی جا سکتی ہے؟ کیا خالی ریل چھوڑ دی جائے؟"

اب ہم بالکل راضی بہ رضا ہو کر خاموش ہو گئے۔ اس انتظام کو برا اس لیے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہماری ہی دعا تھی۔ اچھا اس لیے نہیں کہہ سکتے تھے کہ آج ہی کانپور پہنچنا تھا جس کی اب کوئی امید بظاہر نہیں معلوم ہوتی تھی۔ غرضیکہ کبھی اپنے ڈبہ میں بیٹھ کر، کبھی لوٹے میں پانی لا کر، کبھی پلیٹ فارم پر ٹہل کر، کبھی انجن کو مشرق اور مغرب کی سمت حدِ نظر تک ڈھونڈھ کر کبھی مسافروں کی تعداد کا اندازہ لگا کر وقت کاٹتے تھے

گیارہ سے بارہ، بارہ سے ایک، ایک سے دو بجے مگر نہ گھڑی کی سوئی ہٹی نہ ٹرین اپنی جگہ سے ہلی، صرف ہم ٹہلتے رہے۔ خدا خدا کرکے ایک آدمی نے بآوازِ بلند چیخنا شروع کیا۔

”بیٹھنے والے مسافرو بیٹھو گاڑی چھوٹتی ہے۔“

ہم نے جلدی سے پہلے مشرق کی طرف انجن کو ڈھونڈھا پھر مغرب کی طرف، مگر دونوں طرف انجن غائب تھا اور ہماری بالکل سمجھ میں نہ آیا کہ بغیر انجن کے گاڑی کس طرح چھوٹ سکتی ہے اور ان الفاظ پر شک کرنا اس لیے کفر سمجھتے تھے کہ ان کا کہنے والا کوئی غیر ذمہ دار شخص نہ تھا بلکہ وہی اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب تھے جن کو ہم قلی سمجھتے تھے۔ بہرحال بغیر کچھ سوچے سمجھے ہم اپنے ڈبہ میں بیٹھ گئے۔ ہمارے بیٹھتے ہی دو تین درجن لٹھ بند گنوار ہمارے درجہ میں گھس آئے۔ ان سے ہم نے لاکھ کہا ”ارے سیکنڈ کلاس ہے، اماں سیکنڈ کلاس ہے، بھائی سیکنڈ کلاس ہے۔“ مگر انھوں نے ایک نہ سُنی اور یہی کہتے رہے۔ ”ہم ہو جانت ہے ڈیوڑھا ہے ہم ٹکس لیا ہے۔“ خیر صاحب ہم چپ ہو رہے اور پلیٹ فارم پر اس غرض سے آئے کہ کسی سے کہہ دیں مگر گارڈ وارڈ تو نظر نہ آیا مجبوراً انہیں اسسٹنٹ اسٹیشن سے عرض کر دیا جس کا جواب انھوں نے اپنی سودیشی شان سے صرف یہ دیا ”بیٹھئے جناب سب ہندوستانی برابر ہیں۔ سب بھائی ہیں۔ سب بھارت ماتا کے سپوت ہیں۔ کوئی کسی سے بڑا یا چھوٹا نہیں ہے۔ اب سیکنڈ کلاس اور تھرڈ کلاس کے فرق کو بھول جائیے۔ سب کو برابر کا سمجھئے۔ جائیے تشریف رکھئے نہیں تو تھرڈ کلاس میں بھی جگہ نہ ملے گی۔“ ہم یہ کھرا جواب سُن کر منہ لٹکائے ہوئے اپنے درجہ میں آ گئے جہاں ہماری جگہ پر قبضہ ہو چکا تھا اور ہم کو یہ طے کرنا پڑا کہ کھڑے کھڑے سفر ہوگا یا غسل خانہ میں جگہ ملے گی مجبوراً اپنا ٹرنک گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئے اور گاڑی چھوٹنے کا انتظار کرنے لگے۔

ہم کو بیٹھے بیٹھے بھی ایک گھنٹہ کے قریب ہو گیا۔ گاڑی بدستور کھڑی رہی۔ گھبرا کر ہم پلیٹ فارم پر آئے تو دیکھا کہ انجن گاڑی میں لگایا جا رہا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ کانپور ہی کی طرف لگایا جا رہا ہے۔ لیکن انجن لگنے کے بعد بھی گاڑی جب دیر تک نہ چھوٹی تو ہم نے اس تاخیر کا سبب دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی کا انتظار ہے، وہ کانپور جائینگے انھوں نے کہلا بھیجا تھا کہ بارہ بجے آ جائیں گے لیکن ابھی تک نہیں آئے۔ آدمی لانے کے لیے گیا ہوا ہے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ہم کانپور جائیں یا ایک روپیہ سے صبر کر کے ارادہ ملتوی کر دیں۔ کام اشد ضروری تھا اس لیے جانا ضروری تھا۔ گاڑی چھوٹتی نہ تھی اس لیے سفر ملتوی کرنے کا ارادہ تھا۔ عجیب کشمکش میں جان تھی۔ معلوم نہیں، وہ کونسا وقت تھا، جب ہمارے منہ سے یہ دعا نکلی تھی۔ اب تو اس کو واپس کرنا بھی مشکل تھا اس لیے کہ کفرانِ نعمت کا الزام بھی تو ہم پر لگا دیا جاتا۔ ہم اسی غور و فکر میں اپنے ٹرنک پر گردن جھکائے بیٹھے تھے کہ ایک دم سے ”بندے ماترم“ کے فلک شگاف نعروں سے اچھل پڑے۔ معلوم ہوا کہ سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی تشریف لے آئے۔ ہم نے بھی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو ایک مجمع میں وہی لیڈر صاحب دکھائی دئیے جنھوں نے رات کو تقریر کر کے سوراج دلوایا تھا اور اب ہم کو معلوم ہوا کہ یہی سیکرٹری ٹاؤن کانگریس کمیٹی ہیں۔ غرض ان کے تشریف لانے کے بعد ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور انجن بھی شُن شُن کرنے لگا۔ ایک کھدر پوش زیر پا بزرگوار لال اور سبز گاڑھے کی جھنڈیاں لیے ہوئے بھی نمودار ہوئے اور ہم نے اپنی جگہ پر سمجھ لیا کہ یہ گارڈ ہیں ان گارڈ صاحب نے کرتے کی جیب سے ایک سیٹی نکال کر بجائی اور پہلے سُرخ پھر جلدی سے سبز جھنڈی اس طرح ہلانے لگے گویا پہلے

غلطی سے سُرخ جھنڈی ہلا دی تھی۔ دو تین مرتبہ سیٹی بجا کر اور جھنڈی ہلا کر آخر غصہ میں انجن کی طرف جھپٹے اور ڈرائیور کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ گھنٹہ بھر سے سیٹی بجا رہا ہوں مگر تمہارے کان میں آواز ہی نہیں آتی اور آنکھیں بھی پھوٹ گئی ہیں کہ جھنڈی بھی نہیں دیکھتے۔

ڈرائیور نے بھی ان کے بے جا غصہ کا جواب کڑک کر دیا: "جناب آپ آنکھیں مجھ پر کیوں نکال رہے ہیں۔ میرا کیا قصور ہے دو گھنٹے سے للّو فائرمین کوئلہ لینے گیا ہوا ہے۔ کہہ دیا تھا کہ لپک کر جلدی سے لے آ۔ ابھی تک غائب ہے معلوم نہیں کہاں گیا۔ پتہ بھی بتا دیا تھا کہ رکاب گنج کے چوراہے سے یا عیش باغ کے پھاٹک سے لے آنا۔ دو چار پیسے کم زیادہ کا خیال نہ کرنا مگر وہ جا کر مر رہا۔ اب بتائیے میرا کیا قصور ہے۔" گارڈ صاحب بھی ڈرائیور کو بے قصور سمجھ کر چپ ہو گئے اور کوئلہ کے انتظار میں گاڑی روکنے پر مجبور ہو گئے۔ انجن میں یہ بڑی بری بات ہے کہ وہ بغیر کوئلہ کے چل ہی نہیں سکتا۔ جس طرح گھوڑے کے لیے دانہ گھاس ضروری ہے بالکل اسی طرح جب تک کوئلہ بھر نہ دیا جائے انجن چلنے کا نام نہیں لیتا۔ گھوڑا بیچارہ تو تھوڑی دیر بھوکا بھی چل سکتا ہے مگر یہ اتنا بھی کام نہیں دے سکتا۔ اب بتائیے کہ ریل بھی تھی، انجن بھی، مسافر بھی تھے، گارڈ بھی، سیکرٹری صاحب طاعون کانگریس کمیٹی بھی آگئے تھے اور ڈرائیور بھی تھا مگر ایک کوئلہ کے نہ ہونے سے سب کا ہونا نہ ہونا یکساں تھا۔ کامل ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد للّو فائرمین کوئلہ کی گٹھری لیے بکتا ہوا آ پہنچا۔

"آدھی رات کو کوئلہ منگانے چلے ہیں۔ تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں، ایک دکان پر اتنا سا کوئلہ تھا وہ بھی بمشکل تمام ایک روپیہ نو آنہ میں ملا ہے۔ بھاگتا ہوا آ رہا ہوں، راستہ میں گر بھی پڑا تھا۔ تمام گھٹنے چھل گئے۔ کوئلہ وغیرہ دن سے منگا لیا کرو۔"

ڈرائیور نے جلدی سے کوئلہ ڈالا اور سیٹی بجا کر گاڑی چھوڑ دی۔ گاڑی چلی ہی تھی کہ ایک شور مچ گیا، روکو۔ روکو گارڈ صاحب رہ گئے۔" گاڑی پھر رکی اور گارڈ صاحب کو سوار کر کے چلی۔ ابھی دو فرلانگ بھی مشکل سے چلی ہو گی کہ گاڑی پھر رکی اور گارڈ صاحب نے ڈرائیور سے چلا چلا کر پوچھنا شروع کیا۔ "ارے لائن کلیر بھی لے لیا تھا ——— لائن کلیر"۔ ڈرائیور نے بھی چلا کر جواب دیا "لے لیا تھا ——— لے لیا تھا"۔ گارڈ صاحب نے جب اس طرف سے بھی اطمینان کر لیا تو پھر فرمایا۔ "اچھا تو چھوڑو گاڑی میں سیٹی بجاتا ہوں"۔ گاڑی پھر چلی۔ اب گاڑی کی رفتار کے متعلق ہم نے سوچنا شروع کیا کہ یہ میل ہے یا ایکسپریس! اس لیے کہ اس کی رفتار سے زیادہ تیز شاید ہم خود چل لیتے اور اگر ابھی شرط بد کر دوڑیں تو اس گاڑی سے پہلے کانپور پہنچنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ہم سے آخر نہ رہا گیا اور اپنے ایک شریکِ سفر سے پوچھا "کیوں صاحب یہ میل ہے یا ایکسپریس۔" وہ پہلے ہی کچھ خفا بیٹھے تھے غالباً گاڑی پر ہوں گے، غصہ ہم پر اتارا اور جھڑک کر فرمانے لگے "میاں خدا کا شکر بھیجو کہ یہ گاڑی ہی ہے، تم میل ایکسپریس لیے پھر رہے ہو۔" ان کا جواب سن کر ہم نے کھڑکی میں گردن ڈال کر جنگل کی سیر کرنا شروع کر دی مگر سب سے زیادہ دلچسپ منظر یہ تھا کہ راستہ کے نئے مسافر چلتی گاڑی پر سوار ہوتے جاتے تھے اور گاڑی چھک چھک چل رہی تھی۔ اسی رفتار سے چل کر گاڑی اموسی کے اسٹیشن پر رکی۔ اب وہاں ایک نیا جھگڑا یہ شروع ہو گیا کہ اسٹیشن ماسٹر اموسی نے ڈرائیور پر خفا ہونا شروع کیا کہ:-

"جب تک میں نے سگنل نہیں دیا تم کو اسٹیشن میں گاڑی لانے کا حق کونسا تھا؟"

ڈرائیور:- جب آپ نے گاڑی آتے دیکھی تھی تو سگنل کیوں نہیں دیا؟

اسٹیشن ماسٹر:- ایک تو گاڑی لے آیا اوپر سے زبان لڑاتا ہے۔ ابھی نکلوا دوں گا، دوسرا ڈرائیور رکھ لوں گا جو مجھ سے

گستاخی کی۔ اگر گاڑی لڑ جاتی تو تمہارا کیا جاتا، آئی گئی سب ہم پر آتی۔

ڈرائیور:۔ دیکھئے زبان سنبھال کر کسی شریف آدمی سے باتیں کیا کیجئے۔ نوکری کی ہے عزت نہیں بیچی ہے۔ بڑے آئے وہاں سے نکالنے والے، جیسے ہم ان ہی کے تو نوکر ہیں۔ اچھا کیا گاڑی لائے، خوب کیا گاڑی لائے۔ اب اس ضد پر تو ہزار دفعہ لائیں گے۔ دیکھیں ہمارا کوئی کیا کرتا ہے۔

اسٹیشن ماسٹر:۔ دیکھئے گارڈ صاحب منع کر لیجئے اس کو کیسی کمینہ پن کی باتیں کر رہا ہے۔ افسری ماتحتی کا کچھ خیال نہیں۔ میں چھاتی پہ چڑھ کر خون پی لیتا ہوں۔

گارڈ:۔ جانے بھی دو، اماں جانے بھی دو۔ ہائیں ہائیں یہ کیا کرتے ہو؟ اماں تم ہی ہٹ جاؤ۔ بھائی تم ہی ہٹ جاؤ۔ ارے ارے چھوڑو بھی، ہٹو بھی، سنو تو سہی، ارے یار سنو تو۔

اسٹیشن ماسٹر نے ڈرائیور کو اور ڈرائیور نے اسٹیشن ماسٹر کو گھونسے، لاتیں، تھپڑ، جوتے رسید کرنے شروع کر دئے اور تمام مسافر یہ جھگڑا دیکھنے کھڑے ہو گئے۔ بمشکل تمام گارڈ نے بیچ بچاؤ کیا اور سمجھا بجھا کر دونوں کو ٹھنڈا کیا۔ ابھی بیچارہ سمجھا ہی رہا تھا کہ کسی نے آ کر نہایت گھبرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"گارڈ صاحب! اے گارڈ صاحب! اجی وہ مال گاڑی سامنے سے آ رہی ہے اور اسی پٹڑی پہ آ رہی ہے، غضب ہو گیا۔"

گارڈ بھی یہ سنتے ہی بدحواس ہو گیا اور چیخنا شروع کر دیا۔

"مسافرو جلدی اترو، گاڑی لڑتی ہے۔ گاڑی لڑتی ہے، جلدی اترو۔"

سب مسافر گڑبڑا کر اپنا اسباب کچھ لے کر کچھ چھوڑ کر گاڑی سے نکل آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے مال گاڑی جس کا ڈرائیور سو گیا تھا اس گاڑی سے اس بری طرح ٹکرائی کہ کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ کر میرے منہ پر آ پڑا۔ میں ایک دم سے چونک پڑا۔ حقہ کی نے میرے منہ پر آ کر گری تھی۔ حقہ جل چکا تھا، آرام کرسی بھی شبنم سے تر ہو گئی تھی اور گھڑی میں بھی دو بجنے کے قریب تھے۔ میں کرسی سے اٹھ کر چارپائی پر لیٹ گیا، اس لیے کہ اب گاڑی تو سونے کی وجہ سے چھوٹ چکی تھی۔ اب ہو ہی کیا سکتا تھا سوائے آرام سے سونے کے۔

شاہین بچے

میرے یہاں خدا کے فضل سے تین شاہین بچے ہیں جو آپ کی دُعا سے خاکبازی کی تعلیم حاصل کرنے میں شب و روز مصروف ہیں اور اگر سچ پوچھئے تو میں خداوندانِ مکتب کا ممنونِ احسان ہوں کہ وہ ان شاہین بچوں کو یہی یقین دلائے ہوئے ہیں کہ وہ ممولے ہیں۔ جس طرح اللہ آمین سے ان کو پروان چڑھا کر مکتب جانے کے قابل بنایا گیا ہے اسی طرح مکتب بھی ان کے لیے بسم اللہ کا گنبد بنا ہوا ہے۔ جہاں ان کو خود اُڑنا نہیں سکھایا جاتا۔ بلکہ پروں کی گیند اُچھالنا سکھایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ تینوں شاہین بچے جب اسکول سے گھر آتے ہیں۔ تو ایک جال تان کر دن چھپے تک بیڈمنٹن کھیلا کرتے ہیں۔ اور وہ پروں والی گیند ان کے درمیان اُچھلا کرتی ہے۔ جب تمام شٹل کاک خراب ہو جاتے ہیں۔ تو ان شاہین بچوں کی ماں مجھ سے کہتی ہے کہ ؎

پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے

اور میں تو اسی دن ایک درجن شٹل کاک بازار جا کر خرید لاتا ہوں۔ اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ شاہین بچے نہایت محفوظ قسم کا کھیل کھیلتے ہیں۔ جس میں نہ کوئی جان جوکھم کا معاملہ ہے۔ نہ منہ ٹوٹنے اور سر پھوٹنے کا کوئی اندیشہ۔ اگر بارش ہوگی۔ اور پروں والی گیند کی پرواز میں کوتاہی واقع ہوگی۔ تو یہ شاہین بچے ایک بڑی سی میز پر جال تان کر چھوٹی چھوٹی تھاپیوں سے سلولائڈ کی ہلکی پھلکی گیند سے ٹیبل ٹینس کھیلتے ہیں۔ جس کو وہ پنگ پانگ کہتے ہیں۔ یہ کھیل بھی کچھ خطرناک نہیں ہے۔ کہ چوٹ چپیٹ کا اندیشہ ہو۔ یا مثلاً کیرم ہے۔ یہ بھی محفوظ قسم کا کھیل ہے، کہ انگلی ذرا بچا کر اسٹرائکر چلایا جائے۔ تو کسی قسم کے گزند کا امکان نہیں۔ بڑا شاہین بچہ چونکہ کالج میں پڑھتا ہے لہذا وہ کبھی کبھی بیرڈ کھیلنے بھی چلا جاتا ہے۔ یا اپنے احباب کو بلا کر جو اتفاق سے سب کے سب شاہین بچے ہیں۔ تاش وغیرہ کھیل لیتا ہے۔ اس میں نقصانِ مایہ تو ہے۔ بلکہ شماتتِ ہمسایہ بھی ہے۔ مگر یہی کیا کم ہے۔ کہ زندگی کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ جان کا صدقہ مال ہے۔ لہذا میں اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں کہ وہ برج اور پوکر وغیرہ کھیل کر کچھ ہار جاتا ہے مگر ہاکی اور کرکٹ قسم کے خطرناک کھیل تو نہیں کھیلتا۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ یہ قماربازی ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں یہی کیا کم ہے۔ کہ کوئی جان کی بازی نہ لگائے۔ جب تک میں

کمارہا ہوں ان کی قمار بازی بھی ایک قسم کی بارلیش بابا بازی ہے۔ اس کے بعد خود ہی سنبھل جائیں گے مطلب تو یہ ہے کہ کسی طرح بھی تو بچیں۔

میں اپنے اوپر زمانے کی تمام سختیاں ان ہی شاہین بچوں کے لیے جھیلتا ہوں کہ ان کا بال بیکا نہ ہو۔ جاڑے کی ٹھٹھرا دینے والی راتوں میں لحاف ایسی نعمت کو چھوڑ کر میز پر بیٹھا دماغ کو ان ہی کے آرام کے لیے تو نچوڑا کرتا ہوں۔ کہ ان کے لیے سویٹر سے لے کر چیسٹر تک ہر چیز اعلیٰ درجہ کی میسّر آسکے۔ اور جب مئی جون کی آگ برسانے والی گرمی انسان کو بھون کر رکھ دیتی ہے۔ میں ان شاہین بچوں کے لیے خسخانہ اور برفاب کو کافی نہیں سمجھتا۔ بلکہ اپنی تکلیف کا خیال کیے بغیر ان سے بھی کہتا ہوں۔ کہ۔ ع

تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اور ان کو پہاڑ پر بھیج کر خود اسی جہنّم میں بدستور محنت کرتا رہتا ہوں۔ کہ ان کے پہاڑ کے اخراجات برابر بھیجتا رہوں اگر وہ کہتے بھی ہیں "آپ نہیں چلیں گے پہاڑ پر" تو کہہ دیتا ہوں کہ۔ میں تم کو محض اس لیے شاہین بچہ کہتا ہوں کہ تم مجھ کو کرگس ہی سمجھتے رہو!

میرے یہ شاہین بچّے تکلیف اُٹھانے کے عادی نہیں ہیں۔ فاقہ تو خیر خدا دشمن پر بھی نہ ڈالے۔ یہ شاہین بچّے تو موٹا جھوٹا بھی نہیں کھا سکتے۔ کھانا تو درکنار اگر چائے کا وقت بھی ٹل جائے۔ تو ان کے دشمنوں کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ جمائیاں اور انگڑائیاں لینا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر بھی چائے نہ ملے۔ تو دردِ سر اور اگر دردِ سر کے بعد بھی چائے میسّر نہ آئے تو حرارت۔ حرارت کے بعد بخار اور پھر بخار تو آپ جانتے ہی ہیں۔ کہ ہزاروں طرح کا ہوتا ہے۔ لہٰذا طے یہ ہے کہ ادھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے۔ مگر ان کو وقت پر چائے ضرور ملنا چاہیے۔ پھر چائے بھی نگوڑی ناٹھی قسم کی نہیں خالی چلے تو کلیجے پر لگتی ہے۔ تیر کی طرح کچھ نہ کچھ تو چائے کے ساتھ کھانا ہی چاہیے۔ اور اس کچھ نہ کچھ کے ذیل میں کیک۔ پیسٹری، بسکٹ، مختلف قسم کے پھل سب ہی کچھ آتے ہیں۔ رہ گیا کھانا وہ اگر ان شاہین بچّوں کو اچھا نہ ملے گا۔ تو یہ ناز و نعم میں پلے ہوئے اپنی صحت کیونکر برقرار رکھ سکیں گے۔ صحت تو خیر روٹی اور سالن سے بھی برقرار رہتی ہے۔ مگر دل کمزور ہو جاتا ہے۔ یہ محسوس کر کے کہ یہ غریبوں کا کھانا ہے۔ اور امیروں کے دسترخوان پر انواع و اقسام کی چیزیں ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان شاہین بچّوں کو ضعفِ قلب سے بچانے کے لیے کھانے کا بھی معقول ہی انتظام کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ ان کو باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیمی کا احساس نہ پیدا ہو۔ اور باپ کے گھر کو وہ یتیم خانہ سمجھ کر دل شکستہ نہ ہو جائیں۔

یہ قاعدے کی بات ہے۔ کہ اچھا کھانے والے اچھا پہننا بھی چاہتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو دیکھا ہے، کہ وہ اپنے لباس میں ہر طرح کا تکلّف برتتے ہیں۔ مگر اولاد کو کچھ اس طرح پہناتے اوڑھاتے ہیں کہ وہ کچھ لے پالک یا سوتیلی سی اولاد نظر آتی ہے۔ اس قسم کے بچّے ابتدا ہی سے احساسِ کمتری کا شکار ہو کر کرگس زادے تو خیر بن جاتے ہیں۔ مگر شاہین بچّے نہیں بن سکتے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میں اپنے شاہین بچّوں کو اپنی اوقات سے زیادہ شاندار لباس بھی مہیّا

کرتا ہوں - اور وہ بھی ایسے تمیزدار ہیں - کہ کیا مجال کہ نیلے سوٹ پر براؤن جوتا یا کریم رنگ کے پتلون پر سیاہ بوٹ تو پہن لیں - میری آنکھوں میں خاک ایسے جامہ زیب بچے آپ کو مشکل ہی نظر آئیں گے - میری آنکھوں میں خاک میں نے اس لیے عرض کیا کہ ماں باپ کی نظر سب سے زیادہ اولاد کو لگتی ہے - پھر یہ کہ میرے شاہین بچے اس قدر نفاست پسند ہیں - کہ اگر آپ ان میں سے کسی کی ڈریسنگ ٹیبل دیکھ لیں تو دنگ رہ جائیں - کنگھا تو میز پر کیا معنی وہ جیب میں بھی رکھتے ہیں - آئینے اور کنگھے کے علاوہ بے شمار شیشیاں ڈبے اور ڈبیاں آپ کو ان کی ڈریسنگ ٹیبل پر سجی ہوئی نظر آئیں گی - رات کو لگانے کی کریم الگ ہے - صبح کو لگانے کی اسنو الگ، ناخن تیز کرنے کے اوزار - بالوں میں چھلے بنانے کے کل پرزے - بھنوؤں کا تناسب قائم رکھنے کے لیے بال کی کھال نکالنے والی قینچیاں - لبوں پر لگانے کے لیے خاص قسم کے موم و روغن مختصر یہ کہ ایک دکان سی سجی ہوئی نظر آئے گی - اور یہ تمام چیزیں محض اس لیے مہیا کرنی پڑتی ہیں - کہ شجرہ تو ان کے گلے میں لٹکایا نہیں جا سکتا۔ صورت ہی سے شرافت پر رسائی جا سکتی ہے - کہ دیکھنے والے ایک ہی نظر میں بھانپ لیں کہ ہاں یہ ہیں نجیب الطرفین شاہین بچے۔

اس طرح تو صاحب ان شاہین بچوں کو پروان چڑھایا گیا ہے اور مرزا صاحب سے جو پوچھا کہ بڑے بچے کو آخر کس کام سے لگایا جائے کالج سے نکلنے والا ہے - تو عقلمندی ملاحظہ ہو فرماتے ہیں کہ۔

قبلہ میری تو یہ رائے ہے کہ ایر فورس میں بھیج دیجیے۔

ایر فورس کا نام سن کر ہوش اڑ گئے - یعنی ہوائی جہاز کی نوکری چہ خوش - عرض کیا - مرزا صاحب میں نے تو یہ سمجھ کر آپ کی رائے طلب کی تھی - کہ آپ ماشاء اللہ خود صاحبِ اولاد ہیں۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر مشورہ دینگے - مگر آپنے تو عجیب بات فرمائی ہے۔"

مرزا صاحب نے اسی استغنا سے فرمایا - میں نے تو اپنے نزدیک بہترین مشورہ دیا ہے - صاحبزادے کی ماشاء اللہ صحت بھی اچھی ہے - چشمِ بد دور ہاتھ پیر کے بھی اچھے ہیں - ان کے لیے ایر فورس میں ترقی کے بڑے امکانات ہیں - اور اگر سچ پوچھئے تو ہمارے ایر فورس میں ایسے ہی نوجوانوں کی ضرورت ہے۔

عرض کیا۔ ترقی گئی بھاڑ میں مرزا صاحب ذرا غور تو فرمائیے کہ میں اپنے ہاتھوں اپنے جگر کے ٹکڑے کو بھلا کیونکر ایئر فورس میں جھونک سکتا ہوں کہ جاؤ بیٹا اپنی جان سے دور اڑ جاؤ ہے ہے تصور کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں طرح طرح کے ہول آنے لگتے ہیں - یہ آپنے کیا مشورہ دیا ہے۔"

مرزا صاحب نے فرمایا - لاحول ولا قوۃ۔ کس قدر فرسودہ تخیل ہے - آپ کا بھی - اے جناب اب وہ زمانہ گیا۔ جب ان لاڈلوں کو روئی کے گالوں میں پٹاری کے انگور کی طرح سینت سینت کر رکھا جاتا تھا۔ اب آپ ایک آزاد اور خود مختار ملک کے ذمہ دار شہری ہیں -

گھبرا کر عرض کیا - دیکھو بھئی مرزا - اولاد کے معاملہ میں تو یہ سیاسی باتیں مجھ سے کرو نہیں - مجھے ہوتی ہے الجھن - میں سیاست کا بس اتنا ہی قائل ہوں کہ جتنا چاہو مجھ سے چندہ لے لو - کوئی مر جائے کالی شیروانی پہنا دو -

مجھ کو، کوئی سیاسی جشن ہو گھر پر چراغاں کرنے کو میں موجود ہوں۔ مگر چندے میں اولاد نہیں دے سکتا۔ یہ آپ نے کیا منہ بھر کر کہہ دیا۔ کہ ایر فورس میں بھیج دوں۔

مرزا صاحب پھر بھی قائل نہ ہوئے۔ جوتوں سمیت آنکھوں میں گھس کر بولے، "بندہ نواز اب یہ خودنگری اور خودشناسی کا دَور ہے۔ اب قوم کا ہر فرد سپاہی ہے۔ ملت کا ہر نوجوان ملت کے مقدر کا ستارہ ہے۔ اگر آپ اسی طرح شاہین بچوں کو ممولا بنائے رکھیں گے۔ اور شہباز بننے سے روکیں گے۔ تو آخر ہمارا مستقبل کیا ہوگا۔

اُلجھ کر عرض کیا۔ خیر میں آپ سے بحث تو کرنا نہیں چاہتا میں تو یہ پوچھ رہا تھا کہ ان کے لیے وکالت اچھی رہے گی۔ یا ڈاکٹری۔

مرزا صاحب نے فرمایا۔ ڈاکٹری بھی اچھی ہے۔ اس وقت ہم کو ڈاکٹروں کی بے حد ضرورت ہے۔ اور اس ضرورت کو پورا کرنا ان بزرگوں کا فرض ہے۔ جو اپنے بچّوں کو ڈاکٹری کی تعلیم دلوانے کی استطاعت رکھتے ہیں۔"

عرض کیا۔ ڈاکٹری کے فوائد تو میں خود جانتا ہوں۔ نہایت شریف پیشہ ہے۔ اور اگر چل نکلی ڈاکٹری تو دولت قدم بھی چومے گی۔ مگر قباحت یہ ہے کہ صاحبزادے واقع ہوئے ہیں۔ نہایت کمزور دل کے ایک مرتبہ مرغ ذبح ہوتے دیکھ لیا۔ اب سے دوَر ایک ہفتہ تک بخار آتا رہا۔ سوتے میں اُچھل اُچھل پڑتا تھا۔ ڈاکٹری میں چیر پھاڑ کیسے کریں گے۔ اور بھی سُنا ہے۔ کہ لاشوں کو چیرنا پھاڑنا پڑتا ہے۔"

مرزا صاحب نے فرمایا۔ جی ہاں یہ تو ہے۔ مگر اس میں مضائقہ کیا ہے۔

عرض کیا۔ جو مضائقہ ہے۔ اس کا افسوس یہ ہے۔ کہ تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ بہر حال ڈاکٹری سے تو باز آیا میں رہ گئی وکالت ویسے تو اس پیشہ میں کوئی خرابی نہیں۔ مگر ایک بات سے ذرا ڈر لگتا ہے۔ کہ اگر خدا نخواستہ وکالت نہ چلی اور صاحبزادے بن گئے کچھ لیڈر ویڈر تو میں کیا کرونگا۔"

مرزا صاحب عقل کے ذرا واجبی ہی سے لوگ ہیں۔ آنکھیں پھاڑ کر بولے۔ تو اور کیا چاہیئے۔ آپ کو، اگر صاحبزادے لیڈر بن جائیں۔ اور ان کو عوام اپنا رہنما تسلیم کر لیں تو اس سے زیادہ آپ کے لیے باعثِ فخر اور کون سی بات ہو سکتی ہے۔

سمجھاتے ہوئے عرض کیا۔ میاں بات سمجھنے کی کوشش کیا کرو۔ لیڈر کوئی بے وفا ہی نہیں بن جاتا۔ اس کے لیے بڑے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ صرف زندہ باد ہی کے نعرے بلند نہیں ہوتے مُردہ باد کے نعرے بھی ہم نے سُنے ہیں۔ صرف پھُول ہی نچھاور نہیں کیے جاتے۔ جُوتے بھی اُچھالے جاتے ہیں۔ خوش آمدید ہی نہیں کہا جاتا۔ واپس جاؤ بھی کہا جاتا ہے۔ جلوس ہی نہیں نکلتا۔ کالی جھنڈیاں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ خیر یہ سب کچھ بھی سہی مگر لیڈر بننے کے لیے پولیس کے ڈنڈے بھی کھانا پڑتے ہیں کبھی کبھی، اور شیطان کے کان بہرے جیل میں چکی بھی پیسنا پڑتی ہے۔ بس میں ان ہی باتوں سے ذرا ڈرتا ہوں۔ اور چونکہ میں نے وکیلوں بیرسٹروں ہی کو زیادہ تر لیڈر بنتے ہوئے دیکھا ہے۔ لہٰذا وکالت سے کچھ دل کھٹا سا ہو گیا ہے۔"

مرزا صاحب نے گویا تمسخر سے فرمایا۔ اس قسم کے اندیشے تو کم و بیش ہر مشغلہ میں موجود ہیں۔ اور یہ نشیب و فراز تو عملی زندگی میں ہر ایک کے لیے موجود ہیں۔ زیادہ محتاط طریقہ تو یہ تھا۔ کہ اس زمانہ میں ان صاحبزادوں کو پیدا ہی نہ کیا جاتا۔“

عرض کیا خیر اب تو پیدا ہو ہی گئے ہیں۔ لہٰذا کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ میں کہتا ہوں کسی مقابلہ کے امتحان میں کیوں نہ بٹھا دوں۔

مرزا صاحب نے کہا۔ بڑا اچھا خیال ہے۔ مگر ان امتحانوں میں بھی اس قسم کی خطرناک وادیوں سے گزرنا ہی پڑیگا۔ مثلاً پولیس کی ملازمت کو آپ کیا سمجھتے ہیں۔

کانوں پر ہاتھ رکھ کر عرض کیا۔ اجی توبہ کیجئے مرزا صاحب ہتھیلی پر جان لیے پھرتے ہیں۔ یہ بیچارے پولیس والے ایسی بھی سرفروشی کیا کہ انسان واقعی سر کاٹ کر بیچنا شروع کر دے۔ ایک سے ایک خونخوار بدمعاش سے آئے دن سابقہ پڑتا ہے۔ پھر یہ کہ ایسی سخت ڈیوٹی کہ نہ دن کو دن سمجھو نہ رات کو رات۔ صاحب آدھی آدھی رات تک تو یہ پولیس والے گشت لگاتے پھرتے ہیں۔ بلوہ ہو جائے تو گولیوں کی بارش میں سینہ تان کر جاؤ۔ ان صاحبزادے نے تو آج تک شب برات کی آتش بازی بھی اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوڑائی۔ یہ پستول کیونکر چلائیں گے۔ اور اس قسم کی بے شمار باتیں ہیں۔ جن کو میں مناسب نہیں سمجھتا۔ مثلاً گھوڑے کی سواری کو میں نہایت غلط سمجھتا ہوں۔ یا گھوڑے کی جگہ پر وہ جو موٹر سائیکل آجکل نکلی ہے۔ وہ اور بھی خطرناک۔

مرزا صاحب نے پھر چٹکیوں پر اڑایا۔ اگر پولیس آفیسر ڈولی میں بیٹھا کریں۔ اور وردی میں چوڑیاں بھی ہوں۔ تو غالباً کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔“

جل کر عرض کیا۔ برادرم آپ تو خیر مذاق فرما رہے ہیں۔ یہ تو اپنے اپنے دل کی بات ہے۔ میرا دل ایسا مضبوط نہیں ہے۔ کہ اس بچہ کے لیے میں ایسی ملازمت کو موزوں سمجھوں جس میں بس بدمعاشوں ہی سے واسطہ پڑے خواہ وہ بدمعاش انسان ہوں یا بدمعاش گھوڑے۔ مجھ کو تو اس کے لیے ایسے مشغلہ کی ضرورت ہے جس میں امن و امان کے ساتھ زیادہ نہیں تو بس اتنا پیسہ مل جائے کہ جس طرح کی زندگی میں نے اس کو بسر کرائی ہے۔ وہ خود بھی بسر کر سکے۔

مرزا صاحب بولے؛ بندہ پرور آپ نے تو بچوں کو مرزا پھویا بنا کر رکھ دیا ہے۔ اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ مردوں کو مرد بن کر رہنا پڑے گا۔ وہ گہواروں میں جھولنے کا زمانہ گیا۔ اب آپ ایک آزاد قوم کے فرد ہیں۔ اور قوم کی یہ آزادی اسی وقت تک برقرار رہ سکتی ہے۔ جب تک قوم کے ہر فرد میں اس آزادی کے تحفظ کا صرف جذبہ ہی نہیں۔ بلکہ بل بوتا بھی موجود ہے۔ ہر شخص ملت کا جانباز سپاہی بن کر رہے گا۔ اب ملت کے افراد موت سے ٹکرا ٹکرا کر زندگی کے حقوق حاصل کریں گے۔ یہ عمل پیہم کا زمانہ ہے۔ یہ جد و جہد کا دور ہے۔ یہ ہم کو تلافی مافات کا موقع ملا ہے۔ اور اگر اس وقت بھی ہمارا یہی عالم رہا۔ جو آپ کا میں دیکھ رہا ہوں تو پھر خدا ہی حافظ ہے ہمارا۔

عرض کیا۔ بھائی جان آپ تو یہ باتیں کچھ کتابوں کی دنیا کی کر رہے ہیں۔ اس قسم کی باتیں کتابوں میں تو خیر پڑھی جا

سکتی ہیں۔ مگر ان پر عمل ذرا مشکل سے ہو سکتا ہے۔

مرزا صاحب بات کاٹ کر بولے۔ عمل کیوں نہیں ہو سکتا ہے۔ آپ کے سامنے ہی مثال موجود ہے۔ کہ میں نے اپنے دو بڑے بچوں کو نیوی میں بھیج دیا ہے۔ دو چھوٹے بچے ایئر فورس کے لیے تیار کر رہا ہوں۔ آخر ان بچوں کو بھی میں کہیں سے اٹھا تو نہیں لایا تھا۔ اولاد ہی تو ہیں۔ مگر میں اولاد کے ساتھ جو بہتر سے بہتر سلوک کر سکتا تھا۔ وہ یہی تھا جو میں نے کیا۔

عرض کیا، یہ سلوک کیا۔ کہ ان کو جان بوجھ کر ایسے محکموں میں بھیجا کہ خدا ہی ان کا حافظ ہے۔ اصل میں یہ بڑی ہی غلطی تھی۔ کہ میں آپ سے مشورہ کرنے بیٹھ گیا جس نے خود اپنے بچوں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہو۔ وہ دوسرے کی اولاد کے لیے دل میں کیا درد رکھ سکتا ہے۔"

مرزا صاحب نے پھر بنانے کی کوشش کی:۔ میری رائے میں تو آپ صاحبزادوں کو ایک ایک دودھ کی شیشی خرید کر ایک ایک کھلائی کے سپرد کر دیں۔ کہ ان کو لوریاں سناتی رہے اس لیے کہ ان ہی کو پاکستان کا امین بننا ہے۔ اور یہی اس آزادی کے محافظ ہوں گے۔

مرزا صاحب تو اس قسم کی جلی کٹی سنا کر تشریف لے گئے۔ عجیب پتھر دل پایا ہے۔ اس شخص نے بھی مگر اب ہر ایک تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ بھلا غور تو کیجئے وہ بچے دھوپ میں کملا جائیں۔ جو ٹھنڈی ہوا میں چھینکیں لینے لگیں ان کے لیے آپ تجویز فرماتے ہیں۔ ایئر فورس۔ پولیس کی نوکری۔ فوج اور سپہ گری۔ سبحان اللہ، دروازہ زور سے بند ہو جاتا ہے تو وہ اچھل پڑتے ہیں۔ ننھا سا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ بھلا وہ پستول اور بندوق سے کیونکر کھیل سکیں گے۔ اور صاحب سو باتوں کی ایک بات تو یہ کہ اپنے جیتے جی تو یہ ہو نہیں سکتا کہ ان کو آنکھ بند کر جھونک دیا جائے کسی ایسے محکمہ میں بلکہ اگر وہ خود اس قسم کا ارادہ کریں بھی تو میں یہی کہونگا۔ کہ ؎

اللہ آمیں سے ہم تو یوں پالیں
آپ آفت میں جان کو ڈالیں

یہاں زندگی کے لالے پڑے ہیں جی۔ بچپن میں یہی بہت ہے۔ اگر یہی روزگار رہ گئے ہیں۔ تو ان کے لیے بیکاری بھلی۔

تعزیت

ریاض کے والد بزرگوار نے انتقال فرما کر ایک عجیب سوال پیدا کر دیا تھا کہ والدین کو اولاد کا غم شدت کے ساتھ ہوتا ہے یا اولاد کو والدین کا غم؟ ماشاء اللہ ایک سو پانچ یا ایک سو چھ سال کی عمر میں انتقال فرمایا تھا۔ لیکن ریاض کا یہ حال تھا کہ مچھلی کی طرح تڑپتا تھا معلوم ہوتا تھا کہ جوان اولاد کا داغ کھایا ہے۔ دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹا جاتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اگر اولاد اپنے والدین کا غم منانے پر تُل جائے تو والدین کا داغ بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ بیٹے یا بیٹی کے مرنے سے والدین یتیم نہیں ہوتے لیکن باپ کے مرنے سے اولاد یتیم خانے میں داخل کر دی جاتی ہے۔ اولاد کے مرنے کے بعد انسان اپنی دوسری اولادوں کو دیکھ کر صبر کر لیتا ہے ورنہ کم سے کم یہ امکان تو ضرور ہوتا ہے کہ خداوند کریم اور دے گا لیکن سوال تو یہ ہے کہ ریاض بیچارے اپنے لیے والد کا انتظام کیونکر کرتے۔ ان کو تو یہی غم تھا کہ اگر قیامت تک بھی زندہ رہے تو بغیر باپ کے رہنا پڑے گا۔ ماں کے غم سے وہ واقف نہ تھے۔ اس لیے کہ وہ غریب ان ہی حضرت کی پیدائش کے سلسلے میں دنیا سے کوچ کر چکی تھیں اور ان کو ان ہی ایک عدد مرحوم والد بزرگوار نے ماں اور باپ دونوں بن کر پالا تھا لہٰذا ان کی ماں تھے تو وہی اور باپ تھے تو وہی جن کو موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہمیشہ کے لیے ان سے جدا کر دیا تھا۔

ریاض کے والد ماجد کا انتقال خود ان کے لیے تو غم کا پہاڑ پھٹ پڑنے کے برابر تھا لیکن اس سلسلہ میں ہم بھی کچھ کم مصیبت میں مبتلا نہ تھے اس لیے کہ بحیثیت دوست کے ہم کو ریاض کے پاس تعزیت کے لیے جانا تھا۔ ان سے اظہارِ ہمدردی کرنا تھا۔ جنازہ میں عدم شرکت کے عذر کرنا تھے وغیرہ وغیرہ لیکن ہم اس سے قطعاً ناواقف تھے کہ ہم کو اس سلسلہ میں کیا کیا کرنا ہوگا۔ زندگی بھر میں پہلی مرتبہ یہ ضرورت پیش آئی تھی اور وقت اتنا تھا نہیں کہ ہم تعزیت کے متعلق مفصل معلومات بہم پہنچا کر تھوڑی بہت مشق کر لیں۔ بہرحال ہم کو اتنا اطمینان تو تھا ہی کہ ہم بالکل کورے ثابت نہ ہوں گے۔ اس لیے کہ متعدد مرتبہ لوگ ہمارے پاس تعزیت کے لیے آ چکے تھے اور متعدد مرتبہ ہم نے دوسرے لوگوں کو آپس میں یہی مشکل کام انجام دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اگر کچھ ہم کو جھجک تھی تو صرف اس لیے کہ خود ہم نے بنفسِ نفیس آج تک یہ رسم ادا نہ کی تھی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ جانا اور تعزیت کرنا تقریباً ناگزیر تھا لہٰذا ہم نے اللہ کا نام لے کر اپنے ارادے کو پختہ کر لیا اور مختلف اوقات میں جو تعزیتی الفاظ ہمارے کانوں میں پڑ چکے تھے ذہن پر زور دے کر یکجا کرنا شروع کر دیے۔

”مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے ——— صبر کیجیے ——— جس کی چیز تھی اس نے لے لی ——— دنیا کا یہی دستور ہے۔

مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ کیا علیل ہوئے تھے؛ ہم کو بھی ایک دن اسی راہ پر جانا ہے ــــ آج وہ، کل ہماری باری ہے ــــ خدا بخشے عجیب انسان تھے۔ دل کو یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جدا ہو گئے۔ کوئی نشانی بھی چھوڑی ہے؟ "ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد" ــــ مگر صبر کیجیے ــــ اب رونے سے کیا ہوتا ہے۔ ہر ایک پر یہ دن آنے والا ہے ــــ دنیا سرائے فانی ہے۔ کیا اخلاق تھا مرحوم کا، ہر ایک خوش ــــ کبھی نماز قضا نہیں کی ــــ خدا نعم البدل دے گا ــــ اپنے دل کو سنبھالیے ــــ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے ــــ حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے ــــ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں ــــ ابھی تو نہ تھے ان کے مرنے کے دن ــــ الٰہی عاقبت محمود گرداں ــــ چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں۔"

ہمارے پاس تعزیتی الفاظ کی کمی نہ تھی لیکن آسان سے آسان کام جب تک انسان کر نہ لے اس کے لیے مشکل بنا رہتا ہے۔ بہرحال اب تو ہم کو اس دشواری سے دوچار ہونا ہی تھا لہٰذا ہم نے ان الفاظ کو ترتیب وار دماغ میں محفوظ کر لیا اور ان کی مشق کرنے کے بعد ہم "ایکسپرٹ" ہو گئے تو نصف اطمینان اور نصف بے اطمینانی کی حالت کے ساتھ گھر سے اس طرح چلے گویا یونیورسٹی کے کسی امتحان میں بیٹھنے کے لیے جا رہے ہیں۔ تمام راستہ بھر تعزیتی الفاظ رٹتے رہے اور آخر کار ہماری تعزیتی تقریر کچھ اس طرح تیار ہو گئی۔

"مجھ کو تو کل اطلاع ہوئی، واللہ دل کو یقین نہیں آتا، عجیب سانحہ ہے، عجیب حادثہ ہے۔ خداوند کریم آپ کو صبر دے اور مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ کیا علیل تھے؛ ہر ایک خوش، کبھی نماز قضا نہیں کی ــــ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔ صبر کیجیے، کیا اخلاق تھا مرحوم کا، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ آپ کی قسمت میں یہ غم لکھا تھا ــــ حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے جس کی چیز تھی اس نے لے لی ــــ "ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد" ــــ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ روحیں آزاد نہ ہوں، جسم جو برباد نہ ہوں، ابھی تو نہ تھے ان کے مرنے کے دن، مریں گے تو سانچے میں ڈھل جائیں گے۔ وہ تو جنت کا ایک پھول تھے۔ حوروں کی گود میں ہوں گے۔ نمازی، پرہیزگار، خوش وضع، خوش اخلاق، دوست نواز، غریب پرور، نیک، اچھے، فرشتہ صفت، محبت کرنے والے، پڑھے لکھے، فخرِ خاندان، مختصر یہ کہ خدا آپ کو صبر کی توفیق دے۔ خدا آپ کو نعم البدل عطا فرمائے، خدا آپ کا غم غلط کرے مجھ کو اطلاع ہوتی تو شاید کچھ کام آتا۔ مٹی دینے میں شرکت کرتا۔ نمازِ جنازہ میں شریک ہو جاتا مگر افسوس کہ آج وہ کل ہماری باری ہے۔ چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں۔ السلام علیکم۔"

ریاض کے دروازے پر پہنچ کر ارادہ ہوا کہ "خط لے جائیے" کی آواز دیں لیکن یاد آ گیا کہ غم کا موقع ہے، فوراً اپنا چہرہ اداس بنا لیا اور مری ہوئی آواز کے ساتھ پکارا "ریاض صاحب تشریف رکھتے ہیں؟" آواز کے ساتھ ہی ملازم برآمد ہوا اور ہم کو اپنے ہمراہ گھر میں لے گیا جہاں ایک کمرے میں ریاض اوڑھے لپیٹے پڑے تھے۔ ہم نے مضمحل آواز میں کہا۔

"السلام علیکم!"

انھوں نے اس کے جواب میں "والے کم۔ اس سالام" کہہ کر زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ ہمارا بھی دل بھر آیا لیکن یہ موقع ہمارے رونے کا نہ تھا۔ ہم تعزیت کے لیے آئے تھے لہٰذا ہم کو جلد سے جلد اپنی تعزیتی تقریر شروع کرنا تھی۔ ہم نے جلد جلد دل ہی دل میں تقریر دہرانا شروع کی لیکن ریاض رو رو کر کچھ ایسے ہاتھ پیر پھیلائے دیتا تھا کہ ہم اپنی تقریر بھولے جا رہے تھے۔ لاکھ لاکھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اس کی ہر ہچکی خیالات منتشر کر دیتی تھی اور ہم پھر شروع سے تقریر یاد کرنے لگتے تھے۔ جب اسی میں بڑی دیر ہو گئی تو ہم نے

اپنی خاموشی پر غور کیا کہ یہ تو بڑی بری بات ہے کہ وہ روتے روتے جان دیے دیتا ہے اور ہم چپ بیٹھے ہیں مجبوراً ہم نے طے کر لیا کہ کچھ نہ کچھ کہنا ضرور چاہیے جو اس خاموشی سے یقیناً بہتر ہوگا لیکن سوال یہ تھا کہ کیا کہیں، کہنے کو تو ہم سب کچھ کہہ سکتے تھے۔ بس بات شروع ہونے کی دیر تھی، لہٰذا یہی سوچ رہے تھے کہ شروع کس طرح کریں، چونکہ یہ بھی ایک اہم مسئلہ تھا لہٰذا اس پر غور کرنے میں کچھ وقت صرف ہوا اور ہم نے جو حساب لگایا تو یہ غور و فکر اور تقریر یاد کرنے کا عرصہ اپنی میزانِ کل پر آکر آدھ گھنٹے کے قریب ہوتا تھا۔ ہم نے کہا: لاحول ولا قوۃ یہ بھی کوئی بات ہے کہ تعزیت کے لیے آتے ہیں اور آدھ گھنٹے سے بت سے بنے بیٹھے ہیں، لہٰذا دماغ پر زور دے کر تعزیتی الفاظ کو ازسرِ نو یاد کیا اور آنکھیں بند کر کے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آپ کے والد ——" پھر سوچا کہ اب کیا کہیں؟ کچھ یاد آگیا تو عرض کیا:۔

"آپ کے والد ——" ہم کو خود یاد نہیں رہا کہ ہم کو کیا یاد آیا تھا مگر ٹھیک ہے وہ بات یہ تھی کہ وہ۔

"آپ کے والد —— آپ کے والد —— آپ کے والد ——" خدا جانے ہم کیا کہنا چاہتے تھے، دماغ میں جیسے گوبر بھرا تھا۔ آخر دماغ نے کام نہ دیا لیکن مناسب یہی معلوم ہوا کہ کچھ کہہ چلو لہٰذا ہم نے پھر کہنا شروع کیا۔

"آپ کے والد —— آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔"

ریاض نے یہ سنتے ہی پھر ایک چیخ اس طرح ماری گویا اس کو انتقال کی خبر میں ہی نے سنائی ہے۔ میں پھر خاموش ہو گیا لیکن ساتھ ہی مجھ کو یاد آیا کہ مجھ کو خاموش نہ ہونا چاہیے لہٰذا میں نے جلد جلد کہنا شروع کیا۔

"آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ آپ کے والد مرحوم کو خدا صبر کی توفیق دے اور آپ کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ کبھی نماز نہیں قضا ہوئی۔ زندگی بھر روزے رکھتے رہے آپ کے والد مرحوم، مشیتِ ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ صبر کیجیے، اب رونے سے کیا ہوتا ہے اور آپ کے والد —— آپ کے والد —— آپ کے والد تھے —— جس پہ گزری ہو یہ وہی جانے مگر اب نہ روئیے —— جانے بھی دیجیے —— ہٹائیے بھی اس قصہ کو —— آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔"

میری تقریر سے ریاض کو تسکین ہو رہی تھی، وہ روتے روتے خاموش ہو گیا تھا اور گردن جھکائے خاموشی کے ساتھ میرے الفاظ سن رہا تھا۔ کبھی کبھی میرے بعض زوردار الفاظ پر گردن اٹھا کر میرا منہ بھی دیکھ لیتا تھا۔ اب میرے بھی حواس درست تھے اور میں نہایت مناسب طریقہ پر تعزیتی تقریر کر رہا تھا۔ میں نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"باپ بھی دنیا میں عجیب نعمت ہیں، بہت سے بیچارے اس ارمان میں مر جاتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر خدا دے تو زندگی کا دے نہیں تو اس سے نہ ہونا ہی اچھا ہے۔"

ریاض برابر میرا منہ دیکھے جا رہا تھا لیکن میرے اس جملہ کا اس پر خاص اثر ہوا۔ اس نے اپنی آنکھیں پھاڑ کر میرے چہرے پر جما دیں۔ میں نے ایک آدھ مرتبہ کھنکار کر پھر کہنا شروع کیا۔

"اب وہ واپس تو نہیں آسکتے۔ مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ ہم کو بھی ایک دن اسی طرح تصویر کھچانا یعنی ایک دن اسی راہ پر جانا ہے۔ خدا بخشے عجیب انسان تھے۔ دل کو یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جدا ہو گئے۔ مجھ کو تو کل خبر ہوئی۔ آج وہ کل ہماری باری ہے ورنہ مجھ کو اطلاع ہوتی تو میں کچھ کام آتا اور بفرضِ محال یعنی یہ کہ مٹی میں شرکت ہو جاتی۔ نمازِ جنازہ تو ضرور ہوتی ہوگی۔"

ریاض نے مخنی آواز میں جواب دیا۔ "جی ہاں فرنگی محل ہی میں مولانا عنایت اللہ صاحب نے پڑھائی تھی۔"

میں :- خیر یہ بھی اچھا ہوا اور خدا آپ کو ضرور صبر دے گا اور رفیر کا کیا ہوا ہوگا؟

ریاض :- عیش باغ کے نئے چمن میں مناسب جگہ لے لی تھی۔

میں :- ہاں واقعی اور تم بیچارے کیا کرتے، تمہارے حواس خود ٹھیک نہ ہوں گے۔ دنیا سرائے فانی ہے۔ کیا اخلاق تھا مرحوم کا! اور بیماری کیا تھی؟

ریاض :- ارے بیماری کیا ضعیفی خود ایک مستقل بیماری ہے۔

میں :- ہاں صاحب بڑی مہلک بیماری ہے۔ خدا سب کو محفوظ رکھے۔ ہمارے بھائی صاحب کا چھوٹا بچہ اسی میں ضائع ہوا کمبخت اب تو عالمگیر ہوتی جاتی ہے۔ غم کا پہاڑ پھوٹ پڑا۔ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔ اور مرحوم نے کوئی نشانی بھی چھوڑی؟

ریاض :- ایک تو میں ہی ہوں۔

میں :- (جلدی سے) تم تو خیر ہو ہی۔ مگر میں نے کہا شاید اور بھی ہوں۔ ارے ہاں کیا تعجب ہے؟

ریاض :- جی ہاں دو بھائی اور ایک بہن اور ہے۔

میں :- وہی مطلب ہے میرا، اور ان کی بیوی کا پہلے ہی انتقال ہو چکا ہے نا؟

ریاض :- جی ہاں میری والدہ تو عرصہ ہوا یعنی میری پیدائش ہی کے وقت انتقال کر گئی تھیں اور میری دوسری والدہ بھی چھ سال ہوتے رحلت فرما گئیں جن کے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔

میں :- ان کے انتقال کا بھی سخت افسوس ہوا مگر مشیتِ ایزدی میں کیا چارہ۔ صبر کیجئے! اور آپ کے والد ماجد کی ماشاء اللہ کیا عمر تھی؟

ریاض :- سو سے کوئی پانچ چھ سال اوپر تھے۔

میں :- افسوس صد افسوس! ع حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔

ریاض نے مجھ کو کچھ اس نظر سے دیکھا گویا میں دنیا داری کر رہا ہوں اور یہ سب تصنع ہے، مگر میں نے موثر انداز میں کہا۔

"خدا گواہ ہے کہ چچا جان مرحوم مجھ کو بھی بالکل آپ ہی کی طرح سمجھتے اور محبت کرتے تھے"۔

ریاض :- جی ہاں! ان کا ہر ایک کے ساتھ یہی سلوک تھا۔

میں :- ارے بھائی میں نہ جانتا ہوں تو مجھ سے کہو۔ میں تو یہ کہتا ہوں خدا ایسا لائق باپ ساری دنیا کو دے۔ ہر ایک خوش، کبھی نماز قضا نہیں کی۔ ابھی تو نہ تھے ان کے مرنے کے دن، خدا جانے کس کی نظر کھا گئی۔ تو سب سے بڑے آپ ہیں؟

ریاض :- جی ہاں اب تمام ذمہ داری میرے ہی سر ہے۔

میں :- گھبرائیے نہیں۔ جس خدا نے ان کو اٹھایا ہے وہی آپ کی ذمہ داریوں کو بھی پورا کرے گا۔ دنیا سرائے فانی ہے عجب ذات شریف تھے مرحوم۔ کبھی نماز قضا نہیں کی آخر ان ہی کی قضا آگئی ع

این ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

دنیا کا یہی دستور ہے۔ دنیا سرائے فانی ہے۔ ایک آتا ہے ایک جاتا ہے! اور آپ کی شادی تو ہو چکی ہے نا؟

ریاض :- جی ابھی تو نہیں ہوئی۔

میں :- (بزرگانہ اور تجربہ کارانہ انداز سے) بھائی تو اسی سلسلہ میں اس فرض سے بھی ادا ہو جاؤ۔

ریاض :- اس کا یہ کونسا موقع ہے بھلا؟

میں :- تو اب اور کون سا موقع آئے گا؟

ریاض :- اب خوش ہونے والا کون ہے؟ جو تھے وہی نہیں رہے تو اب کیا ہوگی شادی؟

میں :- ہاں یہ تو سچ کہتے ہو کہ چچا جان مرحوم کو چاہیئے تھا کہ اس خوشی کو دیکھ کر دنیا سے رخصت ہوتے مگر بھائی خوش ہونے والے ہم لوگ موجود ہیں۔ خدا مرحوم کو غریقِ رحمت کرے۔ جس کی چیز تھی اس نے لے لی مگر بھائی شادی میں اب دیر نہ کرو زندگی کا کوئی اعتبار نہیں

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

خدا جانے کل کیا ہونے والا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ع

سامان سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں

اب دیکھو نا چچا میاں مرحوم کو، بیچارے آخر کیا بیمار تھے۔ یہی نا کہ بس قضا آگئی ورنہ کہیں مرنے کے آثار تھے؟ کسی کو شبہ بھی ہوتا تھا کہ مرجائیں گے؟ مگر خدا کی مصلحت! اور تم پر تو وہ جان دیتے تھے۔ اب تم کو کون اس طرح چاہے گا۔ تمہارا محبت کرنے والا اٹھ گیا۔ تم یتیم ہوگئے تم پر سے والدین کا سایہ اٹھ گیا۔ ع

دل صاحبِ اولاد سے انصاف طلب ہے

ریاض نے پھر ہچکیاں لے کر رونا شروع کر دیا اور میں گھبرایا کہ اب کس طرح سمجھاؤں۔ تمام الفاظ ختم ہو چکے۔ کیا ان ہی کو پھر سے شروع کر دوں؟ لیکن اگر انھوں نے بعد میں پھر رونا شروع کیا تو کیا ہوگا۔ آخر کار دل نے کہا بس اب بھاگو ورنہ یہ سلسلہ ختم نہ ہوگا مگر پھر دل نے دوسری بات کہی کہ اس طرح روتے ہوئے دوست کو نہ چھوڑو لہٰذا ہم نے کہا:-

"بھائی رونے کے لیے تو تمام عمر پڑی ہے اور ان شاء اللہ تم سینکڑوں برس تک زندہ رہ کر روتے رہو گے مگر یہ وقت رونے کا نہیں ہے۔ تم کو سمجھ سے کام لینا چاہیئے۔"

ریاض کی ہچکیاں، سسکیاں بن گئیں اور سسکیاں بھی تھوڑی دیر کے بعد بند ہوگئیں تو میں نے سب سے پہلی بات یہی کہی کہ

"اچھا بھائی اجازت دو۔"

ریاض نے کہا، "جائیے گا؟"

ہم نے کہا "ہاں! السلام علیکم!"

ریاض کے یہاں سے آکر مجھ کو پورا اطمینان تھا اور اب میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جس کے یہاں کہیے تعزیت کے لیے روز چلا جایا کروں۔

لکھنؤ کانگریس سیشن

لکھنؤ میں اس مرتبہ انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا اور خوب ہوا۔ خاصی چہل پہل تھی۔ خاصی رونق تھی۔ آریہ نگر کے جنگل میں ایسا منگل منایا گیا کہ اس ویرانہ کو موتی نگر بنا کر چمکا دیا گیا۔ نمائش بھی تھی اور مشاعرہ بھی۔ ڈرامہ بھی ہوا اور کوئی میلن بھی لیکن اگر سچ پوچھیے تو اس موقع پر ہم کو رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا کہ اربابِ کانگریس میں گلستانِ اودھ کی طرف اس وقت متوجہ ہوئے، جب اس چمن کی بہاریں لوٹ لی گئیں اور خزاں نے اس کو اجڑا ہوا دیار بنا دیا۔ کاش وہ شاہی زمانہ ہوتا جب یہاں کا ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برات ہوا کرتی تھی۔ اس عروس البلاد میں اگر اس وقت کانگریس سشن ہوتا تو معلوم بھی ہوتا کہ ہاں صاحب لکھنؤ میں بھی کانگریس ہوئی تھی مگر اب تو جس طرح احمد آباد یا بمبئی میں اجلاس ہوئے اسی طرح لکھنؤ میں بھی اس فرضِ سیاسی کو ادا کر دیا گیا مگر اس وقت یعنی جب لکھنؤ لکھنؤ تھا یہاں سشن ہوتا تو اخبارات وہ رپورٹ پیش نہ کرتے جو آج پیش کی جا رہی ہے بلکہ اگر آپ تھوڑی دیر کے لیے عالمِ تصور کی سیر کرنا چاہیں تو اپنے کو لکھنؤ کے شاہی دور میں فرض کر لیجیے اور ملاحظہ فرمائیے اس شاہی دور کے کانگریس سشن کی روداد ——

لکھنؤ کے موتی نگر کا صدر دروازہ جامہ دار کا بنا ہوا تھا اور اوپر ایک گنگا جمنی چھتر لگا تھا۔ اس چھتر کے نیچے ہی روشن چوکی رکھی ہوئی تھی جس کے سریلے زمزمے فضا میں ایک وجد کی سی کیفیت پیدا کر رہے تھے۔ اس دروازہ پر مجلسِ استقبالیہ کے صدر اور چند اراکین مہمانوں کے استقبال کے لیے موجود تھے اور نہایت گرم جوشی کے ساتھ بڑھ بڑھ کر اور دیدہ و دل فرشِ راہ کر کر کے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ پھاٹک میں داخل ہوتے ہی ایک عجیب بہار نظر آتی تھی۔ سرخی کُٹی ہوئی سڑکوں پر کیوڑہ اور گلاب کا چھڑکاؤ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہو رہا تھا اور سڑکوں کے دو رویہ ریشمی جھنڈیوں کے ساتھ ساتھ چنبیلی اور بیلے کے پھولوں کی لڑیاں عطر میں بسی ہوئی حسن افروز بھی بنی ہوئی تھیں اور شامہ نواز بھی۔ ان ہی سڑکوں پر جا بجا ساقی حقے لیے ہوئے اور حقہ پر ہار لپیٹے ہوئے ٹہل رہے تھے جن کے خمیرے کی خوشبو اور بھی قیامت تھی۔ جو سڑک صدر دروازہ سے عام اجلاس کے پنڈال تک گئی تھی اس کے دونوں طرف دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ کوئی پان کی دوکان تھی تو کوئی پھلکیوں کی۔ کہیں گنڈیریاں برف میں دبی ہوئی پھولوں میں بسائی جا رہی تھیں تو کہیں دوکان پر انواع و اقسام کے کنکوے اور ہر قسم کی ڈور سجی ہوئی تھی۔ کوئی جامدانی کی دوکان تھی تو کسی دوکان میں لکھنؤ کی مشہور و معروف زردوزی کے نمونے نظر آتے تھے۔ مختصر یہ کہ دو فرلانگ تک یہ خاص سڑک اسی طرح

بارونق بنائی گئی تھی کہ گویا چوک کی تمام چہل پہل اس سڑک نے حاصل کر لی ہے۔ وہی چہچہے اور وہی غلغلے۔

دو فرلانگ تک اس خوبصورت اور بارونق معطر اور منور سڑک پر چلنے کے بعد کانگریس کے عام اجلاس کا وہ پنڈال ملتا تھا جس کو لکھنؤ کے نفاست پسندوں کا ایک جامع نمونہ کہنا چاہیے۔ پنڈال جالی کا بنایا گیا تھا تاکہ ہوادار بھی رہے اور خوشنما بھی۔ پنڈال کے تمام ستون چاندی کے تھے اور شرکاء اجلاس کو شبنم سے بچانے کے لیے پنڈال کے اوپر ایک مخملی شامیانہ لگایا گیا تھا جس میں ہر طرف خس کے پردے اس صنعت کے ساتھ لٹکائے گئے تھے کہ اگر رات کا اجلاس ہو تو ان پردوں کو باندھ دیا جائے اور جالی سے چھن چھن کر تازہ ہوا آسکے اور اگر دن کا اجلاس ہو تو لو سے حاضرین کو بچانے اور پنڈال کو خنک رکھنے کے لیے یہ پردے کھول دئے جائیں۔ پنڈال میں ہر طرف رومی قالین اور مخملی گاؤ تکیے نظر آتے تھے۔ صرف صدر منتخب کے لیے اس پنڈال کے اندر کارچوبی شامیانہ لگایا گیا تھا جس کے نیچے زرتار مسند اور تکیہ تھا اور سامنے ہی قد آدم ایک سونے کا پیچوان اور سونے کے خاصدان کے قریب گنگا جمنی کا اگالدان رکھا ہوا تھا۔ صدر کے علاوہ تمام حاضرین اور شرکاء اجلاس کے لیے چاروں طرف چاندی کے خاصدان اور پیچوان رکھے گئے تھے اور تھوڑی تھوڑی دور اگالدان نہایت سلیقے اور قرینے سے سجائے گئے تھے۔ وسط میں گلدانوں کی قطار اس طرح تھی کہ ہر گلدان کے بعد اگر کی بتیاں اور دیگر اقسام کی خوشبو جلانے کے لیے چنگیر رکھے ہوتے تھے اور ہر چنگیر کے بعد ایک گلدان تھا۔ تھوڑی تھوڑی دور پر موم بتیوں کے لالے روشن تھے اور پنڈال کو موم بتیوں کے ہزاروں جھاڑوں اور قندیلوں سے منور کر دیا گیا تھا۔

اجلاس کا وقت ۸ بجے شب مقرر ہوا تھا مگر ۹ بجے شرکاء نے آنا شروع کیا اور دس بجے کے قریب تمام پنڈال معزز حاضرین سے بھر گیا اور ٹھیک سوا دس بجے پہلا گولا چھوٹا۔ پھر روشن چوکی نے ایک ترانہ گایا اور آخر میں نقیب نے بھرے پنڈال میں آکر آواز لگائی ـــ

نگہ دار ہوشیار آتے ہیں
صدر عالی وقار آتے ہیں

یہ سنتے ہی تمام حاضرین بزم کھڑے ہو گئے اور پنڈال کے صدر دروازے سے زرق برق لباس پہنے ہوئے پہلے تو چوبدار داخل ہوئے اور درمیان میں صدر محترم تاروں کے جھرمٹ میں چاند کی طرح خراماں خراماں تشریف لائے۔ ہر طرف سے لوگوں نے جھک جھک کر سلام کیے اور خود صدر محترم نے سب کے سلاموں کا جواب جھک جھک کر، آداب بجا لا کر اور تسلیمات عرض کر کے، ہاتھ جوڑ جوڑ کر اور مسکرا مسکرا کر دیا۔ اس کے بعد صدر محترم اپنی جگہ پر رونق افروز ہوئے اور آپ کے تشریف فرما ہوتے ہی تمام حاضرین بزم قرینے سے اپنی اپنی جگہ پر دوزانو بیٹھ گئے اس کے بعد اجلاس کی باضابطہ کارروائی شروع ہونے سے پہلے ہی مجرا شروع کر دیا گیا۔ کچھ دیر تک لکھنؤ کی مشہور مغنیہ حسنو جان نے موسیقی کے کمالات دکھا کر حاضرین محفل کو مسحور کیا۔ اس کے بعد بنارس اور آگرہ کی دو چوکیاں بیٹھیں۔ آخر میں میاں مصطفےٰ حسین کا مردانہ طائفہ آیا جس نے دور دور سے آئے ہوئے مندوبین کانگریس کو لکھنؤ کے بھانڈوں کا گرویدہ بنا دیا۔ اس نغمہ و رقص کا سلسلہ دو گھنٹے تک جاری رہا اور اس کے بعد کانگریس کے اجلاس کی باقاعدہ کارروائی اس طرح شروع کی گئی کہ صدر مجلس استقبالیہ نے حاضرین بزم میں سے ایک ایک سے اجازت طلب کرنے کے بعد

اور آخر میں صدرِ محترم سے ہاتھ جوڑ کر اجازت طلب کر کے اپنا خطبہ اس شعر سے شروع کیا ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اس شعر کو پڑھتے ہی تمام پنڈال "ماشاء اللہ" اور "کیا برمحل صرف ہے اس شعر کا" کے نعروں سے گونج اٹھا اور صدرِ مجلسِ استقبالیہ نے اپنا خطبہ ملتوی کر کے ہر طرف گھوم گھوم کر سلام شروع کر دیے اور مکرر ارشاد کے حکم کی تعمیل میں اس شعر کو پھر پڑھا اور شعر کے بعد اپنا خطبہ جو مقفیٰ اردو میں تحریر کیا تھا شروع کیا۔ اس خطبہ کے ایک ایک حصّہ پر حاضرین کی طرف سے داد دی جا رہی تھی اور صدر مجلسِ استقبالیہ کا ہاتھ گویا سلام کرنے کی کمانی دار مشین بنا ہوا تھا یہ خطبہ گو بہت مختصر تھا مگر مکرر ارشاد کے تقاضوں اور خطیب کے سلام کرنے اور داد وصول کرنے کے وقفوں کی وجہ سے ایک گھنٹہ میں ختم ہوا اور خطبہ کے ختم ہونے کے بعد بھی تحسین و آفرین کا سلسلہ پندرہ بیس منٹ تک جاری رہا۔ اس کے بعد صدرِ محترم کھڑے ہوئے اور آپ کے کھڑے ہوتے ہی حاضرینِ بزم نے بھی کھڑے ہو کر تعظیم دی مگر صدرِ محترم کے اشارے سے سب بیٹھ گئے۔ اب صدرِ محترم نے حاضرین سے ہاتھ جوڑ کر اپنا خطبہ شروع کرنے کی اجازت طلب کی جس کا جواب سب نے ہاتھ جوڑ کر "بسم اللہ" اور "سب ہمہ تن گوش ہیں" کے متفقہ نعروں سے دیا۔ آخر تین چار مرتبہ کھنکار کر اور ریشمی رومال سے منہ صاف کرنے کے بعد صدرِ محترم نے فرمایا ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید

اور اے حضور!

قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند

اس شعر کا پڑھنا تھا کہ "اے سبحان اللہ!" کا وہ فلک شگاف نعرہ بلند ہوا ہے کہ خود صدرِ محترم بھی تھوڑے اچھل پڑے اور پھر فوراً سنبھل کر آپ نے سلام کرنے شروع کر دیے۔ تین چار مرتبہ حاضرینِ محفل کے اصرار سے اسی شعر کو پڑھنا پڑا۔ پھر بھی حاضرین نے یہی کہا کہ حضور سیری نہیں ہوئی ایک مرتبہ اور مرحمت فرما دیجیے۔ آخر صدرِ محترم نے پھر یہی شعر پڑھا اور شعر پڑھنے کے بعد اپنا خطبہ شروع کیا:۔

"ہر چند کہ یہ خاکسار فرائضِ صدارت سے ناچار تھا۔ خود بھی علیل تھا اور ریڈر بھی اس ہیچدان کا بیمار تھا مگر آپ حضرات کا اصرار اور پھر اس پر اصرار کی تکرار، مجبوراً مزید انکار سے قاصر ہوا اور افتاں و خیزاں تعمیلِ حکم کے لیے حاضر ہوا۔"

حاضرین نے "کیا سلاست ہے اور کیا روانی ہے" کا نعرہ بلند کیا اور صدرِ محترم نے جھک جھک کر کلام کا تمام لوچ سلاموں میں صرف کرنے کے بعد پھر فرمایا:۔

"آپ کے سرِ عزیز کی قسم کھاتا ہوں بلکہ باوا جان مرحوم کی روحِ پاک کو درمیان میں لاتا ہوں کہ میں ہرگز اس اعزاز کے قابل نہ تھا اور انکار میرا کسرِ نفسی میں شامل نہ تھا مگر آپ حضرات نے اس کو عذرِ لنگ جانا اور میرا کوئی حیلہ صحیح نہ مانا۔ مختصر یہ کہ اپنی تمام مجبوریوں کو بھلانا پڑا

اور کشاں کشاں جانبِ بزمِ کانگریس آنا پڑا۔"

حاضرین نے پھر "حضور واللہ ہے کہ موتی پرو رہے ہیں اور جواہرات جڑے ہیں" کی صدائیں بلند کیں اور صدرِ محترم نے ہاتھوں کو جوڑ کر "آپ عزت بڑھاتے ہیں" کہہ کر فرمایا:۔

"آج ہمارے پیشِ نظر جو سوال ہے وہ کوشش کے بعد آسان اور بغیر کوشش کے سخت محال ہے۔"

حاضرین نے ہم آواز ہو کر کہا:۔

"کیا کلیہ بیان فرمایا ہے حضور نے۔"

صدرِ محترم نے پھر مجرا بجا لا کر ارشاد فرمایا:۔

"باہمی اتفاق یعنی سدِ باب نفاق و شقاق از بس ضروری ہے اور بغیر اس کے منزلِ مقصود تک پہنچنے میں سخت مجبوری ہے۔ ہماری راہ پُر خطر اور دشوار ہے، منزل دور ہے اور راستہ ناہموار ہے۔ مگر کچھ بھی ہو اب تو ٹھنا ہے اور ٹھانا ہے یعنی بہر صورت مقدر کو آزمانا ہے۔ اگر ہمارے ارادوں میں استقلال ہے تو سمجھ لیجئے کہ درخشاں نیرِ اقبال ہے۔"

"آمین آمین! آپ کے منہ میں گھی شکر" کے نعروں سے پنڈال گونج اٹھا۔ صدر نے پھر فرمایا:۔

"ہم کو آج یہ طے کرنا ہے کہ اب ہم کو زندہ رہنا ہے یا مرنا ہے۔ ذلتوں کی انتہا ہو گئی، تکلیف حد سے سوا ہو گئی۔ ہم شہزادے ہو کر بات بات کا محصول اور لگان ادا کریں۔ ہم سے محصول اور لگان مانگنے والے خدا خدا کریں۔ کہا جاتا ہے کہ پیٹ کاٹ کر اور بٹیروں کی پالیاں بند کر کے مالیہ کی ادائیگی کا انتظام کریں گویا ہم اپنی جان سے دور جان دے دیں اور بٹیریں نصیبِ اعدا ہیں۔"

حاضرین نے "دو، یار چاہئیں پھوٹیں مدعی" کا نعرہ بلند کیا اور صدرِ محترم نے پھر اپنا خطبہ شروع کیا۔ اس خطبہ میں شروع سے آخر تک اس قسم کی شکایتیں تھیں کہ جب حکومت ہماری ہے اور ہم خود شاہزادے ہیں تو ہم مرغ کی پالیوں کا ٹیکس، بٹیر بازی اور کنکوے بازی وغیرہ کے محاصل کیوں ادا کریں۔

یہ خطبۂ صدارت تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ختم ہوا اور آخر میں جنابِ صدر نعرہ ہائے تحسین و آفرین کے درمیان سلام کرتے ہوئے تھک کر خستہ ہو کر پسینہ پسینہ ہو کر بیٹھ گئے۔ چوبداروں نے پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔ کوئی برفِ آب لے کر دوڑا تو کسی نے خاصدان پیش کیا۔ آخر دس پندرہ منٹ کے بعد صدرِ محترم کے حواس بجا ہوئے اور اس کے بعد اجلاس کی ایجنڈے کے مطابق کارروائی شروع ہوئی۔

سب سے پہلے دربارِ شاہی میں نیابت کا مسئلہ تھا۔ شاہی خاندان کے دیگر نواب زادگانِ وقت کا مطالبہ یہ تھا کہ ان کو بھی دربار میں کرسی نشینی کے ۳۲ فیصدی حقوق دیے جائیں۔ چنانچہ نواب زادگانِ اودھ کی طرف سے جس وقت اس سوال کو لے کر نواب دلارے مرزا صاحب کھڑے ہوتے ہیں اور حاضرینِ محفل کو جھک جھک کر سلام کیے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اسی وقت سے ایک عجیب سماں بندھ گیا تھا۔ آپ نے سب سے پہلے تو اپنا بٹیرا اپنے خدمتگار کو دیا۔ اس کے بعد اب مدلل، مقفٰی اور مسجع تقریر میں دربارِ شاہی میں اپنے ۳۲ فی صدی حقوق پر زور دیا اور آدھ گھنٹہ تک تقریر کرنے کے بعد شہزادہ والا تبار، برہان الدولہ نواب فلک رفعت بہادر

کھڑے ہونے والے تھے لہٰذا خدمتگار نے فوراً آئینہ پیش کر دیا۔ آپ نے آئینہ میں ٹوپی کو درست کر کے اور مونچھوں کا تاؤ ٹھیک کرنے کے بعد ایک گلوری نوش فرمائی اور اس کے بعد کھڑے ہو گئے۔ ہر طرف سے "یا علی" اور بسم اللہ کا نعرہ بلند ہوا جس کے جواب میں آپ نے حاضرین کو سلام کرنے کے بعد فرمایا:۔

"اے حضرت میں معافی کا خواستگار ہوں۔ اختلاج قلب کا پرانا بیمار ہوں۔ آپ کو معلوم ہے بھائی دلارے مرزا عرف لاڈلے نواب میرے دوست ہیں لیکن سچ پوچھئے تو میرے گوشت اور پوست ہیں مگر آج انہوں نے غیروں سے بڑھ کر منافرت سے بھری ہوئی تقریر کی ہے۔ یعنی اپنے اور میرے دوستانہ مراسم کی تحقیر کی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آخر حقوق میں فی صدی کا کیا سوال ہے، دوستی میں تو سب کا یکساں حال ہے۔ وہ سر آنکھوں پر دربار میں تشریف لائیں اور اگر کوئی کرسی خالی نہ ہو تو ہمارے دل میں جگہ پائیں۔ مگر خدا کے لیے یہ غیریت نہ فرمائیے اور بسر و چشم دربار میں تشریف لائیے۔"

نواب فلک رفعت سلام کر کے بیٹھ گئے اور اس کے بعد نواب دلارے مرزا پھر کھڑے ہونے والے تھے مگر تیور دیکھ کر پہلے تو کچھ ٹھٹک گئے اور آخر کھڑے ہو کر صرف اتنا کہا کہ میں کچھ عرض کرتا ہوں مگر استخارہ مانع آ رہا ہے۔ گویا جناب صاحب نواب فلک رفعت کی من جانب اللہ تائید ہو رہی ہے لہٰذا یہاں بھی سر تسلیم خم ہے۔

ایجنڈے میں اب آزادی کامل کی تجویز تھی۔ امید تھی کہ اس پر زبردست مباحثہ ہوا مگر ہوا یہ کہ تجویز تو متفقہ طور پر منظور ہو گئی مگر سوال یہ تھا کہ آخر اس تجویز کو عملی صورت میں کونسی جماعت لائے۔ نواب زادگان نے شہزادوں کی طرف اشارہ کر کے کہا:۔

"حضرت پہلے آپ آزادی حاصل کریں۔"

شہزادوں نے کہا: "نہیں پہلے آپ۔"

نواب زادوں نے کہا: "پہلے آپ۔"

شہزادوں نے کہا: "واللہ یہ نہ ہوگا۔ پہلے آپ! آخر اسی پہلے آپ اور نہیں حضرت پہلے آپ میں صبح ہو گئی اور اجلاس ختم ہو گیا۔

اس طلسم خیال کو توڑ دیجیے اور بتائیے کہ ایسی حسین کانگریس کے مقابلہ میں جس کا نازک بدن تصور جوف دماغ میں محدود تخیل رہ گیا ہے ہم کو باوجود تمام زیبائشوں اور رونقوں کے یہ کھدر قسم کی کانگریس کیونکر پسند آ سکتی تھی یا کسی ایسے شخص کو اس قسم کا کانگریس سیشن کیونکر پسند آ سکتا ہے جس کا دماغ عہد پارینہ کے تصور سے معطر ہو رہا ہو۔

پرابلم

جس کا وطن غریب الوطنی ہو وہ اپنے کندھے پر اپنا مکان تلاش نہیں کرتا بلکہ خانہ بدوشی پر ایسا اتراتا ہے گویا اسی سے وطن کے تمام حقوق حاصل کر کے رہے گا۔ معلوم نہیں یہ بات ہم نے انگریزوں سے سیکھی ہے یا ہر انسان فطرتاً مگر غیر محسوس طریقہ پر انگریز ہوتا ہے۔ بہرصورت کچھ بھی ہو حال یہ ہے کہ اٹھائیس سال تک لکھنؤ میں مہمان رہے۔ وطن پردیس اور پردیس وطن بنتا رہا۔ بیگانگی یگانگت بن گئی۔ نام کے ساتھ تھانوی لکھ لکھ کر لکھنوی بنتے رہے! اسی مسافر خانہ میں پڑھے لکھے۔ اسی سرائے میں شادی بیاہ سے فارغ ہوئے۔ اسی ڈاک بنگلہ میں بچوں کے باپ تک ہو گئے۔ اور عین اُس وقت جبکہ لکھنؤ قریب قریب وطن بن چکا تھا۔ ازلی خانہ بدوشی نے پھر کروٹ لی، پیروں کے سنیچر نے دشتِ غربت کی راہ لی اور اب جو آنکھ کھلی تو ہم لاہور میں تھے۔

لاہور آکر نیا دانہ نیا پانی نئے آدمی نئے جانور یہاں تک کہ ادب بھی نیا ملا مگر طے تھا کہ اس نئی نویلی غربت کو پرانے بال بچوں کے ساتھ گھر بنا کر رہنا ہے۔ فکرِ آشیانہ کہیے یا آرزوئے دولت خانہ مختصر یہ کہ سر چھپانے کی جگہ درکار تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک پردیسی اس قسم کے واقف کارانہ کام نہیں کر سکتا۔ لہٰذا نئے ہمدردوں اور پرانے دوستوں سے اس کارِ خیر میں امداد کی مہم لے کر روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے جن بزرگِ محترم کے دروازہ پر دستک دی گئی ان سے مراسم کچھ ایسے ویسے نہ تھے ہم دونوں تو ہم دونوں ہمارے والد بھی آپس میں دوست تھے۔ ہم کو دیکھتے ہی "اخاہ" کا نعرہ بلند کر کے لپٹ گئے۔ پہلے کرسیاں نکلیں۔ پھر شکنجبین کی بارش شروع ہوئی۔ پھر سگریٹ کی ژالہ باری ہوئی۔ مختصر یہ کہ عجیب خوشگوار ملاقات تھی۔ دل خوش ہو گیا، پردیس میں ایسے ہمدم و دیرینہ کا ملنا واقعی مسیحا اور خضر کی ملاقات سے بہتر ہے۔ مکان تو مکان اس سے تو اگر ہم جان تک مانگیں تو یہ عذر نہیں کر سکتے ہوٹل میں ٹھہرنے ہی پر ایسے خفا ہوئے کہ بمشکل راضی ہو سکے۔ کہنے لگے "اچھا کھانا کل ساتھ کھاؤ!"

عرض کیا "بھائی جان میں مہمان بن کر نہیں آیا ہوں، وبالِ جان بن کر حاضر ہوا ہوں۔" یہ کہہ کر تمام حالات سنا دیئے کہ اب مستقل طور پر یہیں رہنا ہے اور جب ٹیپ کا بند عرض کیا کہ فوراً مکان دلوائیے ڈھونڈھ کر تو ایک دم رخِ روشن کی تمام روشنی غائب۔ دیر تک آسمان کی طرف دیکھتے رہے گویا ہمارے لیے عالمِ بالا میں مکان تلاش ہو رہا ہے

سیٹی بجاتے رہے گویا اپنے کُتّے سے مکان کا پتہ پوچھیں گے۔ سر پر ہاتھ پھیرا۔ کچھ مُنہ ٹیڑھا کیا۔ ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس لے کر بڑے متفکّرانہ انداز سے بولے ”مکان؟“

عرض کیا ”جی ہاں مکان۔ بھئی جو مکان ہوتا ہے نا۔ رہنے سہنے کے لیے یعنی کرایہ کا مکان۔ بھئی پچاس ساٹھ کے کرایہ کا ہو۔“

اسی عالمِ جذب میں فرمایا ”وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر میں یہ سوچ رہا ہوں کہ مکان تو آج کل بڑا پرابلم ہے۔ بہرحال“

بیتابی سے عرض کیا ”بہرحال؟“

ارشاد ہُوا ”مطلب یہ کہ غور کروں گا۔“

حیرت سے گذارش کی ”غور کس بات پر کرو گے۔ یعنی یہ کہ مجھے مکان دلوانا چاہیئے یا نہیں۔ کان کھول کر سن لو کہ مجھے مکان فوراً چاہیئے۔“

سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد فرمایا ”بڑا پرابلم ہے صاحب بڑا پرابلم۔ بہرحال اور لوگوں سے بھی کہہ رکھو اور میں بھی کوشش کرتا ہوں۔“

ان حضرت کے وعدے میں ہم کو وعدہ کم اور اخلاق زیادہ نظر آ رہا تھا۔ لہٰذا ہم نے واقعی دوسرے لوگوں سے بھی کہنے کی ایمانداری کے ساتھ نیت کر لی مگر مصیبت یہ تھی کہ پہلے لوگ ڈھونڈے جائیں پھر اُن سے کہو کہ مکان ڈھونڈھو مگر وہ جو مثل مشہور ہے ”جویندہ یابندہ“ ایک تو ملے ہوٹل کے گائیڈ۔ یہ گرل گائیڈ قسم کے نہایت مستعد اور ہمدرد سے آدمی ہیں خصوصاً ہمارے ساتھ تو اسٹیشن پر اس اخلاق سے پیش آئے تھے کہ ان کا بس چلتا تو قلی کے بجائے خود ہی اسباب اُٹھا لیتے۔ جب سے بیچارے برابر خیریت پوچھ لیا کرتے تھے اور خدماتِ لائقہ کا برابر تقاضا فرمایا کرتے تھے۔ آخر ہم نے اُن سے عرض کر دیا کہ ”بھائی صاحب سب سے بڑا کام تو یہ ہے کہ مکان دلوایئے کوئی۔“

پہلے تو وہ مُنہ کھول کر اس طرح رہ گئے گویا اس وقت ہم کو آنکھوں کے بجائے مُنہ سے گھور رہے ہیں۔ پھر بڑے تعجب سے بولے ”مکان یعنی مکان آخر کیوں؟“

ہم نے اپنا مفہوم واضح کرتے ہوئے کہا ”بھئی رہنا ہے نا۔ تو اس لیے مکان چاہیئے ہے ہم کو۔“

کچھ ڈرے ہوئے انداز سے فرمایا ”آخر آپ کو ہوٹل سے کیا شکایت ہے؟“

ہم نے سمجھ کر بڑے زور سے کہا ”اوہو، آپ غلط سمجھے، ہوٹل کی بات نہیں ہے مجھے اب مستقل طور پر لاہور میں رہنا ہے۔ بال بچوں کو بلانا ہے۔ اس لیے کرایہ کا مکان چاہتا ہوں۔“

گائیڈ صاحب نے اب پھر سے اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے کہا ”ہوں۔ ہوں تو گویا مکان۔ مگر صاحب مکان ہے ———“

ہمارے دل نے باقی جملہ پورا کر دیا ——— بڑا پرابلم ———“

گائیڈ صاحب کہہ رہے تھے۔ مگر خیر یہ جلدی کا کام نہیں ہے۔ فی الحال آپ ہوٹل ہی میں رہیئے میں برابر مکان

کی فکر رکھوں گا۔"

ظاہر ہے کہ ان حضرت نے محض اپنے ہوٹل کی وجہ سے یہ بات ٹالی تھی۔ ان کو ہمارے مکان سے زیادہ ہوٹل کی فکر ہونا چاہیئے۔ ان سے ہمارا مطالبہ ہی غلط تھا مگر اہلِ غرض اندھے تو ہوتے ہی ہیں، ساتھ ہی ساتھ بیوقوف بھی ہونے کی سعیِ بلیغ فرماتے ہیں خیر یہی غنیمت ہے کہ اس حماقت کا اس قدر جلد احساس ہو گیا۔ چنانچہ اب کی مرتبہ ہم نے سمجھ بوجھ کر ایک ایسے شخص سے مکان کے متعلق کہا جس کے انتخاب پر خود ہم کو ناز ہے چشمہ لگا کر آنکھ کی کمزوری کا اعلان کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نظرِ انتخاب بھی کمزور ہے۔ ہوا یہ کہ گھر سے جوابی تار آیا تھا۔ اسی ہوٹل کے پتہ پر فوراً خیریت لکھو۔ طریقہ یہ ہے کہ تار والے کو کچھ نہ کچھ اس بات کا انعام دیا جاتا ہے کہ وہ کسی کے مرنے کا تار نہیں لایا۔ چنانچہ ہم نے بھی بزرگوں کی اس وضع کو قائم رکھا۔ تار والا تھا شریف آدمی، نہایت اخلاق سے "اس کی کیا ضرورت ہے صاحب جی" کہہ کر ہاتھ پھیلا دیا۔ ہم نے غیر ارادی طور پر کہہ دیا۔ یہ تو خیر یوں ہی ہے البتہ اگر مکان دلوا دو کہیں سے ہم کو تو پھر انعام دیں گے۔ اس نے چشمہ کی اوٹ سے ہم کو اس طرح دیکھا گویا ہمارے متعلق یہ غور کر رہا ہے کہ اس شخص کے متعلق مکان میں رہنا ٹھیک کہا جا سکتا ہے یا پنجرہ میں رہنا اور تفصیلی طور پر غور کرنے کے بعد تار کی زبان میں ارشاد فرمایا "مکان۔ اچھا جی" تار کی عبارت غیر متعلق لوگ ذرا کم سمجھتے ہیں مگر ہم ٹھہرے اہلِ معاملہ فوراً سمجھ گئے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ وہ بے چارہ سلام کر کے رخصت ہوا اور ہم پھر ان لوگوں کی تلاش میں نکل گئے جن کے متعلق مکان کی تلاش کے سلسلہ میں ذرا بھی شبہ ہو سکتا تھا۔ تفصیلات سے نہ آپ کو دلچسپی ہو گی نہ میں اپنی نجی باتیں بتانے کا شوقین ہوں۔ البتہ اتنا بتائے دیتا ہوں کہ ایک لسی والے سے مکان کے لیے کہا اور محض یہ کہنے کے لیے لسی کا ایک گلاس پینا پڑا۔ ایک ہیر کٹنگ سیلون میں تفصیلات سے مکان کی اپیل کرنے کے لیے بال بنوا ڈالے۔ ایک تانگہ والے کے چہرے پر "ٹولیٹ" کا سائن بورڈ نظر آیا لہذا ایک گھنٹہ کا کرایہ اس کو دے دیا۔ ایک دن۔ دو دن۔ تین دن یہاں تک کہ اسی جستجو میں صبح ہونے لگی اور شام ہونے لگی مگر مکان نہ آج ملتا ہے نہ کل۔ ملی ملائی اچھی خاصی ملازمت کو چھوڑ کر بھاگنے کی ٹھانی۔ اپنے آقائے نامدار سے بھی مکان کی مشکل کے مقابلہ میں ملازمت سے دست برداری کے آسان ہونے کا اظہار کر دیا۔ مگر اس سلسلہ میں اس کثرت سے "پرابلم" کا لفظ سنا ہے کہ اب تو یہ شبہ ہونے لگا ہے کہ کہیں پنجابی زبان میں انگریزی کے اس لفظ کے معنی مکان ہی کے تو نہیں ہیں۔

جستجو پر ایک وقت وہ بھی گزرتا ہے جب جستجو کرنے والا تھک کر بیٹھ رہے اور منزل خود اسے ڈھونڈنے نکلے۔ چنانچہ ہم اس کمال کو بھی آخر پہنچ ہی گئے۔ گھر خط لکھ دیا کہ نوکری مل گئی ہے مگر تم سب کو چھوڑنا پڑے گا۔ اس لیے کہ مکان نہیں ملتا۔ ارادہ کر لیا کہ کسی ہوٹل ہی کو اپنا یتیم خانہ بنائیں گے۔ ایک ہوٹل سے بات چیت بھی کر لی۔ اب خدا کی دین ملاحظہ ہو کہ مکان ملنا شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے گائڈ صاحب نے ایک مکان کا مژدہ سنایا ہم نے بے اختیار ان کو کلیجہ سے لگاتے ہوئے عرض کیا کہ یوں نہیں جناب پہلے آپ یہ کیجیے کہ کل صبح چاء میرے ساتھ نوش فرمائیے۔ اس کے بعد ہم دونوں چلیں گے مکان دیکھنے۔ وہ فرشتۂ رحمت تو تھے ہی ہماری محبت کو بھلا کیسے

ٹھکراتے ۔ وعدہ کر کے چلے گئے ۔ لاہور آنے کے بعد آج پہلی مرتبہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس پردیس نے اتنے دنوں کے بعد ہمارا انسان ہونا تسلیم کیا ہے ۔ سر سے ایک بار اتر چکا تھا ۔ پہلے مکان کے متعلق سوچا کرتے تھے اب اس کی آرائش کے پُرلطف خواب دیکھنے لگے ۔ ایک کمرہ بنائیں گے اسٹڈی کا ۔ اس میں لکھنے کی میز پر کوئی فضول سامان نہ ہو ۔ البتہ ایک بڑا سا شیشہ ضرور ہوگا ۔ سونے کا کمرہ ذرا ارمان انگیز ہونا چاہیئے ۔ کہ آدمی جاگے تو بھی خواب سا دیکھتا رہے یا خواب دیکھے تو قبر وغیرہ کے نہیں بلکہ ذرا اچھی قسم کے ۔ اسی طرح ہر کمرہ کا ایک تصور آنکھوں کے سامنے تھا دل تو خوش تھا ہی طے کیا کہ چلو آج پھر سے چلیں شاید ڈرائنگ روم کا کوئی نیا سیٹنگ نظر آجائے ۔ کپڑے پہن پہن کر گنگنانے لگے :

اک بنگلہ بنے نیارا

ہوٹل سے برآمد ہوتے ہی ۔ وہی تانگے والا لپک کر سامنے آگیا " واہ بابو جی ایک مکان آپ کے لیے ڈھونڈا ہے تو اب آپ نہیں ملتے ۔ کل کسی وقت دیکھ لیجیے "

ہم نے سوچا کہ دیکھیں مکان یا نہ دیکھیں ۔ گائیڈ صاحب کو اگر خبر ہو گئی کہ یہ اغیار کے ساتھ مکان دیکھنے گیا تو برا نہ مان جائیں ۔ مگر اس بیچارے نے بھی محبت ہی سے ہمارا خیال رکھا ہے لہذا کیا مضائقہ ہے اگر ہم چپکے سے مکان دیکھ آئیں ۔ کچھ غور کرنے کے بعد کہا " کل نہیں اس وقت چلو تو چل سکتے ہیں کل ہم کو اور مکانات دیکھنا ہیں " دل غنی ہو تو مکان کو آدمی مکانات کہنے لگتا ہے ۔ یہ قواعد واحد و جمع کی غلطی نہیں جذبات کی گرامر ناشناسی ہے ۔ " تانگہ والا تیار ہو گیا ۔ اور ہم اس کے تانگہ پر روانہ ہوئے ۔ چلا چل ۔ چلا چل ۔ شہر کے تمام محلّے ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے ۔ یہاں تک کہ لاہور کی تمام آبادیاں ختم ہو گئیں ۔ مگر ہمارے مجوزہ دولت خانہ کا کہیں پتہ نہیں ۔ تانگہ ہے کہ چل رہا ہے ۔ ادھر ہم ہیں کہ بیٹھے ہوئے ہیں ۔ ایک مرتبہ ارادہ کیا کہ اس سے پوچھیں تو سہی کہ آخر ارادہ کیا ہے ۔ مگر پھر خود ہی اپنے اس ارادے پر شرما کر رہ گئے ۔ کہ اس بیچارے نے تو ہماری محبت میں اتنی دور تک خاک چھان کر ہمارے لیے مکان ڈھونڈا ہے ، اور ہم اس کے جذبہ کی یہ قدر کر رہے ہیں کہ ذرا سے فاصلہ ہی کو دیکھ کر گھبرا گئے ۔ غالباً اس غریب کو " پرابلم " کہنا نہ آتا تھا ۔ لہذا وہ بخطِ مستقیم چلا جا رہا تھا ۔ لاہور میں اس کو مکان نہ مل سکا تو اس نے کسی اور شہر میں سہی ، بہرحال مکان ڈھونڈھ دیا ۔ آخر خدا خدا کر کے اب اس نے سڑکوں کو چھوڑ کر گلیاں دریافت کیں ۔ ایک گلی سے دوسری میں ، دوسری سے تیسری میں ، اور تیسری سے چوتھی میں جا کر ایک جگہ تانگہ روک کر کہا " یہ ہے سامنے والا مکان "

ہم نے چاروں طرف حیرت سے دیکھ کر پوچھا " کون سا مکان ؟ "

اطمینان سے کہنے لگا " وہ جو ٹاٹ کا پردہ سامنے پڑا ہے نا بس اسی کے اندر ایک طرف کو مکان ہے "

ہم نے اس ٹاٹ کے پردے کو دیکھا جو ایک آبنائے پر اس طرح پڑا ہوا تھا گویا جہاز ڈوب چکا ہے صرف اس کا پھریرا باقی رہ گیا ہے ۔ ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ اور یہاں پیراکی سے قطعاً ناواقف ۔ مرتے کھپتے ۔ دیوار سے چپکے ہوئے اس ٹاٹ کے پردے تک پہنچے اور اندر جو جھانک کر دیکھا تو چودہ طبق روشن ہو گئے ۔ مالکۂ مکان ایک بڑی بی اپنی بکری سے کان میں کچھ باتیں کر رہی تھیں تا کہ ان کی مرغیاں نہ سننے پائیں ۔ ہم کو دیکھتے ہی اندر بلا لیا اور مکان دیکھنے کی غرض

معلوم کرنے کے بعد بولیں:

"یہی ہے بیٹا مکان دیکھ لو۔ میرا کیا ہے میں ایک کونے میں پڑی رہوں گی۔"

وہاں سے جو بھاگے ہیں تو ہوٹل کے پاس پہنچ کر اس وقت ہوش بجا ہوئے جب تانگہ والے کو ساڑھے تین روپے مکان کی رونمائی کے سلسلے میں دینا پڑے مگر اطمینان تھا کہ یہ مکان تو تفریحاً دیکھا ہے۔ اصل میں تو صبح دیکھیں گے مکان گائیڈ صاحب کے ساتھ۔

صبح گائیڈ صاحب نے چائے پی کر جب المکلّف الخدمت کو رہینِ منت فرما لیا تو مکان دکھانے لے چلے۔ یہ مکان یقیناً کسی زمانے میں مکان تھا۔ غالباً نانا فرنویس کے زمانہ میں اس کی پہلی مرتبہ مرمّت ہوئی تھی۔ آسانی صرف یہ تھی کہ اس مکان میں رہ کر انسان اپنی اس نخوت کو بھول سکتا تھا جو بلا وجہ اشرف المخلوقات سمجھ سمجھ کر اپنے اوپر طاری رکھتا ہے، گائیڈ صاحب نے نام کے ساتھ "تھانوی" دیکھ کر غالباً یہ سمجھ لیا تھا کہ ان حضرت کو اصطبل درکار ہے۔ آفتاب کی روشنی سے آنکھوں کو جو تکلیف ہوتی ہے۔ اس کے پورے بچاؤ کا انتظام تھا۔ ہوا لگ جانے سے جو بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں ان کا بھی کوئی خطرہ نہ تھا۔ ہر کمرہ غسل خانہ اور ہر غسل خانہ آسانی سے کمرہ بن سکتا تھا۔ نمی اس قدر تھی کہ خس کی ٹٹیوں کا خرچ آسانی سے بچایا جا سکتا تھا۔ ہر کمرے کا فرش ایسا کہ چاہے کھیتی باڑی شروع کر دیجیے، چاہے پھول دار چمن بنا لیجئے مختصر یہ کہ ہم نے مکان دیکھنے کے بعد گائیڈ صاحب کا منہ جو دیکھا تو دونوں میں ذرا بھی فرق نہ تھا۔ وہ بھی عجیب آثار قدیمہ بنے ہوئے کھڑے تھے۔ طرّہ یہ کہ ہم کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا:

"کیا رائے ہے؟"

ہم نے کہا "مکان کے متعلق تو بعد میں عرض کرونگا۔ پہلے تو مجھے یہ دریافت کرنا ہے کہ آپ کی کیا رائے ہے میرے متعلق۔"

صاف گوئی تو دیکھیے کہنے لگے "آپ اچھے رہیں گے اس میں۔"

ہم اپنے کو سنبھالتے ہوئے اس مکان سے نکل آئے اور اس کے بعد سے گائیڈ صاحب کی صورت سے وہ نفرت ہوئی ہے کہ اگر مکان فوراً مل نہ جاتا تو عدمِ تشدد پر زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ جیل میں رہنے کا انتظام ہو ہی جاتا۔ مگر شکر ہے کہ سب سے پہلے دوست نے آخر ایک جگہ تلاش کر دی اور ہم سے دوستی کے نام پر اپیل کی کہ ہم اس جگہ کو مکان سمجھیں۔ اس میں کمرے بھی ہیں، دروازے بھی، چھت بھی ہے اور غسل خانے بھی۔ کوٹھڑیاں بھی ہیں اور باورچی خانے بھی مگر معلوم نہیں کیا بات ہے کہ بحیثیتِ مجموعی اس کو مکان نہیں کہا جا سکتا البتہ کہیئے تو "پرابلم" کہہ دیا کریں۔

اب سنیئے دیگر پرابلموں کی ریل پیل:۔

"مکان تو مل گیا ہے اب ملازم دلوائیے۔"

"جی کیا کہا۔ ملازم؟ ملازم تو بڑا پرابلم ہے۔"

"مکان اور نوکر تو آپ کی دعا سے مل گئے ہیں البتہ ضرورت کی بعض چیزیں نہیں ملتیں۔ مثلاً گھی۔"

"گھی ——؟ گھی تو بڑا پرابلم ہے۔"

"اچھا صاحب ڈالڈا سہی۔ ہم بناسپتی بن کر رہ لیں گے۔ مگر شکر۔"

"شکر۔ یعنی چینی چاہیئے ہے آپ کو —— صاحب چینی تو بڑا پرابلم ہے۔"

میں نے کہا "السلام علیکم۔ چینی کے لیے میں نے کارڈ حاصل کر لیے ہیں البتہ کوئلہ یا لکڑی کہیں سے دلوائیے۔"

"خدا جانتا ہے اسی فکر میں ابھی نکلا ہوں یہ ایندھن کا معاملہ بڑا پرابلم ہے۔"

مختصر یہ کہ لاحول و لاقوۃ جو چیز ہے پرابلم۔ جو بات ہے پرابلم۔ تعلیم اسی پرابلم کے نہ یاد ہونے کی وجہ سے چھوڑ دی اب لاہور بھی یہ پرابلم چھڑا دے گا۔ مصیبت تو اس پرابلم کمبخت میں یہ ہے کہ حل ہو جائے تو پرابلم نہ حل ہو تو پرابلم۔ پہلے تو صبر کر لیا تھا کہ شاید صرف مکان کو پنجابی میں پرابلم کہتے ہیں مگر اب تو معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب ہی کو پرابلم کہنا پڑے گا جہاں ان پرابلموں کے مارے ہم خود ہی حل ہوتے جاتے ہیں۔

کچھ یادیں کچھ باتیں

اودھ اخبار صحافت کے باوا آدم کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی ادارت مل جانے کو میں اپنی صحافتی معراج سمجھ رہا تھا اس لیے کہ اسی کرسی پر ایسے ایسے نامور لوگ رہ چکے تھے جن کے ڈنکے ہمارے ادب میں آج تک پٹے ہوئے تھے مگر اودھ اخبار کا قلمدانِ ادارت سنبھالنے کے بعد پتہ چلا کہ اب تو یہ روزنامہ عجوبہ روزگار بن چکا ہے۔ نہ مطبع نولکشور کے مالکوں کو اس سے کوئی بحث ہے کہ اس کی اشاعت کیا ہے نہ اس سے کوئی بحث ہے کہ یہ کتنے نقصان میں چل رہا ہے وہ تو بس اس کو نولکشور آنجہانی کی یادگار کے طور پر نکالے جا رہے تھے نہ اس کی کہیں کوئی ایجنسی تھی نہ خود لکھنؤ کے کسی بازار میں یہ فروخت ہوتا تھا بس چار پانچسو پرچے وضعداری کے طور پہ چھاپے جاتے تھے اور نہ جانے کہاں چھپا دیئے جاتے تھے نہ اس کے کسی شہر قصبہ یا گاؤں میں نامہ نگار تھے نہ کسی اور ہی ذریعے سے خبریں فراہم ہوتی تھیں۔ ہوتا صرف یہ تھا کہ صبح تڑکے لکھنؤ میں شائع ہونے والے انگریزی اخبارات آجاتے تھے اور ان کی تھوڑی بہت خبریں اُلٹا سیدھا ترجمہ کر کے نہایت شان کتابت کے ساتھ شائع کر دی جاتی تھیں۔ چند مراسلہ نگار جن کے مراسلے دوسرے اخبارات شائع نہ کرتے تھے اپنے مراسلے بھیج دیا کرتے تھے۔ ایک ایڈیٹر ہوتا تھا اور دوسرا اس کا نائب۔ یہ دونوں مل کر پہلے تو خبروں کا ترجمہ کیا کرتے تھے اس کے بعد ایڈیٹر صاحب اداریہ لکھنے بیٹھ جاتے تھے اور نائب صاحب قینچی ہاتھ میں لے کر ڈاک میں آئے ہوئے تبادلے کے اخبارات کی قطع و برید شروع کر دیتے تھے لیکن اگر سچ پوچھئے تو اس سارے عملہ میں کام کے صرف ایک ہی بزرگ تھے جو اپنے منصب کے اعتبار سے تو کاتب تھے مگر تھے ہر مرض کی دوا۔ اسم مبارک تھا منشی بنواری لعل اور تخلص تھا شوخ۔ کتابت اور شاعری تو یہ خیر کرتے ہی تھے مگر اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ مثلاً ایڈیٹر صاحب کی طبیعت موزوں نہیں ہے یا وہ اپنے نائب کے ساتھ تاش کھیل رہے ہیں تو منشی بنواری لعل شوخ ہی ایڈیٹوریل بھی لکھ دیا کرتے تھے اور اس ایڈیٹوریل کا کوئی جداگانہ مسودہ نہ ہوتا تھا بلکہ وہ براہ راست کتابت ہی کرتے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس دفتر میں اگر کسی کا دبدبہ تھا تو منشی بنواری لعل شوخ کا، جو نہ ایڈیٹر کو خاطر میں لاتے تھے نہ اسسٹنٹ ایڈیٹر کو بلکہ ان کو یہ بھی اختیار حاصل تھا کہ وہ ایڈیٹر صاحب کے لکھے ہوئے اداریہ میں جہاں چاہیں اصلاح کر دیں اور ایڈیٹر کو بتا دیں کہ یہ بات تم نے غلط لکھی تھی جس کو میں نے یوں صحیح کر دیا ہے اور بیچارے ایڈیٹر کو صرف مسکرانا پڑتا تھا ورنہ منشی بنواری لعل شوخ اس کو آٹھ آٹھ آنسو رلانا بھی جانتے تھے۔

ادارت کا چارج لینے کے بعد جب یہ حالات میں نے دیکھے اور جب یہ کیفیات میں نے سُنیں تو میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی کہ میں کہاں آپھنسا ہوں اور ان حالات میں مجھ سے کیوں کر کام ہو سکے گا۔ منشی پریم چند آنجہانی مشہور افسانہ نگار ان دنوں مطبع نولکشور کے شعبہ تصنیف و تالیف کے انچارج تھے اور اودھ اخبار کی تھوڑی بہت نگرانی بھی ان کے سپرد تھی میں نے ان حالات کی تفصیل ان کو بتا کر ان سے مشورہ کیا۔ کہ اس طرح میں یہاں کیوں کر کام کر سکوں گا تو وہ سب کچھ سُن کر مسکرائے اور کہنے لگے کہ "تو گویا آپ یہاں کام کرنے آئے ہیں بھائی صاحب یہ تنخواہ نہیں وظیفہ بلکہ وثیقہ ہے اور یہ کام کرنے کے معاوضہ میں دیا جاتا ہے۔ آپ اگر یہ سمجھے ہیں کہ یہ اخبار نکلتا ہے تو یہ غلط ہے دراصل اس کی لوح پر منشی نولکشور کی جو تصویر گول دائرہ میں چھپتی ہے اور اس کے نیچے جو لکھا رہتا ہے کہ بیادگار منشی نولکشور سی۔ آئی۔ ای وہی بس اس کا مقصد ہے یعنی یہ اخبار کی لوح نہیں بلکہ نولکشور کی لوح مزار ہے۔ مالکانِ مطبع کا اعتقاد یہ ہے کہ اودھ اخبار کو بہر صورت جاری رہنا چاہیے اس لیے کہ اس سے اس مطبع کو فروغ حاصل ہوا ہے اور منشی نولکشور کو اس سے تعلق خاطر تھا اس کے علاوہ اس اخبار کا اور کوئی مقصد نہیں۔" میں نے منشی پریم چند سے یہ سُن کر بڑی حیرت سے کہا۔ کہ اس بے مقصدی کا شکار آخر میں کیوں کر بن سکوں گا اور یہ حرام کی تنخواہ مجھے کیسے ہضم ہوگی تو انھوں نے بدستور خندہ پیشانی کے ساتھ کہا کہ "اگر آپ کا ہاضمہ ایسا ہی کمزور ہے تو اور آپ یہ دعوئے مسیحائی لے کر آئے ہیں کہ مُردے میں جان ڈال لیں گے تو آپ اس کے لیے ایک اسکیم تیار کیجیے۔ میں اس کے لیے تیار ہوں کہ وہ اسکیم آپ کے ساتھ جا کر منشی بشن نرائن بھارگو کے سامنے پیش کر دوں گا اور جتنا سر کھپایا جا سکتا ہے کھپاؤں گا۔" منشی پریم چند کے اس وعدے کے بعد میں نے ایک مفصل اسکیم تیار کی کہ مجھ کو اتنا عملہ درکار ہے۔ میں اس طرح اس کی ایجنسیاں قائم کرنا چاہتا ہوں۔ شعبۂ اشتہارات کو اس طرح منظم کرنا چاہتا ہوں۔ بیرونی نامہ نگاروں کے علاوہ اتنے مقامی رپورٹر چاہتا ہوں۔ اخبار کی ترتیب۔ کتابت اور طباعت میں یہ انقلاب چاہتا ہوں اور سب سے بڑی بات یہ کہ منشی بنواری لعل کو یا تو بالکل ہی نہیں چاہتا یا صرف ایک کاتب کی حیثیت سے چاہتا ہوں جن کا اور کسی بات میں کوئی دخل نہ ہو سکے۔ منشی پریم چند نے پوری اسکیم نہایت غور سے سُنی۔ منشی بنواری لعل والے حصّہ میں یہ ترمیم کی کہ ان کا نام نہ لکھو بلکہ یہ لکھو کہ دفتر کا نظم و ضبط صرف اسی صورت سے قائم رہ سکتا ہے کہ عملہ کے لیے ایڈیٹر کے احکامات اور ہدایات کو قطعی سمجھا جائے اور اس میں کسی کی مداخلت کا مجاز نہ سمجھا جائے ایڈیٹر کو اپنے عملہ کے تقرر اور برخاستگی کے کلی اختیارات حاصل ہوں میں نے اس ترمیم کو اپنے اختیارات کے لیے اور بھی مستحکم سمجھ کر قبول کر لیا چنانچہ منشی پریم چند کی معیت میں منشی بشن نرائن بھارگو مالک مطبع کے سامنے میری پیشی ہوئی جہاں سب سے پہلے منشی پریم چند نے ایک نہایت سلجھی ہوئی تمہیدی تقریر کی اس کے بعد میری اسکیم ان کے سامنے پیش کر دی گئی۔ بدقسمتی سے اس وقت بھارگو صاحب ریس پر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے اور ان کے ذہن میں گھوڑوں کا اصطبل کھلا ہوا تھا انھوں نے اسکیم لے کر رکھ لی کہ میں اس پر غور کروں گا۔

میں نے منشی پریم چند کے مشورے سے منشی بنواری لعل شوخؔ سے نہایت روادارانہ تعلقات قائم رکھے یہاں تک میرے فرائض میں یہ بھی شامل ہو گیا کہ روزانہ ان کی ایک تازہ غزل سُنا کروں اور اس کی بے حد داد دیا کروں۔ ایک

دن وہ ایک نہایت خوب صورت فریم میں ایک نہایت طویل فارسی کا قصیدہ لے آئے جو شاہ نادر شاہ والیٔ افغانستان کی شان میں تھا اور منشی بنواری لعل شوخ اسے جشنِ تخت نشینی کے موقع پر سفیرِ افغانستان مقیم دہلی کے توسل سے بھیجنا چاہتے تھے۔ نہایت لالہ شاہی فارسی تھی اس قصیدے کی "بوئے کچوری می آید" کا اس سے بڑا نمونہ میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا مگر جب منشی بنواری لعل شوخ نے وہ قصیدہ بھیجا تو کچھ ہی دن بعد ان کو ایک انشیورڈ پارسل موصول ہوا جس میں دربارِ افغانستان کی طرف سے ایک پروانۂ خوشنودی تھا، ایک پارکر قلم اور ایک سونے کی گھڑی۔ اب کیا تھا اب تو منشی بنواری لعل شوخ اس کے مستحق ہو گئے تھے کہ ان کی شان میں ہم سب قصیدے کہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ منشی بنواری لعل شوخ کی شاعری نے مجھ کو ایسا عاجز کیا کہ میں نے منشی پریم چند سے تقریباً دست بستہ نہایت گڑگڑا کر کہا کہ جب تک بھارگو صاحب اس اسکیم پر غور کر رہے ہیں کم سے کم مجھ کو منشی بنواری لعل شوخ کی شاعری سے تو نجات دلوا دیجیے۔ چنانچہ منشی پریم چند نے اودھ اخبار کے دفتر کا معائنہ کیا۔ اسی وقت یہ احکام دیے کہ ایڈیٹر کا کمرہ میرے کمرے سے ملا ہوا ہونا چاہیے۔ اور اس طرح میں منشی بنواری لعل شوخ کی دسترس سے نکل بھاگا۔

اب میں منشی پریم چند کے زیادہ سے زیادہ قریب پہنچ چکا تھا اتنا قریب کہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے ہی بیٹھے پوچھ لیا کرتے تھے کہ "کیوں بھئی شوکت صاحب حضرت آدم کی اہلیہ کا کیا نام تھا؟" اور میں ان سے دریافت کر لیا کرتا تھا کہ "رکشا بندھن کی تاریخ کیا ہے" اور وہ کبھی میرے کمرے میں آ کر اور کبھی مجھ کو اپنے پاس بلا کر بڑی تفصیل کے ساتھ اس قسم کی معلومات فراہم کر دیتے تھے۔ اسی زمانہ میں رسالہ نیرنگ خیال کے مدیر حکیم یوسف حسن صاحب نے مجھ کو ایک خط لکھا کہ میرا ایک کام کر دو۔ منشی پریم چند سے ایک افسانہ لے کر میرے نام وی۔ پی کر دو۔ چنانچہ مجھ کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ افسانے اور مضامین بھی وی۔ پی کیے جاتے ہیں۔ میں نے منشی پریم چند سے کہا تو وہ کچھ چپ سے ہو گئے اور بڑی دیر کے بعد کچھ عجیب شرمائے ہوئے انداز سے کہا کہ میرے لیے یہ بڑا دشوار مرحلہ ہوتا ہے کہ مثلاً آپ کے ذریعہ سے فرمائش آئی ہے تو میں کیونکر وی۔ پی بھیجوں اور بھیجوں بھی تو کس رقم کا۔ بہرحال میں افسانہ لکھ لوں پھر دیکھا جائے گا۔ اور دیکھا یہ گیا کہ بہت شرماتے ہوئے ایک دن منشی پریم چند نے پچاس روپے کا وی۔ پی بھیج دیا جو فوراً وصول کر لیا گیا۔ اس زمانہ میں اول تو مضامین کے معاوضہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اور معاوضہ بھی اتنا کہ شرماتے ہوئے بھی گویا بڑی رعایت کے ساتھ پچاس روپے۔

سچی بات یہ ہے کہ مجھ کو تو منشی پریم چند پر بہت ہی رشک آیا اور ادبی رسائل سے مضامین کا معاوضہ لینے کی راہ منشی پریم چند ہی نے مجھ کو سجھائی تھی مگر ایک افسانہ کا معاوضہ پچاس روپے دینے والے تو آج بھی شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔

وہ اسکیم جو میں نے منشی پریم چند کے ساتھ جا کر بھارگو صاحب کو دی تھی اس کا چھ مہینہ بعد یہ پتہ چلا کہ وہ بھارگو صاحب نے اپنے نہایت قریبی دوست رائے بہادر ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مصنف ہسٹری آف اردو لٹریچر کو غور کرنے کے لیے دے رکھی تھی چنانچہ منشی پریم چند نے ایک دن مجھ کو یہ پیغام دیا کہ تم کو ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے طلب کیا ہے جو اصلاً تو ڈپٹی کلکٹر ہیں مگر آج کل حکومت صوبجات متحدہ کے محکمہ اطلاعات کے افسر اعلیٰ لگے ہوئے ہیں اور پھر ان کے متعلق مجھ کو چند موٹی موٹی باتیں سمجھا دیں کہ وہ آدمی نہایت علامہ قسم کے ہیں چنانچہ تم پر فرض ہے کہ تم ان کو علامہ سمجھو اور ان کو یقین دلا دو کہ اگر

انھوں نے اُردو کا یہ تذکرہ انگریزی میں نہ لکھا ہوتا تو اُردو یتیم خانہ میں داخل ہو جاتی گویا قلعۂ معلی کے بعد معلی القاب اُردو کو نصیب ہوا وہ آپ ہی کی ذات والاصفات ہے۔ میں اس قصیدہ خوانی کے لیے تیار ہو کر ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی خدمت میں باریاب ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک گھومنے والی کرسی پہ اُردوئے معلی منہ میں پائپ لیے بیٹھی ہے۔ بظاہر بڑے تپاک سے ملے مگر اس تپاک میں بھی وہ آدمی کم رائے بہادر زیادہ۔ انشا پردازی کا غازہ ملے ہوئے خالص ڈپٹی کلکٹر ثابت ہوتے رہے۔ اُردو سے اتنی دلچسپی وہ ضرور رکھتے تھے کہ انگریزی انداز سے اُردو بول لیتے تھے۔ اور تھوڑی ہی دیر کے بعد ان کی اُردو ختم ہو جاتی تھی۔ مجھ سے انھوں نے اودھ اخبار کے متعلق تو صرف اتنا ہی کہا کہ اسکیم آپ کی بہت اچھی ہے مگر ذرا مہنگی ہے اور اس کے بعد خود ہی سوال کر لیا کہ آپ نے میری کتاب "ہسٹری آف اُردو لٹریچر" پڑھی ہے؟ جس کے جواب میں میں نے اپنا وہ قصیدہ شروع کر دیا جو منشی پریم چند پہلے ہی میرے کانوں میں پھونک چکے تھے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نہایت غور سے یہ قصیدہ سنتے رہے اور ان کے انداز سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اب اس قصیدہ گو شاعر کو خلعت فاخرہ سے نوازنے ہی والے ہیں۔ چنانچہ قصیدہ ختم ہوتے ہی انھوں نے گھنٹی بجائی۔ یقیناً یہ گھنٹی خلعتِ فاخرہ طلب کرنے کے لیے بجائی گئی تھی۔ چنانچہ جیسے ہی چپراسی داخل ہوا آپ نے حکم دیا "چائے لاؤ" اور پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا میں اس کا دوسرا حصہ بھی تیار کر رہا ہوں جس میں اس وقت کے تمام ادیبوں اور شاعروں کا ذکر ہو گا۔ مگر مصروف اس قدر ہوں کہ وقت نہیں ملتا۔ مثلاً یہ گروپ دیکھیے۔ میں نے جب اس گروپ کو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ میں پہلے ہی یہ گروپ دیکھ چکا ہوں۔ یہ پہلی گول میز کانفرنس کا گروپ تھا۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اس تصویر میں ایک موہوم سے سایہ پر انگلی رکھ کر کہا "ان کو پہچانتے ہیں آپ؟" میں بھلا اس بے خد و خال دھبہ کو کیا پہچانتا۔ ابھی اس کو دیکھ ہی رہا تھا کہ آپ نے تحریر فرمایا "مدبر میں ہوں۔ دماغ کا عرق نکال کر آیا ہوں گول میز کانفرنس میں مگر وہ لوگ بھی یاد کریں گے کہ کس مصیبت کو گول میز کانفرنس میں مدعو کر لیا تھا۔" میں ان کی مرضی کے مطابق اس گروپ کو دیکھ کر ان سے اور بھی مرعوب ہو گیا مگر بعد میں صرف یہی کہا کہ آپ کی یہ سیاسی اور سرکاری ذمہ داریاں کاش آپ سے اُردو کی حق تلفیاں نہ کرائیں۔ آپ نے اس یتیم بچی کے سر پہ ہاتھ رکھا ہے تو اس کو پروان بھی چڑھا دیجیے۔ یہ سُن کر بسکٹ کی طشتری میری طرف کھسکاتے ہوئے کہا "یہ لیجیے نا!"

ایک ہفتہ کے بعد منشی پریم چند نے مجھ کو چند کاغذات دیتے ہوئے کہا کہ تمھاری اسکیم بڑی حد تک منظور کر لی گئی ہے معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کو خاصا شیشہ میں اُتار چکے ہو۔ اور اب مجھ کو بتانا پڑا کہ اس عرصہ میں تین پیشیاں ہو چکی ہیں اور تین قصیدے میں سُنا چکا ہوں بہرحال میں اس کو غنیمت سمجھتا ہوں کہ منشی بنواری لعل شوخ کے بجائے مجھ کو ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی دربار داریاں کرنا پڑ رہی ہیں اور ان کا یہ صلہ بھی مل گیا ہے کہ میری اسکیم بڑی حد تک منظور ہو گئی ہے۔

ابھی اس اسکیم پر عملدرآمد شروع بھی نہ ہونے پایا تھا کہ نولکشور اسٹیٹ معہ روزنامہ اودھ اخبار کے کورٹ آف وارڈس میں چلی گئی اور سارے کئے دھرے پر پانی پھر گیا۔ منشی پریم چند کچھ دن پہلے ہی بنارس جا چکے تھے میرے لیے بھی اب اُردو اخبار میں رہنا ممکن نہ رہا۔

(۲)

وصل صاحب کا ذکر ختم ہو تو کسی اور کا بھی ذکر شروع کیا جائے مگر یہ ذکر نہ اتنا مختصر ہے کہ اتنی جلدی ختم ہو جائے

نہ اتنا محدود کہ اس میں کسی اور کے ذکر کی گنجائش ہی نہ نکلے، میں تو جس کسی کا ذکر چھیڑنا چاہتا ہوں۔ وصل صاحب کو اس ذکر میں موجود پاتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ گورکھپور سے لکھنؤ آ جانے کے بعد وصل صاحب ایک انسان نہیں بلکہ ایک انجمن بن کر رہ گئے تھے۔ اور لکھنؤ کے تمام شعری اور ادبی حلقہ کی ٹھیکیداری اس حد تک ان کے حصہ میں آ گئی تھی۔ کہ لکھنؤ کی ادبی محفلیں تو درکنار لکھنؤ سے باہر بھی اگر کوئی مشاعرہ ہوتا تھا۔ تو بانیانِ مشاعرہ لکھنؤ کے شعرا کو مدعو کرنے۔ فرداً فرداً ہر شاعر کے گھر پہ جانے کے بجائے سیدھے وصل صاحب کی خدمت میں پہنچتے تھے۔ اور وصل صاحب ہی سب کی طرف سے وعدہ کر کے بانیانِ مشاعرہ کی طرف سے آنریری میزبان بن جایا کرتے تھے۔ اور اب یہ ان کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ کہ وہ لکھنؤ کے شعرا کو دعوت نامے پہنچائیں۔ ان کو مشاعرے کی شرکت کے لیے راضی کریں۔ اور وہ اگر شرافت کے ساتھ راضی نہ ہوں تو ڈرا کر، دھمکا کر، ڈانٹ کر، ڈپٹ کر، بہر حال کسی نہ کسی طرح راضی کریں۔ اور اپنی قیادت میں ان کا قافلہ لے کر روانہ ہوں۔ راستہ میں وہ ہر شاعر سے فرداً فرداً اس کی طرحی غزل سنتے تھے۔ کسی سے کہتے تھے کہ "اپنا ساتواں شعر کاٹ دیجئے" کسی کو حکم ملتا تھا۔ کہ "اپنا دوسرا مطلع غزل سے خارج کر دیجئے" کسی کو نویں شعر کے پڑھنے کی ممانعت ہوتی تھی، تو کسی کو گیارھویں شعر کے نہ پڑھنے کی تاکید کی جاتی تھی اور اگر اس کی وجہ پوچھی جائے۔ تو نہایت سادہ سا جواب دیا جاتا تھا کہ "یہ میں پڑھوں گا" حالانکہ خود ان کے پڑھنے کے لیے ایک نہیں کئی غزلیں ان کی جیب میں ہوتی تھیں۔ جن کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کہاں سے آئیں جس پر یہی سمجھ کر رہ جانا پڑتا تھا کہ۔ ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

مشاعرے سے کچھ دیر پہلے وصل صاحب ان سینکڑوں اشعار میں سے اپنے لیے ایک تیرہ شعر کی غزل تیار کرتے تھے جو ظاہر ہے کہ عطر مجموعہ کے قسم کی ہوتی تھی اور حاصلِ مشاعرہ سمجھی جانے کی مستحق ہوتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وصل صاحب اس کو پڑھ کر غارت کر دیں۔ اس لیے کہ وہ غزل پڑھتے نہیں بلکہ "غزل ڈانٹتے" تھے۔ چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔ آنکھوں سے خون چھلکتا محسوس ہوتا تھا۔ گلے کی رگیں پھول جاتی تھیں۔ منہ سے جھاگ اڑتا تھا اور وہ زانو پیٹ پیٹ کر اس طرح ایک ایک شعر پڑھتے تھے۔ گویا اس شعر کو اٹھا اٹھا کر پٹخ رہے ہیں اور طے کر چکے ہیں کہ آج یہ شعر نہیں یا میں نہیں۔ ان کی شعر خوانی کا انداز ہسٹیریا کے دورے سے بہت ملتا جلتا تھا مگر کچھ دن کے بعد ان کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کی اچھی سے اچھی غزل ان کی اس خونخوار شعر خوانی سے ذبح ہو کر رہ جاتی ہے لہذا انھوں نے خود پڑھنا ترک کر دیا تھا اور ہر مشاعرہ کے لیے کسی نہ کسی خوش آواز شاعر کو پہلے سے طے کر لیا کرتے تھے کہ وہی ان کی غزل پڑھے گا۔ اور وہ صرف داد کی رسید کے طور پر سلام کریں گے۔

وصل صاحب جب سے شاعروں کے تھوک فروش تاجر یا ٹھیکہ دار بنے تھے ان ہی کے درِ دولت پر ہر چھوٹے بڑے شاعر سے ملاقات ہوتی رہتی تھی کہ آج ان کے یہاں حضرت ریاض خیرآبادی ٹھہرے ہوئے ہیں تو کل حضرت جگر مرادآبادی ان کے یہاں سے نکل بھاگنے کے لیے پھڑپھڑا رہے ہیں۔ مگر راہِ فرار نہیں ملتی۔ ایک دن دیکھتے کیا ہیں کہ ہمارے حضرت جوش ملیح آبادی ان کی حراست میں آئے ہوئے ہیں ہر چند کہ جوش صاحب سے رفیع احمد خاں مرحوم کے ساتھ بارہا ملاقاتیں ہو چکی تھیں

اور یہ ملاقاتیں تکلف کے حدود کو کب کا ختم کر چکی تھیں۔ مگر وصل صاحب کے شکنجہ میں ان کی بے بسی کا جو تماشہ نظر سے گزرا وہ پہلے کبھی نظر نہ آیا تھا۔ وصل صاحب ان کو کانپور کے ایک مشاعرے میں لے جانے کے لیے پکڑ لائے تھے اور جوش صاحب ان سے رحم کی اپیلیں کر رہے تھے کہ وہ کسی طرح ان کو بخش دیں۔ منت سماجت سے کام نہ چلا تو جوش صاحب نے "پٹھنوری" دکھانے کی کوشش کی کہ "نہیں صاحب اس مشاعرے کی شرکت کے لیے آمادگی کی ایک رمق بھی میں اپنے میں نہیں پاتا یہ بالجبر اغوا ہے۔"

وصل صاحب نے کڑک کر پوچھا "کیا کہا؟" اور فوراً اپنے مصنوعی دانتوں کی پلیٹیں زبان سے ٹھیل کر منہ کے باہر نکال دیں۔ اور اب جو یہ نقلی دانت بجاتے ہیں تو جوش صاحب نے ایک جھرجھری لے کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

"اُف۔ اُف۔ جاؤں گا صاحب یقیناً جاؤں گا۔ اوہ۔ جاؤں گا صاحب۔"

اور جہاں وصل صاحب نے اپنے یہ دانت ضبط کیے جوش صاحب نے پھر رسیاں تڑانا شروع کر دیں۔ مگر توبہ کیجیے ان باتوں سے کہیں ان کو وصل صاحب سے رہائی حاصل ہو سکتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد کانپور جانے والی ٹرین میں وصل صاحب اور جوش صاحب ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہوئے نظر آ رہے تھے مگر اب بھی وصل صاحب تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اپنے دانت باہر نکال کر بجاتے تھے اور جوش صاحب جھرجھری لے کر اور "آف" کہہ کر آنکھیں بند کر لیتے تھے اور تھوڑی دیر کے بعد وصل صاحب سے کچھ کہتے تھے جسے وصل صاحب لکھ لیتے تھے۔ پھر جوش صاحب پہلو بدل کر کہتے تھے کہ "بس صاحب بس" اور وصل صاحب کو پھر دانت نکال کر بجانا پڑتے تھے۔ کانپور تک یہی سلسلہ قائم رہا اور کانپور کے اسٹیشن پر جب جوش صاحب ٹرین سے اترے ہیں تو بہت لٹے ہوئے نظر آ رہے تھے گویا راستہ بھر ان سے چکی پسوائی گئی ہو۔ مشاعرہ تو خیر بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔ لیکن صبح ہوتے ہی جوش صاحب تمام احباب کو گھیر کر دریا کی سیر کو لے گئے اور گنگا گھاٹ پر پہنچ کر کشتی کی سیر کے لیے مچل گئے۔ آخر ایک کشتی کرایہ پر لی گئی اور اس میں ہم سب بیٹھ کر اس پار سے اس پار جانے کے لیے روانہ ہو گئے گنگا ان دنوں باڑھ پر تھی۔ نہایت خوف ناک بھنور پڑ رہے تھے اور ملاح کا دل ہی جانتا ہوگا کہ وہ دھارے میں پہنچ کر جوش صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی کہ ایک دم کشتی میں کھڑے ہو گئے اور پہلے تو ایک مختصر سی مگر نہایت ولولہ انگیز تقریر کی جس کے ممدوح وصل صاحب تھے کہ اس شخص نے کل سے آج تک مجھ پر نہایت انسانیت سوز مظالم کیے ہیں اور مجھ کو زندگی سے اس حد تک بیزار کر دیا ہے کہ اب میں خودکشی کی جرأت آزما بزدلی کے لیے آمادہ ہو چکا ہوں اور یہ کہہ کر انھوں نے کشتی کے ایک کنارے پر ایک پیر اور دوسرے کنارے پر دوسرا پیر رکھ کر ایک پوربی گیت چھیڑ دیا کہ:-

اب نہ لکھو سیاں چھٹیاں گوں کی ——— اب نہ لکھو
چھٹیاں پڑھت موئے انسوا بہت ہیں
انسوا بہت جیسے ندیاں ساون کی
اب نہ لکھو سیاں چھٹیاں گوں کی ——— اب نہ لکھو

وہ شوق سے گاتے کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ مگر انھوں نے ساتھ ہی ساتھ رقص بھی شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ

ظاہر ہے کہ ناؤ ڈگمگانے لگی اور ملاح نے چیخ کر کہا کہ ڈوب جائے گی ناؤ صاحب یہ نہ کرو۔ مگر جوش صاحب کا جواب یہی تھا کہ ہم ناؤ ڈبونے ہی کے لیے یہ کر رہے ہیں اور پھر جو اپنے دونوں پیروں کو جنبش دی ہے تو ہم سب کو موت کا ایک ایسا جھونکا آیا ہے کہ ہر زبان پر کلمۂ شہادت تھا۔ مولانا آسی نے سنجیدگی سے بُرا مان کر کہا۔

"بیٹھ جائیے جوش صاحب یہ نہایت مہلک مذاق ہے۔"

جوش صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا "غالب کا شارح اور سنجیدگی کو مذاق کہہ رہا ہے۔"

مولانا آسی کی شرح دیوانِ غالب اسی زمانہ میں نکلی تھی۔ نشتر سندیلوی نے گھبرا کر کہا "یہ کیا بیہودگی ہے؟" اور جوش صاحب نے بڑے رعبِ سلطانی کے ساتھ کہا "یہ کس گستاخ کی آواز ہے میں حکم دیتا ہوں کہ وہ میرے قدموں پر جھک جائے ورنہ یہ لو۔"

اور اب جو ایک ہچکولہ کشتی کو دیتے ہیں تو نشتر سندیلوی "خدا کے لیے جوش بس کرو۔" کہتے ہوئے واقعی ان کے قدموں پر جھکے ہوئے تھے۔ اب وصل صاحب کی باری تھی۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ "میں کہتا ہوں جوش!"

کہ جوش صاحب نے کڑک کر کہا "خاموش! خبردار جو ایک لفظ بھی زبان سے نکالا۔ نکالو اپنے دانت۔ بالکل نکال لو۔ اپنی ہتھیلی پر درندے کے اس مصنوعی جبڑے کو رکھ لو۔ کرو ان کو دریا برد۔ ان ملتجی نظروں سے دیکھ رہے ہو۔ تو ان دانتوں کو صرف گنگا اشنان کراؤ۔ اب رکھ لو ان کو جیب میں۔"

اور وصل صاحب ان کے ایک ایک حکم کی تعمیل کرتے رہے اس کے بعد جوش صاحب دوسروں کی طرف مخاطب ہوئے۔

"اے موت سے ڈرنے والے بزدل شوکت تھانوی اپنی ناک سے کشتی کے تختہ پہ دستخط کر۔"

میں ایک طرف سہما ہوا بیٹھا تھا اور واقعی اختلاجِ قلب میں مبتلا تھا۔ طرح طرح کے خیال دل میں آ رہے تھے کہ جب اس غرقابی کی خبر گھر پہنچے گی تو گھر میں کیسا کہرام مچے گا۔ میری دکھیاری ماں کیسی پچھاڑیں کھائے گی۔ اس غم کے پہاڑ کو میرا بوڑھا باپ کیسے کر برداشت کرے گا۔ میری چاہنے والی بہن اپنا کیا حال کرے گی آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جان بخشی کی صرف یہی صورت نظر آئی کہ کشتی کے تختہ پر ناک سے لکیریں کھینچنا شروع کر دیں۔ امین سلونوی جو غالباً مرے ہوئے بیٹھے تھے اپنی مونچھوں کا سارا تاؤ بھول چکے تھے اور اس دنیائے فانی کو بڑی حسرت سے دیکھ رہے تھے کہ اپنا نام سن کر چونکے جوش صاحب نے ان کو للکار کر کہا "اپنا شجرہ بیان کرو۔"

اور جب ان کے مُنہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی تو جوش صاحب نے کشتی کو ایک مرتبہ ڈگمگا کر نادری حکم دیا کہ "بیان کرو اپنا شجرہ۔"

امدا امین سلونوی نے اس وقت اور اس عاجزی سے "یاد نہیں آتا جوش صاحب۔" کہا ہے کہ جوش صاحب کی ساری اداکاری ختم ہو گئی اور وہ بے ساختہ ہنستے ہوئے بیٹھ گئے۔ بات یہ تھوڑی ہی دیر کی تھی مگر معلوم یہ ہوتا تھا کہ ہم سب پر مصیبتوں اور آزمائشوں کی صدیاں بیت گئی ہیں۔ گنگا کی خوفناک طغیانی کیفیت ملاح تک کا بار بار یہ کہنا کہ بس اب ڈوبتی ہے ناؤ مگر اس کے باوجود جوش صاحب کا یہ ہولناک کھیل ایسا نہیں تھا جس نے کسی کے حواس بجا رکھے ہوں۔ یوں تو سب

ری اپنی چوکڑی بھول چکے تھے مگر مجھے تو سب سے زیادہ اپنی ہی کیفیت کا علم ہے کہ میں تو یہ سمجھ چکا تھا کہ اس مشاعرے میں ہماری موت ہم کو کھینچ کر لائی تھی اور یہ حضرت ملک الموت ہیں جن کو اب تک جوش ملیح آبادی سمجھتے رہے ہیں۔ کشتی سے اترنے کے بعد بھی دیر تک ہوش بجا نہ ہو سکے اور یہ یقین مشکوک سا محسوس ہوتا رہا کہ اس گرداب بلا سے زندہ سلامت نکل آئے ہیں تھوڑی دیر تک تو ایک مکمل سکوت کا عالم طاری رہا۔ اس کے بعد سب سے پہلا "لاحول" مولانا عبدالباری آسی نے بھیجا۔ اور ان کی تائید نشتر سندیلوی نے کی۔ کہ "حد کر دی بخدا" اور اب مولانا آسی ابل پڑے کہ "میں نہ اس قسم کے مذاق کا عادی ہوں نہ اس قسم کے مذاق کو پسند کرتا ہوں اور یہ سارا کیا دھرا وصل صاحب آپ کا ہے، میں اس پروگرام میں شرکت کرنا ہی نہ چاہتا تھا مگر آپ کی احمقانہ ضد نے مجھ کو اس حماقت میں مبتلا کیا ہے۔ زندگی اور موت کے درمیان آخر فاصلہ ہی کتنا رہ گیا تھا۔"

وصل صاحب نے جوش صاحب کو مخاطب کیا جو نہایت غیر متعلق بنے چلے جا رہے تھے کہ "یہ سوجھی کیا تھی آخر؟" جوش صاحب نے بڑے متکبرانہ انداز میں جواب دیا۔ "اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ میرے عفو و درگزر کا نتیجہ ہے احسان فراموش اقوام نے اپنے محسنوں کے ترحم کا ہمیشہ اسی طرح صلہ دیا ہے جیسا اس وقت مجھ کو دیا جا رہا ہے خیر باد زندہ صحبت باقی۔" نشتر سندیلوی نے تو اس کے جواب میں بھی کچھ تلخ باتیں کہیں مگر مولانا آسی تو اس حد تک ناراض ہو چکے تھے کہ نہ صرف اس وقت انھوں نے اس بحث میں کوئی حصہ لینا نہ چاہا بلکہ اس دن دوپہر کے کھانے میں جب جوش صاحب نے ان کی طرف مرغ کا ڈونگہ بڑھایا ہے تو انھوں نے نہایت خشمگیں نگاہوں سے جوش صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا "خیر۔ خیر" اور مرغ تک ان کے ہاتھ سے لینا گوارا نہیں کیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ مولانا آسی اس واقعہ کو مرتے مرتے نہ بھولے تھے۔ اور کئی مرتبہ نہایت ناگواری کے ساتھ اس واقعہ کو دوہرا چکے تھے۔ بلکہ بعض اوقات تو یہ واقعہ ان کے ذہن میں ایسا بے محل تازہ ہوتا تھا کہ مولانا آسی کی اس یادداشت پر غصہ آنے لگتا ہے۔ مثلاً جوش صاحب کی ایک نظم "فتنۂ خانقاہ" کسی رسالہ میں دیکھ کر میں پھڑک اٹھا اور وہ نظم مجھ کو اس قدر پسند آئی کہ جو کوئی بھی مجھ کو ملتا تھا اس کو میں اس نظم کا ایک آدھ بند سنانا ضرور تھا۔ چنانچہ مولانا آسی کو بھی میں نے اس نظم کے کچھ حصے سنائے۔ مولانا بڑے غور سے نظم سنتے اور جھومتے رہے اور جب نظم سن چکے تو کہنے لگے :۔

"ہاں صاحب بہت بڑا فنکار ہے یہ شخص۔ الفاظ کا ایسا جادوگر بڑی مشکل سے پیدا ہو گا مگر وہ یاد ہے آپ کو کانپور والا واقعہ۔ زندگی ہی تھی جناب جو ہم لوگ بچ گئے۔ اس دن میرے خیال میں وہ کوئی مراق کا دورہ اٹھا تھا جوش صاحب کو۔" میں نے جل کر کہا کہ چھوڑئیے مولانا اس قصہ کو۔ دیکھئے تو سہی کیا کہتا ہے ظالم کہ ؎

ہاتھ اس نے تا کمر کو اٹھائے جو ناز سے
آنچل ڈھلک کے رہ گیا زلفِ دراز سے
جادو ٹپک پڑا نگہِ دل نواز سے
دل ہل گئے جمال کی شانِ نیاز سے

پڑھتے ہی فاتحہ جو وہ ایک سمت پھر گئی
اک پھیر کے تو ہاتھ سے تسبیح گر گئی

مولانا نے بڑی فراخ دلی سے داد دی مگر داد دیتے دیتے پھر ایک دم سے کہنے لگے: "میں حیران ہوں کہ اس دن جوش کو ہوا کیا تھا۔ ذرا غور تو کیجئے کہ کیسی بے کسی کی موت مرتے ہم سب۔"

عرض تو کیا کہ مولانا آسی مرتے دم تک اس نہ ہو سکنے والے حادثہ کا تصور کو نہ بھولے تھے۔ مگر اس حادثہ کے سلسلہ میں ایک صدمہ جوش صاحب کو بھی تھا کہ "ہائے آج رفیع احمد خان نہ ہوا۔ زندگی بھر کے بدلے آج چکا لیتا۔" اللہ جانے رفیع احمد خاں ہوتے تو اس موقعہ پر کیا کرتے۔ مگر جوش صاحب کا یہ جذبۂ انتقام بھی غلط نہ تھا۔ اس لیے کہ یہ واقعہ ہے کہ رفیع احمد خاں نے جوش صاحب کے ساتھ بعض ایسے سلوک کئے تھے کہ ان کا بدلہ لینے کے لیے جوش ترستے ہی رہ گئے۔ ایک چھوٹا سا واقعہ جس کا میں خود عینی گواہ ہوں۔ اس حقیقت پر تھوڑی بہت روشنی تو ڈال ہی دے گا۔ دیوہ شریف میں حاجی وارث علیؒ شاہ کا عرس تھا۔ اس عرس کے موقع پر دیوہ شریف میں بڑی چہل پہل ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ لکھنؤ سے جوش صاحب، رفیع احمد خاں مرحوم اور میں غالباً کچھ اور لوگ بھی ساتھ تھے دیوہ شریف پہنچے وہاں سماع خانہ میں بیدم شاہ صاحب وارثی کی نظر جوش صاحب پر پڑ گئی۔ بس پھر کیا تھا جوش جوش۔ جوش کا ایک شور برپا ہو گیا اور جوش صاحب ہاتھوں ہاتھ اس بے پناہ ہجوم سے اٹھا کر بیدم شاہ صاحب کے پاس پہنچا دیئے گئے اور ہم لوگوں کو کسی نے پوچھا بھی نہیں۔ رفیع احمد خاں مرحوم کو کسی اور پہ تو نہیں البتہ جوش صاحب پر بے حد غصہ تھا کہ یہ حضرت بھی ہم لوگوں کو بھول گئے۔ جوش صاحب بڑی دیر کے بعد جب اس میلہ میں اپنے ٹھیکے پڑا کر سماع خانہ سے باہر آئے تو رفیع احمد خاں نے ان سے کچھ نہ کہا اور بڑی محبت سے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گھومنے لگے کہ ناگاہ ایک نہایت دخترِ ابوالہول قسم کی دیہاتی عورت جوش صاحب کے قریب سے جو گزری تو رفیع احمد خاں نے اپنے اسی ہاتھ سے جو جوش صاحب کی کمر میں تھا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس "افوہ" قسم کی عورت کے بازو میں چٹکی لے لی۔ اس عورت نے دیکھا آؤ نہ تاؤ جوش صاحب کے وہ دو ہتڑ رسید کیا ہے کہ وہ چونک پڑے اور اب لگی وہ بنکارنے۔ جوش صاحب کا دل ہی جانتا ہوگا کہ وہ کس طرح اپنے کو بچا کر وہاں سے نکلے ہیں۔ رفیع احمد خاں نے یہ انتقام لینے کے بعد صرف اتنا کہا کہ "بڑی عزت افزائیاں ہو رہی تھیں جناب کی سماع خانہ میں اور ہم نیاز مندانِ قدیم نیچے دھکے کھا رہے تھے۔ اس وقت ہم عالی مرتبت کو یاد نہ آئے۔ اب جو اس پہلوان عورت نے ایک ہی ہاتھ دکھایا ہے تو ہماری آڑ لے رہے ہو۔ جاتے کیوں نہیں اپنے بیدم شاہ وارثی کے پاس۔" جوش صاحب سمجھ چکے تھے کہ یہ ایک پٹھان نے ایک دوسرے پٹھان سے بدلہ لیا ہے لہٰذا کہتے تو کیا کہتے۔ صرف یہی شکر ادا کرتے رہے کہ جس میلہ میں ابھی جوش کے آنے کی دھوم تھی۔ اس میں شکر ہے جوش کی اس عزت افزائی کے چرچے نہیں ہوئے۔ سچ تو یہ ہے کہ جوش کی پھڑکتی ہوئی جوڑ اگر تھا تو رفیع احمد خاں ہی تھا۔ جس کے تذکرے میں ایسے ایسے نہ جانے کتنے اور واقعات سامنے آئیں گے۔ ابھی تو اس یگانہ روزگار کا ذکر ہی نہیں چھڑا ہے۔

شیش محل

(چند خاکے)

انیس احمد عباسی

لکھنؤ کے روز نامہ حقیقت کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ میونسپل کمشنر بھی ہیں اور لکھنؤ میں اچھی خاصی ذمّہ دار حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں یا شاید زندگی آپ کو بسر کر رہی ہے۔

پرانے لکھاڑ ہیں جب جی چاہتا ہے نہایت دبنگ قسم کے ایڈیٹر بن جاتے ہیں مگر کبھی کبھی مقالاتِ افتتاحیہ سے "میاؤں" کی آواز بھی آجاتی ہے۔ مجبوری کی بات دوسری ہے۔ ورنہ فطرتاً ان کی رائے نہایت بے لاگ اور آزاد ہوا کرتی ہے۔ صحافت کے تمام داؤ پیچ جانتے ہیں۔ سیّد جالبؔ ایسے "بابائے صحافت" کے محبوب شاگرد رہ چکے ہیں۔ اور کبھی کبھی آپ کی تحریر میں استاد مرحوم کا رنگ پھوٹ نکلتا ہے۔ مدّت سے روز نامہ حقیقت کو بغیر کسی سہارے کے قطعاً توکّل پر چلا رہے ہیں آج اخبار نکل جاتا ہے اور کل کی کبھی فکر نہیں ہوتی مگر اس بے سروسامانی کے باوجود آپ کو تھالی کا بینگن بنتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ سادگی اور وضع داری یہ ہیں وہ خصوصیات جن کے قائل آپ کے مخالفین بھی ہونگے گریجویٹ ہیں مگر سادگی کے بدولت مڈل پاس بھی مشکل ہی سے معلوم ہوتے ہیں۔ ترکی ٹوپی اور کبھی کبھی گاندھی کیپ بہر حال جو ٹوپی بھی ہو سر پر منڈھ کر رہ جاتی ہے پھر کیا مجال کہ سر سے کبھی اُتر جائے۔ جاڑے میں اسی ٹوپی پر ایک گلوبند باندھ لیا جاتا ہے۔ چھڑی کا سہارا لے کر میلوں کا سفر کر جاتے ہیں دفتر آئے۔ گھر گئے۔ سسرال ہو آئے۔ پارٹیوں میں شرکت کی بورڈ کی میٹنگ میں حاضری دی اور سب جگہ ہوتے ہواتے اسی چھڑی کے سہارے رات کو دس بجے گھڑی کی سوئی کے ساتھ خان بہادر شیخ احمد علی عرف ڈلن صاحب کے یہاں موجود ہیں۔ تاش کھیل رہے ہیں۔ ہنس بول رہے ہیں۔ دوسروں کے دُکھ سن رہے ہیں اپنا دُکھ کسی کو نہیں سُناتے۔

صورت سے یتیم نظر آتے ہیں مگر چپکے چپکے سینکڑوں یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرتے رہتے ہیں کوئی ضرورت مند آپ کے پاس پہنچ جائے تو اس کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم سمجھیں گے پھر خود چاہے ڈنڈے بجاتے پھریں مگر خوش ہوتے ہیں کہ ضرورت مند کی ضرورت پوری ہو گئی۔ کئی بار کہا کہ انیس بھائی یا تو فقیری لے لیجئے یا انسانوں کی صورت بنائیے کہتے ہیں کہ تم مزاح نگار ہو مذاق کر رہے ہو۔ کاش کوئی سنجیدگی سے انیس بھائی کو سمجھا دیتا :

انصار ناصری

سید انصار علی ناصری۔ رسالہ ساقی دہلی کے دفتر میں سب سے پہلے ملاقات ہوئی افسانے اور مضامین اس سے بھی پہلے دیکھ چکے تھے ملے تو ان کو اپنے سے بھی کم عمر اور اپنے سے کچھ زیادہ مہذب پایا۔ پھر ہر مرتبہ دہلی کے سفر میں ملاقات ہوتی رہی کبھی سرراہے کبھی ریڈیو اسٹیشن پر کبھی شاہد صاحب کے یہاں مگر یہ ملاقاتیں یوں ہی آداب عرض۔ تسلیمات عرض۔ مزاج تو اچھا رہا۔ آپ کی دعا ہے۔ بھئی وہ مضمون خوب تھا۔ قسم کی رسمی ملاقاتیں تھیں۔

لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر ہم تو خیر تھے ہی یکایک دیکھتے کیا ہیں کہ آپ بھی بسلسلۂ ملازمت چلے آ رہے ہیں پھر کیا تھا تقریباً تین چار سال دن رات کا ساتھ رہا۔ ساتھ ساتھ ناچے ساتھ ساتھ گائے۔ لڑے جھگڑے۔ روٹھے۔ منے دھول دھپا۔ ہاہا ہوہو۔

انصار پہلے کہانی لکھتے تھے۔ ریڈیو میں کیا آئے اپنے ادب کے قبرستان میں آ گئے پھر قسم کھانے کو بھی کچھ نہ لکھا البتہ ایک اچھے پروڈیوسر بن گئے ڈرامہ آپ کی خاص لائن ہے اور ڈائرکشن عبادت کے سے انہماک کے ساتھ فرماتے ہیں الفاظ کے مدوجزر کے ساتھ آپ کے جسم میں بھی جوار بھاٹے کی کیفیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ پس منظر موسیقی کے ساتھ غیر ارادی طور پر متحرک رہتے ہیں غیر محسوس طور پر ناچ رہے ہیں۔ پیش کش کامیاب رہی تو قلابازیاں کھا رہے ہیں تمام اداکاروں پر سے صدقے ہوتے جاتے ہیں۔ ناکام رہی تو پیشانی پر رہ رہ کر ہاتھ مارتے ہیں اور ایسا گہرا اثر لیتے ہیں گویا کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔

ایک اچھے ادیب تھے مگر بہت اچھے پروڈیوسر بن گئے ہیں۔ ریڈیو کے لیے موزوں ترین شخصیت ہیں اپنے کو ماحول کے مطابق ڈھال لینے میں کمال حاصل ہے۔ ان تمام خوبیوں میں ایک برائی بھی ہے کہ خلوص پر اعتماد نہیں کرتے۔ چوکنا رہتے ہیں۔ اس خوبصورت ہرن کو اپنے باغ میں ہر طرف شکاری نظر آتے ہیں معلوم نہیں یہ وحشت کیوں ہے؛

بہزاد لکھنوی

سردار حسین بہزاد لکھنوی کو میں بہزاد کے علاوہ سردار حسین کی حیثیت سے بھی اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ بہزاد کم اور سردار حسین زیادہ تھے۔ طالب علم کی حیثیت سے ان کو اس معاملہ میں شہرت حاصل تھی کہ بنتے بہت ہیں۔ زمین کی باتیں بہت کم کہتے تھے ہر بات آسمان سے کم بلندی کی نہ ہوتی تھی۔

"بھئی سردار حسین یہ شیروانی کا کپڑا تو خوب ہے"

"ہاں۔ مگر اب تو مل ہی نہیں سکتا۔ دو شیروانیوں کا بنا تھا ایک شیروانی ڈیوک آف کناٹ کی بن گئی دوسری یہ ہے"

آواز میں بھی تصنع ہوا کرتا تھا۔ بات کرتے ہوئے چہرہ بھی بڑے آدمیوں کی طرح کا بن جاتا تھا۔ ایک دور وہ آیا کہ آپ نامی لکھنوی کے شاگرد کی حیثیت سے مشاعروں میں داد لیتے نظر آئے۔ پھر جو دیکھا تو ایسٹ انڈین ریلوے میں

ٹکٹ کلکٹر ہیں اور ایسی وردی پہنے پھر رہے ہیں کہ ہر طرف سے لیٹر بکس نظر آتے ہیں۔ اسی ریلوے کے مرض نے اختلاج کا مرض پیدا کر دیا۔ نوکری چھوڑ دی۔ ولی اللہ بن گئے۔ نوکری اور داڑھی دونوں ساتھ ساتھ چھوڑی گئیں۔ داڑھی اور اختلاج بڑھتے ہی رہے۔ یہاں تک کہ گلے میں ہر وقت مصنوعی گریبان نظر آنے لگا۔ اور آپ اس سے دل بہلاتے نظر آنے لگے ؎

میرا ہی گریباں ہاتھ بھی میرے تم کو اس سے مطلب کیا
کیوں روک رہے ہو دُنیا والو مجھ کو دل بہلانے دو

آپ کی شہرت میں آپ کے کلام کے علاوہ آپ کے گریبان اور اختری بائی فیض آبادی کو بھی کافی دخل ہے۔ بہزاد اچھا کہتے ہیں۔ پڑھتے اس سے بھی اچھا ہیں لیکن اگر کم کہا کریں۔ اور زود گوئی کے کمالات کا مظاہرہ چھوڑ دیں تو اس سے بھی زیادہ اچھا کہہ سکتے ہیں۔ ان میں پوری صلاحیت موجود ہے جس کو جلدی میں وہ خود سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے ؛

حسرت موہانی

رئیس الاحرار مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی

شعر کا شعور پیدا ہونے کے بعد سے حسرت کا کلام پڑھنا شروع کیا تھا۔ اور سوچا کرتے تھے کہ حسرت کیسے ہوں گے۔ ان کی سیاسی سرگرمیوں کو اخباروں میں دیکھا کرتے تھے زیادہ تر یہی خبریں پڑھنے کو ملتی تھیں کہ حسرت کو اتنے دن کی سزا ہو گئی۔ حسرت آج اس جیل میں ہیں کل اس جیل میں ہیں۔ گویا آپ کا صدر مقام جیل خانہ ہی ہے۔

ایک مرتبہ ہمیر پور میں ایک مشاعرہ تھا۔ میں لکھنؤ سے چلا اور کانپور سے ایک صاحب ساتھ ہو لیے۔

اجاڑ سی صورت۔ عینک میں ایک طرف ایک دھجی بندھی ہوئی۔ میلی سی ترکی ٹوپی۔ اٹنگا سا چار خانے کا پاجامہ۔ ڈھیلی ڈھالی اچکن۔ پیروں میں میلا سا کرمچ کا جوتا۔ چیں چیں کرتی ہوئی آواز اور عجیب بھدا سا نقشہ۔ ثاقب کانپوری نے تعارف کرایا کہ آپ مولانا حسرت موہانی ہیں میں تو سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ یا اللہ ایسے ہوتے ہیں حسرت موہانی۔

راستے میں دوستی ہو گئی۔ اس لیے کہ دشمنی کرنے کی اہلیت ان میں نہ تھی وہ اپنی اسی سج دھج میں وقیع نظر آنے لگے۔ حالانکہ باتیں بھی یوں ہی سی کرتے تھے کچھ عجیب کھوئی کھوئی سی اور بھی وقعت کی کوئی وجہ نظر نہ آتی تھی۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں کہ وہ وقیع نظر آ رہے تھے۔

ایک مرتبہ ریڈیو اسٹیشن کی طرف سے حسرت صاحب کی خدمت میں کانپور حاضر ہوا۔ دیکھا کہ اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں ایک پانی سے بھرا ہوا گھڑا اٹھائے گھر میں جا رہے ہیں۔ مجھ کو دیکھ کر بھی اپنے اس کام میں مشغول رہے جب فارغ ہوئے تو ایک کھری چارپائی پر بیٹھ کر چند باتیں کیں اور جب میں رخصت ہونے لگا تو فرمایا "اچھا" گویا نہ تمہارے آنے کی خوشی تھی نہ جانے کا غم۔

مدت تک کوشش کرتے رہے کہ مولانا حسرت اپنا کلام براڈکاسٹ کرنے پر تیار ہو جائیں مگر کسی طرح قابو ہی میں نہ آتے تھے۔ مسٹر سومناتھ چب اسٹیشن ڈائرکٹر لکھنؤ کی بڑی خواہش تھی کہ حسرت صاحب سے ان کا کلام براڈکاسٹ کرائیں۔ آخر ایک مرتبہ لکھنؤ میں مل گئے۔ میں نے ان کو تو ایک رستوران میں بٹھا کر چائے میں مصروف کر دیا اور چپکے سے مسٹر چب کو فون کیا کہ مولانا

حسرت کو پکڑ لیا ہے فوراً موٹر بھیجئے۔ تھوڑی دیر میں مولانا حسرت حبیب صاحب کے بنگلہ پر تھے اور ان سے پاکستان کے متعلق اپنے نئے فارمولا پر بحث کر رہے تھے۔ اصرار یہ تھا کہ یہ فارمولا براڈ کاسٹ کر دیا جائے۔ بمشکل تمام مولانا کو اس بات پر راضی کیا کہ آپ ریڈیو اسٹیشن چلیں ہم آپ سے دو ایک غزلیں پڑھوا کر ریکارڈ کر لیں گے۔ معلوم نہیں کیوں مولانا نے کہا "اچھا" پھر ترنم کے ساتھ غزلیں پڑھیں اور پھر جب وہ ریکارڈ سنا تو بہت خوش ہوئے۔ فرمایا "ایں؟ یہ تو بالکل میری ہی آواز ہے۔ تو پھر —— اب میں اسٹیشن جاتا ہوں" میں اسٹیشن تک ساتھ گیا۔ میاں لطیف الرحمٰن بھی ساتھ تھے۔ حسرت صاحب نے کچھ رنگین اور رومانی افسانے بھی سنائے یعنی اپنے ذاتی رومانی افسانے اور پھر کچھ اپنا کلام بھی سنایا۔

مولانا کا سیاسی مشرب خواہ کچھ بھی ہو مگر ان کے شدید سے شدید مخالف کو بھی اس بات کا پورا یقین ہے کہ ان کی رائے ایماندارانہ اور آزادانہ ہوا کرتی ہے۔ ساری خدائی ایک طرف ہو جائے اور مولانا اپنی تنہا آواز بلند کئے بغیر نہیں مان سکتے۔ نہ ان کو ہوٹنگ کی پروا۔ نہ مخالفت کے طوفان سے کبھی مرعوب ہوئے جو اپنا عقیدہ ہے وہ ظاہر کریں گے اور برملا ظاہر کریں گے خواہ کچھ ہو جائے۔ وہ شاعر کی حیثیت سے بلند ہیں یا لیڈر کی حیثیت سے۔ اس سلسلہ میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ وہ شاعر پہلے ہیں اور لیڈری ان کی ثانوی حیثیت ہو سکتی ہے۔

روشؔ صدیقی

کلام سن کر عظمت کو اور صورت دیکھ کر شفقت کو دل چاہتا ہے۔ کلام نہایت وزنی اور خود نہایت ہلکے پھلکے سناتے اس طرح ہیں گویا پھدک رہے ہیں۔ کلام کے زور میں اکثر خود اُڑتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ آواز اچھی ہے اور گلے میں سُر بھی ہے مگر جوش میں آکر جب بے سُرے ہوتے ہیں۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ خلافت فنڈ کے لیے اپیل کرتے کرتے یا شیخوں کے مولانا شوکت علی کو غصہ آ گیا ہے۔ نتھنے پھول جاتے ہیں۔ گھونسہ تان لیتے ہیں اور پھر اسی گھونسے سے تعریف کرنے والوں کو سلام بھی کر لیتے ہیں۔ مشاعروں کی شرکت عبادت کی طرح پابندی سے کرتے ہیں آج آگرہ میں ہیں تو کل گوپامؤ میں۔ کبھی بنارس میں ہیں تو کبھی کسی غیر معروف مقام پر مشاعرے میں نظر آ رہے ہیں۔ نیشنلسٹ شاعر ہونے کا دعویٰ ہے۔ وردی کے طور پر کبھی کبھی کھدر بھی پہن لیتے ہیں۔ ورنہ دراصل آپ کو سیاست سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ نظم کے علمبرداروں میں اس طرح شامل ہیں جس طرح راجہ پورس کی فوج میں ہاتھی شامل تھے۔ یعنی بوقت ضرورت غزل بھی اس طرح پڑھ دیتے ہیں کہ نظم کی تمام علمبرداری سرنگوں ہو کر رہ جاتی ہے۔

فطرتاً بہت معصوم، صورتاً نہایت خام مگر اقتصادی معاملات میں نہ معصوم نہ خام بلکہ نہایت پکے بزنس مین "یک سخن" کی قسم کے ضدی بھی اور "نو نقد نہ تیرہ اُدھار" کی قسم کے منہ پھٹ بھی۔

مجنوں گورکھپوری

احمد صدیق مجنوں گورکھپوری۔ معلوم نہیں یہ تخلص شعر کہنے کے لیے رکھا ہے یا اپنا تعارف کرانے

کے لیے۔ آپ کی پوری شخصیت آپ کے تخلّص میں سما کر رہ گئی ہے۔ اس جسامت کے لیے یہی تخلّص اور اس تخلّص کے لیے یہی جسامت ہونا چاہیے تھی۔ نہایت "المختصر" قسم کے پورٹ ایبل انسان ہیں۔ گویا فطرت کی شارٹ ہینڈ میں مثانی کا جیتا جاگتا نمونہ۔ قد و قامت میں ننھے مگر باقی تمام حیثیتوں سے قیامت، ادیب۔ نقاد۔ شاعر۔ افسانہ نگار۔ طالب علم۔ معلّم سب ہی کچھ تو ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مجنوں کو شہرت بحیثیت ایک افسانہ نگار کے حاصل ہوئی۔ حالانکہ یہ خصوصیت اس کتب خانہ کی صرف ایک الماری ہے۔ وہ شعر کہتے اور خطرناک حد تک سمجھتے ہیں۔ گویا شعر و شاعری کے معاملہ میں سمجھدار اور خطرناک کا مجموعہ بن کر "سمجھناک" ہو گئے ہیں پھر طرّہ یہ کہ منہ پھٹ بھی غضب کے ہیں۔ آپ کا شعر سن کر داد دیں گے تو دوسرا شعر سن کر "مہمل" بھی اس صفائی سے کہہ دیں گے کہ آپ منہ دیکھ کر رہ جائیں۔ کسی سے مرعوب ہونا تو جانتے ہی نہیں۔ البتہ اس آدھی چھٹانک کے آدمی سے بڑے بڑے پہاڑوں کو مرعوب ہوتے ہم نے خود دیکھا ہے۔

مجنوں میں دوستوں کے لیے خلوص بھی ہے۔ مگر بہت سپاٹ قسم کا۔ شروع شروع میں لوگ ان کو سنکی سمجھتے ہیں مگر بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنکی تو نہیں البتہ تصنّع سے بری ہو کر تہذیب کے اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ جو منافقانہ اخلاق اور دروغ بافانہ علم مجلس سکھاتا ہے۔ مجنوں کا دوست بننا بڑے دل گردے کے آدمی کا کام ہے۔ مگر جو کوئی دوست بن جاتا ہے وہ اس چھوٹے سے آدمی کی بڑی بڑی باتوں میں نہیں معلوم کیا کیا پاتا ہے۔

مجنوں صاحب پہلے ہمارے بھی بزرگ بنے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ راہِ راست پر آ گئے۔ اب جب کبھی ملاقات ہو جاتی ہے تو کم سے کم ہمارا دل تو خوش ہی ہو جاتا ہے ان کو خواہ کیسی ہی کدورت کیوں نہ ہوتی ہو:

بارِ خاطر

(چند خطوط)

سید امتیاز علی تاج کے نام

لاہور

۶۔ فروری ۵۱ء

سیدنا

اس وقت آپ بے طرح یاد آ رہے ہیں۔ لکھنؤ سے ایک عزیز بھاگ کر آئے ہیں مگر اس اہتمام کے ساتھ کہ بیستی پانوں کی ڈھولیاں بھی لائے ہیں اور وہ چکنی ڈلی بھی جو کبھی "صاحب کے کفِ دست" پر ہوا کرتی تھی۔

دوپہر کا وقت ہے صحن میں دھوپ کھانے نکلا تھا بیٹھ گیا پان کھانے۔ جب پُرتکلف پاندان میرے سامنے کھل جاتا ہے تو ذہن کا وہ دریچہ بھی کھل جاتا ہے جس میں سے آپ کو جھانکا جا سکتا ہے۔ آج میرا پاندان ایک ایسی دلہن کی طرح سجا ہوا ہے جو بیوگی کی خبر پا کر عدّت کے دن گزار رہی ہو کہ یکایک اُس کا دولہا پردیس سے آ جائے اور اُس کو غیر متوقع طور پر اُس کا سہاگ واپس مل جائے۔ کب اُمید ہو سکتی تھی کہ اس پاندان میں لکھنؤ کے بیستی پان پھر نظر آئیں گے مگر آج اس پاندان میں بیستی پان بھی ہیں۔ کیوڑے میں بسا ہوا دودھیا کتھا بھی۔ چھالیہ بھی وہ جس کو اہلِ ذوق "باجرہ" کہتے ہیں۔ چونا اس قدر شفّاف کہ دودھ بھی اُس کو اپنا آئینہ سمجھے اور کہسارِ مری کی برف بھی اُس کے سامنے پانی پانی ہو جائے۔ سفید سڈول الائچیاں بھی ہیں اور مشکی دانے کا تمباکو بھی۔ پھر قوام کی شیشیاں تو آپ جانتے ہی ہیں میری جان کے ساتھ ہیں۔

اس اہتمام سے پان کھا رہا ہوں اور جھوم جھوم کر گنگنا رہا ہوں ؎

پان اے عنوانِ رنگینِ لبِ لعلینِ یار
اے ذرا سے سبز پتّے غازۂ روئے بہار
اے کہ تیرا رنگِ رعنا جاذبِ جذبات ہے
اے کہ تجھ سے سرخرو صبحِ تجلیات ہے

"لبِ لعلینِ یار" اور "غازۂ روئے بہار" تو آپ نے دیکھا ہی ہوگا مگر کیا واقعی "صبحِ تجلیات" بھی آپ نے دیکھی ہے ؟ خدا کرے نہ دیکھی ہو تاکہ مجھ کو اپنا ایک ساتھی تو ملے۔ میں نے آج تک طلوعِ سحر۔ نور کا تڑکا۔ صبحِ صادق وغیرہ کو کتابوں میں دیکھا ہے خود دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا کہ وہ صبح کیا ہوتی ہے جس کے متعلق جوشؔ ایسے شاعر نے بھی کہہ دیا ہے کہ "ظہورِ حق کے لیے" ؎

اگر رسول نہ آتے تو صبح کافی تھی

اور نہ میں کبھی ایسا طالب علم رہا ہوں جس پر یہ شعر صادق آسکے کہ ؎

رات گزری نور کا تڑکا ہوا
ہوشیار اسکول کا لڑکا ہوا

طالب علمی کے زمانے میں بھی اس خاکسار کے یہاں نور کا تڑکا کبھی نو بجے سے پہلے نہ ہوا۔ طالب علمی کے بعد شاعرِ مشرق کے اس طنز کا مخاطب اپنے ہی کو سمجھا کہ ؎

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے ہاں نیند تمہیں پیاری ہے

کاش وہ موجود ہوتے اور میں ان کو بتا سکتا کہ نیند ہمیں پیاری نہیں بلکہ نیند کو ہم پیارے ہو جاتے ہیں۔ کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ آخر ایسی بھی کیا وضعداری، لاؤ کسی دن اندھیرے منہ اٹھ کر تو دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے۔ گھڑی میں الارم لگا کر سوئے مگر معلوم نہیں وہ الارم کس کے کانوں میں بجا اور کون جاگا بہرحال ہم کو کبھی اس مشاہدے کا موقع نہ مل سکا خیر یہ تو ایک بے بات کی بات چھڑ گئی موضوعِ بحث اس وقت صرف پان ہے جس کے متعلق شاعر کہتا ہے۔ ؎

اے ذرا سے سبز پتے غازۂ روئے بہار

مگر صاحب "ذرا سا سبز پتا" تو آج اتفاق سے آگیا ہے ورنہ یہاں تو "بہت سا سبز پتا" ملتا۔ جس پر سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کتھا چونہ کوئی پیدل کیونکر لگائے تاوقتیکہ بائیسکل پر بیٹھ کر یہ فرض پورا نہ کیا جائے اور پھر اس "بہت سے سبز پتے" کو کھانے کے لیے بھی بڑے کلے ٹھلے کے آدمی کی ضرورت ہے۔ گلوری اس کی بن ہی نہیں سکتی۔ چھپر کا چھپر منہ پھاڑ کر کھانا پڑتا ہے اور کھانے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ منہ نہیں ہے بلکہ مال گودام ہے اور تو اور یہاں پان مانگنے والوں سے تنبولی یہ سوال کرتے ہیں کہ "میٹھا یا الائچی سپاری کا" ؟ اب بتائیے کوئی خوش مذاق انسان کیا جواب دے اور جواب نہ دے تو کھانا پڑے وہ پان جس میں سونف بھی ہوتی ہے اور گھٹی کا سفوف بھی، معلوم ہوتا ہے کہ پورا زچہ خانہ اٹھا کر کھا گئے۔

آپ تو خیر تمباکو کے پان میں الائچی کے شرک کے بھی قائل نہیں ہیں مگر میں اس باب میں مشرک واقع ہوا ہوں، تمباکو بھی کھاتا ہوں اور الائچی بھی یعنی گڑ بھی کھاتا ہوں اور گلگلوں سے بھی پرہیز نہیں کرتا میں پان کے معاملہ میں آپ کی رندی کا قائل ہوں کہ تمباکو بھی خوشبودار پسند نہیں کرتے۔ آپ کے مراد آبادی تمباکو کے خلوص سے انکار نہیں مگر مشکی دانہ دار تمباکو کا تعطر اور قوام یا قوام کی گولیوں کی روح افزا خوشبو جو گل کھلاتی ہے اس کا بھی دیوانہ ہوں خالص تمباکو خالص شکر کی ضامن ہے مگر غالب عرقِ گلاب میں شراب یا شراب میں گلاب ملا کر پیتے تھے۔ آپ زیادہ سے زیادہ پان کے معاملہ میں اپنے کو سادہ اور مجھ کو

پُرکار تو کہہ سکتے ہیں مگر اپنے کو بے گناہ اور مجھ کو بدکار نہیں کہہ سکتے۔ آپ کا مراد آبادی تمباکو سب کچھ کر سکتا ہے مگر وہ لعاب کیسے تیار کرے گا جو قوام تیار کرتا ہے کہ وہ لعاب منہ میں لیے بیٹھے ہیں اور "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کی" تفسیر نظر آ رہے ہیں۔ دیکھئے تاج صاحب یہاں پان کی تائید میں ایک نکتہ اور سوجھ گیا کہ پان انسان کو نہایت کم سخن بھی بنا دیتا ہے یعنی انسان ایک ایک بات کو پہلے سو سو مرتبہ منہ میں تولتا ہے پھر اُگالدان سے مشورہ کرتا ہے اس کے بعد کہیں بات کرتا ہے یہ نہیں کہ زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے اور یاوہ گوئی کے گُل کتر رہی ہے۔

پان کے سلسلہ میں آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ چھوٹا کھایا جائے اور کثرت سے کھایا جائے، مگر اس عقیدے کے پس منظر میں غالباً وہی پان ہے جس کو میں چھپّر کہتا ہوں اور جس کے آٹھ آٹھ اور دس دس ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ مگر اس وقت میرے سامنے وہ بمبئی پان ہیں جن سے غالباً "دھان پان" کا محاورہ نکلا ہے۔ نازک نازک۔ چھوٹے چھوٹے پتے۔ گلوری بنا کر منہ میں رکھیئے تو گھل جائیں۔ ان چھوٹے چھوٹے پانوں کی خوب صورت گلوریاں جھومر میں پرو کر خاصدان میں اگر آپ کے سامنے آجائیں تو کثرت سے کھانے کے بھی آپ اس خوف سے قائل نہیں رہ سکتے کہ یہ خاصدان ختم ہو جائے گا تو کیا ہوگا میرے پاس اس وقت بمبئی پانوں کی دو ڈھولیاں ہیں یعنی ایک دو نہیں بلکہ پورے چار سو پان مگر دل دھڑک رہا ہے اُس وقت کے خیال سے جب یہ نہ ہوں گے اور میں پھر اپنے بیڑے پر قناعت کروں گا۔

میں یا تو یہ پان کھا سکتا ہوں ورنہ اپنے کو لنڈورا ہی بھلا سمجھتا ہوں کہ چھالیہ، خشک کتھا۔ الائچی۔ لونگ۔ تمباکو اور قوام کھا کر چونا چاٹ لوں مگر مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ جوٹ اور پٹ سن کی برادری کے پان کھاؤں جو منہ سے رسیاں بٹواتے ہیں اور جن میں لوگ مسلّم الائچی ڈلوا کر جبڑوں کی ورزش کرتے ہیں۔

تقسیم ملک سے پہلے بمبئی نہ سہی مگر بنارس کے سفید پان لاہور میں مل جاتے تھے۔ وہ ذرا تیز ضرور ہوتے تھے مگر یہ تیزی چنداں ناگوار نہ ہوتی تھی اور چونے کی تیزی ان کی تیزی کو رام کر لیتی تھی۔ تاج صاحب ملاحظہ فرمایا آپ نے بنارس کا ذکر تھا تو بے ساختہ رام کرنے کا محاورہ قلم سے نکل گیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ شعر بھی یاد آ گیا کہ ؎

از بنارس نہ روم معبد عام است اینجا
ہر برہمن بچہ لچھمن و رام است اینجا

معاف کیجیے گا اس شعر کا یہاں کوئی محل تو نہ تھا مگر اچھا شعر اگر بے محل بھی ہو تو رنگ دے جاتا ہے۔ ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ تقسیم ملک کے بعد وہ بنارسی سفید پان بھی سفید فام قوم کی طرح عنقا ہو گئے اور رہ گئے یہ پان جن کو پان کی حیثیت سے کھانا تو سمجھ میں آتا نہیں البتہ روٹی کی صورت سے کھایا جائے تو دوسری بات ہے۔

کس طرح میں آپ کو یہ بمبئی پان کھلاؤں۔ گڑھی شاہو سے ایبٹ روڈ زیادہ دور نہیں مگر یہ نازک گلوریاں وہاں پہنچتے پہنچتے مرجھا جائیں گی کملا جائیں گی اور پان کا خون ہو جائے گا جس کو شاید آپ بھی گوارا نہ کر سکیں گے۔ لہٰذا آپ کے حصے کے پان بھی میں خود ہی کھا رہا ہوں اور کھا کھا کر آپ کو یاد کر رہا ہوں معطر، لطیف اور خنک گلوریاں۔ محسوس ایسا ہوتا ہے گویا پان نہیں بلکہ پان کا تصور چبا رہا ہوں گلوری منہ میں جاتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ روح رہی

رُوح ہے مادّے کا پتہ نہیں۔ آپ پان کے پہنچے ہوئے عارف ہیں اور غالباً اس کے قائل ہوں گے کہ پان کے معاملہ میں روحانیت مقدم ہے مادّیت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

شوکت تھانوی

حضرت جگر مرادآبادی کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور
۱۵ر جون ۵۴ء

صدیق مکرم

ابھی مری میں آپ کے ساتھ دو بیدار راتیں اور ڈیڑھ خواب آلود دن گزار کر لاہور پہنچا ہوں مگر تشنگی باقی ہے اور پھر آپ ہی سے مخاطب ہوں۔ مری میں تو رمی کا شغل جاری رہا اور اس کثرت سے جاری رہا کہ رمی پر مری کا اور مری پر رمی کا گمان گذرتا ہے۔ اگر آپ باور کریں تو عرض کروں کہ واپسی میں مری کے فراز سے پنڈی کے نشیب تک ہر فرد پر تاش کے پتّوں کا شبہ ہوتا تھا۔ ہر عورت جو نظر سے گذری پھول کی بیگم یا اینٹ کی ملکہ نظر آئی۔ ہر مرد پہ پان کے غلام یا حکم کے بادشاہ کا گمان گذرا۔ غضب خدا کا دو مسلسل راتیں تاش کی گڈیاں پھینٹ پھینٹ کر بسر کر دیں۔ زندگی میں ایسی ایسی خدا جانے کتنی راتیں بسر کی ہیں اور ایک سے ایک کھلاڑی سے واسطہ پڑا ہے مگر آپ کے انہماک کا جواب نہیں۔ اس موقع پہ آپ ہی کا ایک شعر آپ کو سُناتا ہوں جو آپ کے لیے آپ کی ایک مقبول دُعا کی حیثیت رکھتا ہے ؎

عشق ہے قیدِ تصور شوق بے قیدِ نظر
مجھ کو جو کچھ چاہیے بے حد و پایاں چاہیے

بے شک جو شغل بھی اختیار کیا انتہا پر پہنچ کر اور انتہا تک پہنچا کر اختیار کیا۔ رندی اور سرمستی کا وہ زمانہ جب ہر نظر جام و سبو اور ہر نفس میخانہ تھا ابھی کل کی بات ہے۔ رندِ بلانوش پڑھا ضرور تھا مگر ۱۹۲۶ء کی ایک رات مین پوری کے ایک مشاعرے میں دیکھ بھی لیا جب ایک اُجاڑ سی صورت کا شاعر جیسے لیبل پر چھپی ہوئی خیام کی تصویر مشاعرے کے ایک گوشے سے اُٹھا اور اس نے مقطع نما مطلع جھوم کر پڑھا ؎

نظر کو مستِ مئے حسن کر حجاب اُٹھا
جگر شراب نہ پی تہمتِ شراب اُٹھا

اور میں چونک پڑا کہ کیا یہی ہیں جگر اور فوراً ہی جگر نے یہ شعر پڑھ کر تصدیق کر دی ؎

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ
میں اپنا جام اُٹھاتا ہوں تو کتاب اُٹھا

۱۹۲۶ء کی وہ رات اور آج کا دن۔ تعلقات کے اٹھائیس سال۔ اور ہم دونوں ایسے سخت جان کہ دونوں کو تعلقات کی

یہ مدّت نہ مار سکی۔ اس عمر کے نہ دوست ملتے ہیں نہ دشمن۔ اس مدّت میں دوستیاں دشمنی بن جاتی ہیں اور اتنی طویل دشمنی بھی وفا نہیں کرتی۔ آنے کو تو بہت سے انقلاب آئے۔ ایک رند نے توبہ کی۔ ایک خانہ بدوش صاحبِ خانہ بنا۔ جس کا کوئی نہ تھا وہ کسی کا ہو گیا اس کے علاوہ اور بھی بہت سی گتھیاں سُلجھیں۔ بڑے بڑے سلجھاؤ اُلجھے۔ ملکوں کی تقسیم ہوئی نئے نئے ممالک کرۂ ارض پر اُبھرے اور بٹوارے ایسے ایسے ہوئے کہ آخر ہم بھی بٹ گئے آپ اُدھر، میں اِدھر اور بیچ میں آگ اور خون کے موّاج سمندر۔ مگر یہ تعلقات قائم رہے۔ رند کی توبہ ان کو ختم نہ کر سکی۔ خانہ بدوش کی خانہ آبادی ان پر اثر انداز نہ ہوئی نہ کسی اُلجھن نے ان کو سلجھایا نہ کسی سلجھاؤ نے ان کو اُلجھایا۔ درمیانی آگ اور خون کے سمندر دیکھ دیکھ کر بھی یہ تعلقات یہی کہتے رہے کہ ؎

اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

اور یہ تعلقات صرف مجھ ہی سے نہیں ہیں۔ آپ کہتے ضرور ہیں کہ آپ کو مجھ سے ایک خصوصیت ہے مگر آپ کی یہ خصوصیت اتنی عام ہے کہ ؎

اللہ ری چشمِ یار کی معجز بیانیاں
ہر اک کو ہے گماں کہ مخاطب ہمیں رہے

میں نے تو آپ کی اس خصوصیت کا مرکز ان کو بھی دیکھا ہے۔ جن سے گلے ملنے کے بعد جن کو نہایت خلوص سے پہلو میں جگہ دینے کے بعد آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ:۔

”آپ مجھ سے یہ تقاضا نہ کیجئے گا کہ میں آپ کو آپ کا نام بھی بتاؤں نام اصل چیز نہیں ہے شخصیت اصل شے ہے۔ دماغ میں نام محفوظ نہیں تو نہ ہو مگر وہ جو ایک تعلق ہوتا ہے روح کا روح سے۔ جی ہاں۔ وہ بہر حال موجود ہے۔ فاصلہ اور وقت نام دماغ کو محو کر سکتا ہے مگر اس تعلق کو ختم نہیں کر سکتا۔“

بلکہ میں نے آپ کی اس خصوصیت کا مرکز اُن ناجنسوں کو بھی دیکھا ہے جو محض ایک جذبۂ پرستاری لے کر اُس وقت آ جاتے ہیں جب آپ تاش کھیل رہے ہوں مارے اخلاق کے آپ تمام حرف و حکایت اور تمام دیدہ و دل بن جانا چاہتے ہیں مگر اس اہتمام کے باوجود شرحِ عاشقی اس لیے نہیں ہو سکتی کہ توجّہ ہوتی ہے آپ کی تاش کے پتوں کی طرف اور دلدہی کرنا چاہتے ہیں آپ مہمان کی بھی آپ کی وہ کیفیت بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے کہ ہاتھ میں رمی کے بارہ پتے ہیں جن کو آپ گھبرا گھبرا کر مرتب کر رہے ہیں اور باتیں اُن حضرت سے بھی کرتے جاتے ہیں۔

”خلوص کا سوائے خلوص کے کوئی نام نہیں ہوتا اہلِ خلوص کا تعارف ایک مخلص دل خود ہی کرا دیتا ہے“ اور وہ حضرت اپنی ہانک رہے ہیں ”صاحب میں تو اُدھر آ کر مسلسل پریشانیوں میں مبتلا ہوں“

”آپ اپنے تیرہ پتوں میں گم اُن کی بات کا جواب بھی دیتے جاتے ہیں اور اپنے کھیل کے ساتھیوں سے بھی مخاطب رہتے ہیں نتیجہ یہ کہ مکالمہ کچھ اس طرح کا بن جاتا ہے۔

”جی ہاں وہ پریشانیاں تو ہوتی ہی ہیں۔ صاحب رگن بیچئے تیر دیتے ہیں نا“

"کوئی مکان الاٹ نہیں ہوا ملازمت بھی اب تک نہیں مل سکی۔"

"جی ہاں - یہ امتحانی دَور تو گذرتے ہی ہیں۔ آپ کی چال ہے صاحب۔"

"بچوں کی تعلیم کا بھی کوئی بندوبست نہیں۔"

"جی ہاں۔ آپ اُدھر کھسک کر بیٹھیے پتّے دکھائی دیتے ہیں۔"

"پچھلے مہینے والد صاحب کا بھی انتقال ہو گیا۔"

"جی ہاں وہ تو ہو ہی جاتا ہے۔"

اور پھر ایک دم چونک کر: "جی کیا فرمایا۔ والد صاحب کا انتقال۔"

اس کے بعد آپ تاش کے پتّے رکھ کر واقعی تعزیت کرنا چاہتے ہیں بلکہ ایک آدھ تعزیتی جملہ بھی کہتے ہیں جس سے اُس آدمی کو اپنے باپ کے مرنے پر شرمندہ ہو جانا چاہیئے۔ مگر چونکہ وہ صرف یتیم نہیں بلکہ یتیم العقل بھی ہوتا ہے لہذا آپ فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں اور چونکہ ہاتھ میں تاش بھی ہوتے ہیں لہذا آپ گڈی سے پتا گھسیٹتے ہوئے کہتے ہیں۔

"آپ کے والد مرحوم ——— جوکر۔"

اور آپ کو جوکر مل جانے پر بجائے اُن حضرت کے آپ کے کھیل کے ساتھی یتیم بن کر رہ جاتے ہیں اور آپ "شو" کر کے بازی جیت لیتے ہیں۔

خیر یہ تو ایک تمثیلی منظر خواہ مخواہ بیچ میں آگیا ورنہ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ آپ کی اس خصوصیت کی یہ عمومیت مجھ کو اس لیے ناگوار نہیں ہے کہ مجھے آپ سے نہیں خود اپنے سے غرض ہے اور مجھے جو خصوصیت ہے وہ خصوصیت کے جواب میں خصوصیت بھی نہیں چاہتی اس لیے کہ خصوصیت نہ کوئی تجارتی لین دین ہے نہ جوابی پوسٹ کارڈ۔ آپ کے پاس بیٹھ کر ہی صرف اس شعر کی تفسیر بن جاتا ہوں ؎

تیری محفل میں ہے اک ننگِ محبت بھی ترا
دیکھنا ہو کے پشیمان نہ جانے پائے

اور یہی غنیمت ہے کہ میں اس محفل سے کبھی پشیماں ہو کے نہیں اٹھتا۔ ممکن ہے آپ کو اپنی اداؤں کا اندازہ نہ ہو اور اندازہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ نہ تو ان میں منافقت ہے نہ سیاست نہ مصلحت بلکہ یہ ادائیں آپ کی بے ساختگی بن چکی ہیں۔ میں نے یہ مناظر دانستہ اس لیے پیش کر دیئے ہیں کہ ؎

وہ کیا دیکھ سکتے ہیں اپنی ادائیں
ہمیں دیکھتے ہیں جو ہم دیکھتے ہیں

آپ کے پاندان کی یاد میں ایک تازہ پان اپنے خاصدان سے نکال کر کھا رہا ہوں اور اس وقت آپ کا وہ تصور نگاہوں کے سامنے ہے جب آپ بہت ہی خلوص کے ساتھ میرے لیے پان بنا کر اس میں اپنا نہایت نفیس دانہ دار تمباکو ڈال کر اور گلوری بنانے کی کوشش میں سنبوسہ بنا کر بجائے مجھ کو دینے کے خود کھا جاتے ہیں اور پھر چونک کر لاحول پڑھتے ہوئے دوسرا پان بنا کر

مجھ کو دیتے ہیں۔ پان سے آپ کو وہی شوق ہے جو ہر شریف آدمی کو ہونا چاہیئے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لائے ہیں اگر شعلۂ طور کا ایک ہاتھ ہے تو دوسرا ہاتھ آپ کے پاندان کا بھی ہے۔ اگر آپ اس اہتمام سے پان نہ کھلاتے ہوتے تو معلوم نہیں آپ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرنے کے لیے مجھ کو کتنے دن لگ جاتے، میں نے آپ کی سرمستی کے زمانے میں بھی آپ کی خود فراموشی دیکھی ہے اور موجودہ عالمِ ہوش کی بیہوشیاں بھی نظر کے سامنے ہیں مگر ان دونوں حالتوں میں اپنے پاندان سے آپ کبھی غافل نہ رہے۔ ؎

پاؤں اٹھ سکتے نہیں منزلِ جاناں کے خلاف
اور اگر ہوش کی پوچھو تو مجھے ہوش نہیں

جس وقت آپ کے سامنے پاندان کھل جاتا ہے اس وقت میری طرح آپ کا بھی یہی عالم ہوتا ہے کہ ؎

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے میخانے میں
خلد شیشے میں ہے فردوس ہے پیمانے میں

جگر صاحب۔ سچ تو یہ ہے کہ جو پان آپ ادھر آ کر کھاتے ہیں یا جس پان کو ہم پان سمجھ بیٹھے ہیں اس کا بھلا پان سے کیا تعلق۔ پان تو نہیں پان کا دھوکہ کھا رہے ہیں۔ کھاتے ہیں یہ پان اور تصور کرتے ہیں اس پان کا جو میسر نہیں ؎

اس پردۂ رنگین پہ نظر آتا ہے جو کچھ
جیسے کہ یہ اک خواب ہے معلوم نہیں کیوں

شکر ہے کہ پان کی ایک "غنیمت" قسم لاہور میں ملنے لگی ہے جس کو بیچنے والے میٹھا پان کہہ کر بیچتے ہیں اور ہم اس کو صبر کے پھل والے درخت کا پتا سمجھ کر کھا لیتے ہیں۔ اس پان کو طبیعت نے گوارا کر لیا ہے مجبوری کا صبر ہے اور صبر نے عادت کی صورت اختیار کر لی ہے لہٰذا اسی پان کی ایک گلوری کے لیے پھر ہاتھ بڑھاتا ہوں اور یہ خط ختم کرتا ہوں۔

شوکت

مولانا عبد المجید سالک کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

آقائی و مولائی

اگر "للّٰہی بغض" کوئی چیز ہے تو "للّٰہی حب" کے وجود سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ ہم کو بعض افراد سے خواہ مخواہ کا تنفر سا ہوتا ہے خواہ اس نفرت کی کوئی وجہ ہو یا نہ ہو۔ بس ان کی صورت دیکھی اور طبیعت میں اشتعال پیدا ہوا۔ اسی طرح بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی طرف خواہ مخواہ دل کھنچتا ہے۔ میرے لیے آپ کی شخصیت کچھ اسی قسم کی ہے۔ اب سے چھبیس۔ ستائیس برس پہلے جب میں لکھنؤ کے روزنامہ ہمدم کا مدیر معاون اور پھر مدیر تھا ہمدم کے معاصرین میں سے صرف انقلاب ہی ایک ایسا روزنامہ تھا جس کو میں نے اپنے لیے مشعلِ راہ سمجھا اور اگر سچ پوچھئے تو اس کا بھرم "حوادث و افکار" ہی تھا جس نے

مجھ سے مزاح لکھوایا۔ ہمدم کا مزاحیہ کالم "وہ وہ باتیں" میری مزاح نگاری کا گھٹنیوں چلنے والا بچپن تھا۔ اُسی زمانے میں مجھ کو لاہور آنے کی تمنا صرف اس لیے بھی تھی کہ میں آپ سے ملوں چنانچہ لاہور پہنچتے ہی آپ سے ملا اور غائبانہ عقیدت نے گرویدگی کی صورت اختیار کر لی۔ یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب لاہور میں پان کھانے کو خالص "یوپیاپن" سمجھا جاتا تھا مگر اس زمانے میں بھی آپ کی شیروانی کی جیب سے پانوں کی ڈبیا طلوع ہوئی ؎

شفق نے پھول بکھیرے خزاں کی وادی میں
سحر نے دامنِ مشرق کو لالہ زار کیا

ایک چھوٹی سی چاندی کی ڈبیا میں دانہ دار تمباکو دیکھ کر میں تو حیران رہ گیا کہ یہاں بھی اس سلیقہ اور اس نفاست کے ساتھ پان کھانے والے موجود ہیں اور پھر مجھ کو یہ مسرت ہوئی کہ کھیلا تو تھا اندھا جوا مگر جیت اپنی ہی رہی، فرض کر لیجئے پان کے معاملے میں سالک صاحب بھی "یوپین" نہیں بلکہ "یوروپین" نکلتے تو میں کیا کر لیتا۔ مگر اس معاملہ میں بھی آپ کو اپنا ہم مشرب پا کر معلوم ہوا کہ منہ مانگی مراد مل گئی۔

مولانا آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ پان کے لیے منہ مانگی مراد کس قدر برجستہ آیا ہے۔ خیر یہ تو بہت پرانا قصہ میں چھیڑ بیٹھا اب وہ دن کہاں۔ وہ دَور کہاں وہ زمانہ کہاں۔ ماضی کی یہ یاد کب تک ؎

گزر رہا ہے جو اُس کارواں کی بات کرو

آخر کار تقسیمِ ملک نے اُسی لاہور کو وطن بنا دیا جہاں ۱۹۲۸ء میں صرف ایک مرتبہ آنے کی تمنا تھی اور یہ بھی عجیب اتفاق کہ لاہور آ کر مکان بھی آپ ہی کے محلّے میں ملا۔ اللہ جانے یہ آپ کی کشش تھی یا میری طلب کا خلوص۔ غالباً دونوں ہی کا اس میں ہاتھ تھا۔ بہر حال یہ قرب اور یہ اتصال عارضی اور وقتی سہی مگر تھا بہت غنیمت۔ پھر تو پاکستان بن جانے کے بعد محکمۂ بحالیات کے انتظامات نے یہ صورتِ حال پیدا کر دی کہ ؎

دشتِ جنوں میں ہو گئی منزلِ یار بے سراغ
قافلہ کس طرف گیا بانگِ درا کو کیا ہوا

مگر شکر ہے کہ صرف محلّہ ہی بدلا شہر نہیں بدلا اور تقویت کے لیے یہی غنیمت نظر آنے لگا کہ بہر حال آپ اسی شہر لاہور میں ہیں حالانکہ فاصلے نے صورت یہ پیدا کر دی کہ ؎

میسّر جس سے آ جاتی تھی ساقی کی قدم بوسی
مقدّر میں نہیں وہ لغزشِ مستانہ برسوں سے

یہ لغزشِ مستانہ ہی تو تھی کہ پنچولی اسٹوڈیو سے گھر چلے ہیں کہ آپ کی کوٹھی کے سامنے پہنچ کر قدم ڈگمگا گئے۔ سمت بدلی اور پہنچ گئے آپ کے پاس۔ گھر سے اسٹوڈیو جاتے ہوئے آپ نظر آ گئے اور اسٹوڈیو پہنچنا کچھ غیر ضروری سا نظر آنے لگا۔ اب تو گڑھی شاہو سے مسلم ٹاؤن جانا ایک ایسا سفر معلوم ہوتا ہے جسے انگریزی کا SUFFER کہنا چاہیے۔ حالانکہ اب بھی کبھی کبھی بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ آپ کی خدمت میں حاضری دی جائے اور آپ سے پوچھا جائے کہ جس ناز و نعم سے آپ نے

اپنے پان کھانے کے ذوق کو پروان چڑھایا تھا وہ ذوق آجکل کس عالم میں ہے، یہ "پٹ سن نژاد" پان آپ سے کیسے کھائے جاتے ہوں گے اور انھیں کھاکر منہ میں رسیاں بٹنے کا کارخانہ آپ سے کیسے کھولا جاتا ہوگا۔ میں نے تو خیر پان ہی ترک کر دیا ہے گنگلے پر گذر اوقات ہو رہی ہے۔ اگر کبھی دیسی پان مل جاتا ہے تو اُسے چومتا ہوں۔ آنکھوں سے لگاتا ہوں اور اس کی گلوری کھاکر اس طرح خوش ہوتا ہوں جس طرح عید بقر عید کو پان کھاکر خوش ہوا کرتے تھے۔ مگر جب یہ پان میسّر نہیں آتا تو بجائے اُس نام نہاد پان کے جو ملتا ہے میں "تیمّم" کا قائل ہو جاتا ہوں اور اب اس گنگلے کی عادت سی پڑ گئی ہے ؎

عادت سی ہے نشہ ہے نہ اب کیف
پانی نہ پیا شراب پی لی

تو کیا آپ اب تک پان کھا رہے ہیں۔ یعنی یہ کثیف پان؟ کاش آجکل آپ حوادث و افکار لکھ رہے ہوتے اور اس نام نہاد پان کو اپنا موضوع بنا کر اس کی قلعی کھولتے۔ حوادث و افکار پر یاد آیا کہ خدا کرے حوادث و افکار کو ایک مجموعہ کی صورت میں پیش کرنے کی ضرورت کا آپ کو بھی احساس پیدا ہو چکا ہو۔ کام آسان نہیں ہے ایک انبار ہوگا جس میں سے انتخاب کرنا پڑے گا مگر یہ کام ہو جانا چاہیے یہ ایک بڑا قیمتی ادبی سرمایہ ہے جسے بہر حال محفوظ کر لینا چاہیے۔ آپ کے حوادث و افکار کی یاد میں گنگلے کی ایک تازہ خوراک بنا کر کھاتا ہوں۔ آپ بھی پان کے بجائے جو دھوکہ آجکل کھا رہے ہیں کھا لیجیے۔

شوکت تھانوی

لتا منگیشکر کے نام

گڑھی شاہو - لاہور

عالمہ محترمہ،

آپ کے نام یہ خط اس ذیل میں ہرگز نہیں آتا کہ ع

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

اس لیے کہ جس حد تک ملاقات ضروری ہے وہ ہوتی ہی رہتی ہے ؎

تو نہیں تو کیا ہوا کونسی کمی رہی
ہم ترے بغیر بھی تجھ سے ہم کلام ہیں

آپ کی نواؤں سے جو دنیا آج گونجی ہوئی ہے اُسی دنیا کے بسنے والوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ آپ کی یہ دنیا صرف بھارت یا پاکستان تک محدود نہیں بلکہ آپ کے نغموں کی گونج میں تو افغانستان۔ سیلون۔ ایران۔ برما۔ انڈونیشیا بھی بستے ہیں انگلستان اور امریکہ کی نشرگاہیں بھی آپ کی آواز فضا میں منتشر کرتی ہیں اور یہ آفت ہوش و ایمان آواز تو در در اور گھر گھر پہنچی ہوئی ہے۔ کون سا خطہ ہے جہاں یہ شراب نہ برستی ہو۔ ان نغموں کی زبان کوئی سمجھے یا نہ سمجھے مگر یہ گیت گنگنانے والے وہاں بھی مل جاتے ہیں جہاں اُردو ابھی تک نہیں پہنچی ہے۔ میں نے اُردو کے سب سے بڑے مبلّغ مولانا عبدالحق کے نام جو خط لکھا ہے

اُس میں نہایت سنجیدگی کے ساتھ عرض کیا ہے کہ بھارت کی سب سے بڑی مولانا عبدالحق لتا منگیشکر ہے جس کے گانے اُس ہندوستان کے گوشے گوشے میں بسے ہوئے ہیں جو اُردو سے اپنا دامن بچانے کا دعوے دار ہے مگر اُردو ہے کہ لتا کے گانوں کی شکل میں اپنے گُن گوا رہی ہے اور خدا جانے ان گانوں کے جلو میں کن کن ممالک میں پہنچ چکی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اُردو کی جتنی تبلیغ غیر ارادی طور پر آپ نے کی ہے اُردو کے کسی مبلغ یا اُردو کے کسی تبلیغی ادارے سے ممکن نہ ہو سکی ہندوستان میں تو خیر گلگلوں سے پرہیز کرنے والے بھی یہ گُڑ کھاتے ہی رہتے ہیں مگر ہندوستان اور پاکستان سے باہر بھی اُردو نہ سمجھنے والے بھی یہ گنگناتے ہوئے پائے گئے ہیں کہ

شمع پہ آ کر گرتے ہیں کیوں جل جل کر پروانے
مر کر جینا جی کر مرنا پگلے تو کیا جانے

بلما جا جا جا

آپ کی آواز کی ایک ہی موج بڑے بڑے فرشتہ صورت بزرگوں کو کچے دھاگے میں باندھ کر ریڈیو سیٹ کے قریب لے آتی ہے خواہ وہ اپنے زہد و تقدس کے اعتبارات سے کتنے ہی دُور کیوں نہ ہو جائیں وہ کشاں کشاں آتے ہیں اور عمرِ رفتہ کو آواز دیتے ہوئے آتے ہیں ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

آواز کا یہ جادو اور موسیقی کا یہ تاثر ہی تو ہے کہ ہندوستان سے اُردو کو فنا کیا جا رہا ہے مگر لتا کے گانوں میں جو اُردو سمائی ہوئی ہے وہ سر آنکھوں پر قبول ہے۔ اُردو کے لیے بھارت کے دل کو جتنا تنگ کیا جا رہا ہے آپ کی آواز اتنا ہی کشود پیدا کرتی جاتی ہے حالانکہ یہ بھی درست ہے کہ ؎

کھُل تو جاتا ہے مغنّی کے بم و زیر سے دل
نہ رہا زندہ و پایندہ تو کیا دل کی کشود

مگر جب تک آپ کے نغموں کی گونج باقی ہے کم سے کم اُس وقت تک اُردو آپ کے مُلک میں زندہ رہے گی۔ یوں تو آپ کے پردھان منتری بھی اُردو کا دم بھرتے رہتے ہیں اور ان کے مُلک میں اُردو کا جو خونِ ناحق ہو رہا ہے اُس سے اپنا دامن بچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں مگر یہ خون ان کے دامن پر نہ سہی ان کی حکومت کے دامن پر بہرحال نظر آ رہا ہے ؎

لہو بسمل کا مقتل کی زمیں پر
نہ دامن پر نہ اُس کی آستیں پر

بات دراصل یہ ہے کہ آپ کے گیتوں کی شکل میں جو اُردو ہندوستان میں اب تک قابلِ قبول بنی ہوئی ہے اُس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دُنیا کی تمام قوموں کی قدیمی روایتوں سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ گانے سے جانور تک متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے پھر یہ تو اُردو کے لاکھ دشمن سہی مگر انسان تو ہیں ہی۔ کرشن جی کی بانسری کی لے پر اگر گئو ماتا چرنا چھوڑ دیتی تھیں تو لتا کے

گانوں کی دُھن میں اس امتیاز کا ہوش کس کو ہو سکتا ہے کہ اس آواز کے پردے میں اُردو ہے جو روح میں سمائی چلی جاتی ہے۔ اگر بھی ہوش آجائے تو وہ چیخ اُٹھیں کہ ؎

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

بہرصورت اُردو کی جو نشر و اشاعت آپ کی حسین آواز کے ساتھ ہوئی ہے اُس نے اُردو کو ہندوستان میں امر بنا دیا ہے کوشش کی گئی تھی اُردو کے باب میں ایک ہندوستان گیر سناٹا پیدا کرنے کی مگر آپ کے نغموں نے اُردو کی ایسی گونج پیدا کی ہے کہ اس نقار خانہ اُردو میں ہندی کے طوطی کی آواز مشکل سُنی جا سکتی ہے۔ مانگی جا رہی تھی اُردو کے لیے علاقائی حیثیت مگر آپ کے گانوں نے اس کو مُلک گیر حیثیت خود بخود دے دی۔

مکتوب یہیں تک پہنچا تھا کہ ریڈیو سے آپ کا نغمہ اُبھر کر فضا پر چھا گیا۔ لہٰذا اب میں بھی ایک تازہ پان کھا کر آپ سے باتیں کرنے کے بجائے آپ کی باتیں سُننا چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں آپ پان کھاتی ہیں یا نہیں مگر میں بغیر پان کھائے آپ کا گانا سُننا ایک قسم کی گستاخی سمجھتا ہوں ایک معطر گلوری مُنہ میں ہو اور کانوں میں آپ کی آواز کا رس اُنڈیل رہا ہو تو اس دو آتشہ کا کیف مجھ کو واقعی گُم کر دیتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ کوئی مجھ کو نہ ڈھونڈھے۔

شوکت تھانوی

قاضی جی

(دروازہ پر دستک)

اجمل: "جناب قاضی صاحب۔ قاضی جی تشریف رکھتے ہیں"

بیوی: "کون اجمل بھائی؟ میں آرہی ہوں دروازہ کھولنے"

اجمل: "(داخل ہوتے ہوئے) آداب عرض بھابی۔ کہیے کیسے یاد فرمایا تھا اور ہمارے قاضی جی کہاں تشریف لے گئے؟"

بیوی: "کیا بتاؤں میں اجمل بھائی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر میں ان کو سمجھاؤں کس طرح۔ اب یہ دُھن سوار ہے کہ کسی فلم کمپنی پر قبضہ مل جائے"

اجمل: "فلم کمپنی پر قبضہ؟ اُن کو کیا معلوم کہ فلم کا سر کدھر ہوتا ہے اور دُم کدھر"

بیوی: "یہی تو میں بھی کہتی ہوں کہ فلم کمپنی تو دوسری چیز ہے زندگی بھر میں مشکل سے دو تین تماشے دیکھے ہوں گے مگر دعوٰی یہ ہے کہ فلم کمپنی اگر مل گئی تو جیسے دُنیا ہی تو اُلٹ دیں گے"

اجمل: "مگر یہ فلم کمپنی کی سوجھی کیسے؟"

بیوی: "اللہ جانے فلم کمپنی نگوڑ ماری کا دورہ کیسے پڑ گیا ہے۔ دو دن سے نہ جانے کیا کیا خرافات لکھ رہے تھے۔ اب یہ رٹ ہے کہ فلم کمپنی لے کر چھوڑوں گا۔ خدا جانے کیا کیا خیالی پلاؤ پکایا کرتے ہیں"

اجمل: "اور تشریف کہاں لے گئے ہیں"

بیوی: "جانے کہاں اندر کمرے میں بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ آؤ تم ہی کچھ سمجھاؤ خدا کرے تمھاری ہی بات سمجھ میں آجائے"

(دونوں جاتے ہیں)

قاضی جی: "اخاہ۔ اجمل صاحب ہیں۔ بھئی خوب آئے۔ اِدھر آؤ میرے پاس بیٹھو نہایت ضروری مشورے کرنا ہیں۔ بلکہ اب یہ طے ہے کہ یا تو ہم دونوں بن گئے ورنہ جہاں ستیاناس وہاں ساڑھے ستیاناس سہی مگر دوست پھڑک اُٹھو گے وہ ترکیب تمھارے اس ہیچمدان کے ذہن میں آئی ہے۔ قسم خدا کی سونے کی کان سمجھو سونے کی کان"

اجمل: "اللہ مبارک کرے مگر کچھ معلوم تو ہو کہ واقعہ کیا ہے"

بیوی:- "فلم کمپنی کھل رہی ہے۔"

قاضی جی:- "کھل رہی ہے یا یہ سمجھو کہ بس کھل گئی۔ خدا جانتا ہے کہ اس سے زیادہ نفع کسی کاروبار میں نہیں ہے۔ مٹی سے سونا بنا لو۔ دیکھ لینا یہ دلدر ڈھل جائیں گے دن پلٹ جائیں گے۔ موٹریں اڑائے پھرو گے موٹریں۔ اماں میں تو یہ کہتا ہوں اجمل بھائی کہ زندگی گویا میں نے برباد کر دی اور یہ ترکیب اب ذہن میں آئی ہے جب قبر میں پیر لٹک چلے۔ مگر خیر دیر آید درست آید۔"

اجمل:- "یہ تو درست ہے مگر قبلہ آپ سے اور فلم کمپنی سے کیا تعلق۔ آپ کو اس کا کیا تجربہ ہے؟"

قاضی جی:- "بھئی پھر وہی بچوں کی سی بات کی تم نے۔ عزیزِ من بہت سی صلاحیتیں انسان میں ایسی ہوا کرتی ہیں جن کا اس کو علم ہی نہیں ہوتا۔ اگر مجھ کمبخت کو اپنی اس صلاحیت کا پہلے سے علم ہوتا تو آج بھلا میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا۔ مگر اس خیال کے ذہن میں آتے ہی میری تو جیسے آنکھیں کھل گئیں۔ اور اب مجھ کو معلوم ہوا کہ میں دراصل تھا ہی اس کام کے لیے آپ کو حیرت ہوگی کہ دو ہی دن میں کتنا بڑا کام میں نے کر لیا ہے۔ کہانی مکمل۔ گانے ختم۔"

اجمل:- "یعنی آپ نے لکھے ہیں گانے اور کہانی وغیرہ۔"

قاضی جی:- "میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ تم کو حیرت ہوگی۔ ارے صاحب مجھ کو خود یقین نہیں آتا کہ میں ایسا قابل ہو سکتا ہوں مگر یہ تو مجھ کو کچھ خدا کا فضل نظر آ رہا ہے۔ ہماری کمپنی کے پہلے فلم کا نام ہوگا۔ استغفر اللہ۔"

اجمل:- "استغفر اللہ؟"

قاضی جی:- "نہیں صاحب یہ تو میں بیگم صاحبہ کے رُخِ روشن کو دیکھ کر کہہ رہا ہوں کہ میں تو فلم کمپنی کی باتیں کر رہا ہوں اور وہ اس طرح منہ بنائے ہوئے ہیں گویا میں گھاس کھا گیا ہوں۔ میں چغد ہوں۔ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ ارے صاحب اب تک تو خیر میرے متعلق جو کچھ یہ کہتیں وہ ایک حد تک ٹھیک تھا مگر اب تو ان کو بجا فخر کرنا چاہیے کہ ایسی بے پناہ صلاحیتوں کا مالک گویا ان کا شوہر ہے۔"

بیوی:- "میں تو کہتی ہوں کہ خدا جانے میری قسمت میں لکھا کیا ہے۔ تم روز بروز بہکتے ہی جاتے ہو۔ بھلا بتاؤ یہ باتیں میرے ڈرنے کی ہیں یا نہیں کہ تم نے فلم کے لیے کہانی لکھ لی ہے تم نے گانے لکھ ڈالے ہیں۔ میں تو سچ مچ تمہاری طرف سے بے حد پریشان ہو گئی ہوں کہ خدا جانے میرے مقدر میں کیا لکھا ہے۔"

قاضی جی:- "ملاحظہ فرمایئے آپ کی حماقت؟ خیر تم مجھ کو پاگل ہی سمجھو مگر جس وقت لوگ تم کو میری بیوی سمجھ کر سر آنکھوں پر جگہ دیں گے اُس وقت تم کو اس پاگل اس خبطی اِس نامعقول شوہر کی قدر و منزلت کا پتہ چلے گا۔ تو خیر۔ ہاں تو اجمل بھائی ہماری فلم کمپنی کے پہلے فلم کا نام ہوگا اتفاق۔"

اجمل:- "اتفاق۔ اتفاق سے آپ کا مطلب اتحاد سے ہے۔"

قاضی جی:- "یہی تو خوبی ہے اس نام میں کہ یہ مطلب بھی ہے اور وہ مطلب بھی جو تم نہیں سمجھے۔ کہانی میں نے اس طرح شروع کی ہے کہ ایک ربڑ ٹائر تانگہ ہے جس پر پردہ بندھا ہوا ہے گویا اُس میں زنانی سواریاں ہیں اور وہ

تانگہ نہایت تیزی سے ایک سنسان سڑک سے گزر رہا ہے اور تانگے والا گاتا جا رہا ہے ؎

لمبی چوڑی سڑکوں پہ۔ ہاں پر۔ ہاں پہ۔ میرا تانگہ فرفر جائے
میرا تانگہ فرفر جائے   میرا گھوڑا ہنٹر کھائے
دم لہرائے   چال دکھائے
لمبی چوڑی سڑکوں پہ۔ ہاں پہ۔ ہاں پہ۔ میرا تانگہ فرفر جائے
پھول سی ہلکی ہلکی سواری   میں واری

بیوی:۔ "(ہنس کر) بھئی اللہ۔ بس خدا ہی تم پر رحم کرے۔"

قاضی جی:۔ "لاحول ولا قوۃ۔ اگر اس طرح سنو گی تو میں سنا چکا۔ سمجھنے کی تمیز ہے نہیں اور بھئی اللہ اور اوئی اللہ شروع کر دیا۔ تم کیا جانو کہ فلم کے گانے اسی طرح ہوتے ہیں۔ یہی گانا جب سازوں کے ساتھ چلتی ہوئی دھن کی شکل میں آئے گا تو دیکھئے گا کہ کیا قیامت ہوتا ہے۔"

اجمل۔ "بھابی ذرا سن لینے دیجئے مجھے تو بے حد لطف آ رہا ہے۔ قاضی جی کے یہ کمالات تو آج ہی مجھ پر روشن ہوئے ہیں۔"

قاضی جی:۔ "ارے صاحب ابھی آپ نے سنا ہی کیا ہے دم بخود رہ جاؤ گے آگے سن کر خیر گانوں کو جانے دو ان کا لطف تو سازوں ہی پر آئے گا۔ مگر کہانی سنو کہ کس قیامت کی ہے۔ تو صاحب وہ تانگے والا اسی طرح گاتا ہوا جا رہا ہے کہ ایک موڑ پر ایک موٹر سے ٹکر ہو جاتی ہے اور تانگے کی سواری نکل کر سڑک پر گر پڑتی ہے۔ قیامت کا حسن ہے۔ موٹر چلانے والا نوجوان اس کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ اور اس کو اسی بے ہوشی کی حالت میں موٹر پر ڈال کر چل دیتا ہے اور اپنی عالی شان کوٹھی میں لے آتا ہے اور تیمارداری کرتا ہے وہاں صاحب ایک واقعہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اس کو ہوش آجاتا ہے۔"

بیوی:۔ "(ہنس کر) لو اور سنو۔ یہ واقعہ ہوا ہے!"

قاضی جی:۔ "خیر۔ خیر۔ تم کو تو نکتہ چینی سے مطلب ہے۔ مگر خدا کے لیے کہانی کے لطف کو غارت نہ کرو یہ بڑا پر لطف موقع ہے تو جناب وہ ہوش میں آتے ہی کہتی ہے۔ میں کہاں۔ وہ جواب دیتا ہے۔ آپ یہاں۔ وہ کہتی ہے الٰہی یہ بیداری ہے یا خواب۔ وہ کہتا ہے۔ جو کچھ بھی سمجھیں جناب۔ وہ کہتی ہے۔ میں تانگے پر جا رہی تھی۔ وہ کہتا ہے۔ میں موٹر پر آ رہا تھا۔ وہ کہتی ہے۔ تانگے والا گا رہا تھا۔ وہ کہتا ہے۔ یہ بھی اتفاق کہ میں سیٹی بجا رہا تھا۔ وہ کہتی ہے۔ پھر تانگہ لڑا۔ وہ کہتا ہے آپ کو بالکل ٹھیک یاد پڑا۔"

بیوی:۔ "تو کیا پوری کہانی سناؤ گے اس وقت۔"

قاضی جی:۔ "لیجئے یہ ہوئی ہے قدر افزائی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اب تم پر میری قابلیت کا سکہ جمنا شروع ہو گیا ہو گا۔ مگر وہ مثل کہ بھینس کے آگے بین بجائی بھینس نے کہا یعنی بھینس بولی۔ گویا بھینس نے کوئی مہمل سا جواب دے دیا۔

خیر تم سے تو مجھ کو اسی قسم کی توقع تھی۔ مگر ان میاں اجمل سے پوچھو کہ ایمانداری کے ساتھ کہہ دیں کہ کس قیامت کی روانی ہے۔ اس قدر تالیاں بجیں گی اس مکالمہ پر کہ تم ہی صدقہ اتارو گی مجھ پر سے کہ خدا مجھ کو نظرِ بد سے بچائے رکھے۔"

اجمل:۔ "یہ تو ٹھیک ہے قاضی جی مجھ کو نہ تو اس کہانی پر کوئی اعتراض ہے نہ میں گانے کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں بلکہ فلم کمپنی ان ہی دو چیزوں پر تو ختم نہیں ہو جاتی۔ سوال پھر بھی پیدا ہوتا ہے کہ آپنے کبھی ایسا کام یا اس سے ملتا جلتا کوئی کام شروع سے کیا ہی نہیں ہے۔"

قاضی جی:۔ "نہ سہی۔ ارے بھئی نہیں کیا ہے تو نہ سہی۔ اب کریں گے۔ اور دیکھ لینا ایسا کریں گے اس کام کو کہ دنیا منہ دیکھ کر رہ جائیگی اور فرض کر لو کہ نصیبِ دشمناں شیطان کے کان بہرے۔ نہ چلی یہ کمپنی تو بھی اپنی گرہ سے کیا گیا۔"

بیوی:۔ "ہاں اور کیا تمہارے لیے تو ایک تماشہ ہو گیا اور جو لوگ اِس کام کو کر سکتے تھے۔ ایک تو ان کا حق مارا گیا دوسرے تمہارے اس شوق کے پیچھے اپنے پاکستان کی ایک صنعت یوں غارت ہوئی۔"

قاضی جی:۔ "یہ لیجیے لے آئیں وہ گھما پھرا کر اپنے پاکستان کو اِس ذکر میں بھی۔ کوئی پوچھے ان عقلمند سے کہ بھلا اس میں پاکستان کا کیا ذکر تھا۔ مگر معلوم نہیں یہ پاکستان ان کی زبان پر کیوں اس قدر رچ گیا ہے یہ بات پاکستان وہ بات پاکستان، پاکستان نہ ہوا جناب کا تکیہ کلام ہو گیا۔ اور اگر پاکستان کو آپ میرے لیے کوئی دھونس سمجھتی ہیں تو کان کھول کر سن لیجیے کہ میں بھی کوئی انگلستان کا رہنے والا نہیں ہوں۔ پاکستان اگر تمہارا ہے تو میرا بھی ہے۔"

اجمل:۔ "پاکستان زندہ باد۔ آج تو شکر ہے کہ پاکستان کو آپ نے بھی اپنا لیا۔ اچھا اب جان کی امان پاؤں تو ایک بات عرض کروں۔"

قاضی جی:۔ "فرمائیے۔ فرمائیے۔ آپکے لیے تو ضروری ہے۔ کہ اپنی بھاوج کی طرفداری کریں۔ اس فرض سے بھلا آپ غافل ہو سکتے ہیں۔ بہرحال آپ کو جو کچھ فرمانا ہے ارشاد فرمائیے ؎ میں سننے کے لیے پیدا ہوا ہوں — وہ۔ وہ۔ ہائے ہائے کتنا لاجواب شعر تھا اس وقت بالکل یاد نہیں آ رہا ہے۔"

اجمل:۔ "قاضی جی بھابی کا اور میرا مطلب یہ ہے کہ یہ فلم کمپنی آپکے بس کا روگ نہیں ہے آپ کو اگر کچھ کرنا ہی ہے۔ تو ایسا کام کیجیے جس کا آپ کو کچھ تجربہ ہو جس کی کامیابی کا آپ کو یقین ہو۔"

بیوی:۔ "اور کیا۔ کرنا ہی چاہیئے وہ کام جس سے خود اپنے کو بھی فائدہ پہنچے اور ملک اور قوم کو بھی فائدہ پہنچنے کی اُمید ہو۔"

قاضی جی:۔ "خدا کے لیے کبھی تو مجھ نامراد سے اس طرح باتیں کیا کرو جس سے مجھ کو یقین آ سکے کہ یہ میری بیوی گفتگو کر رہی ہے میں تو کانپ جاتا ہوں تمہاری زبان سے ملک اور قوم قسم کے الفاظ سن کر۔ ارے صاحب آپ میری اہلیہ ہیں میری رفیقۂ حیات ہیں۔ میری شریکِ غم ہیں مگر اس قسم کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا بیوی کے بجائے یا تو آپ اخبار بن گئی ہیں یا کوئی بہت بڑی لیڈر واقع ہوئی ہیں۔ اور پھر یہ کہ بات جو کرتی ہیں وہ نہایت مہمل۔ جس کام کا مجھ کو تجربہ ہے وہ کیا خاک کر سکتا ہوں۔ تھانیداری کی ہے زندگی بھر اب بتائیے میں تھانیداری کیسے

کر سکتا ہوں۔"

بیوی:۔ "اچھا تو سوال یہ ہے کہ تم ڈاکٹری کیوں نہیں کرتے۔"

قاضی جی:۔ "ڈاکٹری (قہقہہ لگا کر) بھئی کیا عقل کی پوٹ بیوی ملی ہے ہم کو بھی۔ یعنی میں ڈاکٹری بھلا کیسے کر سکتا ہوں جس کو یہ تمیز نہ ہو کہ نبض انسان کی گدی میں ہوتی ہے یا بغل میں اس کو جناب ڈاکٹری کا مشورہ دے رہی ہیں۔"

بیوی:۔ "بس ٹھیک ہے اسی طرح تم کو یہ بھی نہیں معلوم کہ فلم کس چڑیا کا نام ہے۔ پھر آخر فلم کمپنی کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔"

قاضی جی:۔ "یہ تو صاحب قائل کرنے کا نہایت ہی بیہودہ طریقہ ہے۔ کہ مثالیں دے کر قائل کیا جائے۔ بلکہ تم خود ہی دیکھ لو کہ آخر میں نے کہانی لکھی ہے یا نہیں۔ گانے تیار کئے ہیں یا نہیں۔"

بیوی:۔ "خدا کے لیے یہ کہانی یا یہ گانے کسی کو سنانا بھی نہیں لوگ مذاق اڑائیں گے۔"

قاضی جی:۔ "کیا مطلب یعنی اس قدر لغو ہیں اس قدر مہمل ہیں۔ جب تم اپنی حقیقی۔ یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ خاص اپنی بیوی ہو کر ایسی باتیں کہہ رہی ہو تو مجھ کو کسی اور سے کیا شکایت ہو سکتی ہے۔ وہی سعدی والی بات ہوئی کہ سعدی اپنے ہاتھ ——— نہ ——— نہ ——— وہ تو فارسی میں ہے کہ سعدی از دست خویشتن فریاد۔ خدا نہ کرے کہ کوئی شخص اپنے گھر ہی میں ذلیل سمجھ لیا جائے۔ میرا کیا ہے لعنت بھیجو فلم کمپنی پر۔ آج سے اگر کسی فائدے کی بات کا ذکر بھی کروں تو تھو ہے میری اوقات پر۔"

(غصہ میں چلے جاتے ہیں)

منشی جی

(منشی جی گھبرائے ہوئے گھر میں داخل ہوتے ہیں کچھ ہانپ
رہے ہیں گویا دوڑتے ہوئے آئے ہوں اور بیوی کو آواز
دیتے ہیں۔)

منشی جی: "میں نے کہا سنتی ہو اجی کہاں گئیں؟ لاحول ولا قوۃ ہمیشہ کام کے وقت ندارد۔"

بیوی: "آ تو رہی ہوں۔ تم تو گھبرا دیتے ہو ابھی گری ہوتی موئے دوپٹے میں اُلجھ کے۔"

منشی جی: "اجی میں نے کہا وہ آیا ہے تصویر والا۔ تصویر کھینچنے والا۔ اُس کے ڈبّہ پر لکھا ہوا ہے...... اُونہہ...... کچھ بھلی سی بات لکھی ہوئی ہے۔ لاحول ولا قوۃ کبھی جو یاد آجاتے۔"

بیوی: "تو مطلب کیا ہے تمھارا۔ کھنچوا لو نا تصویر۔ کیا اچھے معلوم ہوں گے بیچارے اس بڑھاپے میں تصویر کھنچواتے ہوئے۔"

منشی جی: "کیا مطلب اس کا یعنی بڑھاپے میں تصویر ہی نہیں کھنچوائی جاتی۔ تمھاری اسی بات کا کچھ جواب اسی تصویر کھینچنے کے ڈبّہ پر لکھا ہوا ہے۔ ذرا تم جھانک کے دیکھو تو باہر۔"

بیوی: "میں کیا کروں گی دیکھ کر تم کو تصویر کھنچوانا ہے تو کھنچوا لو نا میرا سر کیوں کھا رہے ہو۔"

منشی جی: "میرا مطلب یہ تھا کہ تم بھی کھنچوا لیتیں تصویر۔"

بیوی: "لو اور سنو میں تصویر کھنچواؤں گی؟"

منشی جی: "تم بیٹھنا کرسی پر اور میں پیچھے کھڑا ہو جاؤں گا معلوم ہو گا جیسے میاں بیوی ہیں ہم تم۔"

بیوی: "خیر آپ مجھے تو معاف رکھیے اپنی ہی تصویر کھنچوا لیجئے۔ خدا نہ کرے کہ میں اس بڑھاپے میں ایسی سٹھیا جاؤں کہ موئی تصویر کھنچواتی پھروں۔"

منشی جی: "میرا کیا ہے میں نے تمھاری ہی بھلائی کے لیے کہا تھا کہ تمھاری بھی یادگار رہ جاتی... ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے یہی لکھا ہے اس ڈبّہ پر کہ...... کہ...... لو پھر بھول گیا۔ تم تو آئے حواس کھو دیتی ہو اپنی کج بحثی میں......

ذرا پردہ سے جھانک کر دیکھ لو بہت موٹا موٹا لکھا ہوا ہے۔"

بیوی "توبہ ہے، سچ مچ ایک بات کے پیچھے پڑ جاتے ہو۔ چلو اب پردہ سے بھی جھانکوں گی۔ مگر پڑھنا تو پھر بھی تم ہی کو پڑے گا۔"

منشی جی "پڑھ تو خیر میں دونگا مگر یہ تو تم کو معلوم ہو جائے گا کچھ لکھا ہوا ہے (دونوں جاتے ہیں مگر باتیں کرتے جاتے ہیں) میں نے کہا تھا کہ تصویر ہی آج کھنچ جاتی۔ وہ دیکھو سفید سفید لکھا ہے نا۔"

بیوی "ہاں دیکھ لیا لکھا ہے کچھ۔"

منشی جی "لکھا ہے کہ "انسان کی...... اصلی یادگار...... کیا ہے؟..... تصویر۔ سمجھیں کچھ۔ میں تو بس یادگار کے لیے کھنچوانا چاہتا ہوں اپنی اور تمھاری تصویر۔"

بیوی "اپنی یادگار کے لیے کھنچواؤ مگر میری موئی یادگار کیا ہوگی؟"

منشی جی "یادگار کیا ہوگی؟ بھئی سخت جاہل ہو۔ خیر جاہل تک تو غنیمت تھا مگر بے وقوف بھی ہو، ارے صاحب یادگار کے معنی یہ ہیں کہ اگر والد صاحب کی تصویر میرے پاس نہ ہوتی تو بھلا میں ان کو یاد رکھ سکتا تھا؟ قیامت تک تو یاد نہ رکھتا۔ والدہ صاحبہ کی تصویر نہیں ہے تو یقین جانو کہ کس مردود کو یہ بھی یاد ہو کہ ان کی صورت کیسی تھی۔"

بیوی "اور صورت یاد ہی رہتی تو تم کیا کر لیتے؟"

منشی جی "کیا کر لیتے؟ یہ کیا بات ہوئی؟ ارے صاحب خوش ہوتے دیکھ دیکھ کر۔ اب والد صاحب کی تصویر دیکھ کر کم سے کم یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے والد صاحب بھی تھے۔"

بیوی "اے جب انسان ہی کو دنیا میں رہنا نہیں ہے تو تصویر موئی رہ کر کیا کرے گی؟"

منشی جی "لاحول ولا قوۃ۔ وہ تصویر والا باہر کھڑا ہوا سوکھ رہا ہے اور تم بحث کر رہی ہو مجھے عزیز من...... یعنی...... یعنی...... یعنی بیگم صاحب اگر انسان کو دنیا میں رہنا ہوتا تو تصویر کی کیا ضرورت تھی؟ مگر تصویر تو اسی لیے ضروری ہے کہ انسان کو رہنا نہیں ہے یہاں تمھاری قسم ایسی بات کہہ دی ہے یہ میں نے کہ اب تم کو چپ ہو جانا چاہیئے۔ ایں؟"

بیوی "تو میں کچھ کہہ بھی رہی ہوں تم کو کس نے روکا ہے البتہ میں نے کہہ دیا ہے کہ میں تصویر نہیں کھنچواؤں گی۔"

منشی جی "شبن جب میری عمر کو پہنچے گا تو میری تصویر دیکھ دیکھ کر کیسا خوش ہوگا کہ بھئی کیا والد تھے ہمارے بھی اور تم کو یاد بھی نہیں رکھے گا۔ میرا کیا ہے۔"

بیوی "اس موئی بڑھاپے کی جھرّیوں دار ڈراؤنی صورت کو یاد رکھنے سے نہ یاد رکھنا ہی اچھا ہے تم کو شوق چرّایا ہے، تم کھنچواؤ۔"

منشی جی "اچھا بھائی اب کون تم سے بحث کرے مگر میں تو کھنچواؤنگا۔ ذرا منہ ہاتھ دھونے کا پانی صابن، منجن، آئینہ، کنگھی

سرمہ وغیرہ تو رکھ دو۔"

بیوی:۔ شرم تو نہیں آتی گی بڑھاپے میں یہ سولہ سنگار کر کے تصویر کھنچواتے ہوئے جیسے بیچارے اپنے سسرال ہی تو بھیج رہے ہیں۔"

منشی جی:۔ خیر۔ خیر۔ یہ وقت مذاق کا نہیں ہے کہیں وہ انتظار کرتے کرتے باہر ہی سے چل نہ دے ذرا میں اس سے کہہ دوں۔ تم پانی وانی رکھ دو۔ پھر ذرا میرے کپڑے نکال دو۔ (جاتے ہوئے) وہ جامہ وار کی اچکن ہے نا۔ اور میرا نیا جوتا (دروازہ کھول کر) بھائی ذرا ٹھہر جانا میں بس تیار ہی ہو رہا ہوں۔"

تصویر والا:۔ (دور کی آواز) جلدی کیجیے صاحب دھوپ جا رہی ہے۔ پھر وقت نہیں رہے گا۔"

منشی جی:۔ (واپس آتے ہوئے) ابھی لو...... ابھی لو...... (بیوی کے پاس آکر) ایں! یعنی بیٹھی ہوئی ہو وہ کہہ رہا ہے کہ دھوپ جا رہی ہے۔ اور تم ہو کہ بیٹھی ہو؟"

بیوی:۔ تم جب تک منہ دھو لو اور وہ اچکن کونسی کہی تھی؟"

منشی جی:۔ تو یہ ہے ارے صاحب وہی شادی والی اچکن جامہ وار کی اور نیا جوتا۔ لاؤ یہ لوٹا ادھر کھسکاؤ۔ یہ رہا منجن اور وہ کدھر گیا...... وہی...... ارے صاحب۔ وہ وہ...... صابن دانی"

بیوی:۔ سامنے رکھا ہے اور دکھائی نہیں دیتا۔ اور کچھ چاہیے ہے کہ میں جاؤں بس کپڑے نکالنے"

منشی جی:۔ نہیں بس تم کپڑے لاؤ جلدی سے۔ شاباش"

(بیوی جاتی ہے۔ منشی جی منہ دھوتے ہیں منہ دھونے کی آواز کے ساتھ ہی منشی جی بڑی زور سے کہتے ہیں۔)

منشی جی:۔ لاحول ولاقوۃ۔ اَخ تھو...... تھو...... تھو...... لاحول ولاقوۃ"

(بیوی دوڑتی ہوئی آتی ہیں۔ منشی جی برابر تھوک رہے ہیں)

بیوی:۔ یہ کیا ہے آخر...... یہ کیا ہوا؟

منشی جی:۔ اَخ تھو...... ہوا کیا...... اَخ تھو...... جلدی کا کام شیطان کا، منجن کے بجائے صابن لگا لیا دانتوں پر...... تھو...... اَخ تھو"

بیوی:۔ (ہنسی سے دوہری ہو کر) منجن سے منہ دھو لو نا اب اور اسی طرح تصویر کھنچوا لو"

منشی جی:۔ اب مذاق ہی کرو گی یا آئینہ کنگھا بھی دو گی مجھے؟"

بیوی:۔ رکھا تو ہے آئینہ کنگھا دیکھا بھی تو کرو"

منشی جی:۔ ٹھیک ہے۔ اب ذرا ازار بند تو ڈال دو پاجامہ میں۔ بھئی خط بہت بڑھا ہوا ہے اب کیا ہو؟"

بیوی:۔ اب میں اس کا کیا جواب دوں میرے ہاتھ کا کام تو یہ ہے نہیں کہ میں خط بھی بنا دوں؟"

منشی جی:۔ خیر ہو گا بھی۔ ذرا سا گوند تو نہیں ہے گھر میں؟

بیوی :- "گوند؟ گوند کیا ہوگا آخر؟"

منشی جی :- "ارے صاحب ہو تو بتاؤ ورنہ تم تو جرح کرنے لگتی ہو بات بات پر۔ مطلب یہ کہ ذرا مونچھوں پر تاؤ دے دیتا تو تصویر رعب دار ہو جاتی۔"

بیوی :- "تو گوند سے موئی مونچھیں چپکائی جائیں گی؟ لائے دیتی ہوں میں گوند بھی۔"

(بیوی جاتی ہے)

منشی جی :- "دیکھا پاجامہ لائی ہیں یہ نکال کر پھٹا ہوا نیفے کے پاس سے ...... ارے صاحب اب آبھی چکو۔"

بیوی :- "آ تو رہی ہوں۔ ہاتھ پیر پھلائے دیتے ہو۔ خود ہی تو کہا تھا گوند لانے کو نگوڑا مارا۔"

منشی جی :- "یہ پاجامہ ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے یہ پھٹا ہوا چیتھڑا پہن کر کھنچے گی میری تصویر۔"

بیوی :- "اے ہے میں نے دیکھا بھی نہیں تو اس کا کیا ہے یہ تو کرتے اور اچکن کے نیچے رہے گا۔"

منشی جی :- "نیچے رہے گا؟ ارے صاحب نیفہ کے پاس سے پھٹا ہوا ہے نیفہ کے پاس سے۔"

بیوی :- "تو کیا نیفہ گھٹنوں پر رہتا ہے تمہارے یہاں؟"

منشی جی :- "(قائل ہونے کے انداز سے) ٹھیک ہے یہ تو اوپر ہی رہے گا۔ اچھا لاؤ دو گوند۔ ہاں یہ بس اب ٹھیک ہے۔ مطلب یہ کہ تصویر کھنچوائی جائے تو ذرا ڈھنگ کی تو ہو۔"

بیوی :- "اے ہے کیسی ڈراؤنی ہو گئیں موئی مونچھیں معلوم ہوتا ہے جیسے چوہا دم اٹھائے ہوئے منہ پر بیٹھا ہے۔"

منشی جی :- "ایں ...... ہاں واقعی ...... ذرا قینچی نکالنا اپنی بقچی سے۔"

بیوی :- "کیا اب کاٹی جائیں گی مونچھیں اس وقت۔"

منشی جی :- "یعنی دیکھ رہی ہو کہ ایک تو ہے بس نتھنوں تک اور دوسری تو دیکھو کہاں جا رہی ہے۔"

بیوی :- "تو یہ چھوٹی بڑی کیسے ہو گئیں؟"

منشی جی :- "اب میں کیا جانوں کیسے ہو گئیں۔ تم قینچی لاؤ بحث بعد میں کر لینا۔"

بیوی :- "اب مونچھوں کا بھی خدا ہی حافظ ہے۔ لو یہ قینچی۔"

منشی جی :- "ادھر آؤ ذرا یہ آئینہ پکڑ کر مونچھوں کی سیدھ میں کھڑی ہو جاؤ۔"

بیوی :- "لو بس ٹھیک ہے نا۔"

منشی جی :- "ایں۔ ٹھیک ہے۔ مگر نہیں یہ تو بھویں ہیں۔ ذرا نیچے رکھو آئینہ۔ اور نیچے۔ بس بس اب ٹھیک ہے یونہی رہنا۔"

بیوی :- "کہیں زیادہ نہ کٹ جائے مونچھ۔"

منشی جی :- "زیادہ کیسے کٹ جائے گی۔ تم ٹوکو تو نہیں لے (مونچھ کاٹ کر) یہ لو۔"

بیوی :- "کٹ گئی نا زیادہ۔ کیا برا منہ ہو گیا۔"

منشی جی: "زیادہ کٹ گئی؟ یہ کیسے کٹ گئی؟ اب یہ اُدھر والی بڑی معلوم ہونے لگی۔"

بیوی: "اب کہیں اسے بھی نہ کاٹ دینا۔"

منشی جی: "تو کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں اس ڈیڑھ مونچھ کی تصویر کھنچوا لوں؟"

بیوی: "میرا کیا ہے تم اپنی گت بنائے جاؤ ذرا آئینہ تو دیکھو۔ کیسی موئی جوجو کی سی صورت ہو گئی ہے۔ گنجی ہو کر رہ گئیں مونچھیں۔"

منشی جی: "تو پھر اب کیا کروں میں۔ بغیر دوسری طرف کی مونچھ کاٹے کام نہیں بن سکتا۔ اب کی میں ذرا کم ہی کاٹوں گا۔"

بیوی: "دیکھو دیکھو دیکھو۔ پھر زیادہ کٹ جاتی۔"

منشی جی: "میرا ہاتھ کانپ گیا تھا تم اس وقت منہ میں قینچی بھی بھونکواؤ گی۔"

بیوی: "میرا کیا ہے تم میری طرف سے بالکل صاف کر دو مونچھیں۔"

منشی جی: "بالکل کیسے دیکھتی تو رہو۔ ذرا آئینہ برابر رکھو۔ ہاں یوں۔ اے (مونچھ پر قینچی چلتی ہے) یہ لو اب تو ٹھیک ہے۔"

بیوی: "خاک ٹھیک ہے۔ اچھی خاصی مونچھوں کا ناس مار لیا ابھی ادھر کی ذرا بڑی ہے۔"

منشی جی: "اٹھانا ذرا آئینہ ...... ہاں بڑی ہے بہت بڑی ہے ابھی منہ ٹیڑھا معلوم ہو رہا ہے۔"

بیوی: "اسے نائی سے ٹھیک کراؤ نہیں تو اور خراب ہو جائیں گی مونچھیں۔"

منشی جی: "اب اس وقت نائی کی تلاش میں نکلوں۔ توبہ ہے تمام بال پسینہ میں اور بھی چپک رہے ہیں۔"

بیوی: "پھر ان میں لگا ہوا ہے گوند۔"

منشی جی: "توبہ۔ توبہ۔ بس یونہی دکھو آئینہ۔ (قینچی چلاتے ہیں) ارے استغفراللہ۔"

بیوی: "بس اب تو طبیعت خوش ہوئی بالکل ہی غائب کر دی ایک طرف کی مونچھ۔ بھئی واللہ مجھ سے تو تمہاری صورت بھی نہیں دیکھی جاتی۔"

منشی جی: "اجی صورت کو ڈالو جہنم میں تصویر کا کیا ہوگا اب۔ مونچھ تو اب نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ اس طرف کی کچھ کچھ البتہ ٹھیک ہے۔ اچھا سنو۔ ٹھیک ہے بس تم شبّن کی دوات لاؤ دوڑ کے۔"

بیوی: "دوات؟ ...... دوات سے کیا ہوگا؟"

منشی جی: "اچھا صاحب نہ لاؤ مگر اس وقت حجت نہ کرو میں خود لیے آتا ہوں۔ مجھے خود ہی غصہ آ رہا ہے اس پر تمہاری بحث، ناطقہ بند کر دیا ہے تم نے۔"

بیوی: "بھئی تو یونہی پوچھا تھا۔ میں لا کے دیتی ہوں ابھی۔"

(بیوی جاتی ہے منشی جی بڑبڑا رہے ہیں)

منشی جی: "توبہ ہے۔ ادھر کی ٹھیک کی اُدھر کی غائب۔ اُدھر کی ٹھیک کی اِدھر کی غائب اور دھوپ الگ جا رہی

ہے .... لے آئیں؟ (بیوی آتی ہے) لاؤ اِدھر اور اب ذرا خاموشی کے ساتھ کھڑی ہو جاؤ آئینہ لے کر۔"

بیوی:- "جانے کیا کرنے کا ارادہ ہے اب موا بہروپ بھرا جائے گا مُنہ کالا کر کے۔"

منشی جی:- "دیکھتی تو رہو۔ بس یونہی رکھو آئینہ .... ہاں ...... اب ذرا دُور ہٹ کر دیکھو کیا معلوم ہوتا ہے۔ بالکل مونچھیں معلوم ہوتی ہیں نا۔؟"

بیوی:- "کہیں بھی نہیں صاف دکھائی دے رہا ہے کہ روشنائی کی لکیر ہے۔ اچھے خاصے ٹیسو معلوم ہوتے ہو دسہرہ کے۔"

منشی جی:- "ایں؟ .... ٹیسو؟ ...... روشنائی ذرا ہلکی رہی۔ اچھا اور سہی۔ بس یہیں رکھنا شیشہ ..... ہاں ...... اب ٹھیک ہے .... دیکھو تو ذرا دُور ہٹ کر۔"

بیوی:- "میں نہیں دیکھتی تمہارا تو دماغ چل گیا ہے اور ساتھ ساتھ مجھ کو بھی پاگل بنائے ہوئے ہو۔"

منشی جی:- "اچھا خیر۔ نہ دیکھو۔ مگر یہ گالوں میں جو گڑھے پڑے ہوئے ہیں ان کو اب کیا کروں، تصویر خراب ہو جائیگی ان سے۔"

بیوی:- "مونچھوں کی گت بن چکی اب گالوں میں روشنائی بھر لو۔"

منشی جی:- "پھر وہی۔ ارے صاحب عقل سے کام لو تو سب باتیں سمجھ میں آ جائیں مگر عقل تمہارے پاس کہاں، جلدی سے دو گلوریاں بنا دو یہ گڑھے بھی اُبھر آئیں گے۔"

بیوی:- "گلوریاں کہاں سے بنا دوں گی سویرے سے پانوں کے لیے چیخ رہی ہوں مگر تم سنتے بھی ہو؟"

منشی جی:- "اچھا اچھا خیر ...... وہ ...... کیا چیز ہونا چاہیئے ...... ٹھیک ہے وہ لاؤ جلدی سے وہ ......"

بیوی:- "وہ کیا اس موئے وہ کا کچھ نام بھی ہے یا بس وہ ہی وہ کیے جاؤ گے؟"

منشی جی:- "وہی میرا مطلب ہے یعنی وہ .... کیا کہتے ہیں اسے۔ مسّم ڈلی کے دو ٹکڑے۔"

بیوی:- "لاتی ہوں۔ گھن چکر بنا کے رکھ دیا ہے۔"

(جاتی ہے)

منشی جی:- "(خود ہی بڑبڑا رہے ہیں) مونچھیں تو اب ٹھیک ہیں۔ کنگھی بھی خوب ہو گئی ہے اس وقت (زور سے) میں نے کہا لائیں وہ ڈلی کے ٹکڑے۔"

بیوی:- "لا رہی ہوں۔ لا رہی ہوں۔ لاتے ہی لاتے تو لاؤں گی۔ لو یہ ڈلی کے ٹکڑے۔"

منشی جی:- "ایک ایک گال میں ایک ایک ڈلی کا ٹکڑا ٹھیک رہے گا (گالوں میں ڈلی رکھ کر بدلی ہوئی آواز میں) اب دیکھو اب تو ٹھیک ہے؟"

بیوی:- "میاں ٹھیک ہے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دونوں گالوں میں بتوڑیاں نکل آئی ہیں۔"

منشی جی:- "بتوڑیاں؟ ...... لانا تو آئینہ۔ (آئینہ لے کر) بتوڑیاں تو کیا البتہ کچھ ٹھیک نہیں رہیں یہ ......

اچھا اگر دونوں گالوں میں ایک ایک نوالہ رکھ لوں روٹی کا تو...... ”

بیوی :۔ مگر تصویر ضرور کھنچواؤ گے اس گت کے ساتھ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ ”

منشی جی :۔ کیا مطلب ہے تمھارا؟ بغیر تصویر کھنچوائے مرجاؤں میں کمبخت تاکہ اولاد کو یہ بھی پتہ نہ چلے کہ باپ بھی تھا۔ ”

بیوی :۔ نہیں نہیں تم برا نہ مانو ضرور تصویر کھنچواؤ تاکہ اولاد کو یہ معلوم ہو کہ باپ بہروپیہ تھا۔ ”

منشی جی :۔ بھئی تم سخت دلشکنی کرتی ہو میری۔ اس میں بہروپیہ ہونے کی آخر کونسی بات ہے۔ تصویر میں ان امور کا پتہ بھی نہ چلے گا اور تصویر ہی نہ ہوئی تو پھر یہ کون کہے گا...... کہ...... کہ...... وہی حسینوں کے خطوط اور تصویر بتاں...... بولو وہ کیا ہے شعر...... مگر مجھے یاد نہیں تو تمھیں کیا یاد ہوگا۔ تو بولو نوالے رکھ لوں منہ میں؟

(دروازہ پر دستک)

بیوی :۔ جو تمھارا جی چاہے وہ کرو۔ مگر...... ”

منشی جی :۔ آیا آیا بھئی آیا ابھی آیا بس تیار ہی سمجھو (چپکے سے) چھوڑو نوالہ ووالہ کو لاؤ اچکن اٹھاؤ جلدی سے۔ ”

بیوی :۔ اس گرمی میں یہ جو موٹی جامہ وار لادی جائے گی تو مزا ہی آجائے گا۔ ”

منشی جی :۔ (شیروانی پہنتے ہوئے) خیر۔ ہوگا تم ٹوپی تو لاؤ میری...... وہ دیکھو وہ رکھی ہے گھڑونچی پر۔ ”

بیوی :۔ یہ اچکن اور اس پر یہ موٹی چتا شاہی ٹوپی۔ ”

منشی جی :۔ اچھا تو جانے دو، اپنا کوئی دوپٹہ ہی دے دو صافہ باندھ لوں گا۔ ”

بیوی :۔ نیل تو چڑھا ہوا ہے تمھارے سر پر۔ ”

منشی جی :۔ چاہے میری تصویر کمبخت خراب ہو جائے مگر تمھارا دوپٹہ خراب نہ ہو...... اقوہ۔ سخت گرمی ہے...... اچکن تو آگ لگائے دیتی ہے۔ ”

بیوی :۔ تو یہی دوپٹہ لے لو نا۔ ”

منشی جی :۔ لاؤ یہی لاؤ۔ سخت پسینہ ہے...... توبہ ہے...... لاؤ دوپٹہ۔ مگر اب اسے باندھے گا کون؟ بیوی بھی ایسی ملی ہیں جن کو صافہ تک باندھنے کا ڈھنگ نہیں۔ ”

(دروازہ پر دستک اور آواز)

بیوی :۔ لے اور کیا یہ تو عورتوں کے کام ہی ہیں کہ...... ”

تصویر والا :۔ ارے صاحب اب تکلیف نہ کیجئے وقت نکل گیا۔ ”

منشی جی :۔ تو میں بھی اب تیار ہوں بھئی۔ (بیوی سے) رہنے دو صافہ میں ننگے سر ہی کھنچوا لوں گا۔ ”

بیوی :۔ لے ہے۔ یہ سارا منہ کالا ہو گیا۔ روشنائی پسینہ میں خوب منہ بھر پر پھیلی ہے۔ ”

منشی جی :۔ ایں...... لانا تو آئینہ...... لاحول ولا قوۃ۔ ”

تصویر والا :۔ اچھا صاحب میں جا رہا ہوں۔ ”

منشی جی :۔ ارے یار ذرا دم تو لو...... توبہ ہے یہ تو شیروانی پر بھی ٹپک رہی ہے۔ بھئی ذرا لوٹا لاؤ جلدی۔ ”

بیوی :۔ لو لوٹا۔ ” (منشی جی منہ دھوتے ہیں اور بڑبڑاتے جاتے ہیں)

پہاڑ تلے

(۱)

چند دن سے یہ کالم غائب تھا اس لیے کہ کالم نویس راولپنڈی سے غائب تھا۔ اس کالم کے قارئین سے اپنی اس غیر حاضری کے لیے معذرت خواہ ہونے کے بعد عرض پرداز ہوں کہ مجھ کو مشاعرہ ہو گیا تھا۔ آپ نے اخبارات میں تو یہ خبریں پڑھی ہوں گی کہ کراچی میں چیچک پھیلی ہوئی ہے مگر میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ وہاں چیچک سے کہیں زیادہ مشاعرے پھیلے ہوئے ہیں میں نے خود دیکھے ہیں۔ جہاں تک چیچک کا تعلق ہے اس کو تو قابو میں لانے کے لیے وہاں ٹیکے لگانے کی مہم شروع ہو چکی ہے مگر چونکہ اب تک کوئی "اینٹی مشاعرہ ویکسین" ایجاد نہیں ہوا ہے لہٰذا مشاعروں سے تحفظ کے ٹیکے نہیں لگتے اور اگر کسی جگہ کوئی مشاعرے کا کیس ہو جاتا ہے تو ایسا متعدی مرض ہے کہ ہر طرف مشاعرے ہی مشاعرے پھوٹ پڑتے ہیں چنانچہ جب سے مجلسِ یادگارِ جگر کا مشاعرہ ہوا ہے مشاعروں کی وبا کراچی میں پھیل گئی ہے اور کراچی کے گوشے گوشے میں ایک نہ ایک مشاعرے کی قیامت برپا نظر آ رہی ہے۔

کہا جاتا ہے اور کہا ہی نہیں جاتا بلکہ واقعہ بھی یہی ہے کہ مجلسِ یادگارِ جگر کا جو مشاعرہ ۶ر جنوری کو ہوا تھا وہ کراچی کی ہی نہیں بلکہ پاکستان کی تاریخ کا پہلا کامیاب ترین مشاعرہ تھا جو سات گھنٹے تک بیس بائیس ہزار سامعین نے نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ سنا نہ کوئی ہنگامہ ہوا نہ ہوٹنگ کے ذریعے مشاعرے کو جگانے کی ضرورت محسوس کی گئی نہ سیٹیاں بجیں نہ جانوروں کی بولیاں سنائی دیں۔ حد یہ ہے کہ داد تک کو بیداد نہ بننے دیا گیا ورنہ آج کل تو مشاعروں میں جتنا کلام شاعر سامعین کو سناتے ہیں اس سے زیادہ بدکلامی سامعین کی طرف سے ان کو سننا پڑتی ہے، لاٹھی چارج ہوتے ہیں، کرسیاں چلتی ہیں۔ شامیانے گرائے جاتے ہیں اور لوگ ایک دوسرے پر گرتے ہیں۔ مگر یہ پہلا مشاعرہ تھا جو اس عظیم اجتماع کے باوجود چشمِ بد دور ایسا مہذب، پرسکون اور شریفانہ ثابت ہوا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اتنے سخن فہم کیونکر اس مشاعرے کو نصیب ہو گئے۔

یہ اصل مشاعرہ تو خیر بحمد للہ خیریت سے گزر گیا مگر اس کے بعد جو مشاعرے کراچی میں پھیلے ہیں تو جان بچانا دوبھر ہو گیا ایک ایک رات میں کئی کئی مشاعرے اور ہر مشاعرے کی طرف سے شاعروں کی کھینچا تانی کوئی شاعر کو ادھر گھسیٹ رہا ہے تو کوئی ادھر اور شاعر کی حیثیت اس کٹی ہوئی پتنگ کی سی ہے جس کو لوٹنے والے لڑکے یہ طے کر چکے ہوں کہ یا تو یہ پتنگ مجھ کو ملے ورنہ

پھٹ جائے اور کسی کے ہاتھ نہ آئے ادھر شاعر کا یہ حال کہ وہ کہہ رہا ہے کہ ؎

گر یہاں تھے مشاعرے اتنے
ہم بھی یا رب کئی بنے ہوتے

نتیجہ یہ کہ اس نے وعدہ کسی سے کیا شعر کسی اور محفل میں پڑھے۔ داد کسی اور محفل میں حاصل کی پلاؤ کسی دعوت میں کھایا۔ زردہ کسی اور دسترخوان پر۔ پانی کسی تیسری جگہ اور زندگی سے ہاتھ جائے قیام پر دھوئے۔

مجلس یادگار جگر والے اصل مشاعرے کے دوسرے ہی دن بیت الغزل میں فضلی صاحب کلام و طعام دونوں کی دعوت دے کر تمام بیرونجاتی اور کچھ مقامی شعراء کو گرفتار کر چکے تھے لہٰذا مشاعرے کے نائب ناظم اقبال صفی پوری صاحب کو اپنی صفی پوری ہاؤس والی "محفل کھاؤ اور گاؤ" کو تیسرے دن کے لیے اٹھا رکھنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور ۹ جنوری کو تو شاعروں کا یہ حال تھا کہ وہ منہ چھپاتے پھرتے تھے اور ان کو ڈھونڈنے والے ہر طرف ڈھونڈتے پھرتے تھے سونگھتے پھرتے تھے اور ان کا سراغ لگاتے پھرتے تھے اس لیے کہ اس ایک ہی دن میں کئی نشستیں منعقد ہو رہی تھیں حضرت جوش ملیح آبادی کے یہاں کی نشست مولانا ماہر القادری کے یہاں کی محفلِ طعام و کلام۔ کراچی یونیورسٹی کا مشاعرہ جوناگڈھ پیلس کی "محفل پلاؤ اور سناؤ" آخر بیچارے شاعر اپنے کو چار ٹکڑوں میں کیونکر تقسیم کر دیتے نتیجہ یہ کہ کچھ کو جوش صاحب لے اُڑے کچھ مولانا ماہر کے ہاتھ آ گئے۔ کچھ یونیورسٹی پہنچے اور کچھ جوناگڈھ پیلس میں نظر آئے۔ بعض ایسے جانباز بھی تھے جو یونیورسٹی کی محفل میں بھی نظر آئے اور جوناگڈھ یا مولانا ماہر کے دسترخوان پر بھی اس میں دراصل شعرائے کرام کی "ہرجائیت" کا کمال نہ تھا بلکہ ان محفلوں کے بانی ہی ان کو اس طرح بٹورتے پھرتے تھے جس طرح الیکشن کے ورکر ووٹروں کو بٹورتے پھرتے ہیں۔

واضح رہے کہ مجلس یادگار جگر کا مشاعرہ صبح چار بجے ختم ہوا بیت الغزل میں فضلی صاحب کا مشاعرہ رات کو دو بجے تک ختم ہوا۔

صفی پور ہاؤس میں اقبال صفی پوری کا مشاعرہ ڈھائی بجے رات کو ختم ہوا۔

جوناگڈھ پیلس کا مشاعرہ رات کو ایک بجے ختم ہوا۔

ان مشاعروں کے علاوہ باہر سے آنے والے شعرائے کرام سفر میں بھی جاگے ہوئے تھے اور ان پے بہ پے مشاعروں میں مبتلا ہو کر تو راتوں کی نیند ہی ان پر حرام ہو چکی تھی۔ دن کو آٹو گراف لینے والے یا ان کے دوسرے قدردان یوں بھی سونے نہ دیتے تھے لہٰذا کیفیت ان کی یہ تھی کہ نیند میں ایک مصرع ایک غزل کا پڑھ جاتے تو دوسرا کسی اور غزل کا اور پھر معذرت خواہ ہوتے تھے کہ "حضور معاف کیجیے گا ہم چار پانچ دن کے جاگے ہوئے ہیں لہٰذا عفو و بخشش کے مستحق ہیں" دوسروں کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہوگا خود اپنا تو یہ حال ہو گیا تھا کہ اگر کسی وقت آنکھ لگ بھی گئی تو خواب میں مشاعرہ دیکھ کر پھر اُچھل پڑے۔

ممکن تھا کہ کراچی میں ایک آدھ دن اور قیام ہوتا مگر جب مشاعروں کی یہ کثرت دیکھی اور وعدہ لینے والوں کے حملوں نے بالکل ہی پسپا کر دیا تو ۱۰ جنوری کو عین اس وقت جبکہ سرسید گرلس کالج میں مشاعرہ برپا تھا میں اپنے سامان کے علاوہ کئی وعدے اپنے اوپر لادے ہوئے بھاگ کھڑا ہوا اور اسٹیشن پہنچ کر ٹرین میں اگر دم لیا ورنہ کراچی میں تو اب تک مشاعرے جاری ہیں شاعر

مسلسل جگائے اور گوائے جا رہے ہیں مگر میرے تو چھوٹے چھوٹے ننھے بچے ہیں ان پر رحم کھا کر آ گیا ہوں اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اب اگر کبھی کراچی گیا تو مشاعروں کا ٹیکہ لگوا کر ہی جاؤں گا ورنہ آپ جانتے ہیں کہ جان ہے تو جہان ہے۔

(۲)

لندن پہنچ کر ایک صاحب کو سب سے زیادہ تعجب اس بات پر ہوا کہ عجیب تعلیم یافتہ جگہ ہے یہ بھی کہ یہاں کا بچہ بچہ فر فر انگریزی بولتا ہے اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ بچے مادر زاد گریجویٹ ہوتے ہیں ان انگریزی بولنے والے بچوں کو دیکھ کر ان صاحب کو بے حد شرم آئی کہ ہم سے اچھے تو یہ بچے کہ ہم انگریزی کے "اے" کے نام "بی" ابھی نہیں جانتے اور منہ اٹھائے چلے آئے ہیں اس شہر میں جہاں دودھ پیتے بچے تک انگریزی میں تتلاتے ہیں نتیجہ یہ کہ منہ میں زبان رکھتے ہوئے بھی گونگوں کی طرح اشاروں سے اپنا مفہوم سمجھانا پڑتا ہے نہ کسی کی بات سمجھ سکتے ہیں نہ اپنی بات کسی کو سمجھا سکتے ہیں۔ سُنی سُنائی انگریزی بولنے کی کوشش کرتے ہیں تو اور بھی ہنسی اڑتی ہے کہ کسی عورت سے "مس سر" کہہ دیا تو وہ چونک پڑی اور کسی مرد کو نہایت ادب سے "میڈم" کہہ دیا تو وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ "یس" کی جگہ "نو" اور "نو" کی جگہ "یس" کہہ رہے ہیں، خاموش فلموں کے زمانہ کے اداکار بنے ہوئے ہیں مگر آفت میں جان ہے کہتے زمین کی ہیں اور سمجھی جاتی ہے آسمان کی بات، جانا چاہتے ہیں آکسفورڈ اسٹریٹ اور ٹیکسی والا پہنچائے دیتا ہے ٹیوی اسٹاک اسکوائر میں دکاندار سے مانگ رہے ہیں تولیہ اور وہ تھمائے دیتا ہے رومال۔ کھانے کو مانگ رہے ہیں مرغی اور فراہم کیا جا رہا ہے کیکڑا۔ نہ کسی سے کسی جگہ کا پتہ پوچھ سکتے ہیں نہ کسی کا بتایا ہوا پتہ سمجھ سکتے ہیں سوائے اس کے کہ سب کچھ سُن کر جان بچانے کے لیے "یس سر" کہہ کر خود ہی سرگرداں رہیں۔

سُنا ہے کہ اسی قسم کے ایک منشی فاضل صاحب انگریزی کی دو تین ریڈریں پڑھ کر انگلستان جا پہنچے اور وہاں پہنچ کر ان کو فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ جتنی انگریزی وہ جانتے ہیں وہ تو یہاں کے لیے اس قدر ناکافی ہے کہ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ وہاں پہنچتے ہی بیمار ہو گئے اور خدا جانے اپنے کو کس طرح ڈاکٹر تک پہنچایا مگر اب ڈاکٹر کو اپنی تکلیف سمجھائیں تو کس طرح۔ خیال یہ تھا کہ ہمارے نباض طبیبوں کی طرح کے وہ ڈاکٹر بھی ہوں گے جو نبض دیکھتے ہی سب کچھ خود سمجھ لیتے ہیں اور مریض کو کچھ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی مگر وہاں ڈاکٹر اپنی زبان میں سوال کر بیٹھا کہ تم کو کیا شکایت ہے اور اب جو انھوں نے اُردو میں انگریزی بولنا شروع کی ہے تو ڈاکٹر بھی چکرا کر رہ گیا کہ اس مریض کو آخر کس مرض کی دوا دے کہنے لگے کہ "سر لاسٹ نائٹ ہیڈک ان اسٹامک شروع ہوا پھر فور آر فائیو ٹائمز چھینکیں کیم اور اس کے بعد خراش ان تھروٹ محسوس ہوئی آفٹر دیٹ لرزہ سے فیور ہو گیا۔"

ڈاکٹر کے پلے جب کچھ نہ پڑا تو اس نے ان کو بمشکل سمجھایا کہ علاج کرانا ہے تو اپنے کسی انگریزی جاننے والے ہم وطن کو لیکر آؤ ورنہ ایسا نہ ہو کہ اختلاجِ قلب کی شکایت ہو اور مراق کی دوائیں تمھارے لیے تجویز کر دی جائیں۔"

ایسے تو خدا جانے کتنے لوگ وہاں پہنچ جاتے ہیں جو ہوٹلوں میں مرغی مانگنے کے لیے انڈا دکھا کر سمجھاتے ہیں کہ "اس کی مدر چاہیے" تصویریں دکھا دکھا کر مطلوبہ اشیاء دکانداروں سے طلب کرتے ہیں آٹا درکار ہوتا ہے تو گیہوں دکھا کر اپنے ہاتھ کو گردش دے کر کہتے ہیں

کہ اس کا یوں یوں چاہیے"۔ یہ انگریزی تقریباً اسی قسم کی ہوتی ہے جیسی ہمارے یہاں کے خوانچہ فروش انگریزوں کی عملداری میں گوروں سے انگریزی بولا کرتے تھے کہ "صاحب یہ آرنج ون آنہ ملے گا خوشی ٹیک خوشی نو ٹیک" مگر اس قسم کی انگریزی لندن میں بولنے والوں کو یہی جواب ملتا ہے کہ "تم جو کچھ مانگتا ہے ہم اس کو ہم اتنا ہی سمجھتے ہیں خوشی ٹیک خوشی نو ٹیک"۔

صورت حال یہ ہے کہ برطانیہ کے متعلق ہمارے یہاں کے لوگ جب یہ سنتے ہیں کہ وہاں نہایت آسانی سے روزگار مل جاتا ہے اور معاوضہ نہایت معقول ملتا ہے تو وہ بغیر سوچے کہ انگریزی زبان جانتے ہیں یا نہیں کسی نہ کسی طرح انگلستان پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر صرف ہوٹلوں میں پلیٹیں ہی صاف کرنے کا کام مل گیا تو وارے نیارے ہو جائیں گے مگر جب وہاں پہنچ جاتے ہیں تو اپنے کو ایسا گونگا اور بہرا محسوس کرتے ہیں کہ خود بھی پریشان ہوتے ہیں۔ اور وہاں کے لوگوں کے لیے بھی مصیبت ثابت ہوتے ہیں کہ آخر ان کو کس طرح سمیٹا جائے ان کو کس طرح سمجھا جائے اور کس طرح سمجھایا جائے، آخرکار ایک آخری ترکیب اس قسم کے نوواردانِ برطانیہ کے لیے سمجھ میں آئی ہے کہ ان کو پہلے انگریزی پڑھائی جائے اس کے بعد ان سے پوچھا جائے کہ آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔ اور کیا چاہتے ہیں۔ برطانیہ کے صنعتی شہر بدفرم میں ان غیر ملکی اور انگریزی نہ جاننے والے افراد کو انگریزی پڑھانے کے انتظامات کیے جا رہے ہیں تاکہ وہ یہاں آئے ہیں تو یہاں آنے کا مقصد بھی بیان کر سکیں ملازمتیں چاہتے ہیں تو ملازمتیں حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں۔ محنت مزدوری کرنا چاہتے ہیں تو اس پر روشنی ڈالیں۔ ان اشارہ بازیوں سے آخر کب تک کام چل سکتا ہے۔

انگریزی نہ جاننے والے ان پردیسیوں کو انگریزی میں شُدبُد حاصل کرنے کی تحریک دراصل ایک ڈاکٹر کی اپیل پر شروع کی گئی ہے جس کا ایک ایسے پاکستانی مریض سے سابقہ پڑ گیا تھا جو بیمار تو یقیناً تھا مگر یہ بتانے سے قاصر تھا کہ اس کو بیماری کیا ہے اور وہ کن تکالیف میں مبتلا ہے۔ ڈاکٹر نے اس کے اشاروں پر بھروسہ کر کے اوٹ پٹانگ علاج کو خطرناک سمجھ کر یہ اپیل کی ہے کہ ان نوواردوں کو کم از کم اتنی انگریزی تو آنا ہی چاہیے کہ وہ اپنے مرض کی علامات بیان کر سکیں ورنہ ہو سکتا ہے کہ مبتلا ہوں پیچش میں اور علاج شروع ہو جائے بواسیر کا، تکلیف ہو بیوی کو اور آپریشن کر دیا جائے خود ان کا۔

اب دفتر روزگار والے ان انگریزی نہ جاننے والوں سے پوچھتے پھر رہے ہیں کہ ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو اس قسم کی کلاسوں میں داخلہ لینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ پوچھنا ان سے یہ چاہیے کہ بندہ نواز جب آپ انگریزی جانتے ہی نہ تھے تو انگریزوں کے ملک میں آخر کیا سمجھ کر آ پہنچے ہیں۔ اب یہ تو ہونے سے رہا کہ آپ سے سر کھپانے کے لیے اہلِ برطانیہ اردو پڑھنا شروع کر دیں یہ زحمت تو آپ ہی کو کرنا پڑے گی مگر ایسا نہ ہو کہ اس کے جواب میں وہ یہ کہیں کہ انگریزی جانتے ہوتے اور انگریزی ہی پڑھنا ہوتی تو اپنا دیس چھوڑ کر پردیس کا کیوں رُخ کرتے انگریزی جاننے والوں کے لیے روزگار کی خود ہمارے یہاں کون سی کمی تھی ہم تو یہ سمجھ کر یہاں آ گئے تھے کہ یہاں پڑھے نہ لکھے بھی محمد فاضل ہوتے ہیں۔

(۳)

بشیر ساربان جن کو مسٹر لنڈن جانسن کی ایک نگہ التفات نے کراچی سے امریکہ تک پہنچا دیا تھا آخرکار اونٹ گاڑی سے

ٹرک تک جا پہنچے اور ان کو فورڈ کمپنی کا وہ سُرخ رنگ کا ٹرک مل گیا جس کا ان سے سفرِ امریکہ کے موقع پر وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ ٹرک ان کو ایک خاص تقریب منعقد کر کے دیا گیا جس میں بشیر نے شکریہ کی تقریر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ادا کیا اور ان دوستوں کی دوستی پر اظہارِ فخر کیا جنھوں نے ایک اونٹ والے سے یکایک ٹرک والا بنا دیا۔ معلوم ہوا ہے کہ بشیر نہایت انہماک سے ٹرک چلانے کی تربیت حاصل کر رہے ہیں اور ان کو توقع ہے کہ وہ بہت جلد ڈرائیونگ کا لائسنس بھی حاصل کر لیں گے مگر وہ ایسے بے وفا یا احسان فراموش نہیں ہیں کہ اپنے اونٹ کو بھول جائیں اس لیے کہ ان کا خیال ہے کہ یہ عروج ان کو اونٹ ہی کے دم قدم سے حاصل ہوا ہے اور بجائے اس کے کہ وہ اپنے اونٹ سے یہ پوچھیں کہ "اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی؟" ان کا خیال یہ ہے کہ ان کے اونٹ کی ہر کل سیدھی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ سفرِ امریکہ میں اپنے اونٹ کو ساتھ نہ لے گئے۔ مگر زندگی کے سفر میں وہ اونٹ کو ہمیشہ ساتھ رکھیں گے انھوں نے ایک شتربان کی خدمات حاصل کر لی ہیں کہ جب وہ ٹرک چلانا شروع کر دیں تو شتربان ان کا اونٹ چلاتا رہے۔ وہ یہ اونٹ کسی کو نہ دیں گے البتہ اگر مسٹر لنڈن جانسن مانگیں تو دوسری بات ہے۔

بشیر نے اپنی تقریر میں بڑی سادگی سے یہ بھی بات کہہ دی کہ ایسا قیمتی ٹرک تو مجھ کو مل گیا ہے مگر اسے رکھنے کے لیے میرے پاس گیراج نہیں ہے اس لیے کہ میں تو خود ہی ایک جھونپڑے میں رہتا ہوں اس ٹرک کے لیے دولت خانہ کہاں سے لاؤں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ٹرک نہایت قیمتی ہے اور کراچی میں اس قسم کے ٹرک کی قیمت آج کل پچیس ہزار روپیہ کے قریب ہے۔ اس ٹرک کے علاوہ بشیر کو فاضل پرزوں اور اوزاروں کے دو صندوق بھی دیئے گئے ہیں جن کی قیمت ڈیڑھ ہزار کے قریب ہے مگر اس ٹرک اور ان دونوں صندوقوں کو رکھے گا کہاں اس کا فی الحال کوئی انتظام نہیں ہے مگر خدا مسبب الاسباب ہے ممکن ہے کہ امریکی سفیر ولیم رٹونٹری بشیر کی اس پریشانی کی خبر بھی مسٹر لنڈن جانسن کو کر دیں اور حقِ دوستی ادا کرتے ہوئے گیراج کا بھی بندوبست کر دیں۔

فی الحال تو بشیر پر وہ قصہ صادق آ رہا ہے کہ ایک راجہ صاحب نے ایک مہنت سے خوش ہو کر اپنا ایک ہاتھی اس کو انعام میں دے دیا تھا ظاہر ہے کہ اتنا بڑا انعام پا کر وہ خوش نصیب مہنت کتنا خوش ہوا ہوگا ساری ریاست میں اس کی دھوم ہو گئی کہ مہاراج نے ایک غریب مہنت کو اتنا بڑا انعام دے ڈالا ہر طرف سے لوگ اس ہاتھی کو دیکھنے آنے لگے جو مہنت کے دروازے پر کھڑا جھوم رہا تھا اور مہنت کو مبارکباد دیتے رہے مگر جب یہ مبارک سلامت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اس غریب مہنت کو اس ہاتھی کی خوراک کا بندوبست کرنا پڑا۔ تو چند ہی دن میں اس مہنت کا حال ایسا پتلا ہوا کہ دن کو تارے نظر آنے لگے اور اب پتہ چلا کہ مہاراج نے اس کو یہ انعام نہیں دیا ہے بلکہ ایسی سزا دی ہے کہ ہاتھی کے بوجھ تلے وہ دبتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ اس انعام سے وہ مالا مال ہوتا ہاتھی کا پیٹ بھرنے کے لیے اس کو خود اپنا پیٹ کاٹنا پڑا۔ بال بچوں کا پیٹ کاٹنا پڑا اور آخرکار جب گھر کا سامان نیلام کرنے کی نوبت آ گئی تو وہ دست بستہ مہاراج کی خدمت میں حاضر ہوا کہ کم از کم اس کو وہ خطا تو بتا دی جائے جس کی اتنی بڑی سزا اس کو دی گئی ہے۔ آخر بمشکل تمام مہاراج کو یہ سمجھایا جا سکا کہ یہ ہاتھی اس مہنت پر کتنا بڑا بوجھ بن گیا ہے لہذا دوسرا انعام مہاراج نے یہ دیا کہ اپنا عطیہ واپس لے کر اس ناقابلِ برداشت بوجھ سے مہنت کو

سبکدوش کر دیا۔

فورڈ کمپنی والوں کو کیا معلوم کہ مسٹر لنڈن جانسن کا یہ دوست اس قابل بھی نہیں کہ اس تحفہ کو سنبھال سکے۔ اگر ان کو بشیر کے جھونپڑے کی خبر ہوتی تو پہلے وہ خود بشیر کے لیے ایک گیراج کا بندوبست کرتے جس میں یہ بے چارہ رہ سکے اس کے بعد اس کے لیے ٹرک کا گیراج فراہم کرتے پھر ٹرک دیتے۔ اب تو یہی ہو سکتا ہے کہ بشیر اس ٹرک کو اپنے جھونپڑے کے سامنے کھڑا کر کے خود اس میں رہنا شروع کر دے اور اس کو ٹرک سے زیادہ اپنے گھر کے طور پر استعمال کرے یہ ٹھیک ہے کہ جب وہ ڈرائیونگ کا لائسنس حاصل کر لیں گے۔ ٹرک چلانا شروع کریں گے اور اس سے پیسہ کمائیں گے تو یہ آمدنی خود ہی گیراج کا بندوبست کرا دے گی مگر اس آمدنی سے پہلے تو اخراجات ہی اخراجات ہیں کہ اونٹ کے لیے ایک شتربان رکھنا پڑا ہے۔ ڈرائیونگ سیکھنے کی فیس ادا کر رہے ہوں گے۔ ٹرک تو آ گیا ہے اب پٹرول بھی پھونکنا پڑے گا۔ اس کو رجسٹر کرانے کے اخراجات کا بار الگ ہو گا۔ ڈرائیونگ لائسنس بھی ظاہر ہے کہ مفت تو ملتا نہیں پھر یہ ٹرک چلانا شروع کریں گے تو نئے نئے ڈرائیور کی حیثیت سے نہ جانے کتنے چالان کرائیں گے اور کتنے جرمانے ادا کریں گے۔ اور ان تمام منزلوں سے گزرنے کے بعد کہیں آمدنی کی شکل نظر آئے گی۔ نتیجہ یہ کہ بجائے اونٹ کے ان کو اس ٹرک ہی سے پوچھنا پڑے گا کہ "ٹرک رے ٹرک تیری کونسی کل سیدھی"

ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ بشیر کو اگر خدا عقل دیتا تو وہ اس ٹرک کو شکریہ کے ساتھ قبول کر کے اس کی قیمت نقد کر لیتے اور پچیس چھبیس ہزار میں اس ٹرک اور اس کے سامان کو فروخت کر کے اس رقم سے کچھ اونٹ اور کچھ گاڑیاں خرید لیتے اور اپنے اسی پیشہ کو ترقی دیتے جس کا ان کو تجربہ بھی ہے اور جس سے ان کو یہ عروج حاصل ہوا ہے بجائے ایک اونٹ گاڑی کے اونٹ گاڑیوں کے ایک قافلہ کے مالک بن کر چین سے زندگی بسر کرتے۔ مگر جانسن صاحب کی دوستی نے ان کو ساربان سے ڈرائیور بنا کر رکھ دیا ہے تو اب وہ بھلا ہماری یہ بات کیوں مانیں گے وہ اپنی لائن شوق سے بدل لیں مگر خدا کرے اونٹ گاڑی اور ٹرک میں جو فرق ہوتا ہے اس سے وہ بے خبر نہ رہیں۔ اور اس ٹرک کو اس طرح استعمال نہ کریں کہ چند دن کے بعد اسی میں اونٹ جوتنے کی نوبت آ جائے اور اونٹ ہی اس کو کھینچ کر گیراج تک نہ پہنچایا کرے

(۴)

ٹیڈی گرس کچھ بھی سہی مگر یہی کیا کم ہے کہ وہ اپنے کو گرلس تو کہتی اور سمجھتی ہیں مگر آپ ان "مردانہ عورتوں" کو کیا کہیں گے جو عورت پیدا ہو کر مرد بننے کے ارمان میں گھلی جاتی ہیں اور ایسی مردانہ وضع قطع اختیار کئے رہتی ہیں کہ عجیب "خانم خان" قسم کی نظر آتی ہیں وہ نہ صرف مردوں کی طرح کے بال ترشوا کر گیسوئے تابدار کو مردانہ وار بنوا لیتی ہیں بلکہ اچھا خاصہ غرارہ شلوار ساڑھی وغیرہ چھوڑ کر سلیکس پہننا شروع کر دیتی ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ گویا بہت حسین نظر آتی ہوں گی حالانکہ اس لباس اور اس وضع قطع کے ساتھ ان کو گھوڑے پر سوار دیکھ کر یا سگریٹ کے کش لگاتی ہوئی دیکھ کر یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ یہ مسماۃ غفورن ہیں یا مسٹر اے غفور یہ بیوی بننے کے قابل ہیں یا ان کو شوہر بنا لینا زیادہ مناسب ہو گا۔ یہ عورتوں کے لیے زیادہ جاذب نظر ہیں یا مردوں کے لیے بلکہ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کو اگر مس کہہ کر مخاطب کر لیا گیا تو ناراض تو نہ ہوں گی اور

اگر مسٹر کہہ دیا تو اس کو طنز سمجھ کر خفا تو نہ ہو جائیں گی۔ مختصر یہ کہ وہ اپنی جنس کو ایسا معمّہ بنائے پھرتی ہیں جو نہ سمجھنے کا ہو نہ سمجھانے کا۔

ممکن ہے کہ اس قسم کے مردانہ وار حسن کو وہ مرد پسند کرتے ہوں جو خود نسائیت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں نسائیت میں مبتلا مردوں کی بھی آپ کی دعا سے کوئی کمی نہیں ہے یہ وہ مرد ہوتے ہیں جو اپنے وقت کا بیشتر حصہ آئینہ کے سامنے گزارتے ہیں کہ آئینہ خانہ میں کھڑے بال بال موتی پرو رہے ہیں اور آرائشِ جمال میں ہمہ تن مصروف ہیں کہ بالوں میں پیچ اور گھونگھر پیدا کر چکے تو اس کے بعد رخِ روشن پر طرح طرح کی پالش کا سلسلہ جاری ہے کبھی یہ کریم رگڑ رہے ہیں تو کبھی وہ اسنو تھوپ رہے ہیں ممکن ہے آپ اس بات کا یقین نہ کریں مگر ہم نے تو پوڈر اور سرخی لگانے والے مرد بھی دیکھے ہیں بلکہ ایسے ایسے نازآفرین گل اندام دوشیزوں سے بھی پالا پڑا ہے جن کے لبوں پر لپ اسٹک تک کی کاریگری نظر آئی ہے عطر میں بسے گل بدن بنے خرام ناز سے گل کترتے وہ اس طرح پھرتے ہیں کہ بقول جوش ان سے پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ۔ ع

اے ہیں صدقہ رن میں جاؤ گے اسی انداز سے

سمجھتے یہ ہیں کہ جو بھی ان کو دیکھ لے گی غش کھا کر گر پڑے گی حالانکہ عورتیں یا تو ان کو اپنی موت سمجھتی ہیں یا اس کشمکش میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ ان کو ڈوپٹہ بدل بہن بنا لیں یا ان سے صاف صاف کہہ دیں کہ اے نام نہاد مرد تجھ کو یہ نسائیت زیب نہیں دیتی۔

اس قسم کے "لیڈیز مرد" ممکن ہے کہ ان "جنٹلمین عورتوں" کو پسند کرتے ہوں ورنہ جو اصل نسل کے مرد ہیں وہ تو اپنی ہم جنس نظر آنے والی ان عورتوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے بلکہ اگر کسی شوہر کی بیوی یکایک اس طرح خود ہی شوہر ہونا شروع کر دیتی ہے تو وہ بیچارہ سخت پریشان ہو جاتا ہے کہ میں بھی شوہر اور یہ بھی شوہر تو آخر بیوی کون ہے۔ ہم آپ تو پھر بھی مشرقی ہیں، یہ وضع قطع جس مغرب سے آئی ہے خود وہاں کے صحیح قسم کے مردوں کا حال یہ ہے کہ جس بیوی کو عورت سمجھ کر بیاہ لاتے ہیں اس کی اس مصنوعی جنسی تبدیلی کو برداشت نہیں کرتے چنانچہ فرانس ایسے فیشن ایبل ملک میں ایک شوہر نے اپنی بیوی سے طلاق حاصل کرنے کی محض اس لیے درخواست دے کر کامیابی حاصل کر لی کہ بیگم صاحبہ کو بیٹھے بٹھائے نہ جانے کیا سوجھی کہ انھوں نے اسکرٹ چھوڑ کر سلیکس پہننا شروع کر دی۔ اپنے تمام زنانہ لباس اپنی سہیلیوں میں تقسیم کر دیئے اپنے بال بھی مردوں جیسے کٹوا لیے اور پائپ پینا شروع کر دیا۔ پہلے تو شوہر نے بیوی کو سمجھایا کہ دیکھ نیک بخت میں نے مرد سے نہیں بلکہ ایک عورت سے شادی کی ہے اور تجھ کو میرے لیے عورت ہی بن کر رہنا چاہیئے۔ تو میرا برادرِ عزیز بننے کی کوشش نہ کر۔ مجھ کو گھر والی درکار ہے گھر والا نہیں مگر جب ان مسماۃ نے اس کی ایک نہ سنی تو اس نے طلاق کی درخواست دے دی کہ چونکہ میری بیوی وضع قطع کے اعتبار سے مرد بن چکی ہے لہٰذا میں اس مرد نظر آنے والی عورت کو اپنی بیوی نہیں سمجھ سکتا۔ عدالت نے اس کو طلاق کا حق دے دیا اور محض اس مردانہ پن نے اس عورت کو اپنے شوہر سے علیحدہ کرا دیا۔

عدالت نے اس مقدمہ کا فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ یہ بیوی کی سراسر زیادتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کو اس بات پر مجبور کرے کہ وہ ایک مرد نظر آنے والی جنس کو بیوی سمجھے۔ یہ عورت نہایت آسانی سے اس وضع کو ترک کر سکتی تھی اور عورت بن کر رہ سکتی تھی مگر اس نے شوہر کے جذبات کا خیال نہ کیا حالانکہ اس کو غور کرنا چاہیئے تھا کہ اگر اس کا شوہر اسکرٹ پہننا شروع کر دیتا۔ عورتوں کی

طرح کے بال بڑھانا۔ اونچی ایڑی کا جوتا پہننے لگنا۔ میک اپ کا پابند ہو جانا تو خود اس کے لیے کس حد تک ناقابلِ برداشت بن جانا اسی طرح وہ مردانہ وضع اختیار کر کے اپنے شوہر کے لیے ناقابلِ برداشت بن چکی ہے اور اس پر مُصر ہے کہ اس وضع کو ترک نہ کرے گی تو سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس کے شوہر کی درخواست منظور کر کے اس کو طلاق کا حق دے دیا جائے۔ اور اس کے مطالبہ کو حق بجانب سمجھا جائے۔ وہ عورت یہ فیصلہ سن کر پتلون پہنے سگریٹ کے کش لیتی ہوئی نہایت اطمینان سے چلی گئی اور وہ مرد بھی ایک مرد بیوی سے نجات حاصل کر کے سبکدوش ہو گیا۔

یہ حالات اس ملک کے ہیں جہاں عورتوں اور مردوں میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا مگر ہمارے یہاں تو عورت صحیح معنوں میں عورت، اور مرد صحیح معنوں میں مرد ہوتا ہے۔ یہاں یہ مغربی نقالی بھلا کیونکر چل سکتی ہے مگر کورانہ تقلید کا یہ حال ہے کہ یہاں بھی کبھی نہ کبھی جب کوئی "پتلون آرا بیگم" نظر آجاتی ہیں تو مرد یہ غور کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ اب ہم کیا پہنیں اور کیونکر اس فرق کو قائم رکھیں جو عورت اور مرد کے درمیان ہونا چاہیئے ۔

(۵)

متعدّی امراض سے احتیاط برتنا اور اپنے کو بچائے رکھنا بے حد ضروری ہے اور اس احتیاط کے ہم خود قائل ہیں مگر روشن خیال اہلِ برطانیہ کی طرح نہیں جو اس وہم میں مبتلا ہیں کہ پاکستان والے بذریعہ ڈاک ان کو چیچک ارسال کرتے ہیں ہمہ تن مصروف ہیں اور اس کو نہایت خود غرضی سمجھتے ہیں کہ اکیلے اکیلے چیچک کے مزے خود ہی لوٹیں اور دُور افتادہ اہلِ برطانیہ کو اس سے محروم رہنے دیں۔ چنانچہ ان برطانوی عقلمندوں کا خیال یہ ہے کہ یہ پاکستان والے نہ صرف تحفہ کے طور پر ان کے لیے چیچک لے کر جاتے ہیں بلکہ خطوط تک میں چیچک کے جراثیم بھر بھر کر بھیجے جا رہے ہیں لہٰذا وہاں کے اکثر عقلمند یہ کہتے پھرتے ہیں کہ ؎

خط میں لکھے ہوئے چیچک کے پیام آتے ہیں
کس قیامت کے یہ نامے مرے نام آتے ہیں

لندن وغیرہ میں کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ جہاں کوئی پاکستانی راستہ میں نظر آیا اور بھاگے یہ انگریز سر پہ پیر رکھ کر چلاتے ہوئے کہ ؎

آیا آیا پاکستانی بھاگیں سارے لوگ
اُوپر اُوپر اچھا خاصہ اندر چیچک روگ

ریڈیو اور ٹیلی ویژن والے اور بھی اس وہم کو ہوا دے رہے ہیں چنانچہ ابھی پچھلے دنوں ایک ڈاکٹر صاحب ٹیلی ویژن پر عوام کو بتا رہے تھے کہ چیچک کے جراثیم خطوط، اخبارات اور کپڑوں کے ذریعے منتقل ہو سکتے ہیں اس خبر کو وہاں کا ایک اخبار ایوننگ نیوز بھی لے اُڑا۔ نتیجہ یہ کہ ڈاکخانوں کے ملازمین نے پاکستانی ڈاک کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا اور پوسٹ مینوں نے صاف کہہ دیا کہ صاحب جان ہے تو جہان ہے ہم یہ پاکستانی چیچک میں مبتلا ڈاک تو ہرگز تقسیم نہ کریں گے ان خطوط میں محبت نامے نہیں چیچک نامے بھرے ہوئے ہیں ان پاکستانی اخبارات میں خبریں نہیں چیچک بھیجی ہوئی ہے اور چونکہ یہ خطوط اور پاکستانی اخبارات

بغیر ٹیکہ لگوائے آ گئے ہیں لہٰذا ہم تو ان کے قریب بھی نہ جائیں گے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستانی ڈاک تقسیم نہ ہو سکی اور اس کے ڈاک خانوں میں ڈھیر لگتے رہے۔

اب لندن کے جی۔ پی۔ او نے اعلان کیا ہے کہ پاکستانی ڈاک کی تقسیم شروع کر دی گئی ہے اس لیے کہ اس کا طبی معائنہ ہو چکا ہے اور چونکہ اس میں چیچک کے جراثیم نہیں ملے لہٰذا اس پرہیز کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ یہ برطانوی افراد دراصل چاہتے یہ ہیں کہ ہر پاکستانی خط یا اخبار کے ساتھ اس کے متعلق ایک طبی سرٹیفکیٹ بھی آنا چاہیئے کہ اس خط یا اس اخبار کا باقاعدہ طبی معائنہ کیا جا چکا ہے اور اس بات کی تصدیق کی جاتی ہے کہ یہ خط یا یہ اخبار چیچک میں ہرگز مبتلا نہیں ہے احتیاطاً اس خط یا اس اخبار کے چیچک کا ٹیکہ بھی لگوا دیا گیا ہے اور اس کے اندر بھی ایک ٹیکہ ملفوف ہے تاکہ اس خط یا اخبار کو وصول کرنے والا پہلے یہ ٹیکہ اپنے لگا لے اس کے بعد خط یا اخبار پڑھے اور ہر خط یا اخبار کے لفافہ پر یہ بھی لکھا ہونا چاہیئے کہ ؎

نامہ کو کھولیے گا ذرا دیکھ بھال کے
چیچک کا ٹیکہ رکھا ہے اس میں سنبھال کے

کراچی میں چیچک کے پھیلتے ہی برطانیہ میں پاکستانیوں سے ایسی نفرت پھیلی ہے کہ وہ بے چارے سخت پریشان ہیں کہ کریں تو کیا کریں۔ وہاں کے عام ہوٹلوں میں ان کو گھسنے نہیں دیا جاتا ہے۔ ریسٹورانوں کے مالکوں نے پاکستانیوں کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا ہے انگریز دوستوں تک نے ان سے ہاتھ ملانا چھوڑ دیا ہے اور اس کے قائل ہو گئے ہیں کہ ان پاکستانیوں سے صاحب سلامت دور کی اچھی۔ بسوں میں ان کو جگہ نہیں دی جاتی۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی ان کو ٹیکسی میں بٹھانے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ اب وہ لاکھ کہیں کہ بھائی ہمارا چیچک سے جائز یا ناجائز کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم تازہ ولایت بھی نہیں مدت سے یہاں رہ رہے ہیں۔ مگر ان کو جواب یہی دیا جاتا ہے کہ تم کو خود چیچک نہ سہی مگر تم دوسروں کو چیچک میں ضرور مبتلا کر دو گے۔ تم چیچک خود نہیں لاتے مگر تم کو تمہارے عزیز پاکستان سے ہمارے لیے چیچک بھیج دیتے ہیں۔ لہٰذا بحیثیت پاکستانی کے تمہارا کوئی اعتبار نہیں۔ کہ تم کب ہمارے لیے چیچک آگیں بن جاؤ۔ اس چیچک نے برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں کی چیچک ایسی الجھائی ہے جو کسی طرح سلجھائے نہیں سلجھتی۔

چیچک کے ٹیکے تو مدت ہوئی ایجاد ہو چکے ہیں مگر وہم کے ٹیکے چونکہ اب تک ایجاد نہیں ہوئے ہیں لہٰذا برطانیہ میں چیچک کے بجائے وہم کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ وہم کا علاج تو بیچارے لقمان کے پاس بھی نہ تھا چنانچہ یہ وہمی برطانوی آج کل عجیب و غریب حرکتیں کر رہے ہیں کہ پاکستان سے جو خطوط اور اخبارات جاتے ہیں ان کو اصل پتہ پر پہنچانے سے پہلے اسپتال میں داخل کر دیا جاتا ہے اور بستر علالت پر لٹا دیا جاتا ہے اس کے بعد ان کا ایکسرے وغیرہ ہوتا ہے۔ ان کے خون کا معائنہ کیا جاتا ہے ان کو دو ایک دن اسپتال میں رکھ کر دیکھا جاتا ہے کہ ان کے چیچک تو نہیں نکلتی اس کے بعد اگر وہ صحت یاب ثابت ہوتے ہیں تو اسپتال سے نکال کر ان کو پوسٹ مین کے حوالے کر دیا جاتا ہے ورنہ وہ چیچک میں مبتلا ہو کر ردی کی ٹوکری میں دفن ہو جاتے ہیں یا ڈیڈ لیٹر آفس کے قبرستان میں ان کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کر دیا جاتا ہے۔

اس قسم کے توہم پرستوں کی ہمارے یہاں بھی کوئی کمی نہیں ہے نہ جانے کتنے لوگ ایسے ہیں جو احباب سے ہاتھ ملا کر آستین چڑھاتے

ہوئے گھر میں داخل ہوتے ہیں اور جب تک صابن لگا کر ہاتھ نہ دھو لیں ان کو چین نہیں آتا۔ ایک بزرگ محترم کا یہ وہم ان کی بے ساختگی بن چکا تھا کہ جہاں ان کے سامنے کسی کو چھینک آ گئی وہ اس طرح ہائے کہہ کر گر جاتے تھے کہ گویا ان کو گولی مار دی گئی ہے اور ان کو پورا یقین ہو جاتا تھا کہ اب ان کا جانبر ہونا مشکل ہے۔ وہ ضرور فلو میں مبتلا ہوں گے۔ اور یہ فلو ضرور جان لیوا ثابت ہوگا یہاں تک کہ جب ان کی ایک عزیزہ کا فلو میں انتقال ہوا تو انھوں نے میت کو کندھا تک نہ دیا کہ مرنے والی تو بے شک مر گئی ہے مگر ممکن ہے کہ اس کے جراثیم زندہ ہوں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ احتیاط نہ کرنا چاہیئے مگر اب ایسی بھی کیا احتیاط کہ احتیاط اور مسخرے پن میں کوئی فرق ہی باقی نہ رہے۔

(۶)

اندازہ یہ ہوا ہے کہ انگریز بہادر ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم وغیرہ سے بھی اتنا نہیں ڈرتے جتنی ان کی روح چیچک سے فنا ہوتی ہے چنانچہ آج کل برطانیہ میں کیفیت یہ ہے کہ جہاں ان کو کوئی پاکستانی یا بھارتی نظر آیا وہ جوتے چھوڑ سر پہ پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں کہ یہ شخص قریب آیا اور وہ چیچک میں مبتلا ہو جائیں گے۔ برطانیہ میں رہنے والے پاکستانیوں کو سخت پریشانی ہے کہ وہ آخر ان انگریزوں کو کس طرح یقین دلائیں کہ ہم ٹیکہ لگوا چکے ہیں جب تک وہ اپنا بازو کھولیں تب تک یہ لوگ ہرن ہو جاتے ہیں پہلے تو ان کا ارادہ ہوا کہ اپنے ٹیکے کو نمایاں کرنے کے لیے وہ اپنے بازو کے بجائے پیشانی پر ٹیکہ لگوانا شروع کر دیں تاکہ ان کی صورت دیکھنے والے اس ٹیکہ کو بھی پہلی ہی نظر میں دیکھ کر مطمئن ہو جایا کریں مگر اپنے چہرے کو مستقلاً داغدار بنانا اور کلنک کے ٹیکہ کی طرح پیشانی پہ چیچک کا ٹیکہ لگوانا جب ان کی سمجھ میں نہ آ سکا تو اب انھوں نے یہ ترکیب کی ہے کہ اپنے خلاف اس نفرت اور بدگمانی کو دور کرنے کے لیے وہ ٹیکہ لگوا کر اپنے کالروں پہ ایک بلّا آویزاں کر لیتے ہیں جس پہ لکھا ہوتا ہے کہ "مجھے ٹیکہ لگ چکا ہے" یہ بلّے لنکا شائر کامن ویلتھ سوسائٹی نے تیار کرائے ہیں جن کی سبز زمین پہ پاکستان کا ہلال اور لنکا شائر کا سرخ گلاب بنا ہوا ہے اور یہ عبارت لکھی ہوئی ہے کہ "مجھے ٹیکہ لگ چکا ہے" دیکھنا یہ ہے کہ ان بلّوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔

برطانیہ تو برطانیہ انگریز جہاں کہیں بھی ہیں پاکستانیوں کو چیچک کے جراثیم سمجھ سمجھ کر ان سے بھاگتے نظر آ رہے ہیں مثلاً ایم سی سی کی جو ٹیم پاکستان کا دورہ کر رہی ہے اس کے کھلاڑی اب اس خیال سے لرزہ براندام نظر آتے ہیں کہ اب ان کو کراچی بھی پہنچنا ہے جو چیچک کا مرکز ہے حالانکہ اب کراچی میں چیچک پر قابو حاصل کیا جا چکا ہے اور اس کا بھی انتظام کر دیا گیا ہے کہ ڈھاکہ سے یہ کھلاڑی چیچک کے ٹیکے لگوا کر مغربی پاکستان بھیجے جائیں گے مگر وہ اس کے باوجود مطمئن نہیں ہیں اور طرح طرح کی شرطیں ان کی طرف سے پیش کی جا رہی ہیں کہ ہم کراچی کی آبادی سے دور کسی جگہ قیام کریں گے۔ ہم وہاں کسی سے ہاتھ نہ ملائیں گے ہمارے پاس وہاں کوئی آٹوگراف لینے اور چیچک دینے نہ آئے ہم کو کراچی کے عوام اپنے نرغہ میں لینے کی کوشش نہ کریں ہم نہ ان کی آٹوگراف بکس کو ہاتھ لگائیں گے نہ اس بات کے دستخط دیں گے کہ ہم نے چیچک وصول پائی۔ لہٰذا ان کے لیے اسی قسم کے انتظامات کیئے جاتے ہیں کہ ان کو آبادی واقع ہوٹلوں میں ٹھہرانے کے بجائے ہوائی اڈے کے باہر ہی ایک ہوٹل میں ٹھہرایا جائے گا۔ اس بات کی بھی احتیاط برتی جائے گی کہ ان سے آٹوگراف لینے کوئی ان کے قریب نہ آئے اور ان کو "چھوئی موئی" سمجھ کر سب ان سے دور

ہی دُور رہیں اور اپنا حصہ دور کا جلوہ سمجھیں۔

کراچی سے یہ ایم سی سی والے اس قدر ڈرے ہوئے ہیں کہ غالباً کراچی کے ٹسٹ میچ میں ان کے کھیل کی نوعیت بھی ذرا مختلف ہی ہوگی مثلاً پاکستانی کھلاڑیوں کا کیچ لیتے ہیں وہ احتیاط برتیں گے کہ اس گیند کو پاکستانی کھلاڑی کے بلّے نے اچھالا ہے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ اس بیٹ میں چپکے ہوئے چیچک کے جراثیم اس گیند سے بھی چپک گئے ہوں لہٰذا اس گیند کا کیچ لینا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ بعض بہت ہی محتاط قسم کے کھلاڑی پاکستانی بولروں کے گیند اپنے بیٹ سے چھوانا بھی نامناسب سمجھیں گے اس لیے کہ ممکن ہے کہ اس گیند کے ساتھ انھوں نے چیچک کے جراثیم چھینکے ہوں لہٰذا بیٹ لگے یا نہ لگے احتیاط ضروری چیز ہے جان ہے تو جہان ہے۔ معلوم نہیں ان لوگوں کی طرف سے یہ مطالبہ کیوں نہیں کیا گیا کہ اس میچ میں استعمال ہونے والے تمام گیندوں اور بیٹوں وغیرہ کے بھی چیچک کے ٹیکے لگوا دیئے جائیں تاکہ وہ بے خوف و خطر ان سے کھیل سکیں اور معلوم نہیں ان لوگوں نے یہ شرط کیوں نہ پیش کی کہ صرف آبادی سے دُور ٹھہرنا ہی نہیں چاہتے بلکہ یہ میچ بھی آبادی سے اتنی دُور کھیلنا چاہتے ہیں جہاں کراچی کی آبادی پہنچ ہی نہ سکے۔ اس کی آسان ترکیب یہ تھی کہ ڈھاکہ ہی میں وہ کراچی ٹیسٹ بھی کھیل لیتے اور قصہ ختم کرتے۔

انگریزوں نے چیچک سے اس بُری طرح ڈر کر اس پُرآشوب دَور میں اپنے حریفوں پر یہ راز کھول دیا ہے کہ وہ دراصل ڈرتے کس چیز سے ہیں اور جس کے خوف سے ان کے دیوتا کوچ کر جاتے ہیں۔ وہ کیا چیز ہے لہٰذا اب ان کے لیے تو صرف اتنا کافی ہے کہ بجائے اس کے کہ ان کے دشمن ان پر ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم وغیرہ ضائع کریں چند ہانڈیوں میں چیچک کے جراثیم بھر کر ان پر گرا دیئے جائیں۔ وہ بھاگ کھڑے ہوں گے اور پھر اس طرف کا رُخ ہی نہ کریں گے۔ ان پر حملہ آور ہونے کے لیے پوری فوج بھیجنے کی بھی ضرورت نہیں۔ چیچک میں مبتلا چند مریض پیراشوٹ سے ان کی قلمرو میں اُتار دیئے جائیں۔ وہ ایسا میدان چھوڑ کر بھاگیں گے اور ایسے غائب ہوں گے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ میدان سے ان کے قدم اُکھاڑنے کے لیے ایسا حربہ تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا کیا عجب ہے کہ اب روس کی اسلحہ ساز فیکٹریوں میں ان کے لیے ایٹم بم اور میگاٹن بم وغیرہ بنانے کے بجائے چیچک بم بنانا شروع کر دیئے جائیں۔ اور ان تیاریوں ہی سے وہ لرزہ براندام نظر آنے لگیں۔

بعض حلقوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اہلِ برطانیہ چیچک سے اتنا ڈرتے نہیں ہیں جتنا وہ ظاہر کر رہے ہیں۔ کہ وہ اس بہانا تارکینِ وطن کا بل منظور کرانا چاہتے ہیں۔ تاکہ نہ صرف پاکستانیوں سے بلکہ دولتِ مشترکہ کی تمام سیاہ فام اقوام سے ان کو نجات مل جائے۔ مگر اس مقصد کے لیے جس طرح ساری قوم کو ڈرایا جا رہا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس ساری قوم میں چیچک سے انتہائی خوف موجود ہے لہٰذا اس خوف سے برطانیہ کے حریف یقیناً فائدہ اُٹھائیں گے اور اس پر بجائے اس کے کہ خود حملہ کریں یہ چیچک سے حملہ کرائیں گے۔ اہلِ برطانیہ کو چاہیئے تھا کہ وہ اپنے شیر کو چیچک کے سامنے بھیڑ نہ بننے دیتے۔ اگر یہ خوف تھا بھی تو اس کو اپنے حریفوں سے چھپائے رکھتے۔ اور اپنے ہاتھوں یہ حربہ اپنے دشمنوں کو نہ دیتے۔ اب تو اس کا راز افشا ہونا بڑے سے بڑے جنگی راز کے افشا ہو جانے سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اور اس کمزوری کے کھل جانے سے فائدہ اُٹھانے والے یقیناً فائدہ اُٹھائیں گے۔

چیچک سے ان صاحب بہادروں کا یہ عالم ہے کہ خود ایم سی سی کے پاکستان آئے ہوئے کھلاڑیوں تک کو یہ شکایت ہے

کہ وہ جو خطوط اپنے احباب و اعزہ کو بھیج رہے ہیں وہ اُن تک نہیں پہنچتے اس لیے کہ وہ خطوط لاکھ انگریزوں ہی کے لکھے ہوئے انگریزوں ہی کے نام ہوتے ہیں مگر چونکہ پاکستان سے جاتے ہیں لہذا ان کو پہلے طبی معائنہ کے لیے اسپتالوں میں داخل کر دیا جاتا ہے کہ کہیں پاکستان سے آئے ہوئے یہ خطوط بھی چیچک میں مبتلا تو نہیں ہیں۔ برطانوی پوسٹ مین ان کو چھونے سے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ اور جب تک ان میں سے ہر خط کو صحت کا سرٹیفکیٹ نہ دے دیا جائے وہ اس کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ ابھی تو یہ صرف خطوں ہی کا قصہ ہے مزہ تو اس وقت آئے گا جب یہ ایم سی سی ٹیم پاکستان سے اپنے وطن واپس پہنچے گی اور وہاں ان کھلاڑیوں کے احباب و اعزہ یہی کہیں گے دوستی اور قرابت دوسری چیز ہے لیکن پہلے اسپتال تشریف لے جائیے۔ اس کے بعد گھر کے دروازے آپ پر کھل سکتے ہیں۔ اس لیے کہ آپ کا بھی کوئی اعتبار نہیں کہ تحفہ کے طور پر چیچک لیتے آئے ہوں یہ

(۷)

بھارت کے جوتشیوں نے جب سے یہ بیہودہ حساب لگایا ہے کہ ۴ فروری کو جبکہ آٹھ ستارے ایک ہی برج میں جمع ہو جائیں گے ساری دُنیا تہہ و بالا ہو جائے گی بھارت کے توہم پرست جو ان جوتشیوں پر اعتقاد رکھتے ہیں سخت بدحواس ہیں کہ۔ ع

جائیں تو جائیں کہاں

وہ تو کہتے ہیں کہ ان جوتشیوں نے یہ بتایا ہے کہ صرف بنارس ایک ایسا مقام ہے جو ان تباہیوں سے بچ جائے گا لہذا اب جس کو دیکھیے وہ منہ اٹھائے بنارس کی طرف چلا آ رہا ہے چنانچہ اب بنارس کا یہ حال ہے کہ وہاں نہ کسی ہوٹل میں تل دھرنے کی جگہ باقی رہی ہے نہ کوئی مکان کرایہ پر ملتا ہے نہ کسی سرائے میں کسی کی سمائی ممکن ہے۔ یعنی اور کہیں یہ قیامت آئے یا نہ آئے بنارس میں تو میدانِ حشر کا سا منظر ابھی سے شروع ہو گیا ہے اور اندازہ یہ ہے کہ بنارس آنے والے چاہے اس قیامت سے بچ جائیں مگر خود بنارس کا بچنا مشکل ہے۔

بنارس کے علاوہ ان لال بجھکڑ جوتشیوں میں سے بعض کی ''پوتھی'' یہ بتاتی ہے کہ بھارت کے دوسرے چند مقامات بھی بچ جائیں گے خصوصاً وہ تمام مقامات بچ جائیں گے جو تیرتھ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہاں اوّل تو لوگ مریں گے کم اور اگر مر بھی گئے تو ان کو نروان حاصل ہو جائے گا۔ ان جوتشیوں نے بتایا ہے کہ بھارت بھی اس تباہی کے نرغے میں آ ہی جاتا اگر اس کا نام انڈیا کے بجائے بھارت نہ رکھ دیا جاتا بلکہ اب بھی بھارت کے صرف وہی لوگ بچیں گے جو اس کو انڈیا نہیں کہتے۔ رہ گئے وہ لوگ جو اب بھی مارے انگریزیت کے اس کو انڈیا ہی کہتے اور سمجھتے ہیں ان کو تو چاہیے کہ وہ اپنا کہا سنا معاف کرا لیں اور اپنے کریا کرم کا بندوبست کر رکھیں اس لیے کہ ان کے بچنے کی کوئی صورت نہیں اور وہ سب کے سب ۴ فروری کو ''رام نام ست'' ہے کہ مستحق بن کر رہ جائیں گے اور سارا ملک ایک عظیم الشان مرگھٹ بن کر رہ جائے گا۔

اس توہم پرستی میں صرف ہندو جہلا ہی مبتلا نہیں ہیں بلکہ بڑے بڑے پڑھے لکھے اس جہالت کے فارغ التحصیل ثابت ہو رہے ہیں مثلاً اتر پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنانند جن کو لوگ پڑھا لکھا آدمی سمجھتے تھے باوجود صورت سے پڑھے لکھے نظر آنے کے بعض معتبر لوگوں کا بیان یہ ہے کہ وہ اتنے جاہل بھی نہیں ہیں جتنے صورت سے نظر آتے ہیں اپنی جہالت اور

توہم پرستی کا یہ ثبوت دے رہے ہیں کہ وہ بھی ۴ر فروری کو نہایت خطرناک دن قرار دے رہے ہیں۔ ان کو بھی جوتش میں بڑا دخل ہے اور ان کا بیان یہ ہے کہ میں نے متعدد نامی گرامی اور قابلِ اعتماد جوتشیوں سے تبادلۂ خیال کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ۴ر فروری کو دنیا قطعی طور پر تو ختم نہ ہوگی لیکن زبردست قسم کے زلزلے آئیں گے۔ طوفان برپا ہوں گے اور سیاسی اکھاڑ پچھاڑ ہوگی لیکن ۱۹۶۲ء میں عالمی جنگ کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

بھارت کے یہ جوتشی جن میں سمپورنانند قسم کے لوگ بھی شامل ہیں عوام کو خوف زدہ اور ہراساں کرتے پھر رہے ہیں اور پنڈت نہرو لوگوں کو سمجھاتے پھر رہے ہیں کہ یہ سب لغو باتیں ہیں یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے اس میں سے کچھ بھی نہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ پنڈت نہرو بھی بحیثیت پنڈت ہونے کے دل ہی دل میں ۴ر فروری سے خائف ہوں مگر وہ آدمی ہیں چالاک لہٰذا انھوں نے یہ سمجھ کر یہ کہہ دیا ہے کہ یہ تمام پیش گوئیاں غلط ہیں اور جوتشیوں کا یہ سارا حساب مہمل ہے کہ اگر واقعی کچھ نہ ہوا اور ۴ر فروری خیریت سے گزر گئی تو عوام ان کے قائل ہو جائیں گے۔ اور اگر جوتشیوں کا بیان درست ہے اور یہ تمام آفتیں آنے والی ہیں جن کی طرف جوتشی اشارہ کر رہے ہیں تو پنڈت نہرو کو جھٹلانے کا کسی کو کیا ہوش ہو سکتا ہے سب اپنے اپنے عذاب میں مبتلا ہوں گے اور بجائے پنڈت نہرو کو جھوٹا کہنے کے جوتشیوں کے پیچ میں مبتلا ہو کر مرنے کھپنے میں مصروف ہوں گے لہٰذا پنڈت نہرو نے ایسی بات کہہ دی ہے کہ اگر خیریت رہی تو وہ پوجے جائیں گے۔ اور اگر خیریت نہ رہی تو موت ان کی شرم رکھ لے گی۔

۴۹۷۶
ان جوتشیوں نے بتایا ہے کہ اب سے چار ہزار نو سو چھہتر برس قبل آٹھ ستارے ایک ہی برج میں جمع ہو گئے تھے تو دنیا میں کلجگ کا آغاز ہو گیا تھا۔ اور مہابھارت جیسی خوفناک جنگ کا آغاز ہو گیا تھا مہابھارت کی تاریخ کے طالب علموں کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ "گریٹ وار" قسم کی کوئی چیز نہ تھی۔ دو خاندانوں کی ذرا سی جھڑپ تھی جس میں دونوں طرف سے کچھ تیر وغیرہ چلے تھے۔ اگر یہ ایسی ہی ہولناک جنگ ہوتی اور چار ہزار نو سو چھہتر برس پہلے واقعی قیامت برپا ہوئی ہوتی۔ تو آج اس نئی قیامت کی پیش گوئی کرنے والے موجود نہ ہوتے۔ ان کی ساری نسل اسی وقت ختم ہو گئی ہوتی اور ان کو تباہ کرنے کے لیے اب ان آٹھ سیاروں کو ایک ہی برج میں آنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑتی۔

بھارت میں در اصل کشمکش یہ جاری ہے کہ عام انتخابات کے پیشِ نظر کانگریس ایسی شورشیں برپا کر رہی ہے۔ کہ بھارتی عوام اس کی دیرینہ کوتاہیوں اور نااہلیوں کے بجائے اس شورش کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اور وہ اس طرح عوام کی توجہ ہٹا کر الیکشن کی بازی جیت لے، معلوم یہ ہوتا ہے کہ مخالف پارٹیوں نے کانگریس کی اس ترکیب کا توڑ یہ سوچا ہے کہ عوام کی توجہ ان شورشوں سے ہٹا کر ۴ر فروری والی قیامت کی طرف مبذول کر دیں اور ۴ر فروری گزر جانے کے بعد یہ کہہ دیں کہ فروری غلط کہا گیا تھا یہ تاریخ دراصل ۴ر مارچ ہے اور جب مارچ بھی "کوئک مارچ" ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس کے بعد اپریل اور مئی وغیرہ بھی آتی ہے۔

تو دیکھ لیجیے گا کہ جب فروری کو کچھ نہ ہوگا تو یہ جوتشی اور یہ سمپورنانند سب یہی کہیں گے۔ کہ یہ آفت تو آ ہی گئی تھی مگر ہم نے پوجا پاٹ اور گیان دھیان سے اسے ٹال دیا ہے لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ اس پوجا پاٹ اور گیان دھیان کا سلسلہ جاری رکھیں۔ ورنہ اگر اس سے ذرا بھی غافل ہوئے تو ایک ہی برج میں بیٹھے ہوئے یہ آٹھ ستارے قیامت ڈھا دیں گے۔ معلوم ہوتا ہے

کہ ۲۵ر جنوری کو وہاں ایک عظیم الشان یگیہ بھی شروع ہوا ہے جس کا افتتاح بنارس کے سابق مہاراجہ نے کیا ہے لہٰذا اگر ۴ر فروری خیریت سے گزر گئی تو اس کو اس یگیہ ہی کی کرامت کہا جائے گا۔ مختصر یہ کہ اس سارے جہل اور اس تمام توہم پرستی کو جہل اور توہم پرستی کسی طرح تسلیم نہ کیا جائے گا۔

(۸)

اس خبر سے ہمارے رندانِ بادہ نوش کا سارا نشہ ہرن ہو گیا ہے کہ حکومت مغربی پاکستان مکمل طور پر شراب نوشی اور افیون خوری پر پابندی عائد کرنے کے سوال پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے اور صوبہ بھر میں تمام جاری شدہ پرمٹوں کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے گا۔ اس لیے کہ اب صرف ان ہی لوگوں کو پرمٹ دیئے جائیں گے جن کو واقعی طبی طور پر شراب نوشی کی ضرورت ہے باقی جتنے لوگ شوقیہ طور پر یہ شغل فرماتے ہیں اور محض غم غلط کرنے اور آپے سے باہر ہونے کے لیے شراب پیتے ہیں ان سے کہا جائے گا کہ وہ بھلے مانس بننے کی کوشش کریں بجائے شراب کے دودھ پیا کریں۔ شراب خور کے بجائے اپنے کو شیر خوار بنائیں تاکہ ان کو معصوم سمجھا جا سکے لیکن اگر وہ دودھ پیتے بچے بننا نہیں چاہتے تو بھی ان کے پینے کے لیے بہت سی چیزیں ہیں کوکا کولا پئیں۔ لیمن اسکوئیش پئیں۔ گنے کا رس پئیں۔ کافی پئیں۔ رہ گئی شراب اس کو اب مشروب کی نہیں صرف دوا کی حیثیت ہی حاصل ہوگی اور ڈاکٹر جس کو نسخہ میں شراب لکھے گا وہی بیمار شراب پی سکے گا۔

اس پابندی کے عائد ہونے کے بعد ہمارے رندانِ بادہ نوش اپنی تندرستی اس مرض پر قربان کرتے نظر آنے لگیں گے جس کی دوا شراب ہو وہ ان بیماروں کو رشک سے دیکھیں گے جن کو وہ مبارک مرض ہو جو ڈاکٹر سے نسخہ میں شراب لکھوا سکے اور اس کے بعد وہ ڈاکٹروں کے پاس محض یہ دریافت کرنے جایا کریں گے کہ وہ کیا تدابیر ہیں جن پر عمل کر کے ہم اس بیماری میں اپنے کو مبتلا کر لیں جس کے علاج کے طور پر ہم کو شراب کا پرمٹ حاصل ہو سکے۔ ڈاکٹروں سے اس سلسلہ میں دوستیاں پیدا کی جائیں گی سفارشیں پہنچوائی جائیں گی کہ کسی طرح ان محترم کو وہ بیماری پیدا کر دیں جو ان کو شراب کا حقدار بنا دے۔ اب تک ڈاکٹر کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ بیماریوں سے مریض کو نجات دلائے مگر اب ڈاکٹروں سے ایسی بیماریاں پیدا کرنے کی فرمائش ہوگی جن میں مبتلا ہو کر شراب پینے کی اجازت مل سکے۔ ڈاکٹر تو ڈاکٹر اب تو وہ مریض بھی بے حد ہر دلعزیز بن جائیں گے جن کے پاس شراب کے پرمٹ ہوں گے تاکہ ان سے مراسم بڑھا کر اس کا موقع مل جائے کہ ان کے شریکِ جام ہو سکیں اور یہ شغل جاری رہ سکے۔ ان سے اس قسم کے معاملات طے ہوا کریں گے کہ پرمٹ تمہارا پیسے ہمارے۔ مرض تمہارا علاج ہمارا۔ بیمار تم بنو۔ دوا ہم پئیں اور فائدہ دونوں کو پہنچے یعنی تم کو مفت کی شراب ہم کو بے مرض کے دوا۔

پرمٹ تو خیر اب بھی رائج ہیں مگر جب ان کی از سرِ نو جانچ پڑتال ہوگی تو بہت سے عقدے کھلیں گے اور بہت سے پرمٹ بند ہوں گے اس لیے کہ آج کل تو حال یہ ہے کہ کسی کے پاس اثر و رسوخ کے تحت پرمٹ موجود ہے تو کسی نے بصرفِ کثیر پرمٹ حاصل کر رکھا ہے۔ کسی کے پرمٹ کرایہ پر چلتے ہیں تو کسی کے پرمٹ ادھر ادھر مہمان جاتے رہتے ہیں اور ہر پینے والے نے کسی نہ کسی طرح پرمٹ حاصل کر رکھا ہے اور سب خوش ہیں کہ ان کو اتنی شراب حاصل ہے کہ مچھلی کی طرح اس میں اپنے کو تیرتا ہوا

محسوس کرتے ہیں لیکن اب ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے کا زمانہ بھی آ رہا ہے اس لیے کہ جب ان جاری شدہ پرمٹوں کی از سرِ نو پڑتال ہوگی اور یہ منسوخ کیے جائیں گے تو ان سیراب ہونے والوں کا ایسی خشک سالی سے واسطہ پڑے گا کہ بس انگڑائیاں لیتے ہوئے نظر آئیں گے اور یہی کہتے رہ جائیں گے کہ ؎

اُف یہ ساقی تیری بے پروائیاں
کس طرح دیکھی گئیں انگڑائیاں

شراب تو شراب اگر واقعی افیون پر بھی پابندی عائد کی گئی تو تین مہینہ میں ڈھیر سے افیون کھا جانے والے تو بے موت ہی مر جائیں گے ذرا ان "اہلِ پینک" کے دل سے پوچھئے کہ افیون ان کے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے ان کی اصل دُنیا یہ کرۂ ارض نہیں بلکہ افیون کی وہ چھوٹی سی سیاہ گولی ہے جس کے بغیر وہ اس دُنیا کو تاریک سمجھتے ہیں۔ ان کا دل تو یہ چاہتا ہے کہ یہ گول دُنیا اپنی ان ہی وسعتوں کے ساتھ افیون کا گولا ہوتی جس میں میٹھی چائے کے سمندر اور دریا ہوتے بالائی کے جزیرے ہوتے۔ جا بجا کھیر کی دلدل ہوتی حلووں کے پہاڑ ہوتے۔ حلوہ سوہن کی چٹانیں ہوتیں لڈو پیڑوں کے کنکر پتھر ہوتے اور ساری آبادی گھٹنوں میں سر دیئے ایک عالمِ بے خودی میں دُنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھی نظر آتی۔ ان کا قول تو یہ ہے کہ اگر ہماری یہ مطلوبہ دُنیا میسر آجاتی تو ہر طرف امن ہی امن ہوتا نہ یہ اہلِ پینک جنگجو ہوتے نہ کسی قسم کے جدال و قتال کی کبھی نوبت آتی اور کبھی جنگ چھڑ بھی جاتی تو ایٹم بموں وغیرہ کی نوبت نہ آتی ایک دوسرے پر رس گلے مارتے اور گلاب جامنیں چلاتے نظر آتے۔

ان افیونیوں کا خیال یہ ہے کہ دُنیا میں سارا ہنگامہ وہی لوگ برپا کیے ہوئے ہیں اور امن سوزی کی ذمہ داری ان ہی پر عائد ہوتی ہے جو افیون سے شغل نہیں کرتے اگر یہ سب کے سب افیون نوش فرماتے ہوتے تو وہ ان خرافات میں کبھی نہ پڑتے سب ایک دوسرے سے بے خبر اپنی اپنی پینک میں مبتلا رہتے اور وہی کیفیت ہوتی جو ان دو افیونیوں کی ہوئی تھی جو ایک کنوئیں کی جگت پر بیٹھے افیون پی رہے تھے اور آخر پینک میں آکر ان میں سے ایک محترم کنوئیں میں جا گرے۔ کنوئیں میں گرنے کے بعد جب ان کا نشہ ہرن ہوا تو انھوں نے اپنے ساتھی کو آواز دی کہ "بھائی خدا بخش بچاؤ" اور جب بھائی خدا بخش نے کنوئیں میں جھانک کر ان کو دیکھا تو بڑے اطمینان سے کہا کہ اچھا تو گویا آپ وہاں تشریف رکھتے ہیں یہاں ہم تو یہ کہتے ہیں کہ جہاں رہو خوش رہو" اس قسم کے لوگ کسی دوسرے کے معاملے میں بھلا کیسے پڑ سکتے ہیں اس عالم میں اگر ہوتے تو مسٹر خروشیف بھی بجائے دھمکیاں دینے کے مسٹر کینیڈی سے یہی کہتے کہ "جہاں رہو خوش رہو"

دُنیا میں آج جو ہنگامے برپا ہیں اور عالمگیر جنگ کے جو بادل ہر طرف منڈلاتے نظر آتے ہیں ان کے متعلق ان اہلِ افیون کا خیال یہ ہے کہ یہ سب کچھ محض اس لیے ہو رہا ہے کہ لوگ افیون سے شغل نہیں کرتے اور پینک کے فوائد سے بے بہرہ ہیں ورنہ اگر افیون پر بھروسہ کرتے تو ان واہیات باتوں میں پڑنے کا ان کو ہوش ہی نہ ہوتا ان سارے جھگڑوں بکھیڑوں سے بے نیاز خود فراموشی میں زندگی بسر ہوتی اور بغیر ہوائی جہازوں میں پٹرول پھونکنے کے بیٹھے بٹھلائے فضاؤں میں دن رات اڑتے رہتے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ افیون ان کو بزدل بنا دیتی ہے۔ وہ بزدل ہرگز نہیں ہوتے بلکہ بڑے جرأت مندانہ حوصلے بھی رکھتے ہیں مثلاً جنگِ جرمنی کی جب ان کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے مردانہ وار اپنا جنگی نعرہ بھی بلند کیا تھا جس نے ہٹلر کے چھکے چھڑا دیئے

تھے کہ ؎

ہم لوگ ہیں افیونی اک رنگ جما دیں گے
جرمن تری توپوں میں ہم بانس چلا دیں گے

وہ تو کہیے کہ اس نعرے کے بعد ہی ان کو پینک آ گئی تھی اور وہ اونگھ گئے تھے ورنہ ہیڈ کا تو اس سے بھی زیادہ عبرت انگیز حشر ہوتا جتنا آخر کار ہوا۔ مگر افسوس ہے کہ اب ان کی افیون پر بھی پابندی عائد ہونے والی ہے اور ان کو بھی مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے اپنے گوشۂ امن سے نکل کر اس عالمِ ہوش میں آ جائیں جو سراپا انتشار بنا ہوا ہے۔

(۹)

گورنر مغربی پاکستان ملک امیر محمد خاں نے سرکاری افسروں کو ایک غیر رسمی گفتگو میں کہا کہ "انتظامیہ کی تنظیم نو کے لیے اقدام کیے جا رہے ہیں لیکن سب سے ضروری بات یہ ہے کہ صحیح کام پر صحیح آدمی مقرر کیا جائے" اس معیار پر اگر سرکاری ملازمین کو پرکھا جائے تو عجیب عجیب منصبوں پر عجیب عجیب کارکن نظر آئیں گے۔ مثلاً ماہر ہیں وہ فن طبقات الارض کے اور خدمت سپرد ہے ان کے یہ کہ مرغبانی کو ملک میں فروغ دینے کی کوشش کریں۔ تعلیم حاصل کی ہے انھوں نے بینکنگ کی اور بنے ہوئے ہیں بغل میں سرخ اور سبز جھنڈیاں دبائے اور منہ میں سیٹی لیے ہوئے ریلوے کے گارڈ۔ تربیت حاصل کی ہے انھوں نے محتسب بننے کے لیے اور نوکری کر رہے ہیں ٹریفک پولیس میں۔

اس قسم کا ایک واقعہ آخر کس طرح بھلا دیا جائے کہ حضرت جگر مرادآبادی مرحوم ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے جب لاہور تشریف لائے تو ان سے ایک ڈاکٹر صاحب جو ایم اے۔ پی۔ ایچ ڈی تھے ملنے آ گئے جگر صاحب نے مزاج پرسی وغیرہ کے بعد ان سے کرسی وغیرہ کی بات بھی چھیڑ دی کہ آج کل آپ کس یونیورسٹی میں ہیں تو ان ڈاکٹر صاحب نے سر جھکا کر خاموش رہ جانا ہی مناسب سمجھا مگر جب جگر صاحب نے اپنے سوال کے جواب کے لیے اصرار شروع کر دیا تو آخر بیچارے کو کہنا پڑا کہ میں کسی یونیورسٹی میں پروفیسر یا لیکچرار وغیرہ نہیں ہوں بلکہ محکمۂ آبادکاری میں ملازم ہوں ظاہر ہے کہ اس جواب پر صرف جگر صاحب ہی نہیں بلکہ ان کا ہر ہمنشیں حیران ہو کر اور منہ کھول کر رہ گیا کہ آخر ایک پی ایچ ڈی کا محکمۂ آبادکاری سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ جگر صاحب پہلے تو دیر تک ان ہی ڈاکٹر صاحب کے سر رہے کہ صاحب آپ کیوں ہیں محکمۂ آبادکاری میں اور اپنی بربادکاری کیوں کر رہے ہیں مگر جب وہ سوائے مجبوری کے اور کوئی معقول وجہ نہ بتا سکے تو جگر صاحب نے اس نیازمند کی خبر لینا شروع کر دی کہ یہ کیوں ہیں محکمۂ آبادکاری میں گویا اس بے تکے پن کا ذمہ دار میں ہی تھا آخر مجھ کو حکم دیا کہ گورنر صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری سے میرے لیے وقت لیجیے۔ ابھی ٹیلیفون کیجیے میں ان ڈاکٹر صاحب کو اور آپ کو لے کر وہاں جاؤں گا۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب سردار عبدالرب نشتر پنجاب کے گورنر تھے۔ لہٰذا جگر صاحب ان سے ملے اور یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کیا اور جب تک ان سے وعدہ نہ لے لیا کہ وہ خود اس معاملہ کی طرف متوجہ ہوں گے اس وقت تک وہاں سے ٹلنے کا نام نہیں لیا۔

تقسیم ملک سے قبل دیسی ریاستوں میں تو اس قسم کی باتیں بہت عام تھیں کہ جس کو جس کام پر چاہا لگا دیا چنانچہ ایک واقعہ

مشہور ہے آپ اس کو اگر لطیفہ سمجھنا چاہیں تو ہم آپ کا کیا کر سکتے ہیں بہرحال قصّہ یہ ہوا کہ ایک پیشکار کو جب تبادلہ کا حکم ملا تو وہ اپنے افسر کے قدموں پر گر پڑا کہ حضور خدا کے لیے مجھ کو اس تبادلہ سے بچائیے۔ افسر نے لال پیلی آنکھیں دکھائیں کہ آخر تم تبادلے سے کیوں گھبراتے ہو کیا یہاں رشوت کے امکانات تمہاری نئی جگہ سے زیادہ ہیں تو اس بیچارے نے آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنی بپتا سنائی کہ حضور والا میں سب سے پہلے بحیثیت تھانہ دار کے پولیس میں بھرتی ہوا تھا کچھ دن کے بعد میرا تبادلہ بحیثیت حکیم کے کر دیا گیا مرتا کیا نہ کرتا چلا گیا حکیم بن کر اور اُلٹے سیدھے نسخے لکھتا رہا مگر کچھ دن بعد مجھ کو انجنیئر کے درجہ پر ترقی دے دی گئی حالانکہ انجنیئری تو میں بالکل ہی نہ جانتا تھا مگر ایک سال انجنیئری کرتا رہا اس کے بعد مجھے ایک ایسے ڈاکٹر کی جگہ بھیجدیا گیا جو ایک اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنا دیا گیا تھا۔ اس ڈاکٹری کے بعد میرا تبادلہ بحیثیت پیشکار کے ہوا اور میں آپ کی خدمت میں آ گیا۔ میں نے آج تک اپنے کسی تبادلہ سے انکار نہیں کیا مگر اب کی جو تبادلہ ہوا ہے اس سے مجھ کو بچا لیجیے۔ افسر نے پوچھا کہ جب تم ابتک کسی تبادلہ سے نہیں گھبرائے تو اب کیوں اس قدر پریشان ہو۔ یہ سُنکر وہ بیچارہ موٹے موٹے آنسوؤں سے رونے لگا اور اس نے کہا کہ حضور اب کی مجھے لیڈی ڈاکٹر بنا کر ایک زنانہ اسپتال میں بھیجا جا رہا ہے۔

تقسیم ملک کی گڑبڑ میں مختلف ماہر بھی اسی طرح گڑبڑ ہوئے ہیں اور یہ گڑبڑ آج تک جاری ہے کہ مثلاً کوئی صاحب ہجرت کر کے یہاں آ گئے اور ہر چند کہ وہ نہایت ماہر زردوز تھے مگر بجائے اس کے کہ وہ اپنے اس فن کو یہاں فروغ دیتے ان کو کیمسٹ کی ایک متروکہ دکان پر آسانی سے قبضہ مل گیا تو بیٹھ گئے دوا فروش بن کر۔ کوئی کیمسٹ صاحب بعد میں پہنچے اور انھوں نے دیکھا کہ ایک ریسٹوران خالی پڑا ہے لہٰذا بجائے دوا فروشی کے چائے فروشی شروع کر دی۔ کوئی صاحب نہایت ماہر حجام تھے مگر کوئی ہیئر کٹنگ سیلون تو جلدی میں ان کو مل نہ سکا البتہ ایک دندان ساز کی دکان خالی تھی لہٰذا اسی کو اپنا بیٹھے۔ کوئی مٹھائی کی دکان چھوڑ کر آیا تھا اور یہاں پرنٹنگ پریس کا مالک بن بیٹھا کوئی نان کباب کا دھندا کرتا تھا مگر یہاں کتابوں کی دکان لے بیٹھا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ان لوگوں نے دو فنوں کو بیک وقت نقصان پہنچایا ایک فن وہ جس کو وہ جانتے تھے اور جس کے ماہر تھے اس کو چھوڑ کر اور دوسرا وہ فن جس کو وہ نہیں جانتے مگر اختیار کر لے اب آپ ہی بتائیے کہ ایک حجام سے جو کوئی بھی اپنے دانت لگوانے جائیگا وہ اپنے مسوڑھوں کی حجامت نہ کرائے گا تو کیا کرے گا، یا اگر کوئی شخص کسی دندان ساز سے حجامت کرانے بیٹھ جائے گا۔ تو اس کے بال زنبور سے نہ نوچے جائیں گے۔ تو کس چیز سے نوچے جائیں گے۔

افرادی قوت کے کمیشن نے اپنی رپورٹ تو پیش کر دی ہے مگر معلوم نہیں اس رپورٹ میں اس گوشہ پر بھی روشنی ڈالی ہے یا نہیں کہ اپنے سے غیر متعلق پیشہ اپنائے ہوئے کتنے لوگ ہمارے ملک میں کھا کما رہے ہیں حالانکہ یہ بات اتنی ہی خطرناک ہے کہ کوئی وکیل ڈاکٹری شروع کر کے قبرستان بسانا اور کوئی ڈاکٹر وکالت شروع کر کے جیلیں بھرنا شروع کر دے اگر کوئی تجہیز و تکفین کا دھندا کرنے والا کسی ریستوران کو چلانے بیٹھ جائے تو اس ریستوران میں جانے والوں سے سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ۔ ؎

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی

مختصر یہ کہ سرکاری محکموں میں اس کی جانچ پڑتال بے حد ضروری ہے کہ کس کام پر کون لگا ہوا ہے اور صحیح کام پر صحیح آدمی مقرر بھی ہے یا ہم یوں ہی صحیح نتائج کے اُمیدوار بنے بیٹھے ہیں اگر انتظامیہ کی تنظیم نو کے سلسلہ میں یہ مہم بھی سر کر لی گئی تو یہ بڑا

کام ہوگا۔ خدا کرے ملک امیر محمد خان کی یہ کوشش کامیاب ہو جائے اس لیے کہ جب تک "ہر مرضے و ہر کارے" والی بیل منڈھے نہیں چڑھتی بہتر نتائج کی امید کیونکر کی جاسکتی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ۔ ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند

ہمارے یہاں اہلِ صلاحیت کی کمی نہیں ہے مگر گڑبڑ تو یہی ہے کہ صحیح کام پر غلط آدمی اور غلط کام پر صحیح آدمی اگر لگے ہوئے ہوں تو کام کیونکر بنے۔

(۱۰)

خدا خدا کر کے ہم کو اب اس بات کا خیال پیدا ہوا ہے۔ کہ ہمارے اُردو منہ میں جو انگریزی زبان انگریزہ لگ گئے ہیں یہ کچھ چھری کانٹے سے کھچڑی کھانے والی بات ہے اور اس سے صرف یہی اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز تو چلا گیا مگر انگریزی کو ہم سے چپکا گیا ہے کہ یہ سوتیلی زبان ہمارے لیے خدا جانے کیوں مادری زبان بنی ہوئی ہے کہ ضرورت اور بے ضرورت ہمارے بے شمار افراد انگریزی جھاڑتے نظر آتے ہیں وہ نہ صرف انگریزی جاننے والوں سے انگریزی بولتے ہیں بلکہ جو انگریزی نہیں جانتے ان سے بھی انگریزی ہی بولنا چاہتے ہیں اور بدرجۂ مجبوری اگر ان سے اُردو بولنا پڑتی ہے تو اس تکلّف سے چبا چبا کر اُردو بولتے ہیں گویا لوہے کے چنے چبا رہے ہوں اور سخت تکلیف میں مبتلا ہوں۔ بلکہ ہمارے یہاں ایک طبقہ وہ بھی ہے جو عام طور پر انگریزی نہ جاننے والوں ہی سے انگریزی بولتا ہے اور اگر کوئی انگریزی جاننے والا ان پر نازل ہو جائے تو ان کی انگریزی فوراً ختم ہو جاتی ہے اور بھلے مانسوں کی طرح جھٹ اُردو بولنا شروع کر دیتے ہیں۔

اصولاً اب انگریزی زبان کا صرف یہ مصرف ہونا چاہیئے کہ اگر کسی بیرونی ملک کے کسی مہمان سے تبادلۂ خیال کرنا ہو جو اُردو نہ جانتا ہو اور جس کی زبان آپ نہ جانتے ہوں تو اس قسم کے موقعوں پر اس سے انگریزی بول لیجئے اس لیے کہ اگر ایک جاپانی کی زبان آپ نہیں سمجھ سکتے اور اپنی زبان اس کو نہیں سمجھا سکے تو اس مشکل کا حل انگریزی زبان ہی ہو سکتی ہے لہذا ایک بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے انگریزی پڑھنا ضروری ہے مگر ہم ایسے انگریزی پڑھنے کے قائل نہیں ہو سکتے کہ کوا ہنس کی چال چل کر اپنی چال ہی بھول جائے یعنی انگریزی پڑھتا جائے اور اُردو بھولتا جائے اور جب پڑھ لکھ کر کالج سے گھر آئے تو اپنی بوڑھی ماں سے بھی انگریزی بولے اور نوکروں پر بھی انگریزی ہی جھاڑے اور جب کسی کے پلّے کچھ نہ پڑے تو بھولی بسری اُردو اس طرح ٹٹولنا شروع کر دے کہ :-

"او آئی سی۔ آپ نہیں سمجھا۔ ہم آلو نہیں۔ وہ مانگتا ہے اس کو آپ
کیا بولتا ہے وہ جو مرغی کا بابا لوگ بننے سے پہلے کی چیز ہوتا ہے"

اور اگر ماں نے یہ پہیلی بوجھ کر کہہ دیا کہ :-

"اے بیٹا تم انڈا تو نہیں کہہ رہے ہو"

تو وہ ایک دم اُچھل پڑتے ہیں "ہیر یُو آر۔ انڈا۔ بالکل انڈا ٹھیک ہے اس کو انڈا بولتے ہیں۔ ہم اتنی دیر سے انڈا ہی مانگ

رہا ہے۔

یہ تو خیر انگریزی کے نہایت ہی جاں بلب مریضوں کا ذکر ہے جو اب محض ان اسکولوں اور تعلیمی اداروں سے نکل کر گھر آتے ہیں جن میں ان کو اصل نسل کا انگریز بنانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اگر خدانخواستہ اردو کا سایہ بھی ان پر پڑ گیا تو وہ جاہل رہ جائیں گے۔ مگر یہ طبقہ اس وقت ہمارا موضوع بحث نہیں ہے ہم تو ان لوگوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو اردو اور انگریزی دونوں زبانیں جانتے ہیں مگر جہاں آپس میں مل بیٹھے انگریزی بگھارنا شروع کر دیتے ہیں اور اردو میں گفتگو کرتے ہوئے ایسا شرماتے ہیں کہ گویا اگر کسی نے ان کو اردو بولتے سن لیا تو خدا جانے کیا رائے قائم کرے گا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض حالات میں انگریزی بولنا ہی قرین مصلحت ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی ایسی بات کرتا ہے جو شریف بہو بیٹیوں کے سامنے نہ کرنا چاہیئے تو وہ بات اچھا ہی ہے کہ اردو میں نہ کی جائے یعنی یا تو وہ بات ہی نہ کی جائے اور اگر کسی طرح ہضم نہ ہو رہی ہو تو انگریزی میں کر لی جائے بشرطیکہ وہ بہو بیٹیاں خود بھی انگریزی نہ جانتی ہوں۔ یا اگر کسی پر غصہ آ گیا ہے تو بہتر یہی ہے کہ وہ غصہ انگریزی میں کیا جائے اس لیے کہ انگریزی زبان کی گالیاں اول تو ذرا اردو کے بہ نسبت ہلکی پھلکی ہوتی ہیں دوسرے ان گالیوں کا مخاطب ان گالیوں کا اتنا برا نہیں مناتا جتنا اردو کی گالیوں پر مشتعل ہو سکتا ہے۔ اور ہر گالی کا جواب اس سے بڑی گالی میں دینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ تو آپ کو ماننا ہی پڑے گا کہ گالی دینے کے لیے انگریزی زبان اتنی خطرناک نہیں ہے۔ جتنی پنجابی یا اردو زبان ہے۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ غصہ آتے ہی انگریزی شروع کر دی جائے تاکہ عزت آبرو کا سوال ذرا کم ہی پیدا ہو۔ اور اگر پیدا بھی ہو تو ایک غیر زبان میں پیدا ہو۔

خدا کا شکر ہے کہ ہماری راولپنڈی میں بھی بعض ممتاز شخصیتوں نے یہ محسوس کیا ہے کہ انگریزی زبان کی بدہضمی کوئی اچھی چیز نہیں ہے کہ جس کو دیکھئے ٹکڑا انگریزی جھاڑ رہا ہے یہ لوگ انگریزی کی اس بے ضرورت گٹ پٹ سے عاجز آ چکے ہیں اور اردو بولنے کی تحریک چلا رہے ہیں۔ ان میں شہر کے بہت سے لیکچرر۔ وکیل۔ مجسٹریٹ وغیرہ شامل ہیں۔ جنھوں نے طے کیا ہے کہ حتی الامکان اردو بولنے کی کوشش کریں گے۔ کس قدر عبرت انگیز بات ہے یہ بھی اردو بولنے کی گویا کوشش کرنا پڑے گی۔ اور اردو ماحول پیدا کرنے کی جد و جہد کرنا پڑے گی۔ اردو ماحول سے مراد یہ ہے کہ وہ کوشش کریں گے کہ ہمارے دکاندار اپنے گاہکوں کو انگریز سمجھنا چھوڑ دیں اور اپنا سائن بورڈ اردو میں لکھوائیں۔ دکاندار تو درکنار کیفیت تو یہ ہے کہ جس گھر پر دیکھئے نام کی تختی انگریزی میں لکھی ہوئی آویزاں ہے خواہ گھر والا گھر کے اندر بیٹھا انگلی سے کھیر چاٹ رہا ہو اور کھری چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا ہو مگر دروازے پر انگریزی میں لکھا سائن بورڈ اس طرح آویزاں ہے کہ گویا یہ گھر نہیں انگلستان ہے۔ اور اس میں صرف ان ہی لوگوں کو آنے کی اجازت ہے جو انگریزی میں ان کا نام پڑھ سکیں۔

دکانوں کے سائن بورڈ مشرف بہ اردو کرانے کی نہایت منظم تحریک لاہور میں شروع کی گئی ہے۔ اور اب راولپنڈی والے بھی دکانداروں سے کہہ رہے ہیں۔ کہ وہ اس اردو ملک میں انگریزی کے سائن بورڈ آخر کیوں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ جن کی وجہ سے بے شمار لوگوں کو جو انگریزی نہیں جانتے دکاندار سے پہلا سوال یہی کرنا پڑتا ہے کہ آپ آخر بیچتے کیا ہیں۔ اور یہ کس چیز کی دکان ہے مثلاً اچھی خاصی لڈو پیڑے امرتی اور بالوشاہی کی دکان ہے جس کا کوئی تعلق نیو کلیبٹ۔ ٹوفی یا کسی اور انگریزی مٹھائی سے نہیں ہے

مگر سائن بورڈ انگریزی میں لکھا ہوا ہے۔ واقع ہوئے ہیں آپ غرارہ اور شلوار سینے والے درزی مگر سائن بورڈ انگریزی کا ہے تاکہ معلوم یہ ہو کہ صرف اسکرٹ اور سلیپس وغیرہ سیتے ہیں۔ دکان ہے اُردو کتابوں کی اور سائن بورڈ انگریزی کا ہے۔ دوکان ہے پان کی جس کا انگریزوں سے دور کا بھی تعلق نہیں مگر سائن بورڈ انگریزی کا لٹک رہا ہے۔ ہوٹل ہے خالص دیسی کھانوں کا جو اگر انگریز کھالیں تو ہوٹل سے نکل کر اسپتال میں داخل ہو جائیں مگر سائن بورڈ انگریزی کا ہے۔ یہ انگریزی کی بدہضمی نہیں تو اور کیا ہے اور اس کا علاج آخر کب تک نہ کیا جائے گا۔

(۱۱)

عورتوں کو گھر والی کہنے والے مرد جب طبقۂ نسواں میں یہ بیداری دیکھتے ہیں کہ؎

قومی ترقیوں کی زمانہ میں دھوم ہے
مردانے سے زیادہ زنانہ میں دھوم ہے

تو بجائے اس کے کہ وہ اس کو عورتوں کا قومی فرض سمجھیں طرح طرح کے اعتراض شروع کر دیتے ہیں کہ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ان عورتوں نے چولھا ہانڈی چھوڑ کر لیڈری شروع کر رکھی ہے اور بجائے شوہر کی اطاعت کے ملک و قوم کی خدمت کا بیڑہ اُٹھا لیا ہے۔ ان مردوں کا خیال یہ ہے کہ عورتیں صرف اس لیے پیدا ہوتی ہیں کہ بچوں کے ساتھ ساتھ شوہر کو بھی پالتی رہیں اور تیمارداری کے انداز سے اپنے کو اس کی خدمت کے لیے وقف رکھیں وہ جب سیر و تفریح سے تھک کر آدھی رات کو گھر آئے تو ٹھنڈا کھانا اس کے لیے گرم کریں اور جب وہ کھانا کھا کر لیٹے تو اس کے سر میں تیل ڈالیں اور دبائیں کہ میاں تاش کھیل کر آئے ہیں اور اس کھیل میں اپنا دماغ تھکا چکے ہیں جس کو آرام پہنچانے کی ضرورت ہے اور جب میاں خدا خدا کر کے سو جائیں تو وہ بھی اس نیت کے ساتھ ذرا سی جھپکی لے لے کر صبح میاں سے پہلے بیدار ہونا ہے تاکہ ان کو آنکھ کھولتے ہی سلگتا ہوا حقّہ بھی مل جائے اور اس کے فوراً بعد چائے بھی بغیر مانگے مل جائے اور اس کے بعد ہی جب میاں ضروریات سے فارغ ہونے میں مصروف ہو جائے تو وہ اس کے لیے ناشتہ تیار کرنے، ڈبیا میں پان بنانے، دفتر جانے کے لیے کپڑے ٹھیک کرنے وغیرہ میں مصروف ہو جائے اور جب وہ خیر سے دفتر سدھاریں تو وہ باورچی خانہ کی ہو کر رہ جائے کہ دفتر کھانا بھیجنا ہے اور دفتر کھانا بھیج کر وہ پھر میاں کی واپسی کے انتظامات میں مصروف ہو جائے کہ ان کو اپنا کمرہ صاف ملنا چاہیے وقت پر سہ پہر کا ناشتہ ملنا چاہیے، حقّہ تیار ملنا چاہیے گلوریاں ملنا چاہئیں اور اگر واپسی میں چند دوستوں کو ساتھ لے آئیں تو ان کی مدارت کا بھی بندوبست ہونا چاہیے پھر میاں کی واپسی کے بعد منٹ منٹ پر باہر پان بھیجنا ہیں۔ بار بار چائے پہنچانا ہے کبھی خشک میوہ مانگا جا رہا ہے تو کبھی تر حلوہ اور ساتھ ہی ساتھ رات کے کھانے کا بھی بندوبست کرنا ہے۔ بچوں کی دیکھ بھال گویا ان سب کے علاوہ ہے۔

اس قسم کی خدمت گزار بیویوں کے لیے یہ شوہر قوم کے افراد بھلا یہ کیونکر برداشت کر سکتے ہیں کہ وہ قومی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینا شروع کر دیں اس لیے ظاہر ہے کہ اگر وہ قومی کارکن بن گئیں تو ان شوہروں کو اس ناز و نعم سے کون پالے گا پھر تو یہی ہوگا کہ دفتر سے آ کر پوچھا کہ وہ کہاں گئیں تو معلوم ہوا کہ فلاں گرلس کالج میں آج ان کو تقریر کرنا تھی وہاں گئی ہوئی ہیں اور کہہ گئی ہیں کہ بے بی کو لے جا کر چیچک کا ٹیکہ لگوا دیجئے گا، فلاں جلسۂ تقسیم انعامات میں ان کو انعام تقسیم کرنا تھے لہٰذا کہہ گئی ہیں کہ ننھے میاں کے بال بہت بڑھ گئے ہیں

دھوے جاکر بنوا لائیے گا۔ اب نہ صرف یہ کہ ہاتھ منہ دھلوانے والا بھی کوئی نہیں ہے خود ہی ہاتھ منہ دھونا ہے خود ہی ملازم سے چائے بنوا کر پینا ہے بلکہ بچی کو لے جاکر ٹیکہ بھی لگوانا ہے اور جب وہ روئے تو اس کو کندھے سے لگا کر ٹہلانا اور بہلانا بھی ہے۔ نہ صرف بچے کے بال بنوانا ہیں بلکہ اس کو نہلوانا بھی ہے۔ نہ صرف یہ کہ تاش کھیلنے نہیں جاسکتے بلکہ بچوں کو بہلانے کے لیے ان کے ساتھ لوڈو وغیرہ کی قسم کا کوئی نہایت واہیات کھیل کھیلنے پر بھی مجبور رہیں اور دفتر میں دن بھر سر کھپانے کے بعد گھر میں "اوور ٹائم" کرنے پر مجبور ہیں۔

اس قسم کی قومی کارکن بیویوں کو وہ شوہر تو بے حد پسند کرتے ہیں۔ جو خود خواہ کچھ بھی نہ ہوں مگر اس حیثیت سے بے حد مشہور ہو جاتے ہیں کہ آپ ہیں شوکت تھانوی یعنی بیگم شوکت تھانوی کے شوہر اور جب اس حیثیت سے ان کا تعارف ہوتا ہے اور ملنے والا گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر کہتا ہے کہ "آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی" تو خود ان کو بھی بڑی مسرت ہوتی ہے کہ وہ ایسی عظیم الشان بیوی کے شوہر بن کر گویا بہت ہی شوہر ثابت ہوئے ہیں حالانکہ جہاں تک ان کی شوہرانہ حیثیت کا تعلق ہے وہ صرف یہ ہوتی ہے کہ بیگم صاحبہ کے پرسنل اسسٹنٹ بنے نوکروں کو ہدایات دیتے پھر رہے ہیں کہ "تم لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو اور بیگم صاحبہ کو ٹھیک چار بجے میٹنگ میں جانا ہے اس سے پہلے ہی چائے کا بندوبست کرنا ہے ایسا نہ ہو کہ بغیر چائے پیئے وہ چلی جائیں۔ کم سے کم ان سے یہی معلوم کر لیا ہوتا کہ رات کا کھانا کہیں باہر تو نہیں ہے یا خود انھوں نے تو کسی کو کھانے پر نہیں بلا رکھا ہے۔ ہزار مرتبہ کہا کہ میں ایک ڈائری رکھے لیتا ہوں۔ اپنا پروگرام مجھ کو نوٹ کرا دیا کریں۔ ارے بھائی خوب یاد آیا۔ ذرا ٹائپسٹ سے تو پوچھو کہ آج جو ان کا بیان اخبارات میں جانے والا ہے ٹڈی دل کے متعلق اور کل جو جائے گا ٹیڈی گرل کے متعلق اس کی کاپیاں بھی تیار ہوئیں یا نہیں۔"

اس قسم کے شوہر جو بیویوں کے نام سے پہچانے جاتے ہیں زیادہ تعداد میں نہیں ہیں۔ زیادتی تو ان شوہروں کی ہے جو عورتوں کی اس بیداری پر بیٹھے دانت پیسا کرتے ہیں اور اس وقت سے ڈرتے رہتے ہیں جو بیداری کی اس لہر کو خود ان کے حرم تک پہنچا دے۔ شوہروں کا یہ طبقہ خواتین میں اس جوشِ عمل کا قطعاً روادار نہیں ہے اور اس قسم کے قومی تعمیر کے کاموں کو عورتوں کا منصب ہی نہیں سمجھتا۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کو مخاطب کرتے ہوئے بیگم لیاقت علی خاں نے نیویارک میں نمائندہ جنگ کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ اپوا کے ان ناقدوں کی یہ باتیں سن سن کر تنگ آچکی ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ اپوا بیگموں کا ایک ادارہ ہے جو سیمیناروں میں شریک ہوتی ہیں اور جو صرف سماجی تتلیاں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اپوا پر یہ نکتہ چینی کرنے والوں نے عوام کی تکالیف دور کرنے کے لیے کیا خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے بعد بیگم لیاقت علی خاں نے بڑی تفصیل سے اپوا کی ان خدمات کا تفصیلی تذکرہ کیا جو یہ خواتین کا ادارہ عوام کی حالت سدھارنے کے لیے انجام دے رہا ہے۔

بیگم صاحبہ لیاقت علی خاں کو اپوا کے ان نکتہ چینیوں سے بددل ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہر قوم میں اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے اقتدار کو متزلزل دیکھ کر اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ اور ان کو اس قسم کی باتیں بنانے کا بہانہ اس لیے مل جاتا ہے کہ مثلاً اپوا میں سب ہی ملک و قوم کا درد رکھنے والی اور تعمیری انہماک سے خلوص رکھنے والی خواتین شامل نہیں ہیں۔ بلکہ اس قسم کی بیگمات بھی ہیں جو سمدھنوں کے سے ٹھسّوں کے ساتھ ہجوم ریشم و کمخواب بنی ان قومی جلسوں میں جاتی ہیں اور ان جلسوں کو فیشن شو بنا کر رکھ دیتی ہیں۔ شروع شروع میں تو واقعی ان کی بڑی تعداد اپوا میں نظر آتی تھی مگر رفتہ رفتہ انجمنِ خواتینِ پاکستان میں ان خواتین کی اکثریت ہو گئی جو محض اپنے کو دکھانا نہیں بلکہ کچھ کام کر دکھانا چاہتی ہیں۔ اور جن کو نام سے زیادہ کام سے غرض ہے۔ مثلاً اب

پورے ملک میں عموماً اور پنجاب کے دیہاتوں میں خصوصاً اپوا نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف نہ کرنا سوائے تنگ دلی کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اپوا کی یہ کارکن خواتین اپنے گھر اور اپنے بچوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتیں۔ اور ان قومی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتی ہیں۔ اور دونوں کا ایسا توازن قائم کر لیا ہے کہ اب صرف وہی مرد شاکی نظر آتے ہیں جو عورتوں کو قوم کا نہیں صرف اپنا خدمت گزار دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور شوہرانہ اقتدار کے ایسے مریض ہیں کہ بیوی کو صرف اپنا ہی تیمار دار بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔

(۱۲)

ہمارے شاعروں کا معیارِ حسن بھی سمجھ میں آنے والی چیز نہیں ہے اگر محبوب کا قد بالا ان کے نزدیک حسن کا معیار ہے تو پستہ قد کو اصولاً اس معیار سے گرا ہوا ہونا چاہیئے۔ مگر ان حسن شناسوں کو یہ بھی پسند آجاتا ہے اور وہ بھی محبوب اگر طویل القامت ہے تو اس کو بڑے پیار سے سرو قد کہہ کہ اس کی تعریف کے پل باندھ دیتے ہیں۔ اگر محبوب ٹھنگنا ہے تو اس کے قد کو بوٹا سا قد کہہ کہ زمین آسمان کے قلابے ملانا شروع کر دیتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی کس بات کا اعتبار کیا جائے۔ اور حسن کا معیار قد بالا کو سمجھا جائے یا بقول ان کے بوٹا سے قد کو۔ حالانکہ اگر سچ پوچھئے تو ان دونوں قدوں کے درمیان ایک اور قد بھی ہوتا ہے جس کو "قد موزوں" کہتے ہیں کہ نہ بہت ہی اونٹ نظر آئے محبوب نہ نہایت ہی پدّی مگر ان شاعروں نے اس قد موزوں کی بہت ہی کم تعریف کی ہے البتہ اگر محبوب تاڑ کا تاڑ ہے تو وہ اس کے متعلق نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں کہ یہ تو وہ سوا نیزا ہے جس پر رُخِ روشن کی حیثیت آفتاب قیامت کی ہے۔ یہ تو وہ سرو قامت ہے جس نے قسام ازل سے انگڑائی کے بہانے ہاتھ بڑھا کر سارا حسن اپنے ہی لیے لے لیا تھا ؎

حسن قسام ازل بانٹ رہا تھا جس روز
لے لیا ہاتھ بڑھا کر تری انگڑائی نے

حالانکہ ان بلند قامت حسینوں کا دیدار ان کے پرستار اسی طرح کرتے ہیں جس طرح ہم آپ گھنٹہ گھر میں وقت دیکھتے ہیں کہ آنکھیں تو جلوۂ یار دیکھ لیں مگر ٹوپی سر سے گرے بغیر نہ رہ سکے ظریف لکھنوی نے اپنے رنگ میں اسی قد بالا کے متعلق کہا ہے کہ ؎

اور تو کیا میں کہوں اس قدِ بالا کی قسم
اونٹ کی شکل دکھائی تیری انگڑائی نے

اور اس طرح سرو قدی کا لطف تو اس وقت دوبالا ہو جاتا ہے جب ان کا شیدائی پستہ قد واقع ہوا ہو۔ ان دونوں طالب و مطلوب کو دیکھ کر گلی ڈنڈے کی ایسی کیفیت نظر آتی ہے کہ مثنوی زہر عشق کی قسم کی مثنوی "شتر گربہ" لکھنے کو جی چاہنے لگتا ہے مگر اب کیا کیا جائے کہ دلِ ناداں اکثر اسی قسم کی جست لگا جاتا ہے اور اہل دل اپنا دل اسی قسم کی بلندی پر اچھال دیتے ہیں۔ کہ گویا دل کو اسپوٹنک میں رکھ کر چاند کی طرف روانہ کیا ہے۔

مگر اس قد بالا کا ایک نمونہ نیویارک کی ایک خبر کے مطابق ٹوسانا میں پیش کیا گیا ہے۔ جن صاحبزادی کا یہ قد ہے ان کا اسم شریف ٹوڈلر لیس ہے۔ نسلاً یہ کافر ماجرا انگلش ہے مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ سرو قدی میں ان کا کوئی جواب اب تک تو پیدا

ہوا نہیں آئندہ کی خبر خدا جانے۔ اس بنتِ آبنوس کی عمر فی الحال "بالی عمریا" ہے یعنی محض ۱۴ سال ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی باڑھ کا زمانہ ختم نہیں ہوا۔ اور ابھی ان کا قد اور بھی بڑھ سکتا ہے مگر اس چودہ سال کی عمر میں بھی اس طول طویل دوشیزہ کا قد خدا نظرِ بد سے بچائے آٹھ فٹ ۲ انچ ہے اور طبی رائے یہ ہے کہ یہ قد ابھی اور بڑھے گا۔ بچپن ہی سے انھوں نے قد نکالنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ جب یہ چار سال کی بچی تھی اس وقت بھی دس برس کی لڑکی کا قد رکھتی تھی۔ سات سال کی عمر میں قد بھی سات فٹ ہو چکا تھا۔ اللہ جانے ابھی ان کا سلسلہ کہاں تک طول کھینچے گا۔ اللہ جانے ان صاحبزادی کی سرشت میں غلطی سے اونٹ کی مٹی پڑ گئی تھی۔ یا ان ہی کی مٹی سے قطب مینار بنایا گیا ہے۔ بہرصورت یہ لڑکی ابھی سے اگر ایک قسم کی ڈبل ڈیکر بس نظر آنے لگی ہے تو اپنے معیار پر پہنچکر تو غالباً یہ کیفیت ہوگی۔ ان سے سرگوشی کرنے کے لیے ان کو صحن میں چھوڑ کر خود کوٹھے پر جانا پڑیگا تاکہ سرگوشی کرنے والے کا منہ کان کے قریب جا سکے۔

محبوب کے قدِ بالا کی تعریف کرنے والے یہ شاعر ہیں تو اسی قابل کہ ان کو یہ سیاہ مینار سپرد کر دیا جائے کہ لو سنبھالو اس قدِ بالا کو اور کرو اس کی سیڑھیاں لگا لگا کر زیارت اور اونٹ پر سوار ہو ہو کر حاصل کرو اس سے شرفِ ہمکلامی یا ہوائی جہاز پر اڑ اڑ کر حاصل کرو اس کی رسائی اس سزا کے بعد کبھی جو یہ لوگ قدِ بالا کی تعریف کریں اور اس کی شان میں بحرِ طویل اختیار کر کے طول طویل قصیدے کہیں۔ اگر یہ حبشن ان شعرا کے مجمع میں آجائے تو منظر یہی ہوگا جیسے کوئی دیونی بالشتیوں کے ملک کی سیر کو آگئی ہو اور پھر جب وہ ایک ایک شاعر کو اٹھا اٹھا کر اپنی جیب میں رکھنا شروع کرے تو ان کی سرو قدی کی ساری مدح سرائی دھری رہ جائے گی۔ مگر صاحب العظمت للہ چودہ برس کی عمر دیکھیے اور اس عمر میں آٹھ فٹ سے نکلتا ہوا قد دیکھیے پھر یہ کہ یہ قد ابھی بڑھ رہا ہے۔ اللہ جانے اپنی حد پر پہنچکر ان مسماۃ کا عالم کیا ہوگا۔ اور وہ کون شامت زدہ انسان ہوگا جو ان کو اپنی زوجہ بنا کر اونٹ کے منہ میں زیرہ بنے گا۔ اور چلتے پھرتے بالاخانے کو اپنی زوجیت میں لینے کا کمال دکھائے گا۔

دیکھنے کو تو ہم نے بھی بڑے بڑے قد آور انسان دیکھے ہیں بلکہ بعض لوگ تو ایسے بھی نظر آتے ہیں جن کو دیکھ کر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اصولاً ان کے سر پر برف جمی ہوئی ہونا چاہیئے۔ مگر اس قسم کا قد مردوں کے لیے تو پھر بھی گوارا ہو جاتا ہے۔ مگر خدا نہ کرے کہ کوئی خاتون اس قدر دو منزلہ واقع ہوں۔ کہ اچھا خاصا شوہر ان کو ٹانگ برابر کا چھوکرا محسوس ہو اور جب منظرِ عام پر آئیں۔ دیکھنے والے یہی سمجھیں اونٹنی اور اس کا بچہ چلے جا رہے ہیں۔ مثلاً وسانا کی یہ طویل القامت لڑکی تو خاتون بنتے بنتے اچھی خاصی بنتِ قطب مینار بن کر رہ جائے گی۔ اور اس کو اپنی بلندی سے ہم ساکنانِ خطۂ خاک خدا جانے نظر بھی آئیں گے یا نہیں۔ کہیں ان صاحب کا واقعہ صادق نہ آجائے جو سیب خریدنے بازار پہنچے تھے اور پھل فروش سے سیب کا بھاؤ دریافت کر کے کہہ اٹھے تھے کہ اتنے اتنے سے سیب اور ان کے اتنے دام مگر سیب والا بھی حاضر جواب تھا کہنے لگا حضور ذرا بیٹھ کر دیکھیں اس بلندی سے تو یہ واقعی اتنے اتنے سے نظر آ رہے ہوں گے۔

شعرائے کرام خواہ برا مانیں مگر سچی بات تو یہ ہے کہ نہ "حسنِ فلک بوس" ہی کسی کام کی چیز ہے نہ "حسنِ زمیں دوز" ہی قابلِ ستائش ہے آخر یہ لوگ آدمیوں کی سی بات کیوں نہیں کرتے۔ کہ محبوب کا قد بس واجبی سا ہونا چاہیئے۔ نہ اتنا لمبا کہ عاشقِ ناشاد حسرتِ دیدار کے معاملہ میں بس ناشاد ہی رہ جائے۔ نہ اتنا پستہ کہ اس کو طاق پہ بٹھا کر دیکھا جا سکے۔ یہ باتیں شعر و شاعری

کا بھرم کھونے والی ہیں اور صرف ایک قد ہی پر کیا منحصر ہے یہ شاعر تو کمر پتلی کرنے پر آئیں گے تو اس کو غائب ہی کر دیں گے۔ نزاکت کا ذکر کریں گے تو اس کی حد یہ کر دیں گے کہ ؎

بُرا ہو نزاکت کا سو کر جب اُٹھے
تو بستر پہ انگڑائیاں چھوڑ آئے

معلوم نہیں یہ لوگ اعتدال میں کیوں نہیں آتے۔ اگر ان کو سزا دینے کے لیے قضاً و قدر کوئی ایسا ہی پیکر بنا کر بھیج دے جیسا وہ اپنے اشعار میں بیان کرتے ہیں۔ تو بخدا یہ شاعر بیاضیں چھوڑ چھوڑ کر بھاگتے نظر آئیں۔ اور چیخ نکل جائے ڈر کے مارے کہ بالوں کی جگہ سانپ ہیں، ابرو کی جگہ خنجر لٹکے ہوئے ہیں، آنکھوں کی جگہ ترکش ہے جس سے تیر نکل رہے ہیں۔ گردن کے بجائے صراحی آویزاں ہے۔ کمر غائب ہے۔ اور اپنے جسم کے دو علیحدہ علیحدہ ٹکڑے لیے محبوب چلا آ رہا ہے۔ ہوش گم ہو جائیں بھاگیں سر پہ پیر رکھ کر یا گر پڑیں غش کھا کر مع تخلص کے۔

(۱۳)

راولپنڈی میں گرمی اور مری میں رونق بے حد بڑھ گئی ہے اور راولپنڈی کی گرمی سے بوکھلائے ہوئے لوگوں کی سمجھ میں جب کچھ نہیں آتا تو وہ بھاگتے ہیں سر پہ پیر رکھ کر مری کی طرف نتیجہ یہ کہ راولپنڈی کی ساری رونقیں مری نے چھین لی ہیں اور مری کی آبادی یکایک اتنی بڑھ گئی ہے کہ مری کے سب ڈویژنل کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ مری میونسپلٹی کے اسٹیشن ایریا کے اندر اب کسی قسم کے جانور لانے یا ان کو چرنے کے لیے چھوڑ دینے کی قطعاً اجازت نہیں ہے ان جانوروں میں گائیں، بھینسیں، بکریاں، گدھے اور گھوڑے وغیرہ شامل ہیں۔ البتہ جو گھوڑے اور گدھے سواری کے لیے مری میں رکھے گئے ہیں۔ ان پر یہ پابندی نہ ہوگی۔ وہ انسان جو جانوروں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں وہ تو خود ہی مری جانے کی ہمت نہیں کر سکتے خواہ گرمی سے مر ہی کیوں نہ جائیں البتہ بھینس کی جسامت کی خواتین و حضرات اور بکریوں کی قسم کی چاٹنا شرٹ پہننے والیوں پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے اور ان کو اس کی بھی اجازت ہے کہ وہ مال روڈ پر کیک اور پیسٹریاں وغیرہ نہایت آزادی سے چرتی پھریں۔ وہ گدھے بھی وہاں جا سکتے ہیں جو شوہر واقع ہوئے ہیں اور خواہ کتنے ہی زہر بار کیوں نہ ہو جائیں مگر "حکم بیگم مرگ مفاجات" کے قائل ہیں اور عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ اس موسم میں بیگم کے دماغ پر گرمی نہ چڑھنے دیں بلکہ بیگم کے ساتھ پہاڑ پر چڑھ جائیں اور خود اپنے اوپر قرض چڑھا لیں۔

واضح رہے کہ جانوروں میں کتّا شامل نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ بہت سے لوگ اپنے لیے یا اپنے بال بچوں کے لیے سرد مقامات پر جانا اتنا ضروری نہیں سمجھتے جتنا اپنے کتّے کے لیے پہاڑ پر جانا ضروری سمجھتے ہیں اس لیے کہ ان کا عزیز از جان کتّا گرمی کی شدّت برداشت نہیں کر سکتا اور ہو سکتا ہے کہ اس کی جان پر بن آئے۔ اس قسم کے کتّوں کو جانور کوئی ایسا ہی آدمی کہہ سکتا ہے جس کو کتّے نے کاٹا ہو ورنہ ان کی زندگی پر تو بے شمار انسانوں کو رشک آتا ہے کہ وہ ریشم و کمخواب کے صوفوں پر لوٹتے ہیں۔ معطر آغوشوں میں بیٹھتے ہیں۔ بہترین دودھ پیتے اور اعلیٰ درجہ کا گوشت کھاتے ہیں اور پھر مری کی مال روڈ پر ہوا خوری کو نکلتے ہیں۔ ان میں سے خدا جانے کتنے کتّے ایسے ہوتے ہیں جو مالک کے ساتھ آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور کتنے مالک ایسے ہوتے ہیں

جو کتوں کے ساتھ آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں اگر کتے کو جانور سمجھ کر پابندی لگا دی جائے تو مری کی رونق آدھی رہ جائے لہٰذا جہاں تک مری کا تعلق ہے کتا جانور نہیں ہے۔

مری کی مال روڈ آجکل دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے جو طوفانِ رنگ و بو بنا رہتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک فیشن پریڈ ہے جو مسلسل جاری ہے یا کہکشاں تبدیلیٔ آب و ہوا کے لیے آ اتر آئی ہے۔ اسی چھوٹے سے ٹکڑے میں کچھ اس قسم کی مٹر گشت کا سماں نظر آتا ہے کہ گویا یہ چکر کاٹنے والے۔ م

تیری گلی کے سو سو پھیرے

کی تمثیل پیش کر رہے ہیں۔ کہ کبھی ادھر سے اُدھر جاتے ہیں اور کبھی اُدھر سے ادھر آتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ان میں سے ہر ایک کو ہر ایک سے پچاسوں مرتبہ ملنا پڑتا ہے ان میں سے کچھ نئے شادی شدہ جوڑے ہوتے ہیں جو ہنی مون منانے آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور یا تو شوہر بیوی کو چلنا سکھاتا ہوا نظر آتا ہے یا بیوی ہی شوہر کو ڈبل مارچ کی مشق کراتی نظر آتی ہے۔ کچھ اپنی دیرینہ شادی کا غم غلط کرنے آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ان کی نگاہیں اس اژدہامِ حسن و جمال میں کسی قابلِ غور شے کی جستجو میں نظر آتی ہے اور وہ کسی کو پانے کے لیے اپنے کو کھویا ہوا محسوس کرتے ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ کسی کا ساتھی تو نکلتا ہے شوہر اور کسی کے ساتھ ہوتا ہے کتا لہٰذا اگر ذرا بھی بہکے تو دونوں ہی کاٹنے کو دوڑ سکتے ہیں۔ اور بہت سے ایسے خوش نصیب بھی ہوتے ہیں کہ ان کو اپنا مرکزِ نظر مل بھی جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ خود ان حضرت کو نظر انداز کر دے۔

اس اجتماع میں ایسے سعادتمند شوہروں کی بیویاں بھی ہوتی ہیں جو خود تو اپنی ملازمت یا کاروبار کی وجہ سے گرمیاں بسر کرنے یہاں آ نہیں سکتے البتہ بیوی کو ٹھنڈی ہوا کھلانے کے لیے پہاڑ پر بھیج دیتے ہیں اور خود بھاڑ جھونکتے رہتے ہیں خیر یہ ان کی تو شرافت بلکہ سعادت ہے مگر حیرت ہے ان بیویوں پر جو اپنے کو "ٹھنڈی سہاگن" بنائے خود تو موسم کی دلفریبی کے مزے اڑاتی ہیں اور شوہر کو اسی قابل سمجھتی ہیں کہ وہ روسٹ ہوتا رہے اور میدانی گرمی میں جھلستا رہے۔ شوہر کو جہنم داخل کر کے خود جنتی موسم میں اللہ جانے ان وفا کی پتلیوں سے رہا کیسے جاتا ہے۔ مگر شوہر بھی ایسے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر آپ ان سے قیامت خیز میدانی گرمی کا ذکر کریں تو وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہیں گے کہ جی ہاں گرمی تو بے شک ہے مگر یہی کیا کم ہے کہ بیوی نہیں ہے چنانچہ محسوس یہ ہو رہا ہے جیسے انگریز چلا گیا ہو اور آزادی مل گئی ہو۔ اپنی زندگی اب واقعی اپنی محسوس ہو رہی ہے۔ ع

ہیں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصلِ بہار پر

مری لاکھ سرد اور پُر فضا مقام سہی راولپنڈی جہنم سہی اور مری اس کے مقابلہ میں جنت سہی مگر یہ بڑی وحشتناک بات ہے کہ وہاں جس کو دیکھئے وہ نکما ہی نظر آتا ہے کسی کو کسی قسم کا کوئی کام نہیں ہوتا جس کو دیکھئے منہ اُٹھائے سڑک ناپتا پھر رہا ہے اور وقت کاٹنے کے بہانے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ یعنی مال روڈ پر ٹہلنا شروع کیا تو ٹہلتا ہی چلا جاتا ہے گویا زندگی کا مقصد ہی صرف یہ ہے کہ بس مال روڈ کے چکر کاٹتے رہو۔ تاش کھیلنے بیٹھے تو معلوم ہوتا ہے کہ بس تاش ہی کھیلنے کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ کسی ریستوران میں بیٹھ گئے ہیں تو بس بیٹھے ہوئے ہیں اور اس انداز سے بیٹھے ہیں کہ ع

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں ریستوران میں ہم کوئی ہمیں اُٹھائے کیوں

بہانہ یہ ہے کہ صحت بنا رہے ہیں خواہ عادتیں کتنی ہی کیوں نہ بگڑ جائیں اور سوال یہ ہے کہ صحت ایسی کونسی خراب ہے جسے آپ بنا رہے ہیں تو جواب ملتا ہے کہ یہ تعمیری دَور ہے کچھ اور نہیں بنا سکتے تو صحت ہی بنا لیں مطلب یہ ہے کہ یہ بیکاری سخت پریشان کر دینے کی چیز ہے بلکہ اس تصور سے جنّت تک سے جی گھبرانے لگتا ہے کہ سُنا ہے کہ وہاں کوئی کام ہی نہ ہوگا۔

مری میں مستقل طور پہ رہنے کی نہ تو فرصت ہے نہ توفیق البتہ ایک آدھ پھیرا لگا لینا بھی ہو جاتا ہے مگر یہ پھیرا سخت تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے کہ وہاں جا کر جتنی راحت نہیں ملتی اس سے کہیں زیادہ واپسی میں تکلیف ہوتی ہے کہ جیسے جنّت نصیب ہو جانے کے بعد پھر جہنّم میں جھونک دیئے گئے ہوں، مری کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھانے کے بعد جب پھر لُو کے تھپڑ کھانا پڑتے ہیں تو طبیعت صاف ہو جاتی ہے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ مردانہ وار اسی موسم کا مقابلہ کریں اور اس عارضی جنّت کے لیے اپنے مستقل جہنّم کو شدید سے شدید تر نہ بنائیں :

رعنا

(غیر مطبوعہ ناول کے دو باب)

کچھ تو وکیل صاحب کے اس اچانک رویہ سے شیخ صاحب ناراض تھے کچھ ان کے عزیزوں نے ایسے دلخراش طعنے دیئے کہ وہ اپنی جگہ پر قطعی فیصلہ کر چکے تھے کہ لڑکی کے لیے اب کوئی اور ہی گھر ڈھونڈنا چاہیئے اور وکیل صاحب کی اس بے ہودگی کا دندان شکن جواب یہ دیا جائے کہ اب اگر وہ ناک سے لکیریں بھی کھینچیں تو بھی ان کے یہاں شادی نہ کی جائے۔ بیگم صاحبہ البتہ یہ چاہتی تھیں کہ لگی لگائی نسبت کسی طرح گڑبڑ نہ ہونے پائے۔ اس سلسلہ میں شیخ صاحب کے یہاں مستقل طور پر خانہ جنگی جاری تھی بیگم صاحبہ کا قول یہ تھا کہ ڈھنگ کے لڑکے اس زمانہ میں مشکل ہی سے ملتے ہیں اور شیخ صاحب دعویٰ کر چکے تھے کہ میں ایک سے ایک ڈھنگ کا لڑکا مہیا کر کے دکھا سکتا ہوں۔ بیگم صاحبہ کو چونکہ شیخ صاحب کے متعلق یہ معلوم تھا کہ یہ حضرت اعلیٰ درجہ کے نکمے واقع ہوئے ہیں لہٰذا وہ ان کا چیلنج قبول کر چکی تھیں اور شیخ صاحب اس مہم کو سر کرنے پر کمر باندھ چکے تھے کہ وہ اپنی نظرِ انتخاب کی بسیلی پھڑکا کر رہیں گے چنانچہ وہ واقعی اسی تگ و دو میں ہمہ تن مصروف ہو چکے تھے اور اپنی بیماری کو ایک سرے سے بھول کر اس کام میں ایسی مستعدی دکھا رہے تھے کہ بیگم صاحبہ بھی حیران تھیں کہ یہ چستی اور مستعدی ان بڑے میاں میں ایک دم سے کیسے پیدا ہو گئی ہے۔ شیخ صاحب اس جستجو میں جس رفتار سے ناکام ہوتے تھے اسی رفتار سے ان کا جوش بڑھتا جاتا تھا مگر جوش کے ساتھ ہی ساتھ مزاج کا چڑچڑا پن بھی ترقی کر رہا تھا چنانچہ آج جو دنیا زمانے کی خاک چھان کر تشریف لائے تو ان کے تیوروں کا اندازہ کئے بغیر بیگم صاحبہ پوچھ بیٹھیں:

"کچھ پتہ چلا یا اکرم کے متعلق؟"

شیخ صاحب نے شیروانی ایک طرف اور ٹوپی دوسری طرف اچھالتے ہوئے کہا "گولی مار آیا ہوں اس نابکار اکرم کو۔"

بیگم صاحبہ نے بڑے اطمینان سے کہا "چلو چھٹی ہوئی۔ مگر کچھ معلوم تو ہو کہ کس سلسلہ میں گولی ماری گئی ہے۔"

شیخ صاحب نے کہا "اس کا باپ اعلیٰ درجہ کا لفنگا ہے جس گرمجوشی سے نسبت لے کر آیا تھا اسی سرد مہری سے میرے ساتھ پیش آیا کہ صاحب اب تو جب تک اکرم میاں چار پیسے کمانے کے لائق نہ ہو جائیں میں تو ان کی شادی کر نہیں سکتا۔"

بیگم صاحبہ نے کہا "یہ بات نسبت دینے سے پہلے ان کو نہ سوجھی تھی"

شیخ صاحب نے کہا "گولی مارو اس مردود کو پہلے کے حالات اس کے کچھ اور تھے اب تو حالت بہت پتلی ہے کہتا ہے کہ بس اب خشک تنخواہ رہ گئی ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح پوری پڑے گی اوپر کی ساری آمدنی ایک دم سے ختم ہو گئی ہے۔ سٹی گم نظر آ رہی تھی اس کی"

بیگم صاحبہ نے کہا "اوپر کی آمدنی ؟ اے تو کیا وہ نگوڑ مارا رشوت لیتا تھا"

شیخ صاحب نے کہا "رشوت ہی کو پیار سے اوپر کی اور بالائی آمدنی وغیرہ کہتے ہیں۔ میں تو خود حیران تھا کہ نوکری تو اتنی بڑی ہے نہیں جتنے ٹھاٹھ ہیں مگر اب تو آثار یہ ہیں کہ سارا کھایا پیا اگلنا پڑے گا اور تعجب نہیں کہ تبدیلی آب و ہوا کے لیے جیل بھی جانا پڑے ممدوح کو۔ آج بڑی پراگندہ نظر آ رہی تھیں اور بھنبھناتی ہوئی مونچھیں اور وہ اینٹھی ہوئی گردن بھی آج سیدھی دکھائی دیتی تھی۔ کہنے لگے کہ دعا کیجیے کہ یہ وقت عزت آبرو کے ساتھ ٹل جائے۔ سنا آپ نے یعنی حرامخوری آپ کریں اور دعا کریں ہم ان کی رسّی کی درازی کے لیے۔ مختصر یہ کہ میں نے تو گولی مار دی"

بیگم صاحبہ نے کہا "میں تو یہ کہتی ہوں کہ یہ قصہ کیا ہے کہ جو ملتا ہے تم کو ایسا ہی ملتا ہے۔ بڑے دعوے سے لائے تھے اس سوداگر کے لڑکے کی نسبت کیا نام اس کا ——"

شیخ صاحب نے کہا "جی ہاں بڑا ملک التجار بنا پھرتا تھا۔ چور کہیں کا۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے ہم کو بچا لیا ورنہ کچھ دن بعد اگر وہ حضرت چور بازاری کے سلسلہ میں دھرے جاتے تو کیا ہوتا۔ صورت سے نہایت شریف بظاہر نہایت بھلا مانس۔ اچھی خاصی دواؤں کی دکان کا مالک مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ دواؤں کی چور بازاری کرتا ہے ورنہ میں پہلے ہی گولی مار دیتا"

بیگم صاحبہ نے کہا "دیکھو میں پھر کہتی ہوں کہ مسلمان میں کوئی برائی نہیں ہے۔ سمجھا بوجھا لڑکا ہے۔ ہم کو اس کے باپ سے کیا مطلب خود لڑکا تو اپنی ذات سے برا نہیں ہے"

شیخ صاحب نے بپھر کر کہا "پھر تم نے اس کا نام لیا۔ جب میں اس کو گولی مار چکا ہوں تو تم بار بار اس کا نام کیوں لیتی ہو"

بیگم صاحبہ نے کہا "تمہارے گولی مارنے میں یہی تو خوبی ہے کہ گولی مارنے سے قصہ ختم نہیں ہوتا کسی کا۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو کہ آخر خود اس لڑکے میں کیا عیب ہے"

شیخ صاحب نے نہایت جوش میں آ کر کہا "سو عیبوں کا ایک عیب یہی کیا کم ہے کہ وہ ایک عیبی باپ کا بیٹا ہے تم خود سن چکی ہو کہ اس کے ٹھگ باپ نے ایک قوم کو کس کس طرح سے ٹھگا ہے"

بیگم صاحبہ نے کہا "وہ تو جو کچھ کیا ہے اس کے باپ نے کیا ہے"

شیخ صاحب ابل پڑے "غلط۔ سراسر غلط۔ باپ کو تو خیر گولی مارو مگر صاحبزادے بھی تو آخر اسی طرح کی کمائی میں ہمیشہ مصروف رہے ہیں یہ کام جو وہ کر رہے ہیں کیا تم اس کو ڈکیتی سے کچھ کم سمجھتی ہو۔ پکے کاغذ پر مجھ سے لکھوا لو

کہ باپ کے ساتھ یہ بلند اقبال بھی گرفت میں آئے بغیر نہ رہیں گے کاروبار تو آخر وہی کر رہے ہیں۔"

بیگم صاحبہ نے کہا: "اچھا تو اس میں تمہارا کیا نقصان ہے کہ ذرا انتظار کر لو اگر اس پر آنچ نہ آئے تو تم کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

شیخ صاحب نے بلبلا کر کہا: "اب تم بھی گولی مار دینے والی باتیں کر رہی ہو۔"

بیگم صاحبہ نے احتجاج کیا: "لو اور سنو۔ اب یہ بیچارے مجھے بھی گولی مارنے چلے ہیں۔"

شیخ صاحب نے بڑی مستعدی سے کہا: "بالکل گولی مار دینے والی بات ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب باپ بیٹے انشاء اللہ گرفتار ہو جائیں گے تو تم کہو گی کہ ذرا انتظار کر لو میعاد ختم ہونے کے بعد جب وہ جیل سے نکل آئیں گے تو شادی کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ کان کھول کر سن لو کہ میں رعنا کو گولی مار سکتا ہوں مگر سلمان سے شادی نہیں کر سکتا۔"

بیگم صاحبہ نے طرح طرح سے دم دلاسے دیئے ہر اونچ نیچ سمجھائی سلمان کی بے گناہی کے طرح طرح سے یقین دلائے مگر شیخ صاحب کی نہیں کو وہ ہاں بنانے میں کامیاب نہ ہو سکیں اور سلمان کو گولی مار دینے کا جو حکم وہ سنا چکے تھے اس کے خلاف کوئی اپیل اور کوئی رحم کی درخواست کارگر نہ ہو سکی۔ مگر بیگم صاحبہ کو اب تک یہ یقین تھا کہ یہ بڑے میاں کسی طرح گولی مارتے مارتے ایک نہ ایک دن سلمان کی بے گناہی اور معقولیت کے قائل ہو جائیں گے اور جو یہ ادھر اُدھر ہاتھ پیر مار رہے ہیں اس میں تو ان کو خیر کامیابی ہو ہی نہیں سکتی اس لیے کہ اول تو ان کا ایمان تھا کہ کوئی ڈھنگ کا لڑکا یہ تلاش ہی نہ کر سکیں گے اور اگر کوئی لڑکا مل بھی گیا تو اس میں ہزار عیب نکالنے کو وہ خود موجود ہیں، بات دراصل یہ تھی کہ ان کی نظر گھوم پھر کر اب تک سلمان ہی کی طرف آ کر جم جاتی تھی سلمان کا نقش ان کے دل پر اتنا گہرا تھا کہ کسی طرح مٹائے نہ مٹتا تھا سلمان کے مقابلہ میں باقی نسبتوں کا تو نہ ان کو کوئی خوف تھا نہ کوئی پروا البتہ شیخ صاحب کی بہن کے صاحبزادے میاں احسن سے وہ خائف تھیں کہ کہیں شیخ صاحب تھک ہار کر اس کے لیے راضی نہ ہو جائیں۔ بہن بہت دن سے جال بچھائے بیٹھی تھیں اور ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں کہ رعنا کو بہو بنا کر لے جائیں وہ تو کہیئے خدا کا شکر یہ تھا کہ خود احسن ہی کے اطوار ایسے تھے کہ شیخ صاحب اس کا نام سن کر ہمیشہ گولی مارتے رہے اور بہن کی ناراضگی مول لے لی مگر اس نسبت کو منظور نہ کر سکے مگر جب سے احسن کی والدہ کو یہ معلوم ہوا تھا کہ وکیل صاحب نے "بوجوہ" اس تقریب کی تاریخ غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دی ہے ان کی توجہ بہت بڑھ گئی تھی یا تو یہ حال تھا کہ بھائی کی صورت تک دیکھنے کی روادار نہ تھیں اور اس شادی میں شرکت ہی سے انکار کر چکی تھیں یا اب ایک دم سے بھائی کی محبت ایسی عود کر آئی تھی کہ ہر دوسرے تیسرے دن دھری ہوئی ہیں اور میاں احسن کی آمد و رفت بھی ان دنوں خلاف معمول بہت بڑھی ہوئی تھی حالانکہ اس گھر میں ان سے کوئی سیدھے منہ بات بھی نہ کرتا تھا مگر ممدوح عجیب مٹی کے بنے ہوئے تھے کہ رعنا کا ہر تمسخر ان کو گوارا تھا۔ شیخ صاحب اپنے مصنوعی دانت باہر نکال نکال ان کو دیکھتے ہی پیسنا شروع کر دیتے تھے بیگم صاحبہ ان کے سامنے قطعاً گھاس نہ ڈالتی تھیں مگر آپ تھے کہ نہایت پابندی سے حاضری بھی دے رہے تھے اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر کسی نہ کسی خدمت کا موقع بھی حاصل کرتے رہے تھے کچھ نہیں تو رعنا کے کتے کے لیے راتب ہی لیے چلے آ رہے ہیں اس لیے کہ گھر بھر میں وہی ایک

تھا جو ان کو دیکھ کر دُم ہلا دیا کرتا تھا۔ رعنا کے چھوٹے بھائی اسلم ہی کو پڑھانے کے بہانے سے جب دیکھئے موجود ہیں لہٰذا ان سے بیگم صاحبہ کو سخت وحشت ہو رہی تھی کہ کہیں ان کی یہ نیاز مندیاں شیخ صاحب کو نہ موہ لیں۔

رعنا کو سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی وہ بظاہر جس قدر شوخ اور شریر تھی اس سے کہیں زیادہ گہری بھی تھی، بیگم صاحبہ تو اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی جانتی تھیں کہ اس کو سلمان سے ایک قلبی لگاؤ ہے اور در اصل سلمان کی وہ طرفدار ہی محض اسی وجہ سے تھیں مگر اس قلبی لگاؤ کی اصل حقیقت سے اگر کوئی واقف تھا تو وہ رعنا کی واحد سہیلی ندرت تھی کہ باوجود اس قلبی لگاؤ کے رعنا اور سلمان کے درمیان کس قدر وسیع خلیج حائل ہو چکی ہے اور اب رعنا کا یہ حال ہے کہ وہ سلمان سے اپنے اس قلبی لگاؤ کو بیگانگی اور بے تعلقی سے تبدیل کر سکتی ہے اپنے دل کو مار سکتی ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک مجرمانہ ذہنیت کے انسان سے اپنی وابستگی کو قائم رکھے البتہ اس کو بھی اگر حیرت تھی تو صرف یہ کہ سلمان کی طرف سے اتنا بڑا دھکا پہنچنے کے بعد بھی جو اثر اس پر ہونا چاہیئے تھا وہ کیوں نہیں ہے وہ بدستور اپنی شگفتگی کو کیونکر قائم کئے ہوئے ہے اور اس کے ہر انداز سے یہ کیوں ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے اس نے کچھ کھویا ہی نہیں ہے شروع شروع میں تو اس کو یہ شبہ رہا کہ رعنا در اصل شگفتہ نہیں ہے بلکہ شگفتگی کی اداکاری کر رہی ہے مگر رفتہ رفتہ اس کو اندازہ ہو گیا کہ یہ بناوٹی شگفتگی نہیں بلکہ سلمان کی اس نقاب کشائی کی اس کو واقعی کوئی پروا نہیں ہے اور اس یقین کے بعد آخر اس نے ایک دن یہ ذکر چھیڑ ہی دیا:

”رعنا ایک بات پوچھوں مگر پہلے مجھ کو یہ یقین دلا دو کہ تم مجھ سے بھی سچائی کو چھپانے کی کوشش کر کے میرا دل نہ توڑو گی۔“

رعنا نے غور سے ندرت کو دیکھتے ہوئے کہا ”یہ بات تم مجھ سے کہہ رہی ہو یا پرویز بھائی سے باتیں کرنے کا گویا ریہرسل کرنا چاہتی ہو۔“

ندرت نے پرویز کے نام پر شرمائے بغیر نہایت سنجیدگی سے کہا ”دیکھو رعنا میں اس وقت بیحد سنجیدہ ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ تم بھی سنجیدہ ہو جاؤ۔“

رعنا نے اپنا دوپٹہ درست کر کے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا ”لو ہو گئی سنجیدہ۔ مگر یہ تم پر سنجیدگی کا دورہ کیوں پڑا ہے اس وقت۔ خیریت تو ہے۔“

ندرت نے کہا ”میری خیریت کو تو جانے دو مگر مجھ کو تمہاری خیریت نظر نہیں آتی اگر تم نے اپنا یہ انداز تبدیل نہ کیا اور میری بات کو اسی طرح مذاق میں ٹالتی رہیں۔ یا صاف صاف یہی کہہ دو کہ مجھ کو تمہارے ہر راز سے آگاہ ہونے کا کوئی حق نہیں ہے اور بعض راز ایسے بھی ہیں جو مجھ سے بھی چھپائے جا سکتے ہیں۔“

اب رعنا نے بھی سنجیدگی سے کہا ”دماغ ٹھکانے ہے یا نہیں۔ میں نے کونسی بات تم سے کب چھپائی ہے؟“

ندرت نے کہا "پہلے تو کبھی نہیں مگر اب مجھے شبہ ہو رہا ہے اور مجھ کو یہ یقین نہیں آتا کہ سلمان بھائی سے مایوس ہونے کا تم پر سچ مچ کوئی اثر نہیں ہے"

رعنا نے سوال کیا "تو کیا تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں خود اپنے ساتھ منافقت کر رہی ہوں"

ندرت نے کہا "یہ تمہارا تو مجھے علم نہیں مگر ہو سکتا ہے کہ باقی سب کے ساتھ جن میں میں بھی شامل ہوں منافقت کر رہی ہو"

رعنا نے کہا "ڈوب مرو ندرت چلو بھر پانی میں۔ تم کو یہ کہتے ہوئے شرم بھی نہ آئی۔ اور سب تو خیر کیا میں تمہارے ساتھ بھی منافقت کر سکتی ہوں۔ یہ خیال ہی تمہارے ذہن میں کیونکر آیا"

ندرت نے کہا "یہ بھی یوں آیا ہے میرے ذہن میں یہ خیال کہ مجھے یہ معلوم تھا کہ تم سلمان بھائی سے جذباتی طور پر کس حد تک وابستہ تھیں"

رعنا نے کہا۔ "ٹھیک ہے میں واقعی اس سلسلہ میں اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ تم اس کو جذباتی وابستگی ہی کہہ سکتی ہو مگر جذبات کی رَو میں بہہ جانے والے کے لیے یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ وہ ڈوب ہی جائے ایسی صورتیں بھی پیدا ہو سکتی ہیں کہ وہ منجدھار سے صحیح سلامت نکل آئے چنانچہ میں تو بے حد خوش ہوں کہ مجھ کو ڈوبنے سے پہلے ہی بچاؤ کا موقع مل گیا اور میں اس کو اپنی خوش نصیبی سمجھ کر بے حد خوش ہوں"

ندرت نے کہا "تم کو کیا یہ بالکل محسوس نہیں ہوتا کہ تم نے کچھ کھو دیا ہے"

رعنا نے کہا "برعکس اس کے مجھ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں خود کھو گئی تھی اور اب میں اپنے کو پا گئی ہوں۔ تم کیسی باتیں کر رہی ہو ندرت کیا خود تم یہ گوارا کر سکتی ہو کہ خدانخواستہ پرویز بھائی تمہاری محبت اسمگل کرنا شروع کر دیں"

ندرت نے تعجب سے کہا "یہ محبت کس طرح اسمگل ہو سکتی ہے"

رعنا نے کہا "ہو سکتی ہے۔ بلکہ ہوتی ہے۔ نہ جانے کتنے دنوں تک خود میری محبت اسمگل ہوتی رہی ہے۔ کاش تم اس باریک بات کو سمجھ سکو کہ محبت اس ایمانداری کا نام ہے جو کسی ایسے دل میں پنپ ہی نہیں سکتی جس میں بے ایمانی بھی رچ بس رہی ہو۔ ایک جرائم پیشہ آدمی اور خواہ کچھ کر سکتا ہو مگر محبت ہرگز نہیں کر سکتا محبت کے ساتھ بے ایمانی ضرور کر سکتا ہے جو میرے ساتھ کی گئی"

ندرت نے کہا "مگر اس کا افسوس تو ہوتا ہے کہ جس کو ہم اپنی محبت کا مرکز بنائے ہوئے تھے وہ سراسر دھوکا نکلا"

رعنا نے کہا "مگر مجھ پر تو اس کے برعکس یہ اثر ہوا ہے کہ گویا میں کسی نہایت مہلک مرض سے یکایک صحت یاب ہو گئی ہوں اور میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے وقت سے پہلے ہی مجھ کو ایک ایسے خطرے سے بچا لیا جو میرے لئے واقعی جان لیوا ثابت ہوتا۔ سلمان تو اس لیے ناقابلِ علاج ہیں کہ وہ اپنے مرض کو مرض ہی نہیں سمجھتے"

ندرت نے کہا "محبت تو اندھی مشہور ہے مگر تمہاری محبت تو بڑی دور بین نکلی"

رعنا نے مسکرا کر کہا "جی ہاں اندھوں کی محبت اندھی ہی ہوتی ہوگی مگر میں تو اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے دغابازی کو محبت دیکھ نہیں سکتی مجھ کو یقین ہے کہ سلمان مجھ کو دھوکہ دیتے رہے ہیں اور اس یقین کے بعد ان کو کھونے کا غم ہونے کے

بجائے ہیں تو خس کم جہاں پاک کہا کرتی ہوں۔"

ندرت نے کہا "مگر اب کیا ہوگا؟"

رعنا نے کہا "نیلام ہوگا اور کیا ہوتا۔ ہم لوگوں میں لڑکیوں کا نیلام ہی تو ہوتا ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ اس کو جوا کہہ لو۔ مگر میرے دل کو یہ اطمینان ہے کہ جس خدا نے مجھ کو اس گرداب سے بچایا ہے جو سلمان نے میرے لیے کیا تھا وہ بیڑہ ڈبوئے گا نہیں پار ہی لگائے گا۔"

ندرت نے کہا "سنا ہے کہ آجکل تمہاری پھوپھی جان اپنے نورِ نظر میاں احسن سلمہٗ کے لیے پھر مہم شروع کیے ہوئے ہیں۔"

رعنا نے قہقہہ لگا کر کہا "یہ مہم تو اس قدر دلچسپ ہے کہ سچ پوچھو تو میرے لیے دل کے بہلانے کا اس سے بہتر اہتمام اور کوئی ہو ہی نہ سکتا تھا۔ کاش میں تم کو یہ تماشے دکھا سکتی اور عزیز القدر میاں احسن سلمہٗ کو تم آجکل دیکھ سکتیں کہ وہ کس حد تک حکم کے غلام بنے ہوئے ہیں۔"

ندرت نے ہنس کر کہا "اچھا اب گویا ترقی کر کے حکم کے غلام بن گئے ہیں اینٹ کے غلام تو وہ ہمیشہ ہی سے تھے کہ عقل پر پتھر برسا کرتے تھے۔"

رعنا نے کہا "خیر وہ پتھر تو آپ کی دعا سے اب بھی برس رہے ہیں مگر اب دیکھو گی تو مشکل ہی سے آنکھ ٹھہر سکے گی مزاجِ یار کی طرح اس قدر جلد جلد اپنے کو بدلتے رہتے ہیں کہ گرگٹ بھی کیا رنگ بدلے گا۔ صبح سوٹ میں ہیں تو دوپہر کو شیروانی میں اور شام کو شکاری لباس میں ہیں تو رات کو ڈرس سوٹ تک میں جلوہ دکھا جاتے ہیں۔"

ندرت نے ہنس کر کہا "سچ مچ ڈریس سوٹ میں تو اچھے خاصے بینڈ ماسٹر نظر آتے ہوں گے۔"

رعنا نے کہا "اس سے ان کو کوئی بحث نہیں کہ وہ کیا نظر آتے ہیں وہ تو صرف اس جستجو میں ہیں کہ میرے نقطۂ نظر سے ان کو کیا نظر آنا چاہیے۔"

ندرت نے بڑی سنجیدگی سے کہا "بہن یہ تو اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے کہ اس نے تم کو ایک ایسا کھلونا عطا کر دیا ہے مگر تم اس سے پوری دلچسپی شاید ہی لیتی ہو۔"

رعنا نے تردید کرتے ہوئے کہا "جی نہیں میں ایسی بدمذاق نہیں ہوں کہ ایسی خداداد دلچسپی کی بھی ناقدری کروں۔ اچھا تم یہ کرو کہ کل آجاؤ تا یہ تماشہ دیکھنے کے لیے۔"

ندرت نے کہا "لو بھلا اب بھی نہ آؤں گی۔ میں تو صبح سے شام تک کے لیے آؤں گی۔"

یہ پروگرام طے ہو جانے کے بعد رعنا ندرت سے رخصت ہو گئی۔

دُردانہ

ایک جدید مثنوی سے ریڈیائی اوپیرا

ترتیب: **شوکت تھانوی**
عشرت رحمانی

(یہ اوپیرا آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے لیے ۱۹۴۱ء میں لکھا گیا تھا۔ حضرت جگرؔ مرادآبادی سے ایک مثنوی لکھوائی گئی اس کی اساس پر شوکت تھانوی مرحوم اور عشرت رحمانی نے ریڈیائی اوپیرا مرتب کیا۔ گیت اور غزلیں عشرت رحمانی نے لکھیں۔ حضرت جگرؔ کے بعض اشعار اس میں استعمال ہوئے ہیں باقی تدوین شوکت تھانوی اور عشرت رحمانی کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہے ——— اور سید انصار ناصری حال ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان نے ہدایت کاری کے فرائض انجام دیے تھے جہاں آرا کجن مرحومہ مشہور فلم و اسٹیج اداکارہ اور گلوکار طلعت محمود نے ہیروئن اور ہیرو کے کردار انجام دیے تھے۔ مدیر)

(نغمہ)

ایک مترنم آواز:
بزم فطرت عجیب فسانہ ہے   حسن و الفت کا کارخانہ ہے
شمعِ غم خانۂ حیات ہے عشق   زندگی کی اجالی رات ہے عشق
ایسے ہی عشق کا اِک افسانہ   سُنئے اب سرگذشتِ دُردانہ

(موسیقی)

راوی: ———
قصۂ دل پذیر روپ نگر   عشق کی سیر گاہ کا تھا وہ گھر
اُمرا جس میں شان کے مالک   غُربا آن بان کے مالک
اُن میں سب سے زیادہ باوقعت   ایک نواب تھے فلک رفعت
تھے کنیز و غلام و دولت و زر   گوہرِ بے بہا حسین دُختر

خوب رو شاد کام نیک نہاد   باپ ماں کے دلوں کی زندہ مراد
نام دُردانہ چہرہ مہ طلعت   گوہرِ شب چراغ خوش قسمت
سولھویں تھی جو نیک فال گرہ
ہوا تجویز جشنِ سال گرہ

(شہنائی کی آواز)

(باجوں اور مجمع کا شور)

گیت : مبارک ہو یہ رنگ و بو کی کہانی
بہاروں پہ آئی کلی کی جوانی   مبارک ہو یہ دورۂ شادمانی
مبارک ہو یہ رنگ و بو کی کہانی
یہ نغمہ یہ عشرت یہ رنگیں نظارے   بہر سو نگارے بہر سو بہارے
سناتے ہیں گل سولھویں کی کہانی
ہیں ناہید و زہرہ بھی رقصاں خوشی سے   سنائے نہ کیوں جھوم اٹھیں بیخودی سے
یہ ہے بربطِ ماہ کی نغمہ خوانی
مبارک ہو یہ رنگ و بو کی کہانی

راوی : بزم عیش و نشاط برپا ہے   رقص ہے زمزمہ ہے نغمہ ہے
جشن گہ ہے کہ آنکھ کی پتلی   سمٹ آئی ہے جس میں کل بستی
آمد آمد ہے مہمانوں کی   دھوم ہر سمت شادیانوں کی
شادماں آج ہیں فلک رفعت   کر رہے ہیں ہر ایک کی آؤ بھگت

(دور سے آوازیں قریب آتی ہیں)

آواز نمبر ۱ : آداب عرض!

آواز نمبر ۲ : تسلیمات عرض!

آواز نمبر ۳ : تشریف لائیے قبلہ۔

آواز نمبر ۱ : آداب۔ آداب

آواز نمبر ۲ : اِدھر تشریف رکھیے

فلک رفعت : ؎ غریب خانہ میں بھائی قمر کو دیکھتے ہیں
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

آواز ۱: کیا خوب نواب صاحب۔ ماشاءاللہ!

آواز ۲: واللہ کیا خوب فرمایا ہے۔

آواز ۳: گویا مرزا نوشہ کا مصرع اپنا بنا لیا۔

فلک رفعت: قدر دانی۔ ذرّہ نوازی۔ اے حضرت تشریف رکھیے۔ تشریف رکھیے۔

قمر: ع اُدھر تو دیکھیے خسرو نواب آئے ہیں

فلک رفعت: ع زہے نصیب کہ تشریف آپ لائے ہیں

خسرو نواب: ع مرا یہ گھر ہے حضور اس میں کیا تکلف ہے!

خسرو: ع "کون یہ سربلند" آئے ہیں

فلک رفعت: ع آہا! "ارجمند" آئے ہیں

آواز ۱: آئیے آئیے تشریف لائیے۔

آواز ۳: میاں ارجمند اکبر اس طرف۔

ارجمند: حاضر۔ حاضر قبلہ۔

فلک رفعت: ؎ ہمہ تن انتظار تھا آؤ   اس طرف آؤ صدر میں بیٹھو!

ارجمند: آداب عرض۔ حاضر ہوا۔

فلک رفعت: ؎ ارے بھئی خاصدان لائے کوئی   پیچواں اس طرف لگائے کوئی

آواز: حاضر سرکار۔ حاضر۔

ارجمند: ؎ جشن کی لاجواب زینت ہے   آسماں کو بھی جس سے حیرت ہے

فلک رفعت: ؎ ہے تمہارے ہی دم سے یہ توقیر   ارے بھئی گانے میں ہے کیوں تاخیر

آواز: بہت خوب سرکار۔

(گانا)

——— (جشن) ———

کورس: یہ نغمہ پُرکیف یہ رنگین نظارے   دھرتی پہ اُتر آئے ہیں آکاش کے تارے
اور ہیں مہ و انجم ہیں محبت سے اشارے
رنگین نظارے ہیں یہ رنگین نظارے
مستی کا چھلکتا ہوا میخانہ جہاں ہے   یا نورِ محبت کا پری خانہ جہاں ہے
کیفیتوں میں غرق ہیں آکاش پہ تارے
رنگین نظارے ہیں یہ رنگین نظارے

مسرور جوانی کی یہ شوخی بھری باتیں   ہیں بادۂ عشرت سے یہ بہکی ہوئی راتیں
نغموں کی جوانی کہیں ایسے میں پکارے
رنگین نظارے ہیں یہ رنگین نظارے

منظر! زنانخانہ

راوی: تھی محل میں بھی گرم اک محفل   پردہ پردہ میں دید کے قابل
عورتوں کا بپا تھا ہنگامہ   دوڑتی پھر رہی تھی ہر ماما
آرہی تھیں سواریاں پیہم   کرتی تھیں پیشوائی خود بیگم

(ڈومنیوں کا گانا)

شادیاں رے آج ہے جھما جھم
لاری مالن سہرا بنی کا!
اس سہرے پہ تارے ہوں چم چم

میّا باوا کو خوشیاں مبارک
خوشیاں رہیں یہ جم جم
شادیاں رے آج ہے جھما جھم

(موسیقی)

راوی: تھا محل میں جو آئینہ خانہ   اس میں تھی محوِ حسن دُردانہ
ہائے وہ سوز ساز کی تصویر   حسن کا خواب عشق کی تعبیر
آرزوے طرب کا میخانہ   زندگی کا حسین افسانہ
بال اپنے بناتی جاتی تھی   زیرِ لب گنگناتی جاتی تھی

دُردانہ: (گاتی ہے) بے زبانی اگر زباں ہو جائے   داستانِ دل کی جاوداں ہو جائے
ہے محبت سکوت میں سب کچھ   کچھ نہیں ہے اگر بیاں ہو جائے

(ستارہ کا آنا)

ستارہ: (کھلکھلا کر) یہ رہیں دُردانہ آخر پا لیا
دُردانہ: نا بہن نا مت کرو یوں گدگدی
ستارہ: دیکھ تیری گت بناتی ہوں ابھی

دُردانہ : بس ستارہ بس کہاں تھی یہ بتا
ستارہ : ڈھونڈتی پھرتی تھی تم کو ہر جگہ
دُردانہ : ہیں کہاں تھی بس اسی کمرے میں تھی
ستارہ : بیوی نتّو کچھ اِدھر کی ہے خبر ؟
دُردانہ : کیا خبر ؟ کیسی خبر ؟
ستارہ : تمھاری امّی سے مل کے آئی ہوں   اور بھی باتیں سن کے آئی ہوں
ارجمند اکبر کی ماں کے پاس ہیں   ہونے والی جو تمھاری ساس ہیں

دُردانہ : بس ستارہ چپ بھی رہ -
ستارہ : سن تو سہی -
دُردانہ : جانے کیا آگے کہے -
ستارہ : کہہ رہی تھیں سولھواں ہے ختم سال   کیوں نہ شادی کا اُٹھائیں اب سوال
ارجمند اب آپ کا داماد ہو !   میرا دُردانہ سے گھر آباد ہو
دُردانہ : مجھ کو وحشت ہوتی ہے چھوڑو یہ ذکر   ابّا امّی کو مبارک ہو یہ فکر
ہیں وہ دولت مند اور دولت پسند   انتخاب اُن کا نہ ہو کیوں ارجمند
ارجمند اکبر ہیں دولت کے سوا   کوئی پوچھے تو سہی خوبی ہے کیا

ستارہ : اے ہٹاؤ یہ ذکر چھوڑو بھی   اِس طرح سے نہ لب کرٹھاؤ جی
چلو اٹھو دریچہ میں آؤ   ذرا محفل سے دل کو بہلاؤ
ہنسو بولو ہے نیک فال گرہ   آج خوشیوں بھری ہے سالگرہ

دُردانہ : سب ہیں ساماں کہ جن سے دل مانوس   پھر بھی ہوتی ہے اِک کمی محسوس
ستارہ : کیا ہُوا خیر ہے، کمی کیسی ؟
دُردانہ : سنو! آئے نہیں ہیں ناصر آج ؟
ستارہ : پر نہ آنے کا کچھ سبب بھی کھلا ؟
دُردانہ : بے بُلائے وہ کیسے آتے بھلا ؟
سمجھے شرکت ہیں اپنی وہ تحقیر   ہوئی خوداری ان کی دامنگیر

ستارہ : ہاں بہن وہ بھی تھے کبھی خوشحال
دُرّدانہ : تم سے پوشیدہ کب ہے یہ احوال
جب سے پردہ میں ہیں بٹھائی گئی   خاص کر اُن سے جب چھپائی گئی
اور بزرگوں کے دیکھے بدلے طور   اُن کا انداز ہو گیا کچھ اور
ستارہ : بچپنے کی منگی ہوئی تھیں تم   اُن کے دل میں بسی ہوئی تھیں تم
اُن پہ افلاس کا جو آیا دَور   بدلے ماں باپ کے تمھارے طور
دُرّدانہ : ہے عجب اس زمانہ کا معیار   وہی سب کچھ ہے بس جو ہے زردار

(آہٹ)

ستارہ : کون ؟ گلشن ہیں !
دُرّدانہ : (سنبھل کر) آؤ آؤ بوا !
گلشن : جیوُ جم جم نصیب ہو اچھا ۔
دُرّدانہ : ادھر بیٹھو برسوں میں دکھلائی صورت
گلشن : میرے چاند کو سولھویں ہو مبارک
میں خود دیکھنے کے لیے تھی پریشاں   کیا آج ناصر میاں نے یہ ساماں
اُنھیں نے یہ خط دے کے بھیجا ہے مجھ کو   کہا ہے کہ جلدی جواب اس کا لاؤ
ستارہ : پڑھو خط کو دُرّدانہ کیا مدعا ہے   نہ آنے کا شاید سبب کچھ لکھا ہے

—: خط :—

مردانہ آواز: میری بیداریوں کے خواب اسلام   ذرّہ کہتا ہے آفتاب اسلام
ہو مبارک تمھیں یہ سولھواں سال   مہ کامل بنا ہے آج ہلال
گو بظاہر ہیں بار یاب نہیں   کیا تصوّر بھی کامیاب نہیں
وہی معصوم چاندنی راتیں   بھولی بھولی سی سب وہی باتیں
تم تصوّر میں گنگناتی ہو   گو بظاہر چھپائی جاتی ہو
ہے یہ پردہ فقط مرا افلاس   ہے خطا یہ نہیں ہے دولت پاس
وہی محفل میں آج ہیں مہماں   خاندانی تھے جو کہ دشمنِ جاں
خیر اس ذکر ہی کو رہنے دو   تہنیت جشن کی قبول کرو
ٹوٹے دل کی دعائیں بھی لے لو   آرزوؤں کے پھول بن کے رہو
تا ابد یہ بہار دیکھو تم   ایسی خوشیاں ہزار دیکھو تم

ستارہ : آئینہ کی صورت ہے ہر لفظ میں سچائی   وہ آئے نہیں یہ بھی دراصل تھی دانائی

گلشن : میں دیر سے آئی ہوں اب مجھ کو اجازت ہو۔

ستارہ : دُردانہ بہن پرچہ تم لکھ کے انھیں دے دو

دُردانہ : لکھوں بھی تو کیا لکھوں کچھ تم ہی ذرا بولو

ستارہ : ہاں میری سمجھ میں بھی آیا نہ جواب اس کا

دُردانہ : میں نے تو یہ لکھا ہے ؎

بے زبانی اگر زباں ہو جائے   داستاں دل کی جاوداں ہو جائے

ستارہ : بس ٹھیک ہے گلشن یہ پرچہ انہیں دے دینا!

(جاتی ہے)

گلشن : جیو سرکار خوش رہو جم جم۔

ستارہ : (شعر گاتی ہے) بے زبانی اگر زباں ہو جائے   داستاں دل کی جاوداں ہو جائے

(موسیقی)

راوی :

گئی گلشن جواب لے کے اُدھر   حال دُردانہ کا ہُوا ابتر!
گو ستارہ نے لاکھ سمجھایا   پر نہ دُردانہ کو قرار آیا!
تھی ادھر فرطِ غم سے یہ پامال   حال ناصر کا تھا اُدھر بے حال
اِسی صورت گذر گئے کئی ماہ   رنج سے دونوں کے تھے حال تباہ
ہو گئی ارجمند سے نسبت   اور نزدیک آ گئی رخصت
اس مصیبت میں جو سہارا تھی   دونوں کے حق میں اِک ستارہ تھی
یہی اک دوست تھی یہی دمساز   یہی مونس تھی اور یہی ہمراز
دونوں کے درد سے تھی وہ آگاہ   سوچ کر اُس نے اک نکالی راہ

ستارہ :

لاؤں تدبیر یہ برائے کار   کر لیں یہ دونوں آخری دیدار
درد اک دوسرے کا کہہ سن لیں   ورنہ پھر بعد میں ملیں نہ ملیں

راوی :

کی ستارہ نے یہ مسیحائی   اُجڑے گلشن میں پھر بہار آئی
اُس کی تدبیر سے کھلا یہ گل   باغ میں مل گئے گل و بلبل!
معرکہ تھا عجیب اک درپیش   ہوش میں تھے کہاں محبت کیش

اس طرف شرم اور ادائے ناز   اس طرف بیقرار ذوقِ نیاز
آنکھیں پُرنم گھٹے گھٹے ارماں   دونوں جانب دبے دبے طوفاں
بے زبانی زباں تھی گویا!   خامشی داستاں تھی گویا!
ناصر اک دلفگار پروانہ!   شعلۂ بے قرار دردانہ!
تمتمائے ہوئے سے وہ رُخسار   جام خوش رنگ میں شفق کی بہار
تھی مجسّم وہ کھوئی کھوئی سی   جاگی جاگی سی سوئی سوئی سی
غم سے دُردانہ بیقرار ہوئی   دل امنڈ آیا اشکبار ہوئی

سسکیاں

ناصر : دُردانہ ——— دُردانہ
خدا کے واسطے دُردانہ اشکبار نہ ہو!
دُردانہ : خزاں نصیب ہوں کیونکر غمِ بہار نہ ہو!
ناصر : نگارِ خوبی و رعنائی بہار ہو تم   کسی کی قسمتِ بیدار کا سنگار ہو تم
دُردانہ : نہ ایسی باتوں سے للہ دل دکھاؤ تم   میں خود ہوں سوختہ ساماں اب جلاؤ تم
ناصر : یہ دل جلانے کی باتیں ہیں دیکھو دُردانہ!   چھلک رہا ہے میرے دل کا آج پیمانہ
دُردانہ : کہاں گیا وہ مسرّت کا دَور یاد کرو   وہ اپنا صحنِ چمن اور وہ چاندنی راتیں
ناصر : ورق الٹ بھی دو وہ بھولے ہوئے فسانے کے   انھیں نہ یاد کرو خواب کی تھیں وہ باتیں
دُردانہ : ملے تھے آج مقدر سے اب ملیں نہ ملیں   خدا ہی جانے کہ اس غم میں "اب جئیں نہ جئیں"
ناصر : یہ بدشگونی ہے کیسی نہ اس طرح ہو اُداس   تمہاری یاس بڑھاتی ہے میرے دل کا ہراس
دُردانہ : بس اب تو موت ہی ناصر ہے میری چارہ ساز

(قدموں کی چاپ)

ناصر : ادھر ہی آتا ہے شاید کوئی سنو آواز
ستارہ : شش شش تمہارے گھر سے بلانے کو آگئی ماما
دُردانہ : میں جا رہی ہوں بپا ہو نہ کوئی ہنگاما!

(جاتی ہے)

ناصر : دُردانہ ——— دُردانہ
راوی : یوں اچانک وہ ہو گئی رخصت   ٹوٹی ناصر کے دل پہ اک آفت

درد پہلو میں یوں چمک اُٹھا   شعلۂ زندگی بھڑک اُٹھا
دل میں یارائے ضبط ہی نہ رہا   ہوش و تمکیں سے ربط ہی نہ رہا
اس کو رہ رہ کے تھی یہی وحشت
ناصر: کر رہے ہیں یہ کیا فلکِ رفعت؟
ارجمند ایک رند مشرب ہے   اس کو رنگینیوں سے مطلب ہے
ہر گھڑی رقص نغمہ سرشاری   ہے یہی اس کا شغلِ بیکاری
اس کو دُردانہ سے ہے کیا نسبت   اس کی کچھ اور اُس کی کچھ فطرت
ناصر: کہیں شادی کا ہو نہ یہ انجام   کہ بنے اُس کی موت کا پیغام
کیوں نہ خود میں ہوں حاضرِ خدمت   دیکھوں کہتے ہیں کیا فلکِ رفعت
کیا عجب ہے جو کچھ سمجھ جائیں   عقل کو اب بھی کام میں لائیں

نواب: آپ اور میرے یہاں آئیں خدا کی قدرت   آج کیوں بخشی گئی ہے مجھے ایسی عزت
راستہ بھول کے کیا آپ اِدھر آ نکلے   خیر فرمائیے کیا ہے مرے لائق خدمت

ناصر: رسم کے طور پہ آنے سے رہا گو معذور   میری حالت نے مجھے کر دیا ایسا مجبور
بندہ مطلب کے لیے اب بھی نہیں آیا ہے
نواب: حال پہ میرے کرم کس لیے فرمایا ہے
ناصر: میں نے دُردانہ کی نسبت کا سُنا جب سے حال
نواب: دیکھ کر آپ کو خود مجھ کو ہوا تھا یہ خیال   آشکارا تھا جناب آپ کی صورت سے سوال
ناصر: میں قسم کھاتا ہوں اپنے سے سروکار نہیں   ارجمند اچھا ہے مجھ سے مجھے انکار نہیں
نواب: مگر اِس باب میں اب کچھ بھی نہ فرمائیں جناب   بے تُکے آپ کی ہر بات کا ہے بس یہ جواب
ناصر: اس کی دولت سے وجاہت سے تو انکار نہیں   پھر بھی دُردانہ کے لائق تو وہ زنہار نہیں
نواب: کون سا عیب ہے اُس میں جو ہوا انگشت نما   ہے رئیس ابنِ رئیس اُس میں خرابی ہے کیا؟
ناصر: رنگ رلیاں ہیں وہاں آٹھ پہر اور شراب
نواب: سن چکا اب میں بہت آپ کی مہمل بکواس   وقت اس کے لیے بیکار نہیں میرے پاس
تم جلے دل کے پھپھولوں سے ہو اپنے مجبور   تم کو تو اس میں نظر آئیں گے لاکھوں ہی قصور
ناصر: قبلہ و کعبہ یہ الزام ہے مجھ پہ بے سود   ہے فقط آپ کی مجھ کو تو بھلائی مقصود

نواب: اپنی اولاد کی ہے تم سے زیادہ مجھے فکر   ختم فرمائیں براہِ کرم اب آپ یہ ذکر

راوی:
جب یہ کوشش بھی ہو گئی بیکار   مرحلہ اور بن گیا دشوار
تھی ہر اک سمت اب تو یاس ہی یاس   گم ہوئے جا رہے ہیں ہوش و حواس
تھک کے بیٹھا مگر نہ جاتا تھا   کسی پہلو نہ چین آتا تھا!
تھا خیالات کا عجیب ہجوم   اور نتیجہ ہر ایک کا معلوم
یک بیک اُس کو یہ خیال ہوا :-

ناصر:
ارجمند" مجھ سے گو ہے "لاکھ خفا
پھر بھی خود اُس کے گھر اگر جاؤں   کیا عجب ہے، کہ راہ پر لاؤں

راوی:
ایک امید کے سہارے پر   بہہ چلا حسرتوں کے دھارے پر
پہنچا وہ ارجمند کے ایواں   تھا جہاں عیش کا بپا طوفاں

(ارجمند کی محفل - رقص و نغمہ)

ارجمند : کیا خوب رقص و نغمہ ہے
دوست ۱: مے ہے سرود ہے
دوست ۲: یہ جلوہ گاہِ ناز ہے
دوست ۳: یا بزمِ نور ہے
دوست ۱: اپنے نشے سے مے بھی یہاں چُور چُور ہے
ارجمند : عشرت کا ہے وفور
ساقی : مسرت مزید ہے
دوست ۱: ہر شب شبِ برات ہے
دوست ۲: ہر روز عید ہے
ارجمند : چھلکے جام چلے پیمانہ   لب پر نام رہے دُردانہ
سب دوست: دُردانہ ——— دُردانہ ——— دُردانہ
ناصر : ہے اجازت کہ اندر آ جاؤں ؟
ارجمند : کون ہے ؟
ناصر : میں آپ سے ملنے آیا ہوں -

ارجمند : تو آؤ ناچ گانا سنو

ناصر : جی - جی نہیں - ہیں

ارجمند : شرما رہے ہو کیا میری پریوں کے سامنے ؟ (ہنستا)

ناصر : تنہائی میں سنو کہ ضروری ہے التجا ؟

ارجمند : کیا تخلیہ کی بات ہے ؟ اچھا تو تخلیہ !

(تخلیہ)

ارجمند : اوہو - یہ کون - ہاں یہ آپ !

ناصر : ہاں بھائی میں ہوں

ارجمند : یعنی کہ ناصر میاں یہ آپ ؟
کہیئے یہ آج کس لیے زحمت اُٹھائی ہے ؟

ناصر : اک التجا غریب کو اس دَر پہ لائی ہے

ارجمند : یہ کس طرح سے راستہ حضرت گئے ہیں بھول
میخانہ میں یہ حضرت زاہد کا کیوں نزول

ناصر : گو ارجمند ہم میں بہت کچھ ہیں اختلاف

ارجمند : چھوڑو بھی اختلاف کو تم آ گئے یہاں
اب بیٹھو بھول جاؤ وہ سب پچھلی داستاں
اب غرقِ جام کر دیں ہر اک اختلاف کو

ناصر : انسانیت کے نام پہ کرتا ہوں التجا

ارجمند : آخر کہو تو صاف کہ یہ ماجرا ہے کیا ؟

ناصر : دُردانہ کے خیال کو دل سے نکال دو
شادی جو ہو رہی ہے کسی طرح ٹال دو

ارجمند : (قہقہہ مار کر) استاذ تم کو مان گئے خوب ہے سوال
کیا خوب مجھ سے آئے ہیں چلنے یہ آپ چال

ناصر : تم کو غلط خیال ہے میری نہیں غرض !

ارجمند : اپنا علاج کیجئے دل کا ہے یہ مرض !
حیرت تھی مجھ کو خود بھی کہ آئے ہیں کیوں جناب — مغرب سے کیوں طلوع ہوا آج آفتاب
اتنا تو بیوقوف نہ سمجھیں مجھے جناب — حاوی نہیں ہوئی ہے ابھی اس قدر شراب

یہ داؤں پیچ آپ کے سب جانتا ہوں میں   حرفوں کے ہیں بنے ہوئے پہچانتا ہوں میں

ارجمند : بس بس بہت ہیں سن چکا ان مہملات کو   اپنی گرہ میں باندھ لو تم میری بات کو
شادی اٹل ہے ہو کے رہے گی وہیں ضرور   پامال کر کے رکھوں گا میں آپ کا غرور

راوی : ہوا تقدیر کا لکھا پورا   آخر کار دن وہ آ پہنچا
آج شادی تھی کیوں نہ ہوتی دھوم   مہمانوں کا تھا محل میں ہجوم
رشکِ فردوس تھا محل گویا   گوشہ گوشہ میں جشن تھا برپا
دھوم ہر سمت ہے برات آئی   نغمے برسا رہی ہے شہنائی

(نغمہ)

راوی : ارجمند آئے بن کے یوں نوشہ   سب نے خوش ہو کے واہ واہ کہا
مطربوں کی وہ گونجتی آواز   زمزمہ بار ہر طرف تھے ساز
تھا یہاں تو مسرتوں کا یہ دَور   اور ناصر کا تھا حال تھا کچھ اور
دل شکستہ تھا زیست سے بیزار   بیکسی میں نہ تھا کوئی غم خوار
ضبط جب ہو گیا بہت دشوار   حسرتیں گنگنا اٹھیں اک بار

(ناصر کا گانا)

مل کے بچھڑ گئیں ہم سے نظریں آہ مقدر پھوٹ گیا
ان کے ہاتھوں بن کر آخر دل کا کھلونا ٹوٹ گیا
ہائے کہاں اب بادہ باقی افسانہ ہے جلوۂ ساقی
کشمکش اندوہِ وفا میں ہاتھ سے ساغر چھوٹ گیا
غنچے چٹکے سب نے دیکھے دل کی کون آواز سنے
کس کے دل کا سہارا ٹوٹا کس کا ساتھی چھوٹ گیا

(منظر — تبدیل ہوتا ہے)

(آگ آگ کا شور بلند ہے)

راوی : شور اٹھا آگ آگ کا ناگاہ   چرخ نیلی ہوا دھوئیں سے سیاہ

(شور جاری رہتا ہے)

اک کہرام سا مچا ہر سو   گویا محشر سا تھا بپا ہر سو
نغمہ و رقص سارے بھول گئے   دفعتاً ہاتھ پاؤں پھول گئے
دیکھتے تھے کھڑے تماشائی   تیز آتش کی شعلہ آرائی

ستارہ: ارے جاکر دلہن کو کوئی بچائے   کوئی دُردانہ کو نکال کے لائے
اُس کے کمرے میں جاکے دیکھو آگ   ہائے دیکھو اُجڑ رہا ہے سہاگ

راوی: ایسی ہمت تھی کس میں سامنے آئے   کیا پڑی تھی کسی کو جان گنوائے
سُنی ناصر نے شور کی آواز   اُس کی وارفتگی بنی اعجاز
سُن کے بھاگا وہ جیسے دیوانہ   شمع کی سمت مثلِ پروانہ
سامنے تھا اک آتشیں سیلاب   آگ کی موجیں آگ کے گرداب
شعلوں کو چیرتا بڑھا آگے   دیکھنے والے نقشِ حیرت تھے
دُھن کا پکا تھا عزمِ مردانہ   وہیں پہنچا جہاں تھی دُردانہ
وہ بچا لایا اُس کو آخرکار   وہ تھی بیہوش اور زار و نزار

(شور)

آگ اِدھر بارگاہ تک پہنچی   آنچ اب عزّ و جاہ تک پہنچی
ارجمند اور اُس کے سب ساتھی   آگ میں گھر چکے تھے باراتی
ناصر اب اُس طرف بڑھا یکبار   لایا دُولہا کو بھی وہ آخرکار
دیکھ کر اُس کی جرأت و ہمّت   متحیّر تھے خود فلک رفعت
گرا چکرا کے ناصرِ جانباز   تھے مگر اُس کے اب تو سب دمساز

ارجمند: ارے ناصر کو کیا ہوا دیکھو!
فلک رفعت: لخلخہ جلد لا کے اِن کو سُنگھاؤ
ناصر: میں ہوں اچھا نہ فکر کچھ کیجئے ——— پہلے دُردانہ کی خبر لیجئے!
راوی: بارے دُردانہ ہوش میں آئی   ہونٹ کانپے نگاہ تھرّائی
دُردانہ: ناصر ——— ناصر
فلک رفعت: کیا ہے دُردانہ؟
ارجمند: یہ رہے ناصر

فلک رفعت: محسنِ خاندان ہیں ناصر شکر سے اِن کے ہے زبان قاصر!

ارجمند : بھائی ناصر مجھے معاف کرو
دل کدورت سے اپنا صاف کرو

ناصر : بھائی ارجمند مجھے شرمندہ نہ کیجیے

ارجمند : نواب صاحب۔ التجا میری آخری یہ ہے
یہ ہوں نوشہ مری خوشی یہ ہے

فلک رفعت: نواب صاحب۔ ع: فیصلہ خوب ارجمند کیا
ع: ہم نے داماد یہ پسند کیا

ارجمند : آؤ ناصر یہ سہرا مبارک تمہیں

آواز : حق بحقدار کہنا مبارک تمہیں

آوازیں: مبارک۔ سلامت

(نغمہ)

آوازیں: مبارک جشنِ شاہانہ
مبارک عقدِ دُردانہ

(فیڈ آؤٹ)

جگر مرادآبادی

یہ ذکر ہے ۲۷؁ کا۔ میں حساب میں کمزور ہوں مگر غالباً چھبیس برس گذرے۔ ایک عمر ہوتی ہے یہ تو، بلکہ اس عمر کا آدمی تو اگر احتیاط سے کام نہ لے تو صاحبِ اولاد تک ہوجاتا ہے۔ بہرحال معاف کیجئے گا یہ اتنی ہی پرانی بات ہے کہ یو۔پی کے شہر ہیت پوری میں ایک مشاعرہ تھا۔ ایسا بے ہودہ مشاعرہ کہ لاحول ولاقوۃ۔ تھوڑی دیر تک تو یہ مشاعرہ اونگھتا رہا۔ اس کے بعد ایسا سو رہا ہے کہ شاعر کی آواز چوکیدار کی آواز معلوم ہوتی تھی "سونے والو جاگتے رہو"۔ میں بھی ایک طرف بیٹھا غالباً سونے کی مشق کر رہا تھا کہ ایکدم طوفان آگیا۔ سب اس بُری طرح چیخے ہیں کہ میں واقعی اچھل پڑا اور اب جو دیکھتا ہوں تو ایک صاحب جن کا چہرہ غائب تھا شمعِ محفل کے سامنے بیٹھے جھوم رہے تھے۔ چہرہ غائب یوں تھا کہ سر کے تمام بال اپنی تمام ژولیدگی کے ساتھ اس طرح داڑھی سے اُلجھے ہوئے تھے گویا یہ ایک مسلسل داڑھی ہے جو سر سے شروع ہوکر تمام چہرے کو چھپاتی ہوئی گردن تک آئی تھی اور یہ داڑھی سیاہ فر کی اُس ٹوپی سے لپٹا کر نکلی تھی جو ان صاحب کے سر پہ نہایت بے ڈھنگے پن سے رکھی ہوئی تھی۔ ڈھیلی سی شیروانی جس کے تمام بٹن کھلے ہوئے۔ شیروانی کے نیچے قمیص جس کے رنگ کا صحیح اندازہ ناممکن تھا۔ چوڑی دار پاجامہ جو کسی زمانے میں یقیناً سفید ہوگا اور اس وضع قطع کے ساتھ یہ صاحب غزل پڑھ رہے تھے۔ آواز ایسی کہ روح اُس کی کھنک محسوس کرے اور کلام ایسا کہ اس مشاعرے کے سامعین جو داد دینے میں متانت کی حدوں سے گذرے ہوئے نظر آ رہے تھے حق بجانب نظر آنے لگے۔ میں جس وقت ہوش میں آیا ہوں اس فضا پہ یہ شعر برس رہا تھا ؎

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں زاہد
میں اپنا جام اُٹھاتا ہوں تو کتاب اُٹھا

کتاب اُٹھا۔ شباب اُٹھا۔ شراب اُٹھا ایسی زمین نہیں ہے کہ اس کو اس آسانی کے ساتھ آسمان بنایا جاسکے مگر یہاں تو عالم یہ تھا کہ ایک سے ایک ڈھلا ہوا شعر سماعت میں کھنک رہا تھا۔ ابھی اس شعر پہ جھوم ہی رہے تھے کہ شاعر نے جھوم کر دوسرا شعر پڑھا ؎

مجھے اُٹھانے کو آیا ہے واعظِ ناداں
جو اُٹھ سکے تو مرا ساغرِ شراب اُٹھا

اور پھر یہ شعر —

نشانِ منزلِ جذبِ تمام چھپ نہ سکا
اِدھر فنا ہوا قطرہ اُدھر حباب اُٹھا

اور آخر میں مقطع —

کہاں یہ بار کہاں پائے نازکِ جاناں
اُٹھا مگر، او جگرِ خانماں خراب اُٹھا

یہ تھے جگر۔ وہ جگر مراد آبادی جن کی دھوم سن چکے تھے اور ملاقات آج اس طرح ہوئی کہ جب آپ غزل پڑھ چکے اور چہرے پر چھائے ہوئے بال چہرے سے ہٹا کر اپنی سیاہ فر کی ٹوپی کے نیچے دباتے ہوئے آپ اپنی جگہ پر آ کر بیٹھے تو بہت سے داد دینے والوں میں ایک میں بھی تھا۔ مین پوری کے صرف شاعر ترجبتی سرن شآد نے تعارف کرایا اور جگر صاحب بہت ہی جلد تعارف کی رسموں سے گذر کر بے تکلف ہو گئے پان کی وہ گلوری جو خود کھانا چاہتے تھے مجھے دے دی اور قوام کھلانے کا وعدہ کر کے ایک صاحب کو اپنے ارد گرد ڈھونڈھنے لگے جن کے پاس قوام کی شیشی دیکھ چکے تھے۔ اور پھر یہ اصرار کہ یہ شیشی آپ ہی دیکھ لیں حالانکہ وہ شیشی خود آپ کی بھی نہیں بلکہ آپ کے ایک دوست کی تھی۔

مین پوری میں قیام کا ارادہ بالکل نہ تھا مگر جگر صاحب نے زبردستی ایک ہفتے تک اُسی گھر میں مہمان رکھا جہاں خود مہمان تھے اور مارے خلوص کے اپنے میزبان کو طاق پر بٹھا کر خود ان کی اور اپنے دوسرے مہمانوں کی مدارات میں مصروف ہو گئے۔

مین پوری میں جگر صاحب اُس زمانے میں منشی اصغر حسین صاحب اصغر مختار کے یہاں اپنا ہیڈ کوارٹر بنائے ہوئے تھے۔ فرخ آباد چلے گئے اٹاوہ چلے گئے یا جہاں بھی کوئی پکڑ لے گیا چلے گئے اور پھر اصغر صاحب کے یہاں واپس آ گئے معلوم نہیں اصغر صاحب سے یہ تعلق حضرت اصغر گونڈوی کے ہم نام ہونے کی وجہ سے تھا یا جگر صاحب کی قسمت ہی میں محبت کرنے کے لیے ہر قسم کے اصغر لکھے ہوئے تھے مگر اصغر کی یہ مین پوری والی قسم بھی واقعی محبت کرنے کے قابل ایک چیز تھی سفید داڑھی اور لمبے قد کا یہ بھولا بھالا آدمی اپنی شخصیت میں اس قدر محبوبیت رکھتا تھا کہ اس "بزرگ بچے" کو دیکھ کر خواہ مخواہ پیار آتا تھا پھر جگر صاحب کو تو ان کے گھر پر ایسا اقتدار حاصل تھا کہ واقعی خود صاحبِ خانہ جگر صاحب ہی کے مہمان نظر آتے تھے۔ میرے لیے ایک نزاکت یہ بھی تھی کہ اس مین پوری کو میری سسرال کی حیثیت بھی حاصل تھی میرے خسر صاحب محترم حکیم مولوی محمد سجاد حسین صاحب مرحوم و مغفور اس زمانے میں یہیں بسلسلۂ ملازمت موجود تھے اور ملازمت کے علاوہ ایک مستقل حیثیت اُن کو یہ حاصل تھی کہ مین پوری کے مشاعروں کی صدارت کا گویا آپ ہی کے پاس ٹھیکہ تھا۔ ان کی موجودگی میں جگر صاحب کا مہمان بن کر رہنا ظاہر ہے کہ عجیب سی بات تھی مگر خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے خسر صاحب کو ان کو سوائے اس بات کے کوئی اعتراض نہ ہوا کہ جگر کی صحبت بہرحال ایک رند کی صحبت تھی اور باوجود ضبط کرنے کے اتنا تو کہہ ہی دیا کہ "بھئی یہ جگر کمبخت شراب بہت پیتا ہے بس یہی نہایت لغو بات ہے اس میں" مطلب یہ تھا کہ اس لغویت سے دُور ہی رہنا چاہیئے۔ مگر داماد ہو تو ایسا سعادتمند کہ خود ان کے سایۂ رحمت سے زیادہ سے زیادہ دور اور اس لغویت سے قریب تر رہ کر ایک ہفتے کے بعد جگر کو اپنی روح پر طاری کئے اور ان ہی کے شعر گنگناتے مین پوری سے لکھنؤ واپس آ گئے۔

اس ملاقات کے بعد تو یہ حال ہو گیا کہ جہاں کہیں بھی مشاعرے میں گئے اور یہ معلوم ہوا کہ جگر صاحب بھی موجود ہیں سیدھے پہلے جگر صاحب کے پاس پہنچے اگر وہ ہوش میں ہوئے تو خود جا کر میرا سامان اپنے میزبان کے گھر اٹھوا لائے اور اگر ہوش میں نہ ہوئے تو میں خود اپنا سامان اٹھا لایا اور ان کی تیمارداری شروع کر دی۔ مگر اس قسم کی تیمارداری میں صرف ایک مرتبہ میں نے اناڑی ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ بھوپال میں مشاعرہ تھا۔ اطرافِ ہند سے منتخب شعرائے نواب صاحب بھوپال کی سالگرہ کے جشن کی تقاریب میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ میرا اور جگر صاحب کا قیام تربینی سرن شاد کے یہاں تھا جو ان دنوں بھوپال میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔ ذرا ملاحظہ کیجیے کہ بھوپال میں بھائی جان مولانا ارشد تھانوی کا گھر موجود ہے اور اس گھر میں لے دے کر صرف ایک بہن محبت چھڑکنے کے لیے موجود ہے کہ بھائی آئے تو ماں جائے بر واری جائے مگر بھائی ٹھہرے ہوئے تربینی سرن شاد کے یہاں تاکہ جگر سے قریب رہیں۔ جگر صاحب پر ان دنوں پینے کا دورہ پڑا ہوا تھا تین دن سے دن رات بس پی رہے تھے اور پیے چلے جاتے تھے۔ خوشامد کی۔ بچوں کی طرح بہلایا۔ ڈانٹا۔ غصہ کیا۔ مگر وہ اس عالم ہی میں نہ تھے کہ ان میں سے کسی کا اثر لیتے ان کو سمجھانے کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اپنے ہاتھ سے بوتل سے گلاس میں انڈیل کر دینا پڑتی تھی۔ تیسری رات ان کی حالت نازک ہو گئی۔ رات کے تین بجے ہوں گے کہ انھوں نے بجائے شراب کے پانی مانگا۔ معلوم نہیں کیوں میں نے طے کر لیا کہ بس اب یہ قصہ ختم ہے اور چل چلاؤ ہے ان حضرت کا غالباً میں نے کسی سے سن رکھا تھا کہ شرابی اگر شراب پیتے پیتے پانی مانگے پینے کے لیے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بس چلا اب۔ چنانچہ جگر صاحب کے اس مطالبے پر میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ایک تو میرے نزدیک جگر صاحب کا یہ عالمِ نزع دوسرے میں موت سے ذرا گھبراتا بھی ہوں اور یہ تو ہرگز گوارا کر ہی نہیں سکتا کہ تنہائی میں جہاں صرف میں ہوں کوئی صاحب یہ شوق پورا کرنے لگیں۔ میں بجائے پانی دینے کے دوڑا تربینی سرن کو جگانے اور جگا لایا بہاری چرن صادق اور تربینی سرن دونوں کو کہ جگر ختم ہو رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی دونوں کے علاوہ اور بھی بہت سے آدمی جمع ہو گئے مگر جب وجہ بتائی میں نے کہ پانی مانگ رہے تھے تو وہ مذاق اڑا ہے میرا کہ اپنی معصومیت کا خود بھی قائل ہونا پڑا۔

انجمن معین الادب لکھنؤ کا ایک سالانہ مشاعرہ تھا طے ہوا کہ جس طرح بھی ہو جگر مراد آبادی کو اس مشاعرے میں ضرور شریک کیا جائے مگر جگر ملیں کہاں؟ نہ ان کا کہیں پتہ نہ نشان۔ پتہ تو اس کا ہوتا ہے جس کا کہیں گھر ہو اور جگر اس زمانے میں خانہ بدوشی کی بلکہ میخانہ بدوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ طے یہ کیا گیا یہ کام شوکت تھانوی اور اس زمانے کے شاعروں کے چودھری مولانا وصل بلگرامی مرحوم کر سکتے ہیں چنانچہ ہم دونوں انھیں ڈھونڈھنے نکلے۔ مین پوری میں ڈھونڈھا۔ آگرے میں ہر میخانہ چھان مارا اور ملے آپ کہاں فرخ آباد میں وہ بھی اس حالت میں کہ نہ ان کو ہمارا ہوش تھا نہ اپنا۔ اسی حالت میں ان کو لے کر لکھنؤ روانہ ہو گئے اس لیے کہ اب وقت اتنا کم رہ گیا تھا کہ بمشکل مشاعرے کے وقت پر لکھنؤ پہنچ سکتے تھے اب مصیبت یہ تھی معین الادب کا یہ مشاعرہ طرحی تھا اور نہایت سختی سے اس ضابطہ کی پابندی ہو رہی تھی کہ خواہ کوئی بھی ہو کسی سے غیر طرح کلام نہ سنا جائے گا۔ ادھر ان حضرت کا عالم یہ کہ شعر کہنا کیا معنی یہ بات بھی ڈھنگ سے نہ کر سکتے تھے۔ خدا خدا کر کے کانپور کے اسٹیشن پر آپ نے پوچھا کہ میں کہاں ہوں اور جب آپ کو بتایا گیا کہ آپ لکھنؤ جا رہے ہیں تو

بمشکل تمام آپ سمجھ سکے کہ واقعہ کیا ہے۔ موقع غنیمت جان کر وصل صاحب نے اور میں نے اُن سے طرح میں کچھ کہنے کی درخواست کی اور آخر مشاعرے تک پہنچتے پہنچتے دو شعر آپ نے کہہ لیے جو آج تک مجھے یاد ہیں ؎

محیطِ عشق میں جو کچھ بھی تھا اک عالمِ دل تھا — اسی ذرّے میں دریا تھا اسی قطرے میں ساحل تھا
خوشا وہ دور جب آغازِ دردِ عشق کامل تھا — مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں سرتا بہ پا دل تھا

اور یہ واقعہ ہے کہ یہی دو شعر حاصلِ مشاعرہ تھے۔ مگر اس خود فراموشی کے زمانے میں بھی عالم یہ تھا کہ مشاعرے کے لیے غزل کہی ہے کہ کوئی صاحب جن کو کسی حکیم نے نسخے میں لکھ دیا ہے کہ شاعری ضرور کرو خواہ شعر کہہ سکو یا نہ کہہ سکو تشریف لے آئے اور چپکے سے کہہ دیا کہ طرح میں فکر نہیں کر سکا آپ نے اپنی غزل ان کے سامنے رکھ دی وہ شعر چن لے گئے۔ کوئی اور صاحب اسی قسم کے آئے وہ بھی ایک آدھ لے بھاگے کسی کو کوئی مطلع پسند آگیا وہ لے گئے اور تلچھٹ ان کے حصّے میں رہ گئی میں اس بات پر بہت جلا کرتا تھا اور اکثر فوجداری کی نوبت آگئی لہٰذا اس معاملہ میں مجھ سے چوریاں ہونے لگیں مگر یہ سلسلہ جاری رہا اور اب بھی جاری ہے حالانکہ ان سے پوچھیے تو نہایت برہمی کے ساتھ انکار کر جائیں گے۔

اردو کے اس حافظ نے ہند پوری میں اپنے لیے شیراز بھی مہیا کر لیا تھا۔ اپنے ہر بے تکلّف دوست کو شیراز کی سیر کراتے تھے جہاں جاتے تھے جذبۂ پرستش لے کر مگر واپس آتے تھے معبود بن کر۔ اس شیراز کا نام آپ نے طور بھی رکھا تھا اور صاحبانِ طور سے تعلقات اس قسم کے تھے کہ خود نہ کبھی موسیٰ بنے نہ برقِ طور کو یہ جرأت ہوئی کہ وہ کلیم کی تابِ نظر آزمائے معلوم نہیں اُسے کلیم سے دلچسپی تھی یا کلام سے بہر حال جگر صاحب کی حیثیت میرے نزدیک صرف آنریری مجسٹریٹ کی تھی۔

اب تو اللہ رکھے جگر صاحب گھر گرہست ہو گئے ہیں۔ سخت جان ایسے کہ شراب پی پھر شراب نے ان کو پیا آخر شراب ان سے چھوٹی اور یہ شراب سے۔ مدت سے پیتے نہیں مگر تمام رندانہ ادائیں آج بھی موجود ہیں۔ بچوں کا سا معصوم دل جس سے کہیے ذرا سی بات پر لڑادیں مگر لڑ کر بھی روٹھنا نہیں جانتے جس سے لڑتے ہیں اسی کو مناتے بھی خود ہیں۔ سب کہتے ہیں جگر بہت بڑا شاعر ہے مگر میں کہتا ہوں جگر بہت بڑا انسان ہے اور شاعری اس کی شخصیت کا صرف ایک پرتو۔

ڈاکٹر صاحب

(چلتی ٹرین کی آواز کچھ دیر کے بعد اسی آواز پر دو مسافروں
کی آواز غالب آتی ہے)

ریاض: خالد۔ خالد، اٹھو بھئی اسٹیشن آ رہا ہے بستر باندھ لو۔

خالد: (انگڑائی لیتے ہوئے) کیا بجا ہوگا۔

ریاض: بھئی بجا ہوگا کچھ پہلے تم سامان درست کرو گاڑی صرف ایک ہی منٹ ٹھہرتی ہے۔

خالد: تو یہ کہو نا۔ لو ابھی بستر لپٹا لے یہ لو۔

ریاض: ذرا کھسکو نا اُدھر میرا سوٹ کیس شاید اُدھر کھسک گیا ہے۔

خالد: نہیں اِدھر تو میرا سوٹ کیس ہے۔ ایں؟ یہ کیا۔ یہاں تو نہ میرا سوٹ کیس ہے نہ تمھارا۔

ریاض: یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اور آگے بڑھ کر دیکھو۔

خالد: نہ کوئی سوٹ کیس ہے نہ میرا ہینڈ بیگ۔ یہ تو بڑا غضب ہوا۔ دیکھو نا کسی اور برتھ کے نیچے۔

ریاض: کیا فائدہ اب دیکھنے سے ظاہر ہے کہ دونوں غافل سوئے تھے کسی نے ہاتھ صاف کر دیا۔

خالد: مگر اب ہوگا اب ہوگا کیا۔ اس پردیس میں میرے پاس نہ تو پہننے کو کپڑے ہیں نہ جیب میں دھیلا۔

ریاض: گویا میرے پاس سب کچھ ہے۔ شامت کی مار گھڑی اور پیسوں کا پرس بھی لیٹتے وقت سوٹ کیس میں رکھ دیا تھا۔

(ٹرین آہستہ ہوتی ہے)

خالد: غالباً اسٹیشن آ گیا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مرے بے موت۔

ریاض: اور ٹکٹ؟ لو ٹکٹ بھی تو پرس ہی میں تھا۔

خالد: مانگنا پڑی بھیک برادرم۔ بہرحال اللہ مالک ہے۔

(ٹرین ٹھہرتی ہے کچھ اسٹیشن کی چہل پہل)

ریاض: مگر یہ حرکت کیا کی ہے تم نے ایک تو سفر میں لٹ گئے دوسرے تم نے جیل پہنچانے کے سامان بھی کر دیئے۔ آخر یہ ہینڈ بیگ ہے کس کا۔

خالد: تو بھلا مجھے کیا معلوم کس کا ہے میں نے تو بس ٹرین سے اترتے وقت یوں ہی اٹھا لیا تھا۔ کہ ہمارا اتنا سامان گیا ہے تو ہم کیا ایک ہینڈ بیگ بھی نہ اٹھائیں۔ خیال یہ تھا کہ کچھ نہ کچھ تو نکلے ہی گا اس میں سے۔

ریاض: اس میں سے نکلے گا گرفتاری کا وارنٹ۔ دیکھ لینا اگلے ہی اسٹیشن سے ہینڈ بیگ کا مالک ٹیلیفون کرائیگا تار کھڑکائے گا اور ہم یہاں مع ہینڈ بیگ کے دھر لیے جائیں گے۔

خالد: دھرے تو جب جائیں گے کہ یہ سوٹ کیس میرا مطلب یہ ہے کہ یہ ہینڈ بیگ ہمارے پاس سے برآمد کر لیا جائے۔ ہم تو اس کو ابھی سامان نکالنے کے بعد پھینکے دیتے ہیں کسی طرف۔ کچھ نہ کچھ تو روپیہ نکلے ہی گا۔ ایسا بھی کیا۔ جو ایسا شاندار ہینڈ بیگ رکھ سکتا ہے۔ وہ تھوڑا بہت تو لے کر چلا ہی ہو گا۔

ریاض: خدا کے لیے جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ آنے ہی والی ہے شامت ہماری اسی ویٹنگ روم میں۔

خالد: دل کو مضبوط رکھو۔ اور چوروں والی گھبراہٹ خواہ مخواہ اپنے اوپر طاری نہ کرو۔

ریاض: اچھا تو تم غسل خانے میں یہ ہینڈ بیگ لے جا کر دیکھ بھال لو۔ میرا تو خون خشک ہوا جاتا ہے۔

خالد: خواہ مخواہ بھی، جتنا ہم اپنے کو چھپانے کی کوشش کریں گے اتنے ہی مشکوک سمجھے جائیں گے۔ یہیں کھولتے ہیں ہینڈ بیگ (ہینڈ بیگ کھول کر) یہ کیا۔ یہ تو کسی ڈاکٹر کا بیگ معلوم ہوتا ہے یہ دیکھو اسٹیتھسکوپ (STHETHIS COPE) ہے ڈاکٹر کا ہینڈ بیگ تو ہے ہی، یہ دیکھو، انجکشن دینے کا سٹ یہ البتہ کچھ ہے۔

ریاض: چھوڑو اسے بھی یہ بلڈ پریشر دیکھنے کا آلہ ہے۔ باقی یہ سب دواؤں کی ڈبیاں اور شیشیاں ہیں۔ کچھ نہیں ہے اس میں دفع کرو۔

خالد: ٹھہر تو جاؤ شاید ڈاکٹر صاحب کی ایک آدھ فیس بھی نکل آئے۔ یہ کیا ہے غالباً پرس۔

ریاض: جی نہیں نشتر دینے کے چاقوؤں کا پاکٹ سٹ ہے۔ لے یہ دیکھو۔

(ایک دم ویٹنگ روم کا دروازہ کھلتا ہے اور ایک صاحب داخل ہوتے ہوئے کہتے ہیں)

محمود: وہی مثل کہ جہاں جائیے بھوکا وہیں پڑے سوکھا۔ روز یہ ٹرین لیٹ ہوا کرتی تھی آج ہی اس کو ٹھیک وقت پر آنا تھا تاکہ مجھے نہ مل سکے۔ کیوں صاحب معاف کیجئے گا۔ آپ کو کچھ پتہ ہے کہ دوسری ٹرین اب کس وقت چلے گی۔

ریاض: جی ہاں۔ یعنی جی نہیں ہم کو کچھ پتہ نہیں۔

خالد : کس طرف جانے والی ٹرین کے متعلق آپ پوچھ رہے ہیں۔

محمود : کسی طرف جانے والی مل جائے ملتان جانے والی مل جائے تو اُدھر چلا جاؤں لاہور جانے والی مل جائے تو اُدھر چلا جاؤں۔ مجھ کو آج ہی کسی نہ کسی شہر تک پہنچنا ہے کاش میں تھوڑی دیر پہلے پہنچ جاتا اور مجھ کو یہ گاڑی مل جاتی۔ کاش میں۔ کاش۔ یہ۔ یہ کیا۔۔۔ یہ آپ کا سامان ہے؟

ریاض : جی نہیں بخدا یہ میرا سامان نہیں ہے۔ میں تو آپ سے بالکل سچ سچ کہہ دونگا کہ یہ سامان۔

محمود : تو پھر یہ سامان آپ کا ہوگا۔ آپ ڈاکٹر ہیں۔ خداوند تو بڑا ہی مسبب الاسباب ہے بے شک تجھ کو منظور ہے کہ میری رضیہ بچ جائے۔ ڈاکٹر صاحب مجھ کو مُنہ مانگی مراد مل گئی۔ میں اس وقت ڈاکٹر ہی کو لینے ملتان یا لاہور جانا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب میری بچی اس وقت موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ میری زندگی بھر کی کمائی صرف یہی لڑکی ہے۔ خدا کے لیے اس کو بچا لیجئے۔

خالد : یہ تو درست ہے مگر بندہ نواز۔

محمود : اب اگر مگر کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب آپ مجھ کو خرید لیں گے اگر اس وقت میرے ساتھ چلے چلیں میں زندگی بھر آپ کا غلام رہوں گا ڈاکٹر صاحب بس اب چلے ہی آئیے میرے ساتھ۔

خالد : ذرا بات تو سن لیجئے۔

محمود : بات بھی سُن لونگا مگر پہلے آپ چلے چلئے۔ آپ کی جو فیس ہو اس سے دوگنی لیجئے چار گنی لیجئے ڈاکٹر صاحب میری بچی کو چل کر بچا لیجئے۔ خیر بچانے والا تو خدا ہے مگر اسی خدا نے آپ کو رحمت کا فرشتہ بنا کر یہاں بھیجا تھا۔ مجھ کو ڈاکٹر کی تلاش تھی۔ آپ مجھ کو مل گئے میں اس کو اتفاق نہیں کہتا بلکہ یہ قدرت کا انتظام تھا اور اب میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ میری بچی بچ جائے گی اور آپ ہی کے علاج سے بچے گی۔ لائیے یہ ہینڈ بیگ مجھے دیجئے۔ یہ بستر بھی میں ہی لادے لیتا ہوں۔

ریاض : نہیں صاحب یہ رہنے دیجئے میں خود اُٹھا لوں گا مگر۔

محمود : اب آپ بھی کچھ نہ کہئے ذرا جلدی کیجئے ایسا نہ ہو کہ میرا تانگہ واپس لوٹ جائے۔ بس آ ہی جائیے۔ وہ ابھی موجود ہوگا۔ لائیے نا یہ بستر میں ہی لیے لیتا ہوں۔

خالد : جی نہیں ٹھیک ہے اِن ہی کو لانے دیجئے مگر اس کمبخت نے اپنا ٹکٹ تک کہیں پھینک دیا ہے۔

محمود : وہ سب ٹھیک ہے کوئی نہیں پوچھتا آپ سے ٹکٹ۔ آئیے باہر۔ میں ذمّہ دار ہوں۔ خدا نے آپ کو واقعی رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیجا ہے۔

(موسیقی)

محمود : دیکھو ذرا جلدی سے پردہ کرا دو۔ ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں۔ آپ آ جائیے ڈاکٹر صاحب پردہ خود ہی ہو جائے گا۔ اِدھر تشریف لائیے۔ اِس کمرے میں۔ یہ دیکھئے ڈاکٹر صاحب۔ آپ تشریف تو رکھیے۔ اور آپ بھی بیٹھ جائیے۔

ڈاکٹر صاحب یہ میری بچّی ہے۔ آج چوتھا دن ہے بخار کو اور آج تو اس نے صبح سے آنکھ ہی نہیں کھولی ہے بالکل بیہوش ہے۔ نہ جانے کیا کیا بک رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہی میری ایک بچی ہے ہم میاں بیوی اسی کو دیکھ دیکھ کر جی رہے ہیں۔

خالد : آپ گھبرائیے نہیں ذرا برف۔ مگر برف یہاں کہاں۔ کسی گھڑے کا باسی پانی منگائیے اور دو تین جھاڑن یا تولیے۔

محمود : ابھی لیجئے۔ (جاتا ہے)

ریاض : خدا جانے تم اب اور کیا گل کھلانے والے ہو۔

خالد : شش۔ دیوار گوش دارد۔ انشاءاللہ یہ لڑکی بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ ذرا بیگ مجھے اٹھا دو۔

محمود : (آتے ہوئے) یہ لیجئے ڈاکٹر صاحب پانی اور یہ جھاڑن۔

خالد : دیکھو کمپاؤنڈر تم یہ جھاڑن اس پانی میں تر کر کے مریضہ کے سر پر رکھو۔

ریاض : کیا مجھ سے کہا۔

خالد : تم پر سفر کی اتنی تھکن ہے کہ دماغ ہی حاضر نہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ یہ جھاڑن پانی میں تر کر کے مریضہ کے سر پر مسلسل رکھتے رہو اور دیکھئے صاحب آپ تھوڑا سا پانی گرم کرائیے۔ باقاعدہ اُبلوا لیجئے پانی۔

محمود : ابھی لیجئے۔ ارے بھئی ذرا پانی جوش کراؤ جلدی سے اور چائے کے لیے بھی پانی رکھواؤ۔ بلکہ میں خود لاتا ہوں ابھی، پانی ابھی حاضر ہوا۔ (جاتا ہے)

ریاض : یعنی میں کمپاؤنڈر بھی ہو گیا۔

محمود : (لوٹتے ہوئے) جی مجھ سے کچھ فرمایا۔

خالد : جی نہیں آپ تشریف لے جائیے۔ میں کمپاؤنڈر سے بات کر رہا تھا (دفعۃً) تم سے کچھ دیر چپ نہیں رہا جا سکتا۔

ریاض : مگر میں کہتا ہوں کوئی اُلٹی سیدھی بات نہ ہو جائے کہ دھر لیے جائیں۔

خالد : دیکھا جائے گا۔ اللہ مالک ہے۔ ذرا کھولو یہ بیگ۔ وہ انجکشن کے سیٹ کی ڈبیا کہاں ہے۔ ہاں یہ رہی۔

ریاض : خدا کے لیے اب کوئی انجکشن نہ دے بیٹھنا۔ (محمود آتا ہے)

محمود : بس ابھی اُبلا جاتا ہے پانی ڈاکٹر صاحب۔ اس کی حالت کچھ بہت خطرناک تو نہیں ہے۔

خالد : مرض بڑھ تو چکا ہے مگر خدا کی ذات سے اُمید ہے کہ فائدہ ہوگا اور مریضہ ٹھیک ہو جائیگی۔ آپ یہ انجکشن کی پچکاری اُبلتے ہوئے پانی میں رکھ دیجئے اور پھر وہ پانی یوں ہی اُٹھا لائیے۔

محمود : ابھی لیجئے۔ اب تو شاید اُبل رہا ہوگا پانی۔ (جاتا ہے)

خالد : (ہینڈ بیگ میں کھڑبڑ کر کے ٹٹولتے ہوئے) نہ جانے کیا کیا آخر بھرا ہوا ہے اس میں۔

ریاض: بات سُنا کردا انجکشن وغیرہ دینا خطرناک ہے نہ جانے کیا ہو جائے کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔

خالد: بھائی صاحب ڈاکٹری نہیں کی تو کیا بیمار بھی نہیں پڑتے ہیں۔ زندگی بھر تیمارداری کی ہے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے یہی تو ہے وہ انجکشن جو خود میرے لگایا گیا تھا۔

محمود: (آتے ہوئے) یہ لیجئے ڈاکٹر صاحب۔

خالد: شکریہ۔ بس اب میں انجکشن دیئے دیتا ہوں انشا اللہ بخار اُتر جائے گا۔

محمود: خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔

خالد: ذرا یہ آستین ان کی بازو تک اٹھا دیجئے۔ جی ہاں۔ اور۔ اور۔ تھوڑی سی اور بس ٹھیک ہے دیکھو کمپاؤنڈر تم یہ روئی اسپرٹ میں تر کرکے تیار رہو۔ بسم اللہ یا شافی۔ بس اب ٹھیک ہے لاؤ ذرا روئی۔ ہاں یہ۔ اب سُنیئے جناب والا آپ کہیں سے منگائیے لسوڑھے کے چند پتّے اور تھوڑا سا پیسا ہُوا نمک۔

محمود: یہی کھانے والا نمک نا۔

خالد: جی ہاں یہی نمک۔ وہ نمک لسوڑھے کے پتّوں پر چھڑک کر دو صاحبان مریضہ کے دونوں پیر لے کر بیٹھ جائیں اور ان پتّوں کو ایڑی سے پنجے کی طرف تلوے سے رگڑیں بالکل سہلانے کے انداز سے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد یہ پتے سیاہ ہو جائیں گے تو ان کو بدلتے رہیئے اور جب پنجے ٹھنڈے ہونے لگیں تو یہ عمل ختم کر دیجئے۔

محمود: بہت بہتر ہے۔ اب آپ لوگ آرام فرمالیں میں نے کمرہ ٹھیک کرا دیا ہے۔

خالد: جی ہاں۔ آپ بھی اب اطمینان رکھیئے بخار انشا اللہ صبح تک اُتر جائے گا۔

محمود: انشا اللہ۔ بہرحال تشریف لائیے۔ نہ نہ نہ مجھے دیجئے یہ ہینڈ بیگ۔ آپ کے کمرے ہی میں چائے پہنچ رہی ہے۔ تشریف لائیے۔ ادھر آئیے یہ رہا آپ کا کمرہ۔ یہ ملا ہُوا غسل خانہ ہے۔ ضرورت کی ہر چیز موجود ہے اور جس چیز کی ضرورت ہو فرما دیجئے۔ اور چائے تو پہلے ہی سے رکھی ہوئی ہے۔

خالد: بس شکریہ اب آپ تشریف لے جائیں۔ ہم لوگ خود چائے پی لیں گے دیکھئے آپ وہ لسوڑھے کے پتے منگوا کر پاشویہ کرائیے۔

محمود: بہت اچھا۔ خدا حافظ (جاتا ہے)

خالد: بناؤ ریاض چائے بناؤ۔ سخت تھکن ہے چائے پی کر جان میں جان آئے گی۔

ریاض: تم کو جان میں جان آنے کی اُمید ہے اور تمھاری حرکتوں سے میری جان نکلی جا رہی ہے کہ نہ جانے تم کرنے والے کیا ہو۔

خالد: تو آخر میں کیا کروں تم ہی بتاؤ۔ کوئی اپنی خوشی سے تو میں پھنسا نہیں ہوں اس خطرے میں۔

ریاض: خوشی سے تو نہیں پھنسے ہو۔ مگر اپنے لیے خطروں میں اضافے پر اضافہ جو کرتے جا رہے ہو۔ اوّل یہ کہ اس

نامراد ہینڈ بیگ کو اُٹھانے کی آخر کیا ضرورت تھی۔ خیر فرض کر لیجئے۔ کہ یہ ایک اضطراری حرکت تھی۔ تو اب ڈاکٹر ہی بن بیٹھے سچ مچ۔

خالد : کون بن بیٹھا ہے! بخدا مجھ کو زبردستی ڈاکٹر بنایا گیا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیسے کہہ دیتا۔ کہ میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ اور یہ ڈاکٹری کا سامان چوری کا ہے۔

ریاض : خیر یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے۔ اور مجبوراً ڈاکٹر بننا بھی پڑا تھا۔ تو یہ آپ سے کس نے کہا تھا کہ آپ انجکشن دینا بھی شروع کر دیں اور جو یہ لڑکی مُر وُر گئی تو۔

خالد : جس کی موت آتی ہے وہ سچ مچ کے ڈاکٹر کی دوا سے بھی مر جاتا ہے اگر دعویٰ بھی کیا ہے تو ڈاکٹری کا کیا ہے خدائی کا تو نہیں کیا ہے۔

ریاض : اب تک تو صرف یہ دھڑکا تھا کہ ہینڈ بیگ کی چوری کے سلسلے میں پولیس آتی ہی ہوگی گرفتار کرنے اب دیکھ لینا یہ ہوگا کہ مرے گی یہ لونڈیا اور یہ جو اس کا باپ ہے بندھوا دے گا ہم دونوں کو۔

خالد : خیر مرتی نہیں وہ اس کا ذمہ تو میں لیتا ہوں۔ میں نے صحیح انجکشن دیا ہے۔ بھئی میں تم کو کیسے یقین دلاؤں اسی انجکشن سے میرا بخار اترا تھا۔ مگر ایک بات بتاؤ کہ ایسی خوبصورت لڑکی اگر واقعی مر گئی تو خود تم کو افسوس نہ ہوگا۔

ریاض : اللہ رے اطمینان۔ یعنی آپ نے اُس کی خوبصورتی بھی تاڑ لی۔ یہاں کس کافر کو گھبراہٹ کی وجہ سے یہ خیال بھی آیا ہو کہ اس لڑکی کی صورت شکل بھی دیکھنا چاہیئے۔

خالد : یہی مجھ میں اور تم میں فرق ہے تم گھبراتے زیادہ ہو حالانکہ خطرے میں زیادہ مُبتلا میں ہوں۔ اس لیے کہ اگر پولیس وغیرہ کی تحقیقات کی نوبت آئی تو تم کھٹ سے کہہ دو گے کہ سب کچھ کیا دھرا اس شخص کا ہے بلکہ تم تو ویٹنگ روم ہی میں کہنے والے تھے ان حضرت سے۔

ریاض : جھوٹ کیوں کہوں میں سمجھا تھا کہ یہ پولیس کا آدمی ہے۔

خالد : آپ کی اسی سمجھداری کا تو ماتم ہے۔ خیر چائے تو بناؤ ٹھنڈی ہو جائے گی۔

ریاض : (چائے انڈیلتے ہوئے) بخدا میرا دل دھڑک رہا ہے۔ کہ نہ جانے تم نے کس دوا کا انجکشن دے دیا ہے! اور ابھی آتی ہے یہ خبر کہ وہ چھوکری چل بسی۔ لو پیو چائے۔

خالد : چائے پی کر تھوڑی دیر سو لو گے تو دماغ کا یہ بار ہلکا ہو جائے گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارے مزاج میں اس قدر وحشت ہے۔

ریاض : میں تو بھائی صاحب سوچ رہا ہوں کہ یہاں سے تو دو گیارہ ہو جاؤں۔

خالد : خدا تمہیں بیٹا دے اگر یہ احسان کر جاؤ تو کیا کہنا ہے۔ میں صاف بچ جاؤں گا۔ اس لیے کہ مفرور ہی جرم کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ شاید جناب کو یہ نہیں معلوم کہ فرار اقبالِ جرم کا دوسرا نام ہے۔

ریاض: بہرحال مجھ سے لکھوا لو کہ تم اپنے کو اور اپنے ساتھ مجھ کو پھنسوا کر رہو گے۔

خالد: جو قسمت میں لکھا ہے وہ تو ہونا ہی ہے۔ مگر میں اس وقت یہ سوچ رہا ہوں کہ ایسی حسین لڑکی کو واقعی مرنا ہرگز نہ چاہیئے۔ حالانکہ بیچاری بیمار ہے۔ مگر پھر بھی سبحان اللہ، بہرحال تھوڑی دیر سو رہو۔ غالباً دو بج رہے ہیں۔

ریاض: دو؟ — دماغ ٹھکانے ہے چار سے کم نہ ہوں گے۔ ڈیڑھ بجے تو ہم ٹرین سے اترے تھے۔

خالد: خیر چار ہی سہی اب کون تم سے وقت جھگڑائے۔ مطلب یہ ہے کہ سو جانا چاہیئے۔ اچھا بھئی شب بخیر۔

(خاموشی۔ گھڑی کی مسلسل ٹک ٹک۔ کچھ وقفے کے بعد دروازے پر دستک)

خالد: (انگڑائی لے کر) کون ہے۔ آجایئے اندر۔

محمود: (آتے ہوئے) معاف کیجئے گا شاید میں نے آپ کو جگا دیا دن چڑھ آیا تھا۔ میں نے کہا ناشتہ میں دیر نہ ہو۔

خالد: پہلے مریضہ کا حال بتایئے۔

محمود: اس کا حال مجھ سے نہ پوچھئے۔ اس بستی کے ایک ایک آدمی سے پوچھئے۔ ساری بستی سے اس وقت آپ ہی کی مسیحائی کے چرچے ہیں میرے گھر میں تو سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا ڈاکٹر صاحب۔ میری رضیہ اس وقت ہوشیار ہے بخار بھی میرے خیال میں نہیں ہے اور وہ ماشاءاللہ بالکل بشاش ہے۔ میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔

ریاض: انگڑائی لیتے ہوئے۔ السلام علیکم۔

محمود: اُٹھیئے کمپونڈر صاحب دن چڑھ آیا ہے ہاتھ منہ دھو لیجئے۔ ناشتہ تیار ہے۔

خالد: میں ناشتے سے قبل رضیہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔

محمود: تو آپ تشریف لایئے ناشتہ بھی تو وہیں ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب میری رضیہ کو بچا کر آپ نے مجھ کو خرید لیا ہے۔ زندگی بھر آپ کا یہ احسان نہیں بھول سکتا۔

ریاض: یعنی۔ وہ گویا ٹھیک ہیں اب۔

خالد: ہاں بخار اتر گیا ہے اور وہ ہوشیار ہیں آپ نے کچھ کھانے کو بھی دیا ان کو۔

محمود: جی ابھی تو نہیں آپ سے پوچھے بغیر کیسے دیتا۔

خالد: بہرحال چلئے میں خود دیکھ کر کچھ تجویز کروں گا۔

محمود: تو پھر تشریف لایئے۔

ریاض: ابھی حاضر ہوا ذرا منہ دھو لیتا۔

محمود: جی ہاں شوق سے۔ وہ رہا غسل خانہ وہیں تولیہ بھی ہے صابن بھی۔ منجن بھی۔

خالد: اچھا تو تم آؤ میں چل رہا ہوں۔ تشریف لایئے صاحب۔

محمود: اسی دروازہ سے نکل چلیے۔ ارے بھئی ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں۔ تشریف لائیے نا اپنے محسنوں سے کون پردہ کرتا ہے۔ لو بیٹی تمہارے ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں جنھوں نے تم کو بچا لیا ہے۔

خالد: کہیئے صاحب کیا حال ہے آپ کا۔

رضیہ: اچھی ہوں بالکل۔

خالد: کچھ سر میں درد ورد۔ کچھ بیماری کا اثر وغیرہ۔

رضیہ: جی کچھ بھی نہیں ہے بس بھوک کی شدت ہے۔

خالد: ابھی لیجیے۔ کیا کھانے کو جی چاہتا ہے کوئی میٹھی چیز یا چٹپٹی چیز۔ بلکہ ٹھہریے ناشتہ آ جائے تو یہیں آپ کے ساتھ ہم سب ناشتہ کریں گے۔ آئیے ریاض صاحب دیکھیے میری مریضہ کو جس پر آپ سب بیمار رہنے کی تہمت رکھ رہے تھے۔ رضیہ صاحبہ یہ ہیں میرے کمپاؤنڈر ریاض صاحب ان بچارے نے بھی رات آپ کے لیے بڑی محنت کی ہے۔

ریاض: حیرت ہو رہی ہے آپ کو اس قدر جلد تندرست دیکھ کر۔

محمود: مجھے بالکل حیرت نہیں۔ مجھے تو اُسی وقت رضیہ کی صحت کا یقین ہو گیا تھا جب عین مایوسی کے عالم میں آپ لوگ اچانک ویٹنگ روم میں مل گئے۔ یہ سب خدا کی طرف کے انتظام تھے۔ (آواز دے کر) ارے بھئی ناشتہ لاؤ نا۔

خالد: ہاں بھئی رضیہ اب یہ بتاؤ کہ بستر سے اُٹھ کر ہم مہمانوں کی خاطر تواضع کا ارادہ کب سے ہے۔

رضیہ: میں تو ابھی بستر سے اُٹھنے کو تیار ہوں اگر آپ اجازت دیں۔

محمود: بلکہ یہ تو مارے باندھے پڑی ہوئی ہیں صبح ہی ان کا ارادہ ہوا تھا کہ بستر سے اُٹھ کر حسبِ معمول گھرداری شروع کر دیں۔ ارے آ گئے ناشتہ ادھر رکھ دو۔ یہ دونوں چھوٹی میزیں ادھر لگا دو۔ ایک عجیب تماشہ یہ ہوا ہے ڈاکٹر صاحب کہ آپ کے تشریف لانے کی خبر سن کر اور رضیہ کے اتنی جلدی صحت پانے کے چرچے نے بہت سے مریض صبح ہی سے آپ کے لیے جمع کر دیے ہیں۔ میں نے صاف کہہ دیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب لمبی چوڑی فیس لیتے ہیں۔

خالد: لاحول ولا قوۃ۔ فیس کا کیا سوال ہے میں آپ کا مہمان ہوں۔ ہاں بھئی رضیہ اس ناشتے میں سے کیا چیز پسند ہے سوائے اس اُبلے ہوئے انڈے کے جو غالباً پورا اُبلا ہوا ہو گا۔ اور باقی سب کچھ تم کو مل سکتا ہے۔ میری رائے میں تم کھاؤ۔ رس مکھن اور یہ ایک پیالی چائے۔

رضیہ: جی ہاں ٹھیک ہے ٹوسٹ ہی کا ارادہ تھا۔

خالد: اچھا یعنی توس نہیں بلکہ ٹوسٹ کہتی ہو کافی عالم فاضل معلوم ہوتی ہو۔

محمود: جی ہاں ان کا شوق ہی اور کیا ہے سوائے پڑھنے کے۔ میٹرک کرنے کے بعد میں نے کہا بیٹی اب کیا کرو گی آگے پڑھ کر مگر ان کا نہ جانے کیا ارادہ ہے گھر سے دُور لاہور میں ہوسٹل کی زندگی بسر کرتی ہیں اور پڑھ رہی ہیں۔

خالد: خوب خوب۔ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے اگر میرا سامان راستے میں چوری نہ ہو جاتا تو میں کچھ دلچسپ کتابیں آپ کو پڑھنے کے لیے دیتا۔

محمود: سامان چوری ہو گیا آپ کا۔؟

ریاض: وہی تو رونا بیٹھے ہوئے رو رہے تھے ہم لوگ جب آپ سے ویٹنگ روم میں اچانک ملاقات ہو گئی۔

محمود: تو کچھ بہت زیادہ نقصان ہو گیا خدانخواستہ۔

ریاض: سوائے ایک بستر کے اور رہ ہی کیا گیا۔

خالد: اور وہ بھی اس لیے رہ گیا کہ اس پر سوئے ہوئے تھے۔ بس یہ بیگ اور یہ بستر رہا ہے۔

ریاض: جی ہاں جی ہاں گویا ہینڈ بیگ بھی۔ ورنہ کپڑوں کے سوٹ کیس، اٹیچی جس میں نقد روپیہ بھی تھا کچھ ضروری کاغذات تھے گھڑی تھی ٹکٹ تھے، سب ہی کچھ تو صاف ہو گیا۔

محمود: کوئی بات نہیں جان کا صدقہ مال ہے۔ یہ سب کچھ مہیا ہو جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب ویسے آپ رہنے والے تو اس طرف کے نہیں معلوم ہوتے۔

خالد: ہوں تو نہیں یہاں کا مگر اب تو مغربی پاکستان میں اطراف باقی ہی نہیں رہے۔

محمود: جی ہاں مگر میرا مطلب یہ ہے کہ شاید ہندوستان سے تعلق رہا ہے آپ کا۔

خالد: اس اعتبار سے تو واقعی مہاجر ہوں، حالانکہ آج تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اپنے گھر میں آنے والے کو مہاجر کیوں کہا جاتا ہے۔

ریاض: شکر ہے کہ اب ایک وحدت ہے اور کوئی یہ نہیں پوچھ سکتا ہے کہ ہندوستانی ہو یا پنجابی۔ سندھی ہو یا سرحدی اب تو واقعی کسی کو مہاجر کہنا یا کسی کا اپنے کو مہاجر سمجھنا بھی غلط ہے۔

محمود: بالکل غلط ہے۔ صاحب ہم سب مل جل کر ایک ہیں۔ ڈاکٹر صاحب میں تو طے کر چکا ہوں اپنی بچی کی شادی میں یہ سوال ہی نہ اٹھاؤں گا کہ لڑکا کہاں کا ہے بس پاکستان کا ہونا کافی ہے۔

خالد: جی ہاں یگانگت تو اسی صورت سے پیدا ہو گی۔ کیوں بھئی رضیہ ایک پیالی اور بنائی جائے۔

رضیہ: جی نہیں بس کافی ہے اب کھانا ہی کھاؤں گی تھوڑی دیر میں۔

خالد: صاحب آپ ذرا زحمت فرما کر ان کے لیے مرغی کے چوزوں کا انتظام کریں تاکہ ان کو کھانے میں مرغ کا شوربہ مل سکے اور اگر زحمت نہ ہو تو ان مریضوں سے بھی فرما دیں جو میرے منتظر ہوں گے کہ شام کو آ جائیں تو اچھا ہے۔

محمود: بیشک بیشک میں بھی یہی چاہتا تھا کہ آپ ذرا آرام فرما لیں۔ کیوں بھئی یہ کیا لائے ہو کشتی میں۔ اچھا اچھا نذرانہ ہو گا رکھو یہ کشتی۔ ڈاکٹر صاحب یہ نہ کوئی معاوضہ ہے نہ آپ کے احسانِ عظیم کا کوئی بدل بلکہ ایک حقیر سی نذر ہے۔ یہ کچھ پارچہ جات یہ ایک ادنی سی گھڑی اور یہ ایک حقیر سی رقم۔

خالد: یہ نوٹوں کی گڈی۔ اس کو آپ حقیر سی رقم کہہ رہے ہیں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ میرا فرض تھا اور میں ان

میں کوئی چیز قبول کر کے اپنے اس فرض کو کاروبار بنانا نہیں چاہتا ۔

محمود : ڈاکٹر صاحب، دنیا اسی طرح چلتی ہے آپ نے مجھ کو میری کھوئی ہوئی بیٹی دلوا دی ۔ میں آپ کا کھویا ہوا سامان اگر نہیں دلوا سکتا، تو حسب توفیق جو کچھ پیش کر سکتا ہوں اس سے تو انکار نہ کیجئے ۔

خالد : اچھا اس کو چھوڑیئے یہیں، فی الحال جو انتظامات میں نے کہے ہیں وہ کر دیجئے ۔

محمود : بہتر ہے یہ بات بھی میں آپ سے نہیں کمپاؤنڈر صاحب سے طے کئے لیتا ہوں ۔ آپ تشریف لائیے ادھر کمپاؤنڈر صاحب ۔

(دونوں جاتے ہیں)

خالد : دیکھا آپ نے رضیہ بیگم آپ کے والد مجھ کو معاوضہ دے کر اس خوشی سے محروم کرنا چاہتے تھے کہ میں نے ایک مرجھانے والے پھول کو پھر سے شگفتہ کر دیا ہے ۔

رضیہ : جی — پھول ؟ — اچھا گویا آپ ڈاکٹر کے علاوہ شاعر بھی ہیں ۔

خالد : میں شاعر ہوں یا نہیں مگر آپ سخن فہم ضرور ہیں ۔

رضیہ : شکریہ ۔ مگر آپ کو اس نذرانہ کے قبول کرنے سے انکار کیوں ہے ۔ آپ نے مجھ کو دوبارہ زندگی دے کر میرے گھر بھر کو نئی زندگی بخشی ہے کاش ابا جان آپ کی خدمت میں وہ نذر پیش کر سکتے جو در اصل ان کو پیش کرنا چاہیئے ۔

خالد : مگر مجھ سے یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں آپ کے علاج کا معاوضہ وصول کر لوں ۔ میرا بہترین معاوضہ یہ ہے کہ مجھ کو اپنے تصور کے لیے ایک ایسا نقش مل گیا ہے جس کے سہارے تنہائیوں کو آباد رکھا جا سکتا ہے ۔ اب میں یہاں سے تنہا نہ جاؤں گا ۔

رضیہ : سوال یہ ہے کہ جانے کی ضرورت ہی کیا ہے ۔

خالد : کاش یہ سوال واقعی پیدا ہو سکتا ۔

ریاض : (دور ہی سے) خالد ۔ یعنی میں نے کہا ڈاکٹر صاحب ذرا بات سنیئے ۔

(خالد جاتا ہے)

خالد : (قریب آتے ہوئے) کیا بات ہے ۔

ریاض : ادھر آئیے ۔ میں نے کہا یہ کیا حماقت ہے کہ اتنا روپیہ اور اتنے کپڑے ایسی قیمتی گھڑی اور یہ پر تکلف سامان چھوڑ رہے ہو معلوم بھی ہے ایک ہزار کے نوٹ ہیں ۔

خالد : میں ایک اس سے بھی زیادہ قیمتی چیز چھوڑ کر یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں ۔ فوراً اسی وقت ۔ بس ہینڈ بیگ اٹھاؤ اور چل دو ۔

ریاض : وحشت کیا ہے آخر ۔

خالد: میں سب کچھ کر سکتا ہوں رضیہ کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ مجھ کو ڈاکٹر سمجھا جا رہا ہے۔ وہ نہایت خطرناک طریقہ پہ میرے قریب آ رہی ہے میں زندگی بھر کا یہ جرم نہیں کر سکتا۔

ریاض: تو پھر یہ چیزیں لو اور چلتے بنو۔

خالد: نہیں میں یہ بھی نہیں کر سکتا۔ میں اس کو چھوڑ کر تو جا سکتا ہوں مگر یہ بھی نہیں چاہتا کہ وہ مجھ کو نفرت سے یاد کرے۔

ریاض: خیر یہاں سے بھاگنا تو اس لیے بھی برحق ہے کہ اب کس کس کا علاج کرو گے اور کہاں تک قسمت تمہارا ساتھ دے گی۔ مگر یہ چیزیں ——

خالد: لعنت بھیجو ان چیزوں پر۔ میں کہہ جو رہا ہوں کہ اٹھاؤ ہینڈ بیگ اور گول کرو بستر۔ ابھی ہم غسل خانے کے دروازے سے نکل سکتے ہیں ورنہ پھر موقع نہ ملے گا۔

ریاض: کرائے بھر کا تو روپیہ لو نا۔

خالد: مفلسی اور مجبوری سب کچھ کرانی ہے اُٹھا لو کرایہ بھر کا روپیہ اور چل دو۔ بس تین نہیں صرف دو نوٹ۔ بیس روپے بس کافی ہیں۔ اب جلدی۔ میں چلا تم بھی جلدی نکلو یہاں سے۔

ریاض: چل تو رہا ہوں ہاتھ پیر کیوں پھلاتے ہو۔ چلو نکلو۔

خالد: بند کر دو یہ دروازہ۔

(ختم)

وہمی

ملازمہ : حکیم صاحب آئے ہیں۔ بیگم صاب!

بیگم : اچھا۔ دیکھنا! نجمہ وہ ان کی طرف نہ نکل جائیں، بلا لو یہاں، جلدی سے!

نجمہ : میں نے بیرے سے کہہ دیا ہے کہ وہ ہم لوگوں سے مل کر جائیں ابو جان کو دیکھنے۔ — لیجئے وہ تو آ رہے ہیں اسی طرف حکیم صاحب!

حکیم صاحب : (کمرے کے باہر ہی سے آواز دے کر) میں حاضر ہو سکتا ہوں بندہ نواز!

نجمہ : تشریف لے آئیے حکیم صاحب!

حکیم صاحب : (آتے ہوئے) آداب بجا لاتا ہوں بیگم صاحبہ۔ جیتی رہو نجمہ بیٹی۔ کہیئے صاحب کیا حال ہے خاں بہادر صاحب کا۔

بیگم : حال کیا ہوتا حکیم صاحب۔ جس مرض کا آپ علاج کر رہے ہیں سچ پوچھئے تو اس کی دوا لقمان کے پاس بھی نہ تھی۔

حکیم صاحب : یہ تو آپ نے عجیب بات فرمائی۔ میرے خیال میں تو دنیا میں کوئی مرض ایسا نہیں ہے جس کی دوا حق تعالےٰ نے بقول مولانا حالی کے پیدا نہ کی ہو۔

بیگم : یہ تو ٹھیک ہے مگر وہم کا علاج نہیں کر سکتے۔ میرے خیال میں تو ان کو سوائے وہم کے کوئی بیماری نہیں ہے۔ خوراک ماشاءاللہ اچھی ہے۔ نیند خوب آتی ہے۔ وزن اللہ رکھے بڑھ ہی رہا ہے۔ بخار ان کو نہیں۔ کھانسی اللہ نہ کرے ان کو نہیں۔ دور پار کہیں درد بھی نہیں۔ پھر آخر بیماری کیا ہے۔

حکیم : بیگم صاحبہ! بعض امراض ایسے ہوتے ہیں جن کو صرف مریض محسوس کر سکتا ہے۔ اور اگر عقل سے کورا نہ ہوا تو طبیب بھی سمجھ سکتا ہے۔ تھوڑا بہت میرے نزدیک آپ کا یہ خیال درست نہیں کہ خاں بہادر صاحب ہر طرح تندرست ہیں اور صرف وہم میں مبتلا ہیں۔

بیگم : تو آپ کے نزدیک ان کو شکایت کیا ہے۔

حکیم : وہی تمام شکایات جن کا اظہار خان بہادر صاحب کرتے رہتے ہیں کہ بخار نہیں ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہے، بھوک لگتی ہے مگر جتنا کہ کھانا چاہتے ہیں نہیں کھا سکتے۔ دل جوان ہے اور خود روز بروز ضعیف ہو رہے ہیں۔

بیگم : کمال کرتے ہیں حکیم صاحب آپ بھی! میں کہتی ہوں عمر بھی آخر کوئی چیز ہے۔ آپ کے خیال میں کیا ہوگی ان کی عمر؟

حکیم : بیگم صاحبہ میں نے ہمیشہ امراء اور روساء کا علاج کیا ہے اور مجھ کو معلوم ہے کہ روساء اپنی عمر کے تابع نہیں ہوتے بلکہ ان کی عمر ان کے تابع ہوتی ہے ویسے خان بہادر صاحب کی عمر بھی کچھ زیادہ نہیں ہو گی ساٹھ کے لگ بھگ !

بیگم : تو آپ کا خیال ہے کہ اس عمر میں بھی ان کو ضعیفی کی شکایت نہ ہونی چاہیئے ۔

(خان بہادر کی آواز آتی ہے)

خان بہادر : (دور سے) ارے بھئی کوئی ہے ۔

نازو : جی سرکار ۔

خان بہادر : بیگم صاحبہ کو ذرا بھیجو ۔

نازو : بہت بہتر ۔

(بیگم سے) بیگم صاحبہ ۔ سرکار یاد فرما رہے ہیں ۔

بیگم : تم چلو ! میں آ رہی ہوں حکیم صاحب کو لے کر (بجمہ جاتی ہے) حکیم صاحب آپ آخر ان کی ہاں میں ہاں کیوں ملاتے ہیں ۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ بالکل تندرست ہیں ۔

حکیم : غالباً آپ یہ سمجھ رہی ہوں گی کہ میں اپنی فیس اور دواؤں کی قیمت وصول کرنے کی وجہ سے خان بہادر صاحب کو خواہ مخواہ بیمار ڈالے ہوئے ہوں ۔ مگر یہ غلط ہے بیگم صاحبہ وہ واقعی علیل ہیں ۔ علالت کا تصور ہی بیمار ذہن میں آتا ہے ۔

بیگم : تو یہ کہئے ناکہ ذہنی بیماری ہے ۔

حکیم : ذہنی بیماری نتیجہ ہوتی ہے جسمانی علالت کا ۔ ان کے عناصر میں اعتدال نہیں ہے ۔ قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں ۔

بیگم : میں غالب کا شعر پڑھنے کو نہیں کہہ رہی ہوں ۔ حکیم صاحب میں ان کی صحت کے متعلق کسی قطعی نتیجے پر پہنچنا چاہتی ہوں ۔ اسی لیے میں نے آج اپنے بھانجے ڈاکٹر اکبر کو بھی بلایا ہے ۔ خدا کرے وہ آپ کی موجودگی ہی میں آجائیں وہ کل بھی دیکھ چکے ہیں ۔

حکیم : ڈاکٹر اکبر ۔ وہ صاحبزادے گویا جن سے نجمہ کی نسبت بھی ہو رہی ہے ۔

بیگم : جی ہاں وہی ۔ ماشاء اللہ بڑا سمجھدار ڈاکٹر ہے ۔ ہزار بارہ سو کی پریکٹس تو ابھی سے ہو گئی ہے اُس کی ۔

حکیم : یہ درست ہے مگر شاید آپ کو معلوم نہیں کہ خان بہادر صاحب یونانی امراض میں مبتلا ہیں ۔ ان امراض کو طبِ انگریزی کے ماہر مشکل ہی سے سمجھ سکیں گے ۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے ۔

بیگم : جی ہاں اب اسی اختیار سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ ہے ۔ آپ تشریف تو لائیے ۔ وہ آپ کے لیے کچھ اور امراض تصنیف کئے بیٹھے ہوں گے ۔

حکیم : بسم اللہ !

(دونوں جاتے ہیں ذرا سے وقفے کے بعد خان بہادر کی آواز قریب آنا
شروع ہوتی ہے)

خان بہادر : نسخے میں صاف لکھا ہے کہ مربہ سیب در ورقِ نقرہ پیچیدہ اول بخورند ۔ اور مجھ کو پلا دی گئی پہلے دوا گویا جو چیز اول بخورند

نئی وہ عقب ان ہو گئی۔ خوب ہو رہی ہے تیمارداری۔ اب نہ جانے اس کا کیا نتیجہ ہو۔

نجمہ : غلطی تو ضرور ہو گئی مگر یہ کوئی اتنی پریشانی کی بات نہیں ہے ابو جان!

خان بہادر : اے بیٹا بیمار کے لیے اتنی ہی سی بات بہت ہوتی ہے۔ دیکھ رہی ہو میری حالت۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ اور وہ کیا ہوئی معجون!

نجمہ : اُس کی دوائیں کوئی جا رہی ہیں، چٹنی بھی تیار ہے۔ لعوق بھی بن گیا ہے۔

خان بہادر : ذرا دیکھنا بیٹی میرا جسم تو گرم نہیں ہے۔ آنکھیں کچھ جل سی رہی ہیں۔ نتھنے کی ہوا بھی گرم ہے۔

نجمہ : نہ کہیں ابو جان۔ جسم تو اچھا خاصہ ہے۔

خان بہادر : مگر یہ تمہاری ہتھیلیاں کیوں جل رہی ہیں۔ دکھانا ذرا۔ ہوں۔ ہوں دوسرا ہاتھ دو۔ ٹھیک ٹھیک۔ ضرور حرارت ہے۔ جسم گنگنا ہے۔ چہرہ بھی تمتمایا ہوا ہے۔ حکیم صاحب آئیں تو نبض دکھا دینا۔ آئیے حضور۔ یاد شد بخیر۔ بھئی بڑی عمر ہے۔ نام لیا ہی تھا کہ تشریف لے آئے۔

حکیم : کہئے حضور مزاج مبارک۔ کیا حال رہا۔

خان بہادر : میرا حال تو بعد میں پوچھیے گا پہلے ذرا صاحبزادی کی نبض دیکھئے۔ میرے خیال میں حرارت ہے اور بخار کی آمد آمد ہے آنکھوں کا اضمحلال اور چہرے کی بھربھراہٹ ملاحظہ فرمائیے۔

حکیم : دکھانا بیٹی ذرا اپنی نبض!

بیگم : چھوڑیے بھی حکیم صاحب اچھی خاصی ہے۔ یہ ان کو تو اپنے متعلق بھی طرح طرح کے شک گھیرے رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی وہم میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔

خان بہادر : کمال کرتی ہیں صاحب آپ بھی۔ یعنی میں کہہ رہا ہوں کہ لڑکی بیمار ہے اور آپ فرماتی ہیں وہم ہے۔ آخر مجھ کو بھی کچھ نہ کچھ تجربہ تو ہے ہی۔ جو شخص اتنے دن سے بیمار ہو وہ خود بھی چھوٹا موٹا طبیب تو ہو ہی جاتا ہے۔ کیا رائے ہے حکیم صاحب۔

حکیم : بجا فرمایا غریب پرور۔ صاحبزادی کے چہرے پر علالت کی تمام علامتیں موجود ہیں۔ کیوں بیٹی نزلہ کی شکایت تو نہیں ہے۔ مثلاً چھینکیں یا گلے میں کچھ سرسراہٹ۔

نجمہ : جی نہیں مجھے اس قسم کی کوئی شکایت نہیں ہے۔ آپ ابو جان ہی کو دیکھئے۔

خان بہادر : اب ہو گی بھی کوئی شکایت تو وہ ظاہر تھوڑی کرے گی۔ ماں کی نگاہیں پہچانتی ہے۔ اس کو اپنی عاقبت تھوڑی خطرے میں ڈالنا ہے اور میں یہ کہتا ہوں کہ یہی چھوٹی چھوٹی شکایتیں بڑھ کر مہلک امراض کی صورت اختیار کر لیں۔

حکیم : درست فرمایا غریب پرور۔ اگر ان معمولی شکایات کا ابتدا ہی میں سدباب ہو جایا کرے تو علالت طوالت اختیار نہ کرے۔

بیگم : حکیم صاحب آپ اس قصے کو چھوڑیے فی الحال۔ آپ ان کا حال سنئے اور ان ہی کا معائنہ فرمائیے۔ کل ڈاکٹر اکبر نے ان کو دیکھ کر آپ کی ہر تشخیص سے اختلاف کیا ہے۔

خان بہادر : جی ہاں وہ صاحبزادے بھی عجیب اناڑی نکلے۔ میں تو سمجھا کہ اتنے دنوں تک میڈیکل کالج میں پڑھا ہے۔ دو تین سال فیل

ہو کر پاس ہوا ہے۔ پھر ولایت گیا ہے اور اب پریکٹس بھی اچھی خاصی کر رہا ہے۔ کچھ نہ کچھ جانتا ہی ہو گا۔ مگر وہ تو سخت جاہل ہے اور بیوقوفی میں بھی بالکل اپنے آپ کی اولاد معلوم ہوتا ہے۔

بیگم : محض اس لیے کہ اُس نے تمھاری ہاں میں ہاں نہیں ملائی۔ اُس نے تمھارا معائنہ کر کے اپنی صحیح رائے دے دی۔

خان بہادر : خیر آپ کا قصّہ تو یہ ہے کہ گھٹنے پیٹ کی طرف جاتے ہیں۔ وہ آپ کا بھانجا ہے اس لیے اُس کی جہالت بھی آپ کے نزدیک بڑی چیز ہے اور اگر میرے گھٹنے بھی پیٹ کی طرف گئے تو مجھ کو یہ غور کرنا پڑے گا۔ کہ میں اپنی لڑکی اس جہل مرکب کے حوالے کروں یا نہیں۔

بیگم : جہلِ مرکب وہ اسی لیے تو ہے کہ اُس کے نزدیک تم کو وہ بیماریاں نہیں ہیں جو تمہارے خیال میں تم کو ہیں۔

خان بہادر : یعنی حکیم صاحب یہ کمال دیکھئے اُن صاحبزادے کا کہ میں نے اُن سے کہا کہ مجھ کو حرارت ہے۔ وہ تھرمامیٹر لگا کر اس نتیجہ پر پہنچے کہ گویا میں جھوٹا ہوں۔ اور وہ شیشے کا سوا روپے والا قلم جس میں پارے کا ایک قطرہ اِدھر اُدھر ٹہلا کرتا ہے۔ میرے مقابلے میں سچا ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ میرا سر بھاری بھاری رہتا ہے۔ ان حضرات نے ایک صندوقچہ کھول کر ایک سیاہ پٹی باندھی۔ میرے بازو پہ اور ایک پھنکنا دبانا شروع کیا۔ اور آخر میں کہہ دیا کہ بلڈ پریشر بھی ٹھیک ہے۔ سر کی شکایت کی تو بازو پر پٹی باندھی اور صندوقچے کے ہندسوں سے نتیجہ نکال لیا۔ اس کو کہتے ہیں ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ ایسے چُغد کو میں اپنی لڑکی دے کر اس کی زندگی تباہ کر دوں گا۔ ناممکن۔

حکیم : عجیب تشخیص ہے یہ تو غریب پرور۔ خیر چھوڑیے اس قصّہ کو۔ یہ فرمائیے کہ رات کو نیند کیسی آئی!

خان بہادر : ویسے تو میں خوب سویا مگر جو شخص رات بھر سوتے میں بیداری کے خواب دیکھے۔ وہ کچھ ٹھیک ضرور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ صبح جو میں بیدار ہوا تو معلوم ایسا ہوتا تھا۔ حکیم صاحب کہ گویا رات بھر سفر میں رہا ہوں۔

حکیم : وہ خستگی تو میں آپ کے چہرے پر بھی دیکھ رہا ہوں۔

بیگم : بالکل غلط۔ مجھے تو کوئی خستگی نظر نہیں آتی۔ اچھا خاصا بشاش چہرہ ہے۔ ڈاکٹر اکبر کی رائے پر عمل کر کے اگر صبح غسل کیا ہوتا اور ہوا خوری کو گئے ہوتے تو طبیعت اور بھی چاق ہوتی۔

خان بہادر : صاحب آپ کے ڈاکٹر اکبر کی رائے پر عمل تو میں جب کرتا اگر مجھ کو ان پر اعتقاد ہوتا۔ آپ کو کیا معلوم کہ کل میں نے اُن صاحبزادے کے متعلق کیا رائے قائم کی ہے۔ میرے خیال میں تو اُس نے ڈاکٹری کو ڈوں دے کر پڑھی ہے۔ اُسے معلوم ہی نہیں کہ کس مرض کا سر کدھر ہوتا ہے۔ اور دُم کدھر ہوتی ہے۔ بہرحال تو میں یہ عرض کر رہا تھا حکیم صاحب کہ صبح کچھ مضمحل زیادہ تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناشتہ بھی حسبِ دلخواہ نہ کر سکا۔

بیگم : حکیم صاحب مجھ سے سنئے۔ ناشتے میں حسبِ معمول، دلیا اور دودھ تھا۔ پھر دو تلے ہوئے انڈے۔ دو مکھن لگے توسٹ جن پر جیلی بھی بھی خاصی مقدار میں چپڑی گئی تھی۔ اور دو چائے کی پیالیاں اور آخر ناشتہ کس کو کہتے ہیں۔

خان بہادر : ارے بھئی حکیم صاحب نے خود فرمایا ہے کہ پرندوں کا گوشت ناشتے میں کھایا جا سکتا ہے۔ بھنے ہوئے گُردوں کی بھی اجازت دی ہے۔ بہرحال تو جناب والا اس ناشتہ کے بعد ہی کچھ اختلاج کی سی کیفیت محسوس ہوئی تو میں نے تھوڑے تھوڑے

وقفے سے تین گلاس مالٹوں کے رس پیئے۔

بیگم : اور وہ چٹنیاں۔ معجونیں۔ لعوق۔ مربّے اور حریرے الگ سے استعمال کیے جو حکیم صاحب نے دوا کے طور پر بتائے ہیں۔ —

خان بہادر : خیر۔ خیر۔ یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات — تو میں یہ عرض کر رہا تھا حکیم صاحب کہ اب کھانے کا وقت قریب ہے۔ مگر بھوک کا جیسے کوسوں پتہ نہیں۔ مجھے تو اب یہ شبہ ہو گیا ہے کہ میرے پیٹ میں معدہ ہے بھی یا نہیں۔ اور ہاں صاحب صبح سے ایک عجیب شکایت یہ پیدا ہو گئی ہے کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پیر سو جاتا ہے۔ یہ فالج کا مقدمہ تو نہیں ہے حکیم صاحب۔

بیگم : جب چوبیس گھنٹے پڑے رہو گے تو اور کیا ہو گا۔

خان بہادر : صاحب یہ عجیب مصیبت ہے جو بات میں حکیم صاحب سے کرتا ہوں جواب آپ دیتی ہیں، ان کو بھی تو کوئی رائے قائم کرنے دیجئے۔ یہ پیر کا سُن ہو جانا یا سو جانا معمولی بات نہیں ہے۔ مجھے تو بڑا خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔

حکیم : ہے بھی خطرناک بات۔ میں اس کی رعایت نسخے میں کر دوں گا اور آپ بھی پرندوں میں کبوتر کا اضافہ کر دیجئے۔

(موٹر کار کا ہارن)

بیگم : ارے دیکھو۔ میرا خیال ہے اکبر میاں آئے ہیں۔ تم انھیں یہاں لے آؤ۔

لڑکی : بہتر بیگم صاحبہ۔

حکیم : تو میں اب اجازت چاہوں گا۔

خان بہادر : نہیں صاحب۔ آپ تشریف رکھئے۔ آنے دیجئے ان صاحبزادے کو، ایسے ایسے لونڈوں کو خاطر ہی میں کون لاتا ہے۔ کہاں آپ ایسا طبیب حاذق کہاں وہ کل کا چھوکرا۔ اور میں نے کہا سن لیجئے۔ بیگم صاحبہ میری طرف اُن صاحبزادے کو متوجہ نہ فرمائیے گا۔ ورنہ آج میں ان کی قلعی کھول کر رکھ دوں گا۔ آیا وہاں سے ڈاکٹر بن کر۔

بیگم : خدا کے لیے اب اُس کے منہ پر نہ کچھ کہہ بیٹھنا۔ سُن لے تو وہ بھی کہے کہ خوب قدر ہو رہی ہے ہونے والی سسرال میں۔

خان بہادر : خیر یہ تو ابھی غور طلب مسئلہ ہے۔

(دستک)

نجمہ : (دوڑتے ہوئے، دروازے کا کواڑ کھولتے ہوئے) تشریف لائیے۔

اکبر : السلام علیکم۔ مزاج کے متعلق اگر کچھ فرمانا ہو تو فرما دیجئے۔

نجمہ : مجھے مزاج کے متعلق تو نہیں البتہ اور کچھ عرض کرنا ہے اور سنجیدگی سے عرض کرنا ہے۔

اکبر : بالکل ٹھیک۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ہم دونوں کے درمیان اب سنجیدہ گفتگو عام طور پر ہوا کرے۔ وہ کھلنڈرے پن کا زمانہ گیا۔ اب بقول خالہ جان کے اللہ رکھے ہم دونوں سمجھدار ہیں۔

نجمہ : میں تو خیر ہوں سمجھدار، مگر فریقِ ثانی کی طرف سے مجھے شبہ ہے۔

اکبر : فریقِ ثانی! — وہ تو — وہ تو غالباً میں ہوا۔

نجمہ : غالباً نہیں بلکہ یقیناً آپ ہی ہیں اور آپ ہی کی عقلِ سلیم کی طرف سے مجھ کو شبہ ہے۔ میں یہ پوچھتی ہوں کہ جناب کو ابّا جان کی

تشخیص میں اپنی قابلیت بگھارنے کی کیا ضرورت تھی۔

اکبر : قابلیت۔ وہ کب بگھر گئی۔ میں نے تو ان کو دیکھ کر یہی بتایا ہے کہ ان کو دراصل کوئی بیماری ہی نہیں ہے۔

نجمہ : جی ہاں۔ تو یہ آپ نے کیوں بتایا۔ اتنے دنوں سے آپ اُن کے بھلے بنے چلے آ رہے ہیں۔ اور اب تک آپ کو یہ بھی اندازہ نہیں ہوا کہ اُن کو بیماری اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ بیمار ہونے کا شوق ہے اور ہر اس شخص سے وہ بیزار ہو جاتے ہیں، جو ان کی بیماری میں ذرا بھی شک کرے۔

اکبر : بیزار ؟ تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ وہ مجھ سے بھی بیزار ہو گئے ہوں گے۔

نجمہ : ایسے ویسے بیزار۔ وہ تو یہ کہہ رہے ہیں کہ اب مجھ کو غور کرنا پڑے گا کہ اس لڑکے کو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کو گویا وہ۔

اکبر : داماد بھی بنائیں یا نہیں ؟ یہی نا۔

نجمہ : جی ہاں یہی سمجھ لیجئے۔

اکبر : لاحول ولا قوۃ۔ میرا کیا ہے مجھ سے کہئے میں دو ہزار بیماریاں ان کے لیے تجویز کر دوں۔

نجمہ : خیر یہ کام وہ خود اپنے لیے کرتے رہتے ہیں۔ اب آج خیال یہ ہو گیا ہے کہ فالج کے آثار ہیں۔ پیر بار بار سو جاتا ہے۔

اکبر : بس تو ٹھیک ہے۔ وہ معتقد کیا ہوا اپنا کہ وہ نیم حکیم خطرۂ جان بھی منہ دیکھ کر رہ جائے۔ آؤ۔ میرے ساتھ آؤ۔

نجمہ : سنئے تو۔ صبح جب اُٹھے ہیں تو کچھ تھکاوٹ بھی تھی اور ناشتہ بھی حسبِ دلخواہ نہیں کیا ہے۔

اکبر : بس بس سمجھ گیا میں۔ تم آؤ میرے ساتھ۔

(جاتے ہیں خان بہادر صاحب کی آواز رفتہ رفتہ قریب آتی ہے)

خان بہادر : رات جو ملازم میرے کمرے میں دُودھ لے کر آیا تھا۔ اس کو چھینک آ گئی تھی۔ نزلے کی وجہ تو یہی ایک بیہودگی ہو سکتی ہے۔

حکیم : درست فرمایا غریب پرور۔ نزلہ چھینک ہی کے ذریعے پھیلتا ہے۔

اکبر : (داخل ہوتے ہوئے) آداب عرض کرتا ہوں خالو جان۔ خالہ جان تسلیم۔ اور آپ کی تعریف۔

خان بہادر : یہ میرے طبیب خاص عمدۃ الحکماء حکیم اشرفی صاحب ہیں۔ کیا سوجھ بوجھ ہے اور کیا تشخیص ہے۔

اکبر : (ہاتھ ملاتے ہوئے) میرا نام اکبر ہے۔ بڑی مسرت ہوئی حکیم صاحب آپ سے مل کر۔ صاحب کل میں نے آپ کے مریض کا معائنہ کیا تھا اور چند معمولی شکایات محسوس کر کے بظاہر خالو جان کو مطمئن کر دیا تھا کہ آپ کو کوئی بیماری ہی نہیں ہے۔ مگر میں جو خون وغیرہ ٹسٹ کرنے کے لیے لے گیا تھا اس کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مریض سے بیماری چھپانا نہیں چاہئے تاکہ وہ زیادہ احتیاط برت سکے۔

خان بہادر : کیا مطلب۔ گویا آپ کے خیال میں کچھ امراض ہیں نا مجھے ؟

اکبر : وہ میں ابھی عرض کرتا ہوں آپ کو دیکھ کر۔ ذرا نبض دیجئے مجھے۔ ہوں۔ ہوں۔ کبھی ایسی کوئی بات تو نہیں ہوئی کہ مثلاً آپ رات کو خوب سوئے بھی مگر صبح اس طرح اُٹھے گویا سخت تھکن سی ہو۔

خان بہادر : بالکل۔ بالکل۔ وہ تو بھئی آج ہی ہوا ہے۔ کیوں بھئی حکیم صاحب میں کہہ رہا تھا نا ؟

حکیم : جی ہاں آپ فرما رہے تھے اور مجھے بھی چہرہ پر خستگی نظر آئی تھی۔

اکبر : ٹھیک ہے میرا خیال۔ اچھا یہ بتائیے خالو جان کبھی آپ کے ہاتھ یا پیر سُن تو نہیں ہو جاتے یعنی سو تو نہیں جاتے۔

خان بہادر : ارے بھئی میں بالکل یہی تکلیف بیان کر رہا تھا ابھی۔

بیگم : یہ تو آج ہی ان کو شکایت پیدا ہوئی ہے۔

خان بہادر : میرا خیال یہ ہے کہ تم اب مرض کی تہہ کو پہنچ گئے ہو۔

بیگم : کوئی خطرناک بات تو نہیں ہے اکبر میاں۔

اکبر : خالہ جان احتیاط شرط ہے انشاءاللہ خالو جان بالکل تندرست ہو جائیں گے۔ ان کو دو مرض ہیں ایک کا نام ہے انسائیکلوپیڈیا اور دوسرے کا نام ہے کانسٹینٹی نوپل۔

حکیم : بجا ارشاد ہوا غریب پرور۔ میری تشخیص بھی یہی تھی۔

خان بہادر : تشخیص تو آپ کی ضرور ہوگی۔ مگر علاج اب میں اکبر میاں ہی کا کروں گا۔ گھر کی مرغی دال برابر ضرور ہوتی ہے۔ مگر کیا سوجھ بوجھ ہے۔ یعنی پیروں کا سُن ہونا سمجھ گئے۔ صبح کا اضمحلال سمجھ گئے۔

اکبر : آپ اطمینان رکھیے۔ میں ابھی آپ کے لیے دوا منگواتا ہوں۔ خالہ جان آپ ذرا میرے ساتھ آئیے۔

حکیم : میں گویا اب اجازت چاہتا ہوں۔

خان بہادر : (بلند آواز سے) ارے بھئی حکیم صاحب کی فیس بھی بھیج دینا بیگم۔

بیگم : (دُور سے) بھیجے دیتی ہوں (آہستہ آواز میں) اکبر میاں۔ یہ ان کو آخر ہو کیا گیا ہے۔

اکبر : چپ بھی رہیے خالہ جان۔ کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ وہم کا علاج اس طرح ہوتا ہے۔ نجمہ سے جو حال سُنا تھا وہ اُن پر ظاہر کر دیا وہ معتقد بھی ہو گئے اور میری ساکھ بھی قائم ہو گئی اور رشتہ بھی گڑبڑ نہیں ہوا۔

بیگم : توبہ ہے میرا تو دم ہی نکال لیا تم نے۔ مگر تم نے ٹھیک کیا ان کا علاج ہی یہ ہے۔ ٹھہرو میں حکیم صاحب کو فیس تو بھیج دوں۔

اکبر : بھیجیے یا نہ بھیجیے (آہستہ سے) میں نے تو اپنی فیس کھری کر لی کیوں نجمہ؟

نجمہ : چُپ بھی رہیے گا کہ نہیں — شرم نہیں......"

اکبر : (بات کاٹ کر) شرم کس کی تمہاری؟ اس کا بھی علاج کرنا پڑے گا مجھے — ٹھہرو! (ہنستا ہے)

مُرقّع

(شیخ صاحب خوشی سے بدحواس گھر میں داخل ہوتے ہیں)

شیخ صاحب: ارے بھئی میں نے کہا الطاف کی ماں۔ میں نے کہا سنتی ہو نجمہ کی ماں۔ ارے بھئی کدھر گئیں نیاز کی ماں۔ کون اصغر؟ ارے بھئی کہاں ہیں تمھاری والدہ یعنی ماں۔

اصغر: ابھی بلاتا ہوں ابا جان۔ یہ تار کیسا ہے آپ کے ہاتھ میں۔

شیخ صاحب: تم کو بھی معلوم ہو جائے گا۔ مگر پہلے تمھاری ماں کو معلوم ہونا چاہیئے۔ پہلے اُن کو بلاؤ۔ یا رہنے دو تم۔ تم سے بھی بھلا کوئی کام ہوا ہے۔ وہ خود آ رہی ہیں۔ میں نے کہا۔ بھلا پوچھو تو سہی یہ کیا ہے۔ اچھا فرض کر لو کہ یہ تار ہے تو بھلا کس کا ہے۔ اور اس میں کیا لکھا ہے۔

بیوی: کتنا اچھا موقع نکالا ہے پہیلیاں بجھانے کا۔ کہ ہاتھ میں تار ہے۔ اور کھڑے ترسا رہے ہیں۔

شیخ صاحب: پہلے مٹھائی کھلاؤ۔ پھر بتاؤں گا میں کہ میاں نجم الحسن کا تار ہے۔

بیوی: نجمل کا تار ہے۔ لکھا کیا ہے۔ خدا کے لیے کسی طرح بتا بھی چکو۔

اصغر: بہرحال ہے کوئی خوشی کی بات۔ ابا جان خوش نظر آ رہے ہیں۔

شیخ صاحب: خوش تو خیر میں اس لیے نظر آ رہا ہوں۔ کہ یوں ہی خوش مزاج میری خندہ پیشانی کو تو ایک دنیا مانتی ہے۔ مصیبتوں پر میں مسکرا دوں۔ آزمائشوں پر میں ہنسوں۔ ابا جان مرحوم کا جب انتقال ہوا ہے۔

بیوی: بھئی خدا کے لیے اصغر میاں تم ہی ان سے تار لے کر ذرا پڑھ لو۔

شیخ صاحب: نا۔ خبردار۔ یہ تار بغیر مٹھائی کھائے ہرگز نہ سنایا جائے گا۔

بیوی: کھلا دوں گی مٹھائی۔ کھلا دوں گی۔ خدا کے لیے اب تو بتا دو۔

شیخ صاحب: ہاں بات ہوئی نا اب۔ جناب والا۔ یہ تار ہے نجم الحسن کا۔ اس کی شادی ۲۵ ر کو ہو رہی ہے۔

بیوی: مجھے بھی دھڑکا لگا ہوا تھا۔ کہ بس ایک دم سے تار آ جائے گا کسی نہ کسی دن۔

شیخ صاحب: دھڑکا لگا ہوا تھا۔ یعنی۔ بھئی دھڑکا کیسا؟ بھائی کی شادی کی خوشی ہوتی ہے یا دھڑکا ہوتا ہے۔ اتنی بڑی خوشخبری سُنائی اور وہ کہتی ہیں دھڑکا لگا ہوا تھا صاحب یہ میری شادی کا تار نہیں ہے جس کا آپ کو دھڑکا ہو سکتا ہے۔ یہ آپ کے حقیقی برادرِ عزیز کی شادی کا مژدہ ہے۔

بیوی: مژدہ تو ہے مگر میرے تو پیروں تلے کی زمین نکل گئی کہ اب اتنی جلدی میں کیسے سارا انتظام کروں گی۔

شیخ صاحب: عجیب چیز واقع ہوئی ہیں آپ بھی۔ انتظام سے تم کو کیا مطلب۔ انتظام اُنھوں نے خود کیا ہوگا ہم کو تو صرف شرکت کرنا ہے۔

بیوی: اس شرکت ہی کے انتظام کو کہہ رہی ہوں۔ کچھ نہیں کچھ نہیں پھر بھی پانچ سو روپیہ سے کم کا خرچ نہیں ہے۔

شیخ صاحب: پانچ۔ سو۔ روپے تو کیا تمھارا خیال ہے کہ یہ دراصل ہم دونوں کی شادی ہے۔ ایک روپیہ دس آنے ہے ریل کا ٹکٹ۔ تم ہو۔ میں ہوں۔ اور چار پانچ بچے ہیں۔ اس کے لیے پانچ سو روپے آخر کس حساب سے جوڑ لیے۔

بیوی: بس لنگوٹیاں باندھ کر سب ریل پر بیٹھ جائیں۔ چلیے چھٹی ہوئی۔ تجمل کی دُلہن تمھاری کون ہے۔

شیخ صاحب: کون نفیسہ۔ ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ ہے ضرور میری۔

بیوی: وہ خالہ زاد بہن ہے تمھاری۔ لہٰذا ہمیں اُسے بھی جوڑا دینا ہے۔ تجمل میرا بھائی ہے لہٰذا اُس کی دُلہن کو مُنہ دکھائی میں ہاتھ گلے کی کوئی چیز تو دی جائے۔ پھر تجمل کی سلام کرائی۔ ڈومنیوں کو دینے کے لیے نچھاور اور شادی کے پچاس خرچ ہوتے ہیں۔ پھر کسی بچے کے پاس گت کے کپڑے نہیں ہیں دو دو جوڑے تو نئے ہوں سب کے پاس۔ نجمہ کی سینڈل آئے گی ——— الطاف کے پاس ٹوپی نہیں ہے۔ نیاز کے پاس بھی جوتا نہیں ہے۔

اصغر: ذرا اس جُوتے کو بھی دیکھ لیجیے۔ جو دانت نکالے اس شادی کی خوشی میں ہنس رہا ہے۔

شیخ صاحب: قصّہ مختصر یہ کہ شادی میں جانا تقریباً ناممکن۔

بیوی: لو اور سُنو۔ جائیں گے کیسے نہیں۔ میرے کوئی دس پانچ بھائی نہیں ہیں۔ کہ میں تجمّل کی شادی میں نہ جاؤں۔

شیخ صاحب: اچھا بھئی تو جاؤ۔ خدا مبارک کرے جانا۔ مگر یہ پانچ سو روپے کہاں سے آئیں گے۔

بیوی: جہاں سے بھی آئیں۔ کرنا تو کچھ انتظام۔ وہ تو کہو دُلہن کو مُنہ دکھائی میں دینے کے لیے میں نے پیسہ پیسہ جوڑ کر کلائی کی گھڑی خرید رکھی تھی۔ نہیں تو دو ڈھائی سو روپے یہ بھی چا ہوتے۔

شیخ صاحب: بھئی صاف بات یہ ہے۔ کہ اب تو پانچ سو روپے خود میری بھی قیمت نہیں رہی ہے۔ کہ میں اپنے کو نیلام پر چڑھا دوں۔

اصغر: مگر ابّا جان شادی میں جانا تو بہرحال ہے ہی۔

شیخ صاحب: تو یہ بھی ہے ہی کہ میں کوئی انتظام نہیں کر سکتا۔ سوائے اس کے کہ کہیں ڈاکہ ڈالوں۔

بیوی: تمھارا مطلب یہ ہے کہ اپنے بھائی کی شادی میں بھی، میں شرکت نہ کروں۔ اور کیا تم یہ چاہتے ہو کہ بھائی

کی شادی میں بس چار ہاتھ پیروں سے پہنچ جاؤں ۔ اے میں کہتی ہوں دنیا آخر کیا تھوکے گی میری اوقات پر

شیخ صاحب: تو صاحب دنیا کے اس تھوک کے لیے میں پانچ سو روپے کا اگالدان آخر کہاں سے لاؤں مجھے تو کوئی قرض بھی نہ دے گا ۔

بیوی: یہ مجبوری حسینہ کی شادی پہ تو ہوئی نہیں ۔ یہی نا کہ وہ اپنی بہن تھی اور یہ میرے بھائی کی شادی ہے ۔

شیخ صاحب: پھر وہی ۔ میں کہتا ہوں سمجھا لو ، اصغر میاں اپنی ماں کو انھوں نے شروع کر دیں دلآزاری کی باتیں ۔ حسینہ کی شادی کے اخراجات کے اٹھتے بیٹھتے ہر وقت طعنے سن رہا ہوں ۔ حالانکہ ان کو معلوم ہے کہ اس کا باپ تھا تو میں تھا ۔ بھائی تھا تو میں تھا ۔ اور ــــ اور ــــ میں تھا تو میں تھا ۔

بیوی: میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ اس وقت تو خوب قرض مل گیا تھا ۔ اس وقت تو خوب اللّے تللّے ہوئے تھے ۔ کہ پانچ رنگ کا کھانا بھی تھا ۔ سر سے لے کر پیر تک کے زیور بھی دیئے تھے ۔ پچاس کے لگ بھگ جوڑے بھی تھے ۔ صوفہ سیٹ بھی دیئے گئے سنگھار کی میز بھی دی گئی ۔ دولہا کو موٹر سائیکل تک تو دی تم نے ۔

شیخ صاحب: اگر وہ قرض ادا ہو گیا ہوتا تو بخدا آج بھی قرض مل جاتا ۔ مگر اب کون دے گا ۔ مجھ قرض میں لدے ہوئے مریض کو قرض ۔

بیوی: اچھی بات ہے نہیں جاتی میں ، لکھ دو تجمل کو کہ (روکر) تمہاری بہن مر چکی ہے بھائی کی شادی کا ارمان لیے سدھار گئی ۔ اِس دنیا سے ۔

شیخ صاحب: لیجئے رونا شروع ہو گیا لاحول ولا قوۃ ۔ ارے صاحب خدا کے لیے یعنی میرا مطلب یہ کہ میں تو یوں ہی چھیڑ رہا تھا ۔ قرض کیسے نہ دیں گے لوگ مجھے ۔ بخدا مزاج ٹھکانے کر دوں ۔ جو قرض دینے سے انکار کرے ۔ ابھی ان بوڑھی ہڈیوں میں اتنا کس بل ہے کہ قرض دینے سے انکار کرنے کی ہمت کسی کو نہیں ہو سکتی ۔ لو اب تو پونچھ ڈالو یہ آنسو ۔ بخدا جب تم روتی ہو تو مجھے اپنی زندگی پہ طرح طرح کے شک گزرنے لگتے ہیں ۔ میں جا رہا ہوں ۔ روپیہ کا انتظام کرنے ۔

بیوی: کچھ روپیہ زیادہ ہی لینا خود تمہارے پاس بھی کپڑے نہیں ہیں ۔

شیخ صاحب: ہاں ہاں ۔ زیادہ سے زیادہ لو ۔ قرض ہی تو لینا ہے کونسی اپنی کمائی کا خرچ ہے ۔ بہرحال تم چلنے کی تیاری کرو ۔

اصغر: میرا جوتا نہ بھولیے گا ۔ ورنہ میں ہرگز نہ جاؤں گا ۔

شیخ صاحب: نہیں صاحب نہیں ۔ میں کچھ نہ بھولوں گا (زیر لب بڑبڑاتا ہوا جاتا ہے) کاش آپ لوگ مجھ کو بھول سکتے میرا کیا ہے ۔ انشاء اللہ اتنا قرض چھوڑ کے مروں گا ۔ کہ طبیعت صاف ہو جائے ۔ میرے پسماندگان کی ۔ قرض مانگتے مانگتے بدھیا بیٹھ جائے ۔

(بڑے میاں کی آواز فیڈ آؤٹ ۔ ٹرین کی آواز فیڈ اِن ہوتی ہے

اس ٹرین میں جھگڑا ہو رہا ہے)

ایک مسافر: جی نہیں۔ میرے باپ کی تو ریل گاڑی ہے نہیں۔ مگر جناب کے والد محترم کی بھی نہیں ہے۔ آپ کو اُٹھ کر بیٹھنا ہوگا۔

دوسرا مسافر: خواہ مخواہ بھی اٹھنا ہوگا۔ میں نے پیر سمیٹ تو لیے ہیں بیٹھ جاؤ نا۔

ایک مسافر: ایسا ہی تو میں تمھاری پٹّی تلے پیدا ہوا ہوں کہ تمھارے قدموں میں بیٹھ جاؤں۔

دوسرا مسافر: کتنی مرتبہ میں تم سے کہوں کہ مجھے لیٹنے کا شوق نہیں ہے۔ بیمار ہوں۔

شیخ صاحب: ارے بھئی یہ کا ہے کا جھگڑا ہے۔ اصغر میاں تم کھڑے ہو جاؤ۔ ان کو جگہ دے دو مگر کچھ پتہ تو چلے کہ آخر بات کیا ہے۔

ایک مسافر: صاحب اصل قصّہ یہ ہے کہ۔

دوسرا: جی نہیں اصل قصّہ وہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ۔

ایک مسافر: آپ مجھ سے سنیئے۔

دوسرا: ان سے نہیں مجھ سے سنیئے۔

شیخ صاحب: میں چاہتا ہوں کہ آپ دونوں سے کچھ نہ سنوں بلکہ آپ دونوں مجھ سے سُنیں۔ آپ کو شکایت ہے کہ یہ لیٹے ہیں۔ یہی نا۔

ایک مسافر: جی ہاں، معلوم ہوتا ہے کہ جناب کا دولت خانہ ہے۔

شیخ صاحب: بہرحال، اور آپ کو شکایت یہ ہے کہ اگر آپ لیٹے ہیں تو یہ اُٹھا کیوں رہے ہیں۔

دوسرا: نہیں صاحب۔ میں بیمار ہوں اس لیے لیٹا ہوں۔

شیخ صاحب: کیا تکلیف ہے آپ کو۔ ذرا دکھایئے نبض اپنی۔ بخار تو نہیں۔ ہے البتہ تبخیری کیفیت ضرور ہے۔ ذرا زبان تو نکالیئے۔

دوسرا: (زبان نکال کر) آ آ آ۔

شیخ صاحب: کس کا علاج کر رہے ہیں آپ اور کیا مرض تجویز کیا ہے آپ کے معالج نے۔

دوسرا: میں حکیم ابوالشفاؔ کے زیرِ علاج ہوں ان کا خیال ہے کہ مجھے ہڈیوں کا بخار ہے۔

شیخ صاحب: غلط۔ اور جب تشخیص ہی غلط ہے تو علاج یقیناً غلط ہوگا۔ آپ کو دراصل تپ

پہلا: (گھبرا کر) دِق؟ تپِ دق؟ آپ نے پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔ آپ آرام سے لیٹیئے۔ میں اگلے سٹیشن پر اُتر جاؤنگا۔ باپ رے باپ، تپِ دق۔

شیخ صاحب: نہیں صاحب تپِ دق نہیں ہے بلکہ تپِ محرقہ ہے اور اس کا علاج حکیم شیخ ابوالبرکات ہی کر سکتا ہے۔

دوسرا: حکیم شیخ ابوالبرکات؟ یہ کون بزرگ ہیں۔

شیخ صاحب: اب میں اپنی زبان سے کیا عرض کروں۔ بہر حال اگر آپ سنجیدگی سے اپنا علاج کرنا چاہتے ہیں اور اس مرض سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو مجھ سے خط و کتابت کیجیے گا۔

دوسرا: جناب کا اسم مبارک؟

شیخ صاحب: اس خاکسار کو حکیم شیخ ابوالبرکات کہتے ہیں۔

دوسرا: یعنی آپ خود ہی، گویا حکیم، یعنی شیخ، مطلب یہ کہ ابوالبرکات ہیں۔

(گاڑی اسٹیشن پر رکتی ہے۔ قلیوں کا اور اسٹیشن کا ہنگامہ فیڈ اِن ہوتا ہے۔ یہ شور رفتہ رفتہ فیڈ آؤٹ ہو کر موٹر کے چلنے کی آواز فیڈ اِن ہوتی ہے اور پھر شہنائی کی آواز میں گم ہو جاتی ہے۔ شہنائی کی آواز فیڈ آؤٹ ہوتی ہے اور ڈھولک کی آواز اس پر غالب آجاتی ہے۔ لڑکیاں ڈھولک پر گا رہی ہیں)

گوری تیری گھونگھٹ میں چندا براجے
گوری ترے مکھڑے پہ تارا ساجے

بیوی: (ڈانٹتے ہوئے) توبہ ہے تم سے بھی لڑکیو! بس اب یہ گانا بجانا ہی کرو گی یا کوئی اور کام بھی ہے۔ برات آنے ہی والی ہے۔

ایک لڑکی: ہم تو اسی وقت سے برات آئی ہوئی سمجھ رہے ہیں جب سے آپ آگئی ہیں۔

بیوی: ہاں سچ مچ آنا تو چاہیے تھا مجھے سمدھن ہی بن کر برات کے ساتھ مگر انھوں نے یہی کہا کہ میں آؤں گا برات کے ساتھ تم شرکت کرو لڑکی والوں کی طرف سے۔ گھر کی گھر میں شادی ہو تو یہی کچھ ہوتا ہے۔

دوسری لڑکی: مگر اب ایسا بھی نہیں ہوتا کہ سگی نند بھی سمدھن بن کر نہ آئے۔

بیوی: اے تو یہ بھی تو میری صرف بھاوج نہیں ہے بہن۔ اس سے پہلے کی اس کی بھاوج ہوں تو یہ ہے لڑکیو مجھے بھی باتوں میں لگا لیا اور برات اب پہنچنے ہی والی ہے اے میں نے کہا بس یہی جہیز ہے۔

ایک لڑکی: جو کچھ تھا وہ رکھ تو دیا ہے سامنے۔

دوسری: رکھ تو دیا ہے مگر ان کی نظر میں کیوں آنے لگا۔ مگر وہ بھی مجبور ہوں ان کا رشتہ ہی ہے نام دھرنے کا۔

ایک لڑکی: شادی لڑکی کے لیے تھوڑی کرتے ہیں۔ جہیز کے لیے کرتے ہیں۔

بیوی: بس صاحبزادی بس۔ بہت ہو لی۔ لو اور سنو بات پوچھ کر میں گنہگار بن گئی۔ میں نے تو یہ پوچھا کہ سب چیزیں رکھ دی ہیں یا کچھ رہ گیا ہے۔ مگر تم تو جیسے بہانہ ہی ڈھونڈھ رہی تھیں لڑنے کا۔

دلھن کی ماں: کیا بات کیا ہے، دلھن بیگم کس پر خفا ہو رہی ہو۔

ایک لڑکی : اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹ رہا ہے جہیز پر اعتراض کر رہی تھیں کہ بس اتنا ہی ہے ۔

دلھن کی ماں : یہ اعتراض تو نہ ہُوا ہماری غریبی کا مذاق اُڑانا ہو گیا مگر میں تو یہ پوچھتی ہوں ۔ خود تم جہیز میں کون سے گاؤں لائی تھیں ۔

بیوی : یہ ہے تو یہی سہی ۔ جب نہیں کہا تھا تو اب کہتی ہوں کہ اس سے زیادہ جہیز تو اللہ میری توبہ ہے میرے باورچی کی بہو بھی لے آئی تھی ۔

دلھن کی ماں : اے ہے دیکھے ہیں ۔ جانے تمہارے باورچی بھی وہی باورچی نا جو چھ مہینے کی تنخواہ کے لیے آٹھ آٹھ آنسو روتا ہُوا چلا گیا ۔

بیوی : خیر میں تمہارے مُنہ تو لگتی نہیں مجھے خوب معلوم ہے کہ تمہارے ہی بہکائے میں آ کر وہ موا نکل گیا میرے یہاں سے

ایک لڑکی : خیر ان جھگڑوں کا یہ کونسا موقع ہے ۔

بیوی : اور بھیجیں مجھے کہ تم دلھن والوں کی طرف سے شرکت کرو ۔ یہ ہیں کہاں ۔ ذرا بلواؤں تو سہی میں ان کو ۔

دوسری لڑکی : چھوڑیئے بھی ان باتوں کو ۔ جو سنے گا وہ بھی کیا کہے گا ۔ مہمان سے گھر بھرا ہُوا ہے ۔

بیوی : گھر بھرا ہُوا ہے تو سب ہی دیکھ لیں گے یہ تماشہ میں تو اب ایک منٹ کے لیے بھی نہ ٹھہروں ۔ اس گھر میں (آواز دے کر) اے میں نے کہا الطاف او ۔ الطاف کے بچے ، ذرا دیکھ تیرے اباجان کہاں ہیں ۔ ڈیوڑھی میں بُلا ذرا ان کو ۔

الطاف : (جاتے ہوئے) ابھی لاتا ہوں ۔ ابھی لایا ۔

(اس کے ساتھ ہی منظر باہر کا قریب آ جاتا ہے)

شیخ صاحب : نہ نہ نہ ۔ میری بات سُنیئے ۔

الطاف : اباجان ۔ امّی جان بلاتی ہیں ۔

شیخ صاحب : خیر بلاتی ہوں گی ۔ چُپ رہ ذرا ۔ ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا ۔ کہ مہر دراصل لڑنے کی چیز ہے ہی نہیں ۔ اب مثلاً میرا مہر بندھا تھا سوا لاکھ روپیہ دینارِ سُرخ ، پاؤ بھر چڑیا کا دودھ ۔ آدھ سیر گولر کے پھول ۔

نظام : جی کیا فرمایا ۔ چڑیا کا دودھ ۔ گولر کے پھول ۔

شیخ صاحب : جی ہاں جناب عرض تو کر رہا ہوں کہ چڑیا کا دودھ گولر کا پھول ۔ مقصد یہ تھا کہ نہ چڑیا کا دودھ ملے گا نہ طلاق ممکن ہو گا نہ گولر کے پھول دستیاب ہوں گے نہ فارغ خطی کی نوبت آئے گی تو جناب والا پچیس ہزار سکّہ رائج الوقت تو گویا کچھ بھی نہ ہُوا ۔ میرے خیال میں ٹھیک ہے ، حسابِ دوستاں در دل کے معاملات میں سے ہیں یہ باتیں ۔

نظام : جی نہیں یہ غلط ہے شرعی نقطۂ نظر سے نیّت ہونا چاہیئے ادائیگی مہر کی ۔

شیخ صاحب : درست ہے مگر میں جو کہہ رہا ہوں وہ بھی درست ہے چلئے میں ہُوا وکیل اور دونوں سے سہرا پڑھنے

کی آواز آتی ہے) ایں یہ کیا ہو رہا ہے۔

نظام: نجم الحسن کا کوئی دوست سہرا پڑھ رہا ہے۔

شیخ صاحب: بھئی یہ پیشگی سہرا کیسا۔ سہرا نکاح کے بعد پڑھا جاتا ہے منع کرنا چاہیے اُن کو (جاتے ہیں اور سہرا پڑھنے والے کی آواز)

(ترنّم سے ایک شخص سہرا پڑھ رہا ہے لوگ داد دے رہے ہیں)

متعدد لوگ: سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ ذرا پھر ارشاد ہو۔

شاعر: تسلیمات عرض ہے۔ عرض کیا ہے۔

شرمائے ہیں دُولہا گھونگھٹ میں جیسے دلہن
نجم الحسن کے سر ہے آن کی دُلہن کا سہرا

شیخ صاحب: خوب خوب ماشاءاللہ۔ مگر جناب

(داد کا عام شور)

شاعر: آداب عرض کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہو

ہیں عقل پہ یہ پتھر یا سر پہ پھول ہیں یہ
بھولے سے باندھ آئے تم کو کفن کا سہرا

داد کا ہنگامہ

شیخ صاحب: ارے بھئی میری بات تو سنو۔ سبحان اللہ مگر صاحبزادے۔

شاعر: حسن سماعت ہے آپ کا عرض ہے

تو حسن کا ہے گاہک صورت تو دیکھ اپنی
اُس چاند کے لیے ہے تجھ سے گہن کا سہرا

(لوگوں کے قہقہے اور داد)

شیخ صاحب: استغفر اللہ۔ اپنی کہے جاتے ہو میری نہیں سُنتے۔

شاعر: میں کس قابل ہوں حوصلہ بڑھاتے ہیں آپ سماعت فرمائیے۔

ہے جانگلوش دولہا جنگل کا رہنے والا
گلشن کا کیا کرو گے منگواؤ بن کا سہرا

(لوگوں کے قہقہے اور داد)

شیخ صاحب: میں کہتا ہوں میری بات سُنو۔

شاعر: قدر افزائی ہے آپ کی پیش کرتا ہوں۔

مسٹر کیسے بنائیں اور کیوں بنائیں آخر
کس چال ڈھال کا ہے اور کس چلن کا سہرا

(داد کا شور)

شیخ صاحب: ارے بھئی حضرت مسٹر۔ کمال کر دیا تم نے بھی سارا سہرا پڑھ گئے اور میری ایک بات نہ سنی عزیز من سہرا نکاح کے بعد پڑھا جاتا ہے۔

نظام: بہرحال اب تو پڑھ ہی دیا گیا۔ اب نکاح کی جلدی ہونا چاہیئے بہرحال یہ طے ہے کہ مہر گیارہ سو سے زیادہ نہ ہوگا۔

شیخ صاحب: پھر وہی۔ اگر بزرگ سمجھ کر مجھ کو بلایا ہے تو میری بات مانو ورنہ مجھ سے کہو میں اپنا راستہ لوں جو بات ہے وہ اوندھی، باوا آدم ہی نرالا ہے یہاں کا چار شادیاں اپنی بھی ہوئیں سو شادیاں دوسروں کی دیکھیں مگر یہ اندھیر کہیں نظر نہ آیا۔

نظام: بہرحال یہ طے ہے قبلہ و کعبہ کہ مہر گیارہ سو۔

شیخ صاحب: تو یہ بھی طے ہے کہ میں نہیں بنتا وکیل۔

نظام: اس کا آپ کو اختیار ہے۔

شیخ صاحب: تو اس کا بھی اختیار ہے کہ میں واپس چلا جاؤں۔ اب منہ کیا دیکھ رہا ہے الطاف میرا جا کر اپنی ماں سے کہدے کہ بھر پایا میں نے میں جا رہا ہوں واپس۔

الطاف: وہ اسی لیے تو بلا رہی ہیں کہ وہ بھی واپس جا رہی ہیں۔

شیخ صاحب: بیشک جانا چاہیئے واپس کم سے کم اتنا تو متحد الخیال ہونا ہی چاہیئے میاں بیوی کو۔ جا کر بلاؤ ان کو۔

نظام: قبلہ میری بات سن لیجئے۔

شیخ صاحب: جی کچھ نہیں بس ہو چکی بات ختم۔ ۲۔ بس اب خانہ آباد و دولت زیادہ۔

الطاف: امی جان تانگہ پہ بیٹھ چکی ہیں۔

شیخ صاحب: بیٹھ چکنا چاہیئے تھا ان کو چلو تم سب بھی اصغر کہاں ہے نیاز۔ نجمہ سب آ گئے نا۔ بس ٹھیک ہے چلو۔

اصغر: آپ چل تو رہے ہیں مگر ——

شیخ صاحب: اگر مگر کچھ نہیں قرض کے بارے بھی بچے اور آن بھی قائم رہی یعنی وہ کیا ہے مصرعہ کہ جنت کی جنت اور رند کے رند خیر ہوگا کچھ مصرعہ گھر چل کر کہیں گے کہ ۲ خیر سے بدھو گھر کو آئے۔

(تانگہ چلنے کی آواز قریب سے دور جا کر فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

آم اور جامن

(تیز ہوا کے مسلسل خراٹے - درختوں کے ہلنے کی آواز - پرندوں کی چہچاہٹ
کے بعد جامن کی آواز آتی ہے)

جامن : آم ... میں نے کہا آم کیا سو گئے؟

آم : کون ہیں؟ نہیں تو جامن - بھلا یہ سونے کا وقت ہے، میں تو اپنی ایک ڈال پر بیٹھے ہوئے کبوتروں کی جوڑی کے راز و نیاز سن رہا تھا۔

جامن : اور میں نے تم کو اس لیے آواز دی تھی کہ میری ایک بہت اونچی شاخ پر طوطوں کی ایک جوڑی عجیب طرح کی باتیں کر رہی تھی۔

آم : عجیب طرح کی باتیں؟ وہ کیا؟

جامن : وہی انسان کا دکھڑا - وہی اشرف المخلوقات کا رونا۔

آم : بڑی بھولی ہو تم بھی جامن - انسان کی باتوں کو تم عجیب و غریب کہتی ہو - حالانکہ روز دیکھتی ہو کہ انسان اس کثرت سے عجیب باتیں کرتا ہے کہ اب میرے نزدیک تو اُس کی کوئی بات عجیب نہیں رہی ہے، وہ یقیناً اپنے کو اشرف المخلوقات کہتا ہے مگر میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ عجیب المخلوقات ہے - بہرحال وہ کیا باتیں تھیں۔

جامن : طوطوں کا جوڑا اپنے کسی بچھڑے ہوئے ساتھی کی المناک داستان ایک دوسرے کو سنا رہا تھا - جس کو اس اشرف المخلوقات نے گرفتار کر لیا ہے - طوطا کہہ رہا تھا کہ اس بیچارے کو ایک خوبصورت سے پنجرے میں پر کاٹ کر بند کر دیا ہے - اور اُسی پنجرے میں اس کو کھانے کے لیے چنے کی بھیگی ہوئی دال - کچھ پھل - کچھ ترکاریاں اور جانے کیا کیا دیا جاتا ہے۔

آم : اور وہ انسان یہ سمجھتا ہو گا کہ جس طرح وہ خود پیٹ کا غلام ہے اُسی طرح یہ طوطا بھی - اس پنجرے میں کھانے پینے کی یہ چیزیں پا کر خوش ہو گا۔

جامن : اسی پر تو مجھ کو بھی تعجب ہے کہ اتنی بے ہودہ بات سوچنے والا اپنے کو اشرف المخلوقات کیوں کہتا ہے۔

آم : وہ خود کہتا ہے نا، خود ہی کہتا ہے - اور خود ہی سن کر خوش ہو لیتا ہے اور ہنستا ہے - طوطوں پر کہ یہ اپنے کو میاں مٹھو کہنے کے عادی ہیں - مگر جامن مجھ کو طوطوں کی یہ بات سن کر ذرا بھی تعجب نہیں ہوا - مجھ کو تو انسان سے ہر قسم کی بیہودگی کی امید ہے

(دور سے کچھ لڑکیوں کے ہنسنے کی آواز قریب آتی ہے)

جامن : چپ رہو آم۔ وہ دیکھئے سامنے کچھ لڑکیاں ایک موٹی سی رسی لیے اسی طرف آ رہی ہیں۔

آم : خدا خیر کرے۔ ان کے ارادے مجھے اپنے حق میں کچھ نیک نظر نہیں آتے۔

(لڑکیاں ہنستی ہوئی قریب آتی ہیں)

ایک لڑکی : اری دیکھو تو سہی تارا۔ یہ درخت ٹھیک رہے گا جھولے کے لیے۔

دوسری : بس ٹھیک ہے۔ اسی کی اُس موٹی سی ڈال میں جھولا ڈال دو۔

ایک لڑکی : بھیا کو چڑھاؤ درخت پر، وہی جھولا ڈالیں گے۔

لڑکا : لاؤ رسی ادھر لاؤ، میں ابھی ڈالے دیتا ہوں جھولا۔ تم جب تک پٹڑا اٹھا لاؤ۔

دوسری : ابھی لیجئے، یار چل جلدی سے۔

ایک لڑکی : ٹھہر تو سہی پٹڑا وہ لا رہی ہیں نجمہ اور سلمیٰ۔

لڑکا : (ذرا دُور سے) لو دیکھو ٹھیک ہے نا جھولا۔

ایک لڑکی : بس ٹھیک ہے۔ آؤ نجمہ اس رسی میں ادھر سے تم ڈالو، پٹڑہ اُدھر سے تارا اور سلمیٰ ڈالیں گی۔

دوسری : بس ٹھیک ہے۔ اب آؤ بیٹھو۔ میں اور سلمیٰ پینگ دیں پھر تمھاری باری آئے گی تارا۔

ایک لڑکی : چلو یہی سہی۔ بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی ساز چھیڑ دیں۔

(جھولے کا کورس گانا)

(گانے کے بعد لڑکیاں ہنستی ہوئی فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہیں)

(سناٹا، ہوا کا شور۔ پرندوں کی چہچہاہٹ پر آم کے کراہنے کی آواز.....)

آم : (کراہتا ہے) آہ۔ اُف۔ ہائے۔ آہ۔

جامن : آم کیا بات ہے۔ کیسی طبیعت ہے۔

آم : سخت درد ہے، میری اُس ڈال میں جس پر ابھی جھولے کی مصیبت آئی تھی۔

جامن : مجھے بڑا ترس آ رہا تھا تم پر، جب تمھاری وہ ڈال مسلسل چرچرا رہی تھی۔

آم : میں تو سمجھتا تھا کہ آج میری یہ ہری بھری ڈال ٹوٹ جائے گی۔ اتنا بوجھ۔ ایسے ہچکولے۔ جان نکل کر رہ گئی میری تو۔

جامن : مگر آم تم نے یہ بھی غور کیا کہ یہ گانا تھا اُس انسان کا۔

آم : جی ہاں یہ عقل کی ٹھیکہ دار مخلوق گانا بھی اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے گاتی ہے یعنی گاتی اتنا نہیں ہے جتنا سناتی ہے۔

جامن : ہم تو اپنی موسیقی صرف اپنے لیے سمجھتے ہیں۔

آم : موسیقی ہوتی ہی صرف اپنے لیے ہے کہ اس کو خود محسوس کیا جائے، خود اُس پر وجد کیا جائے، خود اس کا لطف لیا جائے۔ یہ تو غذائے روح ہے۔ اور غذا کے سلسلہ میں میری سمجھ میں تو آتی نہیں، یہ ترکیب کہ کھائے کوئی اور پیٹ کسی کا بھرے۔

جامن : یہی وجہ ہے کہ ان کی موسیقی کچھ سطحی سی کچھ بے جان اور کچھ مصنوعی سی معلوم ہوتی ہے۔

آم : سطحی۔ بے جان اور مصنوعی نہ ہو تو کیا ہو۔ ہم تو موسیقی کو ایک روحانی چیز سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری موسیقی ہمارے اندر ہے اور ہم اس کو کسی قیمت پر باہر نہیں لا سکتے۔

جامن : ہم تو اگر اپنی موسیقی کو باہر لا کر کسی صورت سے ادا کر دیں تو ہماری موسیقی ختم ہو جائے۔

آم : بات یہ ہے کہ ہمارے تو عناصر میں سے ایک عنصر موسیقی بھی ہے۔ اگر وہ انسان کی طرح ہم ایک سے دوسرے تک پہنچانے لگیں تو ہماری زندگی ہی کے لالے پڑ جائیں۔ ہم تو اس کو اپنا ایک ذاتی وجدان سمجھتے ہیں۔ لین دین کی چیز نہیں جانتے۔ مگر انسان میں اتنا ظرف کہاں کہ وہ اپنی موسیقی کو ضبط کرے۔

جامن : مگر مجھ کو تو تعجب ہے کہ تم بھی موسیقی ہی کہہ رہے ہو۔ جو اپنے سے باہر آ جائے وہ موسیقی ہوتی بھی ہے یا نہیں۔

آم : میں اپنے یا تمہارے نقطۂ نظر سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ انسانی غلط فہمی کا اظہار کر رہا ہوں۔ ورنہ کیا میں خود نہیں جانتا کہ وہ موسیقی جو اپنے لب سے ادا کر کے دوسرے تک پہنچائی جائے۔ وہ موسیقی جو دوسرے سے حاصل کر کے اپنے اوپر طاری کی جائے، موسیقی تو خیر کیا ہوتی کوئی کاروباری معاملہ معلوم ہوتی ہے۔

جامن : اور تم نے یہ بھی دیکھا تھا کہ انسان کو اپنی موسیقی کے لیے سازوں کا کس بُری طرح محتاج ہونا پڑتا ہے۔

آم : طرح طرح اپنی مُردہ موسیقی میں جان ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بیچارے کوئی پوچھے ان مسخروں سے کہ گانا بھی کوئی گانے یا سننے سنانے کی چیز ہے۔ اس کو تو بس ہماری طرح محسوس کرنا چاہیئے اور اس کے کیف کو اپنے اوپر طاری کر کے خود سراپا نغمہ بن جانا چاہیئے۔ ہم تو خود ہی اپنا نغمہ ہیں۔ خود ہی اپنا ساز ہیں۔ خود ہی اپنے مغنّی ہیں اور خود ہی اپنے سامع۔

جامن : تو پھر آخر ان کی موسیقی کو تم کیا کہو گے۔

آم : چھچھوراپن اشرف المخلوقات کا۔ اوچھاپن اس کا جو اپنے کو انسان کہتا ہے۔

جامن : دیکھنا سامنے والے بنگلے سے وہ دونوں پھر اسی طرف آ رہے ہیں جو روز آیا کرتے ہیں۔

آم : اور پھر وہی باتیں دہرائیں گے، جو روز دہرایا کرتے ہیں۔ کل میری ڈال پر بیٹھے ہوئے ایک اُلّو کی نیند ان دونوں کی باتوں سے اُچاٹ ہو گئی تھی۔ وہ رات جاگنے کے بعد اپنی مادہ سے ہنس ہنس کر ان دونوں کی بیوقوفی کا ذکر کر رہا تھا۔

جامن : چُپ رہو وہ قریب آ گئے ہیں۔

(ہوا کی سرسراہٹ، پرندوں کی چہچہاہٹ)

خالد : محبت نہ کرتے بڑا کام کرتے۔

طلعت : محبت سے لیکن بڑا کام کیا تھا۔

خالد : مگر طلعت، تم خود ہی انصاف کرو۔ کہ زندگی کو کب تک اس شیریں خواب کے سپرد کر کے ہم یوں ہی لوریاں سناتے رہیں گے۔

طلعت : ابھی سے گھبرا گئے خالد۔

خالد : تم اضطراب کو گھبرا جانا کہتی ہو۔

طلعت : میں نے تو اضطراب کے یہی معنی پڑھے ہیں۔

خالد : میں کتابی دنیا کی باتیں نہیں کر رہا ہوں، محبت کی اصطلاحیں کتابوں میں نہیں ملتیں۔ تم جس کو گھبرا جانا کہتی ہو وہ میرے دل ناصبور کے تقاضے ہیں۔ خود میرے لیے تو صرف اتنا ہی کافی ہے کہ تم مجھ کو اپنی وفا کا یقین دلا چکی ہو۔

طلعت : مگر آپ کے دل ناصبور کو یقین نہیں آتا۔ یہی نا!

خالد : اُس کو بھی یقین ہے۔ مگر صرف یہ یقین ہی تو ہماری آخری منزل نہیں۔

طلعت : وہ آخری منزل کونسی ہے۔ کیا میں معلوم کر سکتی ہوں۔

خالد : جہاں امید و بیم کی پہنچ نہ ہو۔ جہاں شک اور یقین کی کشمکش نہ ہو۔ جہاں مجھ کو تمہارے والد کے انکار اور تمھاری مجبوری کا دھڑکا نہ ہو۔ جہاں مجھے مسعود سے تمھاری منگنی کا دھڑکا نہ ہو۔

طلعت : خالد۔ میں نے تم سے پچاس مرتبہ کہا ہے کہ مسعود کا نام میرے سامنے نہ لیا کرو۔ میں اس کا نام برداشت نہیں کر سکتی۔

خالد : تم سے زیادہ یہ نام میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ مگر میں کیا کروں کہ اس کے امکان روز بروز قوی سے قوی تر ہوتے جا رہے ہیں۔

طلعت : مگر آخر میں اُسے ناکام ہونا پڑے گا۔ اس لیے کہ مجھے تم سے۔

خالد : ہاں ہاں مجھ سے کیا؟ کہہ دو طلعت۔ خدا کے لیے اپنی زبان کو آزاد چھوڑ دو۔ طلعت میں وہی بات سننا چاہتا ہوں۔ جو تم سنانے سے کترا رہی ہو۔ جو تم نہیں کہنا چاہتیں۔ میں وہی سننا چاہتا ہوں۔

طلعت : تم خود جانتے ہو تو پھر پوچھتے کیوں ہو۔

خالد : جانتے ہوئے بھی جاننا چاہتا ہوں۔ اپنی روح میں بالیدگی پیدا کرنے کے لیے۔ امیدوں پر سے یاس کا زنگ اُتارنے کے لیے دل کی مردہ اُمنگوں کو آبِ حیات پلانے کے لیے میں تم سے وہی سننا چاہتا ہوں۔ جو تم سُنانے سے پرہیز کر رہی ہو۔ کہہ دو اچھی طلعت

طلعت : ہزار مرتبہ تو کہہ چکی ہوں۔

خالد : اس بات کو حدودِ شمار کا پابند نہ بناؤ۔ پھر کہہ دو۔ اچھی طلعت تمھیں مجھ سے کیا ہے؟

طلعت : میں کہہ تو چکی ہوں کہ مجھے تم سے۔ تم سے مجھے، میں تم سے محبت کرتی ہوں۔

خالد : طلعت یقین دلاؤ کہ میں جاگ رہا ہوں۔ قسم کھاؤ کہ یہ خواب نہیں ہے۔

طلعت : پاگل ہوئے جا رہے ہو تم تو۔

خالد : ہاں اس لیے کہ اسی کو محبت کا ہوش کہتے ہیں۔ طلعت ابھی تم نے کہا تھا۔

طلعت : کہا تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ مجھے تم سے کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی۔ اچھا اب اجازت دو، مجھے بس اتنی ہی مہلت تھی

خالد : نہیں ابھی نہیں۔ اتنی جلدی نہیں۔ ان چند منٹ کے انتظار میں مَیں نے پہاڑ سی رات اور سست رفتار دوج والا دن کاٹا ہے۔

طلعت : پھر وہی۔ تم چاہتے ہو کہ یہ مہلت بھی نہ ملے۔

خالد : اچھا تو کل۔

طلعت : (جاتے ہوئے) اسی وقت، وہی جگہ۔

(ہوا کا شور۔ پرندوں کی چہچہاہٹ)

آم : (قہقہہ لگا کر) عجیب المخلوقات اور اپنے کو کہتا ہے اشرف المخلوقات۔

جامن : مگر آم میں تو کچھ بھی نہیں یہ ساری بکواس تھی، کیا، یہ دونوں آخر باتیں کیا کر رہے تھے۔

آم : یہ باتیں ہمارے تمہارے سمجھنے کی نہیں ہوتیں جامن، یہ لوگ آپس میں محبت کر رہے تھے۔

جامن : محبت کر رہے تھے؟ یہ کیا یہاں محبت بھی ہوتی نہیں بلکہ کی جاتی ہے۔ ہم کو تو یہ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کوئی یہ کہے کہ نزلہ کر رہا ہوں، بخار کر رہا ہوں، کھانسی کر رہا ہوں۔

جامن : واقعی عجیب بات ہے تو کیا ان بیچاروں کو محبت کا بھی اظہار کرنا پڑتا ہے۔

آم : میرے اس گھنیرے سائے میں یہی دو نہیں بلکہ اکثر محبت کرنے والے جوڑے آیا کرتے ہیں۔ اور میں نے آج تک کسی کو بھی نہیں دیکھا۔ جس نے بغیر محبت کا اظہار کئے بغیر محبت کا اظہار کیا ہو۔ ایک مرتبہ تو مجھ کو بڑی ہنسی آئی۔ جب ایک عاشق ناشاد اپنی محبوبہ سے کہہ رہے تھے کہ ؎

محبت معنی و الفاظ میں لائی نہیں جاتی
یہ وہ نازک حقیقت ہے جو سمجھائی نہیں جاتی

جامن : (بے ساختہ ہنس کر) اچھا۔ تو گویا یوں سمجھا رہے تھے۔

آم : بات یہ ہے کہ ٹھوس حقیقتیں اس بے چاری مخلوق تک رفتہ رفتہ پہنچ تو رہی ہیں۔ مگر ابھی ان حقیقتوں کے رمز کو پانا اُس کے امکان میں نہیں ہے۔ وہ ان لطیف باتوں کو اپنے کرخت ماحول میں لا کر عجیب مضحکہ خیز بنا دیتا ہے۔

جامن : مجھے تو بڑی ہنسی آ رہی تھی۔ آم جب وہ شخص اپنی محبوبہ سے بار بار کہہ رہا تھا کہ تم اپنی زبان سے کہہ دو کہ تم کو مجھ سے محبت ہے۔ کیا اُس کی آنکھ میں اتنا نور بھی نہ تھا کہ وہ اپنی محبوبہ کی آنکھ میں اپنے لیے محبت دیکھ لیتا؟

آم : تم نہیں جانتیں جامن جو محبت پیدا نہ ہو بلکہ کی جائے وہ اسی قسم کی باتیں چاہتی ہے۔ اس مصنوعی محبت کے لیے صرف ایک دل کافی نہیں ہوتا۔ آنکھ بھی کچھ دیکھنا چاہتی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ محبت نہ ہوتی ہے۔ نہ در اصل بقول انسان کے کی جاتی ہے بلکہ سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ جتائی جائے۔

جامن : خیر یہ تو میں سمجھ گئی۔ مگر فرض کر لو کہ محبت ہوئی نہیں تھی۔ بلکہ کی ہی گئی تھی، تو بھی محبت کے بعد اس شخص کو آخر اتنے اندیشے اور اتنے خطرے کس بات کے تھے۔

آم : بڑی بھولی ہو تم جامن۔ نقل اصل تو نہیں ہو سکتی، نقل کو لاکھ اصل کے مطابق بنایا جائے۔ مگر اس کی طرف سے ہمیشہ یہ ڈر ہوتا ہے کہ ملمع اُتر نہ جائے، اصلیت بے نقاب نہ ہو جائے۔ اس قسم کی سطحی محبت کرنے والا ظاہر ہے کہ وہ خود اعتماد نہیں ہو سکتا۔

جامن : یہ تو ٹھیک ہے آم۔ مگر مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے اس کو محبت کے بعد کچھ اس قسم کا انتظار ہو جیسے امتحان دینے کے بعد

طالب علموں کو کامیابی اور ناکامی کا انتظار ہوتا ہے۔

آم : ٹھیک ہے بالکل اسی طرح انسان محبت میں بھی سود و زیاں دیکھتا ہے۔ ہماری تمہاری طرح انسان کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ محبت پیدا ہو گئی، تو اس کے کیف کو اس کا حاصل سمجھ کر اُسی میں گم ہو گئے۔ انسان تو یہ چاہتا ہے کہ جس سے وہ محبت کرتا ہے، وہ بھی اس سے محبت کرے۔

جامن : ٹھیک ہے یہ سب فتور اصل میں محبت کرنے کا ہے۔ اگر محبت خود بخود ہو جایا کرتی ہم لوگوں کی طرح تو انسان کو بھی دوسری طرف سے اُس کے جواب کا انتظار نہ ہوتا۔

آم : جواب کی بات نہیں جامن۔ انسان تو محبت باہر سے اپنے لیے حاصل کرتا ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ طوفان خود اُس کے اندر سے اُمنڈے۔ اس کے یہاں دو نگاہوں کے تصادم اور دو دلوں کے ٹکراؤ سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ گویا یہ بھی تالی ہے۔ جو ایک ہاتھ سے بج نہ سکے

جامن : واقعی عجیب المخلوقات ہے انسان بھی۔ ہمارے یہاں تو محبت کی خبر کبھی کسی کو نہیں ہوتی ہم تو اس نعمت کے سلسلے میں اتنے خود غرض ہیں کہ اس میں اپنا شریک کبھی کسی کو بنا ہی نہیں سکتے اور یہ دلِ ناصبور کیا چیز ہوتی ہے آم۔

آم : (قہقہہ لگا کر) اچھا تم یہ بھی نہیں سمجھیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں جس وقت جذبۂ محبت پیدا ہو جاتا ہے، پھر ہم کو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ ہمارا دل مستغنی ہو جاتا ہے۔ گویا اس کو سب کچھ مل گیا۔ اس کے برعکس انسان نے جہاں محبت پالی، اس کا دل اچھا خاصہ دلِ ناصبور بنا۔ پھر اس کو نہ دن چین رہتا ہے، نہ رات آرام۔

جامن : ہائے ہائے۔ ارے آم۔ کہیں یہ کم بخت کسی عارضہ کو تو اپنی زبان میں محبت نہیں کہتے۔

آم : نہیں نہیں کہتے۔ تو یہ بھی محبت ہی کو محبت ہیں، مگر محبت کی روح سے بے خبر ہیں۔ ان کے یہاں تو محبت کو غم محبت تک کہا جاتا ہے۔

جامن : کیا کہا غم محبت۔ لو اور سنو۔ نشاطِ محبت شروع ہوئی۔ اور ان کی حالت غیر ہو گئی۔ سرد آہیں، گرم آنسو۔ بیماروں کی سی صورت۔ وحشیوں کی سی وضع قطع۔ وہ جو اُس روز ایک شخص میرے گھنیرے سائے میں بیٹھا اپنے لمبے لمبے اُلجھے ہوئے بالوں سے کھیل رہا تھا۔ کبھی ہنستا تھا کبھی روتا تھا، کبھی شاعری کرتا تھا۔ وہ بھی کوئی پاگل نہیں اہلِ محبت تھا۔

جامن : محبت کی طرح شاعری بھی انسان کے یہاں کی جاتی ہے۔

آم : جی ہاں جو ادا ہو جائے۔ یہ عقلمند اس کو شعر کہتا ہے۔

جامن : حالانکہ جو ادا نہ ہو سکے وہ شعر ہے۔ ارے دیکھنا آم یہ دو آدمی کون آرہے ہیں ادھر۔ میرے خیال میں تو ڈاکو ہیں۔

آم : ہاں ایک قسم کے ڈاکو ہی ہیں۔ وہ خوفناک سا شخص اس باغ کا ٹھیکہ دار ہے اور دوسرا شاید کوئی نیا گاہک پھانسا ہے۔

جامن : چُپ رہو وہ قریب آگئے ہیں۔

(ہوا کا شور۔ پرندوں کی چہچہاہٹ)

ٹھیکیدار : یہ دیکھئے شیخ جی۔ ایک اسی درخت کو دیکھ لیجئے۔ لدا ہوا ہے۔ اور قوم بھی جو کچھ ہے اس آم کی وہ ظاہر ہی ہے۔ مگر میں ایک درخت کا سودا نہیں کروں گا۔ باغ کا باغ لینا پڑے گا۔

گاہک: نابابا مجھے تو بس لنگڑے کے پیڑ چاہئے ہیں۔ سہارنی اور تخمی وخمی کا جھنجھٹ میں نہیں پالتا۔

ٹھیکیدار: لنگڑے کے بارہ پیڑ ہیں چلو ان ہی کا سودا کر لو۔ اتنا میں بتائے دیتا ہوں کہ سونا خرید رہے ہو شیخ جی۔

گاہک: مگر دام سونے کے نہ مانگ بیٹھنا ٹھیکیدار۔

ٹھیکیدار: داموں کا کیا ہے۔ وہ تو طے ہو ہی جائیں گے' درخت پسند آگئے سودا ہو گیا۔

گاہک: تم اپنے درختوں کو دیکھ رہے ہو مگر مجھے اپنی جیب بھی تو دیکھنا ہے۔

ٹھیکیدار: اچھا تو آؤ داموں کی بھی بات ہو جائے۔

(دونوں جاتے ہیں)

(ہوا کا شور۔ پرندوں کی چہچہاہٹ)

آم: (ایک ٹھنڈی سانس لیتا ہے) ؎ حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔

جامن: کیا ہوا آم۔ تم تو ایک دم کچھ مرجھا کر رہ گئے۔

آم: منصوبے نہیں سُنے تم نے ان لوگوں کے۔

جامن: تمہارا سودا ہو رہا تھا کچھ۔

آم: ہاں میرے ننھے ننھے جگر کے ٹکڑوں کو۔ میری آنکھوں کے تاروں کو مجھ سے جُدا کرنے کا سودا ہو رہا تھا۔ اب یہ ظالم میرے نونہالوں کو مجھ سے چھین لے جائیں گے۔ کس ارمان سے میں پھول کھلاتا ہوں۔ اللہ آئین سے ان پھولوں کو پھل بناتا ہوں۔ اور ہر سال یہی ہوتا ہے کہ یہ پھل مجھ سے چھن جاتے ہیں' یہ اشرف المخلوقات مجھ سے چھین لے جاتا ہے۔

جامن: میری گود بھی ہمیشہ اسی طرح خالی ہوتی ہے۔

آم: اپنے کو اشرف المخلوقات کہنے والا یہ انسان ہماری یہ بہاریں ہم سے چھین کر اپنی خزاں ہم کو دے دیا کرتا ہے۔ یہ کس قدر محتاج ہے ہمارا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے اور بڑے سے بڑے کاروبار۔ اس کی ادنیٰ اور اعلیٰ ضرورتیں ہم ہی سب سے وابستہ ہیں اور یہ خود ہمارے کسی کام کا نہیں۔ اب یہ درندہ ہمارے ننھے ننھے بچوں کو ہم سے چھین لے جائے گا۔ ان کا خون چوس لے گا۔ ان کو بھنبھوڑ کھائے گا (رو دیتا ہے)

جامن: صبر سے کام لو آم۔ یہ آنسو تمہارے وقار پر بہتان معلوم ہوتے ہیں۔

آم: یہ آنسو میں نے انسان کے لیے تھوڑی بہائے ہیں۔ جو بہتان نظر آئیں۔ یہ تو میں اپنے اُوپر بہا رہا ہوں۔

جامن: رات میں نے انسان پر بھی آنسو بہائے تھے آم۔

آم: تم نے۔ وہ کیوں؟

جامن: رات میرے نیچے دو(۲) چور اپنا چوری کا مال آپس میں بانٹ رہے تھے۔ اور پھر ان میں ایسی لڑائی ہوئی کہ ایک نے دوسرے کے پیٹ میں چھُرا گھونپ دیا۔

آم: یعنی مار ڈالا۔ بالکل۔

جامن : مقتول فوراً مر گیا اور قاتل مال لے کر بھاگ گیا۔ میں پھر دیر تک سو نہ سکی۔ میں نے سوچا کہ خدا نے یہ بھی کیا مخلوق بنائی ہے کہ سونا اور چاندی ایسی حقیر دھاتوں کے لیے جن کا خالق وہ خود ہے۔ یہ انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔

آم : سونے اور چاندی۔ ارے یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ سونا اور چاندی تو انسان کے لیے سب ہی کچھ ہے۔ وہ اپنی بڑائی اور چھوٹائی اسی معیار پر جانچتا ہے۔ جس کے پاس یہ زیادہ ہے وہ بڑا ہے، اور جس کے پاس کم وہ چھوٹا ہے۔

جامن : خواہ وہ زیادہ طاقتور ہو۔

آم : طاقتور کمزور سمجھا جائے گا۔ بغیر سیم و زر کے اور کمزور طاقتور گنا جائیگا اگر اس کے پاس سونا چاندی ہے۔

جامن : خواہ وہ حسین ہو۔ عقلمند ہو۔ ہوش گوش کا آدمی ہو۔

آم : عقلمند اور ہوش گوش کا تو خیر اس مخلوق سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ مگر کوئی بھی وصف بغیر دولت کے بیکار ہے۔

جامن : دولت؟ وہ کیا چیز ہے؟

آم : یہی سونا چاندی وغیرہ۔ اسی سے وہ اپنی شان بڑھاتا ہے۔ اسی سے زیب و زینت کو فروغ دیتا ہے۔

جامن : تو یہ شان اور یہ زیب و زینت اس کی کب ہوئی یہ تو سونا چاندی کی ہوئی۔

آم : یہی باتیں تو یہ جانور سمجھتا نہیں۔ جس کو ہم انسان کہتے ہیں اور جو اپنے کو اشرف المخلوقات کہتا ہے، اگر اسی حقیقت کو یہ نامرد پا جائے۔ تو اور چاہئے ہی کیا مگر اسی سے وہ کوسوں دور ہے، اس کی آنکھ باہر بنائی گئی ہے۔ جو اپنے اندر نہ اپنا حسن دیکھ سکتی ہے، نہ اپنی بدصورتی، وہ دوسروں کا حسن دیکھتی ہے۔ دوسروں کے عیب اس کو نظر آتے ہیں۔ وہ تحقیق اور تجسس میں بہت دور نکل گیا ہے سوائے اپنی تحقیق اور تجسس کے۔ سن رہی ہو جامن۔ جامن...... ارے سو گئیں تم تو۔ واقعی رات بھی زیادہ آگئی ہے۔ پرندے بھی بسیرا لے رہے ہیں۔ الو کی بیداری کا وقت آگیا ہے۔

اچھا شب بخیر!

نقش و نگار

(رحیم سو رہا ہے۔ اس کے خراٹوں کی آواز پر عورت کی آواز غالب آتی ہے)

بیوی:۔ اللہ کی مار اس موئی نیند سے۔ بھلا غضب خدا کا، دھوپ سر پر آئی اور یہ ہیں کہ پڑے اینڈ رہے ہیں۔ یہی نحوست تو گھر میں جھاڑو پھیرے ہوئے ہے (جگاتے ہوئے) میں نے کہا سن رہے ہو۔ خدا کے لئے اب اٹھ چکو۔ دوپہرا ہونے کو آئی سلیم کے ابا۔۔۔ میں نے کہا سلیم کے ابا۔

رحیم:۔ (کروٹ بدل کر) کیا شور مچا رکھا ہے۔ دو گھڑی سونا بھی دوبھر کر دیا ہے۔

بیوی:۔ ذرا آنکھ تو کھولو۔ سورج کہاں کا کہاں پہنچا۔ دھوپ میں ڈوبے پڑے ہو۔

رحیم:۔ بھئی لاحول ولا قوۃ۔ کم سے کم یہی سوچ لیا ہوتا کہ یہ کم بخت سویا کس وقت تھا۔ ایک بجے شو ختم ہوا۔ دو بجے تک حساب کتاب کیا۔ تین بجے گھر پہنچا۔ آخر انسان ہوں۔ کوئی بھوت تو نہیں ہوں۔

بیوی:۔ وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر میں بھی آخر کیا کروں، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہوں۔ کہ یہ اٹھیں تو خرچ دیں۔ سودا سلف منگاؤں۔ پھر چولہا ہانڈی کروں۔ وقت پر کھانا نہ دوں گی تو بھی قیامت برپا ہو گی۔ مجھے خرچ دے دو۔ پھر چاہے دن بھر پڑے اینٹھتے رہنا

رحیم:۔ دن بھر پڑے اینڈتے رہنا گویا مجھے کوئی کام ہی نہیں ہے۔ ابھی جانا ہے ریہرسل کرانے آج کے شو کا۔

بیوی:۔ اسی لئے تو کہہ رہی ہوں۔ کہ خرچ دے دو۔ تاکہ وقت پر کھانا تو مل جائے۔

رحیم:۔ اب مجھے چل کر کہیں نیلام کر دو۔ تو شاید خرچ مل جائے۔ میرے پاس تو پھوٹی کوڑی نہیں۔

بیوی:۔ لو اور سنو! ان کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں، اور گھر میں جیسے قارون کا خزانہ گڑا ہوا ہے۔ میں کہتی ہوں آخر کل کچھ آمدنی ہوئی تھی یا نہیں؟

رحیم:۔ خاک آمدنی ہوئی تھی۔ کل چودہ روپے کے ٹکٹ بکے باقی سارا منڈوا فری پاس والوں سے بھرا ہوا تھا۔ کل کا حساب ابھی اپنے سر قرض ہے۔ جو آج کی آمدنی سے ادا ہو گا۔

بیوی:۔ میں تو پہلے جانتی تھی۔ کہ اس موئی گانے بجانے، ناچنے تھرکنے کی کمائی میں برکت نہیں ہے۔ زندگی بھر یہی بھاڑ جھونکا

اور رہے بھڑ بھونجے کے بھڑ بھونجے۔

رحیم:- یہ تم کہہ رہی ہو بھول گئیں، وہ دن جب ماسٹر رحیم ماسٹر رحیم کے ڈنکے پٹتے ہوئے تھے۔ آج بھی تمہارے پاس وہ سارے تمغے موجود ہوں گے۔ جن سے یہ چٹان کا چٹان سینہ ڈھک جاتا تھا۔

بیوی:- ہاں ہاں پڑے ہوئے ہیں وہ موئے کھوٹی چاندی، گلٹ اور پیتل کے تمغے کیا کروں۔ ان کو اوڑھوں، بچھاؤں، چاٹوں، چباؤں، آخر ہیں وہ کس مصرف کے، کس مرض کی دوا ہیں موئے ٹھیکرے؟

رحیم:- میری عزت کے نشان ہیں وہ۔ میری مقبولیت کی سند ہیں وہ۔ اب میں کیا کروں۔ کہ ناٹک کو نہ جانے کس کی نظر کھا گئی۔ ورنہ آج ہُن برس رہا ہوتا۔

بیوی:- ہاں اور کیا۔ جب بڑا دور دورہ تھا ناٹک کا، ہُن تو اس وقت بھی برستے نہ دیکھا۔ چوہے ہیں چوہے۔ جب ڈنڈ پیلتے تھے اور آج بھی پیل رہے ہیں۔ جو رہے سہے دو چار تار تھے ہاتھ کان میں وہ بھی لے جا کر اس موئے منڈوے پر لگا آئے۔ جس میں چودہ روپے کے ٹکٹ بکتے ہیں۔

رحیم:- اس کی تو خیر وجہ یہ ہے۔ کہ ابھی لوگوں کو معلوم ہی نہیں کہ اس منڈوے میں ہوتا کیا ہے۔ ذرا چرچا ہونے دو۔ پھر دیکھنا کہ خلقت کیسی ٹوٹتی ہے۔ اور روپیہ کیسا برستا ہے۔

بیوی:- بادل کو دیکھ کر گھڑے توڑتے تم کو دیکھا ہے کہ روپیہ برسنے کی امید پر میرے جہیز تک کا زیور ٹھکانے لگا آئے۔

رحیم:- جہیز کا طعنہ مجھ کو تو دے رہی ہو۔ مگر میں نہیں چاہتا کہ میری زبان کھلواؤ۔ جو کچھ تم جہیز میں لائی تھیں۔ وہ میں ابھی بھولا نہیں ہوں۔ وہی مثل کہ نام بڑے اور درشن چھوٹے مشہور تو تھے۔ بڑے ٹھیکیدار صاحب اور بیٹی کو رخصت کیا اس طرح کہ کیا کوئی خانساماں رخصت کرے گا۔ کن تیلیوں کی بیٹیاں بھی یوں رخصت نہ ہوتی ہوں گی۔

بیوی:- خیر میرے باپ بھائی تو خانساماں، کن میلیے تھے، مگر جناب کے درِ دولت پر کون سے ہاتھی جھوم رہے تھے۔ تو یہ ہے میرے اللہ بخشے ابا میاں کو خبر بھی ہو جاتی کانوں کان کہ جس لڑکے کو وہ ناٹک کا منیجر سمجھ رہے ہیں وہ تھیٹر کا مسخرا ہے۔ تو ادھر کی دنیا اُدھر ہو جاتی کبھی جو وہ منظور کرتے یہ رشتہ۔

رحیم:- بکواس بند کرو۔ ورنہ ساری قلعی کھول کر رکھ دوں گا۔ سوائے اس کے وہ جو سائیکلوں میں پنکچر جوڑا کرتا تھا، تمہاری نسبت ہی اور کونسی آئی تھی۔ انھوں نے تو شکر کیا ہو گا کہ ایک معزز گھرانے سے نسبت آئی تو سہی۔

بیوی:- ہائے رے معزز گھرانے۔ دیکھا ہے میں نے وہ معزز گھرانا۔ ایک بھائی جادو کے کرتب دکھاتے پھرتے ہیں۔ گولی منہ سے کھائی۔ کان سے نکالی۔ دوسرے بھیا! اللہ میری توبہ ہے، در در گھر گھر کٹ پتلیوں کا تماشہ دکھاتے پھرتے ہیں۔ یہی کام تو ہوتا ہے معزز گھرانوں کا۔

رحیم:- خیر وہ جادو کے کرتب دکھائیں یا کٹ پتلیوں کا تماشہ تمہارے یہاں کی طرح چوری تو نہیں کرتے۔ ڈاکے تو نہیں ڈالتے۔ غبن تو نہیں کرتے۔ تمہارے بھائی قبلہ کی طرح۔

بیوی:- تو کس نے کہا تھا۔ کہ چوروں اور ڈاکوؤں کے یہاں نسبت کے لئے دوڑو، دوڑ کر جوتیاں توڑو،

رحیم:۔ تو یہاں بھی کس نے ہاتھ جوڑے تھے۔ تمہارے باوا جان کے کہ اللہ مجھ تھیٹر کے مسخرے کو غلامی میں قبول کر لیجئے۔

بیوی:۔ خود ہی یاد کرو۔ کس نے ہاتھ جوڑے تھے۔ دہلیز تک گھس گئی تھی۔ میرے دروازے کی تمہارے سو سو پھیروں سے۔ اور وعدے تو بہت تھے۔ کہ یہ کروں گا۔ اور وہ کروں گا۔ سونے سے گوندنی کی طرح لاد دوں گا۔ ریشم کا کیڑا بنا دوں گا۔ یہاں موئی دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ رہا سہا میرا جہیز تک بیچ کر چاٹ گئے۔

رحیم:۔ (کڑک کر) پھر وہی جہیز۔ جہیز وہ کیا دیتے تمہارے فقیرے ماں باپ۔

بیوی:۔ دیکھو میں نے کہہ دیا ہے۔ زبان سنبھال کر بولو۔ میرے باپ کو کچھ کہا تو اچھا نہ ہو گا۔

رحیم:۔ (اور زیادہ کڑک کر) کیا اچھا نہ ہو گا۔ کیا کر لو گی تم۔ کیا ارادہ ہے تمہارا۔ مجھ کو بھی کوئی ایسا ویسا نہ سمجھ لینا۔

بیوی:۔ تو مجھے بھی بے وارثہ نہ سمجھنا۔ اللہ رکھے میرے بھائی کو اس کا گھر موجود ہے میرے لئے۔ دو وقت کی روٹی کے لئے میں اُسی پر بھاری نہ ہوں گی۔ تن کے تین کپڑے وہ مجھے دے سکتا ہے۔

رحیم:۔ تو بلا لو نا۔ اپنے اس حمایتی کو۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ وہ آتا کس طرح سے ہے اس گھر میں۔

بیوی:۔ تو تم کیا کر لو گے اس کا؟

رحیم:۔ (بڑی اونچی آواز سے) کون میں۔ باوا جان کی روح پاک کی قسم ٹانگیں نہ توڑ دی ہوں تو نام بدل دینا۔

بیوی:۔ (اونچی آواز سے مٹکاتے ہوئے) اللہ کی شان یہ توڑیں گے اُن کی ٹانگیں، ایک ہاتھ ماریں تو مُنہ کے پانی بھی نہ مانگو۔

رحیم:۔ میں کہتا ہوں۔ زبان قابو میں رکھو۔ ورنہ گدی سے کھینچ لوں گا۔ یہ قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان۔

بیوی:۔ بس بس بہت ہو لیا۔ خانہ آباد و دولت زیادہ، میں بھی عبدالغفور خاں کی بیٹی ہوں۔ تو جیتے جی اس دروازے پر تھوکنے بھی نہ آؤں گی۔

رحیم:۔ (ڈانٹ کر) خبردار جو قدم نکالا اس گھر کے باہر۔

بیوی:۔ تم مجھ کو نہیں روک سکتے۔

رحیم:۔ تم نہیں جا سکتیں۔

بیوی:۔ میں جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی ہمت ہے تو روک لو۔

رحیم:۔ (دھکا دے کر) بیٹھ ادھر۔ لاتوں کا بھوت باتوں سے نہیں مانتا۔

(بیوی بلند آواز میں رونا شروع کرتی ہے، ہائے مجھے مار ڈالا)

(دروازے پر کئی دستکیں)

ایک اہلِ محلہ:۔ ماسٹر رحیم۔

دوسرا:۔ رحیم خان صاحب

پہلا:۔ ماسٹر رحیم دروازہ کھولو

دوسرا:۔ خان صاحب باہر تو آؤ خان صاحب

} بیوی کے رونے کی آواز مسلسل آ رہی ہے۔

رحیم :- (دروازہ کھول کر) فرمایئے کیا بات ہے۔

ایک اہل محلہ :- یہ کیا آفت مچا رکھی ہے ماسٹر تم نے۔ آخر بات کیا ہے؟

رحیم :- آفت ابھی کہاں مچائی ہے۔ آفت تو اب مچاؤں گا۔ میں اس کی جان لے کر چھوڑوں گا۔ اس نے آخر اپنے کو سمجھ کیا رکھا ہے۔

دوسرا :- بڑی بات ہے خان صاحب۔ عورت پر ہاتھ اٹھانا بھی کوئی شرافت ہے۔

پہلا :- مگر سوال یہ ہے کہ آخر ہوا کیا۔ سارا محلہ اپنے دروازے پر جمع کر لیا تم نے۔

رحیم :- ابھی تو یہ تماشہ ساری خلقت دیکھے گی۔ جب میں اسے ختم کر کے پھانسی چڑھنے جاؤں گا۔

پہلا :- مگر کچھ معلوم تو ہو کہ بات کیا ہے۔

رحیم :- دیکھیئے صاحب میری سنی نہ کہیئے گا۔ خدا لگتی کہیئے گا۔ آپ سب کو معلوم ہے کہ میں اپنے زمانے کا کتنا بڑا ایکٹر رہ چکا ہوں ناٹک کا۔ کمپنی والے آگے پیچھے پھرتے تھے۔ ہاتھ جوڑتے ہوئے، مگر اب اس مقدر کو کیا کروں۔ کہ ناٹک کا زمانہ ہی نہیں رہا۔ نہ وہ قدر رہی نہ وہ روزی۔ جب فاقوں پر نوبت آگئی۔ تو اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مار کر خود اپنا چھوٹا سا منڈوا بنایا۔ پرانے ساتھیوں کو جمع کیا۔ ٹوٹا پھوٹا سامان اکٹھا کیا۔ کہ بھئی چار پیسے کی صورت دکھائی دے۔

دوسرا :- یہ تو ماسٹر ہم خود دیکھ رہے ہیں۔ کہ بڑی محنت کر رہے ہو تم۔

رحیم :- ایسی ویسی محنت۔ اللہ جانتا ہے۔ رات کو رات اور دن کو دن نہیں سمجھا میں نے۔ اپنے کو مٹا لیا میں نے۔ یہ منڈوا بنانے کے لیئے اور آپ لوگوں کو میری قسم ذرا میرے ساتھ چل کر دیکھئے کہ میں نے تیاری کیسی کی ہے۔ بس اب مجھ سے کچھ نہ پوچھیئے۔ خود ہی چل کر دیکھ لیجئے۔ یہ سامنے ہی تو ہے کونسا دُور ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ ذرا سی دیر کے لیئے چلے چلیئے۔

پہلا :- خان صاحب ہم کو آپ کی بات کا یقین ہے۔ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں ٹھیک ہی ہوگا۔

رحیم :- یہ بات نہیں۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیئے ذرا چل کر دیکھ لیجئے۔ آیئے مرزا جی، آیئے نا آپ سب آیئے۔

دوسرا :- چلو بھئی چلو۔ ان کی خوشی ہو جائے۔

(سب چلتے ہیں)

رحیم :- تشریف لایئے۔ مرزا جی سچ کہتا ہوں غلامی قبول کروں گا۔ اگر اتنی جلدی ایسی تیاری کوئی مائی کا لال کر دکھائے ذرا ایک منٹ۔ تالا لگا دوں نکل نہ جائے کم بخت۔

(فیڈ آؤٹ ہوتا ہے اور طبلے گھنگھروؤں کی آواز میدان ہوتی ہے۔

رحیم :- (قریب آکر) بند کر دو باجہ۔ تشریف رکھیئے آپ لوگ۔ ماسٹر خراتی ذرا جلدی کرو۔ اور وہ سین دکھاؤ آپ لوگوں کو جب شہزادی گلنار باغ میں سپاہی زادے سے ملتی ہے۔ اور دونوں میں محبت کا عہد و پیمان ہوتا ہے۔ جلدی کرو۔ (اپنے اہلِ محلہ سے) آجکے تماشے میں یہ محبت کا سین ایک ٹکڑا ہے۔ ہمارے آج کے کھیل کا۔ مگر اسی سے آپ کو

اندازہ ہو جائے گا۔ کہ اس چھوٹے سے منڈوے میں ہم اپنی بساط سے بڑھ کر کتنی بڑی چیز پیش کر رہے ہیں۔

(آواز دے کر) چلو انتر ہو شہزادی۔

(تالی بجاتا ہے)

گلنار:۔ شہباز!

شہباز:۔ شہزادیٔ عالم۔

گلنار:۔ پھر تم نے مجھے درباری زبان میں مخاطب کیا۔ آخر تم مجھے گلنار کیوں نہیں کہتے۔

شہباز:۔ ایاز اپنی جگہ پہچانتا ہے۔ شہزادیٔ عالم۔

گلنار:۔ کیا تم کو اب تک یقین ہے کہ گلنار تمہارے سامنے شہزادی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک کنیز کی حیثیت سے آئی ہے۔

شہباز:۔ افق پر زمین اور آسمان ملے ہوئے نظر ضرور آتے ہیں۔ مگر کون نہیں جانتا۔ کہ یہ نگاہوں کا دھوکہ ہے۔

گلنار:۔ تم میری محبت کو دھوکہ کہہ رہے ہو۔

شہباز:۔ یہ میری جرأت نہیں شہزادیٔ عالم۔ مگر میں اپنی حقیقت سے بھی ناواقف نہیں ہوں۔

گلنار:۔ تمہاری حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ کہ میں تم کو پوجتی ہوں، تمہارے لئے سب کچھ قربان کر سکتی ہوں۔ اپنا شاہانہ اقتدار اپنے محل کے ناز و نعم، تخت و تاج کے تمام حقوق تم ایک مرتبہ مجھ کو اپنا کہہ کر تو دیکھو۔

شہباز:۔ مگر میں حقِ نمک کیسے قربان کر دوں شہزادیٔ عالم۔

گلنار:۔ کیا تم کو مجھ سے محبت نہیں۔

شہباز:۔ اگر میں انکار کر دوں تو یہ جھوٹ ہو گا۔ مگر غریب کی بیشمار تمناؤں کی طرح محبت بھی اس لئے ہوتی ہے۔ کہ اس کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ میں اپنی محبت کو اپنے دل میں دفن کر سکتا ہوں۔ مگر مجھ سے یہ ناممکن ہے کہ سلطانِ عالم کو مجھ پر جو اعتماد ہے۔ اس کا خون اپنے ہاتھوں سے کر دوں، میں غریب سپاہی زادہ ہوں۔ مگر میری رگوں میں شرافت کا خون بھی ہے۔ یہ خون اس وقت جم جائے گا۔ جب ناموسِ شاہی پر ہاتھ ڈالنے کا ناپاک خیال بھی میرے ذہن میں آیا۔

گلنار:۔ اور اگر خود بادشاہ بابا میرا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دے دیں۔

شہباز:۔ تو میں سمجھوں گا۔ کہ نگاہِ خسروی نے ایک ذرّے کو آفتاب بنا دیا۔

گلنار:۔ اچھا تو تم اپنی شرافت کی قسم کھاؤ اور میں اپنی محبت کی قسم کھاتی ہوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے سوا کسی کے نہ ہوں گے۔

شہباز:۔ آپ قسم کھائیے میں تو یہ قسم اسی دن کھا چکا ہوں، جب آپ کے لبوں پر آنے سے بہت پہلے یہ پیام آپ کی نگاہوں میں تھا۔

ایک اہلِ محلہ:۔ سبحان اللہ۔ کیا کہنا ہے ماسٹر صاحب۔

دوسرا :- محبت کا سین ہے۔ مگر کس قدر پاکیزہ ہے۔ اور کیا کیریکٹر پیش کیا ہے۔ سپاہی زادے کا واہ۔ واہ، واہ۔

رحیم :- صاحب یہ تو ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ ایک چھوٹا سا ٹکڑا اور ملاحظہ فرمائیے۔ (آواز دے کر) ماسٹر خیراتی اب ذرا وہ سین پیش کرو۔ جب شہباز کے قتل کے بعد شہنشاہ محل سرا میں ملکہ کے پاس آتا ہے، (اہل محفل سے) ذرا اس سین میں شہنشاہ کی ایکٹنگ دیکھئے اور یہ اندازہ کیجئے کہ یہ چند دن کی محنت کا نتیجہ ہے (آواز دے کر) ملکہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئیں؛ چلو! انٹر ہو شہنشاہ تالی بجاتا ہے۔

ملکہ :- جہاں پناہ۔

شہنشاہ :- ہٹ جاؤ۔ مجھ سے دور رہو۔ میں خونی ہوں۔ (جلدی سے) (اونچی آواز میں) میرے یہ ہاتھ ایک بے گناہ کے خون سے لتھڑے ہوئے ہیں میرے دامن پر خود میرے ہی ایک نمک خوار کے خون کا ایسا دھبہ ہے جس کو میرا عرقِ انفعال بھی نہ دھو سکے گا۔ میں نے محبت کا خون کیا ہے۔ میں نے بے زبانوں کا صبر سمیٹا ہے۔ (نیچے) میں قاتل ہوں، خود اپنی اولاد کی تمناؤں کا قاتل۔ گلنار کی بیکسی کے آنسو۔ مجھ کو غرق کر کے رہیں گے۔ شہباز کی بد نصیب ماں کی آہ مجھ کو بھسم کر دے گی۔ انصاف اور رحم دونوں میرے منہ پر تھوکیں گے۔ تاریخ میرے گلے میں لعنت کا طوق ڈالے گی۔ اور میرا ضمیر اگر زندہ رہا۔ تو میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔

ملکہ :- (نیچے) جہاں پناہ کے دشمن۔ ایسی بات تو زبان پر نہ لائیں۔

شہنشاہ :- مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دو ملکہ۔ خود جشن مناؤ۔ سوتیلی اولاد کو تڑپا کر رقص کی محفل آراستہ کرو۔ میری معصوم بچی کا دل توڑ کر اپنی وابستگی کے سامان کرو۔ کسی کے گھر کا چراغ بجھا کر اپنے محل میں چراغاں کرو۔ میں تم کو مبارک باد دینے آیا ہوں، کہ اپنی آتشِ انتقام کو سرد کر کے تم نے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لیا۔

ملکہ :- عالم پناہ! میں نے سب کچھ ناموسِ شاہی کے لئے کیا تھا۔

شہنشاہ :- ناموسِ شاہی! لعنت اور صد ہزار لعنت اُس شاہی پر جو انسانیت سے گزر جائے۔ اگر بادشاہ کے سینے میں انسان کا دل نہیں ہے۔ تو وہ ایک خونخوار درندہ ہے۔ میں ایک خونخوار درندہ ہوں۔ میرے جبڑوں سے انسانیت کا لہو ٹپک رہا ہے۔ اس سے قبل کہ یہ درندہ تم پر جھپٹ پڑے۔ دور ہو جاؤ میرے سامنے سے ـــــ آتشِ انتقام کو اگر کچھ چھینٹوں کی ضرورت ہے تو جاؤ گلنار کی طرف اور رقصِ بسمل کا تماشا دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈا کر لو۔

ملکہ :- عالم پناہ۔ میں سوتیلی سہی مگر اُس کی ماں ہوں

شہنشاہ :- ماں کا مقدس نام اپنی زبان سے لے کر شفقت کو درندگی کی شکل نہ دو۔ جاؤ اُس بدنصیب شہزادی کو دیکھو جو اپنی سبکیوں اور سسکیوں میں ڈھل کر رہ گئی ہے۔ جس کے آنسوؤں کا سیلاب شہباز کے خونِ ناحق کے ساتھ میری طرف بڑھ رہا ہے۔ میں اس سیلاب میں ڈوب جانا چاہتا ہوں۔ اپنے اس تخت و تاج کو غرق کر دینا چاہتا ہوں اسی سیلاب میں۔ (جاتا ہے) اسی سیلاب میں۔ اسی سیلاب میں۔

ملکہ :- (اس کے پیچھے دوڑتی ہے) عالم پناہ! سلطانِ اعظم! ظلِ اللہ! (فیڈ آؤٹ)

ایک اہلِ محلہ:۔ توبہ ہے صاحب۔ کس قدر رنگینی پیدا کر دینے والا سین ہے۔

دوسرا:۔ اور ایکٹنگ دیکھی آپ نے۔ دل کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔

رحیم:۔ کاش آپ رات کے شو میں آ سکیں۔ یہ تو اِدھر اُدھر سے چند ٹکڑے آپ کو دکھائے ہیں۔ اچھا ذرا ٹھہریئے۔ اسی کھیل کے کامک کا ایک ڈیوئٹ آپ کو سنواتا ہوں۔ (آواز دے کر) ماسٹر خیراتی ذرا پیٹی ماسٹر کو بلاؤ۔ شہلا اور بھوندو سے کہو ڈیوئٹ سنائیں۔ (اہلِ محلہ سے) ذرا اس ڈیوئٹ کی دھن سُنیئے گا۔ مذاقیہ گانا ہے۔ مگر کیا بہار دار دھن بٹھائی ہے۔ (آواز دے کر) تیار ہیں سب۔ چلو شروع کرو شہلا۔ بڑا آیا میرا خریدار۔

(تالی بجاتا ہے)

(گانا)

شہلا:۔ بڑا آیا مرا خریدار۔ تیرا میرا میل کیا۔

بھوندو:۔ میں ہوں دل سے تجھ ہی پہ نثار۔ میرا تیرا میل یہ۔

شہلا:۔ گھر میں نہیں دانے۔

بھوندو:۔ اماں چلیں بھنانے۔

شہلا:۔ میرے ابا تو ہیں ساہوکار۔ تیرا میرا میل کیا۔

بھوندو:۔ میں ہوں لیتا اُن ہی سے اُدھار۔ میرا تیرا میل یہ۔

شہلا:۔ ان کے پاس ہے دولت۔

بھوندو:۔ میرے پاس محبت۔

شہلا:۔ تجھ پہ شامت ہوئی ہے سوار۔ تیرا میرا میل کیا۔

بھوندو:۔ اپنی شامت کا میں راہوار۔ تیرا میرا میل یہ

شہلا:۔ دُور موئے نکھٹو۔

بھوندو:۔ میں ہوں اڑیل ٹٹو۔

شہلا:۔ تجھ پہ اللہ کی ہو سنوار۔ تیرا میرا میل کیا۔

بھوندو:۔ ہو سنوار اور ہو بشمار۔ تیرا میرا میل یہ

شہلا:۔ بڑا آیا میرا خریدار۔ تیرا میرا میل کیا۔

بھوندو:۔ میں ہوں تجھ ہی پہ نثار۔ تیرا میرا میل یہ۔

ایک اہلِ محلہ:۔ مزا آ گیا ماسٹر رحیم۔ کیا کہنا۔

دوسرا:۔ دھن بھی لاجواب ہے۔ اور گایا بھی خوب دونوں نے۔ اس گانے پر ونس مور ہو گا

رحیم:۔ کیا عرض کروں وقت نہیں ہے۔ مجھے ریہرسل کرانا ہے۔ ورنہ گانے تو سب ایسے ہیں۔ کہ گلی کوچوں میں گاتے

جائیں تو میرا ذمہ۔ اچھا میں آپ کو اسی کامک کا ایک سین دکھاتا ہوں (آواز دے کر) ماسٹر خیراتی ذرا کامک کا وہ سین دکھا دو۔ جس میں پھلجھڑی کو گھن چکر شادی کا پیام دیتا ہے۔ (اہلِ محلہ سے) ذرا دیکھئے گا اس سین کو (آواز دے کر) ہاں بھئی شروع کرو (تالی بجاتا ہے۔

پھلجھڑی:۔ ہلو۔

گھنچکر:۔ اے لولو۔

پھلجھڑی:۔ آپ ہی کا نام ہے ڈاکٹر ایکس، وائی۔ زیڈ، ڈنٹسٹ۔

گھنچکر:۔ درست فرمایا آپ نے۔ اسی خاکسار کو اے، بی، سی، ڈی گھن چکر کہتے ہیں۔

پھلجھڑی:۔ گھنچکر؟ مگر کارڈ میں تو۔

گھنچکر:۔ ذرا بلند آواز سے فرمایئے۔

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

پھلجھڑی:۔ آپ ڈنٹسٹ ہیں یعنی دندان ساز۔

گھنچکر:۔ ساز یہ کینہ ساز کیا جائے۔ اخبار میں ضرورتِ رشتہ کا اشتہار دیکھا تھا۔ ضرورت لاحق تھی۔ لہٰذا حاضر ہوں۔

پھلجھڑی:۔ یہ کارڈ کس کا ہے۔؟

گھنچکر:۔ خود ہی پڑھ لیجئے۔ اس کارڈ کو پڑھنے کے لئے جس نمبر کی عینک درکار ہے۔ وہ عینک ابھی میں نے بنوائی نہیں ہے۔

پھلجھڑی:۔ (چیخ کر) ڈاکٹر ایکس وائی زیڈ ڈنٹسٹ،

گھنچکر:۔ ارے نہیں، نہیں نہیں۔ یہ تو اُن ڈاکٹر صاحب کا کارڈ ہے۔ جن سے بر دکھوے میں آنے کے لیے میں نے دانت لگوائے ہیں۔

پھلجھڑی:۔ بر دکھوے میں جناب والا خود تشریف لائے ہیں۔ یا کسی برخوردار کے ساتھ آئے ہیں۔

گھنچکر:۔ جو کچھ آپ نے فرمایا ہے۔ وہ درست ہی ہوگا۔ مگر میری نگاہ کی کمزوری، کان کی گرانی، بالوں کی سفیدی، اور دانتوں کی عدم موجودگی پر غور کرنے کے بجائے قابلِ غور ہے۔ صرف میرا دلِ بیتاب۔

پھلجھڑی:۔ اور دماغ کا ذکر ہی نہیں کرتے جو سب سے زیادہ خراب ہے۔

گھنچکر:۔ مجھے آپ سے یہی اُمید تھی۔ اب آپ کے والد سے ملنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب خود آپ ہی نے پسند کر لیا۔ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔

پھلجھڑی:۔ آپ نے وہ دروازہ دیکھا ہے۔ اس سے قبل کہ گھر کا راستہ یاد نہ رہے۔ اس دروازے سے نکل جایئے۔

گھنچکر:۔ باہر۔ اگر آہ۔ باہر تشریف لے چلنا چاہتی ہیں تو بسم اللہ۔ واقعی راز و نیاز کے لئے ہر جگہ مناسب نہیں ہے۔ میں

گراں گوش اور دیوار گوش دارد۔

پھلجھڑی:- (رچ کر) میں کہتی ہوں نو دو گیارہ۔

گھنچکر:- گیارہ۔ بس یہ ٹھیک ہے۔ میں ٹھیک گیارہ بجے باغیچہ میں انتظار کروں گا۔

پھلجھڑی:- ایڈیٹ۔

گھنچکر:- تھینک یو۔ میرا مطلب ہے بائی بائی۔

(ملی جلی ہنسی)

ایک اہلِ محلّہ:- کمال کر دیا ماسٹر جی۔ مار ڈالا ہنساتے ہنساتے

دوسرا:- پیٹ میں بل پڑ گئے۔ کس قدر زندہ کامک ہے۔

رحیم:- کیا عرض کروں۔ وقت ہی نہیں ہے۔ ورنہ اور بھی بہت چیزیں ہیں۔ کہ آپ پھڑک اٹھیں۔ مگر دیکھئے نہ ایک دم سے روپیہ برس تو نہیں سکتا۔ وہ نیک بخت ہے کہ ہتھیلی پر سرسوں جما رہی ہے۔

ایک محلّہ والا:- رحیم ماسٹر ایسے ناٹک کے لئے روپیہ کی کیا کمی ہے، ہزار پانچ سو سے تو ہم بھی شرکت کر سکتے ہیں۔

رحیم:- شکریہ۔ شکریہ۔

دوسرا:- اجی نو نقد نہ تیرہ اُدھار، میری شرکت کی رقم تو لیجیے۔ یہ حاضر ہے۔ دیجئے ان کو روپیہ۔ اور ختم کیجئے گھر کا فساد۔

رحیم:- نہ نہ یہ روپیہ۔ اسی کے ہاتھ میں دیجئے گا۔ تشریف لائیے۔

ایک اہلِ محلّہ:- نہیں صاحب اس منڈوے میں گھاٹے کا سوال ہی نہیں ہے۔

(دروازے پر دستک)

دوسرا:- میں نے کہا بھابی صاحبہ ذرا دروازے پر آئیے۔

بیوی:- (اندر سے) کون ہے۔ میں نگوڑ ماری تو قید میں ہوں۔ میں کیسے آؤں دروازے پر۔

ایک اہلِ محلّہ:- قفل کھل گیا ہے۔ یہ لیجئے ماسٹر رحیم۔ یہ روپے بھیجے ہیں۔ آپ میکے جا رہی ہیں۔ اسی کے لئے خرچ ہے۔

بیوی:- بھیّا میں کہاں جاؤں گی میکے۔ عورت ذات کا گھر تو میاں ہی کا گھر ہے۔ جہاں سے بس جنازہ نکلتا ہے۔

رحیم:- لیجئے سن لی حقیقت۔ اب تجہیز و تکفین کے لئے اور روپے کا انتظام کیجئے۔۔

(ہنستا ہے)

بیوی:- بڑے اچھے معلوم ہوتے ہیں بچارے۔

(سب ہنستے ہیں)

دو رُخ

(دروازے پر کوئی آہستہ سے دستک دیتا ہے)

شیخ صاحب: کون ہے۔ معلوم ہے۔ سب کو کہ آج میرا خضاب کا دن ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ میں خضاب کے دن کسی سے نہیں ملتا۔ پھر بھی دروازہ بجایا جا رہا ہے۔

ناہید: (دروازے سے جھانک کر) میں آ سکتی ہوں ماموں جان!

شیخ: کون؟ ناہید۔ آؤ آؤ۔ میں سمجھا کہ جانے کون ہے، بیٹا تم اس وقت کہاں۔

ناہید: (قریب آتے ہوئے) تسلیم! امی جان کے ساتھ آئی ہوں۔

شیخ: خوب خوب، کہاں ہیں فرخندہ؟ بیٹی ذرا دیکھنا جلد پر سیاہی نہیں آئی خضاب کی۔ یہ بھی بڑھاپے کا ایک عذاب ہے۔

ناہید: جی نہیں بالوں ہی پر ہے۔

شیخ: بالوں پر تو ہونا ہی چاہیئے۔ تو ہیں کہاں بی فرخندہ جب میں تم کو دیکھتا ہوں۔ فرخندہ کا بچپن یاد آتا ہے ہو بہو ماں کی تصویر ہو، وہ تمھاری عمر میں بالکل ایسی ہی تھیں اور تم ان کی عمر میں بالکل ویسی ہی ہو جاؤ گی۔ بلاؤ نا فرخندہ کو۔ ذرا ٹھہرو یہ آئینہ میرے چہرے کی سیدھ میں لے کر بیٹھو۔ ہاں ہوں، مگر یہ کیا اس میں تو گھڑی نظر آ رہی ہے۔ اے بھئی چہرے کی سیدھ میں رکھو۔ ہاں یہ بس بس یوں ہی رہتا۔

فرخندہ: (باہر سے آواز آتی ہے) ناہید!

ناہید: (اندر ہی سے) آ جائیے امی جان ماموں جان یہاں ہیں۔

فرخندہ: (آتے ہوئے) بھیا تسلیم!

شیخ: (خضاب لگاتے ہوئے بند منہ سے) ہم جیتی رہو۔ ہوں، ہوں...... (صاف آواز میں) تم نہ ہلو بیٹی مونچھوں کے بجائے بھنوؤں میں لگ گیا ہوتا ابھی خضاب۔ بس ایک منٹ۔ ہوں۔ ہوں۔ شاباش۔ بیٹھو نا فرخندہ بس ایک منٹ۔

فرخندہ: نسرین کہاں ہے بھیّا!

شیخ: بس ایک منٹ یوں ہی رہنا ایک مونچھ رہ گئی ہے۔ شاباش۔ ہوں۔ ہوں۔ بس اب ٹھیک ہے۔ ہاں کیا پوچھ رہی تھیں فرخندہ۔

فرخندہ: نسرین نظر نہیں آئی۔

شیخ: جب ہو گی یہاں تو نظر آ جائے گی۔ ارے بھئی فرخندہ یہ جاوید میاں۔ کیا بن کر آ گئے ہیں۔ ولایت سے معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کسی دیہات سے واپسی ہوئی ہے۔

فرخندہ: بھیّا میری عقل تو خود حیران ہے مگر اب ہو گا کیا۔ یہاں نسرین بی بی تو کچھ کی کچھ بن چکی ہیں۔

شیخ: دونوں کچھ کے کچھ بن گئے ہیں صاحب دونوں۔ اب میری سمجھ میں تو آتا نہیں یہ سنجوگ۔

فرخندہ: بھیّا خدا کے لیے یہ تو نہ کہیے، بچپن کی منگنی ہے۔ میں نے اسی دن کے لیے دن گن گن کر برس گذارے ہیں کہ جاوید ولایت سے آ گئے تو ان دونوں کے سہرے کے پھول کھلیں۔ دونوں پروان چڑھیں۔

شیخ: انتظار تو مجھ کو بھی یہی تھا۔ مگر اب تم خود دیکھ لو کہ کوئی بھی مناسبت ہے ان دونوں میں۔ تم کو معلوم ہے کہ تمھاری بھابی مرحومہ کے اور میرے مزاج میں کس قدر فرق تھا۔ ان کو چقندر پسند مجھ کو نفرت شدید۔ وہ خس کا عطر لگائیں اور میں بھاگوں اس کمبخت کی خوشبو سے۔ میری جان جائے، بھنڈیوں پر اور وہ ابکائیں لیں بھنڈی کے نام پر، مجھے شوق کہ ان کے صاف دانت دیکھوں اور وہ بغیر مسّی کے رہ نہ سکیں نتیجہ کیا ہوا۔ وہ جا کر بیٹھ رہیں میکے اور میں نے کہا خس کم جہاں پاک ان کے جانے سے واقعی خس کے عطر کی خوشبو بلکہ بدبو سے نجات مل گئی لہٰذا خس کم جہاں پاک میں نے بالکل صحیح کہا۔

فرخندہ: مگر بھیّا! نسرین اور جاوید تو ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔

شیخ: میرا بھی یہی خیال تھا۔ مگر اب حالات کچھ اور نظر آ رہے ہیں۔ نسرین کو جس شدّت سے انتظار تھا جاوید کا، اُسی قدر وہ جاوید کو دیکھ کر مایوس ہوئی ہے۔

فرخندہ: اور جاوید بھی کچھ چُپ چُپ سا ہے۔ البتہ ایک دن یونہی کہہ رہا تھا کہ امّی جان نسرین تو ایک دم میم بن کر رہ گئی ہے۔

شیخ: بے وقوف لڑکا۔ تم کو کہنا چاہیئے تھا۔ کہ اے عقل کے دشمن صاحبزادے وہ آپ کے لیے میم بن کر رہ گئی ہے، میں نے اس کو میم بنایا ہے کہ ولایت میں تعلیم پانے والے ایک لڑکے کی صحیح شریکِ حیات بن سکے مجھ کو کیا معلوم تھا کہ یہ صاحبزادے ولایت سے اس طرح آئیں گے گویا گاؤں سے غلّہ جمع کر کے آئے ہیں، دیکھنا بیٹی ناہید سیاہی جلد پہ تو نہیں آئی۔

ناہید: جی نہیں۔ ماموں جان بالوں ہی پہ ہے۔

شیخ: بالوں پر تو ہونا ہی چاہیئے۔ بیٹی۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ سوال یہ ہے کہ ولایت جا کر جاوید کو آخر

ہوا کیا۔

فرخندہ: وہ جو باتیں کرتا ہے، ان کا بھی میرے پاس کوئی جواب نہیں، وہ کہتا ہے، کہ میں انگریز بننے نہیں گیا تھا۔ پڑھنے گیا تھا۔ ایمانداری کے ساتھ پڑھا اور امتحان بھی امتیاز کے ساتھ پاس کر کے آیا ہوں۔

شیخ: تم کو معلوم ہے نسرین کیا کہہ رہی تھی۔ اس کے سامنے تو میں اس طرح چُپ رہ گیا تھا۔ گویا مجھے ناگوار ہوا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ بڑا برمحل مصرع پڑھا تھا اُس نے، کہنے لگی کہ ع

لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

فرخندہ: بڑا غضب ہو جائے گا بھیّا۔ اگر ان دونوں میں یہی اختلاف رہا۔

شیخ: غضب تو جو کچھ ہونا تھا میرے نزدیک ہو چکا ہے، اب تو حالات کچھ اس قسم کے ہیں کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب، مغرب۔ یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔

فرخندہ: میری زندگی بھر کے ارمان کا یہ حشر ہو گا۔

شیخ: اپنے ارمان سے زیادہ ان دونوں کے ارمانوں کا خیال کرو۔

نسرین: ڈیڈی۔ ہلو آنٹی۔ ہلو ناہید۔ آپ لوگ کب آئیں؟

فرخندہ: بیٹی ہم تو تم کو پوچھ رہی تھی بھیّا سے۔

ناہید: میں آپ کے کمرے میں بھی آپ کو ڈھونڈ آئی۔

نسرین: میں پکچر گئی تھی، ہلو ڈیڈی I say it is a wonderful Picture آپ نہیں گئے I missed you very badly.

شیخ: بیٹی میرا خضاب کا دن تھا آج۔ ذرا دیکھنا Is it alright?

نسرین: کیوں لگاتے ہیں ڈیڈی آخر آپ خضاب Why do you dye. ۔ اچھا میں جا رہی ہوں۔ پکچر سے میرے ساتھ میرے فرینڈ مسعود۔ ریاض اور خالد آئے ہیں۔ اُن کو چائے پلانا ہے۔

شیخ: خانساماں سے کہہ دینا ذرا تمیز سے چائے دے اور وہ بڑا کیک استعمال کر ڈالو۔

نسرین: O.k. Daddy، ناہید ڈیئر ابھی تو ہو نا۔ یا چلو تم بھی سب کے ساتھ چائے پی لو۔

فرخندہ: نہیں بیٹی اس کو رہنے دو۔ وہ لڑکوں میں کہا جائے گی۔

نسرین: بھئی Why is this، یہ کیا بات ہوئی؟ لڑکوں میں جانے سے کیا ہو جاتا ہے۔ میں جو جا رہی ہوں۔

شیخ: ناہید کو رہنے دو بیٹیا تم جاؤ۔ خانساماں سے کہہ دو یہاں بھی چائے بھیج دے۔

نسرین: O.k. Daddy (چلی جاتی ہے)

فرخندہ: بھیّا سچ سچ آپ نے بہت آزاد کر دیا ہے۔

شیخ: مجھے معلوم ہے کہ میں نے ضرورت سے زیادہ آزاد کر دیا ہے مگر تم کو بھی معلوم ہے کہ میں نے کیوں آزاد کیا

ہے۔ بار بار یہ بات مجھ سے کیوں کہلواتی ہو کہ میں نے اُس کو جاوید کے قابل بنانے کی کوشش کی۔ وہ جاوید جو ولایت گیا تھا اور جس کے لیے مجھ کو خیال تھا کہ ولایت سے اِسی قسم کی شریکِ حیات ڈھونڈتا ہوا آئے گا۔ تم کو معلوم ہے کہ جاوید کے ولایت جانے سے پہلے نسرینؔ ایسی نہ تھی۔ نسرینؔ ناہیدؔ ہی کی قسم کی ایک لڑکی تھی۔ جس کو میرے خیال میں وہ لڑکا کبھی پسند نہیں کر سکتا تھا۔ جس نے سالہا سال ولایت میں گذارے ہوں۔ لہٰذا جاوید کے لیے میں نے نسرین کو یہ کچھ بنا ڈالا۔

جاوید: (باہر سے آواز دیتا ہے) میں آ سکتا ہوں۔

ناہید: بھائی جان آ گئے۔

شیخ: کون جاوید میاں۔ آ جاؤ بیٹے۔

جاوید: (آتے ہوئے) آداب عرض۔ ماموں جان۔ میں گھر پہنچا تو معلوم ہوا امّی جان اور ناہید یہاں ہیں۔

شیخ: اگر یہ نہ معلوم ہوتا تو بھی تم یہاں آ سکتے تھے۔ بیٹھو نا۔ اِدھر نکل آؤ میرے پاس۔ آج برخوردار مجھے تم سے کچھ صاف باتیں کرنا ہیں۔ بات یہ ہے کہ میں آدمی ہوں ذرا صاف قسم کا۔ میرے ذہن میں جو اُلجھنیں تمہارے متعلق ہیں اُنھیں تم تک نہ پہنچانا میرے نزدیک دیانت کے بھی خلاف ہے اور تم سے بھی زیادتی ہے۔ کیوں بھئی فرخندہ مجھے صاف بات کر لینا چاہیے نا۔

جاوید: آپ امّی جان سے بیکار پوچھ رہے ہیں۔ اگر مجھ پر اُن سے کچھ کم حق آپ کو حاصل ہے تو بے شک اُن سے اجازت لے لیجیے۔ ورنہ میرے نزدیک تو اُس کی ضرورت نہیں ہے۔

شیخ: میں بغیر کسی تمہید کے براہِ راست یہ سوال کرتا ہوں، کہ یہ تم ولایت سے آخر کیا بن کر آ گئے ہو؟

جاوید: ماموں جان اپنے نزدیک تو میں وہی بن کر آیا ہوں، جو مجھ کو بن کر آنا چاہیے تھا۔

شیخ: میں نے آج تک ولایت سے لوٹنے والے کسی طالب علم کو یہ نہیں دیکھا کہ وہ سوٹ پہن کر جائے اور شیروانی پاجامے میں واپس آئے۔ میرے تصوّر میں تم اس طرح آیا کرتے تھے۔ کہ ولایت کی اعلیٰ تراش کے اپٹوڈیٹ سوٹ میں موٹی سی کمانی کی فیشن ایبل عینک لگائے تم ٹرین سے اُترو گے، خالص انگریزی قسم کا مصافحہ کرو گے اور گھر پہنچ کر گھر کی فضائیں ہی بدل دو گے۔

جاوید: مگر میں آپ کی اُمّید کے خلاف شیروانی، پاجامے اور دیسی جوتے میں ٹرین سے اُترا اور السلام علیکم کہہ کر آپ کے سامنے ادب سے جھک گیا۔

شیخ: برخوردار اِس میں سعادت مندی تو ضرور تھی۔ مگر یہ اندازہ نہ ہوتا تھا کہ تم لندن سے آ رہے ہو یا چھانگا مانگا سے، انگلستان سے آئے ہو یا قصور سے۔

جاوید: میں سمجھتا تھا کہ میری اِس سادگی اور میری اس شرقیت کو آپ پسند فرمائیں گے۔ میں بے شک یہاں سے سوٹ پہن کر ان لوگوں کے ملک میں گیا تھا جو یہاں آ کر نہ شیروانی پہنتے ہیں نہ پاجامہ بلکہ اپنے ملکی لباس

میں رہتے ہیں۔ اور اپنی ہی معاشرت یہاں پیدا کر لیتے ہیں۔

شیخ: بات تو تم معقول کہہ رہے ہو مگر میں ذرا وضاحت سے سمجھنا چاہتا ہوں۔

جاوید: ماموں جان اس بات کا اندازہ تو مجھے وہاں جا کر ہوا کہ ہم ذہنی طور پر کس حد تک اُن کی غلامی کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم اُن کا کلچر اس طرح اوڑھ لیتے ہیں گویا خود ہمارا کوئی کلچر ہی نہیں اور ہم اُن کو بجا طور پر ناز کرنے کا موقعہ دیتے ہیں۔ کہ اُن کے کلچر نے ہم کو آدمی بننے کے قابل بنایا ہے۔ میرے ذہن میں صرف یہ سوال پیدا ہوا کہ ہم اپنے وطن میں بیٹھے اُن کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں اور وہ ہمارے یہاں آ کر بھی اپنی اصلیت نہیں بھولتے۔ اس خیال نے مجھ کو خود مشرقی کلچر کی طرف متوجہ کیا اور میں نے وہاں رہ کر بجائے ذہنی غلامی کرنے کے اپنا کلچر ان کے سامنے پیش کیا۔

شیخ: دیکھنا بیٹا خضاب کی سیاہی جِلد پر تو نہیں آئی۔

جاوید: جی نہیں۔ ٹھیک ہے۔ ماموں جان آپ کو حیرت ہو گی کہ میں نے وہاں کے درزیوں کو شیروانی کا نمونہ دے کر شیروانیاں اُس سے زیادہ دام صرف کر کے بنوائیں جتنے میں سوٹ بنتا ہے مگر پہنی صرف شیروانی۔ میں صبح کے ناشتے میں بجائے دلیہ اور دودھ پینے کے اور بجائے ٹوسٹ میٹ اور انڈے کے خود پوریاں پکاتا تھا۔ اور آلو کی چٹپٹی ترکاری کے ساتھ نہ صرف خود کھاتا تھا بلکہ اکثر انگریز دوستوں کو اس ناشتے کا دِلدادہ بنا آیا ہوں۔

شیخ: مگر برخوردار اس سے تو تم بھی انکار نہیں کر سکتے کہ ان لوگوں میں بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔

جاوید: میں ان کی خوبیاں چھوڑ کر نہیں آیا ہوں۔ آپ مجھ کو وقت کا پابند پائیں گے۔ آپ مجھ کو محنتی اور جفاکش دیکھیں گے۔ کام کے وقت کام اور تفریح کے وقت صرف تفریح میرا بھی اصول ہے۔ معاملت میں صفائی اور دیانت کا میں بھی قائل ہوں مگر ان باتوں پر صرف سوٹ پہن کر اور سگار پی کر ہی عمل نہیں ہو سکتا۔

شیخ: برخوردار مجھے تمہاری باتوں کی معقولیت کا اعتراف ہے مگر میری ملاحظہ ہو کہ میں نے محض تمہارے لیے نسرین کو خدا جانے کیا کا کیا بنا دیا ہے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ولایت سے واپس آ کر تم جس قسم کی شریک حیات چاہو وہ تمام صفات تم کو نسرین میں مل سکیں۔ میں نے اُس کو نہ صرف کالج میں پڑھوایا بلکہ خالص یورپین ماحول میں رکھا۔ میں نے اس کو پیانو سکھوایا۔ میں نے اُس کو ڈانس کی تعلیم دلوائی۔ وہ رائیڈنگ کر سکتی ہے، وہ سوئمنگ جانتی ہے وہ اعلےٰ سے اعلےٰ سوسائٹی میں بے جوڑ معلوم نہ ہو گی۔ وہ اس فراٹے سے انگریزی بولتی ہے اور اس کا لب و لہجہ اس قدر انگریزیت لیے ہوئے ہے کہ انگریزی اس کی مادری زبان معلوم ہوتی ہے۔

جاوید: میں یہ سب اندازہ کر چکا ہوں اور مجھے یہ بھی احساس ہے کہ آپ نے یہ سب کچھ میرے ہی لیے کیا ہے

مگر حیرت صرف یہ ہے کہ اگر مجھ کو ان ہی تمام صفات کی ضرورت ہوتی تو اس نقل کی کیا ضرورت تھی میں اصل ہی اپنے ساتھ ولایت سے کیوں نہ لایا مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ولایت میں اتنا زمانہ گذارنے کے بعد بھی نسائیت کے اس رنگ سے طبیعت اجنبی ہی رہی اور ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ اس ولایتی حسن اور ان ولایتی اداؤں میں میرے لیے کوئی ہم جنسی نہیں ہے۔

فرخندہ: مگر بیٹا سوال تو یہ ہے کہ اب کیا ہو گا۔

شیخ: اس کو بات کرنے دو وہ بڑی گہری باتیں کر رہا ہے۔ ہاں برخوردار۔

جاوید: ماموں جان۔ وہاں رہ کر میں نے اپنے اوپر نسرین کے اسی تصور کو طاری رکھا جیسا میں اس کو چھوڑ گیا تھا وہی میک آپ سے پاک معصوم چہرہ۔ وہی دوپٹہ۔ وہی غرارہ اور شلوار اور وہی عید بقرعید ماتھے پر ٹیکہ۔ ماموں جان ہماری مشرقی لڑکیوں میں جو ایک بے ساختہ جھجک اور جھپک ہے اس کا خدا کی قسم میں نے کہیں جواب نہیں دیکھا۔ وہ شرم اور وہ لاج جو مشرقی نسائیت کی روح ہے اسی کے بغیر مغربی نسائیت بے روح نظر آتی ہے۔

شیخ: کیا تمھارے خیال میں کوئی ایسی صورت ہے کہ نسرین کو پھر مشرقیت کی طرف واپس لایا جا سکے۔

جاوید: مجھ کو پوری طرح اندازہ نہیں ہو سکا کہ نسرین اپنے موجودہ رنگ میں کس حد تک ڈوب چکی ہے اگر اس نے اپنی اصلیت کی تحقیر ابھی شروع نہیں کی ہے تو واپسی ناممکن نہیں ہے۔

فرخندہ: نہیں بیٹا وہ ٹھیک ہو سکتی ہے۔ اس غریب کو جیسا بنا دیا ہے وہ بن گئی ہے۔

شیخ: خیر۔ خیر میں اس قسم کی باتیں نہیں کرتا برخوردار تم خود اس کا جائزہ لو اور اگر اس کو واپس لا سکو تو مجھ سے زیادہ شاید کسی کو مسرت نہ ہو۔

جاوید: آپ سے کم خود مجھ کو بھی مسرت نہ ہو گی۔

شیخ: ذرا اس سے بات کر کے اندازہ تو کرو۔ ناہید بیٹی دیکھنا ذرا نسرین کے دوست گئے یا نہیں۔ یہ بات تم نے لاکھ روپے کی کہی ہے کہ اگر تم کو یہی وضع قطع اور یہی معاشرت پسند ہوتی تو اس نقل کی کیا ضرورت تھی اصل ساتھ ہی لاتے۔ میں اس بات کی سچائی کا قائل ہو چکا ہوں۔

فرخندہ: اگر کوشش کی جائے اور شادی کے بعد رفتہ رفتہ اصلاح کی جائے تو وہ ٹھیک ہو جائے گی۔

جاوید: امی جان بس یہی بات غلط ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ نسرین کے لیے میرے احساسات کیا ہیں مگر بغیر سمجھے بوجھے دو زندگیاں تلخ نہیں بنائی جا سکتیں۔

شیخ: بالکل ٹھیک ہے۔ بھئی معاف کرنا نہیں معلوم تھا کہ تم اس قدر معقول انسان بن کر آئے ہو میں تو تمھاری ظاہری وضع قطع کو تمھاری نامعقولیت ہی سمجھ رہا تھا۔

ناہید: (آتے ہوئے) نسرین آپا اپنے کمرے میں اکیلی ہیں پیانو بجا رہی ہیں۔

شیخ : میرے خیال میں تو تم پہنچ جاؤ برخوردار، خدا کرے تمہارے دلائل اس کو بھی اتنا ہی قائل کر دیں جتنا مجھ کو کیا ہے۔

جاوید : دیکھیے کوشش کرتا ہوں۔

(جاتا ہے۔ کچھ وقفہ۔ پھر پیانو کی آواز رفتہ رفتہ قریب آتی ہے۔ جاوید اجازت چاہتا ہے)

میں آ سکتا ہوں۔

نسرین : (پیانو بند کرتے ہوئے) او منشی محمد جاوید صاحب Who is there ? (قہقہہ لگاتی ہے) By jow. یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے جاوید۔ پیروں میں بندوق کے غلاف پہنے ہوتے ہیں اور یہ کیا نام ہے اِس کوٹ کا شیروانی۔ کس قدر عجیب چیز ہے یہ بھی۔ اور معلوم نہیں بغیر (سوکس) موزوں کے تم یہ بیڈ روم سلیپر قسم کا جوتا کیسے پہن لیتے ہو۔

جاوید : آپ کے دوست گئے۔

نسرین : جب وہ چلنے ہی لگے تھے۔ میں نے تم کو جاتے دیکھا تھا۔ مگر میں نے بلایا نہیں وہ لوگ مذاق اڑاتے تمہارا بلکہ مسعود پوچھ بھی رہا تھا کہ تمہارے جو Causin ولایت سے آئے ہیں وہ کہاں ہیں۔ اب میں کیا بتاتی کہ وہ چیز تم ہو۔ چیز (قہقہہ)

جاوید : تم نے اچھا کیا کہ نہیں بتایا ورنہ میرے ساتھ تمہارا بھی مذاق اڑتا۔

نسرین : But, I don't know، یہ تم بن کر کیا رہ گئے ہو۔ یہ تم کو ہوا کیا آخر۔ What's wrong

جاوید : کچھ نہیں نسرین۔ صرف یہ ہوا ہے کہ ولایت جا کر میری آنکھیں تھوڑی سی کھل گئی ہیں کہ ہم انگریزوں کی کس شدت سے ذہنی غلامی کر رہے ہیں۔ تم نے کبھی انگریز کو بھی دیکھا ہے کہ اس نے تمہارا ملکی لباس تمہارے ملک میں بھی آ کر پہنا ہو۔

نسرین : یہ تو بالکل ویسی ہی بات ہوئی کہ جیسے کوئی افریقہ جا کر کوڑیوں کے ہار پہن لے۔

جاوید : کیا تمہارے خیال میں تمہارا کلچر ایسا گیا گزرا ہے۔

نسرین : What are you talking. ہمارا کلچر ہی کیا ہے یہی کلچر جس کا تم نمونہ بنے ہوئے ہو؟

جاوید : ہاں بیشک۔ یہ جیسا کچھ بھی ہے مگر اپنا کلچر ہے۔ اور جس رنگ میں تم رنگی ہوئی ہو وہ خواہ کچھ بھی ہو تمہارا نہیں دوسروں کا ہے اور تم پر تہمت معلوم ہوتا ہے۔

نسرین : میں سمجھی تھی کہ تم صرف وضع قطع ہی میں بدلے ہو مگر معلوم ہوا کہ تم ہر اعتبار سے اب سے سو سال پیچھے جا پڑے ہو۔ I wonder what is wrong with you

جاوید : ممکن ہے میرا قصور ہو مگر میں تمہارا قصور بالکل نہیں سمجھتا تم وہی بن گئی ہو جو تم کو بنا دیا گیا ہے۔ اور جو کچھ

تم کو بنایا گیا ہے۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ ماموں جان کا خیال تھا کہ میں بھی ولایت سے وہی بن کر آؤنگا جو عام قسم کے نوجوان بن کر آتے ہیں جو اپنی اصلیت کو بھول جاتے ہیں اپنے وقار کو خود اپنی نظروں سے گرا کر خودنگری کے بجائے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر دوسروں کے قالب میں اپنے آپ کو ڈھال لیتے ہیں۔ ماموں جان نے تم کو میری نصف بہتر بنانے کی کوشش کی تھی۔

نسرین: مگر تم وہاں سے نصفِ بدتر بن کر آ گئے۔ worst half۔ (قہقہہ لگاتی ہے)

جاوید: ہاں نسرین مجھ سے یہ قصور ضرور ہوا ہے کہ میں اپنے کو بھولا نہیں کاش تم کو معلوم ہوتا کہ میں نے اس عرصے میں تمہارے اس تصوّر کی کیسی پرستش کی ہے جیسا کہ میں تم کو چھوڑ گیا تھا۔ میں بے صبری سے منتظر تھا اس وقت کا جب میں آؤں گا اور میری نسرین کی شرم آمیز محبت میں ڈوبی ہوئی نظریں جانے کیا کیا مجھ سے کہہ ڈالیں گی۔

نسرین: (Good Gracious;)۔ یہ تم کس دنیا کی باتیں کر رہے ہو جاوید۔ کاش تم کو بھی معلوم ہوتا کہ میں نے اس عرصے میں تمہارا کیا تصوّر قائم کر رکھا تھا۔ کہ ایک فیشن ایبل مہذب Upto-date نوجوان اعلیٰ درجے کا سوٹ پہنے منہ میں پائپ لگائے ٹرین سے اترے گا۔ اور ہلو کہہ کر میری طرف دوڑے گا۔ اس کو حیرت ہو جائے گی کہ جس نسرین کو وہ ایک جاہل گنوار اور دقیانوسی لڑکی چھوڑ کر گیا تھا وہ اب اس کے خوابوں کی جیتی جاگتی تعبیر بن چکی ہے۔

جاوید: ہاں نسرین میں تم کو دیکھ کر قائل ہو گیا ہوں کہ واقعی خواب کی تعبیر اُلٹی ہوتی ہے۔

نسرین: مجھ کو بات ختم کر لینے دو۔ تم ٹرین سے اس طرح اترے کہ میں سکتے میں آ گئی I was shaked۔ تم نے ایک ٹھنڈا سا سلام علیکم کیا اور میری تمام امیدوں پر اوس ڈال دی میں ایک دم بجھ کر رہ گئی۔ اب میں تم کو چھپاتی پھرتی ہوں اپنے کسی دوست سے تم کو ملا بھی نہیں سکتی میرے دوست تمہارا ذکر کرتے ہیں اور میں ٹال جاتی ہوں کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھ کو کچھ کم شوک پہنچا ہے مجھ کو تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تم اپنے کو کھو کر آ گئے You have lost yourself تم نے اپنے کو گنوا دیا ہے۔

جاوید: اچھا اب ایک بات بتاؤ نسرین جہاں تک میں محبت کو سمجھ چکا ہوں یا یہ کہو کہ سمجھ سکا ہوں وہ تو اتنی کمزور چیز نہیں کہ ان سطحی اور ان ظاہری تبدیلیوں سے گھٹ بڑھ سکے۔

نسرین: No, No, No: تم ناولوں اور افسانوں والی محبت کی بات مجھ سے نہ کرو۔ جب میں اپنی کھلی آنکھوں سے تم کو دیکھ رہی ہوں کہ تم اپنے کو مہذب دنیا کے لیے Laughing stock بنا چکے ہو جتنا میں آگے بڑھی ہوں اتنا ہی تم پیچھے ہٹ چکے ہو تو میرے خیال میں میرا دماغ اتنا خراب نہیں ہونا چاہیے کہ میں اب بھی تم سے محبت کا دعویٰ کروں۔ میں اتنا بڑا جھوٹ کبھی نہیں بول سکتی۔

جاوید: تو پھر اس بات کو مانو نا کہ تم کو مجھ سے میری ذات سے محبت یا وابستگی نہ تھی بلکہ میری وضع قطع سے تھی۔

نسرین: My God میں تم کو کیسے سمجھاؤں کہ مجھے تم اب بھی عزیز ہو مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر میں کسی بلّی کے بچے کو چمکارنے لگوں تو اس کو بحیثیت شوہر کے بھی قبول کر لوں گی۔ جاوید تم یہ خیال تو اپنے دل سے نکال ہی دو کہ ہم دونوں میں شادی بھی ہو سکتی ہے۔

جاوید: اچھا اگر میں اپنے اوپر جبر کر کے تمہاری مرضی کے مطابق Upto—date بن جاؤں تو۔

نسرین: تو مجھ کو یہ معلوم ہوگا جیسے کھویا ہوا جاوید مل گیا مجھ کو۔ I assure you I will be too glad

جاوید: نسرین اب مجھ سے سنو کہ تم جاوید سے نہیں بلکہ کسی درزی کی دکان میں رکھے ہوئے اس مجسمے سے وابستگی چاہتی ہو جس کو درزی نے سوٹ پہنا کر گاہکوں کو دکھلانے کے لیے رکھ چھوڑا ہو۔ جاوید کی جستجو ہوتی تو وہ تم کو مل جاتا مگر اب جاوید تم کو نہ مل سکے گا۔ اپنے تصور میں جو سُوٹ تم نے اس کو پہنا رکھے تھے وہ ضرور مل جائیں گے۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا کہ میں اپنے کو ولایت جا کر کھو آیا مگر اس سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ تم نے گھر بیٹھے اپنے کو گم کر دیا۔

نسرین: تم شاید بُرا مان گئے ہو مگر مجھے اُمید ہے کہ اِتنی عقل تم میں ضرور ہوگی کہ تم یہ سمجھ لو کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کتنے دُور ہو چکے ہیں۔

جاوید: بہت دُور۔ اتنی دُور کہ میں تم کو واپس نہیں لا سکتا۔

نسرین: نہ تم واپس لا سکتے ہو نہ میں واپس آنا چاہتی ہوں جاوید تم بہت پیچھے ہٹ گئے ہو۔

(شیخ صاحب مع فرخندہ اور ناہید کے داخل ہوتے ہیں۔)

شیخ: بس میں یہی فیصلہ سُننا چاہتا تھا۔ میں نے تم دونوں کی تمام گفتگو سُن لی اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ واقعی مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔

فرخندہ: میری زندگی بھر کی تمنّا کا یوں خون ہونا قسمت میں لکھا ہوا تھا۔ (رونے لگتی ہے)

جاوید: امّی جان ایسے حالات پیدا نہ کیجیے کہ رہے سہے تعلقات بھی ختم ہو جائیں باوجود ان تمام باتوں کے میں نسرین کا قصور نہیں سمجھتا۔

فرخندہ: نہیں بیٹا قصور تو ہے میرے مقدر کا۔

شیخ: قصور دراصل صرف میرا ہے مگر اس قصور میں نیک نیتی تھی کہ میں نے نسرین کو اُس معیار پر لانا چاہا کہ ولایت سے واپس آنے والا جاوید اپنے کو کسی گھاٹے میں نہ سمجھے میرے حالات اگر مجھ کو اجازت دیتے تو شاید میں نسرین کو بھی ولایت بھیج دیتا۔

نسرین: مگر ڈیڈی مجھ کو یقین ہے کہ میں انگلینڈ جاؤں گی ضرور اور یورپ کی سیر ضرور کروں گی۔

فرخندہ: بیٹی تم یہ غور کرو کہ تم ایک مشرقی لڑکی ہو۔

جاوید: امّی جان اب سمجھانا بیکار ہے۔ میں تو نسرین کا ممنون ہوں کہ اس نے نہایت صفائی کے ساتھ مجھ سے گفتگو

کی ہے۔

شیخ: اس قدر صفائی کے ساتھ کہ میری طبیعت بھی صاف ہو گئی مجھ کو خود بھی اتنا اندازہ نہ تھا کہ اس تربیت نے نسرین کو اس حد تک بدل دیا ہوگا۔ کوا ہنس کی چال چلا اور اپنی بھی چال بھول گیا۔

نسرین: ڈیڈی Are you talking seriously

شیخ: بس صاحبزادی آئندہ مجھ سے صرف میری مادری زبان میں گفتگو فرمایا کیجئے۔ میں اگر تم کو تعلیم اور آزادی دے کر یہ بتا سکتا ہوں تو مجھ کو یہ بھی آتا ہے کہ میں تم کو اپنے ماحول میں واپس لاؤں۔

نسرین: But I mean to say that....... یہ بات کیا ہوئی ہے۔

شیخ: میں نے تم کو اتنی آزادی دی تو میں ہی یہ بھی کر سکتا ہوں کہ بحیثیت باپ کے اپنے اختیارات سے کام لوں اور تمھاری شادی زبردستی جاوید سے کردوں۔

جاوید: مگر ماموں جان معاف فرمائیے گا میں نسرین پر یہ ظلم نہیں کر سکتا۔

فرخندہ: تم سے کیا مطلب بزرگوں کی باتوں میں کہیں بھی لڑکا اور لڑکی دخل دیتے ہیں۔

نسرین: آنٹی وہ زمانہ گزر گیا اب لڑکا اور لڑکی یہ اندھا جوا نہیں کھیل سکتے۔

شیخ: (روتے ہوئے) یہ دن دیکھنے کے لیے میں زندہ رہ گیا تھا۔ میری لڑکی اور میرے سامنے اس طرح زبان چلائے۔

جاوید: یہ بات آپ کو اس لیے بری معلوم ہوتی ہے کہ آپ کی معاشرت اور آپکے ماحول کے خلاف ہے مگر نسرین کو آپ ہی کی تربیت نے اس صاف گوئی کا عادی بنایا ہے۔ تو اب اس کا رنج فضول ہے۔

فرخندہ: بھیا آپ کیوں رو رو کر ہلکان ہو رہے ہیں۔

نسرین: (جاتے ہوئے) شادی ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کے لیے کسی کو اس طرح دبایا جا سکے I cannot tolerate this (چلی جاتی ہے)

شیخ: کاش یہ دن دیکھنے سے پہلے مجھے موت آجاتی۔

فرخندہ: اللہ نہ کرے، مجھ بدنصیب کا آپ کے اور جاوید کے سوا ہے ہی کون؟

شیخ: ناہید بیٹی دیکھنا جلد پر تو نہیں آئی خضاب کی سیاہی۔

ناہید: جی ہاں شاید آنسوؤں سے پھیل گئی ہے سیاہی۔

شیخ: بس تو پھر ٹھیک ہے۔ شکر ہے پروردگار تیرا۔ خود کردہ علاج نیست۔ (ایک آہ سرد)

ہم اور وہ

لڑکوں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ لڑکیوں کے غلام بن کر رہتے ہیں ہم سب۔ نہ جانے اللہ میاں نے ہم کو لڑکا بنا کر کیوں پیدا کیا ہے کہ نہ پہننے کا مزہ نہ اوڑھنے کا۔ آخر ہمارے ہی ماں باپ کی بیٹی فرخندہ بھی تو ہے۔ دیکھ لیجیے اُس کے ٹھاٹھ۔ آج کی عید تو جیسے سچ مچ اُسی کے لیے آئی تھی کہ کل رات کو چاند دیکھتے ہی اُس کے نخرے شروع کر دیے گئے۔ ہاتھ پیر کی بیسوں انگلیوں کو رنگا گیا۔ بال گیلے کر کے مینڈھیاں گوندھ دی گئیں کہ صبح عید کے دن جب یہ مینڈھیاں کھولی جائیں تو بال گھونگھر والے دکھائی دیں۔ جگمگ جگمگ کرتے ہوئے کپڑے اُس کے لیے نکالے گئے۔ اور جوتا تو اس کے لیے اتنا قیمتی آیا ہے کہ ان داموں کے ہمارے چار جوڑے جوتے آ جاتے۔ اور آج عید کے دن سے تو سویرے ہی سے اُس کے ایسے بناؤ سنگھار شروع کیے گئے کہ جیسے عید بس فرخندہ ہی کے لیے آئی ہے۔ نہ جانے کتنے تو زیور اس کے لیے نکالے گئے ماتھے کا ٹیکہ۔ سر کا چھپکا۔ کانوں کے مگر۔ ہاتھوں کی چوڑیاں۔ گلے کا نکلس۔ پھر یہ کہ سرمہ لگ چکا تو نہ جانے کتنی کریمیں اُس کے منہ پر رگڑی گئیں۔ پھر پاؤڈر ملا گیا۔ گالوں پر سُرخی لگائی گئی، ہونٹوں پر لالی رگڑی گئی۔ ہماری طرح تھوڑی کہ بس نہا کر جو نکلے تو سفید کرتہ پاجامہ پہن کر وہ شیروانی البتہ پہن لی جو عید کے لیے نئی سلوائی گئی ہے مگر حساب لگائیے تو جتنے کا ایک دوپٹہ ہے فرخندہ کا اتنے کا ہمارا پورا جوڑا بھی نہ ہوگا جوتوں سمیت ٹوپی بھی ملا کر۔

ہم دن بھر اسی بے انصافی پر کُڑھتے رہے ہیں کہ لڑکوں اور لڑکیوں میں آخر اتنا فرق کیوں ہے اور اگر فرق ہے تو آخر ہم نے کیا گناہ کیا تھا کہ ہم کو لڑکا بنا کر پیدا کر دیا گیا ہے جلنے اور کڑھنے کے لیے۔ لڑکی بنا کر پیدا نہیں کیا گیا کہ ہم بھی سر سے لیکر پیر تک آج سونے سے لدے چھم چھم کرتے پھرتے۔ ریشمی اور کامدار کپڑے پہنے جگمگ جگمگ نظر آتے سب کو۔ انگلیاں کیسی خوبصورت معلوم ہوتیں اگر ان کے ناخنوں پر وہی رنگ لگا ہوا ہوتا جو فرخندہ کے ناخنوں پر لگایا گیا ہے۔ یہ ڈنڈا جیسی کلائیاں کیسی اچھی لگتیں اگر ان میں چوڑیاں کھنکتی ہوتیں مگر یہ بھی اپنی اپنی قسمت ہے کہ وہ اپنی قسمت میں ریشم اور سونا لکھوا کر پیدا ہوئی ہے اور ہم اُس کے سامنے سچ مچ ٹھُسّے نظر آتے ہیں۔

آج ہم دن بھر اپنے اور فرخندہ کے اسی فرق پر جلتے بھُنتے رہے۔ عید کا سارا مزہ کِرکِرا ہو کر رہ گیا۔ اور رات کو بھی جب سب کے سب دن بھر کے تھکے ہوئے سونے کی تیاریاں کر رہے تھے جب امی جان نے فرخندہ سے کہا کہ "لو بیٹی اب زیور اور کپڑے

اُتار کر آرام کرو" تو اُس نے ایک مرتبہ چھم سے اُٹھ کر اپنا جگمگاتا ہوا دوپٹہ سنبھالا۔ ماتھے کا ٹیکہ ٹھیک کیا اور سر کے چھپکے کو اپنے ہاتھ سے درست کر کے کہا "امّی جان میں ایک مرتبہ آئینہ میں اپنے کو دیکھ تو لوں پھر اُتار دوں گی سب کچھ" یہ سُن کر سب کے سب ہنسنے لگے مگر ہم اور بھی جل کر رہ گئے کہ ایک یہ ہے جس نے آج دن بھر آئینہ دیکھا ہے اور ایک ہم ہیں کہ آئینہ کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی ہے ہم کو۔ وہ اس وقت بھی دیر تک آئینہ دیکھتی رہی مگر ہم نے جل کر کروٹ بدل لی۔

پھر خیال آیا کہ لاؤ ذرا دیکھیں تو سہی آئینہ کہ ہم میں اور ہماری اس بہن میں سچ مچ فرق کتنا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اُٹھے اور دل ہی دل میں یہ کہتے ہوئے آئینہ کی طرف بڑھے کہ واہ اللہ میاں دیکھ لیا آپ کا انصاف بھی۔ مگر اب جو آئینے کے سامنے جاتے ہیں۔ تو پہلی نظر میں خود اپنے کو پہچاننا مشکل ہو گیا۔ مگر جب یقین ہو گیا کہ آئینہ میں یہ کوئی اور نہیں ہم ہی ہیں تو خوش ہو کر ہم نے دل ہی دل میں کہا کہ اللہ میاں دل سے نکلی ہوئی دعا ضرور سنتے ہیں۔ ہمارے بھی ماتھے پر ٹیکا تھا۔ لمبی سی چوٹی میں پچلے کا موباف بندھا ہوا تھا۔ سر پر جھومر تھا۔ کانوں میں کرن پھول تھے۔ گلے میں جڑاؤ ہار تھا۔ ہاتھ اُٹھا کر دیکھے تو چوڑیاں بھی نظر آ گئیں انگلیوں میں انگوٹھیاں دیکھ کر ناخنوں پر جو نظر پڑی تو وہ بھی رنگے ہوئے تھے۔ پھر کپڑوں کو دیکھا تو جی خوش ہو گیا کرن ٹکا ہوا کامدانی پڑا رنگینی دوپٹہ۔ جگمگ کرتی ہوئی قمیص اور غرارہ تو ایسا بھاری کام کا تھا کہ سچ مچ نظر نہ ٹھہرتی تھی اُس پر پھر نازک سی چھماتی ہوئی سینڈل۔ میرا جی چاہا کہ مارے خوشی کے ناچنے لگوں خیر ناچتا تو میں کیا ——— مگر اب ناچتا کیوں کہہ رہا ہوں۔ اب تو کہنا چاہیے کہ ناچتی تو میں کیا البتہ خوشی سے تالی بجاتی دوڑی امی جان کو اور سب کو دکھانے کہ لو اب دیکھو مجھے بھی۔ مگر ابھی میں کمرے سے نکل کر انگنائی میں پہنچی ہی تھی کہ نانی اماں نے ایک ڈانٹ دی:۔

"صاحبزادی۔ صاحبزادی۔ حواسوں میں ہو کہ نہیں۔ تو بھلا یہ لڑکی ذات کے ڈھنگ ہیں کہ لڑکوں کی طرح ایک ٹانگ سے اُچکتی پھر رہی ہو"

امّی جان نے بھی بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا "کیا مجال جو یہ صاحبزادی سیدھی چال کبھی چلیں۔ آخر ہم بھی تو تھے اپنے زمانے میں پھونک پھونک کر نپے تُلے قدم رکھتے تھے کہ باپ بھائی آئے گئے کسی کو نام دھرنے کا موقع نہ ملے"

نانی امّاں نے کہا "یہ دوپٹہ اوڑھنے کا انداز ہے کہ جیسے گلے میں لالٹین کی بتّی پڑی ہو نگوڑ ماری۔ بیوی یہ پرائے گھر جانے کے ڈھنگ نہیں ہیں"

امّی جان نے ہاں میں ہاں ملائی "پرائے گھر جا کر بھی امّاں باوا کے نام دھروائیں گی کہ اچھی تربیت دی ہے بیٹی کو۔ میں یہ کہتی ہوں میں نے تم سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ اب تمہاری عمر ان ہڑدنگوں کی نہیں ہے چولہا ہانڈی دیکھو۔ یہ عمر ہونے کو آئی اور سوئی میں دھاگہ تک ڈالنے کی لاڈلی کو تمیز نہیں ہے۔ اب کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو جاؤ جا کر بوا نصیبن کا ہاتھ بٹاؤ باورچی خانہ میں۔ آٹا گوندھو جا کر"

اور یہ کہہ کر بوا نصیبن کو آواز دے کر امّی جان نے کہہ دیا کہ یہ آ رہی ہیں محمودہ بی بی ان سے کام لو۔ گویا محمود میاں سے محمودہ بی بی بنتے ہی یہ قدر ہوئی ہماری کہ بوا نصیبن کی ماتحتی کرنا پڑی۔ مگر اب ہو ہی کیا سکتا تھا خود ہی تو لڑکی بننے کی دعائیں مانگیں تھیں وہی مثل کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی، جانا پڑا باورچی خانہ میں جہاں بوا نصیبن حکم چلانے کے لیے تیار ہی بیٹھی تھیں ہماری

صورت دیکھتے ہی کہا :

”یہ لیجیے بی بی لگن اور اس میں لائیے کوٹھری میں سے آٹا اور بیٹھ کر گوندھیے میرے سامنے۔ لڑکی ذات کے یہی کام ہیں۔ شکر ہے کہ بیگم صاحبہ کو اب ہوش آیا ہے میں تو سمجھی تھی کہ بیٹی کو وہ یوں ہی لاڈ پیار میں رکھ کر چولہا ہانڈی سینا پرونا کچھ بھی نہ سکھائیں گی۔“

میں نے امی جان اور نانی اماں کا غصہ بوا نصیبن پر اُتارا: ”خیر تم یہ لکچر دینے کو رہنے دو مجھے بتاؤ کتنا آٹا نکالوں۔“

بوا نصیبن نے آنکھیں مٹکا کر کہا: ”واہ صاحبزادی واہ کیا میٹھی زبان ہے۔ جیسے ہوا سے لڑتی ہو۔ لو اور سنو میں نے کہا کیا ہے جو آئیں وہاں سے مجھ پر نہ جانے کس کس کا غصہ اُتارنے۔ میری بلا سے تم کرو یا نہ کرو کام۔“

بوا نصیبن نے یہ بات اتنی اونچی آواز میں کہی تھی کہ امی جان اور ان کے پیچھے پیچھے نانی اماں دونوں باورچی خانہ میں آ موجود ہوئیں اور امی جان نے آتے ہی کہا: ”کیا بات ہے آخر“

بوا نصیبن نے خوب نمک مرچ لگا کر کہنا شروع کیا: ”سرکار میں نے بس اتنا کہا تھا کہ لو بی بی کوٹھری سے آٹا نکال لاؤ تو میں تم کو گوندھنا سکھا دوں۔ چار دن میں چولہے ہانڈی کا سارا کام سکھا دوں گی۔ بس اتنی سی بات پر خفا ہو گئیں کہ میں یہ ٹرٹرہ سننے نہیں آئی ہوں یہ لکچر ختم کرو۔“

نانی اماں نے کہا: ”یہ صاحبزادی تو اب خدا ہی ہے جو لڑکیوں کے ڈھنگ سیکھیں۔

امی جان نے غصہ سے کہا: ”ڈھنگ تو سیکھیں گے ان کے فرشتے، نہیں تو مجھے گلا گھونٹ دینا بھی آتا ہے۔ یہ بارہ ہاتھ کی زبان جس وقت سسرال لے کر جائیں گی وہاں تھوکا تو جائے گا ان کی اوقات پر۔“

میری یہاں یہ گت بن رہی تھی اور میں نے دیکھا کہ صحن میں فرخ جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تک فرخندہ تھا آدھی آستینوں کی سفید قمیص اور نکر پہنے چھلانگیں مارتا پھر رہا ہے اور اس کو کوئی کچھ نہیں کہتا کہ یہ کیا ڈھنگ ہیں یہ ننگا پہناوا۔ یہ اچھل کود بے ننگے سر بال اچھال اچھال کر اس کا کودنا کس قدر آزاد ہے وہ بھی میری طرح نہیں کہ دوپٹہ سر سے سرکا نہیں کہ آفت آگئی۔ چال میں ذرا تیزی آئی نہیں کہ روک ٹوک شروع ہو گئی۔ میں ابھی اُسے رشک کی نظروں سے دیکھ ہی رہی تھی کہ امی جان نے ڈانٹنا شروع کیا :

”اب ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیا بیٹھی ہے۔ آٹا آخر کب گندھے گا فرخ غریب بھوکا پھر رہا ہے۔ تیسرے پہر کو بھی اُسے ڈھنگ سے ناشتہ نصیب نہیں ہوا۔“

نانی اماں نے کہا: ”وہ تو اس لیے نصیب نہیں ہوا کہ لڑکی ذات ہو کر ان کو اتنا بھی خیال نہ آیا کہ ابھی بھائی نے ناشتہ نہیں کیا ہے وہ کھیل کود کر تھکا ہارا واپس آئے گا تو کیا کھائے گا خود ناشتہ کر کے بیٹھ رہیں۔“

امی جان نے کلمہ کی انگلی ہلا کر کہا: ”دیکھو کان کھول کر سن لو شریف بہو بیٹیوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مرد کے لیے چاہے وہ باپ ہو یا بھائی یا کوئی اور پہلے چیز نکال کر رکھ دی پھر خود کھائی آج تو میں نے کچھ نہیں کہا ہے مگر اب نہ ہو ایسی بدتمیزی۔ چلو گوندھو آٹا۔“

میں نے لگن میں آٹا لاکر لوٹا بھر پانی اس میں ڈال دیا اور نانی اماں ایک دم سے چیخیں۔ "چلو چھٹی ہوئی انھوں نے دلدل ہی بہا دی آٹے کی۔"

امی جان نے کہا: "بات یہ ہے کہ کبھی کسی کام میں ہاتھ جو نہیں ڈالا۔ بوا نصیبن ذرا یہ پانی نتھار کر ان صاحبزادی کو دو تاکہ یہ آٹا گوندھیں میں آج اپنے سامنے اس سے آٹا گندھوا کر رہوں گی۔"

بوا نصیبن نے لگن ذرا سی آڑی کر کے زائد پانی بہا کر اور تھوڑا سا آٹا اور اس آٹے میں ملا کر لگن میرے سامنے کھسکا دی اور میں نے دونوں ہاتھ اس آٹے میں لتھیڑ لیے اب مصیبت یہ تھی کہ آٹا ہاتھوں میں چپٹا جاتا ہے اور لگن آٹے سے چپٹی جاتی ہے جب بہت گوندھنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ جیسے میں آٹے کو نہیں بلکہ آٹا مجھے گوندھ رہا ہے۔ امی جان الگ بیٹھی باتیں سنا رہی ہیں۔

"بھلا یہ لڑکی ذات کے ڈھنگ ہیں اتنی بڑی ہو گئی اور اب تک آٹا تک گوندھنا نہیں آیا۔"

نانی اماں نے کہا: "اس کو کچھ شوق بھی نہیں ہے یہ پڑھ گئی ہے اصل میں انگریزوں میں نہیں تو لڑکیوں کے کھیل ہی ایسے ہوتے ہیں کہ کھیل ہی کھیل میں پکانا ریندھنا سب آجاتا ہے۔ میں نے تو آج تک دیکھا نہیں کبھی اسے ہنڈکلیا پکاتے۔"

امی جان نے کہا: "توبہ کیجیے وہ کبھی چولھے کا رخ ہی نہیں کرتی۔ ہزار مرتبہ کہا کہ اپنی گڑیا کی شادی کرو اور اس کا جہیز تیار کرو اسی بہانے سوئی پکڑنے اور سوئی میں دھاگہ ڈالنے کا ڈھنگ تو آجائے گا۔"

نانی اماں نے کہا: "نہیں اسے ان باتوں کا شوق ہی نہیں ہے۔ لو ذرا دیکھو آٹے کی کیا گت بنائی ہے۔"

امی جان نے لگن میرے سامنے سے اپنی طرف کھسکا کر کہا: "آٹا گوندھنے کے لیے تو معلوم ہوتا ہے جیسے ہاتھوں میں دم ہی نہیں ہے یوں چاہیے سارے زمانے میں ڈھنڈورے بجاتی پھریں صاحبزادی۔ دیکھو اچھی طرح سے یوں چلائے جاتے ہیں ہاتھ۔"

اور یہ کہہ کر امی جان نے الٹے سیدھے چند ہی ہاتھ مار کر نہ جانے کیسے آٹا گوندھ دیا۔ اور اب میرے سر پہ آفت روز کی لگ گئی کہ صبح ناشتہ کی پوریوں کے لیے مجھ ہی سے آٹا گندھوایا جاتا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے لیے میں ہی آٹا گوندھتی تھی رات کے کھانے کے لیے پھر بوا نصیبن کی شاگردی میں آٹا گوندھنا پڑتا تھا۔ آٹا گوندھنے کی اس مشق کے بعد بوا نصیبن نے پیڑے بنانا سکھائے۔ پھر ہاتھ سے روٹی بنانا اور روٹی کو دونوں ہاتھوں کی مدد سے چپاتی بنانا سکھایا۔ شروع شروع میں تو کبھی میں نے لنکا کا نقشہ بنا دیا تو کبھی روٹی کی شکل اچھی خاصی دوپلی ٹوپی کی بن کر رہ گئی مگر رفتہ رفتہ مجھ کو چپاتی توے تک پہنچانا آگئی مگر اب مصیبت یہ تھی کہ توے پر چپاتی ڈالنے کے بعد اس کو الٹوں کیسے۔ یہ کوشش جب کبھی کی انگلیاں توے سے لگ کر جل گئیں۔ ایک طرف تو یہ تکلیف دوسری طرف خدا سمجھے ان بوا نصیبن سے ایسے کڑے تیوروں سے بات کرتی تھیں کہ جی چاہتا تھا کہ یہی جلتا ہوا توا اس چڑیل کے منہ پر مار کر باورچی خانہ سے نکل جاؤں مگر بوا نصیبن کو خدا نے یہ موقع دیا تھا کہ وہ مجھ سے اگلا پچھلا سارا حساب چکا لیں اس لیے ان کی باتیں بھی سننا اور سہنا پڑتی تھیں۔

ہائے کیسا رشک آتا تھا فرخ کو دیکھ کر جو شام کو اپنی ہاکی اسٹک لیے کھیل کود کر گھر میں آتا تھا اور پھر پنکھے کے نیچے بیٹھ کر سب سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتا تھا۔ کبھی کیرم کھیلتا۔ کبھی بگیٹیبل اور کبھی امی جان سے اجازت لیکر سینما چلا جاتا تھا اور

ایک میں تھی کہ اسی وقت اس قیامت کی گرمی میں چولھے کے سامنے بیٹھی جھلسا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ کہیں میرے منہ سے بھی نکل گیا تھا کہ امی جان میں بھی سینما دیکھوں گی۔ بس کچھ نہ پوچھیے سارا گھر ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا تھا کہ اس نے آخر یہ بات کہی کیسے۔ امی جان باتیں سنا چکیں تو نانی اماں نے خبر لینا شروع کی وہ تھک گئیں تو پھر امی جان شروع ہو گئیں۔ وہ تو کہیے کہ اسی وقت کہیں ابا جان کو اللہ میاں نے رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیج دیا اور جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ میں نے سینما جانے کے لیے کہا تھا تو وہ بجائے خفا ہونے کے کہنے لگے کہ "میں خود لے کر جاؤں گا اپنی بیٹی کو۔" اور اس کے بعد پھر ان میں اور امی جان میں لڑائی شروع ہوئی ہے تو سچ مچ مجھ کو رونا آ گیا کہ یہ سب کچھ مجھ کمبخت ہی کی وجہ سے ہوا ہے۔ بات بڑھتے بڑھتے کچھ یہاں تک بڑھ گئی کہ ابا جان نے امی جان سے کہہ دیا کہ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ لڑکیوں کو لونڈیوں کی طرح رکھا جائے۔ اور امی جان نے اس کے جواب میں ان سے کہہ دیا کہ زندگی بھر بیٹی کو گھٹنے سے لگائے بیٹھے رہنا۔ اسی لاڈ پیار نے تو لونڈیا کا ناس مار کر رکھ دیا ہے یہ عمر ہونے کو آئی اور نہ صاحبزادی کو ٹانکہ بھرنا آیا نہ ہانڈی میں نمک ڈالنا۔" ابا جان کے منہ سے نکل گیا کہ میں نے دیکھی ہیں تمہاری بہنوں کی لڑکیاں بھی جن کو بیگم بننے کی نہیں بلکہ کنیز بننے کی تربیت دی جا رہی ہے۔ اس بات پر امی جان نے بھی میری تمام پھوپھی زاد اور چچا زاد بہنوں پر ایسے نام دھرے کہ ابا جان غصے میں تاؤ کھاتے باہر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد نانی اماں نے سارا غصہ مجھ پر اتارا۔

"اب تو کلیجہ میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ اماں باوا میں پھوٹ ڈلوا کر جی خوش ہو گیا۔ گھر بیٹھے سینما دیکھ لیا۔"

امی جان نے کہا "ایک مرتبہ نہیں ہزار مرتبہ وہ غصہ کریں مگر میں ان صاحبزادی کو دفن کر دوں گی اگر یہ اپنے چچاؤں کی لڑکیوں کے ڈھنگ پر گئیں یا ان کی نقل کرنے کی کوشش کی۔ ان کا کیا ہے وہ تو لڑکیوں کو لڑکوں کی اٹھان اٹھا رہے ہیں سائیکل ان کی لڑکیاں چلائیں۔ گیند بلا ان کی لڑکیاں کھیلیں۔ رستیاں تان تان کر وہ پھاندیں۔ دوڑ ایسی لگائیں کہ جیسے سچ مچ کی گھوڑیاں۔ مگر میرے یہاں یہ نہ ہوگا۔"

اس تمام آفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں بھوکی پیاسی رو رو کر اپنی جان دیتی رہی اور اسی طرح سو گئی۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ ابا جان نے بھی فاقہ کیا اور امی جان نے بھی نانی اماں کا البتہ دل گھٹ رہا تھا اس لیے دو چار نوالے کھا کر انھوں نے پانی پی لیا تھا۔

میری شامت کہ اسی دن میرے چچا کی لڑکیاں نوشابہ اور رخسانہ بھی آ گئیں۔ سچ پوچھیے تو مجھے ان کے سامنے بڑی شرم آئی کہ میں بدالنصیبن کی ماتحتی میں بیٹھی چولھا پھونک رہی تھی اور یہ دونوں مس بابا بنی اعلیٰ درجے کے کپڑے پہنے بنی سنوری آئی تھیں مجھے دیکھ کر ان دونوں نے ہنسنا شروع کر دیا نوشابہ نے کہا:

"اوہ محمودہ یہ تم کو کیا ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم کو محمودہ بوا کہنا چاہیے۔"

رخسانہ نے کہا "چھوڑو یہ چولھا ہانڈی چلو تم کو اپنے اسکول لے چلیں وہاں آج فینسی فیر ہے۔"

نوشابہ نے کہا "میرے خیال میں ان کو اسی طرح لے چلیں۔ فینسی فیر تو ہے ہی کہہ دینگے کہ یہ ماما بن کر آئی ہیں۔"

یہ دونوں اسی قسم کی باتیں بنا رہی تھیں کہ امی جان نے آ کر کہا "جلدی کرو آٹا گوندھ کر روٹی ڈالو اس کے بعد کام

کالج سے فارغ ہو کر ان سے باتیں کرنا۔"

نوشابہ نے امّی جان سے کہا "چچی جان ہم ان کو اپنے اسکول لے جانے کے لیے آئے ہیں وہاں فینسی فیر ہے۔"

امّی جان نے تیوری پر بل ڈال کر کہا "جی نہیں یہ کھیل تماشے آپ ہی کو مبارک رہیں۔ میرے یہاں لڑکی ذات کو یہ آزادیاں نہیں دی جاتیں۔"

رخسانہ نے تعجب سے کہا "اس میں آزادی کی کیا بات ہے چچی جان وہاں تو سب ہی لڑکیاں آئینگی استانیاں بھی ہونگی۔"

نانی اماں نے کہا "تو تم جاؤ نا تم کو کس نے منع کیا ہے محمودہ کو ابھی گھر کے پچاسوں کام کرنا ہیں۔"

نوشابہ نے کہا "کام کرنے کے لیے آپ کے یہاں نوکر بھی تو ہیں۔"

امّی جان نے کہا "یہ ہمارے یہاں گھرداری نوکروں کو نہیں لڑکیوں کو سکھائی جاتی ہے جن کو کل اپنے گھر کی ہو کر گھر چلانا پڑتا ہے۔"

نانی اماں نے قطعی فیصلہ کر دیا "کہہ جو دیا ایک مرتبہ کہ وہ نہیں جا سکتی۔"

نانی اماں کے خراٹوں سے آنکھ کھلی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ؎

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

جی میں آیا اٹھ کر آئینہ کے سامنے جائیں اور دیکھیں تو سہی کہ کہیں سچ مچ ہمارے سر پر سینگ تو نہیں نکل آئے۔ مگر پھر سہم کر اس خیال سے کروٹ بدلنے پر مجبور ہوئے کہ کہیں شرمندہ ہو کر یہ نہ کہنا پڑے کہ ؎

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے

واقعہ یہ ہے کہ ہم، ہم ہیں اور وہ، وہ! آخر لاحول پڑھ کر ہم اس کلمہ کی گردان کرتے ہوئے دل سے سمجھوتہ کر کے سو گئے ؎

عورت کے خدا کتنے ہیں، مردوں کا خدا ایک

(غیر مطبوعہ)

(قاضی جی)

قائدِ اعظم میموریل فنڈ

(قاضی جی تشریف لاتے ہیں)

قاضی جی :- ارے بھئی میں نے کہا سنتی ہو۔ عجیب خدا کی رحمت ہے اس گھر پر کہ گھر والی کام کے وقت ہمیشہ غائب رہتی ہیں اب کبھی جو پتہ چلے۔ ارے صاحب کہاں ہیں آپ للہ جواب دے دیجئے۔

بیوی :- توبہ ہے! منہ کے سامنے بیٹھی ہوں اور چیخ رہے ہیں۔

قاضی جی :- کیا خوب یہ گویا آپ تشریف فرما ہیں۔ اس طرح دھوپ سے منہ چھپا کر بیٹھی ہو کہ میں سمجھا کسی نے بستر وستر دھوپ کھانے کے لیے رکھ دئے ہیں۔ بہر حال میں یہ کہنے کو بلا رہا تھا کہ میرے ایک بہت پرانے دوست جن کے متعلق میں سمجھا تھا کہ واصل بحق ہو چکے ہوں گے اتفاق سے آگئے ہیں۔ ارے بھئی تم جانتی ہو گی ان کو بھلا سا نام ہے ان کا زبان پر نہیں آرہا ہے۔ لاحول ولاقوۃ! یعنی ابھی مل کر آیا ہوں اور آتے آتے نام ذہن سے نکل گیا۔ ارے بھئی وہی جو بڑے اچھے شاعر بھی ہیں۔ مشاعرے اکثر کیا کرتے تھے۔

بیوی :- انجم صاحب تو نہیں؟

قاضی جی :- انجم۔ لاحول ولاقوۃ! اس کا تو میرے سامنے نام بھی نہ لو۔ خود غرض۔ دوست مار۔ ابن الوقت۔ ایسے مطلبی دوست تو خدا دشمن کو بھی نہ دے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان ہی حضرت کی وجہ سے آج میں بازار کا دودھ، دہی گھی وغیرہ استعمال کرتا ہوں۔ میری بھینس کو گم کرانے میں ان ہی بزرگ کا ہاتھ تھا۔

بیوی :- توبہ ہے اب وہ بھینس یاد آگئی موئی دس برس کی بات۔

قاضی جی :- دس برس کی بات ہو یا سو برس کی جو بات دل میں رہ جاتی ہے وہ گرہ بن جاتی ہے۔ ارے بھئی آپ پولیس میں تھے۔ اپنے ہر وقت کے ساتھی تھے۔ اگر ذرا بھینس کو ڈھنڈوا دیتے تو کونسی بڑی بات تھی مگر اس بندۂ خدا کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ ارے بھئی سنو۔ ذرا میں یہ شلوکا اتار دوں تم دھوپ میں تو بیٹھی ہی ہو ذرا دیکھو کم بخت کوئی جوں وغیرہ تو نہیں ہے۔ رات بھر کھجلی رہتی ہے۔

زبیدہ :- جوں وہ دن نوج ہو۔ خشکی آپ کے بہت ہے۔

بیوی :- خشکی کے علاوہ ذرا یہ تو پوچھو کہ نہائے ہوئے کتنے دن ہوئے ہیں۔ اے میں پوچھتی ہوں کیا سچ مچ تمہارا نہانے کو جی نہیں چاہتا۔

قاضی جی :- اب تھوڑی دیر میں آپ یہ پوچھیں گی کہ تمہارا مرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ذرا اس سردی کو ملاحظہ فرمایئے اور اس نہانے کی فرمائش کو دیکھیے۔ اس موسم میں پانی کا نام سن کر تمام جسم میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔ مصنوعی دانت تک کم بخت جلترنگ بجانا شروع کر دیتے ہیں۔ کیا خوب آپ کو دیکھیے گا تشریف لا رہے ہیں سراج میاں تولیہ سے بال خشک کرتے ہوئے۔ یہ حضرت تو مجھ کو کچھ دریائی جانور نظر آتے ہیں۔ اماں کیا واقعی نہا کر آ رہے ہو؟

بیوی :- وہ روز نہاتے ہیں۔

سراج :- بھائی صاحب میں تو اگر کسی دن غسل نہ کروں تو ——

قاضی جی :- لاحول ولا قوۃ! ہزار مرتبہ کہا کہ غسل نہ کہا کرو یہ سخت بدشگونی ہے۔ زبان کی غلطی کرنے کے علاوہ اپنے کو تم کوس بھی رہے ہو۔ برادرم! تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ غسل عموماً میت کو دیا جاتا ہے جس کو غسلِ میت کہتے ہیں۔ زندہ آدمی حمام کرتا ہے۔ نہاتا ہے۔ میں تو نہانے کے کمرے کو غسل خانہ نہیں کہتا اسی ڈر سے۔

سراج :- بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میں تو اگر کسی دن حمام نہ کروں تو طبیعت نہایت بجھی بجھی سی رہتی ہے۔

قاضی جی :- اور میرا یہ عالم ہے کہ اس موسم میں نہانے کا نام سن کر میری شمعِ زندگی بجھنے کی کوشش میں جھلملانا شروع کر دیتی ہے۔ دیکھیے آپ نے بجھی بجھی طبیعت کہا تھا تو میں نے اسی رعایت سے کیسی شاعرانہ بات عرض کی ہے۔ ارے بھئی ہاں وہ جو میرے شاعر دوست آئے ہیں ان کا ذکر پھر رہ گیا۔ صاحب وہ میرے نہایت عزیز دوست ہیں۔ ہاں ٹھیک ہے نام بھی تو عزیز ہی ہے۔

سراج :- کون عزیز؟ وہ عزیز الحسن عزیزؔ تو نہیں جن کے دیوان کا نام ہے کسبِ کمال!

قاضی جی :- جی ہاں! یہ نام میں ہی نے تو رکھا تھا ان کے دیوان کا اور رعایت یہ تھی کہ ع کسبِ کمال کن کہ عزیزِ جہاں شوی۔ صاحب بڑا خوش فکر شاعر ہے اور گرہ تو ایسی لگاتا ہے کہ کھولے نہ کھلے۔ بہرحال آج ان کی آمد کے سلسلہ میں ایک مشاعرہ ہے مجھ کو بھی جانا ہے۔ اس کی غزل الگ کہنا ہے اور میں ان سے یہ کہنے آیا تھا کہ پرسوں ترسوں ہم کیوں نہ کر ڈالیں ایک مشاعرہ۔

بیوی :- میرے یہاں اب مشاعرہ وشاعرہ نہیں ہو سکتا۔ لو اور سنو میں روزمرہ کے اخراجات گھٹا رہی ہوں وہ آئے مشاعرہ کرنے۔

قاضی جی :- اخراجات ہی کی وجہ سے تو تم سے پوچھنے کی ضرورت پیش آئی ورنہ کوئی تم سے غزل تھوڑی کہلوانا تھی مجھ کو۔ آپ نے جھٹ کہہ دیا کہ مشاعرہ وشاعرہ نہیں ہو سکتا۔ اتنا بڑا میرا دوست، مدت کے بعد ملا ہے۔ میں تو واقعی یہ سمجھا تھا کہ بیچارہ چل بسا ہو گا مگر وہ زندہ سلامت آملا۔ دوسرے مشاعرے میں خرچ ہی کیا ہوتا ہے۔ پان، سگرٹ، چاء —— اور دری، چاندنی، قالین وغیرہ سب میر صاحب کے یہاں سے آجائیں گے۔ شہرت کی شہرت اور تواضع کی تواضع۔

بیوی :- وہ تو ٹھیک ہے مگر میں طے کر چکی ہوں کہ اس وقت جتنے اخراجات ہیں سب میں کمی کر کے قائدِ اعظم میموریل فنڈ میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ مجھ سے دیا جائے گا وہ میں دوں گی۔

قاضی جی :- قائدِ اعظم کا کونسا فنڈ کہا تم نے؟ اللہ مجھ سے انگریزی نہ بولا کرو۔ معلوم ہے کہ میں نہ گریجویٹ ہوں نہ ایف۔ اے، بی۔ اے

مگر بیگم صاحبہ ہیں کہ اپنی انگریزی دانی کی وجہ سے زندگی اجیرن کیے ہوئے ہیں۔

زبیدہ :۔ بھائی جان! انھوں نے کہا ہے قائدِ اعظم میموریل فنڈ یعنی ——

قاضی جی :۔ بھئی تم چپ رہو۔ میں تم سے نہیں پوچھ رہا ہوں۔ ایک گریجویٹ چپ ہو بیٹھیں تو دوسری ایل۔ ایل ڈی چلیں ان کا ترجمہ کرنے۔ آپ بتائیے سراج میاں یہ کیا بات ہے۔ بات یہ ہے کہ جہاں قائدِ اعظم کا نام آجاتا ہے وہاں میرا سر عزت کے ساتھ جھک جاتا ہے اور میں اس نام کے آنے کے بعد پھر اپنے دل کو قابو میں نہیں لا سکتا مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھ کو قائدِ اعظم کے نام سے دھوکے دیے جائیں۔

سراج :۔ الحمد للہ کہ آپ کے دل میں ہمارے محسنِ اعظم اور پاکستان کے معمار کا اتنا احترام موجود ہے۔ بات یہ ہے بھائی جان کہ ۲۵ دسمبر ہمارے محبوب قائدِ اعظم کی پیدائش کا دن ہے اور اسی دن سے ہمارے گورنر جنرل ہز ایکسیلنسی الحاج خواجہ ناظم الدین قائدِ اعظم میموریل فنڈ کا افتتاح فرما رہے ہیں۔

قاضی جی :۔ بابا یہ کوئی نہایت اہم بات ہے۔ للہ انگریزی نہ بولو مجھ کو سمجھ لینے دو کہ یہ ہے کیا۔

سراج :۔ میں عرض تو کر رہا ہوں بھائی جان کہ میموریل فنڈ کا مطلب یہ ہے کہ ایسا چندہ جس سے یادگار قائم ہو سکے حضرتِ قائدِ اعظمؒ کے احسانات قوم کبھی نہیں بھول سکتی۔

بیوی :۔ غلامی سے نجات دلانے والے کو کون بھول سکتا ہے۔

زبیدہ :۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے بانی کو تاریخ کبھی نہیں بھول سکتی۔

قاضی جی :۔ صاحب آپ دونوں کی قابلیت کے سامنے میں سر جھکاتا ہوں۔ آپ کی قابلیت مسلّم۔ آپ کی باخبری تسلیم مگر ہاتھ جوڑتا ہوں کہ مجھ کو بھی ذرا سمجھ لینے دیجئے کہ یہ واقعہ کیا ہے میں اس وقت نہایت سنجیدگی سے اس بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

بیوی :۔ سمجھنا ہی کیا ہے۔ بس کہہ تو دیا کہ قائدِ اعظم کی یادگار ان کی احسانمند قوم کو ایسی بنانا چاہئے جو ان کے شایانِ شان ہو اور اس یادگار میں قوم کے ہر فرد کا بڑے سے بڑا حصّہ ہونا چاہئے۔ یہ طے ہو چکا ہے کہ تین کروڑ روپیہ جمع کیا جائے جس میں ایک عالی شان مقبرہ تعمیر ہو ایک جامع مسجد، ایک دارالعلوم اور ایک ٹیکنیکل درسگاہ۔

قاضی جی :۔ فرما چکیں آپ؛ اچھا بھائی سراج میاں آپ فرمائیے کیا کہہ رہے تھے؟

سراج :۔ بس میں یہی عرض کر رہا تھا کہ ۲۵ دسمبر سے یہ فنڈ کھولا جا رہا ہے اور ضرورت اس کی ہے کہ ہم سب مل کر قائدِ اعظم کے اس احسانِ عظیم کو یاد کریں جو قیامِ پاکستان کی صورت میں ملتِ اسلامیہ پر عموماً اور اس برِ عظیم کے مسلمانوں پر خصوصاً قائدِ اعظم نے فرمایا ہے۔

قاضی جی :۔ کس کو انکار ہو سکتا ہے اس سے اور کون قائدِ اعظم کی یادگار قائم کرنے کی مہم میں زیادہ سے زیادہ حصّہ لینا چاہے گا۔ یہ تو سخت احسان فراموشی ہوگی اگر اس وقت بھی ہم اپنی غیر ضروری اور فضول خرچیوں پر اس فنڈ کو ترجیح نہ دیں۔

بیوی :۔ یا اللہ تیرا ہزار ہزار شکر ہے کہ آج تو ایک بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ آج میں نذر اتاروں گی۔

قاضی جی :۔ یہ تو جناب آپ کی زبردستی ہے کہ آپ نے مجھ کو ایک سرے سے بالکل ہی نا سمجھ طے کر رکھا ہے۔ جذبات معقول ہوگی

اس کا میں ضرور قائل ہو جاؤں گا البتہ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ لوگ مجھ پر خواہ مخواہ کی قابلیت کا سکہ جمائیں اور میں آپ کی ہر الٹی سیدھی بات کا قائل ہو جاؤں۔ قائداعظم کی یادگار قائم کرنے کے لیے تو تم اگر کہو تو میں اپنا پیٹ کاٹ کر جو کچھ مجھ سے ہو سکے وہ دوں۔

زبیدہ :۔ خیر پیٹ کاٹنے یا تکلیف اٹھانے کو کوئی نہیں کہتا ضرورت ہے صرف اس احساس کی کہ ——

قاضی جی :۔ بس ان ہی باتوں سے آگ لگتی ہے کہ اب آپ چلی ہیں احساس اور اس کی ضرورت کا مجھ کو سبق پڑھانے۔ یعنی میں سچ کہتا ہوں کہ یہ صاحبزادی جو اتنے بڑے بڑے الفاظ بولتی ہیں مثلاً احساس وغیرہ، ان کا عقیقہ تک مجھ کو یاد ہے جس میں ایک بکرا ذبح ہوا تھا۔ ارے بھئی یہ تو میں پوچھنا ہی بھول گیا تھا کہ یہ آج کل گوشت کتنا واہیات آ رہا ہے۔ رات کو کم سے کم میری ہی عمر کا بکرا ہو گا جس کا گوشت کھانے کو ملا ہے۔

بیوی :۔ واقعی رات کا گوشت اچھا نہ تھا مگر تعجب ہے کہ تم پہچان گئے۔

قاضی جی :۔ لیجئے اور سنئے۔ اب گویا میں ایسا گیا گزرا ہوا کہ گوشت کی اچھائی برائی بھی سمجھ میں نہیں آ سکتی میرے۔ بیگم صاحبہ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں اس نفیس الطبع خاندان سے ہوں جس کے لوگ قورمہ کا مزا چکھ کر بکرے کا رنگ تک بتا دیا کرتے تھے۔

زبیدہ :۔ ہائے میرے اللہ! آپ بھی جب بات کرنے پہ آتے ہیں تو جو جی میں آتا ہے کہتے ہی چلے جاتے ہیں۔

بیوی :۔ اور حال یہ ہے کہ ہزار مرتبہ شلجم اور گولر وغیرہ کے کباب بنا کر ان کو کھلا چکی ہوں اور یہ دھوکہ کھا چکے ہیں ان پر گوشت کا۔

قاضی جی :۔ دھوکہ تو خیر میں نے بڑے بڑے رکابداروں سے نہیں کھایا۔ یہ اور بات ہے کہ تمہاری حوصلہ افزائی کے لیے جان بوجھ کر انجان بن گیا ہوں۔ دوسرے یہ واقعہ ہے کہ ترکاریوں کے کباب بنانے میں تم کو ملکہ حاصل ہے۔ سراج میاں! ہماری بیوی کو یہ کمال ضرور حاصل ہے کہ ان کے پکائے ہوئے کھانے میں جو چیز یہ پکاتی ہیں اس کا مزا کبھی نہیں آتا۔ گوشت پکائیں گی تو ترکاری کا مزا آئے گا، ترکاری پکائیں گی تو گوشت کا دھوکہ ہو گا۔ اس روز فیرنی پکائی تھی تو میں سمجھا کہ وہ چٹوں میں کلپ دینے والی تھیں کہ اس میں شکر گر پڑی۔

سراج :۔ کہیں بھی نہیں بھائی جان! فیرنی تو وہ نہایت نفیس تھی۔

بیوی :۔ اس وقت کیسا جھوم جھوم کر چٹخارے لے لے کر کھا رہے تھے اور اب وہ فیرنی کلپ ہو گئی۔

قاضی جی :۔ افسوس تو یہ ہے سراج میاں کہ آپ نے فیرنی کبھی کھائی نہیں۔ بس اسی قسم کی کھائی ہے جیسی انہوں نے پکائی تھی اس دن، ورنہ فیرنی پکاتا تھا اچھو رکابدار جو دادا جان کا خاصہ تیار کرتا تھا۔ شرط یہ تھی کہ ایک ہفتہ قبل اس سے کہہ دیا جائے کہ فیرنی کھانا ہے۔ بس جناب اسی دن سے وہ بھینس کو اپنے کمرے میں پکڑ کر باندھ لیتا تھا۔

بیوی :۔ بھینس کو؟

قاضی جی :۔ جی ہاں! بھینس کو باندھ لیتا تھا اپنے کمرے میں اور ہفتہ بھر تک اس کو زعفران اور مشک و عنبر کھلاتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ تیسرے چوتھے دن کے بعد سے وہ زرد رنگ کا نہایت معطر دودھ دینا شروع کر دیتی تھی اور اس کا کھویا بنتا رہتا تھا۔

بیوی :۔ پھر تم کہو گے کہ میں جھوٹ سمجھ رہی ہوں ان باتوں کو۔

سراج :- جھوٹ نہیں آپا! ان ہی باتوں کے پیچھے تو ہم لوگ اتنے دنوں تک غلامی کو پالا پوسا کیے ہیں۔

زبیدہ :- اللہ کا شکر کہ وہ زمانہ گیا۔

قاضی جی :- کیا کہتی چلی جا رہی ہو۔ یہاں یہ عالم کہ نگاہیں ڈھونڈھتی ہیں اس زمانے کو اور بہن صاحبہ ادا کر رہی ہیں شکر خدا کا۔ ارے اب وہ زمانہ کہاں آسکتا ہے۔

بیوی :- اور نہ خدا کرے آئے۔ ہم کو نہیں چاہیئے وہ زمانہ۔ اب ہم اپنا زمانہ خود بنا رہے ہیں۔

قاضی جی :- خیر خیر! بات سنو بیوی، تو سراج میاں! اس وقت کی فیرنی کا مزا آج تک نہیں بھولے ہیں۔ ایک مرتبہ دادا جان نے ایک مخصوص مشاعرہ کیا تھا۔ ہاں بھئی تو میں نے کہا سنتی ہو وہ مشاعرے کی بات تو رہ ہی گئی۔

زبیدہ :- میں بتاؤں بھائی جان! وہ مشاعرہ آپ اس فنڈ ہی کے لیے کیوں نہ کریں؟

سراج :- بات تو معقول ہے۔

بیوی :- توبہ کرو۔ یہ بھلا ان کے بس کا روگ ہے۔ ان میں بھلا اتنی عقل کہاں؟

قاضی جی :- ارے صاحب! اللہ مجھ کو سمجھ تو لینے دو کہ فنڈ میں مشاعرہ کیسے دے سکتا ہوں۔ یہ بات تو سمجھا دو مجھ کو۔ میری عقل کا ماتم بعد میں کرنا مگر مجھے عقل سے کام لینے کا موقع تو دو۔ سراج میاں یہ بات کیا ہے۔ اس تجویز کو سمجھائیے تو ذرا مشاعرے کا فنڈ۔ فنڈ کا مشاعرہ۔

سراج :- بات یہ ہے بھائی جان کہ قائدِ اعظم میموریل فنڈ میں جن جن صورتوں سے روپیہ دیا جا سکے دیا جائے۔ اب چونکہ آپ کے یہ دوست آئے ہوئے ہیں آپ مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں تو اس میں ٹکٹ لگا دیجئے اور مشاعرہ کا انتظام ذرا دھوم دھام سے کیجئے تاکہ ٹکٹ زیادہ سے زیادہ بکیں۔

قاضی جی :- اور جو آمدنی ہو وہ فنڈ میں دے دی جائے۔ بھئی کیا لاجواب ترکیب ہے یعنی آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔ تو اس میں مشکل ہی کیا ہے۔ اب میں ایسا بھی نکما نہیں ہوں کہ اتنا سا انتظام نہ کر سکوں۔ شہناز کی شادی کا سارا انتظام میں نے کیا تھا۔

بیوی :- جی ہاں! جس کے بدولت برات واپس گئی تھی۔

قاضی جی :- وہ خیر دوسری بات پر جھگڑا ہوا تھا۔ کھانے میں دیر تھی۔ بھوک پر غصہ آ رہا تھا وہ اتر آئے مہر کے سوال پر۔ اس میں میرے انتظام کی کیا گڑبڑ۔

بیوی :- خیر میں نے کہہ دیا ہے کہ اتنا بڑا مشاعرہ تم نہیں کر سکتے۔

سراج :- اگر بھائی جان دخل نہ دیں تو انتظام میں کر دوں گا۔

قاضی جی :- یہ تو عجیب شرط ہے کہ میں دخل نہ دوں۔ یعنی میں شاعر اور مشاعرہ میرا خاص میدان آپ اس کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔

سراج :- بس آپ شاعروں کو جمع کیجئے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ٹکٹ وغیرہ اور سننے والوں کے معاملات میں آپ دخل نہ دیں۔

قاضی جی :- چلئے منظور! مصرعِ طرح پہلے طے کر دو، پھر صدر مشاعرہ طے کرو۔

زبیدہ :- صدر ان ہی کو بنا دیجئے نا عزیز صاحب کو۔

قاضی جی:- پھر بولیں تم - چڑی مار کی سی تو ان کی شکل ہے وہ صدارت کیا کریں گے۔ ان سے اچھا تو میں صدر رہوں گا۔

بیوی :- خود ہی مشاعرہ کریں گے اور خود ہی صدر بن بیٹھیں گے۔

قاضی جی:- صاحب یہی موقعے ہوتے ہیں عزت حاصل کرنے کے مگر آپ لوگ تو یہ چاہتے ہی نہیں کہ میری عزت افزائی ہو۔

سراج :- خیر یہ باتیں تو طے ہو جائیں گی اگر واقعی یہ طے ہو جائے تو مشاعرے کے لیے ایک کمیٹی بنا کر مشورے کر لیے جائیں۔

بیوی :- سراج بھائی! خدا کے لیے یہ جھگڑا آپ مول نہ لیں مجھ کو ان سے ڈر ہی لگتا ہے کہ خدا جانے یہ کیا کر بیٹھیں۔

قاضی جی:- کر بیٹھوں گا مشاعرہ اور کیا کروں گا۔ سراج میاں یہ باتیں عورتوں میں بیٹھ کر طے نہیں ہو سکتیں آپ میرے ساتھ باہر چلیں تاکہ سر جوڑ کر ذرا مشورہ کر لیں۔ تم ذرا پان بھیج دو باہر —— اور ہاں! میں نے کہا حقہ بھی۔

(قاضی جی)

گداگری

(قاضی جی نجمہ کو لے کر داخل ہوتے ہیں)

قاضی جی :- آؤ۔ شاباش! آجاؤ تم سے کون پردہ کرتا ہے۔ ارے بھئی ایک تو تم بچہ ہو ابھی دوسرے تم تو لڑکی ہو۔ لڑکیوں سے تھوڑی کوئی پردہ کرتا ہے۔ لڑکیاں تو خود پردہ کرنے لگتی ہیں۔ سلام کرو ان کو، یہ چچی ہیں تمہاری۔ اے چچی! چچی ہوتیں نا تم اس کی۔ ارے بھئی میں چچا ہوں تو میرے رشتے سے تم چچی ہی ہو سکتی ہو زیادہ سے زیادہ۔ سلام کرو بیٹی ان کو، اور ان کو بھی! یہ پھوپی ہیں تمہاری۔

نجمہ :- تسلیم! تسلیم!

بیوی :- جیتی رہو۔

زبیدہ :- کس کی بچی ہے یہ بھائی جان؟

قاضی جی :- ارے بھئی چھٹن خاں کی لڑکی ہے۔ نجمہ اس کا نام ہے۔ آج ان کے باوا کو ہوش آیا تو کہنے لگے کہ قاضی جی! دن بھر لونڈیا ہڑانگے مارتی ہے نہ پڑھنے کی نہ لکھنے کی۔ اگر آپ کے یہاں چلی جایا کرے تو گھر میں سب ہی پڑھے لکھے ہیں، جس کو بھی چھٹی ہوگی دو حرف پڑھا دے گا اور شاید گھرداری کے بھی ڈھنگ آجائیں۔ چنانچہ میں ساتھ لیتا آیا۔

بیوی :- لڑکی تو صورت سے بھولی بھالی نظر آتی ہے۔ کیا پڑھتی ہو بیٹیا تم؟

نجمہ :- الف سے انڈا، بے سے بکری، تے سے تتلی۔

قاضی جی :- ہائیں ہائیں ہائیں۔ تے سے تربوز یا تتلی۔ کہاں ہے کتاب تمہاری؟

بیوی :- تے سے تتلی ٹھیک تو کہہ رہی ہے۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو بی بی! شاباش۔ اپنی کتاب لائی ہو نا؟

نجمہ :- یہ کیا ہے کتاب اور یہ تختی ہے۔

قاضی جی :- اچھا ادھر بیٹھو تم میری طرف منہ کر کے۔ نکالو کتاب۔ یہ۔ یہ۔ رکھو انگلی اس پر، پڑھو اس کو۔ دیکھو میں پڑھتا ہوں پہلے، غور سے سنو۔ الف سے انڈا، بے سے بکری، تے سے تتلی۔ مگر مجھ کو خوب اچھی طرح یاد ہے کہ جو قاعدہ میں نے پڑھا تھا اس میں تے سے تربوز تھا۔ اچھا خیر! تے سے بہت سی چیزیں ہو سکتی ہیں۔ ذرا بتاؤ تو نجمہ! تم کو یہاں کون کون سی چیزیں تے سے نظر آ رہی ہیں؟

بتاؤ۔ شاباش!

نجمہ :- تے سے تخت تے سے یہ تصویر اور۔ اور۔ تے سے یہ تکیہ۔

زبیدہ :- واہ وا۔ بڑی اچھی لڑکی ہے یہ تو۔ شاباش شاباش!

قاضی جی :- واہ بھئی واہ! اور تے سے طوطا بھول گئیں —؟

بیوی :- لو اور سنو طوطا تے سے ہو گیا۔

قاضی جی :- اور نہیں تو کیا الف سے ہوتا ہے طوطا۔ مگر ایں؟ ہاں ٹھیک ہے طوطا تو شاید طوئے سے ہوتا ہے۔ ارے صاحب ذرا غور تو کیجئے یہ چیزیں پڑھے ہوئے گویا ایک عمر ہو گئی۔ یعنی بس بچپن میں یہ کتاب پڑھی تھی اس کے بعد سے کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا۔

بیوی :- بس تو پھر پڑھا چکے تم اور پڑھ چکی یہ غریب۔

قاضی جی :- جی بجا ارشاد ہوا حضور والا! میں اس کو لایا ہی اس لیے ہوں کہ یک کرشمہ دو کار والا مضمون ہو گا۔ یہ بھی پڑھے گی اور اسی بہانے میرا مطالعہ بھی گویا وسیع ہو جائے گا۔ بچوں کو پڑھانے سے خود اپنا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بھولی بسری چیزیں یاد آ جاتی ہیں اور جو کچھ پڑھ چکے ہیں وہ ایک مرتبہ پھر تازہ ہو جاتا ہے۔

(دروازے پر دستک کے ساتھ جمیل کی آواز)

جمیل :- جناب قاضی صاحب!

قاضی جی :- آگے بڑھو بھائی برکت ہے۔

بیوی :- ارے ارے جمیل بھائی ہیں۔

قاضی جی :- ایں جمیل میاں۔ ارے بھئی جمیل میاں آؤ نا۔ استغفراللہ۔ آج صبح سے اتنے فقیر آئے ہیں کہ ہر آواز فقیرانہ صدا معلوم ہوتی ہے۔

جمیل :- (آتے ہوئے) میں تو یہ کہہ کر واپس جانے والا تھا کہ ع فقیرانہ آئے صدا کر چلے

قاضی جی :- ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا۔ مگر نہیں۔ یہ تو۔ یہ تو شاید اس کا مصرع ہے کہ' اور درویش کی صدا کیا ہے۔ اس کا مصرع کیا ہے بھلا فقیرانہ آئے صدا کر چلے۔ کچھ ہے ضرور دوسرا مصرع اس کا۔

جمیل :- جی ہاں! وہ شعر یہ ہے ؎ فقیرانہ آئے صدا کر چلے   میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے۔ آپ نے جب کہا کہ برکت ہے آگے بڑھو تو میں یہی کہہ کر جانے ہی والا تھا۔

قاضی جی :- مگر بھئی یہ قصہ کیا ہے آخر یا تو وہ زور شور تھا فقیروں کی روک تھام اور گداگری کے خاتمہ کا یا پھر وہی رنگ نظر آ رہا ہے یعنی صبح سے چھ سات تو میرا ہی ناطقہ بند کر چکے ہیں بلکہ صاحب اب تو مصیبت یہ ہے کہ یہ لوگ غالباً ڈر کے مارے قرض کے تقاضے کے طور پر تو بھیک مانگتے ہیں۔ کچھ عجیب رازداری کے ساتھ سوال کرتے ہیں مثلاً صبح ایک بزرگ نے دستک دی۔ میں نے پوچھا کون ہے تو ارشاد ہوا باہر تشریف لے آئیے۔ میں نے باہر جا کر ان کو سلام کیا۔ ہاتھ ملایا اور تشریف آوری کا مقصد پوچھا تو بولے کہ میں مہاجرین ہوں۔

زبیدہ :- (ہنس کر) مہاجرین کی بھی ایک ہی رہی۔

قاضی جی :- جی ہاں! یہ جتنے مانگنے والے تھے ان کو اپنے لیے یہ عجیب و غریب نام مل گیا ہے اور لطیفہ یہ کہ مہاجر بھی نہیں مہاجرین۔ ارے بھئی مہاجرین تو جمع ہے نا مہاجر کی، مگر خیر املا کی اس غلطی کو وہ کیا سمجھ سکتے ہیں۔ املا کی نہیں بلکہ — بلکہ قواعد کی غلطی کو۔ تو خیر بہرحال ان صاحب نے نہایت سرگوشی میں سوال کیا اور مجھ کو ان سے معافی مانگنا پڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر راستہ میں ایک صاحب نے سلام علیکم کہہ کر روک لیا اور اللہ کے نام پر کچھ مانگنے کے بجائے پاکستان کے حوالے سے مانگنا شروع کیا' تو مطلب یہ کہ آخر یہ مانگنے والے تو بدستور موجود ہیں۔

بیوی :- بدستور تو خیر نہیں البتہ اب وقت جتنا جتنا گزرتا جاتا ہے اتنے اتنے یہ مانگنے والے پھر پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔

قاضی جی :- یہ تو خیر غلط ہے پیدا ہو کر اتنی جلدی اتنے بڑے وہ ہرگز نہیں ہو سکتے کہ مانگنے کے قابل بھی ہو جائیں مثلاً آج ہی جو صاحب سب سے پہلے تشریف لائے تھے وہ تو عمر میں میرے بھی عموی صاحب قبلہ معلوم ہوتے تھے' آپ کہتی ہیں کہ یہ نئے پیدا ہونے والے ہیں۔ چہ خوش۔

جمیل :- (ہنس کر) پیدا ہونے کا مطلب آپ نے تو ایک دم ولادت ہی سمجھ لیا۔ مطلب بھابی کا یہ ہے کہ یہ طبقہ پھر رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے۔

قاضی جی :- ہاں! یہ ایک حد تک ٹھیک ہے۔ ارے بھئی اس لڑکی کو فی الحال چھٹی دے دو نا۔ جاؤ بیٹی تم کھیلو کودو۔ وہ دیکھو گھڑونچی ہے نا اس میں کوئی ازاربند باندھ کر گھوڑے تانگے کا کھیل کھیلو۔ مونڈھے کو بناؤ تانگہ اور گھڑونچی کو بناؤ گھوڑا اور یہ لو چھڑی' اس کا بناؤ چابک' جاؤ بیٹی کھیلو شاباش۔

جمیل :- آپ کی تعریف ؟ کس کی بچی ہے یہ ؟

قاضی جی :- یہ صاحبزادی ہیں چھٹن خاں کی اور شاگرد ہیں آج سے میری۔ ہاں چھٹن خاں کے نام پر یاد آیا کہ وہ جو غنڈوں کو ختم کرنے کی مہم شروع ہوئی تھی اس کا بھی کچھ پتہ نہیں چلا۔ مجھ کو تو سب غنڈے جوں کے توں نظر آ رہے ہیں۔ اب مثلاً چھٹن خاں نہ جیل گئے نہ حوالات نہ ان سے کسی نے کچھ پوچھا گچھا۔

بیوی :- ہاں جمیل بھائی آپ تو کہتے تھے کہ یہ چھٹن خاں وغیرہ سب پکڑے جائیں گے یہ آخر ہوا کیا ؟

قاضی جی :- تم کو تو بس چھٹن خاں کی گرفتاری کا انتظار ہے۔ میں نے خود اس سے بھی پوچھا تھا کہ بھئی اب تک گئے نہیں سوا لاکھ کی عمارت میں تو نہایت اطمینان سے مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا کہ ؎

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

جمیل :- قاضی جی اصل میں قصہ یہ ہے کہ کوئی بھی اصلاحی قدم حکومت اٹھائے اس میں کامیابی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ عوام بھی حکومت کا ہاتھ نہ بٹائیں اور اس قسم کے کاموں کو سرکاری نہیں بلکہ قومی کام سمجھیں۔ اب مثلاً یہ آپ کا کام تھا کہ چھٹن خاں کو گرفتار کراتے۔

قاضی جی :- جی ؟ کیا مطلب جناب کا۔ یعنی میں یہ حق دوستی ادا کرتا کہ بیچارے کو جیل بھجواتا۔ بھئی جمیل میاں بعض اوقات تو تم ایسی بے سر پیر کی بات کہہ دیتے ہو کہ مجھ کو حیرت ہوتی ہے کہ تمہارا دماغ آخر جسم کے کس حصے میں واقع ہے۔ ارے بھئی وہ لاکھ لفنگا سہی'

لاکھ لوفر سہی مگر جتنا پرانا وہ دوست ہے میرا اتنے پرانے تو دشمن بھی نہیں ملتے۔ کیا میں جانتا نہیں کہ وہ کیسا نجیب الطرفین شہدا ہے اور کس پایہ کا آوارہ گرد ہے مگر آخر ہے اپنا دوست۔

بیوی :- بس تو اسی طرح جیسے چھٹن خاں تمہارے دوست ہیں اسی طرح باقی غنڈے بھی کسی نہ کسی کے دوست یا رشتہ دار ضرور ہوں گے اور وہ سب کرتے ہوں گے ان کی پچ۔ پھر بھلا یہ کوشش کیسے کامیاب ہو سکتی ہے؟

زبیدہ :- اور بھابی جان بہت سے لوگ غنڈوں سے ڈرتے بھی تو ہیں کہ اب کون ان کی رپورٹ کر کے ان کی دشمنی مول لے۔

قاضی جی :- تو کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی غنڈوں سے ڈرتا ہوں۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے تو تعجب ہے۔ صاحبزادی آپ کو معلوم ہے کہ میں اپنے باپ سے بھی کبھی نہیں ڈرا۔ خیر ان مرحوم کا طریقہ تو یہ تھا کہ ان سے کوئی بھی نہ ڈرتا تھا۔ اس معاملہ میں تو عجیب بد اقبال واقع ہوئے تھے۔ اگر کبھی غصہ کرتے بھی تھے تو ایسا پھسپھسا کہ خود ان ہی پر ترس آتا تھا۔ ایک مرتبہ صاحب مجھ کو آمد نامہ پڑھا رہے تھے اور میری کوڑھ مغزی پر اپنے مصنوعی دانت پیس رہے تھے مگر مجھے کسی طرح یاد ہی نہ ہوتا تھا سبق' آخر اب جو ڈانٹتے ہیں مجھ کو تو دانتوں کی پلیٹ کھٹ سے باہر آ رہی اور میں لگا ہنسنے۔ بس جناب مرحوم والدہ صاحبہ کے پاس جا کر بے حد روئے کہ میری ہی اولاد اور میرا رعب نہیں مانتی۔ والدہ صاحبہ نے بمشکل تمام بہلا پھسلا کر ان کو چپ کیا۔

جمیل :- قاضی جی یہاں یہ ذکر نہیں ہے کہ آپ اپنے والدین سے ڈرتے تھے یا نہیں۔ یہ بات زبیدہ بہن ایک حد تک ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ بہت سے لوگ محض اس خیال سے کہ اب کون اس جھگڑے میں پڑے اور کون ان لوگوں کی دشمنی مول لے چپ ہو جاتے ہیں۔

بیوی :- مگر یہ تو غلط ہے۔ اس طرح تو ان کا سلسلہ کبھی ختم ہی نہ ہوگا۔ یہ صرف امن پسندی اور شرافت نہیں بلکہ کمزوری اور بزدلی بھی ہے اور کمزوری اور بزدلی ہی نہیں بلکہ غنڈوں کا ایک طرح ساتھ دینا ہے۔

قاضی جی :- اللہ اکبر! کیا بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی بیوی پائی ہے۔ بھئی قسم خدا کی تم میری بیوی ہونے کی جگہ اگر ہائیکورٹ کی وکیل ہوتیں تو ایسی چلتی پریکٹس تمہاری کہ ہن برستا تم پر۔ گفتگو کا یہ انداز، بات سے بات پیدا کرنا، مناسب الفاظ پر زور دینا، ایک سے ایک مہمل بات کو زبردستی منوا لینے کی دھن، یہ سب وکالت کی علامتیں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اب بھی دے ڈالو ایک امتحان اور لٹکا دو اپنا سائن بورڈ "مسز قاضی جی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل ہائیکورٹ"!

بیوی :- اب دیکھ رہے ہیں جمیل بھائی آپ ایک بات منہ میں آ گئی ہے تو ختم ہی نہیں ہوتی کسی طرح۔ ذکر کیا ہو رہا تھا بات لے گئے کہاں کی کہاں۔

جمیل :- قاضی جی! یہ بالکل سچ ہے کہ اس قسم کی کوئی اسکیم عوام کے تعاون کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ حکومت کے سامنے اس وقت بے شمار کام ہیں اور ظاہر ہے کہ حکومت کے انتظامی شعبوں کو سب ہی کام کرنا ہیں اور اپنی توجہ کو مختلف حصوں میں تقسیم کرنا ہے۔ اب اگر ہمارے عوام حکومت کا ساتھ نہ دیں گے تو یہ بیڑا کیونکر پار ہوگا۔

قاضی جی :- ٹھہریے ٹھہریے۔ ضرورت اس کی ہے کہ آپ لوگوں کی باتیں پہلے تو میں لکھ لیا کروں اس کے بعد غور کیا کروں کہ آپ نے کیا فرمایا ہے۔ بھئی قسم لے لیجیے جو ایک بات بھی میرے پلے پڑی ہو۔ انتظامی شعبے' توجہ' حصے' تقسیم' خدا جانے کیا کیا کہہ گئے ایک سانس میں اور میری آستین میں گھسی جا رہی تھی ایک چیونٹی' میں اسی میں الجھا رہ گیا۔ دنیا جہاں کی چیونٹیوں کو مُردوں سے دلچسپی لیتے دیکھا ہے مگر یہ لاہور کی چیونٹیاں زندوں کو تناول فرماتی ہیں اور وہ کثرت ہے اس نسل کی کہ الامان والحفیظ۔

زبیدہ :- جمیل بھائی آج صبح جو فقیر آیا تھا تو میں نے بھائی جان سے خود کہا کہ اس سے جا کر کہئے کہ پولیس کے حوالے کرتا ہوں ابھی۔

بیوی :- اجی توبہ کیجئے اس روز کہہ رہے تھے کہ فقیر جو آ کر ایک آدھ دعا دے جاتے تھے اب اس کے لیے بھی ترس کر رہ گئے۔ یہ بھلا حوالے کریں گے پولیس کے۔

قاضی جی :- ہاں صاحب تو مجھ سے تو یہ ناممکن ہے کہ میں فقرا کی بد دعائیں سمیٹتا پھروں۔ ان لوگوں کی دعائیں بعض اوقات ایسی لگتی ہیں کہ پھر ان کا کوئی توڑ نہیں ہوتا۔ ایک چچا تھے صاحب ہمارے وہ ایک مرتبہ کسی فقیر سے اُلجھ گئے تھے۔ سنا ہے کہ گنجا تھا وہ فقیر تو آپ نے اس کو ابے او گنجے کہہ کر جو پکارا تو اس نے کہہ دیا کہ جا بابا یہ گنج تجھ کو دیا۔ یقین مانئے گا جمیل میاں کہ آج کل میرے ان چچا کے پوتے موجود ہیں اور سب اللہ کے فضل سے گنجے یعنی اس خاندان میں جو بچہ پیدا ہوتا ہے گنجا ہوتا ہے۔

جمیل :- کیا باتیں ہیں قاضی جی آپ کی بھی۔ یہ سب وہم ہیں۔ جو ایسے پہنچے ہوئے فقیر ہوتے ہیں وہ یوں مانگتے نہیں پھرتے۔

قاضی جی :- اے جناب تو اب یہ شناخت کون کر سکتا ہے کہ ان میں سے کون سے شاہ جی پہنچے ہوتے ہیں اور کون سے بیرنگ واقع ہوئے ہیں وہی مثل کہ ع خاکسارانِ جہاں را بہ سوارے باشد۔

جمیل :- (ہنس کر) خاکسارانِ جہاں را بہ حقارت منگر   تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

قاضی جی :- جی ہاں یہی شعر پڑھنا چاہتا تھا۔ کیا مطلب ہوا جمیل میاں اس کا۔ غالباً ہے تو موقع کا شعر۔ دادا جان اسی قسم کے موقعوں پر یہ شعر عموماً پڑھا کرتے تھے۔ ہاں تو کیا مطلب ہوا گویا اس کا۔

جمیل :- یعنی یہ جو خاکسار بنے ہوئے نظر آتے ہیں ان کو حقارت سے نہ دیکھو تم کو کیا معلوم کہ اسی گرد کے پردے میں کوئی شہ سوار چھپا ہوا ہو۔

قاضی جی :- بس اتنا ہی سا مطلب تھا۔ میں تو سمجھا تھا نہ جانے کتنی بڑی بات کہہ دی ہوگی۔ تو بہر حال مطلب صرف یہ ہے کہ میں ان غنڈوں سے ہمیشہ ڈرتا رہتا ہوں کہ خدا جانے ان میں سے کون سوارے باشد ہو۔

بیوی :- لیجئے فقیروں کا ذکر کرتے کرتے غنڈوں کے لیے یہ شعر بنا دیا۔ اور میں نے کہا کیا تم فارسی پڑھے ہوئے نہیں ہو؟

قاضی جی :- سبحان اللہ! فارسی نہیں تو اور آخر کیا پڑھا ہوا ہوں۔ شعر کا مطلب پوچھنے سے آپ یہ سمجھیں کہ گویا میں فارسی داں ہی نہیں ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اب محاورہ نہیں رہا ہے ورنہ آمد نامہ ازبر تھا۔ گلستان تو دوسری شادی کے بعد تک پڑھتا رہا ہوں۔ یہ آپ نے ایک ہی کہی کہ فارسی پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ مگر صاحب فارسی میں چھٹن خاں کو اچھی مہارت ہے۔

بیوی :- آگ لگے اس کی صورت کو۔ اب علمی باتوں میں بھی اس جھاڑو پھرے کا ذکر آنے لگا۔

قاضی جی :- ہائیں ہائیں۔ یعنی اس کی لڑکی سن لے گی تو کیا کہے گی؟

بیوی :- کیا کرے۔ میں تو اس کو اسی طرح کہوں گی۔ لو اور سنو اب وہ فارسی بھی جاننے لگے۔ جو اڑائیں گے ایسی ہی اڑائیں گے۔

قاضی جی :- اڑائیں گے، کیا مطلب اڑائیں گے سے۔ گویا میں جھوٹا ہوں، دروغ باف ہوں، کذاب ہوں، زرباف ہوں۔ مگر نہیں، زرباف تو دوسری چیز ہوا۔ مطلب یہ کہ میں جھوٹا ہوں۔ چلو میں جھوٹا ہی سہی۔ تم ہی سچے سہی اس بات کا جھگڑا کیا ہے۔ یہ عزت ہے ہماری اس گھر میں کہ ہماری بلی اور ہم ہی سے میاؤں۔ ہماری بیوی اور ہم ہی کو جھوٹا کہیں۔ واہ رے ہمارے مقدر۔

نقوش کے نقّاش

کہتے ہیں کہ اس دُنیا کے جب سب جاندار مر چکیں گے اور ملک الموت سب کو مارنے کے بعد اکیلے رہ جائیں گے تو ان کو بھی موت آئے گی اور ان کو بھی مرنا پڑے گا۔ خیر یہ تو جب کبھی ہوگا دیکھا جائے گا۔ مگر اسی قسم کا ایک واقعہ حال ہی پیش آیا ہے کہ ادارہ فروغِ اُردو کے مالک۔ رسالہ نقوش کے ایڈیٹر اور اپنے وقت کے لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے والے ناشر محمد طفیل صاحب کی بھی ایک کتاب چھپ کر بازار میں آئی ہے اور دوسرے مصنفوں کو چھاپنے والے یہ حضرت خود بھی چھپ کر رہ گئے ہیں۔ کسی گمنام شاعر نے اسی قسم کے مواقع کے لیے کتنا نامور مصرعہ کہا ہے کہ۔ ع

پھانس کر دو چار بلبل پھنس گیا صیاد بھی

طفیل صاحب کی اس تصنیف کا نام ہے "صاحب" اور اس میں ان کے وہ سات مضامین ہیں جو سات صاحبان کی شخصیت پر لکھے گئے ہیں اور ان ساتوں میں جو ایک شخصیت دوسروں کی نقاب کشائی کی کوشش میں خود برافگندہ نقاب ہوئی ہے وہ خود طفیل صاحب کی شخصیت ہے۔ ان سات مضامین میں سے چھ نقوش کے پچھلے شماروں میں نکل چکے ہیں صرف ایک ایسا مضمون ہے جو اسی مجموعے میں چھپا ہے۔ یہ ساتوں مضامین طفیل صاحب کے اس ذاتی مطالعے اور مشاہدے کے آئینہ دار ہیں جو وہ ان ساتوں ملنے والوں کے متعلق کر سکے ہیں اور نہایت سادگی اور صفائی کے ساتھ اپنے ان ساتوں کرمفرماؤں کے سامنے طفیل صاحب کا آئینہ پیش کر رہے ہیں تاکہ وہ خود بھی اپنے کو طفیل صاحب کی نظر سے دیکھ لیں۔ اس ہفت پیکر کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں:

۱۔ سعادت حسن منٹو۔ ۲۔ احمد ندیم قاسمی۔ ۳۔ شوکت تھانوی۔ ۴۔ جگر مراد آبادی۔ ۵۔ فراق گورکھپوری۔ ۶۔ عابد علی عابد۔ اور ۷۔ احسان دانش۔

باقی چھ حضرات کے متعلق تو میں وثوق سے کچھ عرض نہ کر سکوں گا مگر جہاں تک اُس مضمون کا تعلق ہے جو خود میرے متعلق لکھا گیا ہے۔ مجھ کو ایمانداری کے ساتھ اعتراف ہے کہ میں نے اپنی اتنی جامع تصویر اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ یہ تصویر وہ نہیں ہے جو ہونے والی سسرال بھیجنے کے لیے لوگ خاص طور پر کھنچوانے کے بعد بنواتے بھی ہیں کہ گال اگر پچکے ہوئے ہیں تو ذرا ابھرو دیئے جائیں آنکھیں اگر چندھی ہیں تو ذرا روشن کر دی جائیں رنگ اگر کالا ہے تو ذرا گورا کر دیا جائے۔ بلکہ یہ تصویر اصل

خدوخال کے ساتھ جوں کی توں پیش کر دی گئی ہے۔

خود اپنے متعلق اس قسم کا منہ پھٹ سچ اس مضمون سے پہلے میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ایک آدھ مقام پر اگر مجھے شبہ بھی ہوا تو مجھ کو مجھ سے زیادہ سمجھنے والوں نے یہ کہہ کر اس شبہ کو دور کر دیا کہ آپ مانیں یا نہ مانیں بات سچی لکھی ہے۔ ایک مقام پر مجھے شدید اختلاف تھا جہاں طفیل صاحب نے لکھا ہے:

> "میں بھی کوئی آٹھ دس مشاعروں میں ان کا کلام ان کے ترنم سمیت سن چکا ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ سوائے دو ایک مشاعروں کے باقی سب میں بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوٹ ہوئے۔"

میں یہ کہہ رہا تھا کہ صرف دو مشاعروں میں ہوٹ ہوا ہوں ایک میں اس لیے کہ سخن فہم متعصب تھے اور ہوٹنگ کرنے والے فیاض اور دوسرے میں اس لیے کہ تحسین ناشناس و سکوتِ سخن شناس دونوں شباب پر تھے۔ مگر یہ تو ایک ہی بات ہوئی بہرحال میں صرف دو مرتبہ ہوٹ ہوا ہوں مگر بیگم صاحبہ نے طفیل صاحب کی گواہی دی کہ خود آپ کو اندازہ نہیں ہے میں بڑے شوق سے مشاعروں میں جایا کرتی تھی مگر محض آپ کی غزل سرائی نے مجھ سے مشاعرے ترک کرائے ہیں۔ کاش آپ اپنی آواز خویش پروری سے باہر ہو کر کبھی سن سکتے۔ پھر مجھ کو اس مضمون کے اس مقام پر غصہ آتے آتے رہا جہاں طفیل صاحب نے مجھے خبطی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

> "ان کی طبیعت کی ایک اچھائی یہ ہے کہ بیٹھے بٹھائے ناراض ہو جاتے ہیں نہ ناراض ہونے کا پلاٹ بناتے ہیں نہ کوئی اسکیم۔ نہ ہی دوسرے کو یہ موقع دیتے ہیں کہ وہ بیچارہ مدافعت میں کچھ کہہ سکے —"

میں نے جھنجلا کر کہا "یہ غلط ہے۔ متہم کرتے ہیں۔ تہمت لگاتے ہیں۔ اتہام ہے سراسر"

وہ بولیں "حرف بہ حرف صحیح ہے"

میں نے کہا "صحیح کیسے ہے یہ تو پاگل پن ہوا کہ بے وجہ کوئی ناراض ہو جائے میں بغیر کسی وجہ کے کبھی کسی سے ناراض نہیں ہوا"

وہ بولیں "کبھی شاید نہ ہوئے ہوں مگر اکثر ہو جاتے ہیں"

میں نے واقعی مشتعل ہو کر کہا "مثلاً۔ مثلاً کب ناراض ہوا ہوں میں"

وہ بولیں "مثلاً اسی وقت ہو رہے ہیں"

اور مجھ کو واقعی اندازہ ہوا کہ میں خود اس دعوے کی دلیل پیش کر رہا ہوں۔ میں نے جلدی سے یہ صفحہ الٹ دیا اور ایک مقام پر بے ساختہ داد دی۔

> "ذرا بادل گرجے۔ بجلی چمکے پھر دیکھئے آپ کا مزا۔ نادری حکم کے ماتحت تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کرا دیں گے۔ اس کے بعد خود اٹھیں گے چٹخنیاں

> دیکھیں گے کہ کہیں کوئی چٹخنی کھلی تو نہیں رہ گئی۔ پہلے خود اُٹھنے کے بجائے دوسروں کو اس لیے حکم دیں گے کہ مبادا بجلی اندر گھس کر تبادلۂ خیالات کر ڈالے۔"

میں اس "تبادلۂ خیالات کر ڈالنے" کی داد ہی دے رہا تھا کہ بیگم صاحبہ نے یہ فقرے پڑھ کر سنا دیئے:

> "بات کہنے والی تو نہیں ہے لیکن آپ سن لیں کہ یہ خدا کے بنائے ہوئے بتوں کی بڑی پُوجا کرتے ہیں۔ کامیاب ہوں کا حال خدا جانے یا شوکت صاحب جانیں۔"

اور یہ سنا کر بولیں: "دیکھ لیا آپ نے، میں نہ کہتی تھی کہ یہ بات ہے ضرور۔"

میں نے یہ سطریں خود پڑھ کر کہا: "مگر یہ حضرت خود اپنے اس شبہ کی تردید کر گئے ہیں اسی کے آگے مابدولت کا ایک اقتباس دینے کے بعد یہ بھی تو لکھا ہے:-

> "یہ چھوٹے تقدس کے قائل نہیں نہ اپنی لغزشوں پر نازاں ہیں بلکہ وہ سادہ سے الفاظ میں کہتے ہیں کہ بھئی میں آپ جیسا ایک انسان ہوں آپ میں اور مجھ میں فرق اتنا ہے کہ آپ چھوٹے تقدس کی آڑ میں وہ کچھ نہیں کہتے جو آپ ہیں میں تو ایک کھلی ہوئی کتاب ہوں جہاں سے چاہو پڑھ لو ——"

اور پھر میں نے ان کو سمجھایا کہ اپنی اس قسم کی لغزشوں کو جب میں خود ڈنکے کی چوٹ بیان کر کے دُنیا کے سامنے پیش کر چکا ہوں تو اب ان کو یا کسی کو یہ نہ کہنا چاہیے کہ کامیاب ہوں کا حال خدا جانے یا شوکت صاحب جانیں۔ شوکت صاحب تو جو کچھ جانتے تھے اُس سے سب ہی کو آگاہ کر چکے ہیں اس خطرناک اعتراف کے بعد یہ شک اور یہ شبہ زیادتی نہیں تو اور کیا ہے اس پر وہ کہنے لگیں کہ: "بس رہنے بھی دیجئے ایک مقدمے میں سرکاری گواہ بن جانے کے معنی یہ کہاں سے ہو گئے کہ چور چوری سے بھی گیا اور ہیرا پھیری سے بھی۔ یہ چالاکی بھی تو ہو سکتی ہے کہ اس طرح اپنا بھرم قائم کر کے پھر ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گئے کہ جو چاہیں کریں۔"

میں نے کہا کہ خیر آپ کا اور میرا رشتہ تو ہے ہی ایسا کہ اس میں اگر بدگمانی نہ ہو محبت ہی مفلوج ہو کر رہ جائے مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ طفیل صاحب کس رشتے سے اس قدر بدگمان ہوئے۔"

خیر چھوڑیئے اس ذکر کو میں تو اپنے ہی مضمون میں اُلجھ کر رہ گیا اس کتاب میں اور مضامین بھی تو ہیں اور جس طرح اور مضامین کو پڑھ کر میرا یہ حال ہوا ہے کہ۔ ع

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اسی طرح میرے متعلق جو مضمون ہے اس کو پڑھ کر دوسروں نے بھی یہی کہا ہوگا۔ اور یہی طفیل صاحب کی سیرت نگاری کا کمال ہے۔

اس مجموعے کا پہلا مضمون جو منٹو کے متعلق ہے اس کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں منٹو اپنی زندگی کی تمام ہنگامہ آرائیوں کے ساتھ چلتا پھرتا سامنے آ جاتا ہے اور اس کو مُردہ سمجھ کر کسنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہی منٹو کی بہکی بہکی حرکتیں وہی اس کی سرشاریاں اور وہی اس کے لغزیدہ قدم۔ وہی اس کا انداز بیان کہ مضمون پڑھتے جایئے اور منٹو کو سامنے بٹھا کر باتیں کرتے جایئے مگر دوسرے

حصے میں منٹو کی طرف سے جو خط طفیل صاحب نے لکھا ہے وہ منٹو کے اسلوب تحریر کا ایسا جامع چربہ ہے کہ منٹو کی موت بھی ذی روح نظر آتی ہے۔ اگر یہ خط منٹو کے نام سے نہ بھی ہوتا تو بجائے خود ایک اہم ادبی دستاویز کی حیثیت اس کو حاصل ہوتی۔ طفیل صاحب نے اگر اپنی اس صلاحیت کو اب تک چھپایا ہے تو خیانت سے کام لیا ہے اور اب اگر اس میں بخل برتا تو مزید خیانت ہو گی۔

دوسرا مضمون جو احمد ندیم قاسمی کے متعلق ہے ندیم صاحب کو رفتہ رفتہ میرے قریب لا رہا تھا کہ یہ حصہ آ گیا:۔

”اگر یہ چارپائی پر بیٹھے ہوں تکیے سے ٹیک بھی لگا رکھی ہو اور یہ ایک دم اکڑوں بیٹھ جائیں تو سمجھ لیجیے کہ یہ افسانہ لکھنے والے ہیں۔ اس وقت یہ سگریٹ پہ سگریٹ پئیں گے۔ خوبصورت سا کاغذ لیں گے۔ پنسل کو باریک بنائیں گے اور مہین مہین خط میں افسانہ شروع کر دیں گے۔ آپ لاکھ شور مچائیں یہ لکھتے رہیں گے۔“

میں نے کہا ”حیرت ہے ندیم صاحب کی یہ ادائیں مجھ سے کس قدر ملتی جلتی ہیں۔

بیگم نے کہا ”مگر آپ اکڑوں نہیں بیٹھتے۔“

میں نے کہا ”خوبصورت سا کاغذ تو لیتا ہوں۔“

وہ بولیں ”جی ہاں مگر آپ چارپائی پر کب بیٹھتے ہیں۔“

میں نے کہا ”چلو نہ سہی مگر پنسل تو باریک بناتا ہوں۔“

وہ بولیں ”عموماً قلم کا باریک نب تلاش کرتے ہیں۔“

میں نے کہا ”مطلب یہ ہے کہ مہین مہین خط میں تو مضمون شروع کرتا ہوں۔

وہ اگلی سطریں پڑھوانا چاہتی تھیں ”آگے تو پڑھیے۔“

میں نے پڑھنا شروع کیا:۔

”—— آپ لاکھ شور مچائیں یہ لکھتے رہیں گے البتہ شعر کہنے کے لیے تنہائی چاہتے ہیں اس لیے کہ انھیں ہلکا ہلکا گنگنانا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ اپنے ترنم کا مرتبہ جانتے ہیں اس لیے اس خداداد دین کا حال سب پر آشکار کرنا نہیں چاہتے۔“

بیگم صاحبہ نے کہا ”دیکھیے اس کو کہتے ہیں غیرت داری۔“

میں نے جل کر کہا ”پھر آپ کا روئے سخن میرے ترنم کی طرف ہے۔ یہ تعصب کی عجیب گھریلو قسم آپ نے نکالی ہے۔“

احمد ندیم صاحب قاسمی والے مضمون میں طفیل صاحب اپنے اس احترام کو باوجود کوشش کے چھپا نہیں سکے جو ندیم صاحب کے لیے ان کے دل میں موجود ہے۔ جب خود طفیل صاحب نے ندیم صاحب پر مضمون لکھنے کے لیے ہاجرہ بہن سے درخواست کی تھی تو ان بیچاری نے بڑی سچی بات کہی تھی کہ:۔

”اگر میں سچ سچ لکھ دوں تو یہ مضمون کتنے صفحوں پر پھیلے گا اور پھر سب سے بڑی بات

یہ ہے کہ اتنی سچائی کا ادب میں کیا درجہ ہوگا سوگ تو اسے بہن کی پیار والی بات کہہ کر ٹال دیں گے۔“

مگر خود طفیل صاحب نے بھی بھائی کی پیار والی بات سے کام لیا ہے۔ اور صرف طفیل صاحب ہی نہیں اگر میں خود بھی ندیم صاحب کے متعلق لکھتا تو وہ بھی پیار والی بات ہی ہوتی اس لیے کہ اس شخص میں سوائے پیار کے اور ہے ہی کیا۔

جگر صاحب کے متعلق طفیل صاحب کا جو مضمون ہے وہ ایک حد تک خود میرے متعلق بھی ہے اس لیے کہ طفیل صاحب اور جگر صاحب کے مراسم کی ابتدا میرے ہی گھر پر ہوئی تھی۔ مگر جب یہ مضمون آگے چل کر صرف جگر صاحب کے متعلق رہ گیا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ طفیل صاحب نے بھی اتنے ہی دنوں میں جگر صاحب کو اتنا ہی سمجھا ہے جتنا میں ساری زندگی کے مراسم کے بعد سمجھ سکا ہوں۔ اس مضمون میں جہاں کہیں طفیل صاحب نے جگر صاحب کے اندازِ گفتگو کا چربہ اتارا ہے داد دینے کو جی چاہتا ہے واقعی معلوم ہوتا ہے کہ جگر صاحب کے یہ الفاظ ان کے ذہن میں محفوظ تھے بلکہ دستاویزی صورت میں موجود تھے مثلاً کہتے ہیں کہ جگر صاحب کی باتیں عموماً اس قسم کی ہوتی ہیں:۔

> ”اگر میں آپ کے کہنے کے مطابق یہ مان لوں اور مجھے اس کا بھی یقین کامل ہو جائے کہ فلاں صاحب شعر اچھے کہتے ہیں۔ پھر بھی میں کہوں گا کہ ان میں وہی ایک چیز نہیں ہے اور وہ چیز پیدا تو ہوتی نہیں وہ تو انسانِ کامل اور مردِ خود آگاہ میں خود ہی ہوتی ہے میری مراد خلوصِ باصفا ہے۔ وہ شعر بڑے بداعمال ہوتے ہیں جو ایسے ذہنی نابالغوں پر وارد ہو جاتے ہیں۔“

میں جانتا ہوں کہ یہ جگر صاحب کا اندازِ بیان ہے۔ یہی الفاظ یہی ترکیبیں یہی بندشیں۔ اس مضمون کا کونسا حصہ ایسا ہے جہاں جگر صاحب مع اپنی اصلی شخصیت کے متحرک نظر نہ آتے ہوں۔

فراق والا مضمون شخصیاتی بھی ہے اور دستاویزی بھی۔ اس مضمون میں فراق کے چند نہایت اہم خطوط دے کر طفیل صاحب نے ہر ایک سے فراق کو نہایت بے تکلفی کے ساتھ ملا دیا ہے بلکہ یوں فراق سے ملنے والا شاید فراق کو نہ پا سکتا البتہ ان خطوط کے آئینے میں اور پھر طفیل صاحب کی حاشیہ آرائیوں نے فراق کو اس مضمون کے پڑھنے والوں کے بالکل قریب کر دیا ہے۔ اسی مضمون میں ایک جگہ طفیل صاحب لکھتے ہیں:

> ”الہ آباد تین چیزوں کی وجہ سے مشہور ہے ان میں سے ایک جواہر لال نہرو دوسرے فراق تیسرے امرود۔“

یہ بات اکبر الہ آبادی بہت پہلے بڑے مزے میں کہہ گئے ہیں ؎

کچھ الہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے
یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

مگر یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب پنڈت نہرو اور فراق نہ تھے صرف اکبر اور امرود تھے اور طفیل صاحب نے آجکل کا ذکر کیا ہے

جب اکبر نہیں ہیں پنڈت نہرو۔ فراقؔ اور امرود ہیں۔

سید عابد علی عابدؔ کے متعلق مضمون لکھتے لکھتے طفیل صاحب کے ان فقروں نے چونکا دیا: ۔

> "مجھے ان سے یہ شکایت رہی ہے کہ اتنی ٹھوس علمی شخصیت ہونے کے باوجود انھوں نے کوئی قابلِ ذکر ادبی کام نہیں کیا یہ "فضیلت" صرف ان ہی میں نہیں ہے بلکہ یہاں کی کئی اور بڑی بڑی شخصیتوں میں تھی اور ہے اگر میں اس سلسلے میں ڈاکٹر تاثیرؔ (بعض زندہ کرم فرماؤں کا نام لیتے ہوئے ڈر لگتا ہے) کا نام لوں تو میرے کرم فرما مجھے معاف فرمائیں۔"

طفیل صاحب زندہ کرم فرماؤں سے ڈر جائیں مگر میں ان کا نام لیتا ہوں۔ ابھی چند ہی دن ہوئے کہ صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسمؔ کے گھر سید ذوالفقار علی بخاری نے یہی بحث چھیڑی تھی سید احمد شاہ بخاری پطرسؔ کا علم و تبحرّ دیکھئے اور ایک کتابچہ دیکھئے "پطرس کے مضامین" اس قابلیت اس ذہانت اور اس تبحرّ کے اہلِ قلم سے اُمید تھی کہ نہ جانے ادب اُردو کو کیا کچھ دے دے گا۔ ڈاکٹر تاثیرؔ اور چراغ حسن حسرتؔ اپنی صلاحیتیں لیے اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ صوفی تبسمؔ ہیں خدا کرے وہ اب بھی کوئی ادبی کارنامہ پیش کر دیں۔ سید عابد علی عابدؔ کی صحت اگر اجازت دے تو ان میں عزم بھی ہے ہمتؔ بھی اور ان کے تیور بتاتے ہیں کہ وہ خود اب تک کی غفلتوں کی تلافی کے لیے بے قرار ہیں۔ اس موقع پر ان کی صحت کے لیے دل سے دُعا نکلتی ہے۔ عابدؔ کے پاس بہت کچھ ہے اور ان کی نیت بھی بخل کی نہیں۔ دیر ہی سہی مگر ان کی توجہ اس طرف ضرور ہوئی ہے اور امید ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کر دکھائیں گے۔

آخری مضمون احسان دانش پر ہے اور بہت ہی کامیاب مصوری ہے۔ احسانؔ اپنی تمام بے ساختگی اور تمام سادہ پرکاری اور تمام پرکارِ سادگی کے ساتھ اس مضمون میں سمٹ آئے ہیں۔ ان کا بینک کی عمارت پر قبضہ کرنا۔ ان کا کبوتروں سے شغف۔ ان کی موت کے متعلق وہ اسکیم جو تقسیم ملک کی وجہ سے ناکام ہو گئی ان کا مشاعروں سے شیخوپورے کی طرف فرار، ان کے تاجورؔ مرحوم سے مراسم کی داستانیں اس حُسن سے بیان ہوئی ہیں کہ طفیل صاحب پر محمد حسین آزادؔ کی افسانہ طرازی کا شُبہ ہونے لگتا ہے یہ مضمون بقول طفیل صاحب کے نامکمل بھی ہے اور ناکام بھی مگر احسان صاحب کا تو کام تمام کر ہی گیا ہے۔

رہ گئی اس کتاب کی زبان۔ اندازِ بیان اور باقی ادبی نزاکتیں ان کے متعلق خود مصنفؔ کا دیباچہ پڑھ لینا کافی ہو گا جو "اعترافِ جرم" کے نام سے کتاب کے شروع میں دیا گیا ہے۔

خواہ مخواہ

توبہ ہے صاحب کہاں کہاں کی خاک چھانی۔ کن کن گلی کوچوں کے طواف کیے۔ کس کس سے پوچھا اور کتنا کرایہ ٹیکسی کا ادا کرنا پڑا تب کہیں جا کر عبدالغفور صاحب ٹھیکہ دار کا وہ مکان مل سکا جس کا ایک حصہ اسلم نے کرایہ پر حاصل کیا تھا۔ اور آگ ہی تو لگ گئی اسلم کی اس بات سے کہ:۔

"سیدھا سا پتہ تھا اگر ذرا عقل سے کام لیتے تو یہ پریشانی ہرگز نہ ہوتی۔"

میں نے جل کر کہا: "کیا جناب کا خیال یہ ہے کہ میں نسلوں سے ڈاکیہ چلا آ رہا ہوں کہ اس پتہ پر کھٹ سے پہنچ جاؤں جو خط پر درج ہوتا ہے۔ یہ تو ڈاکیوں کا خاص آرٹ ہے کہ وہ ۱-۲-۱۱-۹ کا مطلب سمجھ لیتے ہیں کہ بلاک نمبر ۱۔ سب بلاک نمبر ۲۔ گلی نمبر ۱۱ مکان نمبر ۹۔"

اسلم نے غالباً رفع شر کے لیے کہا: "اچھا خیر۔ اب سامان رکھو۔ غسل وغیرہ کر کے آدمی بنو تاکہ تم کو چائے پلا کر صحیح الدماغ بنانے کے بعد بات کی جائے۔"

میں خود بھی فوراً نہانا چاہتا تھا اس لیے کہ لاہور سے کراچی آنے والے کو محسوس یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی جنازے میں شرکت کرنے گیا تھا جہاں گورکنوں نے بجائے مُردے کے خود اسی کو دفن کر دیا تھا غلطی سے اور وہ اپنی اس تدفین کے بعد بمشکل تمام قبر سے نکل کر بھاگنے میں کامیاب ہوا ہے۔ گرد میں اٹا ہوا تھا چنانچہ آئینہ کے سامنے پہنچ کر خود اپنے ہی عکس پر عبدالغفور صاحب ٹھیکہ دار کا شبہ ہوا، جو ٹھیکہ داری کی مناسبت سے اس حلیہ میں نظر آ سکتے ہیں۔ مگر قبل اس کے کہ میں خود اپنے ہی عکس کو سلام کرتا گرد آلود عینک کو جو اتارا تو اپنے عکس کی اسی حرکت سے فوراً سمجھ میں آ گیا کہ یہ کوئی اور نہیں "خاکسار" ہی ہے اور اگر سچ پوچھیے تو آج ہی "خاکسار" کے معنی بھی سمجھ میں آئے کہ بغیر لاہور سے کراچی آئے ہوئے کوئی شخص صحیح معنوں میں "خاکسار" بن ہی نہیں سکتا۔ میں نے جلدی جلدی شیو کیا۔ کپڑے نکالے اور غسلخانے میں نل کے نیچے جا بیٹھا۔ مگر ابھی سر اور چہرے پر صابن لگایا ہی تھا کہ نل غائب اور میں پریشان کہ اب کیا کروں۔ صابن تمام سر پر پھیلا ہوا ہے۔ آنکھیں یک بند ہیں یہ تو کچھ "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" والا قصہ ہوا ہے۔ ایک آدھ منٹ تو تکلفاً خاموش رہا۔ اس کے بعد غسلخانے ہی سے اسلم کو آواز دی کہ دوڑو مدد کو۔ اسلم نے اس کے جواب میں چیخنا شروع کیا:۔

"صاحب یہ میں نہیں ہوں ایک اور صاحب ہیں خدا کے لیے نل کھول دیجیے۔"

اور عجیب بات ہے کہ اس کے بعد ہی نل چلنے لگا۔ چنانچہ میں نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر جب پھر آئینہ کے سامنے آیا تو اب

آئینہ میں عبدالغفور صاحب ٹھیکہ دار نظر نہیں آئے بلکہ یہ دیکھ کر اطمینان ہو گیا کہ جب کچھ بھی بُرا بھلا ہوں یہ میں خود ہی ہوں۔ ابھی کنگھا ہی پھیر رہا تھا کہ اسلم نے چیخنا شروع کر دیا :۔

”صاحب سولہ سنگھار بعد میں کر لیجیے گا مگر چائے ٹھنڈی ہوتی جاتی ہے۔“

چنانچہ میں اس برآمدے میں آ گیا جہاں ایک چھوٹی سی میز پر اسلم چائے کے برتن رکھے خود مکھیوں کے شکار میں مصروف تھے۔

میں نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہی پہلا سوال کیا :۔

”بھئی یہ نل کا بند ہونا پھر تمہارے ایک مجذوبانہ نعرے کے بعد یکایک چل دینا سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ قصہ کیا تھا آخر۔“

اسلم نے کہا۔ ؎ ”ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا   آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا“

میں نے کہا ”سبحان اللہ لیکن اگر اس شعر کا سلیس اُردو میں آپ ترجمہ بھی کر دیتے تو اچھا ہوتا۔ میں اتنا سخن فہم تو کبھی نہ تھا کہ اپنے تفصیل طلب سوالات کا جواب اشعار میں سُن کر مطمئن ہو جاتا۔ پھر اس وقت تو ابھی دماغ سے ریل کی گھڑگھڑاہٹ ہی نہیں نکلی ہے۔“

اسلم نے کیتلی میں چینی کا ایک چمچہ ڈال کر چلاتے ہوئے کہا ”مطلب یہ کہ یہ تو بسم اللہ تھی ایسی ایسی بہت سی باتیں ہوں گی۔ کرایہ کے مکان میں رہنا آپ معمولی بات سمجھتے ہیں۔ کرایہ کے علاوہ اور بھی بہت سے ٹیکس دینا پڑتے ہیں۔ بخدا بعض اوقات تو جی چاہتا ہے کہ سامان بھی اسی گھر میں چھوڑ دوں اور جا کر سمندر میں چھلانگ لگا دوں۔“

میں نے کہا ”وہ تو خیر ٹھیک ہے کہ جب سمندر ہی میں چھلانگ لگانا ٹھہری تو سامان کی کیا ضرورت ہے۔ مگر کچھ بتاؤ تو سہی بات کیا ہے آخر۔“

اسلم نے چائے کی پیالی کھسکاتے ہوئے کہا ”بات نہیں ہے بپتا ہے یہ۔ اجمال میں سنائے دیتا ہوں۔ تفصیل خود دیکھتے رہنا اب تو رہنا ہی ہے اس گھر میں۔“

میں نے کہا ”اچھا فی الحال تم اجمال ہی سنا دو۔“

اسلم نے ایک گہری سانس لے کر کہا ”کراچی میں مکان حاصل کرنا اتنا مشکل کام ہے کہ اگر یہ مرحلہ ان سائنسدانوں کو پیش آ جائے جو چاند اور مریخ وغیرہ پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں تو ان کے سارے اسپوتنک اور طفیلی سیارے دھرے رہ جائیں۔ میرا ہی دل جانتا ہے کہ میں نے کیسے کیسے پاپڑ بیلے ہیں یہ مکان حاصل کرنے کے لیے۔“

میں نے کہا ”شکر ہے کہ مل ہی گیا۔ اور ہے بھی اچھا خاصا بظاہر۔“

اسلم نے کہا ”جی ہاں۔ مگر بباطن جیسا کچھ بھی ہے۔ بس دعا مانگنا چاہیے کہ خدا دشمن کو بھی ایسا مکان نہ دے۔ معلوم نہیں میرے کن گناہوں کی پاداش میں یہ مکان مجھ کو مل گیا ہے اور اللہ جانے تمہاری تقدیر کی وہ کونسی گردش تھی جو تم کو بھی یہاں رہنے کے لیے لے آئی ہے۔ خدا کے لیے پرویز کوئی اور مکان ڈھونڈھو ورنہ اس مکان میں کل ہی سے تم بھی خودکشی کے امکانات پر غور کرنا شروع کر دو گے۔ جس طرح میں اس حرام زندگی اور اس حرام موت کا موازنہ کرتا رہتا ہوں۔“

وہ واقعی رو دینے کے قریب تھا لہذا میں نے اس کو چمکارتے ہوئے کہا ”ہمت اور حوصلے سے کام لو، انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر ——“

اسلم نے بات کاٹ کر کہا: "مگر میں تم کو تفصیلات سناؤں، بھائی صاحب یہ مکان نہیں بلکہ مکان کا نصف حصّہ ہے۔ نصف بہتر میں خود مالک مکان عبدالغفور صاحب ٹھیکہ دار رہتے ہیں اور اس نصف بدتر میں پہلے صرف میں رہتا تھا اب تم بھی رہو گے۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا: "نصف بدتر؟ مگر مجھے تو کوئی خاص برائی نظر نہیں آتی۔"

اسلم نے جزبز ہو کر کہا: "تم ابھی سے اس مکان کی طرفداری نہ کرو۔ اس میں جو برائی ہے وہ نظر نہیں آتی بلکہ محسوس کی جاتی ہے میری پوری بات تو سُن لو۔"

میں نے پوری بات سننے کا وعدہ کرتے ہوئے کہا: "اچھا اچھا تم بتاؤ پوری بات میں اب نہ بولوں گا۔"

اسلم نے کہا: "تو صاحب اس مکان کی تقسیم یوں ہوئی ہے کہ ہر کمرے سے ملا ہوا دوسرے حصّہ کا ایک کمرہ ہے۔ غسلخانے سے ملا ہوا ان کا غسلخانہ ہے۔ وہ اگر نل کھول دیں تو پانی ادھر نہیں آ سکتا۔ بجلی کا مین سوئچ اُسی طرف ہے اگر وہ اس کو بند کر دیں تو ہماری زندگی کا سہارا موم بتیاں رہ جائیں۔ ان کے یہاں ہر سائز کے بے شمار بچے بھی ہیں جن کی ڈیوٹیاں اس حساب سے لگی ہوئی ہیں کہ ایک بچہ جب رونا بند کر دیتا ہے تو دوسرے کی ڈیوٹی شروع ہو جاتی ہے۔ ان کے یہاں ایک ایسا نامعقول ریڈیو ہے جو سننے کے لیے نہیں ہے بلکہ کان پڑی آواز سننے نہ دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس مکان میں رہ کر کوئی تخلیقی اور تحریری کام تو ہو ہی نہیں سکتا اور اگر بے حیا بن کر اور کانوں میں روئی ٹھونس کر کچھ لکھنے کی کوشش بھی کی جائے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ——— دیکھئے میں ایک ادنیٰ سا نمونہ دکھائے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے کے اندر گیا اور اپنے ہاتھ میں ایک کاپی لیے ہوئے واپس آکر بولا:۔

"یہ ایک افسانہ لکھ رہا تھا میں۔ اس کو ادھورا چھوڑ کر دفتر چلا گیا۔ واپس آیا تو جہاں تک میں نے لکھا تھا اس کے آگے یہ تحریر نظر آئی۔ ملاحظہ ہو۔"

میں نے پڑھنا شروع کیا: "تقسیم ملک کے بعد سوکھی ہوئی پتیوں کے مانند مہاجر رواں دواں تھے۔ ان کو کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں۔ ان کو کچھ معلوم نہ تھا کہ ان کی منزل کہاں ہے وہ محض بے عزم راہی تھے۔ مسافر تھے جن کا کوئی جادہ ہو نہ کوئی منزل اور وہ سفر کرتے رہیں ٹکٹ نہ خریدیں تو چالان ہو ٹکٹ خریدیں تو کہاں کا خریدیں ———"

میں نے چونک کر کہا: "ایں یہ کیا۔ یہ ٹکٹ کیسا؟"

اسلم نے کہا: "اور دکھا کیا رہا ہوں آپ کو۔ مسافر تھے جن کا کوئی جادہ ہو نہ کوئی منزل اور وہ سفر کرتے رہیں۔ بس یہاں تک میں لکھ کر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد یہ خرافات لکھی ہوئی دیکھی۔ دیکھو تو نا خط بدلا ہوا ہے۔"

میں نے کہا: "زنانہ خط ہے۔"

اسلم نے بیزاری سے کہا: "جی ہاں زنانہ خط ہے اور جن محترمہ کا یہ خط ہے وہی میرے لیے بلائے بے درماں بنی ہوئی ہیں۔"

میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا: "مگر وہ ہیں کون؟ جملہ مہمل سہی مگر خط تو بڑا پاکیزہ ہے۔"

اسلم نے منہ بنا کر کہا: "صاحب ناک میں دم کر رکھا ہے اس لڑکی نے۔ بخدا اگر میری بہن یا بیٹی ہو خدا نا خواستہ اس قسم کی تو گولی مار کر پھانسی پر لٹک جاؤں۔"

میں نے پھر پوچھا ”مگر بتایا نہیں تم نے کہ یہ لڑکی ہے کون ؟“

اسلم نے کہا ”صاحبزادی ہیں ٹھیکہ دار صاحب کی۔ اچھی خاصی جوان جہان لڑکی ہے۔ میٹرک پاس کر چکی ہے۔ باوا جان شادی کی فکر میں گھل رہے ہیں اور میں یہ غور کیا کرتا ہوں کہ جس کے پلّے بندھ گئی یہ بلا اس کے دونوں کانوں کے بیچ میں سر کر دے گی۔ صاحب چھلاوا ہے اچھی خاصی۔“

میں نے کہا ”دیکھا ہے تم نے ؟ عمر کیا ہوگی ؟ صورت شکل کی کیسی ہے ؟“

ایک ہی سانس میں اتنے سوال جو کئے تو اسلم نے گھبرا کر کہا ”نہ دیکھا ہے نہ خدا دکھائے۔ عمران کے باوا جان کے حساب سے سولہ سال ہے لہذا ہوگی اٹھارہ انیس سال کی۔“

میں نے کہا ”میٹرک فرسٹ ڈویژن میں کیا ہوگا اس نے۔“

اسلم نے مجھ کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا ”یہ جناب کو کیسے معلوم ہوا۔“

میں نے کہا ”اندازہ ہے میرا۔ خط نہایت اچھا ہے۔ ان تمام شرارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ذہین بھی ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ لڑکی ہے۔ آجکل تو ڈویژن مارنا لڑکیوں ہی کا کام رہ گیا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ تم نے دیکھا نہیں اب تک۔“

اسلم نے کہا ”جی ہاں اب تک تو خدا نے محفوظ ہی رکھا ہے مگر اب آپ کے تیوروں سے اندازہ ہو رہا ہے کہ غالباً آپ یہ کوشش بھی کریں گے۔“

میں نے کہا ”نہیں خیر میں نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے البتہ جو حالات تم نے سنائے ہیں وہ اتنے دردناک نہیں ہیں جتنے تم ستم رسیدہ بنے ہوئے ہو۔ بہر صورت میں حالات کا جائزہ لے کر کوئی رائے قائم کروں گا۔“

چنانچہ میں فی الحال اس کمرے میں سامان ترتیب سے لگانے لگا جو میرے لیے اسلم نے مخصوص کیا تھا۔

۲

میں ابھی سو کر اٹھا ہی تھا اور ایک آدھ انگڑائی لے کر ”گذشتہ سے پیوستہ“ کہہ کر پھر سونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اسلم نے کمرے میں داخل ہو کر کہا :۔

”چلو ان سے بھی مل لو وہ آ گئے ہیں ہمارے اور تمہارے دونوں کے گارجین۔“

میں نے حیرت سے پوچھا ”گارجین ؟ گارجین کون ؟“

اسلم نے پڑوس کی طرف اشارہ کر کے کہا ”وہ — مالک مکان۔ عبدالغفور صاحب ٹھیکہ دار۔ اچھے خاصے دردِ سر ہیں یہ حضرت بھی۔“

اور دیوار کے اُس پار سے ایک کھنکتی ہوئی زنانہ آواز آئی ”امی جان۔ دردِ سر کے واسطے صندل لگانا ہے مفید — کیا یہ سچ ہے۔“

اور اسلم نے دانتوں میں انگلی دبا کر کہا۔ "سُن لیا آپ نے"

میں نے تقریباً زیرِ لب کہا۔ "میں نے تو خیر سن لیا مگر غضب یہ ہو گیا کہ اس نے بھی سن لیا جس کے باپ کو آپ دردِ سر کہہ رہے تھے۔"

اسلم نے بے پروائی سے کہا۔ "اونہہ۔ سُن لیا ہے تو جو کر سکتی ہیں وہ کریں میرے خلاف۔ تم اُٹھ تو چکو بستر سے وہ انتظار کر رہے ہیں۔"

میں بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ منہ پر ایک چھینٹا ڈالا اور اسلم کے ساتھ ان بزرگ محترم سے ملنے کو آ گیا جو نہایت اطمینان سے بیٹھے اخبار میں اشتہارات کا صفحہ اس غور سے پڑھ رہے تھے کہ نگاہیں اخبار پر جمی ہوئی تھیں اور منہ حقے کی نے تلاش کر رہا تھا۔ ہم لوگوں کی آہٹ پا کر ان بزرگ محترم نے عینک کا زاویہ درست کر کے ہم کو دیکھا ہی تھا کہ میں نے نہایت ادب سے آداب بجا لا کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اسلم نے کہا:۔

"ٹھیکہ دار صاحب یہ ہیں میرے عزیز اور دوست پرویز صاحب"

ٹھیکہ دار صاحب نے کہا۔ "جی ہاں غائبانہ تعارف تو کافی سے زیادہ ہو چکا ہے۔ بہرحال بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔ لیجیے حقہ نوش فرمائیے مگر تمباکو ذرا سخت قسم کا ہے۔"

میں نے دست بستہ عرض کیا۔ "شکریہ۔ مگر میں محروم ہوں۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے حقے کی نے پھر اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔ "غالباً سگریٹ پیتے ہوں گے آپ۔"

میں نے کہا۔ "جی نہیں سگریٹ بھی نہیں پیتا۔"

عجیب بات پوچھی ٹھیکہ دار صاحب نے۔ "تو پھر کیا پیتے ہیں آپ۔"

مجھے ہنسی آ گئی اور میں نے جیسا سوال تھا ویسا ہی جواب بھی دے دیا کہ "پانی پیتا ہوں۔ چائے پیتا ہوں۔ کافی پیتا ہوں۔ شربت وغیرہ پی لیتا ہوں۔"

اور ٹھیکہ دار صاحب نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر آواز لگائی۔ "میں نے کہا بلقیس بیٹی ذرا چائے بنوا دینا۔"

اسلم نے لاکھ کہا کہ چائے یہاں بھی تیار ہے مگر وہ "کوئی مضائقہ نہیں کوئی مضائقہ نہیں" کہہ کہہ کر اپنے یہاں کی چائے پلوانے پر مصر ہی رہے چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد ادھر ہمارا ملازم چائے اور ناشتہ لے کر آیا اُدھر ایک نہایت خوبصورت سی کشتی میں نہایت دیدہ زیب ٹی کوزی سے ڈھکی ہوئی کیتلی اور نہایت سلیقہ سے رکھی ہوئی پیالیاں لیے ٹھیکہ دار صاحب کی ملازمہ داخل ہوئی اور وہ چائے بھی ہمارے ملازم نے اس سے لے کر میز پر لگا دی مگر ابھی وہ چائے لگا ہی رہا تھا کہ ٹھیکہ دار صاحب نے اپنے یہاں سے آئی ہوئی چائے کے برتنوں میں سے ایک طشتری اٹھا کر کہا:۔

"ایں؟ یہ کیا ہے؟ دردِ سر کی گولیاں۔ یہ کس نے منگائی تھیں۔ ارے بھئی دردِ سر میں کون مبتلا ہے۔ یعنی خواہ مخواہ بھی۔ یہ کس کے لیے لائی ہے تو کامنی؟"

کامنی نے اپنا دوپٹہ منہ پر رکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔ "بٹیا نے بھیجی ہیں۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے عینک آنکھوں سے ہٹا کر ماتھے پر لگا کر گولی کو بغور دیکھا گویا ان گولیوں کو وہ آنکھوں سے نہیں بلکہ ماتھے

سے دیکھنے لگے۔ "بٹیا نے تو بھیجی ہیں مگر کس کے لیے بھیجی ہیں۔ میرے تو پرسوں ہوا تھا سر میں درد۔ گولیاں آج بھیجی گئی ہیں۔ پوچھ تو سہی ذرا جا کر بلقیس سے کہ یہ معمہ کیا ہے۔"

کامنی تو ہنستی ہوئی اندر چلی گئی مگر میں اور اسلم دونوں سمجھ چکے تھے کہ یہ اسی قصہ کا سلسلہ اب تک چل رہا ہے وہ جو اسلم نے ٹھیکہ دار صاحب کو دردِ سر کہہ دیا تھا چنانچہ اب گولیاں بھیجی گئی ہیں کہ اگر میرے باپ دردِ سر ہیں تو یہ دردِ سر کی گولیاں کھاؤ اور ان سے سر کھپاؤ۔ ہم دونوں ٹھیکہ دار صاحب سے آنکھ بچا بچا کر ابھی مسکرا ہی رہے تھے کہ ٹھیکہ دار صاحب نے کیتلی پر سے ٹی کوزی اتار کر اس کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا:۔

"جو منظر اس میں دکھایا گیا ہے اُسے سمجھے آپ۔"

میں نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "غالباً مالن دکھائی گئی ہے جو پھول چُن رہی ہے باغ میں۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے بڑے معلمانہ انداز سے کہا۔ "غلط —— آپ بتائیے اسلم صاحب۔"

اسلم نے کہا۔ "میں بھی بس اتنا ہی سمجھا ہوں۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے کہا:۔ "تو آپ بھی غلط سمجھے ہیں۔ یہ دراصل چائے کا باغ ہے اور اس میں یہ لڑکی جو اپنی وضع سے مشرقی پاکستان کی لڑکی دکھائی گئی ہے، اوپر کی کلی اور دو کونپلیں اپنی چٹکی سے توڑ رہی ہے۔ آپ کو کسی چائے کے باغ میں جانے کا کبھی اتفاق ہوا ہے۔"

ہم دونوں نے ایک ساتھ انکار کر دیا تو وہ بولے۔ "پچھلے سال اہل و عیال کو لے کر میں سلہٹ گیا تھا وہاں چائے کے باغات دیکھنے کا اتفاق ہوا چنانچہ عزیزہ بلقیس سلمہا نے وہاں سے واپسی کے بعد ہی یہ ٹی کوزی بنائی تھی اور اس پر یہ منظر دکھایا تھا۔ مگر ملاحظہ فرمائیے کہ سوئی سے بنائی ہوئی اس تصویر میں بھی کتنی زندگی ہے۔"

میں نے بھی داد دی۔ "واقعی میں تو اس کو مشین کا کام سمجھا تھا۔ بڑی صفائی ہے ہاتھ میں ماشاءاللہ اور یہ خوش سلیقگی ہے کہ ٹی کوزی کے لیے مناسب ترین منظر کا انتخاب کیا ہے۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے بڑی خاکساری کے ساتھ سر جھکا کر کہا۔ "جی ہاں اس کو ہمیشہ اسی قسم کی اُپج سوجھتی ہے۔ آپ کی دعا سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کیا ہے۔ تقریروں کے مقابلہ میں اوّل آئی تھی اس کا کپ بھی لائی ہے۔ اسکول میں مشاعرہ ہوا تو اللہ جانے شاعری اس نے کہاں سے سیکھ لی ہے کہ مشاعرے کے لیے غزل بھی کہہ کر مجھے دکھائی، میں نے کہا کہ بٹیا میرے تو باپ دادا نے بھی کبھی شعر نہیں کہے۔ ٹھیکہ دار ہوں جیسی کہو عمارت بنوا دوں۔ پُل بنوا دوں۔ مسجد اور تالاب بنوا دوں مگر یہ میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ مگر جناب وہ اسی غزل کو پڑھ کر تمغہ بھی لے آئی۔"

اسی وقت ٹھیکہ دار صاحب کی ملازمہ کامنی ایک دوسری کشتی لے کر آموجود ہوئی جس پر کروشیے کے کام کا نہایت نفیس خوان پوش ڈھکا ہوا تھا۔ ٹھیکہ دار صاحب نے کامنی سے پوچھا:۔

"یہ کیا ہے۔ اچھا گویا ناشتہ ہے۔ میں بھی غور کر رہا تھا کہ کیا کہیں گے یہ لوگ بھی اپنے دل میں کہ چائے بھی پلائی تو محض چائے۔ مگر یہ ہے کیا۔"

یہ کہہ کر خوان پوش جو ہٹایا تو اس کے نیچے واقعی نہایت پُرتکلف ناشتہ چنا ہوا تھا سرخ سرخ سیب۔ ٹوسٹ۔ مکھن۔ انڈے۔

بسکٹ اور ایک طشتری میں نہایت نفیس قسم کا حلوہ جس پر چاندی کے ورق لگے ہوئے تھے۔ اسلم نے ان چیزوں کو دیکھ کر کہا:۔

"یہ تو آپ نے تکلف کر دیا ٹھیکہ دار صاحب۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے کہا "میں نے؟ حالانکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا ہوں، آپ کے سامنے بچی کو صرف یہ آواز دی تھی کہ چائے بھیج دو مگر وہ آپ کی دعا سے اس قدر سلیقہ شعار اور سمجھدار ہے کہ بغیر کسی کے کچھ کہے وہ خود موقع اور محل کو سمجھتی ہے اور یہ دراصل اُسی کا حسن انتظام ہے کہ وقت بے وقت کے لیے گھر میں چیزیں مہیا رکھتی ہے۔ یہ نہیں کہ کسی کو چائے پلانا پڑ جائے تو چور دروازوں سے نوکر دوڑائے جائیں بازار جو بازار کی نہایت ناقص مٹھائیاں وغیرہ لا کر مہمان کے سامنے ڈھیر کر دیں کہ لو زہر مار کرو یہ بازاری چیزیں اور ناس مار دو اپنی صحت کا۔ اب مثلاً یہ حلوہ اُسی کے ہاتھ کا بنایا ہوا ہے۔ ذرا چکھیے گا اسے پرویز صاحب۔"

میں نے تھوڑا سا حلوہ ایک طشتری میں نکال کر چکھا جو عام قسم کے گاجر کے حلووں کی قسم کا تھا مگر چونکہ خصوصیت کے ساتھ اور داد طلب انداز سے مجھ کو چکھایا گیا تھا لہٰذا میں نے پہلا ہی چمچہ کھا کر کہا:۔

"سبحان اللہ۔ لطف آ گیا بخدا۔ کس قدر متوازن مٹھاس ہے اور لطافت کو قائم رکھنے کے لیے کس خوبصورتی کے ساتھ اس سنگنیت سے بچایا گیا ہے جس سے عام طور پر حلوے بچائے نہیں جا سکتے۔"

ٹھیکہ دار صاحب نہایت فخر آمیز تبسم کے ساتھ بولے "مگر مجھے بھی آپ ہے کس چیز کا حلوہ۔"

ظاہر ہے کہ گاجر کا حلوہ تھا مگر میں نے ٹھیکہ دار صاحب کو خوش کرنے کے لیے کہا "سیب کا معلوم ہوتا ہے یا شاید لوکی کا ہو۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے ایک قہقہہ لگا کر کہا "کس قدر قریب ہے سیب اور لوکی میں آپ کے نزدیک حالانکہ یہ نہ سیب کا حلوہ ہے نہ لوکی کا بلکہ محض گاجر کا حلوہ ہے۔"

میں نے گویا حیرت سے کہا "اور اس کے باوجود اس قدر ہلکا! کمال ہے یہ تو۔ اور لذیذ کس قدر ہے۔ تم نے کھایا اسلم؟"

اسلم نے سیب چھیلتے ہوئے کہا "جی ہاں میں سیب کے بعد کسی اور طرف متوجہ ہوں گا۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے کہا "ٹھیک ہے۔ صاحبزادی بھی یہی کہتی ہیں کہ نہار منہ پہلے سیب کھانا چاہیے اور انگریزی میں نہ جانے کیا فرماتی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ سیب کھاؤ بیماریاں بھگاؤ۔ پرویز صاحب یہ بسکٹ بھی گھر ہی کے بنے ہوئے ہیں۔ بچی نے خود ہی بنائے ہیں۔ بھئی مجھے تو بیحد پسند ہیں۔"

میں نے جلدی سے ایک بسکٹ کھا کر کہا "ماشاء اللہ۔ بھلا بازار کے بسکٹوں میں یہ بات کہاں۔ مگر آپ نہ فرماتے تو میں ان کو ولایتی بسکٹ سمجھتا۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے کہا "اور ہیں بھی یہ اس اعتبار سے ولایتی کہ بلقیس نے ان کو بنانا ایک میم ہی سے سیکھا ہے جس کی کوٹھی کا ٹھیکہ میرے پاس تھا اور بلقیس سے اس میم کو بیحد دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ صاحب کیا ہنرمند اور سلیقہ شعار لیڈی تھی وہ بھی۔ یہ جو خوان پوش ہے بلقیس نے جب کروشیا سے اس کو بنا ہے تو وہ میم ایک ایک کو دکھاتی پھرتی تھی کہ بلقیس کے ہاتھ میں کس قدر صفائی ہے اور کتنی بڑی آرٹسٹ ہے یہ لڑکی وہ تو میرے سر تھی کہ میں بلقیس کو اس کے ساتھ ولایت بھیج دوں۔ مگر ناکتخدا لڑکی کو سات سمندر پار

میں کیسے بھیج دیتا۔”

میں نے کہا۔“ہاں صاحب ہم لوگوں میں اس قسم کی آزادیاں کہاں۔”

ٹھیکہ دار صاحب نے کہا۔“اور وہ خود بھی پسند نہیں کرتی اس قسم کی آزادی۔ آپ کی دعا سے کالج میں پڑھ رہی ہے مگر کیا مجال کہ برقعہ کے باہر چشمِ فلک نے بھی اس کو دیکھا ہو۔”

ٹھیکہ دار صاحب اسی طرح اپنی صاحبزادی کی شان میں قصیدہ پڑھتے رہے، میں داد دیتا رہا مگر اسلم بیٹھا ہوا مسلسل کھولتا رہا اور سارا غصہ ناشتہ پر اتارتا رہا کہ سیب کھا چکا تو حلوے کی پلیٹ پر حملہ کر دیا اس سے فارغ ہوا تو مکھن ہی ٹوسٹ پر موٹی موٹی تہیں جما کر صاف کر گیا اور پھر انڈوں کی شامت لے آیا۔ وہ تو معلوم ہو رہا تھا کہ انتقاماً ناشتہ کھا نہیں بلکہ واقعی ٹھونس رہا ہے البتہ کبھی کبھی قہر آلود نگاہوں سے ٹھیکہ دار صاحب کو دیکھ لیتا اور پھر دانت پیس کر بے زبان ناشتہ سے بدلہ لینا شروع کر دیتا تھا۔ خدا خدا کر کے ناشتہ ختم ہوا اور چونکہ ہم دونوں کو دفتر جانا تھا لہذا ٹھیکہ دار صاحب سے رہائی نصیب ہو سکی۔

۳

وہ مصیبت جو ہر مردانے گھر میں ہوتی ہے جہاں کوئی عورت نہ ہو اُس میں ہم دونوں بھی مبتلا تھے کہ مثلاً کپڑے بدلنے جو بیٹھے تو پتہ چلا کہ قمیص میں بٹن ہی ندارد ہیں۔ اب ڈھونڈھ رہے ہیں سوئی دھاگہ اور فرض کر لیجئے کہ مل بھی گیا سوئی دھاگہ تو سوئی میں دھاگہ پرونا کیا آپ کے خیال میں کوئی معمولی کام ہے۔ نہ جانے کتنے وار خالی جاتے ہیں تب کہیں جا کر سوئی کے ناکہ سے دھاگہ گذر سکتا ہے۔ مثلاً آج ہی مصیبت میں اسلم غریب مبتلا تھا۔ خدا جانے بیچارے نے کتنی کوشش کی ہو گی کہ آخر کار اس کو میری مدد کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس نے میرے کمرے میں آکر کہا:۔

“سوئی میں دھاگہ پرونا آتا ہے تم کو؟”

میں نے کہا۔“کسی درزی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ تو نہیں کیا ہے مگر لاؤ کوشش کرتا ہوں۔”

اور خدا کو میری شرم رکھنا منظور تھی کہ پہلی ہی کوشش میں دھاگہ سوئی کے ناکے سے گذر گیا اور جب میں نے نہایت فخر کے ساتھ اسلم کو اپنا یہ کمال دکھایا تو وہ حیران ہی تو رہ گیا:۔

“کمال کر دیا بخدا۔ یقیناً تم نے اس فن پر ریاض کر رکھا ہے ورنہ اتنا صحیح نشانہ کسی اناڑی کے بس کا نہیں ہے۔”

اور وہ میرے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ کر قمیص میں بٹن ٹانکنے کی کوشش کرنے لگا اور غالباً دو ہی تین ہاتھ چلائے ہوں گے کہ ایک مرتبہ “سی سی سی” کرتا ہوا ایکدم کھڑا ہو گیا اور قمیص فرش پر جا گری۔ اب جو میں اس کو دیکھتا ہوں تو وہ ایک ہاتھ سے اپنے دوسرے ہاتھ کی انگلی پکڑے کھڑا ہے اور انگلی کے سرے پر خون کا ایک موٹا سا قطرہ کانپ رہا ہے۔ میں نے کہا:۔

“کیا چبھو لی سوئی انگلی میں؟”

اور اسی وقت دیوار کے اس پار سے بلقیس کی آواز آئی“امی جان۔ کیا پھر اُس انگلی کو انگشتِ شہادت کہتے ہیں جس میں

سوئی چبھ جائے۔"

اسلم نے دانت پیس کر زیرِ لب کہا "بدتمیز۔"

اور میں نے ہنس کر داد دی "مگر بات لاجواب کہی گئی ہے۔ خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہوئے ہو تو غصہ آخر کیوں کر رہے ہو؟"

اسلم نے واقعی غصہ سے کہا "جی چاہتا ہے کہ دھوبی سامنے آجائے تو گولی مار دوں۔ بٹنوں سے تو جیسے بیر ہے اس کمبخت کو کیا مجال کہ کسی قمیص میں کوئی بٹن اس نے سلامت چھوڑا ہو اللہ جانے بٹنوں کی تجارت کرتا ہے یا کیا کہ کبھی جو دھلے ہوئے کپڑوں میں بٹن صحیح سلامت رہ جائیں۔"

میں نے ترس کھا کر کہا "لاؤ میں لگا دوں بٹن۔ حالانکہ یہ کام مجھ کو بھی نہیں آتا مگر کوشش کرتا ہوں۔ جب سوئی میں ڈھاگہ ڈال لیا تو یہ کونسا بڑا کام ہے۔"

اور اسی وقت کامنی نے روئی کی ایک پھریری اور ٹنکچر آیوڈین کی ایک شیشی اسلم کو دیتے ہوئے کہا:۔

"یہ بٹیا نے آپ کے لیے بھیجی ہے اور قمیص منگائی ہے۔"

میں نے پھریری اور ٹنکچر دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا "قمیص تو یہ لو مگر اس زخم کی مرہم پٹی کے لیے میں ان کو اسپتال لیے جا رہا ہوں۔"

کامنی کو بھی یہ سن کر ہنسی آگئی اور وہ منہ پر دوپٹہ رکھ کر ہنستی ہوئی قمیص لے کر بھاگی تو اسلم نے کہا "دیکھ لیا آپ نے اس طرح مذاق اڑایا جاتا ہے بات بات پر۔"

میں نے کہا "معاف کیجیے گا بندہ نواز یہ مذاق تو آپ خود اڑوالتے ہیں۔ ذرا سی سوئی چبھ گئی تو سسکاریاں بھرتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور دھوبی کو گولی تک مارنے کا ارادہ کر لیا۔"

اسلم نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا "اچھا خیر اُدھر آجاؤ۔ یہاں تو دیوار کے بھی کان ہیں۔"

میں نے اس کے ساتھ جاتے ہوئے کہا "صرف کان نہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ آنکھیں بھی ہیں۔"

مگر ابھی ہم دونوں برآمدے میں جا کر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ ٹھیکہ دار صاحب کچھ سراسیمہ سے داخل ہو کر نہایت گھبراتے ہوئے انداز سے بولے:۔

"خیریت تو ہے میں نے تو ابھی سنا کہ خدانخواستہ اسلم میاں کچھ زخمی ہو گئے ہیں۔"

میں نے ہنس کر کہا "استغفر اللہ۔ اگر زخمی ہونا اسی کو کہتے ہیں تو نہ جانے زخمی ہونے کو کیا کہا جائے گا۔ قمیص میں بٹن ٹانک رہے تھے یہ حضرت کہ ذرا سی سوئی انگلی میں چبھ گئی تھی۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے بدستور تشویش کے ساتھ کہا "یہ ذرا سی بات بھی خطرناک ہو سکتی ہے۔ فرض کر لیجیے کہ وہ سوئی زنگ آلود ہو تو اس کا زہر جسم میں داخل ہو سکتا ہے۔ ذرا دکھائیے تو مجھے۔"

اور کچھ نہ پوچھیے کہ اسلم کا کیا حال تھا اس وقت۔ دراصل اس کا رونے کو جی چاہ رہا تھا مگر وہ کھسیانی ہنسی ہنس ہنس کر اپنی اس انگلی کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر ٹھیکہ دار صاحب نے بڑھ کر خود ہاتھ پکڑ لیا اور انگلی دیکھتے ہوئے بولے:۔

"بھلا یہ کون سا موقع ہے اس تکلف کا۔ بظاہر تو کوئی خاص بات نہیں مگر احتیاطاً ٹنکچر لگا ہی دینا چاہیے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آخر

آپ بٹن ٹانکنے بیٹھے ہی کیوں۔ ارے بھئی سیدھی سی بات تھی کہ قمیص اندر بھیج دی ہوتی، بٹن ٹنک کر آجاتے۔ یہ آپ کو تکلف کی سزا ملی ہے کیا خوب کہا ہے کسی شاعر نے کہ۔ ع

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر

چنانچہ آپ نے تکلف برتا اور آپ کو سراسر تکلیف پہنچی۔“

میں ابھی اس لطیفہ کے نشہ ہی میں سرشار تھا کہ مصرعہ میں ذوق موجود ہے اور وہ فرما رہے ہیں کہ کیا خوب کہا ہے کسی شاعر نے کہ۔ ع —— اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر

کہ ٹھیکہ دار صاحب نے مجھ کو بھی مخاطب کر لیا :۔

”کان کھول کر آپ دونوں صاحبان سن لیں کہ یہ خانہ بے تکلف ہے اور میں آپ دونوں کو بخدا اپنا کرایہ دار نہیں بلکہ عزیز سمجھتا ہوں لہٰذا آئندہ اس قسم کا تکلف نہ ہو ورنہ مجھے صدمہ ہوگا میں نے تو پہلے ہی دن اسلم میاں سے کہہ دیا تھا کہ اس گھر کو آپ اپنا گھر سمجھ کر رہیں اور اگر محض کرایہ دار بن کر رہنا ہے تو اس شہر میں بے شمار گھر اور بھی مل سکتے ہیں بلکہ میں تو اکثر اسی پر نادم ہوا کرتا ہوں کہ آپ کو علیحدہ چولہا ہانڈی کرنا پڑتا ہے مگر بلقیس کی والدہ کی یہ رائے بھی صائب ہے کہ بہت زیادہ یگانگت سے بھی پھوٹ پڑ جایا کرتی ہے۔“

اسی وقت کامنی اندر سے قمیص لے کر آگئی اور اس نے کہا :۔

”بٹیا نے کہا ہے کہ باقی قمیصیں اور مرمت کرنے والے کپڑے بھی دے دیجئے۔“

اسلم نے کہا ”شکریہ۔ کہہ دیجئے گا باقی سب کپڑے ٹھیک ہیں۔“

ٹھیکہ دار صاحب نے کہا ”پھر وہی تکلف۔ بہتر ہے میں اس کی دوسری ہی صورت اختیار کر دوں گا۔“

ہم دونوں نے اس دوسری صورت پر غور کرنے کے بجائے دفتر جانے کی تیاریاں شروع کر دیں اور ٹھیکہ دار صاحب سے رخصت ہو کر ہم دونوں دفتر روانہ ہو گئے۔ گھر سے نکلنے کے بعد میں نے اسلم سے کہا :۔

”اللہ جانے یہ بڑے میاں وہ دوسری صورت کونسی اختیار کریں گے۔“

اسلم نے کہا ”خیر یہ بیچارہ بڈھا تو نہایت پُرخلوص قسم کا آدمی ہے مگر ان بڑے میاں کی صاحبزادی کی تیزیوں سے میں بہت گھبراتا ہوں۔“

میں نے کہا ”میری سمجھ میں تو تمہاری یہ گھبراہٹ آتی نہیں، اچھی خاصی ذہین قسم کی تیز طرار لڑکی ہے اور خدا کرے یہ میں اس پر الزام نہ رکھ رہا ہوں مگر میرا خیال تو یہ ہے کہ وہ تم میں غیر معمولی دلچسپی بھی لے رہی ہے۔“

اسلم جیسے سہم کر کھڑا ہو گیا ”کیوں دہلا رہے ہو مجھے۔ یہ تیزی طراری اور ذہانت ایسی ہی پسند ہے تو اس شامت کا رُخ اپنی ہی طرف کیوں نہیں کر لیتے۔“

میں نے کہا ”گویا میں بھی آپ کی طرح — برائے فروخت — کی تختی لگائے پھر رہا ہوں۔ اگر میں تمہاری طرح آزاد ہوتا تو اس امکان پر پھولا نہ سماتا مگر خدا سلامت رکھے میرے متعدد بچوں کی واحد ماں کو جس کے نام میرے جملہ حقوق نہ جانے کب کے محفوظ ہو چکے ہیں۔“

اسلم نے کہا ”تو گویا میں ہی فالتو رہ گیا ہوں۔ یہ تو عجیب خود غرضی کی باتیں کر رہے ہیں آپ۔“

میں نے کہا۔ "تو بھائی صاحب آپ مجھ سے کیوں لڑ رہے ہیں میں نے تو بلقیس سے نہیں کہا ہے کہ وہ آپ کی اس طرح گاہک بن جائے۔ میرے یہاں آنے سے پہلے ہی آپ دونوں کے باہمی مراسم پیدا ہو چکے تھے۔"

اسلم نے گھبرا کر کہا۔ "مراسم ؛ مراسم کیسے۔"

میں نے کہا۔ "وہی مراسم جن سے بظاہر آپ سخت بیزار نظر آتے ہیں۔"

اسلم نے تلخی سے کہا۔ "بظاہر سے کیا مطلب ہے آپ کا۔"

میں نے کہا۔ "بظاہر سے میرا مطلب ہے بظاہر —— بھلا غور کرنے کی بات ہے کہ ایک لڑکی آپ کو نہ صرف مسلسل اور متواتر چھیڑ ہی رہی ہے بلکہ وہ آپ کی ذرا ذرا سی بات پر نظر بھی رکھتی ہے۔ آپ کی قمیص میں بٹن بھی ٹانکتی ہے۔ آپ کے کپڑے بھی سینے پرونے کے لیے منگا بھیجتی ہے اور آپ سے مسلسل دلچسپی لے رہی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ دلچسپی بے معنی تو نہیں ہو سکتی۔"

اسلم نے کہا۔ "یہ تو اچھی زبردستی ہے۔ یہ تو تم کو معلوم ہی ہے کہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "اسی پر تو مجھ کو حیرت ہے۔"

اسلم نے کہا۔ "اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ دلچسپی ہونا تو درکنار مجھے تو وحشت ہوتی ہے اس تصور سے بھی اور بخدا میں ان صاحبزادی سے سخت بیزار ہوں۔"

میں نے کہا۔ "اس کی دلچسپی اور تمہاری بیزاری کی صرف ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔"

اسلم نے بڑے تجسس سے پوچھا۔ "وہ کیا۔"

میں نے کہا۔ "وہ یہ کہ تم نے اس کو اب تک نہیں دیکھا ہے اور وہ تم کو برابر دیکھتی رہتی ہے۔"

اسلم نے منہ بنا کر کہا۔ "جی اور کیا ایسا ہی تو میں گلفام ہوں کہ وہ مجھ کو دیکھ کر اس طرح بے قابو ہو گئی ہیں اور اس شدومد سے دلچسپی لے رہی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ بھی ایسی قابلِ نفرت نہ ہو جیسی بغیر دیکھے آپ اس کو سمجھ رہے ہیں۔"

اسلم نے جز بز ہو کر کہا۔ "نہیں صاحب وہ محض بیوقوف بنا رہی ہے۔ آج کل کی اسکولوں اور کالجوں کی بعض لڑکیوں کو بیوقوف سازی کا بھی بے حد شوق ہو گیا ہے وہ خواہ مخواہ بھی اچھے خاصے نوجوانوں کو اپنے ان ہی ہتھکنڈوں سے پٹڑی سے اتار دیا کرتی ہیں مگر میں ایسا چغد نہیں ہوں۔"

میں نے کہا۔ "بعض اوقات نہایت مسلم الثبوت قسم کے چغدوں کو بھی اپنے متعلق یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ وہ چغد نہیں ہیں بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ آج تک کسی چغد نے اپنے کو چغد نہیں سمجھا ہے اس لیے کہ یہ احساس ہی چغدیت کے منافی ہے۔"

اسلم نے پہلے تو غور کیا پھر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا خیر — مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ صرف بیوقوف بنا رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "مگر اس بیوقوفی کا جواب ہے کہ آپ نے نہ اس غریب کو دیکھا نہ اس سے براہِ راست کوئی واسطہ پڑا اور خواہ مخواہ بھی اس سے بیزار بنے بیٹھے ہیں۔"

اسلم نے کہا۔ "سوال یہ ہے کہ میں اس سے کیوں دلچسپی لوں۔"

میں نے کہا ”جناب کے اسی سوال سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دلچسپی کیوں نہ لیں آپ۔“

اسلم نے اُلجھ کر کہا ”بھئی تم اور بھی پریشان کر رہے ہو۔ مگر میں بخدا عاجز آچکا ہوں، ان باتوں سے اور یہ بڑے میاں اور بھی اپنی صاحبزادی کے قصیدے سنا سنا کر بور کرتے رہتے ہیں کوئی پوچھے کہ آپ کی صاحبزادی بڑی ہنر مند۔ بڑی سلیقہ شعار بڑی لائق فائق، اور بڑی وغیرہ وغیرہ ہیں تو ہم کیا کریں، دلوا دیجئے ان کو نوبل پرائز۔ ہمارا سر کیوں کھاتے ہیں آپ اور ہم کو کیوں مرعوب کرتے ہیں۔“

میں نے کہا ”اس بیچارے کا شاہکار اس کی یہی بیٹی ہے لہذا وہ اسی کا سرخروئی کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ شاعر ہوتا تو شعر سناتا۔ سیاستدان ہوتا تو سیاسی داؤں پیچ سناتا اپنے مگر وہ تو محض باپ واقع ہوا ہے۔

اسلم کا دفتر آچکا تھا لہذا وہ خدا حافظ کہہ کر چلا گیا اور میں اپنی راہ ہو لیا۔

۴

یہ اسی دن کا قصہ ہے کہ میں جو شام کو دفتر سے واپس آیا تو اسلم صاحب برآمدے میں ایک کرسی پر سر تھامے بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھ کو دیکھتے ہی کہنے لگے:۔

”میں تو خیر صاف ہو گیا ہوں بالکل اب ذرا آپ بھی اپنا کمرہ کھول کر دیکھ لیجئے کہ آپ کی کیا کیا چیزیں غائب ہوئیں۔“

میں نے سناٹے میں آکر کہا ”صاف ہو گئے ہو بالکل؟ مطلب کیا ہے تمھارا؟“

اسلم نے نہایت پسپائی کے انداز سے کہا ”چوری ہو گئی اور کیا ہوتا۔ ایک چیز نہیں چھوڑی ہے۔ دیکھو تو سہی ذرا اپنا کمرہ۔“

میں نے لپک کر اپنا کمرہ کھولا تو میری تمام چیزیں بجنسہٖ رکھی ہوئی تھیں۔ تمام سوٹ کیس اپنی جگہ پر رکھے ہوئے تھے الماری کھول کر دیکھی تو کپڑے سب کے سب موجود تھے۔ حد یہ ہے کہ آج میں تکیہ کے نیچے اپنی گھڑی بھول گیا تھا وہ بھی اسی جگہ رکھی ہوئی ملی۔ مگر اپنے کمرے سے جا کر اسلم کے کمرے کو جو دیکھا تو وہاں اصطلاحاً نہیں بلکہ واقعی جھاڑو پھری ہوئی نظر آئی۔ بستر وغیرہ تو خیر نہایت سلیقہ سے لگا ہوا تھا مگر الماری میں ایک کپڑا موجود نہ تھا۔ تین سوٹ کیس تھے غریب کے وہ ندارد تھے۔ بجلی کی استری میز پر رکھی رہتی تھی وہ ندارد تھی۔ میں نے ایک ہی نظر میں یہ سب کچھ دیکھ کر اسلم سے کہا:۔

”رحمان سے پوچھا“

اسلم نے کہا ”وہ تو آج صبح ہی اجازت لے چکا تھا کہ اپنے بھائی سے ملنے جاؤں گا۔“

میں نے کہا ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ پہلے ہی پروگرام بنا چکا تھا کہ ہم لوگ دفتر جائیں اور وہ یہاں ہاتھ صاف کر جائے۔ مگر سوال یہ ہے کہ میرا سامان اس نے کیوں نہیں چھوا۔“

اسلم نے کہا ”جلدی میں صرف ایک ہی کمرے کا سامان اٹھا سکا ہو گا۔“

میں نے کہا ”مگر بڑے تعجب کی بات ہے کہ وہ سامان سمیٹتا رہا اور ٹھیکیدار صاحب کے یہاں کسی نے اس کو ٹوکا بھی نہیں پوچھا تو ہوتا ذرا کامنی کو بلا کر۔“

اسلم نے کہا: "ظاہر ہے کہ ٹھیکیدار صاحب مالک مکان ہیں چوکیدار تو نہیں ہیں۔ مگر مجھے تعجب اس بات پر ہے کہ اس کمرے میں اور بھی کئی قیمتی چیزیں تھیں وہ اس نے کیوں چھوڑ دیں۔ مثلاً یہ ٹائم پیس نہایت قیمتی ہے۔ یہ ٹائپ رائٹر جوں کا توں رکھا ہوا ہے۔ میز کے خانے میں میرا پرس بند تھا وہ بھی موجود ہے حالانکہ اس میں اچھی خاصی رقم تھی۔"

میں نے کہا: "تم کو رحمان پر بھروسہ بھی تو اتنا تھا کہ کمرہ کبھی مقفل ہی نہ کیا حالانکہ میں ہمیشہ اپنا کمرہ بند کر کے جاتا ہوں۔"

میں ابھی یہ کہہ ہی رہا تھا کہ رحمان سامنے سے آتا ہوا نظر آیا اور اس کو دیکھ کر اسلم نے مجھے اور میں نے اسلم کو حیرت سے دیکھا۔ اس نے کچھ اس طرح جیسے کوئی بات ہی نہ ہو قریب آ کر سلام کرتے ہوئے کہا:-

"بس ملنے میں دیر ہو گئی نہیں تو ٹھیک چائے کے وقت پر آ جاتا۔ چائے بناؤں؟"

اسلم نے کہا: "چائے گئی جہنم میں تمہاری عدم موجودگی میں ہر چیز چوری ہو گئی میرے کمرے کی۔"

رحمان نے دم بخود ہو کر کہا: "چوری؟ —"

اور وہ دوڑا اسلم کے کمرے کی طرف۔ غالباً اس وقت اسلم کے ذہن میں بھی یہی سوال ہو گا جو میرے ذہن میں تھا کہ اب تک تو شبہ رحمان پر تھا لیکن اگر اس نے یہ حرکت کی ہوتی تو واپس کیوں آتا اور واپس آ بھی گیا تھا تو اتنا بڑا اداکار تو ظاہر ہے کہ وہ ہو نہیں سکتا کہ اس طرح حیرت کا اظہار کرے اور اس سادگی سے اسی کمرے کی طرف دوڑے جس کو خود اس نے لوٹا ہے۔ ہم دونوں ابھی تک اسی گتھی کو سلجھا رہے تھے کہ رحمان نے واپس آ کر کہا:-

"مگر صاحب یہ کیسا چور تھا جو کچھ لے گیا ہے تو کچھ دے بھی گیا ہے۔ یا شاید دروازوں پر پردے آپ نے لگائے ہوں۔"

ہم دونوں نے تقریباً ایک ساتھ کہا: "پردے؟"

اور دوڑے کمرے کے اندر جہاں واقعی دونوں دروازوں اور دونوں کھڑکیوں پر نہایت خوبصورت پردے لٹکے ہوئے تھے۔ میں نے قریب جا کر ایک کھڑکی کے پردے کو جو ہاتھ میں لے کر دیکھا تو اسلم کے ایک سوٹ کیس کی جھلک نظر آئی اور اب جو پردہ اٹھایا ہے تو تینوں سوٹ کیس نہایت سلیقہ سے اس پردے کے پیچھے رکھے ہوئے نظر آئے۔ میں نے قہقہہ بلند کرتے ہوئے کہا:-

"لو بھئی مبارک ہو تمہارا سامان چوری نہیں ہوا بلکہ پردہ نشین ہو گیا ہے۔ یہ رہے تینوں سوٹ کیس۔"

اسلم نے قریب آتے ہوئے کہا: "اس کا مطلب یہ ہوا کہ باقی چیزیں بھی اسی طرح کسی نہ کسی پردے میں ہوں گی۔"

اور یہ کہہ کر اس نے ایک ایک پردہ اٹھا کر دیکھنا شروع کیا۔ مگر اس کو اپنے وہ کپڑے کہیں نہ مل سکے جو الماری میں اس طرح بھرے ہوئے تھے جیسے گٹھری کا جھونجھ ہو مگر قبل اس کے کہ وہ ان کپڑوں کے متعلق تحقیقات کرتا۔ ٹھیکیدار صاحب کچھ پریشان سے کمرے میں داخل ہو کر بولے:-

"کمال کرتے ہیں آپ لوگ بھی کہ نہ کسی سے پوچھا نہ گھریلو طور پر تحقیقات کی اور تھانہ چوکی بھی شروع کر دی۔ بھلا بتائیے میرے گھر پر پولیس آ موجود ہو گی اور مال مسروقہ میرے گھر کے اندر سے برآمد ہو گا تو میری کتنی بے عزتی ہو گی۔ صاحب آپ کے تمام کپڑے اندر اٹھوا لیے گئے ہیں تاکہ ان کو درست کر دیا جائے گودڑ کی طرح الماری میں ٹھنسے ہوئے تھے کسی قمیص میں بٹن ندارد تھے تو کوئی پتلون بغیر استری کے ملا دلا پڑا تھا۔ کسی کوٹ کا کالر مرمت طلب تھا تو کسی شیروانی کی جیبیں کٹی ہوئی تھیں۔ بچی نے اگر

وہ سب کپڑے نکال لیے ہیں تاکہ ان کو درست کر دیا جائے۔"

میں نے کہا "یہ تو درست ہے مگر یہ تھانہ چوکی کی کیا بات فرما رہے تھے آپ۔"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا "یہی کہہ رہا تھا میں کہ بلاوجہ پولیس نے آ کر تحقیقات شروع کر دی تو کس قدر بدنامی کی بات ہے میرے لیے۔"

اسلم نے کہا "مگر پولیس کا یہاں کیا ذکر تھا۔"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا "اور ذکر کس کو کہتے ہیں کہ آپ جا رہے تھے رپورٹ درج کرانے۔ حالانکہ پہلے آپ کو مجھ سے دریافت کرنا چاہئے تھا۔ مگر میں پچھوانا چاہتے تھا۔"

اسلم نے کہا "مگر یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں پولیس میں رپورٹ درج کرانے جا رہا تھا۔"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا "مجھے نہایت وثوق سے معلوم ہوا ہے۔"

اسلم نے کہا "اور میں نہایت وثوق سے عرض کر رہا ہوں کہ یہ غلط اطلاع آپ کو پہنچائی گئی ہے البتہ میں ڈھونڈھ ضرور رہا تھا کہ سوٹ کیسوں کی طرح یہ کپڑے کس پردے میں رکھے گئے ہیں۔"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا "کیسے رہے یہ پردے؟ اس کمرے کے رنگ اور اس صوفے کی وضع سے میل کھاتا ہوا ابھی کپڑا صاحبزادی نے پسند کیا ہے۔ مگر پرویز صاحب کے کمرے کے لیے جو پردے آئے ہیں ان کا تو جواب ہی نہیں۔ کل دیکھئے گا پرویز صاحب آپ اپنا کمرہ بھی۔ آپ کا کمرہ آج اس لیے درست نہیں کیا گیا کہ ان حضرت سے تو اجازت لینے کی گویا ضرورت ہی نہ سمجھی گئی مگر آپ سے اجازت کے علاوہ کنجی لینا بھی ضروری تھی اس لیے کہ آپ تو اپنا کمرہ مقفل کر جاتے ہیں نا اور میں نیک نیتی کے ساتھ سہی قفل شکنی کو اخلاقی جرم سمجھتا ہوں۔"

میں نے کہا "مگر یہ زحمت آپ اٹھا ہی کیوں رہے ہیں۔"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا "یہ زحمت اس لیے اٹھائی جا رہی ہے کہ آپ لوگ نہیں اٹھاتے۔ اب تک انتظار کیا گیا کہ شاید آپ لوگ خود اپنے رہنے کے ٹھکانے کو آراستہ کر لیں گے مگر آپ لوگ تو عجیب درویش صفت واقع ہوئے ہیں کہ گھر میں بھی اس طرح رہتے ہیں کہ کیا کوئی ویٹنگ روم میں رہتا ہو گا۔ حد یہ ہے کہ ان اسلم صاحب کے بستر کے نیچے سے ہولڈال تک معہ تسموں کے برآمد ہوا ہے۔"

اسلم نے کہا "مگر ہماری اس بدسلیقگی کی سزا آخر آپ کیوں بھگتیں۔"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا "میاں سچی بات تو یہ ہے کہ مردوں کی اکثریت اسی قسم کی اوٹ پٹانگ ہوتی ہے جیسے آپ ثابت ہوئے ہیں۔ مثلاً میں خود بجنسہ کباڑیا ہوتا اگر بلقیس میرا خیال نہ رکھتی چنانچہ باہر سے آ کر میں خود کوٹ ایک طرف اچھال دیتا ہوں۔ ٹوپی گھڑونچی پر رکھ آتا ہوں، جوتوں کے اندر موزے ٹھونس کر ان کو پلنگ کے نیچے کھسکا دیتا ہوں، چھڑی پلنگ پر لٹا دیتا ہوں اور نہ جانے کیا کیا کرتا ہوں مگر دوسرے دن ہر چیز نہایت سلیقہ سے اپنی جگہ پر رکھی ہوئی ملتی ہے۔ خیال آتا ہے تو صرف یہ کہ چار دن میں جب بلقیس کی شادی ہو جائے گی تو میرا کیا حشر ہو گا۔"

میں نے کہا "کیوں کیا بیگم صاحبہ محترمہ سے آپ کو اس دستگیری کی توقع نہیں ہے۔"

ٹھیکیدار صاحب نے منہ بنا کر کہا "اجی توبہ کیجئے ان کی ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی تک تو میں خود اڑاتا ہوں وہ کیا کریں گی میرا کوئی

کام نہایت ٹھس قسم کی خاتون واقع ہوئی ہیں ان کی تیمارداری بھی اسی بیچاری بچی کو کرنا پڑتی ہے۔"

اسلم نے کہا "تیمارداری؟ مگر مجھے تو آج تک پتہ ہی نہ چلا کہ نصیب دشمناں کچھ طبیعت خراب ہے ان کی۔"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا "طبیعت نہیں۔ عادت خراب کر دی ہے بلقیس نے کہ ماں کو ہل کر پانی بھی نہیں پینے دیتی۔ نتیجہ یہ کہ وہ بیٹھے بیٹھے بس پھولتی ہی جا رہی ہیں اور اس تیزی سے موٹی ہو رہی ہیں کہ بھائی مجھے تو ہر وقت یہ ڈر رہتا ہے کہ اس ابتدا کی انتہا کیا ہو گی۔ پرویز صاحب میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے گھر میں سے نہایت چھریرے اور سبک جسم کی خاتون تھیں اور بڑی نزاکت تھی ان کی جسامت میں مگر اب تو یہ حال ہے کہ چاول میں نے بند کر رکھے ہیں۔ آلو ان کو کھانے نہیں دیتا۔ مرغن غذاؤں سے ان کو پرہیز کراتا ہوں وہ خود ڈائٹنگ کرتی ہیں۔"

میں نے حیرت سے پوچھا "جی کیا فرمایا ڈانسنگ؟ یعنی رقص فرماتی ہیں۔"

اور کمرے کی دیوار کے پیچھے سے "کھی کھی کھی" قسم کی ہنسی کی آواز دور جاتی ہوئی محسوس ہوئی اور ٹھیکیدار صاحب نے ایک دم سے چونک کر کہا:۔

"رقص؟ یعنی ناچ؟ استغفر اللہ۔ جی نہیں بندہ نواز میں نئی روشنی سے ابھی اتنا نہیں چوندھایا ہوں کہ میرے یہاں کی خواتین ناچنا شروع کر دیں۔ میں تو اس چیز کو کہہ رہا تھا جس کا مفہوم ہے کم کھانا۔"

اسلم نے کہا "اچھا اچھا ڈائٹنگ کو کہہ رہے تھے آپ۔ میں خود حیران تھا کہ بیگم صاحبہ کا ڈانسنگ سے کیا تعلق تو گویا ڈائٹنگ بھی کرتی ہیں وہ۔"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا "وہ بیچاری خود اپنے مٹاپے سے عاجز ہیں اور اس کو مستقل مرض سمجھتی ہیں بلکہ میرا تو ارادہ ہو رہا ہے کہ اب ان سے چکی پسوایا کروں گا۔ مگر سُنا ہے کہ تیرنے سے بھی جسم سڈول اور چھریرا ہو جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ان کو تیرنے کا انتظام کہاں کیا جائے۔ جی نہیں بس چکی پسوانا ٹھیک رہے گا۔"

اسلم نے کہا "اس کے لیے کچھ ورزشیں بھی تو ہوتی ہیں۔"

ٹھیکیدار صاحب نے بڑی تشویش سے کہا "چہ خوش یعنی آپ کا مطلب ہے ان کو باقاعدہ پہلوان بنا دیا جائے۔ یہ غلط ہے اور نہ یہ عورت ذات کو زیب دیتا ہے کہ وہ بیٹھکیں نکالتی رہے اور ڈنٹر مگدر وغیرہ کا شغل کرے بس چکی والی تجویز نہایت مناسب ہے ایک تو یہ کہ گھر کا پسا ہوا آٹا ملے گا کھانے کو، دوسرے ان کا وزن بھی کم ہو گا بھائی وہ تو اب پرگنہ کی پرگنہ نظر آنے لگی ہیں۔"

میں نے ان کو ایک اور ترکیب بتائی کہ آپ ان کو نہار منہ ایک کیلا کھلا کر ایک پیالی دودھ پلا دیا کیجیے۔ بس یہی ان کا ناشتہ ہو اور اس کے بعد خواہ کتنی ہی بھوک لگے وہ کچھ نہ کھائیں تکلیف تو بہت ہو گی کلیجہ کھرچے گا۔ بھوک سے بُرا حال ہو گا مگر یہ تکلیف ان کو برداشت کرنا پڑے گی اور جب بھوک بالکل ہی ناقابل برداشت ہو جائے تو مغرب کے وقت کوئی ہلکی سی غذا آدھی بھوک باقی رکھ کر کھا لیا کریں پھر دیکھیے کہ چند ہی دن میں کیا ہوتا ہے۔"

اسلم نے کہا "مگر میرا خیال ہے کہ اس طرح بھوک مارنے کا نتیجہ بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں ہوتا جسم تو ضرور گھٹتا ہے مگر کمزوری بھی بڑھتی ہے۔"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا "ابھی بڑھنے دیجئے کمزوری جسم تو گھٹے کسی طرح۔ تو کیا فرمایا آپ نے کیلا؟ یعنی یہی کیلا جو کیلا کہلاتا ہے ہری چھال کا ہو یا کوئی خاص قسم کا کیلا؟"

میں نے کہا "جی ہاں ہری چھال کا ایک کیلا کھلا کر ایک پیالی دُودھ پلا دیا کیجئے۔"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا "کوئی دعا وغیرہ تو نہیں پڑھنا ہے اس کے ساتھ۔۔؟"

میں نے کہا "نہیں صاحب یہ کوئی روحانی عمل نہیں بلکہ مٹاپا دُور کرنے کی دوا ہے۔"

ٹھیکیدار صاحب نے زیر لب کئی مرتبہ دہرایا ایک کیلا ایک پیالی دودھ اور یہی کہتے ہوئے وہ اس طرح کمرے کے باہر چلے گئے کہ گویا اگر یہ نسخہ حفظ نہ کیا تو کیلے کی جگہ کٹھل کھلا دیں گے۔

۵

میں تو چند ہی دن اس مکان میں رہنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ سوائے اسلم کی ناشکر گذاری اور احسان فراموشی کے اور کچھ نہ تھا کہ وہ اس مکان سے عاجز تھا اور دوسرا مکان تلاش کرنا چاہتا تھا حالانکہ اس کو شاید اپنے گھر میں بھی اتنا آرام نصیب نہ ہو سکتا جتنا اس گھر میں اس کو حاصل تھا کہ تھا تو کرایہ دار مگر کیا کسی مہمان کی کوئی میزبان آؤ بھگت کر سکتا ہے جو خاطر تواضع اس کی اور اس کے طفیل میں میری ہو رہی تھی۔ ہم دونوں کے کمرے تو خیر آراستہ کر ہی دیئے گئے تھے مگر اب تو کیفیت یہ تھی کہ بلا طلب ہم کو ہماری ضرورت کی ہر چیز موجود ملتی تھی۔ مجھے تو حیرت اس بات پر ہوئی کہ میری شیونگ اسٹک ختم ہو چکی تھی اور میں ارادہ ہی کر رہا تھا کہ آج دفتر سے واپسی میں لیتا آؤں گا کہ دیکھتا کیا ہوں کہ میز پر نئی شیونگ اسٹک موجود ہے۔ بات بظاہر یہ کوئی اہم بالشان نہ تھی مگر مجھ پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ میں وہ شیونگ اسٹک لیے اسلم کے کمرے میں جا پہنچا اور اس سے کہا:-

"یہ شیونگ اسٹک، کیا تم نے لا کر میری میز پر رکھی ہے۔"

اسلم نے کہا "یہ غالباً میرے ٹوتھ پیسٹ کے ساتھ لائی گئی ہے۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ ہم کو اس طرح کیوں زیر بار احسان کیا جا رہا ہے اور ہم کب تک یہ بار اٹھا سکتے ہیں؟"

میں نے کہا "یہ بات اس ناگواری کے ساتھ کہنے کی نہیں ہے بلکہ حسن سلوک کا جواب بھی حسن سلوک ہی سے دینے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے موقع کی تلاش میں رہنا چاہیئے۔"

اسلم نے کہا "وہ موقع کبھی ہاتھ نہ آئے گا اور اُس طرف سے یہ احسانات ہوتے ہی رہیں گے مگر یہ آخر کیوں ہو رہے ہیں احسانات۔ کیا مطلب ہے اُس کا۔"

میں نے کہا "بغیر کسی مطلب کے بے لوث خلوص بھی تو ہو سکتا ہے۔"

اسلم نے کہا "خواہ مخواہ کی شرمندگی میں مبتلا کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ میرے پاس اتفاق سے رومال ختم ہو گئے تھے۔ کچھ دھوبی نے کھوئے کچھ خود میں نے کھوئے۔ ایک دن دفتر جانے کے لیے میں نے اپنا میلا رومال دھو کر سوکھنے کے لیے باہر پھیلا دیا بس یہ غلطی مجھ سے سرزد

ہو گئی چنانچہ واپس آکر دیکھا کہ کپڑوں کی الماری میں ایک درجن نئے رومال رکھے ہوئے ہیں۔ آخر یہ زیادتی ہے یا نہیں۔"

اور اسی وقت وہی مانوس کھنکتی ہوئی آواز برابر کے کمرے میں گونجی:۔

"امی جان۔ یہ شبو کرتے کے دامن سے ناک صاف کر رہا ہے اس سے کہئے رومال رکھا کرے۔"

میں تو بمشکل تمام اپنی ہنسی ضبط کر سکا مگر اسلم کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا جو غصہ سے تمتما اٹھا تھا۔ میری ہنسی پر اسلم نے جلبلا کر کہا۔

"تم کو ہنسی آرہی ہے اور میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے ان باتوں سے۔"

ابھی میں اسلم کو سمجھانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ٹھیکہ دار صاحب نہایت سراسیمہ تشریف لائے۔

"کہاں؟ کدھر؟ ارے بھئی کہاں آگ لگ گئی۔ کیسے لگی۔ کس نے لگائی۔"

اسلم اور بھی سُلگ کر رہ گئے مگر میں نے ٹھیکہ دار صاحب کو مطمئن کر دیا کہ کوئی آگ واگ نہیں لگی ہے، آپ مطمئن رہیے۔ اور جب انھوں نے بحث شروع کر دی کہ میں نے نہایت وثوق سے سُنا ہے کہ آگ لگی ہے تو آخر مجھ کو کہنا ہی پڑا کہ آگ واقعتاً" نہیں بلکہ محاورتاً" لگی تھی۔ یہ اسلم صاحب ایک صاحب کا ذکر کر رہے تھے کہ ان کی باتوں سے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے

ٹھیکہ دار صاحب نے اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ وہ بیچاری بھی سمجھی کہ خدا نا خواستہ آتشزدگی ہو گئی ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ بعض لوگوں کی باتوں سے خواہ مخواہ تن بدن میں آگ لگ جایا کرتی ہے مثلاً آج صبح سے بلقیس کی والدہ مجھ کو جلا رہی ہیں۔ آپ نے صرف ایک کیلا کھانے کو بتایا تھا وہ پورا درجن صاف کر گئیں۔ ان کا علاج تو صرف یہی ہے کہ چکی پیسیں، یہ کیلا وغیرہ سب واہیات ہے اس سے تو جسم اور بھی پھولے گا۔"

میں نے کہا "جی نہیں یہ نہایت آزمودہ نسخہ ہے کہ نہار مُنہ ایک کیلا کھا کر ایک پیالی دودھ پی لیا جائے اور پھر بھوک کو برداشت کیا جائے۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے کہا "مگر بندہ نواز میری بیوی تو نادر شاہ درانی کی ہمشیرہ عزیزہ ہیں۔"

اسلم نے حیرت سے پوچھا "نادر شاہ درانی کی بہن؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے کہا "یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جیسے نادر شاہ نے گلقند کا پورا مرتبان شاہی حکیم سے چھین کر صاف کر دیا تھا اور پھر کہا تھا کہ ـــ حلوائے خوب است و دیگر بیار۔ اسی طرح یہ محترمہ بھی ایک کے بجائے ایک درجن کیلے کھا گئیں۔"

اسلم نے بدستور سوالیہ نشان بن کر پوچھا "واقعی"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا "جی ہاں واقعی، بلکہ واقعتاً۔"

اسلم پریشان ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ جب ماں کا یہ حال ہے تو صاحبزادی بھی کچھ کم ثابت نہ ہوں گی۔ ٹھیکیدار صاحب کے پاس تو اتنی گنجائش تھی کہ وہ درجنوں کیلے لا سکتے تھے۔ مگر غریب اسلم کیلوں کا باغ کیسے خریدتا! ـــ یہی سوچ کر اس نے اپنا بوریا بستر باندھا اور ناک کی سیدھ میں اشٹیشن کی طرف چل دیا۔

لاحول ولا قوۃ

۱

نواب سکندر بخت کو آپ نہیں جانتے؟

لاحول ولا قوۃ، تو پھر آپ جانتے ہی کیا ہیں۔ مل لیجیے ان سے یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ اور عنقریب فسانہ بننے والے ہیں۔ پھر ایسے لوگ کہاں ملیں گے۔ ہمارے عجائب خانوں میں بھی تو یہ انتظام نہیں ہے کہ اس قسم کے نمونے محفوظ کر لیے جائیں۔ ہائے یہ چُنی ہوئی دوپلی ٹوپی۔ سر پر یہ عنبریں لہریا پٹے۔ لبوں میں دبی ہوئی ابابیلوں جیسی گھنی کالی بھونرا سی مونچھیں۔ ہر چند کہ یہ کاریگری خضاب کی ہے مگر کہاں ملتے ہیں ہر ایک کو خضاب کے یہ خاندانی نسخے کہ اس عمر میں جیسے شباب پھٹا پڑتا ہے۔ جالی دار بنیاٹن پر خوردبین سے دیکھا جائے تو کُرتہ بھی نظر آ سکتا ہے مگر اس طرح کہ جیسے سبزے پر اوس پڑی ہو۔ اس کُرتے کے گریبان پر مُرّی پھندے کا ایسا نفیس اور باریک کام ہے کہ جس کمبخت نے یہ کام بنایا ہوگا، وہ اب آنکھیں مانگتا پھر رہا ہوگا۔ اور کُرتے ہی پر کیا منحصر ہے جس نے یہ چوڑی دار پاجامہ بنایا ہے اُس کے فن کا کیا جواب ہے۔ پنڈلیوں پر کیسی لہریا تراش ہے اور کس قدر باریک جالی کھول کر ایسا چُست بٹھایا ہے پنڈلیوں پر کہ گویا لئی سے چپکا دیا ہو ظالم نے۔ معلوم نہیں نواب صاحب نے اپنے اس درزی کی زندگی کا بیمہ بھی کرا رکھا ہے یا نہیں۔ ایسے فنکاروں کے متعلق تو سنا ہے کہ وہ اپنا فن بھی اپنے ساتھ ہی قبر میں لے جاتے ہیں۔ شیطان کے کان بہرے اگر کسی کی نظر کھا گئی اس درزی کو تو کیا کریں گے آخر ہمارے نواب صاحب اور کون سی کر لایا کرے گا ان بیچارے کے لیے ایسا انگرکھا جیسا ابھی یہ سی کر لایا ہے جسے پہن کر نواب صاحب قد آدم آئینہ کے سامنے اس طرح اپنا اور اس انگرکھے کا جائزہ لے رہے ہیں جیسے کتھک ناچ کے مختلف بھاؤ بتا رہے ہوں۔ اس پر طرہ ان کے حاضر باشوں کی داد کا شور کہ نواب صاحب نے ایک ہاتھ پھیلا کر دوسرا سینہ کی طرف سمیٹا اور ایک شور بلند ہوا کہ "اے سبحان اللہ۔ جواب نہیں ہے حضور والا۔ اور کیا کہنا ہے منجھو استاد انگرکھا کیا سیا ہے بخدا مرقع کھینچ دیا ہے مرقع۔"

ایک صاحب نے الگ سے مصرعہ لگایا "منجھو صاحب کا کمال تو ہے ہی مگر اپنی قسم ہے دُہائی ہے کیا جامہ زیبی پائی ہے میری آنکھوں میں خاک۔"

دوسرے نے کہا "یہ تو ہے ہی یہی انگرکھا مجھے پہنا دیجیے بخدا معلوم ہوگا ڈفلی پر کھال منڈھ دی ہے۔"

تیسرا بولا "اجی سارنگی پر غلاف کہو!"

مجھو درزی نے کان پکڑ کر عرض کیا: "حضور! اپنی قسم یہ جامہ زیبی ہی تو ہے جو نہیں چھوڑواتی ہے یہ ڈیوڑھی۔ قسم لے لیجئے جو آج تک کسی اور کے لیے ایک ٹانکہ بھی بھرا ہو۔ سو روپیہ سلائی دے رہے تھے نواب آغا جانی صاحب ایک گھٹنے کی، میں نے صاف کہہ دیا کہ حضور جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ پہلے نواب سکندر بخت بہادر کی سی سڈول پنڈلیاں اور ان ہی کی جوڑ کی ایڑی بنوائیے اپنے لیے پھر ویسے گھٹنے کے خواب دیکھئے گا۔ حضور ہزار دو ہزار میں یہ بات کسی ایک میں ہوتی ہے کہ جو ناپ پنڈلی کی وہی گولائی ایڑی کی کہ ایڑی پر سے جو پھسلی پاجامہ کی موری تو پیوست ہو گئی پنڈلیوں پر جا کر۔"

نواب سکندر بخت نے بڑے انکسار کے ساتھ مسکرا کر اس طرح فرمایا گویا اپنی پنڈلیاں اور ایڑیاں خود آپ ہی نے بنائی ہوں۔ "خیر۔ خیر۔ یہ تو کوئی ایسی بات نہیں۔ مگر ارمان ہی رہ گیا کہ مجھو کے ہاتھ کے سلے ہوئے کسی کپڑے میں کبھی تو کوئی عیب نکال سکتے۔ کیا سبک ہاتھ پایا ہے اس ظالم نے کہ مجال نہیں جو ہزار ٹانکوں میں سے ایک ٹانکہ بھی ناموزوں نظر آجائے۔"

مجھو نے ہاتھ جوڑ کر کہا: "قدر دانی ہے حضور کی۔ وہی مثل کہ "قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری" محنت کا صلہ سرکار کی یہی خوشنودی ہے۔"

نواب صاحب نے ایک مصاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا: "لڈن صاحب زحمت معاف ان کو لے جا کر حساب کر دیجئے اور جو حساب بنے اس سے بیس روپے زیادہ دے دیجئے گا اس انگرکھے کا انعام۔"

مجھو درزی فرشی سلام کرتا ہوا جب لڈن صاحب کے ساتھ چلا گیا تو نواب صاحب نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنے ہم نشینوں میں سے ایک سے کہا:۔

"اماں لاحول ولا قوۃ۔ اسی وقت مجھو کو بھی آنا تھا انگرکھا لے کر۔ ہاں بھائی شبّن صاحب تو گویا آپ کو امید ہے کہ حکیم صاحب فی الحال تکلف فرما رہے ہیں۔"

شبّن صاحب نے کہا: "تکلف بھی نہیں حضور والا بلکہ رواج یہی ہے کہ لڑکی والے ایک دم سے کوئی نسبت بھی منظور نہیں کرتے خواہ وہ اس نسبت کو دل ہی دل میں کتنا ہی اچھا کیوں نہ سمجھیں اور دل میں کیسے ہی لڈو کیوں نہ پھوٹ رہے ہوں وہی مثل کہ من چاہے مُنڈیا ہلائے۔"

نواب صاحب نے دوسرے مصاحب ابّن صاحب سے کہا: "آپ کا خیال کیا ہے ابّن صاحب آپ کی نظر بڑی گہری ہے آپ نے کیا اندازہ کیا حکیم صاحب سے مل کر اور یہ ذکر چھیڑ کر۔"

ابّن صاحب نے بڑے مفکرانہ انداز سے کہا: "مجھے شبّن بھائی کی رائے سے ذرا اختلاف ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ وہ بڈھا نہایت خرانٹ ہے۔ شیشہ میں تو خیر ہم اس کے باپ کو بھی اتار لیں گے مگر میرا خیال یہ ہے کہ اتنے بڑے گھرانے سے جو نسبت گئی ہے تو اس کا دماغ بھی عرش معلےٰ پر پہنچ گیا اور غالباً وہ چاہتا ہے کہ پہلے آپ کی اولوالعزمیوں کے تماشے دیکھے آپ کی آتش شوق کو بھڑکائے اور اندازہ کرے کہ آپ کا ایسا رئیس اس معاملہ میں اپنی ریاست کے کیا نمونے پیش کرتا ہے اس کے بعد وہ راضی تو ہو ہی جائے گا۔ فی الحال اس کو یہ بھی تو ظاہر کرنا تھا کہ گویا دولت پر ایک دم گر نہیں پڑا ہے وہ۔"

نواب صاحب نے بڑی تشویش سے پوچھا: "آپ میں سے کسی نے یہ تو نہیں کہہ دیا کہ میں ان کی دختر نیک اختر کی زیارت سے مشرف ہو چکا ہوں۔"

شبّن صاحب نے اُچھلتے ہوئے کہا "کمال ہے بخدا۔ اماں سُنا ابّن صاحب دخترِ نیک اختر فرمایا ہے نواب صاحب نے۔ آپ کو ہماری قسم سرکار یہ بتا دیجئے کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اُن صاحبزادی کا نام اختر ہے۔"

نواب صاحب نے بڑی معصومیت سے کہا "آپ کے سرِ عزیز کی قسم میرے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ اس کا نام اختر ہے۔ مگر آپ کو کیسے پتہ چلا کہ اختر نام ہے اُس کا۔"

ابّن صاحب نے کہا "اب جب ہم کو آپ نے اس خدمت پر مامور کیا ہے تو یہ نہ پوچھئے کہ ہم کیا کچھ کر چکے ہیں آپ تو نام ہی معلوم کرنے پر حیران ہیں، ہم تو یہاں تک معلوم کر چکے ہیں وہاں بھی کسی کا نام معلوم کرنے کی کھوج جاری تھی۔"

نواب صاحب نے ذرا قریب کھسکتے ہوئے کہا "تمھیں میری قسم؟ مگر ان کو کس کا نام معلوم کرنے کی کھوج تھی۔"

شبّن نے کہا "ہائے۔ ہائے ——— ع ——— اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا ——— اُسی کا نام جس سے نگاہیں چار ہوتے ہی ایک برقِ تبسم گرا دی گئی تھی۔ نگاہیں مل کر جھک گئی تھیں اور پھر دزدیدہ نگاہی شروع ہو گئی تھی۔ برقعہ کا باریک نقاب چہرے پر آ گیا تھا اور دبیز نقاب اُلٹ دیا گیا تھا۔"

نواب صاحب نے خوش ہو کر کہا "مگر شبّن بھائی وہ برقعہ کا باریک نقاب بھی کیا قیامت تھا۔ شربتِ دیدار کیسا چھان چھان کر پلایا جا رہا تھا اور ابر کی ہلکی چادر سے ماہتاب کیسا نظر فریب معلوم ہو رہا تھا۔ ہاں تو یہ معلوم کیسے ہوا کہ میرا نام گویا معلوم کرنے کی فکر تھی۔"

ابّن نے کہا "پھر وہی۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کو آم کھانے سے مطلب یا پیڑ گننے لگا بیٹھ کر۔ ان تفصیلات میں آپ کیوں جا رہے ہیں۔ ہم نے نہ جانے کیا کیا جتن کئے ہیں۔ حکیم صاحب ہیں تو بڑے حرفوں کے بنے ہوئے مگر ان کو بھی خبر نہیں کہ خود ان ہی کے گھر میں ہمارے پہنچائے ہوئے گھر کے بھیدی موجود ہیں۔"

شبّن صاحب نے لقمہ دیا "حضور ہم نے تو اب تک آپ کو یہ بھی نہیں بتایا ہے کہ ہم اس سلسلہ میں کتنا پیسہ پانی کی طرح بہا چکے ہیں اور اس قسم کے معاملات میں پیسہ تو خیر صرف ہونا ہی ہے مگر ہم نے کیسے کیسے جرأت مندانہ قدم اٹھائے ہیں۔"

نواب صاحب نے کہا "یہ تو گویا آپ لوگوں نے سراسر تکلف برتا ہے کہ اخراجات تک مجھ کو نہ بتائے۔ خیر جرأت مندانہ قدم تو آپ نے اٹھائے ہوں گے مگر بھائی جو کچھ صرف ہو رہا ہے وہ تو لے لیا ہوتا۔"

ابّن صاحب نے بُرا مان کر کہا "جواب نہیں شبّن بھائی آپ کا بھی۔ منع کر دیا تھا میں نے کہ یہ بات زبان پر نہ لائے گا مگر آپ تو بخدا کئے دھرے پر پانی پھیر دیتے ہیں۔"

شبّن صاحب نے کہا "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر میں نے یہ بات اس لیے جان بوجھ کر کہہ دی ہے کہ ابھی تو خیر چار پانچ سو روپے ہی صرف ہوئے ہیں مگر اس معاملہ میں اگر تکلف برتا گیا تو اپنی اتنی حیثیت کہاں ہے کہ بغیر نواب صاحب کو بتائے ہوئے ہم روپیہ پانی کی طرح بہاتے رہیں گے۔"

نواب صاحب نے کہا "نہیں صاحب یہ غلط ہے اور بخدا اگر اس قسم کا تکلف آپ لوگوں نے کیا تو مجھے سخت تکلیف ہوگی۔"

شبّن صاحب نے کہا "اب میں آپ سے عرض کروں حضور والا کہ بھائی ابّن صاحب نے بھابی صاحبہ کے زیور رکھ کر اس رُپے کا انتظام

کیا تھا۔ ڈھائی سو روپے تو صرف اس عورت کو دیئے گئے ہیں جو حکیم صاحب کے یہاں ماما بن کر رہ رہی ہے حالانکہ ہے اچھے خاصے گھرانے کی عورت لکھی پڑھی اور ایسی سوجھ بوجھ والی کہ آپ کی قسم اس کو تو زنانہ پولیس میں ہونا چاہیئے تھا۔"

ابن صاحب نے کہا "جناب والا یہ اسی عورت کا کرشمہ ہے کہ اس نے وہاں جاتے ہی ان صاحبزادی سے ایسے پینگ بڑھائے ہیں کہ اب وہ ہمارے نواب صاحب کی باتیں اُس سے کرنے لگی ہیں۔"

نواب صاحب نے بے تاب ہو کر کہا "بخدا! یعنی کیا باتیں؟ گویا میرے متعلق باتیں بھی ہوتی ہیں وہاں بقول شخصے ؎

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ
اس محفل میں ہے

ابن صاحب نے کہا "ابھی تو صرف اتنی ہی بات ہوئی ہے کہ ان صاحبزادی نے یہ پوچھا تھا کہ جامن والی کوٹھی میں جو نواب صاحب حال ہی میں آئے ہیں یہ ہیں کون آخر اور وہ بھی اس پر یہ ذکر ہوا کہ اس عورت نے وہاں یہ بتایا تھا کہ میں پہلے جامن والی کوٹھی کے نواب صاحب کے یہاں ملازم تھی مگر وہ ٹھہرے پوتڑوں کے رئیس میرے ہاتھ کا کھانا پسند نہ آیا ان کو

نواب صاحب نے بے صبری سے پوچھا "اچھا پھر۔ پھر کیا ہوا"

ابن صاحب نے کہا "پھر کیا ہوتا ابھی آج ہی کی تو بات ہے اب ہم لوگ جا رہے ہیں وہ آئے گی تو اس سے اور کچھ معلوم ہو گا۔"

نواب صاحب نے ان دونوں کو روکنا مناسب نہ سمجھ کر ایک لفافہ میں پانچ سو کے نوٹ بند کر کے ہزاروں قسمیں دے کر ان کے حوالے کئے اور ان کو رخصت کر دیا۔

۲۰

بات صرف اتنی ہے کہ جامن والی کوٹھی میں نواب سکندر بخت کو آئے ابھی چند ہی دن ہوئے تھے کہ ایک دن اسکول جاتی ہوئی برقعہ پوش لڑکیاں جو اُدھر سے گذریں تو نواب صاحب اپنی ٹوپی کا زاویہ درست کرتے ہوئے کوٹھی کے پھاٹک پر آ گئے۔ وہ لڑکیاں آپس میں چہلیں کرتی ہنستی بولتی جا رہی تھیں۔ کسی کے برقعہ کا نقاب اُلٹا ہوا تھا۔ کوئی زیر نقاب نمک مرچ لگا کر املی کھانے میں مصروف تھی کوئی کسی ہم جولی پر آوازے کس رہی تھی کہ ان حضرت کو اس طرح کھا جانے والی نظروں سے گھورتا ہوا دیکھ کر سب ایکدم سنبھل گئیں مگر خدا بچائے ناہید سے ایک ہی بلا ہے وہ تو اُس نے اختر کو ٹھوکا دے کر کہا:۔

"بھلا پہچان تو سہی تاش کا کونسا پتہ ہے یہ"

اختر نے بے ساختہ نواب صاحب کو دیکھا اور برقعہ کا باریک نقاب چہرے پر ڈال کر دبیز نقاب الٹ لیا بس یہ ادا تھی جو نواب صاحب کو ختم کر گئی۔ ان کے حرفوں کے بنے ہوئے مصاحب ایک ہی نظر میں بھانپ گئے کہ معاملہ کیا ہے اور پھر جو ان مصاحبوں نے اس ذرا سی بات کا بتنگڑ بنایا ہے تو نواب صاحب نے واقعی انتقال فرمانا شروع کر دیا۔ نواب صاحب حدِ نظر تک ان لڑکیوں کو گھورتے رہے اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں تو ایک آہ بھر کر جیسے ہی پلٹے ہیں شبن صاحب نے نہایت خوبی سے شعر پڑھا۔

ہمارے واسطے اب موت بن کے پلٹی ہے
وہی نگاہ جو ان کو گئی تھی پہنچانے

اور ابن صاحب نے اور بھی قیامت برپا کی کہنے لگے ”جی ہاں مگر میں نے تو اس وقت یہ عالم دیکھا ہے کہ ؎

گزر گئے وہ نگاہِ کرم بچاتے ہوئے
ہم انتظار میں تھے کوئی ہم کو پہچانے

آخر نواب صاحب نے تڑپ کر کہا ”کاش یہ تیر چلانے کے بجائے آپ لوگوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہوتی کہ وہ ہے کون اور کہاں ہوتی ہے یہیں کھڑے ہوئے مشاعرہ کر رہے ہیں آپ لوگ۔“

ابن صاحب نے کہا ”حضور والا ہم اپنے فرض سے غافل نہیں ہیں۔ لڈن صاحب کو پہلے ہی روانہ کر چکے ہیں کہ وہ جا کر دیکھیں کہ یہ لڑکیاں کہاں جاتی ہیں خصوصاً وہ لڑکی جو تبسم کی بجلیاں گرا کر گئی ہے اور پلٹ پلٹ کر اپنے بسمل کی تڑپ دیکھتی گئی ہے۔“

نواب صاحب نے کہا ”بخدا — ع — تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں — خوب سمجھے آپ کہ مجھ کو دراصل اسی کی کھوج ہے کہ آخر وہ ہے کون۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ وہ پلٹ پلٹ کر کیوں دیکھتی گئی ہے دور تک۔“

شبن صاحب نے کہا ”اب یہ تو آپ جانیں کہ آپ کی نگاہوں نے اس سے کیا کہہ دیا ہے مگر اتنا ہم نے بھی سن رکھا ہے کہ یہ تیر دو طرفہ ہی چلتے ہیں۔“

ابن صاحب نے کہا ”اجی صاف کیوں نہیں کہتے آپ کہ۔ ع

تا نہ سوزد شمع کے پروانہ شیدا می شود

لڈن صاحب کو آتا ہوا دیکھ کر شبن صاحب نے جلدی سے پوچھا ”کیوں بھئی کیا پتہ چلا۔“

لڈن صاحب نے قریب آ کر کہا ”کچھ لڑکیاں تو مڑ گئیں چھاپہ خانہ کی گلی میں مگر وہ لڑکی آگے بڑھتی چلی گئی اور میں نے اسی کا پیچھا کیا آخر پتہ چلا لیا کہ وہ حکیم احسان علی کے گھر میں گئی ہے غالباً حکیم صاحب ہی کی لڑکی ہے۔“

شبن نے کہا ”ظاہر ہے دوائے دردِ دل دینے والی کسی حکیم ہی کی لڑکی ہو سکتی ہے۔ مگر تم اسی کو کہہ رہے ہو نا وہ جو دور تک مڑ مڑ کر ادھر ہی دیکھتی گئی ہے۔“

لڈن صاحب نے کہا ”جی ہاں وہی۔ اس بے چاری کو تو باقی سب لڑکیوں نے آگے بڑھ کر گھیر لیا تھا اور غالباً سب اسی کا مذاق اڑا رہی تھیں۔“

نواب صاحب نے دریافت کیا ”یہ حکیم احسان علی کون صاحب ہیں۔“

ابن صاحب نے کہا ”یہاں سے قریب ہی رہتے ہیں اور طبابت کرتے ہیں مگر مریض وریض تو میں نے کبھی دیکھے نہیں کوئی ان کے مطب میں البتہ بیٹھتے ضرور ہیں نہایت باقاعدگی سے حقہ دقہ لگا کر۔ اور اگر کبھی کوئی بھولا بھٹکا مریض آ نکلے تو اس کو دوا بھی خود ہی بنا کر دیتے ہیں اپنے دواخانہ سے جو اسی مطب کی چند طاقوں پر مشتمل ہے جن پر کچھ ڈبے اور کچھ شیشیاں رکھی رہتی ہیں۔“

شبن صاحب نے کہا ”توبہ ہے آپ سے بھی ابن بھائی اتنی تفصیل کون پوچھ رہا ہے آپ سے، بس یہ کہہ دینا کافی ہے کہ

ٹوٹے پھوٹے سے حکیم ہیں بیچارے۔"

نواب صاحب نے کہا "ظاہر ہے کہ یہ لڑکی شادی شدہ تو ہو نہیں سکتی البتہ یہ نہیں معلوم کہ کہیں نسبت ٹھہری ہوئی ہے یا نہیں اور نہ بھی سہی تو بھی اس کا کیا یقین کہ اگر میں نسبت بھیجوں تو وہ منظور بھی کر لیں۔"

ابن صاحب نے کہا "اللہ اللہ۔ یعنی حضور اس حد تک بس ایک ہی نگاہ میں بڑھ چکے۔"

شبن صاحب نے کہا "کیوں نہ ہو آخر شاعر نے غلط تو نہیں کہا ہے۔ ؎

بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

نواب صاحب نے کہا "ہاں بھائی اڑا لو مذاق میرا۔ کاش تم کو معلوم ہوتا کہ یہی ایک نگاہ مجھ کو واقعی کہاں سے کہاں پہنچا گئی ہے۔ تمہاری قسم ابن صاحب مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میرے زندگی بھر کے خوابوں کی جیتی جاگتی تعبیر آج میری نگاہوں کے سامنے آ گئی ہے۔ بخدا اس نگاہ میں میرے لیے نہ جانے کیا کیا پیغام تھے حالانکہ میں غور کرتا ہوں کہ کہاں میں اور کہاں وہ۔"

لڈن صاحب نے گویا چونک کر پوچھا "یہ کیا بات ہوئی حضور والا کہ کہاں میں اور کہاں وہ۔ میں ہوتا اس کی جگہ تو پھولا نہ سماتا بخدا۔"

شبن صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا "آپ ہوتے اس کی جگہ تو ہمارے نواب صاحب کی کیفیت ہی کیوں ہوتی۔ مگر واقعی یہ کہا کیا ہے نواب صاحب نے کہ کہاں میں اور کہاں وہ۔"

نواب صاحب نے کہا "ٹھیک تو کہا ہے میں نے کہ کہاں وہ نوخیز لڑکی کہاں میں بڑھا آدمی۔"

ابن صاحب نے بڑی قابلیت سے کہا "دیکھئے حضور والا ایک بات گرہ میں باندھ لیجئے کہ اگر فرض کر لیجئے آپ بقول خود اپنے بوڑھے بھی سہی حالانکہ یہ غلط ہے مگر میں ایک بات کہہ رہا ہوں اور مان لیتا ہوں کہ آپ بوڑھے ہیں تو بھی آجکل کی لڑکیوں کا جدید رجحان یہ ہے کہ وہ نوجوانوں میں اپنے لیے کوئی کشش نہیں پاتیں اس کے کئی وجوہ ہیں ایک یہ کہ آج کل کے نوجوان خود اس حد تک محبوبیت میں مبتلا ہوتے ہیں کہ بجائے محبت کرنے کے وہ چاہتے ہیں کہ خود ان سے محبت کی جائے گویا اس قسم کی شادیوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میاں اور بیوی دونوں آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور بیچ میں شمع جلا دیتے ہیں پھر دونوں انتظار کرتے ہیں کہ۔ ؎

ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

شبن صاحب نے داد دی "اے سبحان اللہ کیا بات کہی ہے۔ ایمان کی کہوں گا میں تو کہ ابن بھائی کی نظر جس قدر گہری ہے اتنی ہم میں سے ایک کی نہیں ہے۔"

ابن صاحب نے بات کاٹ کر کہا "بات سنئے میری۔ محبوبیت دراصل عورت کا حق ہے وہ چاہتی ہے کہ وہ چاہی جائے اور آج کل یہ نوعمر صاحبزادے چاہتے ہیں کہ بیوی اُن سے اظہار عشق کرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اُن نوجوانوں سے آج کل کی لڑکیاں یہ بھی ڈرتی ہیں کہ وہ کہیں دوسری شادی نہ کر لیں۔ سوکن نہ سر پر لا بٹھائیں۔ ایک پکی عمر کے آدمی سے ایک تو ان کو یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ خواہ مخواہ کے نخرے نہ کریگا۔ یہ نہ چاہے گا کہ اس کو چاہا جائے دوسرے وہ دوسری شادی ذرا مشکل ہی سے کرے گا۔"

لڈن صاحب نے کہا "بخدا دل میں اتر گئی یہ بات۔ کیا سوجھ بوجھ پائی ہمارے ابن بھائی نے۔"

ابن صاحب نے پھر بات کاٹی "آپ کا قطع کلام ہوتا ہے۔ میں آپ لوگوں کو یورپ اور امریکہ تک کی مثالیں دے سکتا ہوں کہ وہاں بھی آجکل کی لڑکیاں ان نوخیز صاحبزادوں کے بجائے ان لوگوں کو زیادہ پسند کرتی ہیں جن کے بال سفید ہونا شروع ہو گئے ہوں اور جو معبود بننے کے شوق میں مبتلا نہ ہوں بلکہ صحیح معنوں میں پجاری ثابت ہو سکیں۔"

نواب صاحب نے خوش ہو کر کہا "بات تو آپ کچھ خدا لگتی کہہ رہے ہیں تو گویا آپ کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ وہ لڑکی تعلیم حاصل کر رہی ہے اور تعلیم نے اس کی عقل پر بھی جلا کر دی ہے لہٰذا وہ جانتی ہے کہ اس کی پرستش آج کل کے یہ نوعمر لڑکے اتنی نہیں کر سکتے جتنی میری عمر کے لوگ کر سکتے ہیں۔"

ابن صاحب نے کہا "جی اور کیا۔ اب میں آپ سے عرض کروں کہ اپنی عمر کے متعلق بھی آپ کو کچھ غلط فہمی ہے۔ عمر دراصل ماہ و سال کے اعداد و شمار کا نام نہیں ہے بلکہ عمر نام ہے ولولے کا۔ اگر آپ کی عمر جیسا کہ آپ سمجھ رہے ہیں واقعی زیادہ ہوتی تو آپ میں اس لڑکی کے لیے کوئی کشش باقی نہ ہوتی۔ آپ کا دل اس کی طرف کیوں کھنچا اس لیے کہ آپ کا ولولہ ابھی جوان ہے۔"

نواب صاحب نے بیحد خوش ہو کر کہا "بھئی ابن صاحب میں تو قائل ہوں بخدا آپ کی ذہانت اور طباعی کا۔ اس کے علاوہ چونکہ مطالعہ ماشاء اللہ وسیع ہے لہٰذا آپ سے بات کر کے بہت کچھ حاصل ہو جاتا ہے ہم خوشہ چینوں کو۔"

ابن صاحب نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا "استغفر اللہ، حد کر دی بخدا آپ نے بھی یعنی آپ خوشہ چین ہیں۔ حضور یہ جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ ان ہی قدموں کا فیض ہے۔"

نواب صاحب نے یہ ذکر گول کرتے ہوئے کہا "قصہ مختصر یہ کہ اب آپ حضرات سے کیا چوری۔ میں آپ سے صحیح عرض کرتا ہوں کہ جب سے میں نے اس کو دیکھا ہے مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ میری روح جس کے لیے بھٹک رہی تھی وہ سوائے اس لڑکی کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اب آپ حضرات مجھ کو یہ مشورہ دیں کہ اس کو حاصل کیسے کیا جائے۔"

شبن صاحب نے جو گویا اس سوال کے جواب کے لیے پہلے سے تیار بیٹھے تھے کہا "اس میں مشورے کی کیا بات۔ باقاعدہ نسبت بھیج دینا چاہیے حکیم صاحب کے پاس۔ ظاہر ہے کہ حکیم صاحب کی اس سے زیادہ خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کو ایسا عالی مرتبت داماد مل جائے۔"

ابن صاحب نے کہا "جی نہیں یہ غلط ہے۔ نسبت بھیجنے سے کام نہ چلے گا بلکہ ہم خود لے کر جائیں گے نسبت تاکہ ان کو تفصیل سے سب کچھ سمجھ سکیں اور ان پر واضح کر سکیں کہ ان کی قسمت کا ستارہ واقعی کس قدر بلند ہو چکا ہے۔"

نواب صاحب نے تائید کی "میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ آپ حضرات خود نسبت لے کر جائیں۔ مگر نسبت لے جانے سے پہلے کسی طرح اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ خود اُن صاحبزادی کو بھی یہ نسبت منظور ہے یا نہیں تو بڑی اچھی بات ہوتی۔"

ابن صاحب نے کہا "آپ نے میرے منہ کی بات چھین لی میں دراصل پہلے یہی سراغ لگواؤں گا۔ بہرحال اب آپ سے کوئی مطلب نہیں ہم لوگ انشاء اللہ سب کچھ کریں گے۔ اب آپ ہم کو اجازت دیں۔ انشاء اللہ کل مٹھائی کھائیں گے کوئی خوش خبری سنا کر۔"

اور اس قرارداد کے بعد وہ سب کچھ ہوا تھا جس کا پہلے باب میں ذکر آچکا ہے کہ حکیم صاحب کے یہاں ایک مار کھائی گئی اور یہ گرگے نواب صاحب کی نسبت بھی لے گئے۔

۳

جس دن سے جامن والی کوٹھی کے سامنے سے گزرتے ہوئے ان لڑکیوں کو نواب سکندر بخت نے گھورا ہے ان لڑکیوں کو گویا ایک لطیفہ ہاتھ آ گیا تھا اختر کو چھیڑنے کا، مگر اختر اس لطیفہ پر برا ماننے کے بجائے خود بےحد دلچسپی لیتی تھی اس لیے کہ وہ خود ان بڑے میاں کی اس حرکت پر سب کے ساتھ مل کر نہ جانے کتنا ہنس چکی تھی اور اب بھی جب کبھی یہ ذکر چھڑ جاتا تھا وہ ہنسی کے مارے لوٹ لوٹ جاتی تھی۔ بات یہ ہے کہ یہ لطیفہ صرف ایک دن ہو کر ختم نہیں ہو گیا بلکہ اس لطیفہ کی کوئی نہ کوئی نئی شاخ ان کو روز ہی اس لیے مل جاتی تھی کہ وہ روزانہ اسی راستہ سے کالج جایا کرتی تھیں اور اسی راستہ سے ان کی واپسی ہوتی تھی۔ نواب صاحب نے چونکہ ان اوقات کا اندازہ کر لیا تھا لہٰذا وہ دونوں وقت سولہ سنگھار کیے اپنی کوٹھی کے دروازے پر ٹہلتے ہوئے نظر آ جایا کرتے تھے اور ان لڑکیوں کو دیکھتے ہی عجیب و غریب حرکتیں شروع کر دیتے تھے کبھی آنکھوں میں خمار پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو کبھی اس ادا سے ٹہل رہے ہیں کہ گویا قیامت محوِ خرام ہے۔ کبھی ٹوپی کا کوئی زاویہ ہوتا تھا تو کبھی کوئی۔ آج جامدانی کا انگرکھا اور سنہری کام کا سلیم شاہی جوتا ہے تو کل عطر میں بسا ایک سرخ رومال ہاتھ میں ہے۔ سر پر چنی ہوئی دوپلی ٹوپی ہے، آنکھوں پر سنہری کمانی کی عینک لگا رکھی ہے اور لچک لچک کر ٹہل رہے ہیں۔ ان حضرت کے افسانے کالج تک میں پہنچ چکے تھے اور ہر روز جیسے ہی اختر، ناہید، سلمیٰ اور زرینہ کالج پہنچتی تھیں نہ جانے کتنی لڑکیاں ان کو گھیر کر ان حضرت کی خیریت اور ان سے متعلق آج کے موسمی حالات دریافت کرنا شروع کر دیتی تھیں مثلاً آج بھی جیسے ہی یہ لڑکیاں کالج میں داخل ہوئیں خود یہ تو ہنسی کے مارے دوہری ہو ہی رہی تھیں، اس پر ان سے سوالات کی ہر طرف سے ریل پیل شروع ہو گئی۔

”آج کیا ہوا۔ آج کیا کیا اس خبیث نے۔ آج کا کیا سٹیوم تھا۔ آج کس کا روپ دھارے ہوئے تھا؟“

اختر نے ہنستے ہوئے ناہید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”ان ہی سے پوچھو۔“

ناہید نے ایک آہِ سرد بھر کر کہا ”کچھ نہ پوچھو آج کا عالم۔ دلیپ کمار فلم آرزو میں۔“

سلمیٰ نے کہا ”غلط۔ مسرت نذیر فلم یکے والی۔“

زرینہ نے تالی بجا کر کہا ”ہاں ہاں سچ مچ ویسی ہی ٹوپی تھی اور ویسی ہی صدری۔“

اختر نے کہا ”اور آج آپ کا غلام سیٹی بجانے کی کوشش میں نقلی دانت کس احتیاط سے ٹھیک کرتا جا رہا تھا۔“

ناہید نے کہا ”بھئی میں تو یہ کہتی ہوں کہ اب اس عشاق کے جدِ اعلیٰ کو کچھ ٹھیک کرنا چاہیے ہم لوگوں کو بھی۔“

اختر نے کہا ”نہیں بھئی خدا کے لیے ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ مجھے تم سے بس یہی ڈر لگتا ہے۔“

ناہید نے اور لڑکیوں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا ”گواہ رہنا تم سب۔ پھر کہتی ہے کہ میں اس لونگچڑے کی طرفداری کیوں کروں گی۔ یہ طرفداری نہیں تو اور کیا ہے۔“

اختر نے ڈانٹا ”دماغ خراب ہے تیرا تو۔ میرا مطلب یہ کہ اس کو منہ لگانے سے کیا فائدہ نہ جانے وہ اور کیا رنگ لائے۔“

ناہید نے کہا ”تو میں کچھ اور تھوڑی کرنا چاہتی ہوں بس ذرا ٹھنکنا شروع کر دوں گی دادا میاں کہہ کر۔“

زرینہ نے کہا ”جی ہاں ایسے بے حیاؤں پر ان باتوں کا اثر نہیں ہوتا۔“

سلمٰی بولی ”دوسرے یہ کہ دادا میاں کہنا ہی ہے تو تم کیوں کہو یہ کہیں اختر۔“

اختر نے بُرا مان کر کہا ”لو اور سنو مجھ سے کیا مطلب اس رنگے ہوئے سیارے کا۔“

ناہید نے طنز سے کہا ”جی بجا ارشاد۔ میں پوچھ سکتی ہوں کہ اور کس سے مطلب ہے۔ دیکھو بھئی غور سے سنو سب اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر فیصلہ کرو۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ پہلے تو کئی دن ہم کو پتہ ہی نہ چلا کہ ان مرحوم و مغفور کا خون ہم میں سے کس کے دامن پر ہے بلکہ ہم اپنی عقلمندی سے یہی سمجھتے رہے کہ یہ ایک نیلامی مال ہے جو بھی بولی بول کر چھوڑا لے اُسی کا ہے مگر ایک دن یہ ہو گئیں بیمار اُس دن یہ راز کھلا کہ دراصل وہ قبلہ و کعبہ گاہک صرف ان ہی کے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کو غور سے دیکھا اور اس کے بعد نہایت مایوس ہو کر لوٹ گئے گھر کے اندر ورنہ یہ حضرت بھلا لوٹنے والے حد نظر تک گھورا کرتے ہیں کھڑے ہوئے بلکہ خود اپنے دروازے ہی پر کھڑے رہتے ہیں اور دیدے اُن کے ہمارے قریب ہوتے ہیں۔ اچھا صاحب اس دن تو یہ ہوا دوسرے دن جب یہ بھی ہمارے ساتھ تھیں ان کو دیکھ کر اُس کی نگاہوں نے اسی طرح دُم ہلانا شروع کر دی جیسے کتا کسی اجتماع میں مالک کو پہچان کر دُم ہلانا شروع کر دیتا ہے۔ اس دن یہ حضرت ہنسے بھی مسکرائے بھی۔ لال رومال سے رُخ روشن کو بھی صاف کیا اور جب ہم قریب سے گزرے تو کچھ گنگنا بھی رہے تھے حضور اب بتائیے کس سے مطلب ہے ان کو؟“

زرینہ نے کہا ”نہیں خیر یہ تو طے ہے کہ سوائے ان کے کسی سے کوئی مطلب نہیں۔“

اختر نے کہا ”تم سب رشک کر رہی ہو میری قسمت پر حسد کی آگ میں جلی جا رہی ہو۔“

ناہید نے کہا ”لو بھلا حسد نہ کریں گے، ہم کس کو ملتا ہے اس قدر کہنہ مشق عاشق جانباز۔“

سلمٰی نے کہا ”کیوپڈ کے بزرگوں میں بس اب یہی مدظلہ العالی رہ گئے ہیں۔“

ناہید نے بڑی بوڑھیوں کی طرح کہا ”بوا بزرگوں کا سایہ بڑا غنیمت ہے۔“

اختر نے کہا ”سچ مچ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کھوسٹ پر غصہ کیا جائے یا ہنسا جائے۔“

زرینہ نے کہا ”میرا خیال تو یہ ہے کہ اس کی ذرا حوصلہ افزائی کی جائے اس کی نگاہوں کی رسید دی جائے۔“

اختر نے کہا ”بھئی وہ جو ہمارے یہاں نئی ماما آئی ہوئی ہے اس سے معلوم ہوا ہے کہ ان بڑے میاں کا نام نواب سکندر بخت ہے۔“

ناہید نے کہا ”حالانکہ مونچھیں دیکھ کر میں سمجھی تھی کہ نام نامی ہو گا نواب مچھندر بخت۔“

زرینہ نے کہا ”نواب کم بخت ٹھیک رہے گا ان کا نام۔“

اختر نے کہا ”اس ماما سے معلوم ہوا ہے کہ نواب صاحب کے ایک صاحبزادے بھی ہیں جن کو ولایت بھیج رکھا ہے اور اب یہاں یہ بڑے میاں عیش و عشرت میں دونوں ہاتھوں سے خوب دولت لٹا رہے ہیں۔ دن رات مصاحبوں کا مجمع رہتا ہے اور رنگ رلیاں رہتی ہیں۔ یہ ماما پہلے ان ہی کے گھر میں ملازم تھی۔“

زرینہ نے کہا ”بس تو اسی کے ذریعہ کسی دن ان بڑے میاں کو نہایت سعادتمندی سے خط لکھ کر بھیجو کہ قبلہ و کعبہ کیوں موت آئی ہے آپ کی۔“

اختر نے آنکھیں نکال کر کہا ”لو اور سنو اب یہ خط بھی لکھوائے گی خط لکھے ہماری جوتی۔“

ناہید نے کہا: "خطوط غلط ہے بس اس قصہ کو یوں ہی چلنے دو۔ اس طرح اُس بے چارے بڈھے کا ضعیف دل ٹوٹ جائیگا اور ڈر ہے کہ وہ مرنے میں جلد بازی سے کام نہ لے جائے۔ مگر زرینہ تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ ان بی اختر نے ان نواب پھجند رجنت کے ایک صاحبزادے کا بھی ذکر کیا ہے۔"

سلمٰی نے تالی بجا کر ہنستے ہوئے کہا: "میں غور کر رہی تھی کہ اس وقت اختر کے چہرے پر کچھ سرخی بھی تھی اور آنکھوں میں ایک نشہ بھی نظر آ رہا تھا۔"

اختر نے ترکی بہ ترکی کہا: "جی ہاں ایسی غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے والیوں میں سے میں نہیں ہوں کہ نہ دیکھا نہ بھالا محض اتنی سی بات سُن کر چہرا بھی میرا سرخ ہونے لگا اور آنکھوں میں بھی میخانے رقص کرنے لگے۔"

ناہید نے گویا بڑی سنجیدگی سے کہا: "اس نواب پھجند رجنت میں اگر سچ پوچھو تو صرف ایک عیب ہے کہ اللہ رکھے ذرا عمر خضر پا گیا ہے بیچارہ ورنہ جوانی میں ہزار دو ہزار میں ایک ہوگا۔ آثار بتاتے ہیں کہ جوانی میں نہایت قابل دید ہوگا۔ لہٰذا اس کی جوانی کا روپ اگر کسی میں مل سکتا ہے تو اس کے نوجوان بیٹے میں۔"

زرینہ نے اختر سے پوچھا: "نام کیا ہے اُن برخوردار کا۔"

اختر نے بُرا مان کر کہا: "تو بھلا مجھے کیا معلوم۔ میری جانے بلا کہ کیا نام ہے۔"

ناہید نے بڑے سمجھانے کے انداز سے کہا: "مطلب یہ کہ اس ماما سے پوچھا تو ہوتا۔ اگر واقعی تم نے اب تک نہیں پوچھا ہے تو اب پوچھ لینا داشتہ آید بکار۔"

اختر نے جل کر کہا: "میں اس ماما کو تمہارے گھر بھیج دوں گی تم ہی نواب صاحب کے ناک نقشہ کا عہد شباب اپنے تصور میں لا لا کر ان کے لڑکے کا نام بے قراری کے ساتھ اس سے پوچھ لینا بلکہ اس سے کہنا وہ شاید پتہ بھی لا دے۔"

ناہید نے برجستگی سے کہا: "بہن پتہ منگا کر مجھے اپنا دل تو وی۔ پی کرنا ہے نہیں۔ میں تو تمہارے ہی لیے پوچھ رہی تھی تاکہ تمہارے لیے یہ مثل صادق آسکے کہ۔ ع

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

اختر نے بُرا مانتے مانتے ایک دم ہنس کر کہا: "سچ مچ قینچی کی طرح چلتی ہے اس کی زبان اور میں تو حیران ہوں کہ اللہ جانے اس کو یہ باتیں آ کہاں سے گئیں کہ دل وی۔ پی کرنا بھی جانتی ہیں اور باپ کے ناک نقشہ سے بیٹے کے چہرے مہرے کا اندازہ بھی کر لیتی ہیں۔ ماماؤں کے ذریعہ نامہ و پیام کی ترکیبیں بھی چشم بد دور جانتی ہیں۔ توبہ ہے بھئی سچ مچ ہم لوگ کیسی بیہودہ باتیں کرنے لگے ہیں۔ نہ زبان میں لگام ہے نہ دیدوں میں پانی باقی ہے۔ چھوڑو بھی اس واہیات بکواس کو۔"

زرینہ نے کہا: "پھر تم ہی اُلجھنے لگتی ہو کہ زندگی میں پہلا تو رومان کیا ہے اور اسی سے کوئی دلچسپی نہیں لینا۔"

اختر نے چیخ کر کہا: "حد ہوتی ہے مذاق کی، لو اور سنو۔ رومان کرے میری بلا۔ جو منہ میں آتا ہے کہتی چلی جاتی ہیں۔"

اور وہ واقعی اپنا موڈ خراب کر کے وہاں سے چلی ہی تھی کہ سب لڑکیوں نے قہقہہ بلند کر کے اس کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ اور سلمٰی نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا: "سچ مچ تم تو بُرا ہی مان گئیں۔ صدقہ کروں اس موئے لنگور کو تم پر سے۔ اچھا خاصا

سوا کارٹون ہے۔ یہ بات ہنسی کی ہے یا اس طرح بُرا ماننے کی۔”

ناہید نے کہا: “ذرا اس برہمی کی سنجیدگی تو دیکھیے کوئی میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تم اس لطیفہ پر بُرا بھی مان سکتی ہو۔”

اختر نے اُسی بھولے سوجے انداز سے کہا: “آپ کا تو مذاق ہو گیا مگر اللہ جانے کون عقلمند اس کو کیا سمجھ بیٹھے۔”

اُدھر حکیم صاحب نے بھی لڑکیوں کی ساری گفتگو سُن لی تھی۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ کسی طرح انھیں نواب سکندر بخت مل جائیں تاکہ ان کے دماغ کا علاج کر دیا جائے۔ مگر نواب صاحب ہاتھ نہ آئے۔ اس لیے حکیم صاحب لاحول پڑھنے کے سوا کر بھی کیا سکتے تھے۔

خالہ حسینہ

معلوم نہیں اس کو "اسم بامسمّیٰ" یا "اسم بامسماۃ" خیر یہ علمی نکتے تو بعد میں طے ہوتے رہیں گے، ہم کو تو کہنا یہ ہے کہ خالہ حسینہ کا نام ہی حسینہ نہ تھا بلکہ وہ تھیں بھی چشم بددور واقعی قابلِ دید۔ ہر چند کہ عمر ڈھل چکی تھی۔ سہاگ اُجڑ چکا تھا بالوں میں ایک آدھ چاندی کا تار بھی نظر آنے لگا مگر ایک عجیب دلکشی ان میں اب بھی پائی جاتی تھی اور یہ سفید بال ان کے چاند سے مکھڑے کی کرن ہی نظر آتے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اللہ نے چار پیسے دے رکھے تھے جو اس حُسن میں اور بھی نکھار پیدا کر رہے تھے اور ان کی کشش کا یہ عالم کر رکھا تھا کہ رشتہ داروں کا ایک سیلاب تھا جو امنڈا چلا آتا تھا۔ کوئی صاحب چلے آ رہے کہ خالہ آپ نے مجھ کو پہچانا نہیں اور واقعی پہچاننا مشکل بھی ہے۔ اب سے بیس بائیس سال پہلے جب آپ لکھنؤ سے کلکتہ جا رہی تھیں تو ٹرین میں آپ نے والدہ صاحبہ مرحومہ کو دوپٹہ بدل بہن بنایا تھا، اس وقت میں والدہ صاحبہ مرحومہ کی گود میں انگوٹھا چوس رہا تھا۔ کسی نے آکر نہایت قریبی رشتہ سمجھا دیا کہ آگرہ میں جب آپ کی والدہ اور میری نانی دونوں کا بچپن گزر رہا تھا اور نائی کی منڈی ہی میں آمنے سامنے دونوں کا مکان تھا۔ اس وقت ان دونوں خاندانوں میں ایک رشتہ داری قائم ہوئی تھی کہ آپ کی والدہ کی گڑیا تھی اور میری نانی کا گڈا ان دونوں کی نہایت دھوم سے شادی ہوئی تھی۔ خالہ حسینہ ان تمام رشتوں کو فوراً تسلیم کر لیتی تھیں اور اس قسم کے رشتہ داروں کی بھرتی مسلسل جاری رہتی تھی۔ مگر آخر کہاں تک؟ اس دیمک سے بہت جلد گھبرا اٹھیں اس لیے کہ یہ ریل پیل تو کسی طرح ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی اور خالہ حسینہ کی حویلی مفت خوروں کی چھاؤنی بن کر رہ گئی تھی جس سے مارے اخلاق کے وہ کچھ کہتی تو نہ تھیں لیکن مزاجی طور پر بے حد بد اخلاق بنتی چلی جا رہی تھیں اور انھوں نے سب ہی سے سیدھے منہ بات کرنا چھوڑ دیا تھا یعنی اس طرح گیہوں کے ساتھ وہ گھن بھی پس رہے تھے جو ان کے واقعی قریب ترین بھانجے بھتیجے تھے۔

میرا اور خالہ حسینہ کا رشتہ اتنی دور کا ضرور تھا کہ میں براہ راست ان کا بیٹا نہ تھا لیکن ان کی سگی بہن کا سگا بیٹا تو تھا ہی اور میری حیثیت ان تمام بناسپتی بھانجوں بھتیجوں سے قطعاً مختلف تھی جو "جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام" کے مصداق نہ جانے کہاں کہاں سے پھٹے پڑتے تھے اور اپنے ساتھ ہم سچ مچ کے رشتہ داروں کی بھی مٹی پلید کرائے ہوئے تھے کہ خالہ کی تیوریوں پر ہم کو دیکھ کر بھی وہی بل پڑ جاتے تھے جو ان سب کو دیکھ کر پڑتے تھے مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کمبخت اشفاق نے ان پر کیا جادو کر رکھا تھا کہ اگر ان کی جبین کی شکنیں ہموار ہوتی تھیں تو صرف اسی کو دیکھ کر۔ یہ حضرت خالہ حسینہ کی ایک ایسی بہن کے فرزند ارجمند تھے جن کو وہ آج تک سمجھ نہ پائی تھیں کہ ان کی یہ پیاری بہن کون تھیں

مگر یہ عزیز از جان بھانجے خالہ کے مزاج میں ایسے دخیل ہو گئے تھے کہ ان کے مقابلہ میں کسی کی دال نہ گلتی تھی اور اگر سچ پوچھئے تو ان ہی کو خالہ کے معین المہام کی حیثیت حاصل تھی، ان ہی کے ہاتھ میں سارا انتظام تھا۔ وہی سب سے بڑے بہی خواہ سمجھے جاتے تھے۔ وہی گویا سب سے بڑے ایماندار تھے۔ ان ہی کی باتوں پر خالہ کو بے ساختہ ہنسی آتی تھی، ان ہی سے خالہ خندہ پیشانی کے ساتھ بات کرتی تھیں، ان ہی سے دوسروں کی شکایتیں کرتی تھیں اور ان ہی سے دوسروں کی شکایتیں سنتی تھیں لیکن کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ خالہ سے اشفاق کی کوئی شکایت کر سکے۔ اس سلسلہ میں خود میں نے ایک مرتبہ خالہ کی ایسی ناراضگی خریدی تھی کہ مہینوں وہ مجھ کو دیکھ کر منہ پھیرتی رہیں لہذا میں نے تو جب سے کان پکڑ رکھے کہ اب کبھی جو اشفاق کے بارے میں خالہ سے کچھ کہوں البتہ مجھے یہ کھوج ضرور ہے کہ اشفاق کے پاس وہ کونسا عمل تسخیر ہے جس نے خالہ کو رام کر رکھا ہے۔

یہ تو خیر ہم کو معلوم تھا کہ خالہ کی سب سے شہ زور کمزوری ان کی خوشامد پسندی ہے چنانچہ ان کے بھانجوں بھتیجوں کے اس لشکر جرار میں درباریوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ ایک سے ایک خوشامدی ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا مگر اشفاق کی بات ہی کچھ اور تھی

(ناتمام)

سرپنچ کی ایک جھلک

(ہفت روزہ)

مزاحیہ شرحِ دیوانِ غالب

ذیل میں ہم مولانا شوکت تھانوی کی اس مزاحیہ شرحِ دیوانِ غالب کا دیباچہ اور دو غزلیں پیش کر رہے ہیں جو تمام و کمال مکمل ہو چکی ہے اور جس کی اشاعت بوجوہ اب تک نہ ہو سکی لیکن اب عنقریب ایک مکمل جامع کتاب کی صورت میں شائع ہونے والی ہے۔

ایڈیٹر

دیباچہ

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسن طبیعت نہیں مجھے

کچھ شاعری ذریعہ عزت نہ تھی انھیں
کچھ شرح لکھنا باعثِ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
غالب سے کیا کسی سے عداوت نہیں مجھے

میں شرح لکھ رہا ہوں شرف کچھ یہ کم نہیں
مانا اسد کا مرتبہ شوکت نہیں مجھے

غالب پہ اور مجھ کو ہو تنقید کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

میرا مزاج آپ ہے جامِ جہاں نما
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

ہیں اور شرح لکھنا مگر اس سے مدّعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

یوں ہی سا اک مذاق تھا جو شرح بن گیا
دیکھا کہ چارہ غیر طباعت نہیں مجھے

اس میں جو آپڑی ہو سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے ترکِ محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو رو سیاہ
سودا نہیں جنون نہیں وحشت نہیں مجھے

حرکت تو یہ بری ہے پہ نیت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا شوکت خدا گواہ
سچ بولتا ہوں گو کہ یہ عادت نہیں مجھے

[illegible] لکھنؤ
۳۰ اپریل [illegible]

(۱)

شوق ہر رنگ رقیب سرو ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا

آج کل تو برہنہ تصویریں فروخت ہونا جرم ہے لیکن مرزا غالب نے یقیناً مجنوں کی کوئی ننگی تصویر ضرور دیکھی ہے ورنہ وہ کیوں کہتے کہ قیس نے جو تصویر کھنچوائی تو وہ بھی ننگی آئی۔ سچ ہے کہ عشق واقعی سرو سامانی کا دشمن ہے چنانچہ اس سے مجنوں کی لنگوٹی بھی نہ دیکھی گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ تصویر میں لنگوٹی بھی غائب ہو کر رہی۔

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

"یارب" اس میں تخلص نہیں ہے ورنہ شعر بجائے تلامذۂ رحمٰن کے براہ راست رحمٰن کا ہو جاتا۔ پہلے مصرع کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے کہ تنگیٔ دل کے باوجود زخم نے داد کی صورت اختیار نہیں کی لیکن دوسرے مصرعہ سے مطلب کچھ اور ہی ہو جاتا ہے جو غالباً یہ ہے کہ میرے زخم نے میرے دل کی تنگی کی داد نہیں دی کہ اسی چھوٹی سی کوٹھڑی میں میں نے زخم کا طوطا بھی پالا اور پھر ایک تیر بھی خواہ مخواہ ٹھونس لیا جو پھڑپھڑاتا ہوا اس طرح نکلا گویا دل میں بہت زیادہ جگہ تھی۔

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

یہ شعر دراصل نصیحت ہے یعنی دیکھو اے معشوق صاحب تمہاری بہت بدنامی ہو رہی ہے اپنی اصلاح کرو ورنہ ہم نہیں جانتے کہ دنیا بھر میں تمہاری رسوائی ہو گی بھلا غضب خدا کا کہ تمہاری محفل سے جو نکلتا ہے سخت پریشان اور شاکی نکلتا ہے بوئے گل بیچاری نکلی تو سخت پریشان، نالۂ دل غریب نکلا تو وہ پریشان، چراغِ محفل کا دھواں پریشان ہو کر نکلا، آخر یہ بات کیا ہے کہ۔ ع

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا بقدرِ لبِ و دنداں نکلا

اگر پہلے مصرع کے معنی نہ کیے جائیں تو دوسرے کے صرف یہ ہیں کہ یاروں سے صرف یہ ہو سکا کہ ہونٹ چڑھا کر اور دانت نکال کر رہ گئے لیکن چونکہ پہلے مصرع سے سلسلۂ قرابت ملانا ہے لہٰذا مکمل شعر کے معنی یہ ہوئے میرے شہید حسرت دل کو یہ سمجھے تھے کہ ہر مختلف اقسام کے درد کا دستر خوان تھا تاکہ احباب ما حضر غم تناول فرما کر بندہ کو رہین منت کریں لیکن افسوس ہے کہ دوستوں نے پیٹ بھر کر میرا غم نہیں کھایا اور تکلف سے کام لیا۔

اے نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

الہ دین کے چراغ کے موکلوں کا یہ حال تھا کہ جو مشکل سے مشکل کام دیجیے فوراً انجام دے دیتے تھے اور ناطقہ بند کر رکھا تھا بالکل یہی مرزا کی ہمت دشوار پسند کا تھا کہ مشکل سے مشکل کام کو آسان کر کے پھر ایک دشواری پیدا کر دیتی تھی یہاں تک کہ مرنے کو بہت زیادہ مشکل سمجھا تھا لیکن تو نے اس کو بھی یاد کیے ہوئے آموختہ کی طرح آسان بنا دیا اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کونسا مشکل کام تیرے لیے تجویز کیا جائے۔ ہم مرزا کی جگہ پر ہوتے تو اپنی ہمت دشوار پسند کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتے مثلاً یہی کام کرنے کو کہتے کہ اُلٹی گنتی گن. یعنی مرنے کے بعد زندگی عطا کر اور زندگی کے بعد ولادت ہو یہ نہیں کہ ولادت ہوئی زندہ رہے اور مر گئے۔

دل میں پھر گریے نے اک شور اٹھایا غالبؔ
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

علم جراحی کے ماہر سول سرجنوں سے لے کر خانہ ساز جراحوں تک سب اس سے واقف ہوں گے اور ان حضرات کو بھی تجربہ ہوگا جن کے کبھی پھوڑا نکل چکا ہے کہ اگر زخم میں کبھی ایک قطرہ بھی مواد کا رہ جاتا ہے اور زخم کا منہ بند ہو جاتا ہے تو وہی ایک قطرہ پھر پھوڑا بن کر نمودار ہوتا ہے اسی سے مرزا صاحب پر یہ حادثہ گزرا کہ ایک مرتبہ روتے روتے اتفاق سے کوئی آنسو آنکھ ہی میں رہ گیا چنانچہ وہ طوفان بن کر نمودار ہوا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ زخم کا مواد ہو یا آنسو کا قطرہ ان سب کا بالکل ہی نکل جانا اچھا ہوتا ہے ورنہ چور رہ جانے کا وہی نتیجہ ہوتا ہے جو اس شعر میں بیان کیا گیا ہے۔

(۲)

دھمکی سے مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک لالہ صاحب کو فوج میں نوکری کی سوجھی چنانچہ پہنچے آپ افسرِ اعلیٰ کے پاس اُس نے آپ کی بہادری اور فوجی اہلیت کا امتحان اس طرح لیا کہ ریوالور لالہ جی کی آستین میں رکھ کر لبلبی دبا دی، گولی کوٹ کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی اور لالہ صاحب اٹینشن کھڑے رہے افسرِ اعلیٰ اس بہادری سے بہت خوش ہوا اور علاوہ پروانۂ تقرر دینے کے بیس روپیہ اور بھی دیئے کہ اس کا کوٹ بنوا لو جو ریوالور کی گولی سے خراب ہوا ہے لالہ صاحب نے فرمایا کہ "حضور پتلون کے دام؟" کہا "وہ کیوں؟" کہنے لگے "حضور وہ بھی خراب ہو گیا ہے" یہی مضمون اس شعر میں ادا کیا گیا ہے کہ عشق کی جنگجوئی کے لیے پتلون کے دام مانگنے والوں یا گولی کی آواز بن کر مر جانے والے بزدلوں کی ضرورت نہیں ہے اس کے لیے تو سینہ پر حسن کی گولی روکنے والے جوانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

اگر کھٹکے کے معنی قفل والے کھٹکے کے لیے جائیں تو پہلے مصرع کے معنی یہ ہوں گے کہ زندگی کے قفل میں موت کا کھٹکا لگا ہوا تھا لیکن دوسرے مصرع میں یہ مضمون ادا نہیں کیا گیا۔ ملک الموت کے پاس اس قفل کی کنجی تھی بلکہ ایک بالکل بے جوڑ سا مصرع کہہ دیا ہے۔ یعنی۔ ع

اُڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

اب دونوں مصرعوں کو ملا کر یہ مطلب بیان کیا جائے گا۔ مرنے کے بعد تو خیر رنگ کا زرد ہونا ایک معقول سی بات ہے لیکن یہاں تو حال یہ ہے کہ زندگی میں بھی موت کے ڈر کے مارے آپ کی دعا سے رنگ زرد ہی تھا اور مرنے کے بعد وہی رنگ ہے یعنی ہماری موت اور زندگی باعتبارِ رنگ یکساں ہیں۔ مرزا غالبؔ کا یہ شعر ان اشعار میں سے ہے جو مرزا کو کبھی مرنے نہ دیں گے اور ہمارے ایسے سینکڑوں شوکت تھانوی شرح لکھتے رہیں گے۔

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

بچے کے پیر پالنے میں نظر آجاتے ہیں اب دیکھئے تا کہ مرزا صاحب اپنے بچپن کا ذکر فرماتے ہیں کہ جب مجموعۂ خیال فرد فرد تھا یعنی کسی بات کا کوئی ٹھیک ٹھور نہ تھا اسی وقت آپ کا یہ عالم تھا کہ طریقِ وفا اسی وقت سے یاد کر رہے تھے اور وفا کے نسخے جمع

کرنے کا آپ کو جب بھی شوق تھا۔

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے، اب
اس رہگذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

یعنی دل سے لے کر جگر تک جو قطعۂ اراضی اب ساحلِ دریائے خون بنا دیا گیا ہے جب ساحل نہ بنا تھا تو یہاں باغ لگے ہوئے تھے اور ایسے باغ تھے کہ گلوں کی رنگینی کے تمام جلوے اس کے آگے دو کوڑی کے تھے لیکن اب وہی جگہ ساحل کا کام دے رہی ہے اور ساحل بھی دریائے خون کا ساحل، اس دریائے خون کو دنیا کے نقشہ میں تلاش نہ کیجئے یہ صرف شاعروں کے اٹلس میں مل سکتا ہے۔

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

یہ مضمون بھی عجیب و غریب قسم کا رفاہ عام کلب ہے خدا جھوٹ نہ بلائے تو سینکڑوں شعر اسی مضمون کے ہم نے خود سُنے ہیں اور سُنے کیا ہیں ایک شعر تو خود کہا بھی ہے ملاحظہ فرمائیے ؎

نظر کے سامنے اک پرتوِ مجاز رہے
بلا سے دل نہ رہے دردِ دلگداز رہے

مولانا آسی الدنی مدظلہ کا شعر ہے ؎

دھوکا نہ کھاؤ چارہ گرو واقعات سے
پہلو میں دل نہیں ہے تو کیا درد بھی نہیں

حضرت جگر مرادآبادی کا مطلع ملاحظہ ہو ؎

اب زباں بھی دے ادائے شکر کے قابل مجھے
درد بخشا ہے اگر تو نے بجائے دل مجھے

بہر حال ان تمام اشعار اور مرزا غالبؔ کے شعر کے یہی معنی ہیں کہ دل کے مرجانے کے بعد اس کا بھوت درد بن کر سینہ میں رہ جاتا ہے۔

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

واقعی وحشت کا یہی ایک علاج تھا جو مرزا کے دوستوں نے کیا کہ پکڑ کے بڑے گھر کی سیر کرا دی اس لیے۔ اس زمانہ میں آگرہ یا بریلی میں کوئی انتظام نہ تھا لیکن تخیلات پر ان کا کیا بس تھا اور اس کا کیا علاج تھا جو یہ حضرت زنداں میں بیٹھے بیٹھے خاک چھاننے اور جنگل جنگل پھرنے کے خیالات میں کھوئے رہتے ہیں۔

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن، مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے، خدا پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے مگر تعجب تو یہ ہے کہ یہ شعر مرنے کے بعد کا ہے لیکن اس سے ڈرتے نہیں یہ شاعروں کا طبقہ ہمیشہ مرنے کے بعد بھی شعر کہتا رہتا ہے چنانچہ ہمارے استاد حضرت ناطقؔ مدظلہ بالائے مدظلہ کا شعر ہے ؎

لوگ کہتے ہیں کہ ناطقؔ بیٹھا بیٹھا چل بسا
ہائے کیا کمبخت کو ہچکی ہوئی سی آ گئی

دوسرا شعر مولانا آسی مدظلہ کا ہے۔ ؎

خدا آسی کو بخشے اُس کی باتیں یاد آتی ہیں
بڑا سیدھا مسلماں تھا بڑا سچا مسلماں تھا

مرزا غالب نے بھی اپنے انتقال پر ملال کا منظر خود ہی پیش کیا ہے کہ خدا غریق رحمت کرے یہ لاش خود اینجانب مرحوم کی ہے ہم بھی عجیب آزاد مرد تھے جو مرنے کے بعد بھی کفن کا ہوش نہیں جیسے مولانا محمد علی جوہر مرحوم کا شعر ہے ؎

شاید کہ آج حسرتِ جوہر نکل گئی
اک لاش ہے پڑی ہوئی گور و کفن سے دور

قلمی تصویر (پنڈت مدن موہن مالوی) شوکت تھانوی

آپ مادرِ ہند کے معمر ترین صاحبزادوں میں سے ایک ہیں۔ ہندوستان کی قومی رہنمائی عرصۂ دراز سے فرما رہے ہیں مگر جیل بہت کم تشریف لے گئے ہیں۔ سیاست اور مذہب دونوں کو سنبھالے رکھنا چاہتے ہیں یعنی ایک پیر سیاسی کشتی میں ہے اور دوسرا مذہبی ناؤ پر اور اس طرح آپ اپنی زندگی عبور کر رہے ہیں ہندوؤں میں بے حد ہر دلعزیز ہیں اور مسلمانوں میں ڈاکٹر مونجے اور بھائی پرمانند سے غنیمت سمجھے جاتے ہیں بہرحال یہ تو ظاہر ہی ہے کہ آپ پنڈت جواہر لال نہرو کی طرح ہندوستانی نہیں بلکہ پہلے ہندو برہمن ہیں پھر ہندوستانی ہیں۔

برہمن ہیں اور خطرناک قسم کے برہمن ہیں لندن تک گنگا جل لے کر گئے تھے اور جہاز کے تختہ پر بھی آپ کی رسوئی کا علیحدہ انتظام تھا اور جیل میں بھی یہ احتیاط جاری تھی لیکن باوجود اس کے محض لندن جانے سے آپ کا دھرم مشکوک ہو گیا تھا لہذا دریائے گنگا کے کنارے آپ نے دھرم کی از سرِ نو تجدید کی تھی۔ راسخ الاعتقادی میں ایک طرف تو یہ شدت پسندی ہے دوسری طرف گاندھی جی کی ہریجن تحریک ناک میں دم کئے ہوئے ہے اور گاندھی جی سے نہ تو انحراف ہو سکتا ہے نہ دھرم کو اس طرح نباہ کیا جا سکتا ہے ہریجنوں سے جہاں تک زبانی ہمدردی اور قومی بھائی چارہ کا تعلق ہے وہاں تک تو غنیمت ہے لیکن نہ تو آپ روٹی بیٹی کے اس سلسلہ میں قائل ہیں نہ اس کے قائل ہیں کہ ہریجنوں سے معانقہ یا مصافحہ قسم کی بے تکلفی شروع کر دی جائے اس لئے کہ یہیں سے تو "رام رام رام رام" کا قصہ شروع ہو جاتا ہے اور گئو متر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے لہذا آپ نہیں چاہتے کہ گوبر اور گئو متر سے پاک بنائے ہوئے دھرم کو اچھوتوں کی وجہ سے نشٹ کریں اور ملیچھوں سے بھائی چارہ کر کے ملیچھ بن جائیں۔

آپ ویسے بہت زیادہ قابل بہت زیادہ سمجھدار اور بہت زیادہ اچھے آدمی ہیں البتہ بس یہی دقیانوسیت اور مذہبی شدت پسندی نہ ہوتی تو کیا کہنا تھا۔

سفید مونچھیں ہیں سفید لباس پہنتے ہیں اور سر سے پیر تک کالا آدمی ہونے کے باوجود سفید فام رہتے ہیں تقریر بھی خوب کرتے ہیں مگر جیل والے نکات بچا بچا کر تحریر بھی ماشاءاللہ اچھی ہے ہندو یونیورسٹی کے آپ سر راس مسعود ہیں بنارس کے رہنے والے ہیں لہذا پنڈت جی بنارسی بھی کہلاتے ہیں۔ جہاں تک خود ہماری ذات کا تعلق ہے ہم پنڈت جی کے اس چھوت چھات کو بھی اچھا

سمجھتے ہیں اور راسخ الاعتقادی کی بھی قدر کرتے ہیں بشرطیکہ وہ وسیع النظر اور روشن خیال وغیرہ ہونے کا دعوے نہ کریں۔

نئی روشنی کے میاں بیوی

از جناب محوی لکھنوی

ایک شوہر نے یہ بیوی سے کہا ڈر ڈر کر   اپنی زلفوں کو مری جاں کٹایا نہ کرو
پوڈر اور سینٹ سے چھوڑ دو بھی محبت کرنا   ہے قلیل آمدنی خرچ بڑھایا نہ کرو
مضحکہ دوست اڑاتے ہیں مرا مجلس میں   صورت اپنی کس و ناکس کو دکھایا نہ کرو
آگ غیرت کی مرے دل میں بھڑک اٹھے گی   ہاتھ غیروں سے سرِ بزم ملایا نہ کرو
خبریں اغوا کی بہت آتی ہیں اخباروں میں   سیر کرنے تنِ تنہا کبھی جایا نہ کرو

بھر کے غصہ میں لگی کہنے وہ بنتِ تہذیب   کہہ دیا ہے تمہیں بس باتیں بنایا نہ کرو
خرچ بڑھتا ہو۔ اگر کھانے پہننے سے مرے   بھیج دو میکے شب و روز جلایا نہ کرو
ہم نکالیں گے قدم گھر سے نہ ہرگز اپنا   تم سینما کی طرف بھول کے جایا نہ کرو
بوجھ بالوں کا اٹھا لیں گے سرِ نازک پر   داڑھی مونچھوں کا مگر تم بھی صفایا نہ کرو
اپنی عادات میں تبدیلی جو منظور نہیں   میرے کاموں میں بھی پھر ٹانگ پھنسایا نہ کرو

تم ہو ہرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تم نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی

غالبؔ اور وہمیؔ

(مندرجہ ذیل غزل میں ہر شعر کا ایک مصرع مرزا غالبؔ کا ہے اور ایک مصرع حضرت وہمیؔ وہانوی کا ہے لہٰذا یہ غزل دونوں کی مشترکہ سمجھی جائے۔) ایڈیٹر

یہ نہ تھی ہماری قسمت جو وصالِ یار ہوتا   شبِ وعدہ آ بھی جاتی تو ہمیں بخار ہوتا
تجھے ہم ازل سے جھوٹا مری جاں جانتے تھے   کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جاناں کہ بندھا تھا عہد بودا   ترے ہاتھ ٹوٹ جاتے جو وہ پائدار ہوتا
یہ خلش تو اس لیے ہے کہ جگر کے اس طرف ہے   یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح — اور اگر بنا تھا ناصح تو وہ تھانہ دار ہوتا
ہمیں مرا تو بھوت بن کر رہا پیپلوں پہ برسوں — مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
یہ شرر جو آج کل ہے یہی غم کی شکل پاتا — جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا
اگر آ گئی تھی شامت تو نجات کیسے ملتی — غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا
ہم اگر مثالِ مچھر کہیں ڈوب ووب جاتے — نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
وہ دو چار اس لیے ہے کہ دوئی کی بو نہیں ہے — جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہماری شرارتیں

جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی

مجبوراً وقت کاٹنے کے لیے وہاں پہنچے جہاں بے شمار سائیکلوں کا ہجوم تھا اور سیفٹی پن نکال کر پنکچر کرنا شروع کیے قصہ مختصر تمام سائیکلیں بیکار کر دیں اس سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ معاً یہ خیال آیا کہ میچ ختم کرنا چاہیے فٹ بال کھیل کے میدان سے باہر بھی اگر گرتا تھا اور لڑکے دوڑ کر اٹھا کر کھلاڑیوں کو واپس کر دیتے تھے ہم نے بھی ایک مرتبہ یہ خدمت انجام دی اور آہستہ سے اپنے سیفٹی پن کی نوک اس میں چبھو دی مشکل سے دو منٹ لگے ہوں گے کہ دوسرا فٹ بال جو موجود رہتا ہے مانگا گیا اس کا بھی ہم نے وہی حشر کیا چلیے چھٹی ہوئی اب فٹ بال ہی نہ رہا میچ گڑبڑ ہو گیا مگر ساتھ ہی ہمارے اوپر شبہ سا کیا گیا اور ہم نے بہتر سمجھا کہ وہاں سے کھسک آئیں میچ درہم برہم ہو گیا اور اصل لطف تو جب آیا جب سب کے سب بائیسکل والے اپنی بائیسکلوں پر چڑھ کر فوراً اترنے پر مجبور ہوئے۔ اب ہم پریڈ کے میدان میں سے گزر کر اس کے دوسرے پھاٹک پر جو نکلے تو دیکھا کہ ایک آدمی کپڑے کی دکان لگائے ہوئے ہے اس دکان کی اس نے چادریں تان کر کپڑے کی دیواریں اور کپڑے کی چھت بنائی تھی ہم اس کی پشت پر سے ہو کر گزرے کہ ہم کو ایک چھوٹا سا ٹھیلہ نظر پڑا جس پر وہ کپڑے گھر سے لاد کر لایا تھا ہم نے فوراً ٹھیلہ کو دور لے جا کر زور سے دوڑا کر دکان کی پشت میں اس زور سے ریلا کہ وہ کپڑے کی دیوار پھاڑتا ہوا دکان کے اندر اس طرح گھس گیا کہ ساری دکان رگڑ گئی اندر سے دو آدمیوں کے چیخنے کی آواز آئی مگر ہم بھاگ گئے۔ اب مٹھائی کی ٹھہری ہم دو پیسے کی مٹھائی لینے ایک ساتھی کے ساتھ گئے اور باقی کو وہیں چھوڑا ہر دکان پر ہر قسم کی مٹھائی چکھی اور وہ بھی اس طرح کہ آخر کو انھوں نے چکھانے سے انکار کر دیا۔ ہم نے بنگالی مٹھائی پسند کی حالانکہ ہمارے ساتھی کشمیری برہمن تھے مگر دکاندار ہم دونوں کو بھنگی سمجھا تھا اور کہا الگ کھڑے ہو ہم کو برا معلوم ہوا اس نے سیر بھر مٹھائی ہماری فرمائش سے تولی اور بجائے ہاتھ میں دینے کے ہم سے کہنے لگا ہاتھ پھیلاؤ ہم نے ہاتھ پھیلا دیے اس نے دور ہی سے دونا مٹھائی کا ہمارے ہاتھ پر چھوڑا ہم نے فوراً ہاتھ ڈھیلے کر دیے اور دونا مٹھائی کا نیچے گرا۔ ہم گرج کر دکاندار پر برس پڑے اور ادھر وہ دکان سے اتر پڑا کہ میں اپنے پورے دام لے لوں گا، پورا فتنہ کھڑا ہو گیا مگر ہم

نے دام نہ دینا تھے نہ دیئے۔ دوسری جگہ سے مٹھائی خریدی اور دیکھا کہ پان والے کی دکان پر پہنچے یہ پان کی دکان بھی دیکھنے کے لائق تھی، پان والا صدر دروازہ کے بائیں جانب قدِ آدم اونچائی پہ ایک باڑ باندھ کر بیٹھا تھا اور دکان کو ایسا سجایا بنایا کہ لوگ اسی دکان پر ٹوٹے پڑتے تھے، پان والے صاحب اپنے آپ کو نہ معلوم کیا سمجھے ہوئے تھے، دکان پر بیسوں رنگ برنگ کی بوتلیں اور سجاوٹ کا سامان چنا ہوا بڑی اونچائی تک چلا گیا تھا اور کپڑے کی چھت لگی تھی جس میں قندیلیں اور قمقمے آویزاں تھے بہت سی تصویریں چاروں طرف لگی تھیں، ہاتھ میں پنواڑی صاحب کے ایک قینچی تھی جو وہ ہر اس ایسے لونڈے کے رسید کرتے تھے جو ان کے مچان کے کھمبے کے پاس آتا تھا ہم کو یہ بہت برا معلوم ہوا اور ہم نے ان سے کہا کہ ایسا کیوں کرتے ہو تو انھوں نے کہا کہ صاحب یہ بانس کا کھمبا جس پہ کہ مچان ٹکا ہوا ہے زمین میں یونہی رکھا ہوا ہے اور مجھ کو ڈر ہے کہ کہیں ٹھیس لگ کر ساری دکان کی دکان نہ آ پڑے۔ ہم نے کہا کہ یہ تو زمین پر گڑا ہوا ہے بھلا کیسے گرے گا تو انھوں نے فرمایا کہ صاحب یہ یوں ہی رکھا ہے اور پھر طرّہ یہ کہ مچان کے تختے میں بندھا بھی نہیں ہے اس وجہ سے مجھ کو بہت اندیشہ ہے۔

اب پان کھا کہ ہم نے جو دوستوں سے صلاح لی کہ بھئی بولو کیا رائے ہے اس پان والے کی دکان کیوں نہ گرائی جائے تو اس پر ہمارے کسی ساتھی نے حامی نہ بھری، دکان کیا تھی پورا تعزیہ تھا۔ مچان پر بوجہ سامان آرائش تل دھرنے کی جگہ نہ تھی اور مجمع یہاں ایسا تھا کہ پکڑا جانا قطعی تھا مگر ہم نے کہا کہ خواہ کچھ بھی ہو ہم یہ کام ضرور کریں گے ہمارے ساتھیوں نے کانوں پر ہاتھ دھرے ہم نے بھاگنے کی راہ وغیرہ خوب غور سے دیکھ لی اور گھوم پھر کر اس جگہ پہنچے جہاں احاطہ کی چھوٹی سی کچی دیوار تھی یہ جگہ الگ سی تھی اور یہاں لوگ پیشاب کرنے آتے تھے ہم نے ساتھیوں کے ساتھ دو تین گھنٹہ بسر کی اور پھر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئے، گھومتے، پھرتے دکان کے پاس آ کر ہم نے ہمت کر کے مجمع کے دباؤ میں کھمبے سے لگ کر جو ڈنڈے کو گھسیٹا تو ایک شور بے ہنگام برپا ہوا اور دکان مع چھت و سامان سجاوٹ اور پان والے اور بوتلوں کے آن پڑی کتھے اور چونے کی کلھیاں سب ایک ہو گئیں اور غضب یہ ہوا کہ وہ برتن بھی گرا جس میں کہ پان والا پیسے رکھتا جا رہا تھا پیسے جو مجمع میں گرے لوگوں نے دست اندازی کرنا شروع کی ہم کو اس میں موقع فرار کا مل گیا اور اس شور و غل میں ہم مع ساتھیوں کے دیوار پھاند اور گلی میں کود کر اس بری طرح بھاگے کہ نہ معلوم کہاں آ کر نکلے ہم کو سخت اندیشہ پکڑے جانے کا تھا کیونکہ وہاں پر جو کانسٹیبل تھا اس نے ہم کو شرارت کرتے ہوئے شاید دیکھ لیا تھا اور ہم عجب نہیں پکڑے جاتے اگر کہیں دکان نہ لٹنے لگی ہوتی۔

رات کافی آ گئی تھی اور ہم نہ معلوم کہاں تھے جہاں نسبتاً سناٹا تھا جگہ جگہ لوگ سڑک کے کنارے چارپائیوں پہ سو رہے تھے ایک لالہ ننگے بدن پلنگ پہ عین ایک موڑ پر اس طرح توند پھیلائے لیٹے ہوئے تھے کہ ہم کو مجبوراً اپنا سگریٹ جو قریب الختم تھا ان کے پیٹ پر رکھ دینا پڑا، وہ ایسے تڑپ کر پیٹ پیٹتے ہوئے اٹھے کہ ہم کو لطف ہی آ گیا اور ہم بھاگ کر دوسری جگہ پہنچے کچھ آگے پہنچ کر ہم نے ایک چارپائی مع سونے والے کے لوٹی اور گھر واپس ہونے سے پہلے پہلے ہم نے ایک برہنہ بدن سونے والے کے پیٹ پر سگریٹ جلتا ہوا رکھ کر بہترین تماشہ دیکھا۔

رات گئے گھر واپس آئے مگر چونکہ صبح ہم گھر سے اجازت لیکر نہیں گئے تھے اس لیے دوسرے روز محض یہی جرم ہمارے

[illegible] سارا دن بھر کیوں غائب رہے اس کی پاداش میں دن کا کھانا ہمارا بند کیا گیا اور ہم کو مجبوراً اپنے پنڈت دوست کے یہاں کھانا پڑا، افسوس وہی ہم ہیں اور وہی دنیا، ان شرارتوں کا خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

عمر نے ہم کو نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

غسل

احتشام رضوی ماہلی

شیخ علیم کا بچپن ابھی اچھی طرح ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ بوڑھے ہونا شروع ہو گئے۔ آپ تعجب کریں گے کہ یہ ایک منزل کی چھلانگ ہماری سمجھ میں تو نہیں آئی لیکن واقعہ یہی ہے جوانی یا شباب (حضرت شوکت تھانوی کا نکلنے والا رسالہ معاف کریں!) کسی مقررہ عہد کا نام نہیں کوئی خدائی وعدہ نہیں کہ وہ ٹوٹ ہی نہ سکے، عمر کوئی گھڑی نہیں ہے کہ سوئیاں ایک محدود اور مقررہ رفتار سے چلا کریں بلکہ زندگی جس طرح بنائی جائے گی اسی طرح کے ذہنی اثرات ہوں، محسوساتِ قلب صرف رجحاناتِ طبعی کے ہاتھوں میں اسیر ہیں اگر کوئی بچہ شروع ہی سے ہر طرح کے کھیل کود، جسمانی ورزش اور بیرونی فضا کے اثرات سے بچایا جاتا ہے تو اس میں بچپن کی شریر حرکتیں، ہر چیز کے متعلق دلچسپ اور تحیر آمیز سوالات تلاش کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کیونکہ بچپن جس احساس کا نام تھا وہ اس کے لیے بالکل بیگانہ رہا یہی حالت جوانی کی بھی ہے، اگر شباب کی امنگیں، بدمستیاں، لاپرواہی، لاابالی پن کسی شخص سے چھین لی جائیں تو اس کو جوان کہنا گناہ ہے۔

خیر تو شیخ علیم بچپن کے بعد یکایک پیری کی آغوش میں آ گئے، عجیب اتفاق تھا کہ ان کی شادی کرتے ہی ماں اور باپ دونوں عالمِ بالا کو چل دیئے اور اپنی گاڑھی کمائی کا زیادہ حصہ علیم کے لیے چھوڑ گئے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علیم بھی اسی انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ وہ لوگ مریں اور یہ چنیا بیگم سے عشق شروع کر دیں چنانچہ جب باپ کی چالیسی کے لیے اور سامان منگائے گئے تو ساتھ ہی تھوڑی سی افیون بھی آئی اور اسی روز سے افیون پارٹی کا افتتاح ہوا اور محلہ کے کئی دوستوں کے ساتھ تھوڑی مقدار میں شروع کر دی گئی، افیون اور ضعف کا چولی اور دامن کا ساتھ ہے، یہاں تک کہ اس کا نام زبان پر آتے ہی ایک سستی اور کاہلی سی چھا جاتی ہے . . . پھر آپ ہی بتائیے کہ شیخ جی جوان کب ہوئے؟

تھوڑے دنوں تک تو خیر کوئی خاص بات نظر نہ آئی، علیم کے ایک لڑکی پیدا ہوئی اور انہوں نے شیخانی کو الگ بلا کر تاکید کر دی کہ اگر بچی کی زندگی اور تندرستی کا کچھ بھی خیال ہے تو ایک مٹر کے برابر افیون دیا کرو (راوی کا یہی بیان ہے لیکن غالباً سرسوں کہا ہوگا) افیونی کو دو تین چیزوں سے عشق ہوتا ہے لیکن ساتھ کئی چیزوں سے عداوت بھی ہو جاتی ہے سنا ہے کہ اگر کسی افیونی کو سانپ کاٹ لے تو سانپ خود ہی انا للہ ہو جاتا ہے اس کی وجہ جو کچھ بھی ہو لیکن ہمارا تو یہ خیال ہے کہ ایسا نہ نہانے کی وجہ سے ہوتا ہے جسم پر میل کے ساتھ ہی ساتھ زہریلے جراثیم بھی چمٹتے چلے جاتے ہیں ہم لوگ غلطی کرتے ہیں اکثر غسل کر کے انھیں دھو دیتے ہیں ایک افیونی اس کا خاص خیال رکھتا ہے اس کے جسم پر کبھی پانی نہیں پڑنے پاتا . . . جس طرح عام طور پر لوگوں کو بچھو کے ڈنک سے تکلیف ہوتی ہے اسی طرح افیونی کو پانی سے ایذا پہنچتی ہے۔

شیخ جی نے نہانا بالکل ترک کر دیا بیوی نے بہت کچھ سمجھایا لیکن اُن کے فلسفہ کے آگے کسی طرح بس نہ چلا، ہر افیونی بغیر درس و تدریس کے ایک بہترین عالم ہوتا ہے اُس کے پاس چھوٹے تاریخی افسانوں کا گرانبہا خزانہ ہوتا ہے، ہر علم پر وہ رائے زنی کر سکتا ہے سیاستِ حاضرہ پر اُس کی رائے اُس کے حلقۂ احباب میں بڑی وقعت رکھتی ہے یہی حال علیم کا تھا۔ انھوں نے شیخانی کو ہمیشہ سمجھایا کہ نہانا بالکل جائز نہیں کیونکہ قرآن کا حکم اس کے خلاف ہے۔ بیوی نے سر پیٹ لیا اور پوچھا "تو کیا جو لوگ نہاتے ہیں وہ قرآن شریف کے خلاف عمل کرتے ہیں؟" "سراسر" علیم نے افیون کی گولی کو چائے کی پیالی میں گھولتے ہوئے کہا پھر سر اُٹھا کر بولے "آخر قرآن میں یہ تو لکھا ہے کہ اسرافِ بیجا جائز نہیں پھر اگر میں نہاؤں تو پانی بہت خرچ ہوگا جبکہ نہانے کی کوئی ضرورت نہیں تو کیا یہ اسرافِ بیجا نہ ہوگا؟ اب بولو۔"

بیوی کی سمجھ کے باہر تھا کہ اس تحقیقات کا جواب دیں انھوں نے ٹالنے کے طور پر کہا "ارے تو کبھی کبھی تو نہا لیا کرو تب تو اسراف نہ ہوگا؟"

- کیا کہا؟ کبھی کبھی؟ ارے بھئی بھول گئیں ابھی جس سال ہاجرہ پیدا ہوئی ہے اُسی سال عید میں تو میں خوب نہایا تھا! ابھی دن ہی کتنے ہوئے" ہاجرہ قریب ہی کھڑی ہوئی تھی اُس نے کہا "ابا میری عمر کیا دس برس سے کم ہے؟"

- ہاں تو دس برس تو دیکھتے گزرتے ہیں دیکھو جس طرح امریکہ لڑائی میں ہار کر کمزور ہو گیا تھا اُسی حال میں پڑا ہوا ہے روس کے بادشاہ اُسی طرح حکومت کر رہے ہیں ایک تنکا بھی تو اپنی جگہ سے نہیں ہلا اور تم لوگوں کے نزدیک بڑا زمانہ ہو گیا۔

(۲)

جاڑے کا موسم تھا، علیم نے کسی خیال سے اپنے کپڑے اُتار کر دھوپ میں ڈال دیئے تھے اور خود بھی وہیں دھوپ میں بیٹھ کر سجدے کی رسم ادا کر رہے تھے، بدن کی رنگت تبدیل ہو چکی تھی کیونکہ جلد بدن پر ایک تہہ گرد و غبار کی جمی ہوئی تھی، کھانا سامنے لایا گیا اور شیخ جی نے کھانا کھایا ایک چُلّو پانی سے ہاتھ منہ بھی دھویا اور برتن بھی قریب قریب صاف کر دیا۔ بیوی کو اُن کی حالت پر ترس آ گیا اُس نے نہایت منت و سماجت سے کہا "دیکھو کل جمعہ ہے میں پانی گرم کر دوں گی نہا ڈالنا۔"

شیخ جی نے غصہ سے آنکھ اُٹھا کر دیکھا جیسے کسی دشمن کو گھور رہے تھے، "کیا چاہتی ہو کہ مر جاؤں؟" شیخانی حیرت سے ان کا منہ دیکھ رہی تھیں کہ انھوں نے اپنا سوال پھر دُہرا دیا۔ بیوی نے دبی زبان سے پوچھا کہ "آخر مطلب کیا ہے؟"

خالہ کی لڈّو

ڈاکٹر سید نادم رضوی الناظری سیتاپوری

جہاں تک ہم نے اندازہ لگایا ہے خالو کسی وقت بھی ان "مرغیات" اور "بکریات" وغیرہ کے موافق نہیں تھے۔ مگر صرف خالہ کی ہمنوائی میں تائید کر دیا کرتے تھے خیالی اور زبانی تائید ہوتی تو ہم سمجھتے کہ خیر! لیکن خالو جان عملاً مؤید بن جایا کرتے تھے ہم نے خود اکثر دیکھا کہ خالہ جان کی عدم موجودگی میں اُن کی مرغیوں کے چارہ پانی کی فکر کیا کرتے تھے۔ کوئی تین چار برس ہوئے ہوں گے جب جاڑوں ہی میں خالہ نے حسبِ معمول لوگوں سے عمدہ انڈوں" کی فرمائش کی اور اللہ میاں کی عنایت سے کامیاب بھی ہو گئیں یعنی کوئی دو تین درجن انڈے مل گئے اور کڑک مرغیوں کی تلاش ہونے لگی جہاں انڈے مل گئے تھے مرغیوں کا مل جانا بھی کوئی

بڑی بات نہ تھی چند ہی روز کے بعد مُرغیاں بھی آگئیں اور خالہ نے سونے کے کمرہ کی بغلی کوٹھڑی میں ایک "زچہ خانہ" تیار کر کے ایک بہت بڑے جھابے میں گیہوں کی بھوسی بھر کر کچھ لوہے کے ٹکڑے اور لاکھ کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں وغیرہ رکھ کر مُرغی کو بٹھال دیا۔!

اگرچہ معمولات میں ایک جدید اضافہ ضرور ہو گیا تاہم خالہ روزانہ ایک مرتبہ سویرے سویرے وظیفہ پڑھتی ہوئی اُس "زچہ خانہ" میں جا کر "زچہ پُرسی" بھی ضرور کر آتیں اور علیٰ ہذا القیاس خالو بھی بلاناغہ خالہ کی دلجوئی فرمایا کرتے تھے اور کچہری سے آنے کے بعد مرغی کو دیکھنے ضرور جایا کرتے تھے دانہ ابتداً روزانہ دیا جاتا تھا لیکن کوئی ہفتہ بھر کے بعد تیسرے دن مقرر ہو گیا صرف روزانہ تھوڑا سا پانی پلا دیا جاتا تھا کیونکہ خالہ کہتی ہیں کہ پانی نہ پلانے سے میرے دل میں شک پیدا ہو جاتا ہے۔

بیسویں۔ اکیسویں دن انڈوں میں "کٹک" پیدا ہوئی اور بعضوں میں ذرا سے سوراخ سے بچّہ بھی نظر آنے لگا اب کیا ہے دن میں دو تین بار دیکھا جاتا کہ مبادا کہیں کوئی بچہ نکل تو نہیں آیا آخر کار اسی انتظار میں بچیسویں روز صبح ایک سفید موٹا تازہ بچّہ انڈے سے برآمد ہُوا گھر بھر میں خوشی اور مسرّت کا غلغلہ بلند ہو گیا ہر شخص کے دل میں خوشی کا ایک زبردست جذبہ پیدا ہو گیا اور ظاہر ہے کہ بلوٹی کا بچہ سبھی کو پیارا ہوتا ہے پھر اگر ہمیشہ شادمانی پیدا ہُوا تو کیا بیجا تھا۔ خالہ نے پانچ پیسہ کا دونا منگوا کر مولا مشکل کشا کی نذر دلائی ایک آدھ پیسہ صدقہ دیا اور کچھ دھان بچّے سے مس کر کے فقیروں میں تقسیم کر دیئے چھٹی کی بھی اسکیم بنائی گئی تھی لیکن چونکہ خالو صاحب کی تجویز تھی لہٰذا خالہ چڑھ گئیں اور اُن کی سمجھ میں آ گیا کہ خالو جان طنز کر رہے ہیں خفا ہو کر اس تحریک کی مخالف بن گئیں اور اسکیم فیل ہو گئی۔ خالو نے تاریخی نام رکھا لیکن خالہ نے ناراضگی کی وجہ سے اُن کے نام کو رائج نہ ہونے دیا اور خود اپنے رکھے ہوئے نام "لاڈو خانم" پر عقیقہ کروایا اور یہی نام محبّت اور پیار میں "میری لاڈو سے میری لڈو" بن گیا۔

اس فخرِ خاندان تحفہ پر خالہ کے بعد اگر کسی شخص کو محبّت تھی تو وہ میاں بیچو تھے جو اکثر روٹیاں پکاتے ہوئے آٹے کی لونڈیاں بنا کر "لڈو" کو کھلایا کرتے تھے۔ مثل ہے "جس کا کھائیں گے اُسی کا گائیں گے" لڈو نا سمجھ سہی مگر اس مثل کو ضرور سمجھتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اُسے بھی فطرتاً انھیں دو آدمیوں یعنی خالہ اور میاں بیچو سے محبّت ہونی چاہیئے تھی۔

جب خالو کا تبادلہ لکھنؤ ہو گیا اور کئی مہینے ٹال مٹول کے بعد خالہ مع اپنے "کورٹ آف وارڈس" کے لکھنؤ گئیں تو میاں بیچو اور یہ مرغی خانہ یعنی "پولٹری فارم" بھی ساتھ تھا ریل کے کرایہ کا تو کوئی غم نہ تھا اگرچہ ایک ایک مرغی کا کرایہ ایک آدمی کا دونا چارج ہُوا مگر سب کچھ برداشت ہے صرف "لڈو" کے لیے۔

"لڈو" اگرچہ حیوان تھی مگر اُس میں خالہ شناسی کا بہت مادہ تھا اور جس وقت خالہ چھالیاں کرنے کے لیے ہاتھ میں سروتا لیتیں بی "لڈو" بھی ایک زانو داب کر جا بیٹھتیں اور ٹکٹکی باندھے ہوئے پیار و محبت سے خالہ کے اس مشغلہ کو دیکھا کرتی تھی خالہ جب طلب کے لیے پان کا ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھ لیتیں تو "لڈو" کا فرض تھا کہ وہ بھی بچے ہوئے ٹکڑے

کو خالہ کی موجودگی میں ضرور نوش کرے حالانکہ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک مرغی کو مہوبہ کے پانوں سے کیا تعلق۔

یہ تو میری آنکھوں کا دیکھا ہوا واقعہ ہے اور میں بھی فخریہ کہنے کے قابل ہوں کہ مجھے بھی اکثر لڈو کے ساتھ ناشتے کا اتفاق ہوا ہے آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ ڈاکٹر نادم اور ایک مرغی کی ہم جلیسی لیکن کوئی جرأت کی بات نہیں سنیئے جب ہم لوگ ناشتے کے لیے بیٹھتے تو خالہ "لڈو" کو چمکار کر آواز دیتیں اور وہ دوڑتی ہوئی آن کر خالہ کی پہلو نشین بن جاتی۔ خالہ جب پیالی میں چاء انڈیلتیں اور پرچ میں ٹھنڈی کرتیں تو بی لڈو پہلے چکھ لیا کرتیں اور بعد میں کچھ روغنی روٹی اور ٹوسٹ کے نیچے کھچے ٹکڑے بھی نوش فرماتیں اور حسبِ معمول پان۔

اسی طرح جب میاں بیچو کھانا پکانے کے لیے باورچی خانے جاتے تو لڈو بھی پہنچ جاتیں اور بیچو کچھ گوشت کے ٹکڑے وغیرہ کھلاتا کوئی گیارہ بجے تک یہ پروگرام رہتا اور ٹنکاتی دوپہر میں بی لڈو خالہ والے پلنگ پر آرام فرماتیں۔

لکھنؤ کے زمانہ قیام میں چند نیولے خالہ کی پولٹری فارم کے دشمن ہو گئے تھے اور انھوں نے لڈو کے دو چار بھائی بہنوں پر ہاتھ بھی صاف کر دیا کرتا تھا مگر اللہ کو بچانا منظور تھا "لڈو" ان موذیوں کے ہاتھ سے بال بال محفوظ رہیں مگر میاں بیچو کی دور اندیشی نے اس کا بھی خدشہ مٹا دیا یعنی بیچو نے رفتہ رفتہ سات نیولوں کا کام تمام کر کے تمام گھر کو مطمئن کر دیا کہ اب "لڈو" کا خدا اسبد رہا ہے "بلی" کا خدشہ نہ کبھی خالہ کو ہوا تھا نہ ہونا چاہیئے کیونکہ "بجلی" اس کے دفعیہ کے لیے موجود

مراجعتِ وطن پر جب خالہ کا پولٹری فارم بھی آگیا تو خالہ نے کچھ اور مرغیوں کا بھی اضافہ کر دیا اور پہلے سے کہیں زیادہ دلچسپیوں کا اضافہ ہو گیا "لڈو" کے ناز و نعم اور چاہ و پیار میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہی ہوتی گئی اور پروگرام میں کچھ فرق نہ آیا وہی بلبل و نہار ہے۔ "لڈو" کے انڈے بھی بٹھائے گئے اور بچے بھی نکلے مگر ؎

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اور حکمِ خدا سے کوئی بچہ زندہ نہ رہا خالہ کو بھی کچھ شک سا ہو گیا تھا اس لیے انھوں نے "لڈو" کے انڈے بٹھا لینے بھی بند کر دیئے ———؟

(۱۹۳۳ء)

شوکت تھانوی کا اپنا روزنامہ

طوفان

اور اس کے چند مندرجات

ڈوبنے کے واسطے کافی ہے اک ہلکی سی موج ! !
ہاں اُبھرنے کے لئے موجوں میں طوفان چاہیئے

روزنامہ طوفان کا اجرا میرے اس مسلسل خواب کی ایک خوشگوار تعبیر ہے جو اپنی صحافتی زندگی میں اپنی بیدار آنکھوں سے میں برابر دیکھتا رہا ہوں۔ اور اخبار نویسی کا ہر تلخ تجربہ جس شیریں توقع اور جس خوشگوار مستقبل کے سہارے مجھ کو اس مشغلہ سے مایوس ہونے سے ہمیشہ باز رکھتا رہا وہ شیریں توقع آج پوری ہو رہی ہے اور وہ خوشگوار مستقبل آج میرے پیش نظر ہے۔ آج میرے ہاتھ میں میرا ہی قلم ہے۔ اور میرے دماغ میں میرے ہی خیالات۔ میں آج مسلم لیگ کا حامی ہو کر کانگریس کی ہمنوائی کے لئے مجبور نہیں ہوں اور نہ کانگریس کے مقاصد پر ایمان رکھتے ہوئے مسلم لیگ کی جانبداری کے لئے مجھ کو کوئی مجبور کر سکتا ہے۔ میں نے اپنی صحافتی زندگی کے کم و بیش بارہ سال اپنے قلم سے دوسروں کے خیالات کی ترجمانی میں بسر کئے۔ اکثر مجھ کو ضمیر فروشی بھی کرنا پڑی اور اکثر اس سے بھی زیادہ ذلیل قسم کی قلمی تجارت۔ مگر میں جانتا تھا کہ میرا قلم در اصل قلم نہیں بلکہ پھاوڑہ ہے اور میرا کام صرف یہ ہے کہ دماغ کو بالکل مقفل کر کے صرف اپنے سرمایہ دار کے اشاروں پر چلوں اور قلم کو چلاؤں۔ اس میں شک نہیں کہ حصولِ معاش کا یہ طریقہ اخلاقی اور اعتباری حیثیت سے خواہ بظاہر کیسا ہی مناسب کیوں نہ ہو مگر حقیقتاً اس میں اور چوری، ڈکیتی۔ خیانت اور دغابازی کی قسم کے اخلاقی جرائم میں کوئی فرق نہیں۔ مگر دنیا نام ہے۔ اعتبارات کے ایک وسیع دام کا اور میں بھی گویا اعتباری حیثیت سے نہایت جائز طریقہ پر اس ناجائز ذریعہ معاش کو بارہ سال تک اختیار کئے رہا۔ اس لئے کہ میرے حالات نے مجھ کو اسی کے لئے مجبور کیا تھا اور میں اپنی مجبوریوں کے احترام کے لئے بھی مجبور تھا۔

بہرحال بارہ سال کی اس ضمیر فروشی نے مجھ کو بہت سے قیمتی سبق بھی پڑھائے ہیں۔ اور ان ہی قیمتی اسباق میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں سیاسی عقائد کے اعتبار سے ایک اخبار کا اپنے کسی ایک عقیدے کے لئے وقف کر دینا اصولِ صحافت کے قطعاً منافی سمجھتا ہوں۔ کسی اخبار کا اپنے کو کسی جماعت کا آرگن کہنا اس کی اخباری شان کے شایان نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اس قسم کے جماعتی آرگن اخبار کی تعریف سے علیحدہ ہو کر اشتہار کی تعریف میں آتے ہیں۔ ایک مشتہر تو بے شک یہ کر سکتا ہے کہ وہ اپنے تمام عیوب کو بھی محاسن کی صورت

میں پیش کرے۔ مگر اخبارات کے لئے یہ ذرا مشکل ہے اور واقعی وہ اپنی مخصوص جماعت کی خامیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے یا سراہتے ہوئے صحافتی دیانت کو کیونکر برقرار رکھ سکتے ہیں؟ کوئی سیاسی جماعت خواہ وہ اپنے مقاصد اپنے ایثار اور اپنے اقتدار کے اعتبار سے کیسی ہی مکمل کیوں نہ ہو مگر وہ آخر کار انسانوں کی ہی ایک جماعت ہو گی۔ کوئی خدائی جماعت نہیں ہو سکتی۔ اور اس انسانی جماعت کے لئے لغزشیں خامیاں اور کوتاہیاں بھی قدرتی طور پر ممکن ہیں۔ ایسی حالت میں اس جماعت کے نام لیوا اخبار کے لئے صرف دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں کہ یا تو وہ ان خامیوں کو نظر انداز کر دے۔ یا ان خامیوں کا زبردستی جواز ڈھونڈھے اور رات کو دن ثابت کرنے کی کوشش کرے۔

اب اگر اخبار نے سکوت اختیار کیا ہے تو یہ اس کی مجرمانہ خاموشی ہے اور اگر ناجائز طریقہ پر حمایت کی ہے تو اخبار اپنی اخباری حیثیت سے گر کر اشتہار کے درجہ پر آجاتا ہے۔ بعینہٖ یہی حالت ان تمام جماعتی اخباروں کی ہے۔ جو مختلف سیاسی جماعتوں سے اپنے کو منسوب کرتے ہیں۔ عام اس کے کہ وہ کانگریس کے اخبار ہوں یا لیگ کے، مہاسبھا کے اخبار ہوں یا جمعیۃ العلمائے ہند کے۔ دراصل ان میں سے کسی جماعت نے آج تک یہ دعوےٰ نہیں کیا ہے کہ یہ خدائی جماعت ہے۔ اور جب ان میں سے ہر جماعت انسانوں ہی سے متعلق ہے۔ تو وہ غلطیوں اور خامیوں اور لغزشوں اور کوتاہیوں سے کیونکر غیر متعلق ہو سکتی ہے۔ مگر جماعتی اخبارات اپنی اپنی جگہ پر اپنی اپنی جماعت کو تمام عیوب سے پاک اور تمام ممکن خامیوں سے بے نیاز ثابت کرنے میں مصروف ہیں۔ حالانکہ واقعات کی روشنی میں یہ حقیقت نہایت مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ کاش بجائے اس کے یہ ہوتا کہ اخبارات اپنے ذمہ صرف یہی خدمت لیتے کہ ہر جماعت کو اس کی برائیوں اور بھلائیوں سے نہایت دیانتداری کے ساتھ آگاہ کرتے رہیں گے۔ تاکہ ان کی اصلاح بھی ہو سکے۔ اور وہ اپنی حقیقت سے بھی باخبر رہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تہذیب اور تمدن کے علمبردار ممالک میں بھی صحافتی دیانت، سیاسی مصلحت کوشیوں میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج ہر گتھی بجائے سلجھنے کے الجھتی ہی جاتی ہے۔ ہر تخریب فریب تعمیر میں مبتلا ہے۔ اور سیاست نام ہے دروغ مصلحت آمیز کا۔

طوفان اسی ماحول میں نکل رہا ہے۔ مگر اس ماحول سے علیحدہ رہنے کے لئے عزم یہی ہے۔ مگر اس عزم کی تکمیل کا علم خدا کو ہے۔ شعلوں سے کھیل کر دامن کو بچا لانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مگر انسان کا ہر ارادہ بشرطِ خلوص اگر خدا پر منحصر ہو کر ذہن میں آئے تو اس کے تکمیل تک نہ پہنچنے کا اندیشہ بھی ایمانی کمزوری ہے۔ اور کم سے کم میں اس وقت جب کہ طوفان کا اجراء خدا کے نام سے ہو رہا ہے۔ اس ایمانی کمزوری کے لئے تیار نہیں ہوں۔

طوفان ہر جماعت کا اخبار ہے اور ہر جماعت کے جائز حقوق کا محافظ مگر اس کے ساتھ ہر جماعت کی خامیوں اور کوتاہیوں کا آئینہ بھی ہے۔ طوفان کے نزدیک ہندوستان کی ہر سیاسی جماعت واجب احترام ہے۔ مگر طوفان ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی قائل نہیں ہے۔ کہ ان میں سے ہر جماعت یا ان جماعتوں میں سے کوئی جماعت بالکل پاک اور بے عیب ہو سکتی ہے۔ طوفان کے تمام تبصرے اور تمام نکتہ چینیاں بالکل نیک نیتی کے ساتھ محض اصلاحی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر ہمیشہ ہوں گی۔ اسی کے ساتھ ہر جماعت کے جائز حقوق کا تحفظ طوفان کا سب سے پہلا صحافتی فرض ہو گا۔ اور اگر اس ارادہ میں نیک نیتی کو دخل ہے تو میرا ایمان ہے کہ خدا مجھ کو اسی جادہ پر استقلال اور ہمت عطا کر کے کامیابی کی منزل کی طرف سلامت روی کے ساتھ گامزن رکھے گا۔

آمین

اس کو طوفان حوادث سے بچانا یارب
آرزو پھول لئے پھرتی ہے دامانوں میں

درمیانی خلیج

مہاتما گاندھی اور مسٹر جناح کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنمایانِ اعظم کا اجتماع لیگ اور کانگریس کا معانقہ ہے اور ہندو مسلم اتحاد کا نہایت مبارک نشان مگر اس خوشگوار تقریب کی پشت پر بھی ناگوار۔ رکیک اور حد درجہ شرمناک صورتِ حال ہے وہ یہ ہے کہ اخبارات میں اس ملاقات کے متعلق عجیب عجیب واقعات پیش کئے جا رہے ہیں۔ ایک سب سے بڑے اور سب سے زیادہ ذمہ دار کانگریسی اخبار نے جو دہلی سے شائع ہوتا ہے۔ اس ملاقات کے متعلق اپنا مقالۂ افتتاحیہ سپردِ قلم کیا ہے جس میں مہاتما گاندھی کی حیثیت سے زیادہ آپ کی روحانی اور ملکوتی بلکہ پیغمبرانہ حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ خیر اس اخبار کو اپنے اس ذاتی اعتقاد کا یقیناً حق تھا اور گاندھی جی کی بلند شخصیت سے خود ہم کو بھی انکار نہیں ہے۔ مگر اس مقالہ کی سُرخی یہ دی گئی ہے کہ "وطن کی راہ میں رہنمائے اعظم کا ایثار" گویا مسٹر جناح سے ملنا اور اس ملاقات کو گوارا کر لینا مہاتما گاندھی کا ایثار ہے۔ جس کے معنی بالفاظ دیگر یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ گاندھی جی محض وطن کی خاطر اس ذلت اس رکیک بات اور اس افتاد کے لئے بھی تیار ہو گئے کہ وہ مسٹر جناح سے ملیں۔ بلکہ اس مقالہ میں گاندھی جی کی روحانی خصوصیات کا اظہار بھی اسی رنگ میں کیا گیا ہے۔ کہ وہ مسٹر جناح سے ملنا ہرگز گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ بشرطیکہ وہ اوتار نہ ہوتے ظاہر ہے کہ اس مقالہ کا صرف ایک نتیجہ ہی ہو سکتا ہے۔ کہ لیگ کے اخبارات مسٹر جناح کے متعلق اسی قسم کے مقالات لکھیں اور گاندھی جی سے ملنا ان کا ایثار قرار دیا جائے۔ پھر کانگریسی اخبار اس کو لیگ والوں کا تعصب کہیں اور لیگ والے کانگریسی اخبارات سے شدت کے ساتھ الجھ جائیں۔ یعنی ادھر گاندھی جناح ملاقات ہوتی رہے اور ادھر درمیانی خلیج کو یہ اخبارات وسیع بناتے رہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا اخباروں کو اس سے بہتر طریقہ ملک کی خدمت کرنے کا نہیں ملتا کہ وہ محض اپنی گرمیٔ بازار کے لئے ملک میں آگ لگاتے رہیں۔

۱۱ر مئی ۱۹۳۶ء

سورج کی جامع تصویر اور مغل آرٹ کا ایک نمونہ

ہندوستان کا وہ زمانہ جب انگلستان ہندوستان کے کپڑے کا محتاج تھا۔ کیا ہندوستان کا مستقبل اس کے گزرے ہوئے دور سے زیادہ شاندار ہو سکتا ہے؟

ہندوستان میں اسلامی دورِ حکومت کے متعلق متعصب مورخین خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہیں۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانہ کا ہندوستان موجودہ ہندوستان سے کہیں زیادہ خوشحال تھا۔ اس زمانہ میں نہ لوگوں کو فاقہ کشی کرنی پڑتی تھی۔ اور نہ تن ڈھانکنے کے لئے ملک کے باشندے کپڑوں کے لئے ترستے تھے۔

مغلوں کے عہد حکومت میں ہندوستان کی خوشحالی کا بڑا سبب یہ تھا کہ مغلوں نے ہندوستان ہی کو اپنا وطن بنایا تھا۔ اس لئے

ہندوستان کا روپیہ ہندوستان سے باہر کسی ولایت کو نہیں جاتا تھا۔ بلکہ ہندوستان ہی میں رہتا تھا۔

مغلوں کے زمانہ میں ہندوستان کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جتنے اچھے تعلقات ہندو مسلمانوں کے مغلوں کے دور حکومت میں رہے۔ اتنے بہتر کبھی نہیں رہے۔ اس زمانہ میں نہ فرقہ وارانہ فسادات ہوتے تھے۔ نہ باجہ اور مسجد کا جھگڑا تھا۔ نہ گائے کی قربانی کا فتنہ تھا۔ ہندو مسلمان اس طرح رہتے تھے جیسے ایک ماں کے دو بچے۔ یا ایک خاندان کے دو ہونہار فرزند۔

مغلوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلمانوں میں رواداری کس درجہ بڑھ گئی تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ ہندو اور مسلمانوں میں مذہب کے اختلاف کے باوجود شادی بیاہ کا بین الملتی سلسلہ بھی قائم ہو گیا تھا۔ چنانچہ مغلوں کے بیشتر حکمران ایسے گزرے ہیں۔ جو ہندو عورتوں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے یہ بین الملتی شادی بیاہ کا مسئلہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس کی مثالیں موجودہ دور میں بھی جب کہ لوگ بہت زیادہ آزاد ہو گئے ہیں بہت کم ملتی ہیں۔ غرضیکہ خوشحالی اور رواداری کے اعتبار سے اس زمانہ کا ہندوستان قابل رشک تھا۔

مغلوں کے زمانہ میں ہندوستان کس قدر دولت مند اور خوش حال تھا۔ اس کا اندازہ مغربی مورخین کے مندرجہ ذیل بیانات سے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی صنعت و حرفت پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور مغربی مورخ ایچ۔ ڈبلیو۔ ولسن لکھتا ہے کہ۔

”اٹھارہویں صدی تک ہندوستان کے سوتی اور ریشمی کپڑے۔ انگلستان کے تیار کردہ کپڑوں کی نسبت برطانوی منڈیوں میں پچاس ساٹھ فی صدی کی کفایت سے فروخت ہوتے تھے۔ جب برطانیہ نے دیکھا کہ ہندوستان کی صنعت پارچہ بافی انگلستان کی صنعت کو برباد کئے دیتی ہے تو برطانیہ میں بعض ہندوستانی کپڑوں کی درآمد کلیتاً ممنوع قرار دے دی گئی۔ اور بعض کپڑوں پر ستر اسی فی صدی تک محصول لگا دیا گیا۔“

گویا اس زمانہ میں انگلستان کو ہندوستانی مال کی روک تھام کے لئے وہی ذرائع اختیار کرنے پڑے جو آج جاپانی مال کے لئے اختیار کئے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی ہندوستانی مال انگلستان کی منڈیوں میں برابر بکتا رہا۔ کیونکہ ہندوستانی کپڑا انگلستان کے امرا کے طبقہ میں فیشن میں داخل ہو چکا تھا۔

ایک دوسرا یورپین سیاح ہندوستان کی خوشحالی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

”ہندوستان نہایت شاداب ملک ہے۔ اس کے باشندے سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن بہت زیادہ خوشحال ہیں۔ ان کے تمول کا اندازہ ان شاندار عمارتوں اور مندروں سے کیا جا سکتا ہے جن میں کروڑوں روپیہ کی دولت پوشیدہ ہے۔“

یہ ہے قدیم ہندوستان کی خوشحالی کی داستان لیکن یہ افسانہ اس وقت کا ہے جب ہندوستان پر ہندوستانیوں کی حکومت تھی اور ہندوستان کا روپیہ ہندوستان ہی میں رہتا تھا۔ اس زمانہ میں ہندوستان کی ہر ایک چیز کس قدر ارزاں تھی۔ اس کی تفصیل کپتان ہملٹن کے سفرنامہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ کپتان ہملٹن اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

”گوشت تین فاردنگ یعنی چند کوڑیوں میں نصف سیر ملتا ہے۔ ایک ٹن یعنی کئی من نمک ایک کراؤن (دو ڈھائی روپیہ)

میں فروخت ہوتا تھا شہر کلکتہ میں مکھن ایک آنہ میں ایک پونڈ یعنی نصف سیر ملتا تھا۔ دو آنے میں ایک سو بڑی مچھلیاں فروخت ہوتی تھیں۔ میں نے ایک قابلِ اعتبار شخص سے سنا ہے کہ ۵۰۰ پونڈ چاول یعنی تقریباً ۶ من ایک روپیہ میں ملتا ہے۔“

ان چند چیزوں کے نرخوں سے اندازہ لگائیے کہ اس زمانہ کا ہندوستان کس قدر ارزاں تھا۔ دولت کے ساتھ اس ارزانی کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان کا اس زمانہ کا ہر فرد موجودہ زمانہ کے دولت مندوں سے بھی بہتر حالت میں تھا۔

ہندوستان کی خوشحالی اور فارغ البالی کے بعد جب اس زمانہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات پر ہم نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہمیں ہندوستان کا مغلیہ دور ایک ایسا پُرامن دور نظر آتا ہے جس کی مثال اس سے پہلے ملنی ناممکن ہے۔ اکبر کے دورِ حکومت میں ہندوؤں کو جو اعزازات دیئے گئے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ چنانچہ اِس وقت ہندوستان میں جتنی بھی ہندو ریاستیں موجود ہیں۔ وہ اکبر اور اس کے جانشینوں کی رواداری کی یادگار ہیں۔ مغلوں نے سابقہ ہندو حکومتوں کو جوں کا توں برقرار رکھا اور ان کو مستقل اور دوامی ماتحت حکومتوں کی صورت دے دی۔ جو آج بھی دیسی ریاستوں کی صورت میں نظر آ رہی ہیں۔ اس کے علاوہ تمام بڑے بڑے عہدوں پر ہندو حکام قابض اور متصرف رہے۔ مغلوں کے زمانہ میں کبھی ہندو مسلم سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ اس زمانہ میں عہدے ہندو اور مسلم تناسب سے نہیں دیئے جاتے تھے بلکہ قابلیت اور خدمت گزاری کے اصول پر بلا لحاظ مذہب و ملت عہدے دیئے جاتے تھے۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور یہاں تک کہ اورنگ زیب بھی اس دستور پر عامل رہا۔ عہدِ اورنگ زیب میں ہندو مسلمانوں کی رواداری پر روشنی ڈالتے ہوئے کپتان ہملٹن لکھتا ہے کہ:۔

”حکومت کا مسلمہ مذہب اسلام ہے۔ لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان، ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پورے طور سے برتی جاتی ہے۔ وہ اپنے برت رکھتے ہیں۔ اور تہواروں کو اسی طرح مناتے ہیں۔ جس طرح کہ سابقہ بادشاہت میں مناتے تھے۔“

کپتان ہملٹن کی یہ رائے اس عہدِ اورنگ زیب کے بارے میں ہے جس کو متعصب کہا جاتا ہے۔ کپتان ہملٹن ایک دوسرے مقام پر لکھتا ہے کہ:۔

”یہاں پارسی بھی رہتے ہیں۔ اور وہ اپنی رسوم زردشت کے بموجب ادا کرتے ہیں۔ عیسائیوں کو پوری اجازت ہے کہ وہ اپنے گرجے بنائیں اور اپنے مذہب کی تبلیغ کریں۔ لیکن جو لوگ عیسائی ہو جاتے ہیں کیا اُن کے خیالات اس شہر کے تمام لوگوں کے اخلاق سے بُرے ہو جاتے ہیں؟“

گویا نہ صرف مغلیہ دور میں مذہبی آزادی تھی۔ بلکہ ہر مذہب کے باشندوں کو اس کی بھی اجازت تھی کہ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت بھی کریں۔ یہ تھا۔ ہندوستان مغلیہ دور اور اس کی خصوصیت۔

۱۱؍ مئی ۱۹۳۸ء

مد و جزر

جس وقت لوگ یہ سنیں گے کہ طوفان آگیا۔ خدا جانے بیچاروں کا کیا حال ہوگا۔ بہت سے ایسے ہوں گے۔ جو اس کو دیکھنے کے بجائے ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیں گے۔ اور تمام اوراد و وظائف بغیر کسی ترتیب کے پڑھ جائیں گے۔ تاکہ طوفان سے محفوظ رہ سکیں۔ بہت سے ایسے ہوں گے۔ جو طوفان کے آنے کا شور سن کر اپنے بچوں کو کلیجے سے لگا لیں گے۔ اور بہت سے اپنی تجوریوں کو۔ کسی کے منہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں گی۔ اور کسی کو یکایک اختناق الرحم کا دورہ شروع ہو جائے گا۔ مگر بعد میں جب سب کو یہ معلوم ہوگا کہ یہ طوفان دراصل کیا طوفان ہے۔ تو سب ایک دوسرے کا منہ اس طرح دیکھیں گے گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں کہ ہم زیادہ بے وقوف بنے یا تم حالانکہ بنے دونوں رہ گئی کمی بیشی وہ حساب دوستاں در دل کے تحت آتی ہے

ہر چند کہ یہ طوفان طوفانِ نوح نہیں ہے مگر اس کے "مد و جزر" سے خدا ہی وَد۔ سُوَاع۔ یغوث۔ یعوق اور نسر کے پرستاروں کو محفوظ رکھے۔ حضرت نوحؑ نے تو اپنی کشتی پر ان باطل پرستوں کو محض اس لئے جگہ نہ دی تھی کہ حق کشتی پر محفوظ رہے گا۔ اور باطل اس طرح غرق طوفان ہو جائے گا۔ کہ نہ کہیں جنازہ اٹھے گا۔ نہ مزار بنے گا۔ مگر اس طوفان میں انتظام یہ کیا گیا ہے کہ کاغذ کی ناؤ ہے۔ جس میں یہ تمام باطل پرست محض اس لئے بھرے جا رہے ہیں کہ ان کو بیچ سمندر لے جا کر ڈبو دیا جائے۔ ایسی صورت میں حق پرستوں کو تو ڈرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں۔ البتہ باطل پرستوں کو ہر طوفان طوفانِ نوح ہی سمجھنا چاہیئے۔ خواہ وہ کاغذی طوفان ہو یا بحری۔

خیر یہ باتیں تو ذرا ٹھوس قسم کی سنجیدہ تھیں حالانکہ "مد و جزر" سے کھیلنے والے جناب "کھیون ہار" کو ان سنجیدہ باتوں سے کیا تعلق یہاں تو مقولہ یہ ہے کہ ؎

ہر گھڑی پیشِ نظر اک تازہ طوفان چاہیئے

اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہمیشہ طوفان کا تازہ پرچہ چاہیئے جو جناب "کھیون ہار" کو چاء کی پیالی سے طوفان اٹھانے کا موقع دے دے۔ یہ تو جوار بھاٹے کی محفل ہے۔ یہاں سلامت روی۔ متانت سنجیدگی اور اسی قسم کی دیگر صناعیوں کی کیا ضرورت ہے ہمارا کام گدگدانا ہے خواہ "گدگدی الیہ" کو ہنسی آئے یا گدگدی کی شدت سے رونا۔ بہرحال اس کا ذمہ دار "گدگدانندہ" تو ہو ہی نہیں سکتا۔

سیاسی رونا رونے کے لئے اس اخبار کے باقی تمام کالم پڑے ہوتے ہیں بلکہ رونے کے لئے تو تمام ہندوستان ہی پڑا ہوا ہے۔ اور ہندوستان ہی کو کیوں لیجئے، یہ کہیئے کہ اگر کسی کو رونا ہی ہے تو "ملک خدا تنگ نیست" مگر اس کالم میں تو رونے والو کو بھی ہنسنا ہی پڑے گا۔ اور ہنسنے والے تو خیر ہنسیں ہی گے۔ ان کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ہم تو اس کالم میں اشکوں کو بھی تبسم کی تعلیم دی

گے۔ اور ہندوستان کو بجائے رونے کے تمام مصائب کو قہقہوں پر اڑانے کا سبق پڑھائیں گے۔ خواہ ہماری اس ہنسی کو کوئی بے حیائی سمجھے یا کچھ مگر ہم بے حیا سہی۔ اسی طرح جی بہلیں اور اسی طرح عمر دراز ہو جائے۔

۱۱ر مئی ۱۹۳۹ء

(۲)

ہندوستان کے مردوں کا عجیب حال ہے کہ اپنی اپنی بیویوں کو تو سب پردہ کراتے ہیں اور اپنی بیوی کے علاوہ باقی ہر عورت کو ایسی نظر سے دیکھتے ہیں کہ گویا دل ہی میں تو رکھ لیں گے حالانکہ زبان سے یہی کہتے ہیں کہ:

اے ماؤ۔ بہنو۔ بیٹیو دنیا کی عزت تم سے ہے۔

مگر زبان حال سے ان کی ہر نظر یہی اعلان کرتی ہے۔ کہ دنیا کی عزت تم سے ہو یا نہ ہو مگر تمہاری عزت اور آبرو ہم مردوں کے ہاتھوں ہر وقت خطرہ میں ہے۔ بہت سے مغرب زدہ ہندوستانیوں کا خیال یہ ہے کہ مردوں کی اس بدنیتی کی وجہ پردہ کا رواج ہے۔ اگر پردہ اٹھا دیا جائے تو مردوں کی نظریں سیر رہیں۔ اور وہ عورتوں کو عجیب و غریب چیز سمجھ کر گھورنا چھوڑ دیں۔ مگر چونکہ پردہ کی وجہ سے ان کی نظریں ترسی ہوئی ہوتی ہیں۔ لہٰذا وہ ہر بے نقاب عورت کو ایسی کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہیں گویا سات فاقوں سے ہیں۔

یہ نظریہ صحیح ہو یا نہ ہو مگر اتنا تو ہم بھی جانتے ہیں کہ ہر وہ کام جو چھپا کر کیا جائے عجیب ہے۔ اور ہر وہ عیب جو بالاعلان کیا جائے اس تہذیب اور تمدن کے دور میں ہنر بن جاتا ہے۔ چنانچہ عورتوں کے سلسلہ میں بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی برقعہ پوش عورت سے بات کرنا بھی بُرا سمجھا جاتا ہے۔ مگر ایک بے پردہ عورت کے ساتھ باغ کے تنہا گوشوں میں انتہائی مشکوک طریقہ پر چہل قدمی کرنا سوسائٹی کی نظر میں کوئی عجیب نہیں۔ بلکہ اس کو مہذب اصطلاح میں تفریح کہتے ہیں۔ عورتوں سے بغل گیر ہو کر منظر عام پر ناچنا بھی کوئی غیر شریفانہ حرکت نہیں ہے۔ بلکہ اس کو بڑے آدمی نہایت فخر کے ساتھ ڈانس کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس تہذیب اور تمدن کے دور میں دراصل شرافت ہی انتہائی کمینہ پن ہے۔ چونکہ شرافت کمینہ پن ہے۔ لہٰذا شریف بہو بیٹیوں کا پردہ بھی بُرا ہے۔ اور اس پردے کے محافظ بھی ایسے مجرم ہیں جن کو پولیس شک و شبہ کی بنا پر گرفتار کر سکتی ہے۔

ہمارے ہندوستانی خیال اور مغرب زدہ ذہنیت میں جو زبردست اختلافات اس سلسلہ میں موجود ہے اس کی تشریح بیکار ہے نئی روشنی کے سودیشی صاحب بہادر لوگ پردہ کو ہر برائی کی جڑ کہتے ہیں۔ ہمارے خیال میں عورت اور مرد کا معاملہ کچھ اور ہی ہے پرچھائیں کا یہ حال ہوتا ہے کہ اگر اس سے خود بھاگ گئے۔ تو وہ آپ کے پیچھے دوڑتی ہے۔ اور اس کے پیچھے بھاگ گئے تو وہ آپ کو برابر دعوتِ تعاقب دیتی رہے گی۔ بعینہٖ یہی حال عورتوں کا ہے کہ چونکہ مردوں نے خود ان کو گھورنا اُن کے حسن پر للچائی نظر ڈالنا اپنے عشق کرانا۔ اپنے دل کو پھینکنا اور اپنے جذبات اُچھالنا۔ اپنا شعار بنا لیا ہے۔ لہٰذا عورتیں ان نازبرداروں سے نازبرداریاں کراتی ہیں۔

اپنی جوتی کی نوک پر اُن کے تمام جذبات کا استقبال کرتی ہیں اور اپنی ہر جنبشِ ابرو پر اُن کو نچاتی ہیں۔ حالانکہ اگر مرد یہ فدویت اور ارمان انگیزی ذرا بھی چھوڑ دے تو یہی عورتیں اپنے حسن میں چار چاند لگائے ہوئے مردوں کے قدموں پر نظر آئیں

پنامہ کے قریب ایک جزیرہ ہے۔ وہاں اتفاق سے مردوں کی تعداد بہت کم اور عورتوں کی بہت زیادہ ہے۔ اس حد تک زیادہ کہ عورتوں کو شوہر نہیں ملتے۔ اس کے علاوہ جو مرد وہاں ہیں۔ وہ چونکہ عورتوں کو گھورنا پسند نہیں کرتے ان کے حضور اپنا دل پیش کرنا نہیں چاہتے۔ ان کے حسن سے مغلوب نہیں ہوتے اور اُن کے نسائی تیوروں سے مرعوب ہونا مردانگی کے خلاف سمجھتے ہیں۔ لہٰذا وہاں کی عورتوں کا حال یہ ہے کہ وہ عورتیں کیا ہیں۔ گویا ہندوستان کے مرد ہیں۔ وہ مردوں کا اغوا کرتی ہیں مردوں سے اظہارِ عشق کرتی ہیں۔ مردوں کی ناز برداری کرتی ہیں۔ اور اگر ان کو کبھی کوئی مرد کسی اور ملک کا بھی مل جاتا ہے تو وہ اس کو گھیر لیتی ہیں۔ گویا چیل گدھوں کے غول میں کوئی لاش آ گری ہے۔ ہندوستان کے مردوں کے منہ میں اس جزیرہ کا حال سن کر پانی بھر آیا ہو گا اور ہم خود ہندوستانی مردوں اور اس جزیرہ کی عورتوں کی باہمی اصلاح کے لئے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے مرد اور اس جزیرے کی عورتیں تھوڑے دنوں کے لئے یکجا کر دی جائیں۔ تاکہ ان کی بدنیتی اور ان کی ہوسناکی کے میل جول سے معتدل قسم کی آبادی پیدا ہو سکے جو دنیا بھر کے مردوں اور عورتوں کے لئے معیاری قسم کے جذبات پیش کر سکے گی۔

یکم جون ۱۹۳۸ء

(۳)

یہ تو خیر ایک شاعرانہ خیال ہے کہ وہ آنسو جو محبوب کے دامن میں گر جائیں۔ ان کی قیمت لعل و گہر سے بھی زیادہ ہوتی ہے ورنہ واقعہ تو یہ ہے کہ آنکھ سے گرا ہوا آنسو بھی کوئی قیمت رکھتا ہے۔ اور اگر قیمت ہی رکھتا ہوتا تو یقین جانیے کہ اس بے روزگاری کے زمانہ میں جتنے بیکار گریجویٹ ہیں۔ وہ سب بیٹھے ہوئے رویا کرتے اور اپنے آنسوؤں کی آمدنی سے پیٹ پالتے۔ بلکہ بہت سے باکار انسان جو ہاتھ پیر کی مزدوری کرتے ہیں مزے سے گھر بیٹھے آنکھوں کے اس پانی کی تجارت کرتے اور چین کی بنسی بجاتے مگر اب تک تو آنسو کو نامبارک قسم کا عرق سمجھا گیا ہے۔ البتہ آج یہ سننے میں آیا ہے کہ کوئی بزرگ سر المرتھ رائٹ ہیں جن کی دریافت یہ ہے کہ آنسو میں نہایت قیمتی جوہر ہوتا ہے جو ہر قسم کے جراثیم کو مار سکتا ہے۔

سر المرتھ رائٹ کا یہ روتا ہوا بسورتا نظریہ ممکن ہے کہ غلط ہو مگر قرینِ قیاس ضرور ہے اس لئے کہ فطرت کا انتظام یہی رکھا گیا ہے کہ جب کوئی شخص مرتا ہے۔ تو اس کے پسماندگان اظہارِ غم میں آنکھوں سے گنگا جمنا بہا دیتے ہیں۔ وہ اپنے نزدیک تو صرف روتے ہیں۔ مگر دراصل ہوتا یہ ہے کہ مرنے والے کے بعد اُس کے مرض کے جراثیم کو مارنے کے لئے اشکوں کی کثرت سے ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ یہی جراثیم پسماندگان کو بھی مرحوم و مغفور بنا دیں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ خدا کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ اب ان آنسوؤں پر یہی غور کیجیے۔ تو معلوم ہو گا۔ کہ رونا اظہارِ غم کا طریقہ بھی ہے۔ اور ایک لاجواب قسم کا ڈس انفیکٹنٹ بھی یعنی جراثیم بھی

مرتے ہیں اور دل بھی ہلکا ہوتا ہے۔ اگر آنسوؤں میں جراثیم مارنے کا جوہر نہ ہوتا تو موت پر بجائے رونے کے شاید لوگ ہنسا کرتے اور ہنسنے ہی کو اظہارِ غم کا طریقہ سمجھ لیا جاتا۔

اگر سر المرتھ رائٹ کا یہ نظریہ درست ہے تو گھر بیٹھے اچھی تجارت ہاتھ آئی اور رونا بھی گویا ایک قسم کا بیوپار ہوگیا کہ جب مفلسی نے تنگ کیا تو لگے آنسو بہانے۔ اپنے آنسوؤں سے بوتلیں بھر کر "عرقِ جراثیم کش" کا لیبل لگا دیا اور دوا فروشوں کے ہاں بیچ آئے۔ ہندوستانیوں کے لئے رونے کے امکانات خدا کے فضل سے یوں ہی کیا کم ہیں۔ دوسرے ممالک کے باشندے تو شاید کوشش کرنے کے بعد آنسو بہا سکتے ہیں۔ مگر یہاں تو یہ کاروبار نہایت آسانی کے ساتھ چل سکتا ہے۔ اس لئے کہ آلام و مصائب نے ہر ہندوستانی کی صورت ہی رونی بنا دی ہے۔ اور ہر لوگ مژگان میں مستقل واٹر ورکس کھول رکھے ہیں۔ کہ جہاں پلک دبائی اور سیلاب اُمنڈ آیا۔ ایسی صورت میں اگر واقعی عرق جراثیم کش فروخت ہونے لگا تو امید ہے کہ جس قدر سونا ہندوستان سے غیر ممالک میں جا چکا ہے۔ وہ سب اس عرق کی قیمت کے طور پر واپس آجائے گا۔ اور ہندوستان ہی وہ ملک ہوگا۔ جو اس سلسلہ میں تمام دنیا کی سپلائی کا ٹھیکہ لے لے۔

حد تو یہ ہے کہ اس ملک کی عورتیں۔ اس تجارت میں خاص حصہ لیں گی۔ اس لئے کہ ان کو تو بات بات پر رونا آتا ہے۔ اور آنسو گویا رکھے ہی رہتے ہیں۔ کہ موقع پایا اور موسلا دھار بارش شروع کر دی۔ ان عورتوں سے اس تجارت کو خاص عروج حاصل ہوگا۔ اور امید ہے کہ اگر آنسوؤں سے جراثیم کشی شروع کی گئی۔ تو بہت جلد مختلف امراض کے مہلک جراثیم کا خاتمہ ہو جائے گا۔ حالانکہ ضرورت اس انتظام کی ہے کہ دوسرے ممالک میں جراثیم پیدا ہوتے رہیں۔ اور ہندوستان کے اشک ان کو مارنے کے کام آئیں۔ تو یہ تجارت کامیاب ہو سکتی ہے۔ مگر امید ہے کہ جس وقت آنسوؤں کی یہ تجارت شروع ہوگی۔ اس تجارت کے فروغ کے بھی غیب سے سامان پیدا ہو جائیں گے۔

۲ر جون ۱۹۳۸ء

(۴)

امرتسر سے ایک اطلاع موصول ہوتی ہے کہ سیکرٹری صاحب مجلسِ اتحادِ ملت نے رستمِ زماں گاماں پہلوان اور رستمِ ہند حمیدا پہلوان کو دعوت دی ہے کہ وہ نیلی پوش مجاہدین بن کر اپنی سیاسی حیثیت کو بھی نمایاں کر دیں۔ غالباً اس خبر سے اتحادِ ملت کی دوسری حریف جماعتوں میں عجیب کھلبلی پیدا ہو گئی ہوگی۔ اس لئے کہ اگر واقعی یہ دونوں پہلوان لنگوٹ باندھ کر نیلی پوش ہو گئے۔ تو باقی جتنے سفید پوش ہیں۔ ان سب کی خیریت نہیں۔ اور اتحادِ ملت کی حریف جماعتوں کو تو وہ ایسا اُٹھا اُٹھا کر پٹخیں گے کہ دو ہی دن میں سوائے اتحادِ ملت کے اور کوئی اکھاڑہ باقی ہی نہ رہے گا۔

اب اگر ان سیاسی جماعتوں میں پہلوان بھرتی کئے گئے۔ تو سیاسی کاٹ چھانٹ کی جگہ پر کشتی کے عجیب عجیب داؤں پیچ دیکھنے میں آئیں گے اور جماعت کی طاقت کا اندازہ ان کے پہلوانوں کی طاقت سے ہوگا۔ اس کے علاوہ اب سیاسی اختلافات اس طرح نہ ہوں گے کہ اخبارات میں مضامین بازی ہو رہی ہے۔ یا پلیٹ فارموں پر تقریر کے جوہر دکھائے جا رہے ہیں۔ بلکہ اب یہ ہوگا کہ اگر اتحاد ملت کو احرار سے کوئی شکایت پیدا ہوئی تو ادھر سے گاما نے خم ٹھونک کر یا علیؓ کا نعرہ بلند کیا۔ ادھر سے گونگا پہلوان اپنا کس بل دکھاتا ہوا اکھاڑا میں کودا اور تھوڑی ہی دیر میں مار بچھاڑ ہو گئی۔ یعنی کوئی نہ کوئی فیصلہ ہوگا۔ یہ کیا کہ زبان چل رہی ہے۔ اور قلم چل رہا ہے۔ مگر کچھ طے نہیں پاتا۔

پہلوانوں کی سیاسی بیداری کا نتیجہ یہ بھی ہوگا۔ کہ اگر کوئی جماعت عوام میں یا دیہاتیوں میں اپنی تحریک پھیلانا چاہے گی تو اس کا طریقہ صرف یہ ہوگا کہ اس جماعت کے نامی گرامی پہلوان اس طبقہ کو جس میں تحریک پھیلانا ہوگی۔ بیٹھک ڈنڈ مگدر کرائیں گے اور جب وہ کچھ زور کر جائیں گے تو اُن کو استاد ہی کا ایک آدھ داؤں بتا کر چھوڑ دیا جائے گا۔ جاؤ جس کو چاہو اٹھا کر دے مارو اور اپنی جماعت کی طاقت کا اعتراف کرا لو۔ پہلوانوں کی سیاسی بیداری کے بعد یہ آل انڈیا کانگریس اور مسلم لیگ سیشن کی قسم کے جلسے نہ ہوا کریں گے۔ بلکہ عظیم الشان دنگل منعقد کئے جائیں گے جن کا اعلان اس طرح ہوا کرے گا کہ:۔

عظیم الشان دنگل

جس میں اقلیت اور اکثریت کا مسئلہ طے کرنے کے لئے ہندوستان کے مشہور لیڈر مثلاً رستم زماں گاماں پہلوان۔ رستم ہند حمیدا پہلوان رستم اودھ صادق پہلوان۔ اکھاڑہ جوالا مست۔ درجن پہلوان جھنڈا سنگھ وغیرہ حصہ لیں گے۔ اور ان ہی کی کشتیوں سے یہ طے پایا جائے گا۔ کہ کونسی جماعت کن حقوق کی مستحق ہے۔ اور کس جماعت کے لئے نیابت کا تناسب کیا ہونا چاہیئے۔

ابھی تو کانگریس کو باوجود گاندھی کا سا سینک سلائی لیڈر ہونے کے اپنی اکثریت پر ناز ہے۔ مسلم لیگ کو مسٹر محمد علی جناح ایسے ہوائی رہنما کی طاقت پر فخر ہے۔ اور ہندو مہاسبھا کو ڈاکٹر مونجے ایسے دھان پان لیڈر پر گھمنڈ ہے مگر پہلوانوں کی سیاسی بیداری کے بعد یہ تمام اپنی ہڈیاں پسلیاں بچانے کے لئے سیاسیات سے خود ہی کنارہ کش ہو کر کوئی اور کاروبار شروع کر دیں گے اور یہ وہ وقت ہوگا جب نہ سہ رنگا جھنڈا لہرا سکے گا۔ نہ ہلال بلکہ قومی جھنڈا محض لنگوٹ ہوگا اور اس کا احترام سب پر واجب ہوگا۔

۲؍ جون ۱۹۳۸ء

(۵)

حیدر آباد سے ایک اطلاع موصول ہوئی ہے کہ نواب مہدی نواز جنگ بہادر میونسپل کمشنر اپنے رفقائے کار کی ایک جماعت کے ساتھ ۳؍ جون کی صبح کو جھاڑو پنجرا اور ٹوکری لے کر نکلے اور سڑکوں کی صفائی اپنے دست مبارک سے شروع کر دی۔ اس منظر کو

ظاہر ہے کہ ہر ایک نے تعجب سے دیکھا ہو گا کہ ایک جنگ بہادر قسم کا بڑا آدمی ایک میونسپل کمشنر اور پڑھا لکھا عالی خاندان اور عالی سفید پوش آخر یہ کر کیا رہا ہے۔ اور اس بیچارے پر آخر کیا افتاد پڑی ہے کہ اس کو کرسی نشینی چھوڑ کر جھاڑو پنجہ سنبھالنے کی ضرورت پیش آئی۔ اور جاروب کشی کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ مگر جب لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ نواب مہدی نواز جنگ بہادر کا مقصد صرف یہ ہے کہ امیر اور غریب بلند مرتبہ اور پسماندہ سب یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ اور شہر کی صفائی ہر ایک کا یکساں طور پر فرض ہے تو بہت سے تماشائی دوڑے اور ایک ایک جھاڑو لے کر لگے سڑکوں کو جھاڑنے۔

اس میں شک نہیں کہ اپنے اس طرز عمل سے نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے ایک ایسا لاجواب سبق پڑھایا ہے اور ان کا یہ کارنامہ صرف حیدر آباد ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستان بھر کے میونسپل کمشنروں کے لئے باعثِ تقلید ہونا چاہیے۔ میونسپل کمشنری کو باعثِ اعزاز سمجھ کر الکشن پر پانی کی طرح روپیہ بہانے والے یہ سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے کہ ان کے فرائض کیا کیا ہیں۔ ہم تو جب جانیں کہ یہ میونسپل کمشنر نواب مہدی نواز جنگ بہادر کی مثال پر عمل پیرا ہو کر اپنی فرض شناسی جذبہ خدمت اور خاکساری کا ثبوت دیں مگر یہ ناممکن ہے۔ اس لئے کہ یہ سستی فادر لوگ محض اس لئے کمشنر بنتے ہیں کہ ان کے اعزاز میں اضافہ ہو۔ ان کے اختیارات بڑھ جائیں۔ اور ان کو لوگ بڑا آدمی سمجھیں۔ حالانکہ یہ خدمات ان اعزاز کے لئے نہیں ہوتیں۔ بلکہ اس لئے ہوتی ہیں کہ انسان واقعی خدمتِ خلق کرے۔

نواب مہدی نواز جنگ بہادر کی قسم کے میونسپل کمشنروں کا ملنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ صحیح معنوں میں میونسپل کمشنر وہی ہو سکتا ہے۔ جو اس قسم کے نمونے پیش کر سکتا ہو۔ بلکہ ہماری تو یہ رائے ہے کہ میونسپل کمشنری کے لئے انتخاب کا طریقہ ہی غلط ہے۔ انتخاب کے بجائے اگر مقابلہ کا امتحان ہوا کرے تو زیادہ مفید ہو سکتا ہے اور اس امتحان میں اسی قسم کے تحریری اور عملی سوالات امیدواروں سے ہوا کریں کہ۔

۱- ایک نالی میں چالیس مکانات سے پانی آ کر گرتا ہے۔ اور وہ نالی اس پانی کو چار گھنٹے سے پہلے بڑے نالے تک نہیں پہنچا سکتی تو تم اس کی صفائی کا کیا انتظام کرو گے۔ اور اس کے جراثیم کو مارنے میں کتنی فنایل صرف کرو گے؟

۲- اپنے والد کو دو صفحات کا خط لکھو جس میں دن بھر کا پروگرام واضح کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اپنی جاروب کشی کے واقعہ کو نمایاں طور پر ظاہر کرو اور اس بات پر روشنی ڈالو کہ جھاڑو دینے سے تمہارا ہاضمہ کیسا درست رہتا ہے اور جھاڑو دینا کیسی مفید قسم کی ورزش ہے۔

۳- تم ایک جھاڑو سے چار فرلانگ کی ایک گلی پندرہ روز تک جھاڑ سکتے ہو تو بتاؤ کہ بیس فرلانگ کی ایک گلی کو جھاڑنے کے لئے اسی مدت میں تم کو کتنی جھاڑوؤں کی ضرورت ہو گی؟

۴- اگر تم روزانہ ایک نالی کو صاف کرنے کے بعد چار سو اٹھائیس جراثیم سے پاک کرتے ہو تو بتاؤ کہ تمہارے سات دن کام نہ کرنے سے اس نالی میں کتنے جراثیم پیدا ہو جائیں گے۔

مختصر یہ کہ اسی قسم کے پرچے اور اِسی قسم کے عملی امتحان کے بعد جس کے نمبر زیادہ آئیں وہ میونسپل کمشنر ہو جایا کرے یہ کیا کہ انتخاب ہوا روپیہ پانی کی طرح بہا اور ریعیر لاٹ صاحب کی قسم کے ممبر منتخب ہو گئے جو بعد میں اپنے ووٹروں کو منہ لگانا تک پسند نہیں کرتے سڑکوں پر جھاڑو دینا کیا معنی؟

۸ جون ۱۹۳۸ء ——

(۶)

کسان زمینداروں کی دولت ہیں۔ اپنی دولت کس کو عزیز نہیں ہوتی اور کون یہ چاہتا ہے کہ اس کی دولت مٹے اور وہ تباہ و برباد ہو جائے۔ مگر خدا بچائے اس نیند سے کہ انسان غفلت کے ساتھ سو جاتا ہے۔ اور اس کے گھر میں چوری ہو جاتی ہے صاحب خانہ جتنی گہری نیند سوئے گا۔ اسی قدر چور کو چرانے میں آسانی ہوگی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سونے والا یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ سوتا رہے۔ اور اس کی دولت لٹ جائے۔ البتہ یہ تو ایک قسم کی ناگہانی مصیبت ہے کہ ادھر سے نیند آئے اور ادھر سے چور۔ اگر وہ جاگتا ہی رہتا تو چور ہی کیوں آتا۔ اور جب چور نہ آتا تو چوری خود بخود تو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ انسان کچھ کھو کر ہی سیکھتا ہے۔

زمیندار غفلت کی نیند سوتے رہے کانگریس نے کسانوں کو اپنانا شروع کر دیا اور ...... زمینداروں کی یہ دولت ان کے قبضہ سے نکلنا شروع ہوئی یہاں تک کہ جب کانگریس کے بھڑکائے ہوئے کسان اپنے زمینداروں کی جان تک کے دشمن ہو گئے۔ تو زمینداروں نے پہلے تو کچھ کروٹیں لیں پھر کچھ اینڈے ایک آدھ مرتبہ ہاں ہوں کیا اور آخر انگڑائی لے کر جو اٹھے ہیں تو دیکھتے کیا ہیں کہ چراغ گل پگڑی غائب ان کی نیند سے فائدہ اٹھا کر کانگریسیوں نے ان کی دولت یعنی کسانوں کو اپنے قبضہ میں کر رکھا ہے۔ اب تو یہ حضرات بھی گھبرائے اور دوڑے اپنے کسانوں کے لئے کانگریس کے پیچھے۔

کانگریس نے زمینداروں کی نیند سے فائدہ اٹھا کر نہایت آسانی کے ساتھ کسانوں کو اپنایا تھا۔ مگر اب زمینداروں کی بیداری سے وہ اس طرح سٹپٹا گئی ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو ایسے سمجھدار شخص کی سمجھ میں بھی کوئی بات نہیں آتی۔ اور وہ سوائے جز بز ہوتے اور زمینداروں پر کنکٹا سنے کے اور کچھ نہیں کہتے۔ ان کا جو بیان شائع ہوا ہے۔ اس میں الفاظ تو بہت ہیں۔ مگر مطلب صرف یہ ہے کہ سونے والے آخر کیوں جاگ اٹھے۔ اگر یہ ذرا اور سوتے تو کانگریس ان کو کبھی سو کر اٹھنے کے قابل نہ رہنے دیتی۔ اور یہ نیند موت کی نیند بن جاتی۔ وہ تو یہ کہیئے کہ زندگی تھی جو یہ بیچارے جاگ اٹھے۔

کانگریس والے جو زمینداروں کو حلوا سمجھ کر عرصہ سے تناول فرما رہے تھے اور ڈکار تک لینے کی مہلت نہ ملتی تھی۔ وہی زمیندار اب ایسے کمربستہ ہوتے ہیں کہ کانگریس اپنا کھایا پیا اگلنے کے خطرہ میں مبتلا ہے۔ زمینداروں نے یہ طے

کیا ہے کہ ایک والنٹیر کور بنائے تاکہ زمینداروں کے جان و مال کا تحفظ ہو سکے۔ اور کانگریسی پروپیگنڈے سے جو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس کا سدِ باب کرے۔ اس والنٹیر کور کی تجویز نے کانگریس والوں کو سب سے زیادہ پریشان کیا ہے۔ اس لئے کہ دراصل ان کو اپنے والنٹیروں ہی پر تو ناز تھا اور یہی کانگریسی رضاکار دراصل سب کچھ کرتے دھرتے تھے۔ ورنہ کسانوں کی ہمدردی کا دم بھرنے والے پنڈت جواہر لال نہرو تو دیہاتوں کے بجائے ولایت کے سفر میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ عملی طور پر کسانوں کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ لیکن اب کانگریسی والنٹیروں کی طرح مالکان اراضی کے رضاکار بھی جب میدان میں آ گئے تو سوال یہ ہے کہ کانگریس نے کسانوں کے سامنے جو لمبے پر کی اُڑائی ہے۔ اُس کی قلعی جس وقت کھلے گی۔ اس وقت کسان ان کانگریس والوں کے متعلق رائے کیا قائم کریں گے اور کانگریس والے کس گوشہ میں اپنا منہ چھپائیں گے۔ شہروں سے بھاگ کر دیہات گئے تھے۔ اب دیہات سے دیکھنا ہے کہ کدھر جاتے ہیں

۸ر جون ۱۹۳۸ء

طوفان کی آمد

(طوفان کے خاص شاعر کے قلم سے)

طوفان آتے ہیں گو مٹانے کے لیے
بنیادِ زمانہ کو ہلانے کے لیے
لیکن یہ ہے اپنی نوعیت کا طوفاں
آیا ہے یہ سوتوں کو جگانے کے لیے

(۱۱- مئی ۱۹۳۸ء)

کانپور کی ہڑتال

یہ پٹی عجب کانگریس نے پڑھائی
کہ بھوکے رہو میرے مزدور بھائی
قسم ہے تمھیں اب جو تم مِل میں جاؤ
تم ہڑتالیے ہو دکھاؤ ڈھٹائی
خود اپنی ہی روزی میں بٹہ لگا کر
بہادر اگر ہو تو چھوڑو کمائی
مگر اب تو ہر فاقہ کش چیختا ہے
مرے جاتے ہیں کانگریس کی دہائی

(۱۰- جون ۱۹۳۸ء)

اُردو، ہندی اور ہندوستانی

کہو "آب" اور "جل" کو تم صرف "پانی"
وہ اُردو، وہ ہندی یہ ہندوستانی
زباں ایک ہوگی تو دل ایک ہوگا
یہ کوشش تو اچھی ہے لیکن زبانی

(۱۴- جون ۱۹۳۸ء)

سُوباش بابو کا مُسلمانوں کو پیغام

اے مسلمانوں کرو تم ایک کام
پہلے تو چپکے سے بن جاؤ غلام
پھر یہ دیکھو ہم تمھیں دیتے ہیں کیا
تم لگاتے کیوں ہو آخر اپنے دام
گھاس کھاؤ یا چنا حاضر ہے سب
ہاتھ میں رکھیں گے ہم لیکن لگام

(۱۵- جون ۱۹۳۸ء)

جناح نہرو خط و کتابت

صلح کی کوشش ہو کیونکر کامیاب
مصلحت جب ہے حجاب اندر حجاب
لیگ نے جو کانگریس کو خط لکھے
آئیں بائیں شائیں ہے اُن کا جواب

(۱۷۔ جون ۱۹۳۶ء)

مخالفین طوفان سے

تم سے پامال میں ہو جاؤں یہ آسان نہیں
میں کوئی چین نہیں تم کوئی جاپان نہیں
یہ وہ طوفاں ہے جو کُہسار بہالے جائے
خس و خاشاک سے رُک جائے وہ طوفان نہیں

(۳۰۔ جون ۱۹۳۶ء)

کانگریس والنٹیر کور

جنگجوئی سے ہے نفرت صلح کی تعلیم ہے
کانگریس اک گربۂ مسکیں ہے یہ تسلیم ہے
ہاں مگر کچھ قول میں اور فعل میں ہے اختلاف
امن کا دعوٰے ہے اور افواج کی تنظیم ہے

(۲۱۔ جون ۱۹۳۶ء)

بے روزگار شماری

ہونے والا ہے حکم یہ جاری
ایسی فہرست کی ہو تیاری
درج ہوں جس میں سب جو ہیں بیکار
یہ بھی ہے ایک شغل بے کاری

(۲۸۔ جولائی ۱۹۳۸ء)

منظومات

(گہرستان* کے بعد کا کلام)

دل اب دنیا و مافیہا سے غافل ہوتا جاتا ہے
یگانہ بن کے بیگانوں میں شامل ہوتا جاتا ہے
نظر کو اب ترا نظارہ مشکل ہوتا جاتا ہے
نگہ کے سامنے پردہ سا حائل ہوتا جاتا ہے
مرا ہر رنج اب راحت میں شامل ہوتا جاتا ہے
جسے میں درد سمجھا تھا وہی دل ہوتا جاتا ہے
ہر انساں فرضِ انسانی سے غافل ہوتا جاتا ہے
زمانہ آگ دے دینے کے قابل ہوتا جاتا ہے
مذاقِ بے خودی کا لطف حاصل ہوتا جاتا ہے
دلِ دیوانہ اب ان سے بھی غافل ہوتا جاتا ہے
زمانہ آخر آخر میرا قایل ہوتا جاتا ہے
یہ کل عالم سمٹ کر اب مرا دل ہوتا جاتا ہے
★ خودی پہ بیخودی کا رنگ غالب آتا جاتا ہے
مرا دل رفتہ رفتہ ان کے قابل ہوتا جاتا ہے
جہاں تک امتیازِ حق و باطل اٹھتا جاتا ہے
جنونِ شوق گویا اور کامل ہوتا جاتا ہے
نتیجہ چارہ گر کی کوششِ بیکار کا یہ ہے
کہ محرومی کا میری وہ بھی قایل ہوتا جاتا ہے
سُناتا جا رہا ہے ناخدا روداد بچنے کی
سفینہ میرا گویا غرقِ ساحل ہوتا جاتا ہے
میں کرتا جا رہا ہوں جس قدر آسانیاں پیدا
محبت کا معمہ اور مشکل ہوتا جاتا ہے

جہاں تک ڈوبتی جاتی ہے کشتی میری اے شوکت
اسی رفتار سے نزدیک ساحل ہوتا جاتا ہے

---

* مجموعہ کلام

بے حجابی کا تری بزم میں دستور نہیں
ورنہ وہ کونسا ذرّہ ہے جو خود طور نہیں
ذوقِ نظّارہ کا اس دور میں دستور نہیں
آج موسیٰ بھی وہاں پر ہیں جہاں طور نہیں
موت منظور ہے آجائے اگر حسبِ مراد
نامرادی ہو تو پھر زیست بھی منظور نہیں
کبھی ویراں کبھی آشوبِ خیالات ہے دل
کبھی معمور ہے دنیا کبھی معمور نہیں
دیدنی ہے کششِ ذوقِ ستم کا اعجاز
میں زمیں پر ہوں مگر مجھ سے فلک دور نہیں
جوش کہتا ہے کہ ہر بات انالحق بن جائے
لیکن اس راز کا افشا مجھے منظور نہیں
صورتِ حال خود افسانہ ہے میرا شوکت
ضبط وہ رازِ محبّت ہے جو مستور نہیں

وفا نا آشناؤں سے وفا کی خطا کی اور بڑی ہم نے خطا کی
جہاں تک ہو سکا دل کی دوا کی اب اس کے بعد جو مرضی خدا کی
بڑھا جاتا ہے جتنا زورِ طوفاں گھٹی جاتی ہے ہمت ناخدا کی
خدا جانے اب اس کے بعد کیا ہے بقا تو پہلی منزل ہے فنا کی
جسے منزل سمجھ کر میں بڑھا تھا وہ گمراہی تھی میرے رہنما کی
کہیں گے حالِ دل اک روز تم سے قسم ہے جذبِ جرأت آزما کی
مرادِ عاشقی ہے نامرادی دعا کی طرح ہم نے بددعا کی
خدا کی مصلحت سے لڑ رہا ہے ذرا ہمت تو دیکھو ناخدا کی
ملی جنّت ترے کوچے کے بدلے جزا میں بھی ہے نوعیت سزا کی
مگر اب کیا کرے طوفانِ غم کو جہاں تک بہ سکی کشتی بہا کی
سفینے کی تباہی دیکھتی ہے خدائی سے لڑائی ناخدا کی

یہی اک مدّعا باقی ہے شوکتؔ

ضرورت ہے دل بے مدّعا کی

شبِ غم فسانہ غمِ دل کہانی
نہ یہ جاودانی نہ وہ جاودانی
عطا کر کے مجھ کو مری عمرِ فانی
محبت نے بخشا غمِ جاودانی
نہ گرداب ہے اور نہ موجیں نہ طوفاں
کہاں لے کے ڈوبی ہے مجھ کو جوانی
نہ سُنیے مرا آج مجھ سے فسانہ
زمانہ سُنائے گا میری کہانی
یہ بے مائگی اور الفت کا سودا
نہ دل میں لہو ہے نہ آنکھوں میں پانی
تم اپنی جفاؤں کی شدت بڑھاؤ
ستم آزما ہے مری سخت جانی
خموشی ہے پردہ درِ رازِ الفت
تکلم بنی ہے مری بے زبانی
مری موت کو جانتے بھی ہو کیا ہے
شبابِ محبت وفا کی جوانی
ہر اک سانس ہے مستقل موت گویا
بسر ہو رہی ہے مگر زندگانی
محبت ہے میری تو سب کچھ ہے شوکت
مری نامرادی مری کامرانی

تخیل سے دامن بچاؤ تو جانیں
تصور میں بھی تم نہ آؤ تو جانیں

محبت کا اک کھیل ہے ناز اُٹھانا
محبت کے تم ناز اُٹھاؤ تو جانیں

میں اپنے فسانہ پہ خود ہنس رہا ہوں
سنو اور اب مسکراؤ تو جانیں

تمہارا بھلانا تو ہے دوسری شے
ہمیں تم ہی خود بھول جاؤ تو جانیں

بھلاتے ہو شوکتؔ کو اچھا بھلا دو
اسے بھی نہ تم یاد آؤ تو جانیں

نہ وہ رقصِ ساغر نہ وہ دورِ بادہ
زمانے کا ہے اور ہی کچھ ارادہ
محبت نے گو لاکھ رنگیں بنایا
یہ پرکارِ دل میرا اب تک ہے سادہ
ہجومِ مسرت سے گھبرا کے دل نے
غمِ عشق سے کر لیا استفادہ
مسافر ہوں مجھ کو سفر سے غرض ہے
نہ کچھ ہوشِ منزل نہ کچھ فکرِ جادہ
فریبِ نظر سے مفر کب ہے ممکن
محبت کا پھر کر رہے ہیں اعادہ
مرا دل بھی رخصت ہوا مجھ سے کہہ کر
بس اب خانہ آباد و دولت زیادہ
تری بزم میں اس طرح آئے شوکت
لبِ مدعا بستہ و دل کشادہ

اثر جذبِ دل کو دکھانا پڑے گا
وہ آئیں گے اور اُن کو آنا پڑے گا

محبت کا وہ دَور بھی آ رہا ہے
کہ ہر حال میں مسکرانا پڑے گا

بھلایا تھا جس کے لیے ہم نے سب کچھ
ارے کیا اسے بھول جانا پڑے گا

وہ اپنے کو شاید سمجھنے لگے ہیں
انھیں بھی اب اُن سے چھپانا پڑے گا

خدا ہم کو توفیق دے روٹھنے کی
انھیں آ کے ہم کو منانا پڑے گا

خودداریٔ جنوں کو رسوا نہ کیجیے

ان کا بھی التفات گوارا نہ کیجیے
بیگانہ بن کے بزم میں دیکھا نہ کیجیے

نظروں سے دل کے راز کو افشا نہ کیجیے
جور و جفا تو حسن کے جائز حقوق ہیں

جور و جفا کا شکوۂ بیجا نہ کیجیے
امروز کے طلسم کو رہنے ہی دیجیے

للہ آپ وعدۂ فردا نہ کیجیے
زاہد کی ضد ہے کالی گھٹاؤں کو بھول جا

کالی گھٹائیں کہتی ہیں توبہ نہ کیجیے
خود اپنا حسن دیکھ کے انصاف کیجیے

خود اپنی ہی نظر سے تو پردا نہ کیجیے
کب تک یونہی بہار کا موسم گزاریے

کب تک نہ عزم جانبِ میخانہ کیجیے
دھوکے نہ دیجیے نظرِ التفات سے
سرسبز پھر سے داغِ تمنا نہ کیجیے

محبت کے موئے محبت کے مارے
تم ہی جب نہیں تو جئیں کس سہارے
مجھے ناخدا تیرے احساں نے مارا
میں طوفان سے بچ کے ڈوبا کنارے
محبت میں اتنا تو دل کو مٹا لوں
جدھر سے میں گزروں مجھے دل پکارے
اگر ہو یہ سودا تو منظور ہم کو
کہ ان کا ہو سب کچھ مگر وہ ہمارے
ذرا دیکھئے موت کترا رہی ہے
میں دریا میں ہوں اور طوفاں کنارے
محبت کی بازی عجب طرح کھیلی
رہا کھیل قائم نہ جیتے نہ ہارے
یہ ہے فرقِ ناز و نیازِ محبت
کہ تم ہو ہر اک کے مگر ہم تمہارے
میں شوکت اسی فکر میں چپ ہوا ہوں
کہ کب تک کوئی چپ رہے دم نہ مارے

پاک نخوت سے کبھی شیخ کا ایماں نہ ہوا
مجھ کو یہ ناز ہے میں کفر پہ نازاں نہ ہوا
موت کا شکر سہی آپ کا احساں نہ ہوا
یہی کیا کم ہے کہ میں طالبِ درماں نہ ہوا
دل میں گھٹ گھٹ کے رہا درد نمایاں نہ ہوا
وہ یہ سمجھے کہ پریشان پریشاں نہ ہوا
اپنی ہستی کی ضرورت بھی نہ محسوس ہوئی
دل میں جب درد ترا سلسلہ جنباں نہ ہوا
حشر میں بھی مجھے شرم آگئی شکوہ کرتے
جس کو ہونا تھا پشیماں وہ پشیماں نہ ہوا
اے غمِ دل تری کس طرح تلافی ہو گی
قبر میں بھی جو کوئی داغ نمایاں نہ ہوا
میری ہستی بھی عجب عقدۂ لاینحل تھی
زیست دشوار تھی مرنا مجھے آساں نہ ہوا
ہم گلستاں میں ہر اک گل کو سکھاتے کھِلنا
ہائے اے جوشِ جنوں آج گریباں نہ ہوا
اعتبارات کا پردہ جو اُٹھا کر دیکھا
حسن اور عشق میں کچھ فرق نمایاں نہ ہوا
گل و گلزار کی کیا اس کو حقیقت معلوم
گل بداماں جو ہوا شعلہ بداماں نہ ہوا
دستِ وحشت میں خود اپنا ہی گریباں ہوگا
دستِ شوکت میں اگر آپ کا داماں نہ ہوا

ہوش میں آپ نہ اب لائیے دیوانے کو
یہ بدل دے نہ کہیں عشق کے افسانے کو
آپ بیکار نہ سمجھیں مرے مر جانے کو
ختم کرنا تھا یہیں پر مجھے افسانے کو
لوگ ترغیبِ چمن دیتے ہیں دیوانے کو
عالمِ ہوش سمجھتا ہے جو ویرانے کو
آ گیا جب کبھی بدمست ہوا کا جھونکا
توبہ کے ہاتھ میں لرزش ہوئی پیمانے کو
خونِ حسرت ہی سہی خونِ تمنّا ہی سہی
ہم نے رنگین بنایا ترے افسانے کو
فصلِ گل آئی تو صحرا میں ہوا جشنِ جنوں
وحشتیں ڈھونڈنے نکلیں ترے دیوانے کو
عشق سے ہم کو ملے تو کہیں فرصت شوکت
انقلاب اور بھی باقی ہیں کئی آنے کو

کاش اس سوز میں کچھ ساز بھی شامل ہو جائے
دل کبھی درد بنے درد کبھی دل ہو جائے
دل سے اتنی ہی تسلی مجھے حاصل ہو جائے
ان کے قابل نہ سہی میرے تو قابل ہو جائے
جس کو تو دیکھ لے سرتا بہ قدم دل ہو جائے
میں تو میں سارا زمانہ ترا قائل ہو جائے
مجھ کو بیکس نہ سمجھ میری تباہی پہ نہ جا
آج چاہوں تو ترا دل بھی مرا دل ہو جائے
زندگی کیف محبت میں ہے سرشار مگر
موت سے کس نے کہا ہے کہ وہ غافل ہو جائے
ناخدا دیکھ خدائی میں کوئی دخل نہ دے
کیا عجب ہے کہ یہ طوفان بھی ساحل ہو جائے
شمع کا سوز ہے فطرت کی غلط بخشی سے
میں تو کہتا ہوں کہ یہ بھی مجھے حاصل ہو جائے
سانحہ عشق کا وہ عقدۂ لاینحل ہے
کوئی پوچھے تو بتانا مجھے مشکل ہو جائے
جستجو جس کی ہے وہ مل نہیں سکتا شوکت
دل مگر کہتا ہے شاید کبھی حاصل ہو جائے

میں کافر ہوں میں کافر ہوں قسم کھاتا ہوں ایماں کی
کوئی پوچھے مرے دل سے جو ہے توقیرِ عصیاں کی

مری مایوسیوں نے لاج رکھ لی میرے ارماں کی
جو مشکل پڑ گئی مشکل پسندی ہی نے آساں کی

ذرا عظمت تو دیکھو اس جنونِ فتنہ ساماں کی
بہاریں لے کے آیا ہوں بیاباں میں گلستاں کی

بہار آئی بلاتی ہیں فضائیں اب گلستاں کی
اگر روکے تو بڑھ کر روک لے دیوارِ زنداں کی

پشیمانی نہ دیکھی جائے گی مجھ سے پشیماں کی
اڑا دے جوشِ رحمت دھجیاں تو فردِ عصیاں کی

ذرا سے جام میں کیا غرق ہو جاتا ہے کُل ایماں
جنابِ شیخ کیا قیمت یہی ہے اک مسلماں کی

خدا اور نا خدا میں دیکھئے اب کون کام آئے
ادھر میرا عقیدہ ہے ادھر شدت ہے طوفاں کی

اگر صیّاد نے میرے نشیمن پر نظر ڈالی
بہاریں لے کے اُڑ جاؤں گا میں صحنِ گلستاں کی

ذوقِ عصیاں دیکھیے پھر دوزخی کہہ لیجیے
اپنی کوتاہی کو بھی میری کمی کہہ لیجیے

زندگی کا ہے فسانہ لطف دے گا ہر طرح
میں جو کہنا چاہتا ہوں آپ ہی کہہ لیجیے

یہ غرورِ زہدِ زاہد ہے مرے مذہب میں کفر
سرکشی ہے آپ اس کو بندگی کہہ لیجیے

زیست کی دشواریوں نے ہم کو یہ سمجھا دیا
جو بسر ہو جائے اس کو زندگی کہہ لیجیے

مبتلائے پیچ و خم ہے آج بھی زلفِ ایاز
ہے کوئی ایسا کہ جس کو غزنوی کہہ لیجیے

لب ہلانے کی اجازت ہی نہیں دیتی حیات
وہ غنیمت جانیے جو کچھ کبھی کہہ لیجیے

اک سرور اس میں بھی ہے بے کیفیوں کے کیف کا
تشنگی کو آپ میری مے کشی کہہ لیجیے

پھر لبِ خاموش سے کہنا ہے مجھ کو داستاں
آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے ابھی کہہ لیجیے

اب نیا رُخ ہے نئی دنیا نئے علم و ادب
ان نئی تاریکیوں کو روشنی کہہ لیجیے

ماورائے عالمِ ہستی ہیں ان کے واردات
شیخ جی کو اصطلاحاً آدمی کہہ لیجیے

دیکھیے کافور ہو جائے گا دورِ حال بھی
اس کو شوکت چار دن کی چاندنی کہہ لیجیے

خدا کو اب بھول جائیں گے ہم خودی کا سجدہ ادا کریں گے
جنوں کی انتہا یہی ہے یہیں سے ہم ابتدا کریں گے
جفائیں تم آزمائے جاؤ وفا کے خوگر وفا کریں گے
ہمارے کہنے میں دل نہیں ہے تو ہم ہی دل کا کہا کریں گے
غرورِ دیوانگی سلامت تو عرض کیوں مدعا کریں گے
طلب کی توہین خود طلب ہے، کبھی نہ ہم التجا کریں گے
تم اپنے وعدوں کو بھول کر بھی اگر ہمیں یاد رکھ سکو گے
یہ دل سلامت تو ہم اسے پھر فریب میں مبتلا کریں گے
اگر محبت میں کچھ کشش ہے اگر جنوں کی ہے کچھ حقیقت
ہمارا قصہ جو سن رہے ہیں وہ خود ہم ہی سے کہا کریں گے
خوشی کا تو خیر ذکر کیا ہے ہمارا غم بھی نہ غم رہے گا
ہمارے رونے پہ دیکھ لینا ہمارے آنسو ہنسا کریں گے
محبت اک رازِ منکشف ہے مگر یہ افشا نہ ہوگا شوکت
یہ ایک پردہ نہ اٹھ سکے گا ہزار پردے اٹھا کریں گے

یہ کس نے کہہ دیا وہ آ رہا ہے
کہ دل ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے

سنبھالو ہوش مجھ کو آ رہا ہے
یہ پردہ بھی اب اُٹھتا جا رہا ہے

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کسی کی
میں دل کو دل مجھے سمجھا رہا ہے

وہ عرضِ مدّعا پر سرنگوں ہیں
کہ جیسے چاند ڈوبا جا رہا ہے

دہائی ہے فریبِ آرزو کی
توجہ پھر کوئی فرما رہا ہے

بھروسہ ہے مجھے رحمت پہ زاہد
تو پھر تو کیوں مجھے بہکا رہا ہے

میں اپنے دل کی دھڑکن سُن رہا ہوں
کہ جیسے دور کوئی گا رہا ہے

قیامت ہے مری مرگِ جوانی
پسینہ موت کو بھی آ رہا ہے

گھٹا توبہ پہ چھائی جا رہی ہے
اور ایماں ڈگمگایا جا رہا ہے

بڑھے آتے ہیں ساحل میری جانب
سفینہ ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے

گواہی کون دے محشر میں شوکتؔ
ہمارا دل ہمیں جھٹلا رہا ہے

مری وفا کا کوئی زمانہ کسی زمانے سے کم نہیں ہے
سکون جس کو سمجھ رہے ہو وہ غم اُٹھانے سے کم نہیں ہے

بلا بلا بے قراریوں کو کہ اب وہی ہیں سکونِ خاطر
تری تسلّی تری تشفّی بھی دل دُکھانے سے کم نہیں ہے

یہ کونسا میکدہ ہے آخر جہاں مجھے لائی ہے محبت
کہ اس جگہ کا ہر ایک ساغر شراب خانے سے کم نہیں ہے

خدا ہی جانے کہ کیا سمجھ کر ہوئی یہ فطرت کی دستکاری
میں کہہ رہا تھا مرا بنانا مرے مٹانے سے کم نہیں ہے

نہ کھاؤ دھوکہ نہ کھاؤ دھوکہ کہ غم کی موجوں میں غرق ہوں میں
فلک کو یوں بار بار تکنا بھی سر جھکانے سے کم نہیں ہے

سمجھ کے آ جا رہِ وفا پر سنبھل کے چل راہِ زندگی پر
کہ اس جگہ ہوشیار رہنا فریب کھانے سے کم نہیں ہے

مصیبتوں کا مقابلہ کر مصیبتوں ہی میں زندگی ہے
کنارِ ساحل میں جا کے چھپنا بھی ڈوب جانے سے کم نہیں ہے

جنابِ شوکت خموش کیوں ہیں کھُلا نہیں ہے یہ راز اب تک
خود ان کا افسانۂ محبت کسی فسانے سے کم نہیں ہے

خموشی کہہ رہی ہے جانے کیا کیا
لبِ بے مدعا کا مدعا کیا

محبت کیا، وفا کیا اور جفا کیا
یہ سب دھوکے ہیں دھوکوں کے سوا کیا

نہ وہ سمجھے نہ میں سمجھا ہوا کیا
نگاہوں نے نگاہوں سے کہا کیا

جبیں کیا، سجدہ کیا اور نقشِ پا کیا
ان ہی رسموں سے ہوگا حق ادا کیا

علاج اس کا بتا اے ہمنوا کیا
اگر یہ دردِ دل ہے تو دوا کیا

میں خود کشتی ڈبونے جا رہا ہوں
ارادہ ہے ترا اے ناخدا کیا

نقاب اٹھنے ہی تک تھی سب پہ حیرت
نقاب اٹھی تو کوئی دیکھتا کیا

جفا ہے اور جفائے دوست ہے یہ
روا کیا اور اس میں نا روا کیا

وہ رہ رہ کر ہر اک سے پوچھتے ہیں
یہ شوکت تھانوی کو ہو گیا کیا

درِ جاناں پہ جبہ سائی ہے
اب خدائی مری خدائی ہے
بے قراری ہے جو نوائی ہے
زندگی موت بن کے آئی ہے
لاکھ پردوں میں اس کو دیکھ لیا
عشق نے کیا نگاہ پائی ہے
کعبہ اور عرش کس کو کہتے ہیں
ان کے در تک مری رسائی ہے
جس پہ ہنستی ہے دوریٔ منزل
وہ ہماری شکستہ پائی ہے
شب کو دَورِ سرود و ساغر و مے
صبح ہنگامِ پارسائی ہے
وعدۂ دید اور حشر مگر
یہ خبر بھی سنی سنائی ہے
باغِ ہستی کا شکوہ کیا شوکتؔ
یہ ہوا کس کو راس آئی ہے

خیال و خواب کی دنیا بسا رہا ہے کوئی
بچھڑ گیا ہے مگر یاد آ رہا ہے کوئی
نگاہِ شوق سے بچ بچ کے جا رہا ہے کوئی
سکونِ زیست کو طوفاں بنا رہا ہے کوئی
وفائے عشق کو ان بے اصولیوں سے کیا
کہ حق کسی کا ہے اور داد پا رہا ہے کوئی
غرورِ حسن وفا قابلِ پرستش ہے
لبوں پہ آہ ہے اور مسکرا رہا ہے کوئی
یہ ہو نہ ہو مرا افسانۂ محبت ہے
سنا رہا ہے کوئی مسکرا رہا ہے کوئی
یہ وصل ہے کہ جدائی میں کیا کہوں اس کو
قریب تر ہے مگر بچ کے جا رہا ہے کوئی
خدا ہی جانے کہ کانٹوں سے کیا شکایت ہے
کہ اب گلوں سے بھی دامن بچا رہا ہے کوئی
فلک حریفِ وفا بد نصیب دلِ بیتاب
نئے نئے مجھے منظر دکھا رہا ہے کوئی
تمام حسن و جوانی تمام رنگینی !
بری طرح سے مجھے یاد آ رہا ہے کوئی
فریبِ کشتی و ساحل نہ کھائیے شوکت
کہ ساتھ ساتھ ہی طوفاں بھی آ رہا ہے کوئی

بدلیاں دن کی گھٹائیں رات کی
زندگی ہے زندگی برسات کی
توبہ کی آتے ہی رُت برسات کی
کی مگر اک بے محل سی بات کی
میرے دیوانے نے جس سے بات کی
پوچھی گر دن کی تو سن لی رات کی
تم تصور میں ہوئے تھے ہمکلام
سوچتا ہوں میں نے کس سے بات کی
رو رہا ہوں میں ہنسے دیتے ہیں وہ
کتنی پیاری ہے فضا برسات کی
یاالٰہی کونسا عالم ہے یہ
چھائی ہے دن پر سیاہی رات کی
حشر میں کیا آتے خالی ہاتھ ہم
لائے ہیں اک فرد الزامات کی
کیا ہوا دل کو الٰہی خیر ہو
کچھ کمی پاتا ہوں محسوسات کی
مستقل جذبات بن کر رہ گئی
یاد اک غارت گر جذبات کی
اس طرف بحرِ ندامت موج زن
اس طرف اک فرد الزامات کی
میں ہوں شوکتؔ اور مری تنہائیاں
حد نہیں ہے ان کے احسانات کی

ندامت ہے مجھے جذب و اثر سے
کہ اب پیغام آتے ہیں ادھر سے
مجھے اب دیکھنے والے نہ دیکھیں
ان ہی کو دیکھ لیں میری نظر سے
جنون و ہوش دونوں ننگِ الفت
ہمیں صحرا سے مطلب ہے نہ گھر سے
جبیں جنّت میں ہے کھوئی ہوئی سی
کہ اُٹھا ہوں تمھارے سنگِ در سے
بہاریں اُڑ رہی ہیں چار جانب
مگر بیٹھے ہیں ہم بے بال و پر سے
یہ کم ظرفی کہ ہم کہتے فسانہ
مگر کچھ بس نہیں چلتا نظر سے
طلب چھوڑی غرورِ عاشقی نے
انھیں دکھلا دیا ان کی نظر سے
محبت ہے مگر اس کش مکش میں
تقاضا ہو ادھر سے یا ادھر سے
تمنّا ڈوبنے کی ہو گی شوکتؔ
یہ پانی جب گزر جائے گا سر سے

تجھ سے کیا اپنے سے بھی بیگانہ ہونا چاہیے
بس ترے دیوانہ کو دیوانہ ہونا چاہیے

حشر کے دن ہاتھ میں پیمانہ ہونا چاہیے
کم سے کم یہ جراُتِ رندانہ ہونا چاہیے

تم ہو عنوانِ محبت تم ہو عنوانِ حیات
اب مرے افسانہ کو افسانہ ہونا چاہیے

جب کبھی برسے تو دنیا غرقِ مے ہو کر رہے
ہر گھٹا کے ساتھ اک مے خانہ ہونا چاہیے

میں ترا دیوانہ بن کر تجھ سے بیگانہ بنا
اب تجھے میرے لیے دیوانہ ہونا چاہیے

ہر نظر میں تم ہی تم ہو ہر طرف ہو تم ہی تم
جب تم ہی تم ہو تو پھر پروانہ ہونا چاہیے

طالبِ دیدار بننا ننگ ہے اے جذبِ عشق
خود نظر کو جلوۂ جانانہ ہونا چاہیے

شیخ تو واقف بھی ہے آدابِ میخانہ سے کچھ
توبہ کرتے وقت بھی پیمانہ ہونا چاہیے

یاد فرماتے ہیں شوکتؔ کو وہ اپنی بزم میں
ہر قدم پر سجدۂ شکرانہ ہونا چاہیے

ہوں بے حسیٔ عشق کا ساماں لیے ہوئے
حسرت لیے ہوئے ہوں نہ ارماں لیے ہوئے

وہ جس طرف گئے رُخِ تاباں لیے ہوئے
ہم دیکھتے رہے دلِ حیراں لیے ہوئے

کس کی طرف اُٹھاؤں نظر کس کو چھوڑ دوں
اک زندگی ہے سیکڑوں ارماں لیے ہوئے

کم مائیگیٔ اشکِ وفا پر نہ جائیے
قطرہ ہے بحر- بحر ہے طوفاں لیے ہوئے

اے زاہدو گناہ مجھے بخشوائیں گے
بیٹھے رہو تقدسِ ایماں لیے ہوئے

ہر پھول دے رہا ہے مجھے دعوتِ جنوں
عریانیاں بجائے گریباں لیے ہوئے

آئینہ دیکھتے ہیں ہمیں دیکھتے رہو
ہم بھی کھڑے ہیں دیدۂ حیراں لیے ہوئے

سوغات لے کے آئے ہیں دیوانگانِ شوق
ہاتھوں میں چند تارِ گریباں لیے ہوئے

ہوتا ہے لمحہ سکوتِ فراق کا
نیرنگیٔ حیات کے عنواں لیے ہوئے

کانٹوں سے تصفیہ ہے یہ اب اہلِ ذوق کا
دامن دئے ہوئے ہیں گریباں لیے ہوئے

دن کٹ گیا بلاؤں کا شوکتؔ تو کیا ہوا
آئی ہے رات خوابِ پریشاں لیے ہوئے

نیم باز آنکھوں میں بیداریٔ خواب آلودہ
ہائے یہ نرگسِ بدمست شراب آلودہ

دل میں ایک موج ہے اور پائے طلب میں چھالے
ایک سیلاب ہے، اور وہ بھی حباب آلودہ

ہائے وہ پہلے پہل قول و قرارِ الفت
تیری آواز تھی اس وقت رباب آلودہ

اسی صیاد کو بلبل نہ بنا دوں تو سہی
ایک ایسی ہی بہار اور گلاب آلودہ

اپنے ہر گام پہ منزل کا گماں ہوتا ہے
میری منزل بھی ہے کس درجہ سراب آلودہ

شرم رکھ لی ہے مرے ذوقِ نظر کی تو نے
مجھ کو جلوہ بھی دکھایا تو نقاب آلودہ

عمر بھر کے لیے پیمانِ وفا لیتی ہے
اک تری چشمِ کرم وہ بھی عتاب آلودہ

ہیچ دنیا ہے کرم اس کی نظر میں اے دوست
جس نے دیکھی ہے تری چشمِ عتاب آلودہ

شاعر کی بیوی

شاعری اور پیٹ کا دھندا عجب ثم عجب
جان کے گاہک ہیں بیوی اور بچے سب کے سب
فاعلاتن فاعلاتن بیٹھ کر کرتے ہیں جب
اہلیہ کو یاد آتی ہے ہماری بے سبب

اک سروتا ہاتھ میں اور پاندان اپنا لیے
سر پہ آجاتی ہیں لڑنے خاندان اپنا لیے

ایک لڑکا جس کو پچھلے چار دن سے ہے بخار
ایک لڑکی جس کی آنکھیں دکھ چکی ہیں بار بار
تیسرا جو ٹھیک ہے وہ رو رہا ہے نابکار
شامتِ اعمال کی ہر قسم ہے سر پہ سوار

شاعرِ شیریں بیاں بیٹھا ہے گھبرایا ہوا
ذہن میں ہے طرح کا مصرع بھی بولایا ہوا

وہ یہ کہتی ہیں کہ جائے بھاڑ میں یہ شاعری
ایڑی چوٹی پر کروں قربان یہ کاریگری
اتنے دن سے کوئی بھی پیسہ ملا سوچو ذری
یاد کر لو خود دسمبر، جنوری پھر فروری

تم ہی سوچو کس طرح ہوگا ہمارا اب نباہ
مجھ کو روٹی چاہیے اور تم کو خالی واہ وا

میں یہ کہتا ہوں کہ اے شمعِ شبستانِ حرم   تو ہے اک شاعر کی بیوی کیا ہے یہ اعزاز کم
تجھ کو کیا معلوم میرا مرتبہ میرا حشم   گھر کے باہر دیکھ چل کر کس قدر ہوں محترم
تو سمجھتی ہے مجھے یوں ہی سا اک انسان ہوں
اے میری نادان بیوی میں ادب کی جان ہوں

جان وہ اپنی جلا کر منہ چڑھاتی ہیں مجھے   منہ چڑھا کر میرا آئینہ دکھاتی ہیں مجھے
گھر کی جو حالت ہے وہ سب کچھ بتاتی ہیں مجھے   شرم میری شاعری پر پھر دلاتی ہیں مجھے
وہ یہ کہتی ہیں کہ شاعر تو یقیناً آپ ہیں
لیکن ان بچوں کے بھی تھوڑے بہت تو باپ ہیں

شاعری کرتے ہیں اور بھولے ہوئے ہیں شوہری   کوئی دھندہ بھی نہیں کرتے نہ کوئی نوکری
باپ دادا کی کمائی بھی نہیں گھر میں دھری   میں تو پلّے بندھ کے اک شاعر کے جیتے جی مری
یہ نحوست شاعری جس کلموہی کا نام ہے
مجھ سے پوچھو یہ نکھٹو مردوؤں کا کام ہے

میں گئی چولھے میں حلیہ دیکھیے اپنا ذرا   جیسے خود رَو گھاس ہو خط اس طرح سے ہے بڑھا
جیسے اک قیدی جو کاٹے کوئی لمبی سی سزا   مرحبا اے شاعرِ رنگیں بیاں صد مرحبا
بھاڑ میں جائے یہ تیری شاعری یہ تیرا فن
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

مری

اے مری اے گرمیوں میں اہلِ دولت کے وطن
اے چمن اندر چمن اور اے چمن او پر چمن
اُف تری رعنائیاں اللہ رے یہ بانکپن
جنتِ کشمیر کی بیشک ہے تو چھوٹی بہن
میں تو کہتا ہوں زمانہ میں ترا ثانی بھی ہے
تجھ میں خوباں بھی بہت ہیں اور خوبانی بھی ہے

عاشقوں کی سرد آہیں تھوک ملتی ہیں یہاں
سرد مہری سیکھنے آتے ہیں حسینانِ جہاں
سیکھتی ہیں آسماں سے ظلم تیری چوٹیاں
کج روی میں خود ہی ماہر ہیں تیری پگڈنڈیاں
اہلِ دل کے واسطے المختصر تو موت ہے
بلکہ جنت تک یہ کہتی ہے کہ میری سوت ہے

حسن بھی گو حسن ہے لیکن عجب مردانہ وار
وہ حسیں جو تھے سمندِ ناز کے گویا سوار
لے کے اب ٹٹو کرائے کے وہی سب گلعذار
کھیلتے پھرتے ہیں تیرے گوشہ گوشہ میں شکار
ایسا عالم تیرا ہوتا ہے مئی اور جون میں
بیبیاں بھی چلتی پھرتی ہیں یہاں پتلون میں

وہ حسینائیں قمیصوں میں جو ہوتی ہیں سِلی
وہ ٹیڈی بوائز جو صاحب تو ہیں لیکن پلپلی
چال بے ڈھنگی ادائیں بے تکی گڑبڑ دلی
اس جگہ کثرت سے ملتی ہے ان ہی کی فیملی
یہ مری کے واسطے خود مستقل بھونچال ہیں
اے مری کی مال تیرے سب یہی تو مال ہیں

زندگی ہی زندگی ہے نام ہے لیکن مری
خود ہی کوہِ قاف ہے تو اور خود اُس کی پری
مال پر اللہ اکبر حسن کی کاریگری
عشق پر طاری ہے جس کو دیکھ کر اک تھرتھری
یہ بناوٹ یہ سجاوٹ یہ نکھار اور یہ پھبن
اے مری اے گرمیوں میں اہلِ دولت کے وطن

آٹا

حضرتِ آدم پہ جو گزری ہے سب کو یاد ہے   دانۂ گندم کی زندہ آج تک بیداد ہے
آج پھر اولادِ آدم پر وہی افتاد ہے   اس کا بانی بھی فرشتوں کا وہی اُستاد ہے
دور دورہ آج اس کا چور بازاروں میں ہے
ماہرینِ چور بازاری کے غم خواروں میں ہے

اُن میں دیکھا اس کا جلوہ جو ذخیرہ باز ہیں   دفن تہ خانوں میں جن کے بوریوں کے راز ہیں
بوریوں سے ملتے جلتے توند کے انداز ہیں   اور فریاد و بکا میں سب کے ہم آواز ہیں
توند پر ہے ہاتھ اور فاقوں سے حالت زار ہے
ان کو ایندھن اس جہنم کے لیے درکار ہے

ہوگیا بازار سے آٹے کا ایسا انتقال   اب کھلے بازار میں آٹے کا ملنا ہے محال
لہلہاتی کھیتیوں کے دیس میں کیسا یہ کال   کال کی حیرت ہے پاکستان میں گل جائے دال
دستِ قدرت سے چھنا آزار کا ہر اختیار
فقر و فاقہ کا بنا انسان خود پروردگار

اک ذخیرہ باز مولانا نما دوکان دار   قوم کے اس ابتلا سے کل بہت تھے بیقرار
آہ اس ملّت کا کیوں گیہوں پہ ہے دار و مدار   کاش کھاتی باجرا یا کاش یہ کھاتی جوار
اس کے کھانے کے لیے نعمت ہر اک موجود ہے
دانۂ گندم بھلا کیوں گوہرِ مقصود ہے

سچ جو پوچھو تو کہوں شیطان کا راشن ہے یہ   جس نے جنّت لوٹ لی انساں کا وہ دشمن ہے یہ
حضرتِ آدم کے عزّ و شان کا مدفن ہے یہ   الفتِ ابلیس و انسان کا فقط بندھن ہے یہ
حیف ہے انسان کر دے اس پہ جنت تک نثار
سب کو گندم سے بچانا اے مرے پروردگار

سیکڑوں من یوں تو گیہوں میرے تہ خانے میں ہے   اور مزا بھی کیا مجھے آزار پہنچانے میں ہے
میرے حصّے کی وہی مے ہے جو پیمانے میں ہے   ہاں مگر دوزخ جو ہے گیہوں کے پروانے میں ہے
جس نے گیہوں کھا لیا دوزخ میں گولے کھائے گا
جس کو جنت چاہیے وہ صرف چھولے کھائے گا

کراچی کی بسیں

دلربا اے نازنینو! اے کراچی کی بسو   تم پہ صدقہ ہو کے ہم مرجائیں لیکن تم جیو
کج روی بھولے فلک اب چال تم ایسی چلو   ہم تو خود ہی چل بسیں گے تم مگر چلتی رہو

تم پہ ہم عشّاق کا چلتا نہیں جب کوئی بس
بیٹھ کر پڑھتے ہیں ہم اللہ بس باقی ہوس

کاش اپنے عشق کے ماروں کا کرتیں تم شمار   جو ہر اک اڈے پہ لٹکے ہیں قطار اندر قطار
اپنے پہلو میں دبائے اک دلِ بے اختیار   اور نظروں سے گرائے زندگی کا اعتبار

اس قدر لمبی قطار اور زندگانی مختصر
گھر پہنچنے سے تو ہے آسان دنیا سے سفر

اور اگر گھُل مل کے ہو جائیں کبھی ہم باریاب   گھر پہنچنے کی دعا گڑ بڑ میں ہو کر مستجاب
شرم سے شائستگی گرمی سے ہم ہوں آب آب   زندہ باد اس بس کے اندر آئے دیکھیں انقلاب

دیکھنا چاہیں اُسے گردن میں باہیں جس کی ہیں
جسم تو اپنا ہے لیکن اس میں ٹانگیں کس کی ہیں

منڈھ گئے ہیں ہم کسی کے سر کوئی ہم پر سوار
ہو جو کھجلی ہمنشیں کو ہم کھجائیں بار بار
مُہر لب پر ہو سنیں کانوں سے بیشک تو تکار
یاد بس کرتے رہیں اپنی لحد کا ہم فشار
تا بہ خانہ اس طرح خانہ خرابی لے چلے
لڑکھڑاتا جس طرح بوتل شرابی لے چلے

سامنے درجہ میں بیٹھی میری بیٹر ہاف ہے
جس جگہ میں پھنس گیا ہوں وہ مگر اعراف ہے
ہم نشینو تم سے دل اب طالب انصاف ہے
جیب کو میں نے ٹٹولا ہے تو مطلع صاف ہے
پار کر کے پار کرنے والا بٹوہ لے گیا
اور کنڈکٹر یہ کہتا ہے کرایہ کر ادا

ہو کے چکنا چُور اترے بس سے با حالِ خراب
جیسے بندر نوچ کر پھینکے منڈیری سے کتاب
اس زبوں حالی پہ بھی خوش ہیں کہ ہم ہیں کامیاب
مل گئی ہے گھر کی جنّت جھیل کر یوم الحساب
رات بھر یہ بس رہے گی ذہن پر اپنے سوار
صبح دم ہم پھر وہی ہوں گے وہی اپنی قطار

الوداع

چور بازاری گرانی الوداع
دودھ میں اے نل کے پانی الوداع

گھی کے اندر موبل آئل الفراق
تیری معدوں میں روانی الوداع

اب کہاں مکھن پہ مرہم کا گماں
اے گمانِ بدگمانی الوداع

اے پسی اینٹو نہیں مرچوں میں تم
تم نے بھی رحلت کی ٹھانی الوداع

اے انیسِ بے کساں آٹے کی ریت
ہوگئی تو بھی کہانی الوداع

الفراق اے شورہ پشتی الفراق
غنڈہ گردی آنجہانی الوداع

کیسی بے بس ہوگئی کنڈکٹری
ہائے وہ چنگیز خانی الوداع

دم بخود ہیں ٹیکسی والے سب کے سب
اُف وہ اُن کی بدزبانی الوداع

اب صفائی خود ہمارا فرض ہے
الوداع اے مہترانی الوداع

سچ تو یہ ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس
الوداع اے من کی مانی الوداع

شہادتِ عظمیٰ

آندھی تھی وہ یہاں کہ ہو قرآں منتشر
عصیاں کا ایسا دور کہ ایمان منتشر
مقصد تھا یہ کہ اب ہوں مسلماں منتشر
از بس کہ سب تھے سخت پریشاں منتشر
رشتے تمام توڑ کے پروردگار سے
سب لو لگا چکے تھے فقط شہریار سے

وہ شہریار نشۂ نخوت میں جو تھا چور
باطل پرست حق و صداقت سے دور دور
جام و سبو میں غرق کیے اپنا ہر شعور
معبودیت کے زعم میں اک پیکرِ غرور
اس کو تھا یہ گھمنڈ کہ فرمانرواہوں میں
سودا یہ ہو گیا تھا کہ شاید خدا ہوں میں

وہ چاہتا تھا کوئی نہ ہو اس کا نکتہ چیں
اس کے حضورِ عجز سے سب کی جھکے جبیں
اس کے اثر سے کوئی بھی باہر نہ ہو کہیں
ڈر تھا کہ اک حسینؑ ہیں اور کوئی بھی نہیں
بیعت طلب تھا سبطِ رسالتمآب سے
ذرّہ خراج خواہ بنا آفتاب سے

کس طرح کوئی کفر کو ایماں سونپ دے
شیطاں کو کون وہ ہے جو قرآں سونپ دے
فاسق کو کعبہ اس کا نگہباں سونپ دے
فاجر کو دین اپنا مسلماں سونپ دے

یہ حوصلہ کہ دینِ محمدؐ خرید لے!
بیعت حسین ابنِ علیؑ سے یزید لے

یہ دستِ حق پرست ہو دستِ یزید میں   اسلام کی شکست ہو دستِ یزید میں
کعبہ کا بند و بست ہو دستِ یزید میں   اسلام جا کے پست ہو دستِ یزید میں
ان ذلتوں کا اور ہو یارا حسینؑ کو
تھی موت ان کے بدلے گوارا حسینؑ کو

وہ سوچتے تھے آج جو ہوتے یہاں رسولؐ   کیا ان مطالبات کو کر لیتے وہ قبول
واقف ہے خود یزید ہمارا ہے کیا اصول   پھر بحث اس نے چھیڑی ہے یہ ہم سے کیا فضول
کیا واقعی نہیں ہیں ٹھکانے اب اس کے ہوش
سمجھا ہے اس نے ہم کو بھی شاید خدا فروش

میں بیچ دوں رسول کی غیرت، نہیں نہیں   قرآں کی اور ختم ہو عظمت، نہیں نہیں
ہو داغ دار کعبہ کی حرمت، نہیں نہیں   میں اور کروں یزید سے بیعت، نہیں نہیں
سُن لے بگوشِ ہوش کہ انکار ہے مجھے
اور ایک بار بھی نہیں سو بار ہے مجھے

اب کیا تھا اک گھٹا سی اٹھی فوجِ شام کی   کوندی افق پہ برق سی اک انتقام کی
ہر چند تھی وہ فوج بڑے احتشام کی   خاطر میں اس کو لائی نہ عظمت امامؑ کی
کثرت سے کیا ڈرے کہ جو وحدت پرست ہو
یہ عزم وہ نہ تھا کہ جو اس طرح پست ہو

دشمن نے اپنے نہر پہ خیمے لگا دیئے
کچھ مورچے یہاں تو وہاں کچھ بنا دیئے
مجبور کر چکے ہیں یہ تیور دکھا دیئے
پانی پہ بھی لعینوں نے پہرے بٹھا دیئے
اک بوند بھی نہ جائے کسی نونہالؑ تک
سیرابیوں کا آئے نہ ان کو خیال تک

عباسؑ کو تھا ضبط کہاں وہ بپھر گئے
اکبرؑ لباس جنگ پہن کر سنور گئے
قاسم کچھ ایسے طیش میں آئے نکھر گئے
اب بھی مگر حسینؑ تھے جو ضبط کر گئے
سب کو دیا یہ حکم کہ دیکھو پہل نہ ہو
ہو ابتدا ادھر سے تو بیشک جواب دو

تیر اُس طرف سے آئے اور ادھر سے جری چلے
خیبر شکن کا عزم لیے حیدری چلے
شایانِ شاں بھی جن کے لیے سروری چلے
کس شان سے حسینؑ کے یہ عسکری چلے
ایک ایک جا کے ہونے لگا رن میں سرخرو
دل کا حسینؑ اپنے نچوڑا کیے لہو

قاسمؑ نے گر کے رن سے پکارا حسینؑ کو
جیسے کسی نے تیر سا مارا حسینؑ کو
ہر چند تھا نہ ضبط کا یارا حسینؑ کو
دیتی تھی بے کسی ہی سہارا حسینؑ کو
غلطاں تھا خاک و خون میں بیٹی کا اب سہاگ
لب پر خدا کا شکر تھا سینہ میں ایک آگ

بھائی کی لاش پر بھی کیا شکر ہی ادا
دل کا ہو جو بھی حال زبان پر تھا مرحبا
عباسؑ میرے بھائی جو کرنا تھا وہ کیا
دیکھو تو مجھ کو تم کو سکینہ کا واسطا

بے شک سلام کے لیے اب مت اٹھاؤ ہاتھ
لیکن خدا کے واسطے چھوڑو نہ میرا ساتھ

ہم شکل مصطفےؐ کی اٹھا لائے جا کے لاش   محکم تھا اب بھی عزم نہ تھا اب بھی ارتعاش
وہ مر چکے تھے اور یہ کہتے تھے زندہ باش   ہو نام را شباب سرافرازیاں ہی کاش

یارب، تو جانتا ہے یہ میری کمائی ہے
اور یہ کمائی نام پہ تیرے لٹائی ہے

جب مرتبہ شہید کا اکبرؑ بھی پا گئے   اصغرؑ ہمک کے باپ کی گودی میں آ گئے
کس خاندان سے ہیں یہ سب کو بتا گئے   ہنس ہنس کے رن میں تیرِ قضا وہ بھی کھا گئے

بولے حسینؑ آخری میرے چمن کا پھول
پروردگار نذر ہے تیرے جو ہو قبول

سب کچھ لٹا کے رن کی طرف اب چلے ہیں شاہ   آراستہ ہے ان کے لیے خود رضا کی راہ
ان کے ثباتِ عزم کا ہے خود خدا گواہ   پہنچانے جا رہی ہے سکینہ کی ایک آہ

خیمہ میں لاڈلی کو بلکتا ہی چھوڑ کے
دنیا سے جا رہے ہیں یہ منہ اپنا موڑ کے

مقتل میں آئے حشر سا آ کر بپا کیا   بچپن میں جو کیا تھا وہ وعدہ وفا کیا
حاصل ہے جو سجود کا سجدہ ادا کیا   شمرِ لعیں نے جسم سے سر کو جدا کیا

خیمہ میں شور اٹھا کہ سکینہ بھی کھو گئیں
وہ آ کے اپنے باپ کے لاشہ پہ سو گئیں

شخصیّت

(احباب اور عزیزوں کی نظر میں)

بڑا سانحہ

چوہدری خلیق الزمان

مکرمی جناب طفیل صاحب!

آپ نے شوکت تھانوی مرحوم پر "نقوش" کے لیے کچھ لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ شاید آپ بھول گئے کہ میں اب عمر کی اس منزل میں ہوں کہ اپنے ہاتھ سے لکھنا 'کاہ برآوردن' کے مصداق ہے۔

یوں تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ باپ کے اوصاف اولاد میں بھی نظر آتے ہیں مگر جس طرح شوکت تھانوی اپنے والد بزرگوار سے مزاح اور حاضر جوابی کا ورثہ لے کر آئے اس کی کم تر مثالیں ملیں گی۔ میرے دوستانہ تعلقات محمد صدیق صاحب ان کے والد مرحوم سے تھے جن سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں اور ان کی صحبت میں چند لمحے ہنسی مذاق میں گذر جاتے تھے۔ جو بے پناہ آمد ان کے مزاح میں تھی، وہ میں نے کسی میں بھی نہیں دیکھی۔ ولایت علی بمبوق اور چودھری محمد علی۔ ردولوی مرحومین جو خود بھی اعلیٰ پایہ کا مذاق رکھتے تھے، محمد صدیق صاحب کا لوہا مانتے تھے۔ محمد صدیق صاحب کی ایک کمزوری یہ تھی کہ وہ کچھ لکھنے سے قاصر تھے مگر شوکت تھانوی نے ان تینوں مرحومین کا رنگ اڑا لیا تھا۔ اور جو دلکشی و نازک خیالی اپنے انداز مزاح میں پیدا کی تھی وہ کب کسی ایک انسان کو نصیب ہوتی ہے۔

شوکت تھانوی مرحوم اپنے پیچھے بہت سی تصانیف یادگار کے طور پر چھوڑ گئے ہیں مگر جتنا مواد بے لکھا لوگوں کے دلوں میں محفوظ ہے وہ بھی ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ غضب تو یہ تھا کہ تلخ سے تلخ پھبتی کو بھی وہ ایسے شیریں الفاظ و انداز سے ادا کرتا تھا کہ کسی کو خلش تک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس کی ہر بات میں آمد تھی اور جو کچھ کہہ جاتا تھا، قبل اس کے کہ آدمی سنبھلے بیسیوں اور پھبتیاں اڑا دیتا تھا اور سب ہنس ہنس کر بیٹھے اور دلگداز انداز میں۔

ہندی راج میں ریلوں کا کیا حشر ہوگا اکثر لوگ سوچتے رہتے ہوں گے، مگر اس نے سودیشی ریل لکھ کر ایک دنیا کے اندازے کو چند صفحات میں منتقل کر دیا۔ قاضی جی کا شاہکار اس کا ایک عجیب کارنامہ ہے۔ خود ہی قاضی جی خود ہی ان کی بیگم اور مسلسل ان کا پروگرام ریڈیو پاکستان میں نشر ہوتا رہا اور اکثر ناواقف قاضی جی اور ان کی بیگم کو دو مختلف افراد سمجھتے رہے[1]۔

سچ پوچھیے تو میں اس کی اچانک موت کو ایک بڑا سانحہ سمجھتا ہوں۔ "پطرس" پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے۔ سالک مرحوم بھی جا چکے تھے۔ ان کے بعد شوکت کی جدائی قوم و ملک کے لیے ناقابل تلافی سانحہ ہے۔

(چوہدری خلیق الزمان)

---

[1] شوکت صاحب ضرورت پڑنے پر بیگم کا پارٹ بھی ادا کر لیتے تھے مگر ہر بار ایسا نہیں ہوتا تھا — ادارہ

شوکت تھانوی مرحوم

عبدالماجد دریابادی

"شوکت تھانوی" کے ساتھ مرحوم کا الحاق کیسا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ گویا اجتماع ضدین! لیکن بالآخر جو ہونا تھا واقع ہو کر رہا! —— زندگی اور زندہ دلی اگر کبھی مجسم ہو کر گوشت و پوست کی شکل میں سامنے آ سکتے۔ تو وہ شاید شوکت تھانوی ہوتے۔ اور یہ اگر کہیں یونانیوں کے دور میں ہوئے ہوتے، تو عجب کیا کہ زندہ دلی و ظرافت کے ایک چھوٹے موٹے دیوتا مان لئے گئے ہوتے! موت کے بس سے اگر کسی کا باہر رہنا ممکن تھا تو ہماری تخیل کی دنیا میں بھی تھے —— وقت آیا تو جس کے وجود کا جیسے مقصد ہی ہنسنا ہنسانا، لوگوں کا دل خوش کرنا تھا، خود ایک خاک کا ڈھیر تھا۔ دوسروں کے لیے سرمایۂ ماتم سامان حسرت و غم!

پرانوں میں کسی نے انسان کی تعریف کی تھی۔ کہ وہ حیوان ضاحک ہے۔ عجب نہیں کہ انھیں سابقہ وقت کے کسی شوکت تھانوی ہی سے پڑا ہو۔ لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی میں اپنی نظیر آپ تھے۔ ذہانت کا خزانہ آج کل کے محاورہ میں بے پناہ تھا —— انشا کے لیے مشہور ہے کہ جب بادشاہ نے حکم دیا کہ ایک لطیفہ روز نیا سنایا کرو۔ تو ہمت جواب دے گئی۔ اور پسینہ آنے لگا —— یہ فرمائش اگر شوکت سے کی جاتی تو بے تکلف تیار ہو جاتے۔ اور عمر چاہے سو سال کی ہو جاتی۔ یہ ہر روز بلا ناغہ نئی ہی سناتے رہتے! اپنے صیغہ میں اتنا حاضر دماغ میں نے تو دیکھا نہیں۔ خدا جانے کتنی کتابیں، کتنے رسالے، کتنے مضمون، کتنے خاکے لکھ ڈالے۔ اور تھکن یا ماندگی کا پتہ نہیں۔ ہر وقت آمد ہی آمد۔ آورد جیسے ان کی طبیعت جانتی ہی نہ تھی —— دوسروں کو جو لکھ کر بڑی فیاضی اولوالعزمی سے دے دیتے تھے۔ اس کا حساب الگ! اور پھر آخر میں تو کئی سال سے ایک روزنامہ میں ہر روز لطائف کا کالم پوری لطافت کے ساتھ پورا کیا کرتے!

یہ ہنسوڑ پن تمام تر بے مقصد نہ ہوتا۔ بلکہ ریڈیائی تقریریں ہوں، یا اخباری تحریریں سب میں ہلکی پھلکی تعلیم تبلیغ مشرقیت و شرافت کی ہوتی۔ بلکہ کبھی کبھی تو عین دین و اخلاق کی بھی! —— خود بھی عقیدۃً پختہ مسلمان تھے اور اعمال کی کوتاہیوں پر نادم و شرمسار آخر تھانہ بھون ہی کے تو تھے۔ ع

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے!

جب پہلی بار فلمی دنیا میں قدم رکھا ہے تو مجھے خط میں لکھا "میں ریڈیو سے گاتے گاتے اب فلم میں ناچنے بھی آگیا ہوں!"

یہ اعتراف خود سیاہیوں کو دھونے والا۔ اور رحمتوں کو اپنی طرف کھینچنے والا ہے۔

سب سے پہلے شاید اودھ اخبار (لکھنؤ) کے ادارتی عملہ میں کام کیا۔ پھر لکھنؤ کے دوسرے روزنامہ حق میں آگئے۔ ایک اپنا رسالہ کائنات کے نام سے نکالا۔ سرپنچ (لکھنؤ) کے بھی مدیر رہے۔ شہرت کا پہلا قدم "سودیشی ریل" لکھ کر اٹھایا۔ غالباً ۱۹۲۹ء میں۔ اس کے بعد سے مشہور ہی ہوتے چلے گئے۔ مرعوب نہ "ترقی پسندی" سے ہوئے نہ جدیدیت کے کسی اور رُخ سے۔ لکھنؤ ریڈیو میں ان کا کردار "منشی جی" اپنا ایک مستقل مقام رکھتا تھا۔ اور پھر جب تقسیم کے بعد ہی پاکستان منتقل ہو آئے۔ تو لاہور ریڈیو میں اُن منشی جی کی جانشینی "قاضی جی" کے حصہ میں آئی۔ اور دونوں کی معصومانہ دل لگیوں نے سامعین کو لٹا لٹا دیا ——— تھانوی محض نام کے تھے۔ ورنہ اسکولی تعلیم لکھنؤ میں پائی۔ لڑکپن اور جوانی کا بیشتر زمانہ یہیں گزرا۔ اس لیے زبان کے لحاظ سے پورے لکھنوی تھے۔ یہاں کے محاورہ اور روزمرہ پر عبور رکھنے والے۔ یہیں کی شستہ، رواں، سلیس، شستعلیق زبان لکھنے والے۔ خدائے آموزگار لغزشوں کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔ اور مرحوم کو کروٹ کروٹ جنّت نصیب فرمائے۔ عمر شاید قریب ۵۵ کے پائی ہو۔ مرض اَکِلہ (کینسر) سا موذی نصیب ہوا۔ اس کی ناقابلِ بیان اذیتیں خود ہی کتنا بڑا سبب کفارہ ذنوب کا بن گئی ہوں گی۔ پھر سفرِ آخرت کے لیے ذی الحجہ کے متبرک عشرۂ اوّل میں بھی متبرک ترین تاریخ عین یوم الحج کی پائی! یہ تاریخ کیا ملی۔ گویا غیبی بشارت مغفوریت کامل کی ہاتھ آگئی۔ وما یلقّٰہا الا ذو حظٍ عظیم۔

ایک مہذّب ظرافت نگار

قرۃ العین حیدر

مدّتیں گزریں جب میں نے "سودیشی ریل" پڑھی تھی۔ مگر اس کے بہت سے جملے آج تک اس طرح یاد ہیں جیسے یہ مضمون ابھی ابھی پڑھ کر ختم کیا ہو —

"بابوجی لائیے — نہ ہماری بات نہ آپ کی۔ بوہنی کا وقت ہے، لائیے تیرہ آنے ہی دے دیجئے۔" ٹکٹ بابو نے کہا اور ایک پرچے پر کچھ لکھ کر دے دیا۔

"ٹکٹ کہاں ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"نئے ٹکٹ چھپنے گئے۔"

ریل چلنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔

"ارے صاحب جب مسافر پورے ہو جائیں گے تب ہی تو ریل چھوڑیں گے یا ایسے ہی چھوڑ دیں۔"

مسافر کھچا کھچ بھر گئے۔ ریل پھر بھی نہ چلی۔

"للّو فائرمین کوئلہ لینے شہر گیا ہوا ہے۔ کہہ دیا تھا جلدی آجائیو — اسی لیے چھٹنے میں دیر ہو رہی ہے۔" گارڈ صاحب نے فرمایا۔

اتنے میں للّو فائرمین بھاگتا ہوا آیا۔ "اپنے باپ کا نوکر سمجھ رکھا ہے؟ سوراج کی خوشی میں شہر کی ساری دوکانیں بند ہیں۔ کہیں کوئلہ نہیں ملا۔ بڑی مشکل سے ایک جگہ سے پانچ سیر لایا ہوں" — اس نے کوئلے کی بوری غصّے سے پٹخ دی۔

یہ جملے ممکن ہے بالکل اسی طرح نہ ہوں۔ میں نے حافظے کی مدد سے لکھ دیے ہیں۔ لیکن کتنے مضامین یا افسانے ایسے ہوں گے بچپن میں پڑھے ہوئے جن کے پورے پیراگراف یاد رہ جائیں؟

—

لکھنؤ میں جب ریڈیو اسٹیشن کھلا تو "بچوں کا پروگرام" بھی شروع ہوا۔ اس پروگرام کے تین کردار تھے۔ آپا جان۔ ان کا نوکر "بدھو" اور تیسرے ایک پوپلی سی آواز والے بزرگ "چاچا"

مجھے ان تینوں سے سخت عقیدت تھی۔ اور راسخ عقیدہ یہ تھا کہ آپا جان واقعی آپا جان ہیں۔ بدھو ان کا انتہائی بیوقوف نوکر ہے (جو تتلا کر بولتا تھا اور "گُڑ سوڈے" کا شوقین تھا جسے وہ "ڈُل تھودا" کہتا تھا) جو چاچا سے مستقل جھگڑتا رہتا ہے۔ اور "چاچا" ایک بے حد دلچسپ بڑے میاں ہیں۔

کچھ عرصے بعد جب مجھے اس پروگرام میں شرکت کے لیے بلایا گیا تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یعنی یہ کہ ہم آپا جان، بدھو اور چاچا کو نہ صرف زندہ جیتا جاگتا اور بولتا دیکھیں گے بلکہ ان کے ساتھ پروگرام میں شرکت کا فخر بھی حاصل کریں گے۔

لیکن ریڈیو اسٹیشن پہنچ کر معلوم ہوا کہ آپا جان کا اصل نام تو عرش منیر ہے (یہ ایک اسٹاف آرٹسٹ تھیں۔ ان کی بیحد خوبصورت آواز تھی اور برسوں یہ لکھنؤ اسٹیشن کے ڈراموں کی "اسٹار" صداکار رہیں اور بہت عرصے سے کراچی کی ایک دُور افتادہ مہاجر بستی میں بڑی تکلیف اور تنگدستی کی زندگی گذار رہی ہیں) بدھو کے متعلق انکشاف ہوا کہ یہ آپا جان کے نوکر قطعی نہیں ہیں بلکہ ریڈیو کے ایک رکن ہیں (یہ اب ریڈیو پاکستان کے اعلیٰ افسر ہیں اور کئی برس سے اقوام متحدہ نیویارک میں تعینات ہیں) اور چاچا کے لیے پتہ چلا کہ ارے یہ تو شوکت تھانوی ہیں۔

آئندہ برسوں میں ہم بچوں کے پروگرام کے زمرے سے نکل کر "بڑوں" کے پروگرام میں شامل ہونے لگے اور کچھ تھوڑی بہت "توں تاں" بھی شروع کر دی۔ یعنی یہ کہ عورتوں کے پروگرام کے لیے ایک آدھ "اسکٹ" تصنیف فرمایا۔ اسکول سے نکل کر کالج اور کالج سے یونیورسٹی پہنچے۔ ریڈیو اسٹیشن کی فضا وہی رہی۔ وہی سب جانے پہچانے لوگ اور مانوس، گھریلو سا ماحول۔ ان دنوں لکھنؤ ریڈیو کے ڈرامے خاصے کی چیز ہوتے تھے اور لاہور ریڈیو سے دوستانہ مقابلہ اور چشمک رہتی تھی کیونکہ لاہور والوں کو بھی اپنے فنکاروں پر بہت ناز تھا۔ شاید اسی دوران میں شوکت تھانوی کسی فلم کمپنی میں مکالمے لکھنے کے لیے لاہور چلے گئے اور اس کے کچھ عرصے بعد لکھنؤ واپس آ گئے۔

غالباً اگست ۴۷ء کی ایک شام، ریڈیو اسٹیشن اُجڑا اُجڑا سا لگ رہا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کے کئی اسٹیشن نئے نئے ریڈیو پاکستان میں شامل ہو جانے کی وجہ سے تازہ انڈین لسنر یکلخت بیحد دُبلا اور مدقوق سا معلوم ہو رہا تھا۔ لکھنؤ سے سعیدہ رضا اور آل حسن پہلے ہی تبدیل ہو کر دہلی جا چکے تھے۔ بیشتر مسلمان اراکین لاہور، پشاور، ڈھاکہ اور کراچی روانہ ہو گئے تھے۔ گوہر سلطان، حنیفہ جاوید، اور عطیہ حبیب اللہ انگلستان جا چکی تھیں۔ وہ پرانا ماحول راتوں رات بدل سا گیا تھا۔ عرش منیر نے بتایا کہ جگل کشور مہرہ، شیخ احمد سلمان بھی تبدیل ہو کر پاکستان چلے گئے۔ شمشیر سنگھ ہترہ بھی (شاید یہی نام تھا) سلیم شاہد ہو کر لاہور گئے۔ شوکت صاحب بھی لاہور میں ہیں اور عنقریب اپنے گھر والوں کو وہاں بلانے والے ہیں۔

اس کے فوراً بعد ہی لاہور سے "پاکستان ہمارا ہے" کا پروگرام شروع ہو گیا جسے امتیاز علی تاج اور شوکت صاحب مرتب کرتے تھے۔ اس کے بعد "قاضی جی" کا سلسلہ شروع ہو کر بے حد مقبول ہوا۔

—

لاہور ریڈیو اسٹیشن پر شوکت صاحب سے اکثر ملاقات ہوتی رہی۔ ۵۶ء میں ایک مرتبہ کرشنا آل حسن میرے ساتھ ریڈیو اسٹیشن گئی کیونکہ وہ آل حسن سے شوکت صاحب سے پرانی دوستی کی وجہ سے مرحوم سے خاص طور پر ملنا چاہتی تھی۔

شوکت صاحب ریڈیو اسٹیشن کے پہلو والے کمرے میں اپنی میز پر بیٹھے تھے۔ کرشنا سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے اُن سے کہا: "شوکت صاحب آپ کا وہ ترکہ اب تک نہیں ملا، ہم لوگ بیتابی سے اس کے منتظر ہیں۔"

قصہ یہ تھا کہ چند برس قبل صدیق احمد صدیقی نے بتلایا تھا کہ شوکت صاحب کے ساتھ ایک بڑی ڈرامائی بات ہونے والی ہے، وہ یہ کہ ان کے ایک چچا انگلستان میں بس گئے تھے اور مشہور ہنٹلے اینڈ پامر بسکٹ کمپنی کے ڈائریکٹر یا مالک یا جنے کیا، بہر حال بہت سخت کروڑپتی ہو گئے تھے۔ انھوں نے لاولد وہاں انتقال کیا اور شوکت تھانوی ان کے واحد قانونی وارث ہیں اور عنقریب یہ لاکھوں پونڈ کا ورثہ حاصل کرنے کے لیے ولایت آنے والے ہیں۔ یہ واقعی اکسائٹنگ بات تھی۔ ظاہر ہے کہ جب شوکت تھانوی ملک انگلستان کے ایک کروڑپتی بن جائیں گے تو کلرجز یا ڈورچیسٹر میں رہا کریں گے۔ ایک آدھ قلعہ وغیرہ خرید لیں گے اور ایک عدد رولس رائس تو لامحالہ رکھیں گے ہی۔ تو ہم سب پر کیا لازم آیا ——؟ ہم سب پر یہ لازم آیا کہ ہم لوگ موصوف کو ابھی سے "کلٹی ویٹ" شروع کر دیں اور اہلِ ولایت پر ثابت کریں کہ شوکت تھانوی مدظلہ کے نہایت قریبی رشتے دار ہیں، تاکہ موصوف کے ڈورچیسٹر ہوٹل اور رولس رائس کار وغیرہ سے ہم صوفیا کو بھی فیض حاصل ہو سکے۔

چنانچہ میں نے شوکت صاحب سے پوچھا کہ وہ ترکہ آپ کو اب تک کیوں نہیں ملا۔ ہم لوگ آخر کب تک انتظار کریں۔ واقعی — میں نے کہا —— ہم مقبول انگریزی ناولوں میں پڑھا کرتے تھے کہ فلاں کا چچا آسٹریلیا میں بے اندازہ دولت چھوڑ کر مرا۔ یا افریقہ میں ہیرے کی کانیں اپنے کسی دُور افتادہ اور گمنام بھتیجے کے نام منتقل کر کے دوسری دنیا کو سدھارا۔ آپ کے چچا نے یہ روایت سچ کر دکھائی۔

شوکت صاحب نے جواب دیا کہ بھئی اس میں ایک شاخسانہ نکل آیا۔ اس ترکے کی لندن میں ایک انگریز خاتون دعویدار پیدا ہو گئی ہیں اور انھوں نے وصیت کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ اب میرے پاس اتنا پیسہ کہاں ہے کہ میں اتنا مہنگا مقدمہ لڑتا پھروں، لہٰذا میں نے اس کا خیال ہی چھوڑ دیا۔

اسی وقت ن۔م۔ راشد آ گئے۔ جو ان دنوں نیویارک میں تعینات تھے اور رخصت پر پاکستان آئے ہوئے تھے۔ اس سے قبل میں راشد صاحب سے نہیں ملی تھی۔ شوکت صاحب نے بڑی برجستگی سے میرا تعارف کرایا۔ "یہ ریڈیو کی بیٹی ہیں۔"

اور کرشنا کو متعارف کیا۔ "یہ ریڈیو کی بہو ہیں۔" (یعنی آلِ حسن کے رشتے سے وہ ریڈیو کی بہو تھی!)

کل کی بات ہے کہ صدیق احمد صدیقی، شوکت صاحب کے کروڑپتی ہونے کی بشارت دے رہے ہیں۔ کل ہی کی بات ہے کہ لاہور ریڈیو اسٹیشن پر محمود نظامی نہایت جوش و خروش اور نفاست سے مارچ کا سالانہ جشنِ موسیقی منعقد کر رہے ہیں اور شوکت صاحب باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتے ادھر ادھر ٹہل رہے ہیں۔ اے لیجئے —— آج نہ صدیق احمد صدیقی ہیں نہ محمود نظامی نہ شوکت تھانوی —— کمال ہے واقعی ——

—

مجاز کے لطیفوں جتنے تو نہیں مگر شوکت صاحب کے بھی بہت سے لطائف و ظرائف مشہور ہیں کہ کیسے انھوں نے انتہائی رنج و الم کے موقعے پر اپنے ایک جملے سے روتوں کو ہنسا دیا۔ یا کسی بے ڈھب اور نازک صورت حال کو ایک برجستہ فقرے اور بذلہ سنجی کے

ذریعے خوبصورتی سے سنبھال لیا۔ لیکن اختر شیرانی، میراجی، منٹو اور مجاز کی مانند شوکت تھانوی ایک "روایت" کی صورت اختیار نہ کریں گے ان چاروں فنکاروں کے برعکس شوکت صاحب ایک سیدھے سادے اور گھریلو سے آدمی تھے۔ ان کے کردار میں جہاں تک میرا خیال ہے کوئی غیر معمولی پیچ و خم یا نفسیاتی الجھنیں نہ تھیں۔ اور ایک سیدھے سادے آدمی کا "لیجنڈ" LEGEND یا حکایت میں تبدیل ہو جانا ذرا مشکل ہے۔ محض یہ بات کہ وہ پان کے ازحد شوقین تھے، دیومالا کے لیے کافی نہیں۔ دیومالا کی تخلیق کے لیے مرحوم ادیب کو شراب یا کسی اور جان لیوا اور مہلک نشے کا عادی ہونا بھی ضروری ہے۔

—

شوکت تھانوی بے حد ہر دلعزیز تھے اور آج سے نہیں "سودیشی ریل" کے زمانے سے اب تک ان کی ہر دلعزیزی میں اضافہ ہوتا آ رہا تھا۔ یہ مقبولیت انھیں دونوں ملکوں میں حاصل تھی۔ آزادی کے بعد سے ہندوستان میں ان کی تصانیف کا ہندی میں ترجمہ ہوتا رہا ہے اور وہ ہندی داں طبقے میں بھی بہت مقبول تھے۔ انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ ناول، افسانے، ڈرامے، اخبار کے کالم، ریڈیو فیچر، وہ قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ ایک ایسے محکمے سے ان کا تعلق تھا جہاں ادیب کو اخبار نویس کی مانند متواتر لکھنا اور لکھتے رہنا پڑتا ہے، لکھنا ایک عادت ثانیہ اور میکانکی عمل بن جاتا ہے۔

مگر اس زود نویسی کے باوجود شوکت صاحب کی زیادہ تر تحریریں جو وقتی موضوعات پر لکھی گئیں تھیں، اپنی شگفتگی اور برجستگی کی وجہ سے پڑھنے کے لائق ہوتی تھیں۔ سوائے روزنامہ جنگ کے اس کالم کے جو انھوں نے مجید لاہوری کے انتقال کے بعد لکھنا شروع کیا تھا اور جس میں آمد کے بجائے محض آورد ہوتی تھی۔

"عظیم فنکار"، "عظیم ناول نگار"، "عظیم شاعر"، "عظیم مزاح نگار" ——— میں اس لفظ "عظیم" کو بہت شک و شبے کی نظر سے دیکھتی ہوں۔ عظمت کا فیصلہ صرف تاریخ کے ہاتھ میں ہے اور یہ سوال بہت بعد کا ہے کہ ادب کی تاریخ کس لکھنے والے کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرے گی۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ برنارڈشاد مرنے کے فوراً بعد بھلا دیئے گئے۔ دُور کیوں جائیے خود ہمارے یہاں منٹو کے سلسلے میں جوش و خروش اب مدھم پڑتا جا رہا ہے۔ بہت سے اچھے ادیب اپنے دور کے بعد مختلف وجوہ کی بنا پر محض "DATED" ہو کر رہ جاتے ہیں۔ عظیم بیگ چغتائی کا آج وہ غلغلہ نہیں رہا جو آج سے بتیس سال قبل "نیرنگ خیال" کے دور میں تھا۔ وقت اور تاریخ دونوں انتہائی ظالم اور ستم پیشہ ہیں۔ وقت کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتا۔ نہ وہ خودستائی، گروہ بندی، من ترا حاجی بگویم، "نئی نسل بنام پرانی نسل"، "سنسنی خیزی" یا "فقرہ بازی" کے چکر میں آتا ہے۔ آپ اپنے فن کے متعلق خود کتنے ہی مقالے لکھ بیٹھیے، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پچاس برس کے الٹ پھیر کے بعد معلوم ہو گا کہ کس ادیب کی تخلیقات کا کتنا حصہ باقی بچ گیا اور کتنا زمانہ برد ہو گیا۔ ادبی رواجوں، تنقید کی ٹکسالوں، نظریاتی بحثوں اور وقتی مقبولیت سے بالاتر کوئی چیز ہے۔ ادیب کی اپنی صلاحیت اس کا فنی اور نظریاتی توازن اور ARTISTIC CONSISTENCY جو اسے زندہ رکھتی ہے اور اس کے لیے وقت کی کسوٹی درکار ہے۔

ادب کی دنیا بڑی انوکھی دنیا ہے۔ میرے نزدیک سید ابو تمیم فرید آبادی ایک بہت اچھے مزاح نگار ہیں۔ لیکن میں نے کسی تذکرے یا جائزے میں ان کا نام نہیں دیکھا۔ بلکہ بہت سے لوگ تو ان کی تحریروں ہی سے ناواقف ہوں گے۔ عظیم بیگ چغتائی بہت بڑے مزاح نگار تھے۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی کہا آج وہ اتنے مقبول نہیں رہے اور بعض اوقات بعض گمنام ادبی شخصیتوں کو

"ڈسکور" کر لیا جاتا ہے اور فراموش شدہ فنکاروں کی "تجدید" بھی ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ مرزا رسوا اور نظیر اکبرآبادی کے ساتھ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ، بہت سی چیزیں جن کو ہم ادب عالیہ کہہ کر خوش ہو لیتے ہیں۔ ان کی محض ایک دستاویزی حیثیت ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے ۳۶ء سے پہلے کا بیشتر نثری اور افسانوی ادب خاصا نحیف تھا۔ لیکن شوکت تھانوی نے "سودیشی ریل" اسی زمانے میں لکھی اور "پطرس کے مضامین" بھی جبھی لکھے گئے۔ لہٰذا ہم قطعیت کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ کسی ایک دور میں صرف دوسرے درجے کا ادب تخلیق کیا گیا۔ ادب کے "ترقی یافتہ" اور "درخشندہ" زمانوں یا "تنزل پذیر" اور "کمزور" زمانوں سے بڑے ادیب کا کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔ وہ اپنا کام کر کے چلا جاتا ہے۔ بدلتے ہوئے ادبی رواج، معاشرے اور قارئین کے تبدیل شدہ تعصبات، مزاج اور مذاق، یا بعض اوقات چند نقادوں کی نظرِ کرم اور مبالغہ آمیز تعریف یا نقادوں کا عتاب، یا لاعلمی یا جہالت، تعصب یا بے نیازی، یہ ساری چیزیں مل کر ایک وقفے کے لیے کسی ایک ادبی شخصیت کو یا آسمان پر چڑھا دیتی ہیں یا پاتال میں گرا دیتی ہیں۔ مگر بات وہی رہتی ہے۔ اگر اس لکھنے والے میں کوئی "چیز" تھی تو وہ وقت گزر جانے پر بھی زندہ رہے گا اور بھلا دیئے جانے کے بعد پھر یاد کیا جائے گا۔

لہٰذا میں شوکت صاحب کے متعلق یہ حکم لگانے کا کوئی حق نہیں رکھتی کہ وہ کس قدر عظیم ظرافت نگار تھے اور کتنے بلند پایہ فنکار تھے اور ان کا مزاحی ادب زندگی کی کن اعلیٰ ترین قدروں کا حامل تھا وغیرہ وغیرہ۔ میں بحیثیت ایک قاری کے اتنا جانتی ہوں کہ زندگی کا بھرپور احساس اور ایک لطیف اور مہذب ظرافت ان کی تحریروں میں جاری و ساری تھی۔ ایک اچھے ظرافت نگار کی خوبی یہ ہے کہ وہ روزمرہ کے معمولی واقعات میں، زندگی کے بے تُکے پن اور بدصورتی اور لیسے میں، صورتِ حالات کی شدید نامعقولیت میں معقولیت کا رُخ دیکھ لے اور اس پر ہنس اور ہنسا سکے۔ اچھا مزاح نگار زور سے قہقہہ نہیں لگاتا، صرف مسکراتا رہتا ہے۔ وہ پھکڑ اور سوقیانہ باتوں یا محض ضلع جگت یا چند بندھے ٹکے جملوں یا چند STOCK مسخرے کرداروں کی تکرار سے مزاح پیدا نہیں کرتا۔ وہ زندگی کی گھمسان میں اُتر کر زندگی کا مضحک پہلو تلاش کر لیتا ہے۔ اسی وجہ سے شوکت تھانوی کی تحریروں میں طنز کی تلخی یا خالص مسخرے پن کے ابتذال کے بجائے محض مزاح کی شگفتگی ملتی ہے۔ یہ فرحت بخش ظرافت نکتہ سنجی، خوش طبعی، ذہین زندہ دلی، پُر مذاق اور لطیف فقروں اور الفاظ کے نفیس اور مہذب استعمال سے پیدا ہوتی ہے اور شوکت تھانوی ہمیشہ ایک مہذب ظرافت نگار رہے۔ یہی تہذیب اور متانت ہمیں رشید احمد صدیقی کے یہاں ایک بہت اونچی اور فلسفیانہ سطح پر ملتی ہے۔

شوکت تھانوی اپنی زندگی میں ایک طویل عرصے تک اپنے الفاظ اور اپنی آواز کے ذریعے لاکھوں انسانوں کو ہنساتے رہے اور اس روتی بسورتی اعصاب زدہ دنیا میں اگر کوئی انسان اپنی فطری شگفتگی کے ذریعے دوسروں کو تھوڑی دیر کے لیے محظوظ اور بشاش کر سکے تو ہمیں اس کا شکر گذار ہونا چاہیے۔

کوئی دوسرے شوکت تھانوی اب دنیا میں نہیں آئیں گے۔

میرا رفیق

قدرت اللہ شہاب

شوکت تھانوی کے ساتھ مرحوم کا لفظ استعمال کرتے ایک عجیب ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔

جس باغ و بہار شخصیت نے اپنی تحریر اور گفتار سے لاکھوں کا دل خوش کیا ہو وہ یوں دفعتاً موت کی آغوش میں سو جائے گا، اس کا ہمیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔

شوکت تھانوی نے بے شمار لوگوں کو ہنسایا ہے لیکن اس کے اپنے دُکھ اندر ہی اندر ناسُور بنتے گئے۔ یہاں تک کہ اس ناسُور نے چپکے چپکے گھُن کی طرح اُس کی زندگی کو کھا لیا۔

ایسے بندوں کی بخشش کا یہی ایک نشان ہے کہ ان کی موت پر ایک زمانہ سوگوار ہوتا ہے۔ آج بھی اُردو دان طبقے کا ہر فرد شوکت تھانوی کی وفات پر اشک بار ہے۔ شوکت کے اُٹھ جانے سے اُردو ادب کی محفل ویران ہو گئی ہے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ اپنے ایک محترم اور بزرگ ممبر سے محروم ہو گیا ہے۔ اور ذاتی طور پر میرا ایک عزیز دوست اور رفیق مجھ سے بچھڑ گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ اس کی روح کو جنت میں اُسی طرح ہنستا رکھے جس طرح اس دنیا میں اُس نے لاکھوں ہزاروں انسانوں کو اپنی شگفتہ تحریروں اور تقریروں سے ہنسایا——

آمین

باغ و بہار شخصیّت

حفیظ جالندھری

شوکت سے مل کر ہنستے ہم
یہ کیا خبر تھی رونا پڑے گا

شوکت تھانوی کو آج اردو کی ساری دنیائے ادب رو رہی ہے۔ شاعر، ادیب، افسانہ نگار، ضاحک و ظریف، شوکت اخبارات و رسائل کا مدیر، صحیفہ نویس، لطیفہ گو شوکت بزمِ ادب شعر و فن کی ایک باغ و بہار شخصیت ہم سے جسمانی طور پر رخصت ہو گئی ہے۔ وہ شخصیت جو زندگی کے اذیت دہ پھوڑوں پر اپنی خوش گفتاری کا مرہم رکھا کرتی تھی۔ آج شوکت جن کو ہنسایا کرتے تھے، وہ سب روتے رہ گئے ہیں۔ شوکت کے رخصت ہو جانے کے بعد بزمِ یاراں کو اب سارا عالم کچھ عجیب سا نظر آ رہا ہے ؎

کس قدر آباد ہے دنیائے دوں   مردہ و افسردہ و خوار و زبوں
خاک کا پیوند ہونے کے لیے   صورتِ اشکِ ندامت سرنگوں

اور یہ بالکل سچ ہے۔ صورتِ حال اب یہی ہے کیونکہ

اہلِ دل کی زندگی ہے زندگی   روح کی تابندگی ہے زندگی
ہو گئے رخصت جہاں نورد مرد   کچھ نہیں شرمندگی ہے زندگی

شوکت تھانوی ایک کثیر الاحباب شخصیت تھے، پاکستان میں بھی اور بھارت میں بھی اُن کے بے شمار ذاتی دوست موجود ہیں۔ خدا ان کو زندہ رکھے تاکہ وہ شوکت کے لطائف سے خود بھی مزید لطف حاصل کرتے رہیں اور دوسروں کو بھی ایسے ظرائف سے باخبر کریں جو ابھی تک ذاتی دوستوں ہی کو معلوم ہیں۔

ان کی تحریروں سے شگفتگی حاصل کرنے والے قدردان یا ریڈیو اور مشاعروں میں اُن کی زبان سے بذلہ کے موتی چننے والے ان گنت ہیں۔ اپنے ذوق کے مطابق شوکت کی رحلت پر سب ماتم کناں ہیں۔ سب اس جدائی سے متاثر ہیں۔ سب اپنے ذہن کی تسکین کے معاملے میں اُردو مزاح نگاری اور خندہ گفتاری کی فضا میں ایسا خلا دیکھ رہے ہیں جو شوکت کے بعد آسانی سے پُر ہوتا نظر نہیں آتا۔

ذاتی دوست احباب سے اُن کے مراسم انتہائی مخلصانہ بھی تھے اور شرارتِ معصومانہ سے بھی بندھے ہوئے تھے۔ شوکت کی زبان پر لطیفے اور شرارتیں جو سب دوستوں کو زندہ دلی عطا کرتی تھیں — اب موت نے ان کو قبر میں دفن کر دیا ہے، شوکت کے ساتھ ہی —!

یہ محرومی کش مکش حیات کے ہر قدم پر زخم کھاتے چلے جانے والے احباب کے لیے اس مرہم کے پھاہوں سے محرومی ہے۔ جو ہر دوست کے لیے شوکت کے پاس تیار بہ تیار رہتے تھے۔ اب رونوں بسورتوں کو ایک ہی فقرے ایک ہی جملے سے کون ہنسا سکے گا۔

شوکت کی بذلہ سنجی۔ حاضر جوابی۔ لطائف و ظرائف جس رنگ و ڈھنگ کے تھے۔ اب وہ دوسرے اردو بولنے اور لکھنے والوں میں سے شاید ہی کسی کو حاصل ہوں اس لیے کہ شوکت نے جس فضا جس مقام اور جس دور میں آغازِ حیات کیا تھا اور زندگی کی منزلیں طے کرتے ہوئے وہ جس مقام اور جس دور پر آ پہنچے تھے۔ اُن تمام طے کردہ راہوں کے مناظر اپنے اور اپنے اردگرد کے ماحول کی لیاقتیں بھی اور حماقتیں بھی" اُن کے ذہن پر مرتسم تھیں۔ اور اب نئے مقام اور نئے ماحول پر وہ پرانی حماقتوں اور نئی حماقتوں کو یکجا کرکے بیک وقت دونوں کو آئینہ دکھانے پر قادر تھے۔ پرانا دَور شوکت کے ساتھ ہی انتقال کر گیا۔ اور نیا دور ——— خدا بچائے۔

بیٹھتے اٹھتے بولتے چالتے لکھتے پڑھتے زندگی کی بلندیوں پستیوں پر اُترتے چڑھتے ہر عالم میں ایک خاص خداداد لطیفہ اُن سے سرزد ہوتا تھا۔ دوست ہو یا دشمن غیر ہوں یا عزیز و اقارب حتیٰ کہ اپنے بیوی بچوں تک پر فقرہ کسنے سے وہ دریغ نہیں کرتے تھے اور فقرہ بھی کیسا کہ باید و شاید!

مجھے تو کچھ ایسا نظر آیا کہ اُن کے صدر و سینہ میں کوئی مقناطیس ہے نیا لطیفہ ہو یا نئی شرارت اس مقناطیس کی آڑ میں تیار ہوتی رہتی ہے۔ یہ مقناطیس بڑی بزم ہو، یا محض ایک ہی دوست کے ساتھ لطائف کی رزم، کسی نہ کسی زبان سے یہ مقناطیس ایسی باتیں کہوا دیتا تھا۔ کوئی ایسی حرکت یہ مقناطیس دوسروں سے سرزد کرا دیتا۔ جس پر فوراً وہ چھپا ہوا لطیفہ شوکت کی زبان سے ٹپک کر فضا میں قہقہوں کا لالہ زار سجا دیتا تھا۔ لطیفے کے لیے غور و فکر یا اُمڈی ہوئی شرارت کے لیے کسی مقام اور مرحلے کی ضرورت شوکت کو نہیں تھی۔ جو بات دوسروں سے غائب رہنا چاہتی، شوکت کے لیے حاضر تھی لیکن اُس کے لطیفے یا شرارت میں کبھی کوئی زہر۔ کبھی کسی کی دل شکنی یا دل آزاری نہ موجود تھی نہ شوکت کا مقصود!

شوکت کی ظرافت زندہ دلی تھی۔ یہ دل لگی ہوتی تھی۔ دل کی لگی نہیں۔ لگاؤ تھا لاگ نہ تھی ——— اس لیے جس پر وہ فقرہ کستا تھا۔ وہ روتے روتے قہقہے لگا کر ہنستا تھا۔ اس کے ذہن سے نکلے ہوئے الفاظ کے ہر ہدف کو کھلتے ہوئے صدف سے موتی ملتے تھے۔ اس کی نوازشِ بذلہ سے سوکھے ہوئے چمن کھلتے تھے۔ افسوس آج وہ ذہن بند ہو گیا ہے! آہ آج وہ اپنی رنگینیٔ بیان سے زبان کی لذت کو بیدار کرنے والا خود ہی سو گیا ہے!

جو قیامت اٹھائے پھرتے تھے
سو رہے ہیں وہ لمبیاں تانے

شوکت پرانے دور اور پرانے مقام سے چلتا ہوا جس نئے مقام اور جس نئے دور میں آ گیا تھا، ہماری طرح وہ پرانی یادوں پر بسورتا نہیں تھا۔ کیونکہ اس دور کی حماقتوں پر ہنسنے ہنسانے کا ملکہ اسے ودیعت تھا۔ نئے ماحول کی حماقتوں اور پرانے دور کی حماقتوں کو ہم آہنگ کر لینے اور پھر دونوں تصویروں کو ایک تصویر میں بھر لینے کی لیاقت شوکت میں جس ڈھنگ سے نظر آئی دوسرے میں نہیں پائی گئی۔ رنگ برنگ قہقہوں کو ایک ہی جنبشِ قلم سے ہر پس منظر کے ساتھ فضائے عالم پر ثبت کر دینا شوکت کے لیے آسان تھا۔ دوسروں کے لیے محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ جو لوگ دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ وہ خود لازماً خوش و خرم بھی ہوں گے۔ آہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ میں مانتا ہوں کہ میں شوکت کے خاص الخاص حلقۂ احباب میں سے نہیں ہوں۔ خاص الخاص احباب تو واقعی ان کو بہت زیادہ جانتے ہوں گے۔ تاہم میری بھی پچیس برس سے اچھی خاصی شناسائی کہئے یا دوستی پر محمول کیجئے۔ شوکت سے گہری صحبت رہی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ان کے قلب پر بہت سے رِستے ہوئے ناسور تھے، زندگی کی ذمہ داریوں کے دو پاٹ ان کو پیسے ڈال رہے تھے۔ تاہم وہ راتوں کو بلند مرتبہ دوستوں اور مقتدر افسروں کے ہاں کھانے پر چہکائے جاتے۔ عام مشاعروں پر پے بہ پے بلائے جاتے تھے اور رات رات بھر جگائے جاتے تھے۔ مشاعروں سے رونمائی ضرور حاصل ہوتی ہوگی۔ لیکن چھینٹوں سے گزر اوقات بصد مشکل ہوتی تھی۔

جامہ زیب آدمی۔ وضعداری کا رسیا۔ اپنے زخم ہائے داخلی کو چھپاتا رہا اور خارجی دنیا کو اپنے اندازِ گفتار سے پُربہار بناتا رہا۔ معاش کے لیے شوکت کی محنت کا اندازہ شاید آپ نہیں کر سکیں گے۔ جس پر ایسی ہی بیت رہی ہو۔ اس کے سوا کون جانتا ہے کہ یہ ہنسانے والی مشین اپنے ایندھن کے لیے کیا کیا جتن کر رہی ہے۔ اس نے بارہا مجھے، میرے استفسار پر، اشک آلود آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے آپ بیتی سنائی تو مزاح اور ظرافت کے پیچھے شوکت کی اصل خونچکاں صورت نظر آئی ——!

جنگ کے زمانے میں شوکت نے میرے اسٹاف میں صوبہ متحدہ کے اندر تبلیغ مقاصد جنگ کے سلسلے میں بطور ڈی آرگنائزر اہتمام بھی کام کیا تھا اور میں نے لکھنؤ میں اس کی قیام گاہ پر بھی اس کی میزبانی کے چند مرتبہ طور طریق دیکھے —— مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ دوسری شادی کرنے پر کیوں مجبور ہوا۔ لیکن میں تحسین کے سوا اور کچھ کہہ ہی نہیں سکتا۔ جب میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے پہلے فرزندوں کی تربیت اور پھر ان کو برسرِ روزگار بنانے میں کس قدر پدرانہ شفقت اور ذمہ داری اختیار کئے رکھی اور اپنی پہلی بیگم کو آخری دم تک باقاعدہ وہ جس قدر رقم بہ مہیا کرتے تھے، وہ بھی مجھے معلوم ہے۔ الحمدللہ ان کے دو فرزند اچھا خاصا کما رہے ہیں تیسرا تعلیم کے آخری مدارج طے کر لینے کے قریب ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ مرحوم شوکت کے احساسِ ذمہ داری نے پہلی بیوی اور بچوں کے سلسلے میں وہ سب کچھ کیا ہے۔ جو ایک شریف ترین مسلمان کو کرنا چاہئے تھا۔ یہ بچے سعید اور سعادت مند ہیں۔ ماشاء اللہ برسرِ روزگار ہیں۔ اللہ ان کو سلامت رکھے اور دن دوگنی رات چوگنی ترقی کریں۔ وہ اپنی والدہ کو تو بے نیاز کر ہی چکے ہیں مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی دوسری والدہ کو بھی نہ بھول لیں گے۔

آہ —— دوسری بیوی جو شوکت کے بڑھاپے کا سہارا تھی۔ جس کو میں نے ایک لمحہ بھی شوکت کی خدمت سے غافل نہیں دیکھا اور اس بیوی سے تین بچیاں ——!

شوکت کو بیماری کے عالم میں جس نے بھی دیکھا ہے، وہ شاہدِ عادل ہے کہ اپنی موت پر تو وہ ہنستا ہی تھا۔ بلکہ شاید عزرائیل کو بھی کوئی فقرہ چست کئے بغیر اُس نے نہ چھوڑا ہوگا۔ لیکن وہ روتا تھا۔ روتا کیوں تھا۔ اس لیے کہ اس بیوی کی بیچارگی اور ان تین بچیوں کی یتیمی اُس کو کھائے جا رہی تھی۔ میں نے اسی لیے اخبار جنگ کے ذریعے پاکستان کے اہلِ دل سے استدعا کی تھی۔ مگر اللہ کریم جو سننے والا ہے اُس نے سنی تو، لیکن بندے کے لیے بہتر کیا ہے جاننے والا بھی تو وہی ہے ——!

میر خلیل اور میر جمیل تک میری رسائی تھی۔ میں نے دیکھا کہ یہ دونوں بھائی جان مال ایمان کے ساتھ کوشاں رہے اور اب یتیم بیٹیوں اور ناچار بیوہ کے سلسلہ میں بھی جنگ کے ادارے کے ساتھ شوکت سے وابستگی سے بھی بہت زیادہ شوکت کی شخصیت اور

اس کی مخلصانہ رفاقت کا حق ادا کرنے میں کوئی دریغ نہیں فرما رہے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ دریغ نہیں فرمائیں گے۔ مجھ عاجز نے اور چند مجھ سے بہت بہتر لوگوں نے رائٹرز گلڈ کے ذریعے سے بھی قدردانیِ شوکت کی زنجیریں ہلائی ہیں اور توقع ہے کہ زندگی میں جس نے سبھی کو بہلایا اور ہنسایا ہو۔ وہ شوکت کی زہرہ اور شوکت کے تین کمسن ستاروں کو رونے کے لیے نہیں چھوڑیں گے۔

باقی رہ گئے ہم آپ شوکت کی ظریفانہ تحریروں سے لطف اور لذت لینے والے۔ ان کے تازہ بتازہ لطائف و ظرائف سے تو اب محروم ہو گئے لیکن ہمیں چاہیے کہ ان کی شائع شدہ کتابوں کو دوسرے لوگوں تک پہنچانے کے لیے سعیِ بلیغ کریں اور جو مضامین ابھی کتابی صورت اختیار نہیں کر سکے، ان کو کتابی صورت میں لانے والوں کو توجہ دلائیں۔ کیونکہ اہلِ قلم کی حالت تو یہی رہے گی کہ ؎

پگھلتی جائیں شمعیں اور جلتے جائیں پروانے
اسی کو اہلِ محفل گرمیِ محفل سمجھتے ہیں

شوکت تھانوی کی یادیں

فیض احمد فیض

شوکت تھانوی مرحوم یکایک محفل سے اُٹھ گئے۔ اس ہمدمِ دیرینہ کی جدائی پر احباب کے دل پر جو گزری سو گزری، لیکن ذاتی غم سے زیادہ اس بات کا دُکھ ہے کہ محفلِ وطن میں جہاں رُلانے کو بہت کچھ ہے۔ لیکن ہنسانے کو شوکت تھانوی تھے اور ان کی جگہ اب کون سنبھالے گا۔ برسوں سے اُن کا نام تکیۂ کلام کی صورت گھر گھر وردِ زبان تھا۔ یہ فقرہ، وہ لطیفہ وہ نقل۔ ہزار جگہ ہزار بات شوکت تھانوی سے روایت تھی۔ پھر اُن کے لطفِ صحبت پر مستزاد، آنکھ اوجھل یاد سے دُور، وہ بیسیوں محفلیں۔ بیسیوں صورتیں اور طرح طرح کے بزرگ بھی تھے۔ جنھیں مرحوم اپنی شعبدہ بازی سے دم بھر کو زندہ کر لیا کرتے تھے۔ لکھنؤ کا کوئی مشاعرہ۔ پورب کے کسی رئیس کی بیٹھک۔ دہلی میں کسی حکیم کا مطب۔ یہ ثاقب لکھنوی ہیں۔ یہ نوح ناروی ہیں۔ یہ احسن مارہروی ہیں۔ یہ فلاں حکیم صاحب ہیں۔ اور یہ فلاں نواب صاحب۔ شوکت مرحوم اپنے ممدوح کی نقل نہیں اتارتے تھے۔ خود ہی بن جاتے تھے۔ اور اس پر طرفہ یہ کہ جس صحبت کا تذکرہ کرتے اس کی فضا اُس کا سماں، اس کا پورا نقشہ آنکھوں میں گھوم جاتا یوں تھا کہ اُن کے دم سے صرف شوکت ہی ایک عالم زندہ تھا۔ اب جو وہ رخصت ہوئے تو ان اَن گنت محفلوں کا لطف بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ لیکن یہ تو ان کے گوناگوں کمالات کا بہت چھوٹا سا جزو تھا۔ اُن کی ذہین اور بوقلموں شخصیت نے جولانیٔ طبع کے لیے جو بھی میدان منتخب کیا اس میں یکساں جوہر دکھائے۔ نظم، نثر، تمثیل، افسانہ، شخصیت نگاری، نامہ نویسی، ریڈیو، صحافت، بذلہ سنجی، بدیہہ گوئی اُن کی طبع زبان اور قلم یکساں۔ ہر میدان میں یکساں طراری سے رواں رہتے۔ اُن کی ظرافت میں تکلف اور آورد کو دخل نہ تھا۔ بے تکلف اور بے تکان، جیسے بولتے ویسے لکھتے۔ نہ گفتار میں اُن کی طبع کو غیر حاضر پایا نہ تحریر میں کبھی انھیں قلم پر زور دیتے دیکھا اور اس مشاقی کا راز ریاضت نہ تھی، ان کی خداداد ذہانت تھی جو اکتساب کی محتاج نہیں ہوتی۔

شوکت مرحوم اپنی ہمعصر دنیا کے ان محسنوں میں سے تھے جنھیں زندگی کی آسائشوں میں بہت کم حصہ ملا لیکن وہ اپنے سوا سب کے لیے فرحت اور انبساط کے اسباب بہم کرتے رہے۔ اب جو وہ نہیں ہیں تو اپنی محرومی پر رنج ہے کہ ان کی باغ و بہار صحبت اب کبھی حاصل نہ ہو سکے گی اور اس سے زیادہ رنج ان کی محرومی پر ہے جو اس لطف سے کبھی بھی آشنا نہ ہو سکیں گے۔

افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

گوہرِ مخزنِ ظرافت

کنہیا لال کپور

شوکت تھانوی مرحوم جب تک بقیدِ حیات رہے۔ عوام اُن سے خوش اور نقّاد نالاں رہے۔ مؤخر الذکر کو مرحوم سے طرح طرح کی شکایتیں تھیں۔ مثلاً شوکت تھانوی شوکت تھانوی کیوں تھے؟ رشید احمد صدیقی۔ پطرس۔ عظیم بیگ چغتائی یا فرحت اللہ بیگ کیوں نہیں تھے؟ شوکت تھانوی عوام میں ہر دلعزیز کیوں تھے؟ شوکت مزاح نگار ہونے کے علاوہ فلسفی کیوں نہیں تھے؟ شوکت بسیار نویس کیوں تھے؟ شوکت ایم اے علیگ یا بی اے کینٹب کیوں نہیں تھے؟ بلاشک یہ سب خامیاں شوکت میں تھیں۔ لیکن اگر خدا لگتی کہی جائے تو وہ ان میں سے کسی خامی کے لیے مطلقاً ذمہ دار نہیں تھے۔ اگر وہ شوکت تھانوی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھے۔ تو یہ امر اُن کی خود اعتمادی اور دیانتداری پر دلالت کرتا ہے آخر یہ کہاں کی تنقید ہے کہ کسی مزاح نگار سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ اپنی انفرادیت کو ترک کر کے اپنے کو دوسروں میں مدغم کر دے۔

خدا کا شکر ہے کہ قریب قریب سب نقّاد اس بات پر متفق ہیں کہ شوکت عوام میں حد درجہ مقبول تھے۔ وہ شاید اس حقیقت سے بے خبر ہیں یا دیدہ و دانستہ اُس سے آنکھیں چُرانا چاہتے ہیں کہ شوکت خواص میں بھی اُتنے ہی ہر دلعزیز تھے۔ کیونکہ رؤسا۔ علماؔ اور ادبا بھی اُن کے اُتنے ہی مدّاح تھے جتنے کہ عوام۔ اب یہ اور بات ہے کہ اُن کی ہر دلعزیزی کا خمیازہ اُن کے مدّاحوں کو اُٹھانا پڑتا تھا۔ وہ جب بھی شوکت کی تازہ تصنیف خریدتے۔ اُن کا کوئی نہ کوئی دوست اُسے اُٹھا کر لے جاتا۔ مجھے اِس بات کا ذاتی تجربہ ہے کہ شوکت کی تصانیف، دیکھ کر سب کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ بسا اوقات یوں بھی ہُوا۔ کہ میری میز پر مشہور ادبا کی تازہ ترین تصانیف پڑی ہیں اُن میں سے دو ایک کا مصنّف شوکت بھی ہے۔ میرے احباب جن میں سبھی طرح کے لوگ شامل ہیں کسی اور کتاب کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے لیکن شوکت کی تازہ تخلیق پر اِس طرح جھپٹتے ہیں جیسے بھوکا آدمی خوانِ نعمت پر۔ اور اُن کی اِس حرکت کو دیکھ کر مجھے اُن پر غصّہ اور شوکت پر پیار آنے لگتا ہے۔ اور اُسی وقت فوراً مجھے ایک بھولا بسرا واقعہ یاد آ جاتا ہے۔

یہ شاید ۱۹۴۵ء کی بات ہے سعادت حسن منٹو۔ کرشن چندر اور میں کافی ہاؤس میں بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ ایک مشہور ناشر جو اپنی بھاری بھرکم جسامت کی وجہ سے مولوی اور پہلوان کا مرکب معلوم ہوتا تھا۔ ہماری میز کے قریب

آیا۔ علیک سلیک کے بعد اُس نے ہم تینوں سے درخواست کی "ہمیں بھی کبھی خدمت کا موقع دیجئے۔" منٹو نے طنزیہ انداز میں جواب دیا "بس آپ شوکت تھانوی کی کتابیں ہی چھاپا کیجیے۔" کرشن اور میں نے منٹو کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "منٹو صاحب ٹھیک فرما رہے ہیں۔" ایک لحظہ کے لیے ناشر دم بخود ہو گیا۔ اس کے بعد اُس نے ہم تینوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "گستاخی معاف۔ ایک بات عرض کر سکتا ہوں؟"

"ہاں ہاں بڑے شوق سے۔"

"آپ اپنے کو عظیم ادیب سمجھتے ہیں اور شاید عوام کے علمبردار بھی۔ لیکن معاف کیجئے گا آپ کی تصنیفات عوام نہیں خریدتے۔ کالج کے چھوکرے اور چھوکریاں خریدتی ہیں۔ لیکن وہ تو عوام میں سے نہیں ہیں۔ ادھر شوکت تھانوی کی تخلیقات کا یہ حال ہے کہ ہم صرف اُس کی نئی کتاب کے نام کا اعلان کرتے ہیں کہ پانچ ہزار جلدیں بک (BOOK) ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ آپ کی کسی کتاب کا ایڈیشن ایک ہزار سے تجاوز نہیں کرتا۔ شوکت تھانوی کچھ بھی ہوں۔ عوام کے ادیب ہیں۔ وہ عوام کے لیے لکھتے ہیں...... اچھا السّلام علیکم۔"

وہ کافی ہاؤس سے باہر چلا گیا۔ اور ہم تینوں پہ گویا برف گر گئی۔ دل ہی دل میں ہمیں شدید خفت کا احساس ہوا۔ کیونکہ اُس کی بات صداقت پر مبنی تھی۔ شوکت کو عوام سے اور عوام کو شوکت سے والہانہ عشق تھا۔ وہ صحیح معنوں میں عوامی ادیب تھے۔ اور ہم جو بزعم خویش اپنے کو عوام کا حمایتی سمجھتے تھے۔ اُن سے اتنے ہی دُور تھے جتنا کفر ایمان سے ہوتا ہے۔

شوکت کی یہی خوبی کچھ نقّادوں کے نزدیک اُن کی سب سے بڑی خامی ہے۔ میری رائے میں عوام کے لیے لکھنا جرم ہے، نہ گناہ۔ آج تمام اشتراکی ممالک میں عوام کے لیے لکھنا باعثِ فخر خیال کیا جاتا ہے۔ استالین (STALIN) نے ایک بار ادبا سے خطاب کرتے وقت ایک یونانی دیو کی مثال دی تھی۔ جسے کوئی شخص اُس وقت تک پچھاڑ نہیں سکتا تھا جب تک اُس کے پاؤں زمین کو چھوتے رہتے۔ آخر ایک پہلوان نے اُسے ہوا میں اُچھالا۔ اور اُس پر کاری وار کر کے اُس کا کام تمام کر دیا۔ استالین نے اس کہانی سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہا تھا "یاد رکھیے۔ وہ ادیب کبھی فنا نہیں ہو سکتا جس کے پاؤں زمین کو چھوتے رہیں گے۔" شوکت تھانوی خدانخواستہ اشتراکی ادیب تو نہیں تھے۔ لیکن انھوں نے ہمیشہ زمین سے اپنا رابطہ قائم رکھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ نقّادوں کی کڑی تنقید کے باوجود زندہ رہے۔ اور اپنی زندگی میں زندہ جاوید بھی ہو گئے۔

کچھ نقّادوں کو شکوہ تھا کہ شوکت کی ذہنیت خام تھی۔ اُن کا شعور ناپختہ تھا۔ وہ دوسرے یا تیسرے درجے کی چیزیں لکھا کرتے تھے۔ مجھے اس رائے سے بھی اتفاق نہیں۔ جو شخص اتنا کچھ لکھے چاہے وہ ٹیگور ہو منشی پریم چند یا اقبال ہو ہمیشہ اعلیٰ پائے کے ادب کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ ٹیگور کو ہی لے لیجیے۔ آپ کو اُس کے کلیات میں ایسی چیزیں مل جائیں گی جنھیں پڑھ کر آپ کا سر ندامت سے جھک جائے گا۔ خود ٹیگور نے اپنی مشہورِ عالم تصنیف "گیتا نجلی" کے بارے میں کہ جس پر اُسے نوبل پرائیز ملا لکھا ہے "میں یہ نظمیں رات کے وقت چھپ کر لکھا کرتا تھا۔ کیونکہ ان میں ادبیت کا فقدان

تھا۔ انھیں لکھتے وقت مجھے یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کسی نے آ کے دیکھ لیا تو،،

اِس میں مطلقاً شک نہیں کہ شوکت نے دوسرے یا تیسرے درجے کی چیزیں بھی لکھی ہیں۔ بعض اوقات بھلے چنگے مضامین میں فرسودہ یا عامیانہ اشعار بھی نقل کئے ہیں لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ انھوں نے اعلیٰ قسم کے ادب کی بھی تخلیق کی ہے۔ میرے اس دعوے کے ثبوت میں "مضامینِ شوکت"، "شیش محل"، "بارِ خاطر" اور "قاعدہ بے قاعدہ" پیش کی جا سکتی ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے "شیش محل" پہلی بار پڑھی تو میری ملاقات ایک نئے شوکت سے ہوئی۔ ایسا شوکت جو محض ایک فقرے کے شیشے میں پری اُتار سکتا تھا۔ اور جس کے اسلوبِ بیان کے ایجاز و اختصار کا یہ عالم تھا کہ اُس کا ایک ایک جملہ دوسروں کے پورے مضامین پر بھاری تھا۔ کوزے میں دریا کو بند کرنے کی بہتوں نے کوشش کی ہے۔ کہیں یا تو انھیں کوزہ میسّر نہیں آیا یا وہ "ذرا سی آبجو" کو "بحرِ بیکراں" کے ساتھ خلط ملط کرتے رہے۔ اِس محاورے کو عملی جامہ پہنانے کی سعادت صرف شوکت کے حصے میں آئی۔ اور اُن کے قلم سے اتنے خوبصورت پھول جھڑے۔ جن کی تازگی اور رعنائی ابد الآباد تک قائم رہے گی۔ 'بارِ خاطر' شوکت کا شاہکار ہے۔ میرا تو خیال ہے اگر وہ اِس کو لکھنے کے بعد اپنا قلم توڑ دیتے تو بھی محض اِس تصنیف کی بدولت اُن کا نام زندہ رہتا۔ "بارِ خاطر" سے زیادہ کامیاب تحریف ابھی تک نہیں لکھی گئی اور نہ مستقبل قریب میں اُس کے لکھے جانے کا اِمکان ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ شوکت کے طنز و مزاح میں شائستگی یا گہرائی نہیں۔ اُنھیں چاہیئے 'بارِ خاطر' کا بار بار مطالعہ کریں۔

عموماً دیکھا گیا ہے کبھی کبھی ایک اچھا مضمون مصنّف کے حق میں رحمت کی بجائے زحمت ثابت ہوتا ہے۔ اِسی قسم کا سانحہ شوکت کے ساتھ بھی پیش آیا۔ اُنھوں نے ایک مضمون بعنوان 'سودیشی ریل' لکھا۔ اور 'سودیشی ریل والے شوکت' کے لقب سے ادبی دُنیا میں مشہور ہوئے۔ اِس مضمون کے بعد اُنھوں نے سینکڑوں کامیاب مضامین لکھے جنھیں بیشتر نقادوں نے اِس بنا پر پڑھنے سے انکار کر دیا کہ سودیشی ریل سے بھلا بہتر مضمون اب شوکت صاحب کیا لکھیں گے۔ ایمان کی تو یہ ہے کہ 'سودیشی ریل' اُن کی ابتدا تھی نہ کہ انتہا۔ میں ایسے نقادوں کو بھی جانتا ہوں جنھوں نے 'سودیشی ریل' بھی نہیں پڑھا۔ لیکن جو اِس امر کے باوجود یہ فتوے صادر کرنے کو تیار رہیں کہ شوکت کا مزاح سطحی ہے۔ تنقیدی سطحی پن کی اِس سے بدتر مثال مشکل سے ملے گی!

اور پھر وہ نقاد ہیں جو تنہائی میں شوکت کے مضامین مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ لیکن کھلے بندوں اُس کی مذمّت کرتے ہیں کیونکہ ایسا کرنا فیشن میں داخل ہے ان لوگوں پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

جناب شیخ نے جب پی تو منہ بنا کے کہا
مزہ بھی تلخ ہے کچھ بُو بھی خوشگوار نہیں

شوکت صاحب تعریف و تنقیص سے بے نیاز تھے۔ میں نے اُنھیں کبھی کسی نقاد کی شکایت کرتے نہیں سنا۔ وہ جانتے تھے کہ سب سے بڑا نقاد "وقت" ہے اور اگر وہ اُن کے مضامین پر سبحان اللہ کے ڈونگرے برسا رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آنے والی نسلیں اُنھیں فراموش کر سکیں گی۔ اُنھیں نہ کرم کی خواہش تھی نہ ستم کا شکوہ۔ فطرتاً وہ ظریف اور

بذلہ سنج واقع ہوئے تھے اور اُنھیں خیال۔ واقعہ یا کردار سے مزاح پیدا کرنے کے فن میں قابلِ رشک مہارت حاصل تھی چونکہ اُنھوں نے کسی مغربی ادیب کا تتبع نہیں کیا اس لیے اُن کی ظرافت کے تیور سو فیصد مشرقی تھے۔ اُن کے تمسخر کا طرۂ امتیاز دل جوئی تھا۔ دل شکنی نہیں۔ وہ نہ کسی "ازم" (ISM) سے تعلق رکھتے تھے اور نہ اُنھوں نے کبھی اپنے طنز و مزاح کو اصلاح و تربیت کا ذریعہ بنایا۔ اُن کی زندگی کا مقصد زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ وقت کے لیے ہنسانا تھا۔ وہ مجسم "اودھ پنچ" تھے۔ اور شاید اسی لیے "اودھ پنچ" کی شان میں کہا گیا اکبر الہ آبادی کا قصیدہ مدحیہ شوکت کا بہترین مرثیہ ہے:۔

اے گوہرِ مخزنِ ظرافت وے جوہرِ معدنِ لطافت
سرمایۂ انبساطِ خاطر تسکینِ دل و نشاطِ خاطر
دیباچۂ دفترِ فصاحت عنوانِ صحیفۂ بلاغت
رنگینی میں غیرتِ گلستاں شوخی میں حریفِ برقِ تاباں
معقول مزاح ہے تو یہ ہے شرعاً مباح ہے تو یہ ہے
ہے خلقِ خدا قتیل اِس کی حاسد کا حسد دلیل اِس کی
ہر کس کہ بدید گفت خوب است باللہ مفرحِ القلوب است

صاحبِ طرز ادیب

سیّد ہاشم رضا

شوکت تھانوی کو مرحوم کہتے ہوئے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے جب وہ راولپنڈی کلب کی ایک تقریب میں جو عید الفطر کے سلسلے منعقد کی گئی تھی بلبلِ ہزار داستان کی طرح چہک رہے تھے میں نے ان کے عید کارڈ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے کارڈ کی طباعت، ضخامت اور نفاست دیکھ کر گمان گزرا کہ یہ کسی والیٔ ریاست کا کارڈ ہے تو کہنے لگے کہ ہاں مجھے محسوس بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے آتش کا شعر پڑھا ؎

بدن سا شہر نہیں دل سا بادشاہ نہیں
حواسِ خمسہ سے بڑھ کر کوئی سپاہ نہیں

اس دن جب یہ خوش گپیاں ہو رہی تھیں، کسے خبر تھی کہ ان کے حواسِ خمسہ کی سپاہ میں ایسی افراتفری پیدا ہو چکی تھی کہ ان کا آخری وقت عید قربان کے ایک دن پہلے ہی آجائے گا۔ ان کی بیماری کی خبریں اخباروں میں پڑھیں لیکن اس کی اہمیت کا اندازہ آج سے پہلے نہ ہوا اور آج جبکہ بہت سے دلوں میں اُن کی یاد میں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے اُن کی شخصیت کا بھی اندازہ ہو رہا ہے، اُن کی ذات ایک انجمن تھی۔ وہ شاعر بھی تھے اور ادیب بھی، نواسنج بھی تھے اور بذلہ سنج بھی۔ حقیقت نگار بھی تھے اور افسانہ نگار بھی۔ ڈرامہ نویس بھی تھے اور ایکٹر بھی، قصہ گو بھی تھے اور تمثیل نگار بھی۔ انھوں نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی، قطعات بھی کہے اور مرثیے بھی، ان کی نثر اور نظم میں ایک چیز جو سب سے زیادہ نمایاں تھی وہ ان کی اسٹائل تھی۔ صد حیف کہ آں ساقی نماند و آں قدح بشکست۔

ان کی تصنیف میں ہندوستان اور پاکستان کی بہترین روایات اور قدروں کا تذکرہ ملے گا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ملک اور ملت کی کمزوریوں کا بھی پتہ چلے گا۔ "سودیشی ریل" کی روانی کو کون پڑھنے والا بھلا سکے گا۔ "قاضی جی" کی شگفتہ بیانی کو کون سننے والا بھول سکے گا۔

انھوں نے جنت نگاہ اور فردوسِ گوش دونوں کے لیے سامان مہیا کیا۔

اُن کی وفات کی خبر سُن کر مجھے ایک اور صاحبِ طرز کی یاد آئی یعنی ظریف لکھنوی۔ ان کے دمِ آخر کا نقشہ ان کے بھائی مُتقی لکھنوی نے یوں کھینچا تھا۔ ؎

جو اُٹھ نہ سکتا بے سہارے وہ شورِ محشر اٹھا کے اُٹھا
ستم ظریفی تو دیکھئے گا، ہنسانے والا رُلا کے اُٹھا

اور بالکل یہی تاثر شوکت تھانوی کی موت کا بھی ہے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے اور جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

شوکت تھانوی

شاہد احمد دھلوی

خدا بخشے شوکت تھانوی اُن لوگوں میں سے تھے جو روتوں کو ہنساتے تھے۔ ان کی ہر بات ایک لطیفہ ہوتی تھی، عجب زعفرانِ زار شخصیت تھی مرحوم کی۔ چُلبلے آدمی تھے، نچلے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ان کی رگوں میں خون کے بدلے پارہ دوڑتا تھا۔ تُرت پھُرت، یہ آئے وہ گئے۔ آدمی کیا تھا چھلاوا تھا۔ بڑی جان تھی مرنے والے میں۔ یقین نہیں آتا کہ وہ ہمیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔ اب بھی وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ بھلا جس میں اتنی زندگی اور زندہ دلی ہو وہ کیسے مر سکتا ہے؟ مگر یقین کرو یا نہ کرو شوکت واقعی مر گیا۔ روتوں کو ہنسانے والا ہنستوں کو روتا چھوڑ گیا۔ میں اس کے حد سے بڑھے ہوئے خلوص کو دیکھ کر کہا کرتا تھا "دیکھ لینا یہ شخص ایک نہ ایک دن ایسا دھوکہ دے گا کہ بلبلاتے ہی رہ جاؤ گے۔ دیکھ لیا نا؟ بتیس سال کے تعلقات کا ذرا سا بھی خیال نہیں کیا اور اکیلا ہی سدھار گیا۔ ایسی بھی کیا جلدی تھی؟ ساتھ ہی چلتا۔ ہر کام میں جلدی، زندگی میں بھی جلدی، مرنے میں بھی جلدی ـــ

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

شوکت تھانوی کا نام پہلی بار اُس وقت سُنا جب ۳۵ سال اُدھر کسی نے بتایا کہ "نیرنگ خیال" کے سالنامہ میں ان کا ایک مضمون "سودیشی ریل" پڑھنے کے لائق چھپا ہے۔ رسالہ منگا کر پڑھا، واقعی طبیعت پھڑک گئی۔ اب بھی جب کبھی وہ مضمون یاد آجاتا ہے تو ہنسی آجاتی ہے۔ جب اِس مضمون کی شہرت عام ہوئی تو کسی حاسد نے پتہ چلایا کہ کسی انگریزی اخبار میں کوئی مضمون چھپا تھا، یہ مضمون اُس کا ترجمہ ہے۔ ہمیں بھی اس کی ٹوہ لگ گئی۔ اصل مضمون کا تراشہ حاصل کیا۔ ترجمہ تو ترجمہ اِن دونوں مضمونوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں تھی۔ بہت سے بہت یہ کہا جا سکتا تھا کہ مرکزی تصور اُس مختصر خاکے سے لیا گیا تھا۔ شوکت تھانوی نے اِس تصور کو اپنے رنگ میں اِس خوبی سے پیش کیا تھا کہ یہ سولہ آنے (یا سو پیسے؟) انہی کی تخلیق ہو گئی تھی۔ اور جو خوردہ گیری ہی پر آئے تو شیکسپیئر کا کونسا ڈرامہ طبعزاد کہلانے کا مستحق ٹھہرے گا؟ یونہی چراغ سے چراغ جلتا چلا آیا ہے، اور بڑا فن کار غاصب ہی ہوتا ہے۔

اس مضمون کے لکھنے سے پہلے بھی شوکت تھانوی بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ پہلے لکھنؤ کے ایک اُردو اخبار میں کالم لکھتے

تھے، پھر دو اخباروں میں لکھنے لگے تھے۔ میر جالب دہلوی کے "ہمدم" میں ان کے ادبی ذوق نے تربیت پائی۔ ان کے والد ایک بڑے پولیس افسر تھے۔ اسکول کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد شوکت آسانی کے ساتھ سب انسپکٹر بھرتی ہو سکتے تھے مگر جو شعر و ادب کے چکر میں پڑ جاتے ہیں وہ پھر کسی اور کام کے کب رہ جاتے ہیں؟ بچپن باپ کے ساتھ کم اور بڑی بہن کے ساتھ زیادہ گزرا۔ یہ بڑی بہن خود بھی ادبی ذوق رکھتی ہیں اور یہ خاتون وہ ہیں جن کے شوہر نامدار مولانا ارشد تھانوی ہیں جو شوکت تھانوی کے چچا زاد بھائی بھی ہیں۔ چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں بڑے میاں سبحان اللہ! ان کے سایۂ عاطفت نے شوکت کو شاعر، ادیب، اور تھانوی، سبھی کچھ بنا کر چھوڑا۔ ورنہ تھانہ بھون سے شوکت کا کیا تعلق؟ پیدا بنارس میں ہوئے، پلے بڑھے بھوپال اور لکھنؤ میں۔ اصل نام تھا محمد عمر، تخلص شوکت اختیار کیا اور اپنے بزرگ بھائی کی دیکھا دیکھی تھانوی کا لاحقہ اس میں ٹانک لیا۔ اسی لاحقہ کی وجہ سے پطرس کہا کرتے تھے کہ "خدا جانے کس تھانہ سے ان کا تعلق ہے؟" بڑوں کی بھول چوک پر پردہ ڈال دینا عین سعادت مندی ہے۔ محمد عمر کو اب کوئی نہیں جانتا، شوکت تھانوی کو سب جانتے ہیں۔ ۶

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

۳۲ء کے اوائل میں ایک دن صبح ہی صبح اطلاع ملی کہ دو صاحب ملنے آئے ہیں۔ نام پوچھے تو نام نہیں بتائے۔ ان کی یہ بد اخلاقی طبیعت کو ناگوار گزری۔ میں نے کہا مردانہ گھر کی بیٹھک میں انھیں بٹھاؤ۔ میں اسی وقت اٹھا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ انھیں اتنے سویرے آنے اور نام نہ بتانے کی سزا دینی چاہیئے۔ چنانچہ منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا اور آدھ گھنٹہ بعد مردانے میں آیا۔ دونوں انتظار میں سوکھ گئے تھے۔ میرے داخل ہوتے ہی وہ سروقد کھڑے ہو گئے۔ یہ دو نوجوان تھے جنھیں دیکھ کر ڈپٹی نذیر احمد کے مرزا ظاہر دار بیگ یاد آ گئے۔ دونوں چھیلا بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک جو زیادہ چرباک تھے ذرا آگے بڑھ کر بولے "ہمیں پہچانیئے۔"

میں نے سر سے پاؤں تک انھیں دیکھا۔ آڑی مانگ نکلی ہوئی، کسی قدر تنگ پیشانی، گول چہرہ، آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک، شریر بے قرار آنکھیں، موزوں بینی، لبوں پر پان کی ہلکی سی سرخی، تراشی ہوئی مونچھیں، ڈاڑھی گھٹی ہوئی، بے شکن اچکن، چست پاجامہ، وارنش کا پمپ شو، داہنے ہاتھ میں پتلی سی چھڑی۔ ان کی تصویریں دیکھ چکا تھا۔ میں نے کہا — "شوکت تھانوی"۔ مسکرا کر بولے "آپ نے ٹھیک پہچانا۔" یہ کہہ کر معانقہ کیا۔ پھر اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کر کے بولے "اور یہ؟" میں نے انھیں بھی سر سے پیر تک جانچا۔ تقریباً ایک ہی سا حلیہ تھا دونوں کا، سوائے اس کے کہ ان کے چہرے پر عینک نہیں تھی۔ میں نے کہا "یہ آپ کے نفسِ ناطقہ نسیم انہونوی ہو سکتے ہیں۔" شوکت نے کہا "بھئی خوب اندازہ لگایا۔" نسیم صاحب بھی آگے بڑھ کر گلے ملے۔ ان کا پرچہ "حریم" نکلتا تھا اور رسالے کے تبادلہ میں آتا تھا۔ اب شوکت اور نسیم دونوں نے مل کر "سرپنچ" ایک مزاحیہ اخبار (ہفتہ وار) نکالنا شروع کیا تھا۔ نسیم صاحب بھی مضامین لکھتے تھے مگر کوئی مضمون ان کا مشہور نہیں ہوا تھا۔ محنتی آدمی تھے۔ ان کی محنت اور شوکت کی ذہانت نے مل کر بڑا کام کیا۔ اور اب تو خود نسیم صاحب بھی ایک بھاری بھرکم مصنف ہیں۔

جاڑوں کے دن تھے، میں نے ان حضرات سے کہا کہ آپ کل صبح ہمارے ساتھ نہاری کھائیے۔ یہ دلّی کی ایک خاص چیز ہے اور دلّی والے ہی اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ مگر اس کے کھانے کا لطف علی الصباح کا ہے۔ اس لیے آپ حضرات چھ بجے آجائیے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اپنے ماموں چشتی صاحب سے کہا کہ کل صبح کے لیے نہاری کا انتظام کر دیجیے۔

میں خود چونکہ رات کو دیر سے سوتا ہوں اس لیے صبح دیر سے اٹھتا ہوں۔ اس دن الارم لگا کر اٹھا۔ چشتی صاحب نہاری کا دیگچہ اور دوسرے لوازم لیے ہوئے چھ بجے سے پہلے پہنچ گئے۔ انگیٹھی دہکائی گئی۔ اس پر گھی کڑکڑایا گیا۔ نہاری پر سے تام اُتار کر الگ کر دیا گیا اور جب گھی میں پیاز سُرخ ہو گئی تو پیاز الگ ایک پیالے میں نکال لی اور گھی سے نہاری کو داغ دیا۔ چھ بجے، ساڑھے چھ بجے، سات بجنے لگے۔ چشتی صاحب نے کہا "بھئی تمہارے مہمان نہیں آئے"۔ میں نے کہا "لکھنؤ والے ہیں، تکلف میں کہیں رہ گئے۔ بس آتے ہی ہوں گے"۔ لو صاحب، سات بھی بج لیے، ساڑھے سات ہونے کو آئے۔ انتظار میں طبیعت بڑی بدمزہ ہوئی۔ جوانی کی ترنگ، اُس زمانے میں مَیں ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ جب آٹھ بجے تو میرا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے چشتی صاحب سے کہا "ماموں جان، یہ سارا سامان زنانہ میں بھیج دیجیے"۔ وہ گھبرا کر بولے "کیوں میاں کیوں؟ تھوڑا سا انتظار اور کر لو"۔ مگر میرا پارہ چڑھ چکا تھا۔ میں نے کہا "اب اگر وہ آئیں گے بھی تو میں نہیں کھلاؤں گا"۔ ماموں جان نے کہا "یہ بڑی نامناسب بات ہوگی"۔ مگر میں نے سارا سامان اُٹھوا کر اندر بھیج دیا اور خود بھی اندر چلا گیا۔

کوئی نو بجے دونوں حضرات تشریف لائے۔ مجھے اطلاع ہوئی کہ مہمان آ گئے۔ میں نے بیوی سے کہا "چائے اور پان بھیج دینا"۔ انھوں نے پوچھا "اور نہاری؟" میں نے کہا "اب وہ نہاری کہاں رہی، وہ تو باسی قورمہ ہو گیا۔ اسے مت بھیجنا"۔ انھوں نے سر کو حرکت دی جیسے کہہ رہی ہوں "عجب اوندھی مت کا آدمی ہے؟" اور باورچی خانہ میں خاموش چلی گئیں۔

میں مردانے میں آیا تو شوکت صاحب نے کہا "ہمیں کچھ دیر ہو گئی"۔ میں نے کہا "جی ہاں۔ ع

حریفاں بادہا خوردند و رفتند"

بولے "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ سے ملانے کے لیے جن احباب کو بُلایا تھا انھوں نے دو گھنٹے تک آپ کا انتظار کیا۔ اس کے بعد کھا پی کر رخصت ہو گئے"۔

"یعنی نہاری ختم؟"

"جی ہاں۔ دلّی کے شرفا سورج نکلنے سے پہلے ہی نہاری کھا چکتے ہیں۔ ویسے بازاروں میں مزدوروں اور کام پیشہ لوگوں کے لیے دن چڑھے تک بکتی رہتی ہے"۔

"یہ تو بُرا ہوا"۔

"وقت کی پابندی نہ کرنے کا نتیجہ بُرا ہی ہوتا ہے۔ اب آپ کچھ اور باتیں کیجیے۔ کہیے کل کس کس سے ملے؟"

شوکت صاحب نے بتایا کہ سردار دیوان سنگھ، ایڈیٹر ریاست سے ملے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب سے ملے اور پروفیسر اکبر حیدری سے ملے جو اس قدر تپاک سے ملے کہ گھنٹوں اُن سے باتیں ہوتی رہیں۔ حکیم یوسف حسن صاحب ایڈیٹر نیرنگ خیال

بھی انہی کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُن سے بھی ملاقات ہوئی اور رات کے کھانے پر بھی پروفیسر صاحب نے انھیں مدعو کر دیا۔

یہ پروفیسر صاحب تھے تو دراصل انبالہ کے مگر دلّی ہی میں آ کر بس گئے تھے۔ اُس زمانے میں بعض لوگ گوروں کو اردو پڑھایا کرتے تھے اور منشی کہلاتے تھے۔ سب سے پُرانے منشی اُستاد بیخود دہلوی تھے۔ وہ اپنی کبرسنی کے باعث اِس پیشے کو چھوڑ چکے تھے۔ اکبر حیدری اچھے وجیہہ آدمی تھے۔ ان کی تعلیم شاید اسکول تک ہی محدود رہی تھی مگر اپنی ذہانت اور جوڑ توڑ سے اس پیشے میں گھُس گئے تھے اور اپنے ایک ہم پیشہ سسرالی عزیز کے سہارے بڑھتے چلے گئے اور اُنھی کی طرح گوروں کے لیے دو ایک کتابیں بھی لکھ دی تھیں جو کورس میں داخل ہو جانے کی وجہ سے خوب بکتی تھیں۔ چنانچہ منشی اکبر خاں دِلّی میں آنے کے بعد چند سال کی لوٹ پھیر میں خاصے مالدار ہو گئے تھے اور کچھی والاں میں ان کا ایک عمدہ مکان بھی بن گیا تھا۔ شعر اچھے خاصے کہہ لیتے تھے اور غمّاز کے نام سے ایسی نثر بھی لکھ لیتے تھے جس میں کسی کو بُرا بھلا کہنا ہو۔ نوّل کے ساتھ ان کے تعلقات بھی وسیع ہوتے چلے گئے تھے اور وہ پروفیسر اکبر حیدری مشہور ہو گئے تھے۔ ویسے طبیعت کے بھلے آدمی تھے اور ملنے جلنے میں خوش اخلاق تھے۔ ہم سے بھی ان کی یاد اللہ تھی مگر ہم سے اُن کی میزان نہیں پٹتی تھی۔

شوکت صاحب نے بتایا کہ رات کو ہم ان کے ہاں دعوت میں گئے تو وہاں دو اور ایڈیٹروں سے بھی ملاقات ہوئی۔ ایک نیرنگ کے اڈیٹر عشرت رحمانی تھے اور دوسرے اخبار ریاست کے سب ایڈیٹر حنیف ہاشمی۔ حکیم یوسف حسن صاحب اُس زمانے میں جتنے تنومند اور قوی الجثہ آدمی تھے حنیف ہاشمی اُسی قدر اعصابی اور نحیف الجثہ۔ اچھی خاصی باتیں ہو رہی تھیں کہ حنیف ہاشمی پنجاب اور یوپی کا قضیہ لے بیٹھے۔ اکبر حیدری انبالہ کے تھے، نہ اِدھر کے اور نہ اُدھر کے بلکہ بین بین۔ بچارے بار بار اِس بحث کو ختم کرنے کی کوشش کرتے مگر حنیف ہاشمی کانپ کانپ کر اور لرز لرز کر پھر کچھ کہہ بیٹھتے۔ اِدھر یہ دونوں بھی کچھ کم بولنے والے نہیں تھے۔ پہلے تو اُنھوں نے کچھ ٹالا مگر جب وہ حد سے بڑھنے لگے تو یہ بھی لپٹ پڑے۔ غرض شوکت صاحب نے بتایا کہ فضا اتنی مکدّر ہو گئی کہ ہم وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے مگر اکبر حیدری نے پکڑ کر بٹھا لیا اور فوراً کھانا منگوا لیا مگر دلوں میں غبار بھرا ہوا تھا، کھانا کیا خاک کھایا جاتا؟ دو چار لقمے زہر مار کر کے وہاں سے پیچھا چھڑایا۔

میں نے کہا "مجھے یہ رُوداد سُن کر مطلق تعجب نہیں ہوا۔ اکبر حیدری جب اکیلے ہوتے ہیں تو نہایت معقول باتیں کرتے ہیں۔ مگر جب دو چار ادیب یا شاعر اُن کے ہاں جمع ہو جاتے ہیں تو پھر ایسے ہی ہنگامے ہوتے ہیں۔ اُن کے گھر کی رونق ہی ہنگاموں پر موقوف ہے۔"

اتنے میں چائے آ گئی۔

شوکت صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا "تو کیا واقعی نہاری نہیں ملے گی؟"

میں نے کہا "نہاری اب آئندہ کسی اور موقعہ پر۔ اب تو آپ چائے پیجیے اور پان کھائیے۔"

اس واقعہ کے بعد شوکت صاحب میری طبیعت سے واقف ہو گئے۔ مجھ سے وہ عمر میں دو تین سال بڑے تھے

مگر وہ مجھے ہمیشہ شاہد بھائی ہی کہتے رہے۔ وہ بڑے بڑوں پر فقرے کس جاتے تھے مگر انھوں نے میرے ساتھ کبھی مسخراپن نہیں کیا۔ مذاق البتہ ہوتا رہتا تھا۔

شوکت تھانوی سے میرے تعلقات اڈیٹر اور مضمون نگار کے بھی تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بے معاوضہ نہیں لکھتے۔ لہٰذا جب کبھی اُن سے مضمون لکھوانا ہوتا تھا تو انھیں معاوضہ منی آرڈر سے بھیج دیا جاتا تھا۔ اور اُس زمانے میں معاوضہ ہی کیا ہوتا تھا؟ دس روپے۔ منشی پریم چند پندرہ روپے فی افسانہ لیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ کسی نے پندرہ روپے انھیں دیتے ہیں تو اُن پر بڑا احسان کیا ہے۔ سو دو سو میں شوکت تھانوی اپنا ناول دینے پر تُلے رہتے تھے۔ ایک دفعہ آغا شاعر خوش کو زبردستی اپنا مسودہ دے کر کچھ روپے لے گئے۔ آغا صاحب نے پوچھا اس کا نام کیا ہے؟ کہا "جو جی چاہے نام رکھ لو"۔ آغا صاحب کو شوخی سوجھی۔ کتاب کے ٹائٹل پر ایک گیدڑ بنوایا اور اُس گیدڑ کا چہرہ شوکت تھانوی کا بنوایا۔ گیدڑ کو پنجرے میں بند دکھایا اور کتاب کا نام رکھا "مجھے خرید لو"۔ یہ ادب کے عروج اور ادیبوں کی پستی کا وہ زمانہ تھا کہ اچھے خاصے مشہور ادیب اپنے مسوّدے کے ساتھ دو دو سو روپے بھی دیتے تھے کہ للّٰہ ہماری کتاب اپنے مکتبہ سے چھاپ دو۔

شوکت تھانوی میں خوبی کہیے یا عیب یہ تھا کہ اُن کے کسی کام میں اُستواری نہیں تھی۔ وہ اتنے بڑے آدمی تو تھے نہیں کہ زمانے کو اپنے ساتھ کر لیتے، اس لیے وہ زمانے کے ساتھ ہو جایا کرتے تھے۔ جب دلّی سے آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام ہونے لگے تو ایک دفعہ شوکت صاحب کو بھی تقریر کرنے کے لیے بُلایا گیا۔ اِسے انھوں نے اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھا۔ اُس زمانے میں احمد شاہ بخاری (پطرس) اسٹیشن ڈائریکٹر تھے اور ذوالفقار بخاری ڈائریکٹر پروگرام۔ شوکت صاحب ان دونوں بھائیوں سے مرعوب ہو گئے، کچھ کور بھی دبتی تھی۔ ایک ایک سے ان کی تعریف کرتے پھرتے تھے، اور لکھنؤ واپس پہنچنے کے بعد انھوں نے ایک اُردو اخبار میں (جس سے وہ وابستہ تھے) اِن دونوں بھائیوں کا نثری قصیدہ لکھا اور اس کا تراشہ انھیں بھیج دیا۔ اس کے صلہ میں انھیں دِلّی مزید پروگراموں کے لیے بُلایا گیا اور جب لکھنؤ میں ریڈیو اسٹیشن کھلا تو انھیں مسودہ نویس کی حیثیت سے رکھ لیا گیا۔ ریڈیو میں انھیں اخبار کے مقابلے میں دُگنی بلکہ تگنی تنخواہ مل گئی اور ان کے دلدّر دُور ہو گئے۔ اخبار نویسی نے انھیں زُود نویس بنا دیا تھا۔ ذہین آدمی تھے، فیچر اور ریڈیو ڈرامہ کی تکنیک کو سمجھ لینے کے بعد انھوں نے لکھ لکھ کر مسودوں کے ڈھیر لگا دیے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور صلاحیت کا بھی انکشاف ہُوا کہ ریڈیائی اداکاری اچھی کر سکتے تھے۔ نقّالی کا مادّہ تو ان میں شروع ہی سے تھا، کئی طرح کی آوازیں بنانے پر بھی قادر ہو گئے۔ لکھنے میں انھیں کوئی تکلّف نہ ہوتا تھا، قلم برداشتہ لکھتے تھے، اچھا لکھتے تھے اور خوش خط تھے۔ میں نے ان کے مسوّدے دیکھے ہیں۔ ایک لفظ بھی نہیں کاٹتے تھے اور سطریں موتی کی لڑیاں دکھائی دیتی تھیں۔ لکھنؤ سے انھوں نے اپنا ایک ہفتہ وار فیچر "منشی جی" شروع کیا جس میں کسی معاشرتی خرابی یا وقت کے کسی اہم موضوع پر بڑی دلچسپ بحث ہوتی تھی۔ کئی سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور نہایت کامیابی کے ساتھ۔ جب پاکستان بن گیا تو "منشی جی" نے "قاضی جی" کا روپ دھار لیا۔ یہ فیچر لاہور سے شروع ہوا، پھر شوکت صاحب کراچی آ گئے تو یہاں سے نشر ہونے لگا۔ اور جب وہ راولپنڈی چلے گئے تو راولپنڈی سے۔ اس ہفتہ وار فیچر کی روحِ رواں قاضی جی تھے جن کا پارٹ خود شوکت صاحب ادا کرتے تھے۔ مدتوں

تک اکثر سننے والوں کو نہیں معلوم ہوا کہ قاضی جی کی صداکاری کون کرتا ہے۔ قاضی جی ایک کھوسٹ بڑے میاں تھے جو احمقوں کی جنت میں رہتے تھے مگر ہر معاملہ میں اپنی رائے ضرور دیتے تھے۔ ان کے پوپلے منہ سے جو باتیں نکلتی تھیں بھولی بھولی اور مضحکہ خیز ہوتی تھیں۔ شوکت صاحب کو قاضی جی کی آواز بنانے میں کمال حاصل تھا۔ اس کمال کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے نقال پیدا ہو گئے تھے، اور محفلوں میں جو مسخرے نقلیں پیش کرتے تھے وہ قاضی جی کی نقلیں بھی بنانے اور سنانے لگے تھے۔ شوکت صاحب نے منشی جی اور قاضی جی کے سینکڑوں مسودے لکھے اور میں نے بھی ان کے بیسیوں براڈکاسٹ سنے۔ میں نے ان میں سے ایک کو بھی بھرتی کا فیچر نہیں پایا۔ سب میں ایک ہی جیسی شگفتگی اور تازگی پائی۔

یہی کیفیت ان کی کالم نویسی کی تھی۔ مجید لاہوری کے انتقال کے بعد شوکت صاحب اخبار جنگ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ وہاں انھیں روزانہ ایک مزاحیہ کالم "وغیرہ وغیرہ" لکھنا ہوتا تھا اور ہفتہ میں دو ایک اداریے بھی۔ نواب سعادت علی خان نے انشاء اللہ خاں سے فرمائش کی تھی کہ دو لطیفے روز سنا دیا کرو تو چند روز میں انشا کا یہ عالم ہو گیا کہ ایک ایک سے کہتے "کوئی نقل کوئی چٹکلا یاد ہو تو بتاؤ، میں لون مرچ لگا کر نواب کو خوش کر لونگا۔" شوکت کا شگفتہ رقم قلم روزانہ چلتا رہا اور ظرافت کے پھول کھلاتا رہا۔ پنڈی جانے کے بعد پورے اخبار کی ذمہ داری بھی ان پر عائد ہو گئی تھی مگر وہ "پہاڑ تلے" کے عنوان سے کالم برابر لکھتے رہے۔ اداریے کے علاوہ بھی وہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ مثلاً انھوں نے اپنی آپ بیتی لکھنی شروع کر دی تھی۔ افسوس کہ اس کی چند قسطیں ہی چھپنے پائی تھیں کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

پاکستان بننے سے شاید دو ڈھائی سال پہلے وہ دگنی تنخواہ پر پنچولی فلم کمپنی، لاہور میں مکالمہ نویسی کے لیے چلے گئے تھے۔ اس کمپنی میں انھوں نے سید امتیاز علی تاج کے ساتھ کام کیا۔ فلم کا سینار یو بے تکلف لکھنے لگے تھے۔ یہیں ایک فلم میں انھوں نے اداکاری بھی کی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد۔ ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

تاج صاحب کے ساتھ وہ بھی لاہور ریڈیو میں آ گئے تھے۔ پاکستان کے تعمیری پروگرام میں انھوں نے "قاضی جی" لکھنا شروع کیا تھا اور سب سے زیادہ مقبول پروگرام انہی کا ہوتا تھا۔

"یک در گیر و محکم گیر" کے شوکت صاحب قائل نہیں تھے۔ پیسے کے میت تھے۔ جس کام میں پیسہ زیادہ ملتا دکھائی دیتا اسی کو اختیار کر لیتے۔ کالم نویسی سے ان کی عملی زندگی کا آغاز ہوا۔ وہاں سے ریڈیو میں آ گئے۔ ریڈیو چھوڑ کر پچھلی بڑی جنگ کے زمانے میں سانگ پبلسٹی کے محکمے میں چلے گئے۔ وہ محکمہ ختم ہوا تو پنچولی فلم کمپنی میں آ گئے، وہ بند ہوئی تو پھر ریڈیو میں آ گئے۔ پھر جنگ اخبار میں چلے گئے۔ پیسہ انھوں نے خوب کمایا، مضامین سے، کتابوں سے، ریڈیو سے، اخباروں سے، مشاعروں سے، مگر کبھی انھیں خرچ کرتے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ اپنے آپ کو تنگ دست ظاہر کرتے تھے۔ پان کی ڈبیا تو وہ ضرور اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ سگریٹ تک وہ نہیں پیتے تھے۔ سینما، تھیئٹر، کلب، سیر سپاٹا، دعوتیں، ہوٹل بازی، یا کوئی اور بازی، کچھ نہیں۔ البتہ بڑے آدمیوں کے ساتھ لگے رہنے کا شوق تھا، اور انہی کے ساتھ ان کے شوق پورے ہو جاتے تھے۔

شوکت تھانوی کا کمزور پہلو ان کی شاعری تھی۔ وہ ساری عمر شعر کہتے رہے۔ آسی الدنی کی انھوں نے شاگردی بھی اختیار کی۔ مشاعروں میں بھی اپنا کلام سُنایا کرتے تھے، کوئی ۲۵ سال ہوئے انھوں نے اپنے منتخب کلام کا مجموعہ "گہرستان" کے نام سے شائع کیا تھا مگر شاعر کی حیثیت سے انھیں کوئی نمود حاصل نہیں ہوئی۔ شعر کلامِ موزوں کے علاوہ اور بہت کچھ ہوتا ہے۔ یہ "اور بہت کچھ" شوکت کے کلام میں نہیں تھا۔ چند سال سے انھوں نے مزاحیہ اشعار اور طنزیہ نظمیں بھی کہنی شروع کر دی تھیں۔ یہ اثر تھا سیّد محمد جعفری کی صحبت کا جن کے ساجھے میں بھی انھوں نے دو ایک نظمیں کہی ہیں، مگر ان میں بھی وہی آورد اور بے رنگی ہے جو ان کے سنجیدہ کلام کا عیب ہے۔ شوکت صاحب کا معاملہ کچھ اکبر الہ آبادی سے ملتا جلتا تھا۔ اکبر کی شاعری کا آغاز سنجیدگی سے ہُوا۔ مدتوں اس بحر میں شناوری کرتے رہے مگر حاصل کچھ نہ ہُوا۔ پھر ایک بار اتفاق سے غوطہ مار کر جو نکلے دُرِ مقصود ہاتھ آ گیا۔ یہ موتی تھے طنز و مزاح کے جن کی مانگ چاروں طرف سے ہونے لگی۔ تب اکبر کو معلوم ہُوا کہ ان کا فطری جوہر ظرافت ہے اور اُنھیں اسی جوہر کو اجالنا چاہیئے۔ لہٰذا انھوں نے اِسے مشق کی سان پر چڑھایا اور مزاولت سے ایسے پہل تراشے کہ اس کی آب و تاب ایک دیکھنے دکھانے کی چیز بن گئی۔

شوکت صاحب بھی برسوں اخباروں میں لکھتے رہے مگر جب حُسنِ اتفاق سے "سودیشی ریل" ان کے قلم سے نکلی تو اس کی مقبولیت نے انھیں بتایا کہ ان کا جوہرِ اصلی مزاح ہے۔ اگر نمود چاہتے ہو تو اِسی کو چمکاؤ۔ چنانچہ شوکت نے اپنی بساط بھر اسے چمکایا، اور اس تیز رفتاری سے کہ دو سال ہی میں موجِ تبسم، بحرِ تبسم اور دوا در تبسم، چار مجموعے ان کے مضامین کے شائع ہو گئے۔ مگر ان کی زود نویسی نے انھیں طنز و مزاح کی بلندیوں کو چھونے نہیں دیا۔ آج تک ایورسٹ کی چوٹی کسی نے دوڑ کر سر نہیں کی۔ یہ بڑا جان جوکھم کا کام ہے جس میں قدم قدم پر احتیاط کرنی ہوتی ہے۔ اور کوئی بڑا ہی خوش نصیب ہوتا ہے جو اپنا جھنڈا گاڑ کر لافانی ہو جاتا ہے۔ دوڑ کر ہانپ جانے والوں میں عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی ہیں، قدم قدم چل کر چوٹی تک پہنچنے والوں میں رشید احمد صدیقی اور پطرس۔ ثانی الذکر نے زندہ سلامت واپس آ جانے کے بعد کوہ پیمائی کا سامان ایک طرف ڈال دیا۔ صدیقی صاحب بہت زیادہ سخت کوش ہیں۔ تن سنگھ کی طرح بار بار چوٹی پر دھاوا بولتے رہتے ہیں۔

شوکت تھانوی خوش اخلاق آدمی تھے، اور جن سے دوستی کا رشتہ قائم کر لیتے تھے اُن سے تعلقات میں فرق نہ آنے دیتے تھے۔ مگر وہ دوست صرف انھیں بناتے تھے جن سے انھیں فائدہ پہنچتا رہتا تھا یا فائدہ پہنچنے کی اُمید ہوتی تھی۔

باتوں کے طوطا مینا بنانا یوں تو سبھی یو۔ پی والوں کا شیوہ تھا مگر شوکت صاحب کو اس میں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے اپنی اسی صلاحیت کے بل بوتے پر بڑے بڑے جِنّوں کو شیشے میں اُتار رکھا تھا اور ان سے کماحقہٗ فائدہ اُٹھاتے تھے میں اُن سے کہا کرتا تھا کہ تم بے ہڈّی کے آدمی ہو۔ اپنے سے زبردست کے سامنے جاتے ہو تو سوائے جی ہاں جی ہاں کہنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ کہتے تھے "نہیں، یہ بات تو نہیں ہے۔"

ایک دفعہ میں شوکت تھانوی کے پاس ریڈیو اسٹیشن پر بیٹھا ہُوا تھا۔ باتیں کرتے کرتے شوکت صاحب ایک دم

سے کھڑے ہوگئے اور بولے "ایک لطیفہ یاد آگیا، ذرا نظامی صاحب (اسٹیشن ڈائریکٹر) کو سنا آؤں۔" اور وہ لطیفہ سنانے چل دیئے۔ میں نے ان کے دوست سے کہا "اس نے تو خوشامد کرنے کی حد ہی نہیں رکھی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی؟" انھوں نے کہا "بھیا، یہاں اسی طرح کام چلتا ہے۔ پول سنگ بڑی چیز ہے۔"

"یہ نیا لفظ تم نے کیا بولا؟"

"پول سنگ۔"

"یعنی؟"

"بٹرنگ — مکھن لگانا — پول سن کا مکھن ہوتا ہے نا؟"

پول سنگ، بٹرنگ، مکھن لگانا، مکھن بازی کرنا، یہ سارے محاورے اسی زمانے میں وضع ہوئے تھے۔ ایک صاحب نے اسی زمانے میں کہا تھا "آج بازار میں مکھن ہی غائب ہے۔"

"کیوں؟ کیا مکھن بھی چور بازار میں چلا گیا؟"

"نہیں، فلاں صاحب نے فلاں افسر کے لگا دیا سارا!"

ایسی باتوں پر ہنسی بھی آتی تھی اور جی بھی جلتا تھا۔ مگر یہ عام دستور تھا اور شوکت صاحب کے متعلق کہا جاتا تھا انھوں نے اس کی تکنیک کو اچھی طرح سے سمجھ لیا تھا، بلکہ اس کے ایکسپرٹ ہو گئے تھے۔ جب عام مقولہ یہ ہو کہ۔ ع

سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

تو پھر کسی ایک کو ہدفِ ملامت کیوں بنایا جائے؟ ایسا ہی خودی اور خودداری کا اگر خیال ہے تو اپنے گھر بیٹھو یا دُنیا چھوڑ دو۔

یہ آخر تک معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اپنی کمائی خرچ کہاں کرتے تھے۔ صرف دو مدیں ایسی دکھائی دیں جن میں انھیں ضرور اپنی گرہ ڈھیلی کرنی پڑتی تھی۔ ایک پان اور دوسرے لباس۔ پان وہ کھاتے کم تھے، کھلاتے زیادہ تھے۔ انھوں نے ایک بڑی ڈبیا کتاب کی شکل کی بنوائی تھی جس میں پان کا پورا لوازمہ ہوتا تھا۔ یہ ڈبیا تقریب بہرِ ملاقات بطور بہت کامیاب تھی۔ جو اس سے بچ نکلتا اُس پر بٹوے سے وار کیا جاتا۔ اس میں چھالیا، الائچی، لونگ، جاوتری، منتھال کی ننھی سی شیشی، سبھی کچھ ہوتا تھا کہاں تک کوئی بچتا؟ مار کھا ہی جاتا۔ اس پر غضب ان کی سخن سازی و سخن بازی، نو وارد رام ہو کر ان کا کلمہ پڑھنے لگتا۔

شوکت صاحب بڑے فقرے باز تھے۔ ایک دفعہ ریڈیو اسٹیشن، لاہور پر اپنے چپراسی کو آواز دی۔ وہ آیا تو اُس کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہنے لگے "آپ کو دیکھئے، نیوی کٹ سگریٹ پر آپ ہی کی تصویر ہے۔" اور واقعی میں اُس غریب کی عین بعین وہی شکل تھی جو نیوی کٹ کی ڈبیا پر ہوتی تھی۔ پھر اُس سے کہا، جائیے، جا کر چائے لائیے۔"

اس کے چند روز بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ میں اُن کے کمرے میں داخل ہوا تو سلام کے بعد شوکت صاحب نے پہلی بات یہ کہی "یہ جو بیٹھے ہوئے ہیں میرے صاحبزادے ہیں۔" اور اُن صاحب سے کہا "انھیں تم جانتے ہی ہو گے، شاہد احمد دہلوی ہیں۔" انھوں نے اُٹھ کر سلام کیا۔ میں وعلیکم السلام کہہ کر بیٹھ گیا۔ وہ صاحب "اچھا، میں چلتا ہوں" کہہ کر چلے گئے تو میں نے ہنس کر کہا

"جس بھلے آدمی کو دیکھتے ہو کسی کو اپنا بیٹا اور کسی کو اپنا باپ بنا لیتے ہو۔ تمھیں شرم نہیں آتی؟" بڑی سنجیدگی سے بولے "نہیں واقعی میرا بڑا لڑکا تھا، بی۔ اے۔ ایف میں نوکر ہے۔" مجھے پھر بھی یقین نہیں آیا۔ اتنے میں عشرت رحمانی آ گئے۔ میں نے ان سے پوچھا "ان کا کوئی لڑکا ان سے بھی بڑا ہے؟" انھوں نے کہا "قد میں بڑا ہے۔ ان کی عمر آپ کیا سمجھتے ہیں؟ مجھ سے آپ سے بڑے ہیں یہ حضرت۔ پچاس سے اوپر ہیں، ۳۰-۳۲ سال کا تو لڑکا ہی ہے۔" اس وقت شوکت صاحب کی صحت اتنی اچھی تھی کہ چالیس سے زیادہ کے نظر نہ آتے تھے۔ بال خوب گھنے اور کالے تھے، سفید بال نہ تو سر میں تھے اور نہ مونچھوں میں۔ چہرے پر کوئی جھری نہیں تھی اور نہ آنکھوں کے کونوں میں "کوے کے پاؤں"۔ دس بارہ سال بعد یعنی ؁۶۱ء میں بھی بالکل ایسے ہی تھے عمر کے ساتھ مزاج میں بردباری اور سنجیدگی آ جایا کرتی ہے، مگر شوکت صاحب کی بات چیت کا انداز بالکل نہیں بدلا تھا جوانی کا وہی چلبلا پن قائم تھا، بلکہ مسخرا پن کچھ بڑھ ہی گیا تھا۔ مارچ ؁۶۱ء کے آخر میں پاکستان سے بھارت جو خیرسگالی کا ثقافتی وفد گیا تھا اس میں لاہور سے امرتسر تک اور امرتسر سے دلی تک ذوالفقار بخاری، سید محمد جعفری، شوکت تھانوی اور میں، ہم چاروں ایک ہی ڈبے میں تھے۔ بالعموم بخاری صاحب اپنی بذلہ سنجی اور چرب زبانی سے سب کو دبا لیا کرتے ہیں، مگر اس سفر میں شوکت تھانوی نے سب کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔

پان کے خرچ کے علاوہ شوکت صاحب اپنے لباس پر بھی روپیہ صرف کرنے پر مجبور تھے۔ وہ روزانہ ایک جوڑا بدلتے تھے اور ٹیپ ٹاپ سے رہتے تھے۔ بعد میں سوٹ بھی سلوا لیے تھے۔ وہ اس راز کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ آدمی کی عزت اس کے کپڑوں سے ہوتی ہے۔ جیسے الغریب خواہ مخواہ مردِ معقول ہوتا ہے اسی طرح بڑھیا لباس والا خواہ مخواہ معزز سمجھا جاتا ہے۔ مجھے اس کا بڑا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ ایک دفعہ میرے پرانے ہم جماعت اور بے تکلف دوست ممتاز حسن صاحب نے مجھے کہلوا بھیجا کہ کسی دن شام کو ۵ بجے میرے دفتر آ جاؤ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ ممتاز صاحب اس وقت سیکرٹری فنانس تھے۔ میں سیدھے سبھاؤ ان کے دفتر وقتِ مقررہ پر پہنچ گیا۔ ان کا چپراسی مرغِ زریں بنا باہر کھڑا تھا۔ میں نے پرچے پر اپنا نام لکھ کر اسے دیا کہ صاحب کو دے آئیے۔ اس نے بڑی بے مہری سے میری طرف دیکھا اور بولا "بنچ پر بیٹھ جاؤ۔ صاحب کام کر رہے ہیں۔" میں بیٹھ گیا، وہ بھی تھوڑی دیر بعد آ کر مجھ سے ذرا ہٹ کر اسی بنچ پر آ بیٹھا۔ دس منٹ گزر گئے، اس نے مجھ سے بات کرنی بھی گوارا نہیں کی۔ میں نے کہا "آپ جا کر میرا پرچہ تو دے آئیے، مناسب سمجھیں گے تو بلا لیں گے۔" بولا "اندر کسی بڑے افسر کے ساتھ ضروری کام کر رہے ہیں۔ ابھی ٹھہرو۔" ٹھہرے رہے۔ جب پھر کچھ وقت گزر لیا تو میں نے کہا "صاحب نے مجھے بلایا ہے، میں اپنے کسی کام سے نہیں آیا ہوں، آپ اطلاع تو کر دیجیے۔" وہ میری چٹ لے کر اندر چلا گیا اور وہاں سے چائے کے خالی برتن لے کر باہر نکلا۔ میری چٹ اس کے ہاتھ ہی میں تھی۔ برتن لیے چلا گیا مجھ سے کچھ نہ بولا۔ جب واپس آیا تو آ کر خاموش بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا "چٹ نہیں دی؟" اس نے نہیں کہہ کر منہ پھیر لیا۔ میں جلتا رہا، جھلستا رہا۔ پون گھنٹے بعد جب ممتاز صاحب اپنے معزز مہمان کو رخصت کرنے دروازے پر آئے تو اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ چونک کر بولے "ارے! آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں؟" میں نے کہا "جی ہاں، پون گھنٹے سے۔ اور آئندہ آپ مجھے کبھی اپنے دفتر نہ بلائیں، میں آنے والے پر لعنت بھیجتا ہوں۔" وہ "آئیے آئیے" کہہ کر گلے میں ہاتھ ڈال کر

مجھے اپنے ساتھ کمرے میں لے گئے۔ بولے "آپ اندر کیوں نہ آ گئے؟" میں نے کہا "وہ جو باہر ایک کتا کھڑا تھا اُسے میں نے چٹ دے دی تھی، مگر اس نے اندر نہیں پہنچائی۔ کیا آپ کے ہاں بھی اندر اطلاع پہنچانے کے دس پانچ روپے دیئے جاتے ہیں؟" ہنس کر کہنے لگے "نہیں، ایسا تو نہیں ہوتا۔" پھر میرے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر بولے "آپ چائے پئیں گے، کچھ کھائیں گے؟" اور بغیر میرے جواب کا انتظار کئے گھنٹی بجا کر اپنے مرغِ زرّیں کو بلایا اور کہا "چائے لاؤ۔" پھر خود ہی کہنے لگے "بھائی کیا پوچھتے ہو ان چپراسیوں کی حالت۔ بس کچھ کہنے کا مقام نہیں ہے۔" میں نے کہا "جناب اس کی گرم شیروانی میری شیروانی سے دگنی قیمت کی ہے، میرے پاؤں میں چھ روپے کی جوتی ہے، وہ تیس روپے کا شو پہنے ہوئے ہے۔ بھلا وہ مجھے کیوں خاطر میں لاتا۔ سمجھا ہو گا کہ کوئی غرض مند مہاجر، صاحب سے کچھ مانگنے آیا ہو گا۔" ممتاز صاحب شرمندہ ہو کر بولے "نہیں بھائی نہیں۔ تم مجھے معاف کر دو۔"

تو شوکت صاحب ہمیشہ دیسی یا ولایتی عمدہ لباس پہنا کرتے تھے۔ ورنہ انھیں بھی ایسے ہی حادثات سے دوچار ہونا پڑتا۔ مثل مشہور ہے "الناس باللباس۔" یہ کوئی آج کا دستور نہیں ہے، قدامت سے ہی چلا آتا ہے۔ شیخ سعدی کو دعوت میں داخل ہونے سے دربان نے روک دیا تھا۔ جب وہ جبّہ قبّہ پہن کر آئے تو عزّت و تکریم کے ساتھ انھیں اندر پہنچایا گیا۔ جب کھانا سامنے آیا تو حضرت شیخ نے شوربے میں اپنی آستین ڈالتے ہوئے فرمایا "پہلے تو کھا۔" لوگوں نے کہا "حضور یہ کیا؟" تو فرمایا "اسی نے تو مجھے کھانے تک پہنچایا ہے۔" سچ ہے لوگ ظاہر کو دیکھتے ہیں، باطن کو نہیں۔ لہٰذا مرزا ظاہر دار بیگ بننے ہی میں عزّت ہے۔

شوکت صاحب میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ شاعروں کے ساتھ اور اونچی سوسائٹی میں رہنے کے باوجود شراب نہیں پیتے تھے۔ آئے دن غیر ملکی سفارت خانوں میں کاک ٹیل پارٹیاں ہوتی رہتی ہیں، بلکہ ہمارے "بڑے آدمیوں" نے بھی اِسے اپنی شانِ امارت میں داخل کر لیا ہے کہ جب ان کے ہاں "معزّز مہمان" آ رہے ہوں تو ایک بار کا بھی اپنے ہاں اہتمام کریں۔ مفت کی تو قاضی کو بھی حلال ہے۔ مگر اِن "قاضی جی" نے اسے ہمیشہ حرام ہی سمجھا۔ ورنہ ایسے موقعوں پر میں نے ایسے ثقہ لوگوں کو چسکی لگاتے دیکھا ہے کہ بس دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔

عورتوں کے باب میں بھی شوکت صاحب ندیدے نہیں تھے۔ بلکہ خواتین سے ملنے میں بڑی احتیاط ملحوظ رکھتے تھے یہ نہیں کہ ہمارے بعض شاعروں کی طرح جس عورت سے بھی تعارف ہوا چھوٹتے ہی سمجھ لیا کہ پہلی ہی نظر میں وہ ان پر عاشق ہو گئی اور لگے اس کی فرضی داستانیں سنانے۔ شاید اس وضع احتیاط کی وجہ یہ ہو کہ شوکت صاحب کی شادی نوجوانی ہی میں ہو گئی تھی۔ انہی کی بے تکلف گفتگو سے معلوم ہوا تھا کہ کبھی اوائل شباب میں "جنگلی جی" بھی لو لیا کرتے تھے۔ مگر اس کا انھیں لپکا نہیں پڑا تھا۔ وہ ایک طرحدار جوان تھے، وہ اگر بگڑنا چاہتے تو خوب پیٹ بھر کے بگڑتے، مگر اللہ نے انھیں اس خرابی سے محفوظ رکھا ——— وہ بھی کسی حد تک!

عجیب و غریب ادبی شخصیت

محمد شعیب (وزیر خزانہ)

شوکت تھانوی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ اس سے پہلے میں اُن کے مطبوعہ کلام کے ذریعے سے ایک عرصے سے اُن سے تعارف رکھتا تھا۔

ادبی نقطہ نظر سے اُن کے مضامین، اُن کے افسانوں اور ناولوں سے بہتر ہیں۔ طنز و مزاح کی جو چاشنی اُن کے مضامین میں ہے وہ ان کے افسانوں اور ناولوں میں، پلاٹ سے قطع نظر نہیں ملتی۔ متعدد کتابوں کی تصنیف کے علاوہ عرصے سے وہ ریڈیو پر ہفتہ وار مزاحیہ پروگرام بھی نشر کرتے تھے۔ پہلے لاہور سے اور پھر پنڈی سے۔ پنڈی میں دار الخلافہ تبدیل ہونے کے بعد وہ اخبار "جنگ" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور مغربی پنجاب میں "جنگ" کی مقبولیت کا انحصار خود شوکت تھانوی کی ذات تھی وہ عجیب و غریب ادبی شخصیت کے حامل تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور مضامین، افسانے اور ناولوں کی تصنیف کے علاوہ ایک فلم میں بہ حیثیت فنکار بھی حصہ لے چکے تھے۔ غرضیکہ ادب اور آرٹ کی ہر ایک صنعت پر اُن کو دسترس تھی۔ بہت کم لوگ ہیں جو بیک وقت شاعر بھی ہوں اور افسانہ نگار بھی۔ ناول نگار بھی ہوں اور فلمی فنکار بھی۔ یہ ہمہ گیری شوکت صاحب ہی میں پائی جاتی تھی۔ اُن کی قبل از وقت وفات سے جو خلا ادبی حلقے میں پیدا ہوا ہے وہ مشکل سے پورا ہوگا۔

"جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں"

حجاب امتیاز علی

غم و افسردگی کو ہنسی اور قہقہے میں تبدیل کرنا اور سنجیدگی کو مزاح میں تحلیل کر دینا —— یہ تھے شوکت تھانوی، جو آج ہم سب سے منہ موڑ کر اور رشتۂ چاہ توڑ کر ایک ویرانے میں جا بسے ہیں۔ کئی بار خیال آتا ہے۔ وہاں ان کا دل کیسے لگتا ہوگا!! وہ تو بڑے انجمن پسند اور محفل آرا آدمی تھے۔ لیکن کبھی کبھی —— یا شاید کئی بار میں نے اُن کی مسکراہٹوں میں ایک خفیف اُداسی اور نامعلوم سی افسردگی محسوس کی تھی جسے میں اپنا شبہ سمجھتی رہی۔ ممکن ہے شبہ ہی ہو مگر نہیں —— جو شخص غیر معمولی طور پر ہنستا اور ہنساتا ہے وہ دراصل اپنے دل کی گہرائیوں میں روتا ہے۔

کئی سال ہوئے ایک موسم خزاں میں میرا بہت شدید قسم کا نروس بریک ڈاؤن ہوا جو کئی مہینے جاری رہا۔ کئی حاذق ڈاکٹروں نے میری حالت و علامات کا مطالعہ کیا مگر مکمل شفا نہ بخش سکے۔ ذہنی انتشار اور جذباتی اضطرار کی یہ کیفیت تھی کہ چوبیس گھنٹوں میں سے چند منٹ بھی سکونِ قلب کے نصیب نہ ہوتے تھے۔

ایک دن امتیاز کہنے لگے "وٹامن بی کے سینکڑوں انجکشن لے لیے۔ اب شوکت کو کیوں نہ آزما دیکھیں؟" جیسے شوکت بھی کسی ٹانک یا پیٹنٹ دوا کا نام ہو۔ میں نے ان کی رائے پر زیادہ توجہ نہ دی۔ طبیعت کی افسردگی کی وجہ سے میں اس زمانے میں آدم بیزار سی رہتی تھی۔ اور کسی سے مطلق نہ ملتی تھی۔

لیکن ایک روشن سہ پہر امتیاز اور شوکت میری خواب گاہ کے دروازے میں کھڑے ہوئے نظر آئے۔ میں نے بادلِ ناخواستہ سلام کا جواب دے کر بیزاری کے عالم میں سر دیوار کی طرف پھیر لیا۔ شوکت صاحب آنِ واحد میں دیوار کے اور میرے درمیان آکھڑے ہوئے۔ میں نے دائیں طرف سر پھیرا تو وہ لپک کر دائیں طرف آگئے بائیں طرف منہ کیا تو ادھر نازل ہو گئے۔ لیکن نہایت خاموشی اور سنجیدگی سے۔

ان کی ان حرکات پر میں مسکرائی تو فوراً پوچھنے لگے "ہائیں۔ یہ آپ مسکرائیں کس بات پہ؟ آپ کی حالت نہایت مخدوش ہے یہ مسکرانے کا موقع نہیں ہے۔"

یہ سن کر میں نے بیزاری کے لہجے میں کہا "مجھے ڈراتے ہیں۔"

کہنے لگے "ڈرانے ورانے کی بات نہیں یقین کیجیے۔ آپ کی حالت بہت نازک ہے۔"

میں نے بڑا مان کر کہا "آخر آپ یہ سب مجھے کیوں کہہ رہے ہیں؟"

"اس لیے کہ آپ کی موجودہ حالت کو سدھارنے کا ایک تیر بہدف نسخہ لے کر آیا ہوں۔ مایوس نہ ہو جائیے۔ بچ جائیں گی۔" یہ کہتے کہتے وہ کرسی کھینچ کر یوں بیٹھ گئے جیسے کوئی ماہر ڈاکٹر مریض کے پاس بیٹھتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد ایک ایسے طبیب کی نقل اتارنے لگے جس نے کسی زمانے میں میرا علاج کیا تھا اور بے شمار بیویوں کا شوہر تھا۔ کبھی ان کی کسی بیوی کی نقل اتارتے کبھی ان طبیب صاحب کی باتوں کی۔ مجھے ہنسی آہی گئی۔ اور وہ ساری دوپہر افسردگی کی بجائے تفریح میں گزر گئی۔

اب یہ معمول ہو گیا۔ شوکت دوپہر یا سہ پہر کو باقاعدگی سے آتے۔ دوپہر کے کھانے یا شام کی چاء پر ضرور ٹھہرتے۔ ان کی موجودگی ہم سب کی بھوک کو چمکا دیتی اور کھانا یا چاء بے حد رونق اور ہنگامے کے ساتھ اختتام کو پہنچتا۔

شام کا اضمحلال میرا ایک مستقل مرض تھا۔ اسے رفع کرنے کے لیے ہم سب عموماً لمبی ڈرائیو کو نکل جاتے۔ شوکت لمحہ بھر کو چپکے نہ رہتے مسلسل باتیں کرتے اور باتیں بھی اتنی دلچسپ اور ایسی مضحکہ خیز ــــ کہ مالیخولیا کا اداس مریض بھی قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جائے۔

ایک دفعہ ہم سب ایک لمبی ڈرائیو کو نکلے۔ سامنے بارھویں تاریخ کا چاند آسمان پر جگمگا رہا تھا۔ میں نے امتیاز کو مخاطب کر کے کہا "اُف! دیکھئے تو۔ چاند کتنا بڑا ہو گیا!"

فوراً شوکت کی آواز آئی "مگر تمیز اب تک نہیں آئی"

ان کی باتوں نے آخر میرے گہرے اضمحلال کو کچھ کچھ کم کر دیا اور میری طبیعت نسبتاً پُرسکون رہنے لگی اس وقت سے ہم سب ان پر ایمان لے آئے۔ جہاں کوئی غمگین یا متاثر ہوتا فوراً شوکت صاحب کے لیے کار بھیج دی جاتی۔ وہ بھی ایسے بامروت واقع ہوئے تھے کہ گرمیاں ہوں یا سردیاں کار کبھی خالی واپس نہ کی۔ ایک دفعہ امتیاز کی طبیعت کچھ ناساز ہوئی۔ فون کر کے شوکت صاحب کو تاکید کی کہ فوری امداد کا کیس ہے تشریف لے آئیے۔ گرمی کی تپتی ہوئی دوپہر تھی مگر شوکت صاحب آ گئے آتے ہی یاسمین سے کہا "دیکھنا بھتیجی۔ ساری دوپہر کوئی ٹھنڈی میٹھی اور رقیق سی چیز مجھے مسلسل پہنچتی رہے۔ میں تمہارے ابا کے علاج کے لیے آیا ہوں۔" اور پھر ساری دوپہر خس خانہ قہقہوں اور چہچہوں سے گونجتا رہا۔ اور شام کو امتیاز ہشاش بشاش باہر نکل آئے۔ اس طرح وہ ہمارے خاندانی طبیب بن گئے تھے۔

یاسمین کے امتحان کا زمانہ آیا تو ایک روز پہلے وہ بے حد متوحش اور غمگین ہو گئی۔ کہنے لگی "شوکت چچا کو بلایئے تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔" چنانچہ ہم سب شوکت کے ہاں پہنچے۔ انھیں ساتھ لے کر ایک لمبی ڈرائیو کو روانہ ہو گئے۔ اتفاق سے ہمارے ساتھ ہمارے ایک اور دوست بھی تھے جن کے بال کسی قدر لمبے تھے اور وہ ان پر بہت نازاں تھے اس غلط فہمی کا شکار بھی تھے کہ لمبے بال ان کے حسن میں چار چاند لگانے کے علاوہ انھیں آرٹسٹ ثابت کرنے میں بھی کارآمد ہیں۔ انھیں دیکھ کر شوکت نے کچھ دیر تو ضبط کیا پھر پوچھا "کیوں صاحب۔ آپ کی سالگرہ کس تاریخ کو ہو گی؟" انھوں نے مسکرا کر ایک ادائے محبوبی سے فرمایا "جی ــــ ۱۸ اگست کو" شوکت بولے "اس لیے پوچھا کہ اس موقع پر میں آپ کو بالوں میں لگانے کا فیتہ اور ربن پیش

تحفے میں دینا چاہتا ہوں۔" چاندنی تھی۔ خنک ہوائیں تھیں۔ اور شوکت کی شوخ باتیں۔ یاسمین اپنے امتحان کی ہیبت یکسر بھول گئی۔

وہ ریڈیو کے مشہور قاضی جی تو تھے ہی۔ کبھی کبھار ہمارے ہاں بھی قاضی کے فرائض ادا کرتے تھے۔ قاضی کا کام ہے جھگڑے چکانا۔ یاسمین اور اس کی ہم عمر رشتہ کی بہنوں یا سہیلیوں میں کبھی کبھی رنجش ہو جاتی تو شوکت ہمیشہ ان میں صلح کرا دیتے۔ اس کا طریق یہ تھا۔ دونوں کو آمنے سامنے کر کے ان کے سر اس زور سے ٹکراتے کہ پہلے تو دونوں درد سے بلبلا اٹھتیں پھر جب حواس بجا ہوتے تو ایک دوسرے کو دیکھ کر زور سے ہنس پڑتی تھیں۔ صلح بہر حال ہو جاتی تھی۔

اعتبار انھیں ہمیشہ علامہ کے لقب سے مخاطب کرتے تھے اور یاسمین بچا کہتی تھی۔ علامہ کا نام کیوں اور کیسے پڑا اس کی وجہ میں نے اعتبار سے بھی نہیں پوچھی۔ دونوں اس نام سے مطمئن نظر آتے تھے۔ بلانے والا بھی اور بلوائے جانے والا بھی۔

اعتبار اور شوکت دونوں میں رہ رہ کر تمباکو کے پان کھانے کی بہت بری عادت تھی۔ (مجھے ساٹھ ستر فیصدی یقین ہے کہ اعتبار صاحب کی یہ عادت اب چھوٹ چکی ہے) شوکت نے تو پان کھانے کو ایک آرٹ بنا رکھا تھا۔ میں پان دان سے خائف اس لیے رہتی تھی کہ اس کی بدولت آس پاس کے فرنیچر قالین یا دیوار پر کتھے چونے کی رنگ آمیزی ہو جاتی تھی۔ اسی قسم کے تلخ تجربوں کے بعد میں نے پان دان اوپر کی منزل کی ایک کھلی ہوئی نشست میں ایک اونچی میز پر رکھوا دیا اور اعلان کر دیا کہ جسے بھی پان کھانا ہو انھیں حدود میں رہ کر کھائے۔ اور پان کھانے کے بعد ہاتھ ایک سرخ رومال سے (جو پان دان میں دبا کر رکھ دیا گیا تھا) صاف کر کے نیچے اترے۔ مگر باوجود میری اس احتیاط کے چند ہی ہفتوں میں پاندان کے قریب کی دیوار پر گز گز بھر تک کتھے کے چھینٹوں نے نقش و نگار بنا دیے تھے۔ نہ معلوم پان لگانے میں کتھا کیونکر اتر اتر کر دیوار کی طرف جاتا اور اسے رنگین بناتا تھا۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی تو میں نے تہیہ کر لیا کہ پاندان ہی گھر سے اٹھا دینا چاہیے کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اس کی اطلاع شوکت صاحب کو ملی تو فوراً آئے اور کہنے لگے کہ "میں نے پاندان کے متعلق ایک ترکیب سوچ لی ہے۔ اس پر عمل کرنے سے بانس بھی رہے گا بانسری بھی بجے گی۔ یعنی پاندان بھی گھر سے نہ اٹھے گا اور دیوار بھی صاف ستھری رہے گی۔ میں نے پوچھا وہ کیا ترکیب ہے؟ کہنے لگے "رات بھر سوچتا رہا جب کہیں جا کر یہ تدبیر ہاتھ آئی ہے۔ آپ یوں کیجیے کہ پاندان کے قریب کی دیوار دو دو گز کولتار سے سیاہ کرا دیجیے۔"

کسی زمانے میں ہماری کوئی دعوت شوکت کے بغیر ہوتی نہ تھی۔ لوگ ان سے ملنے اور ان کے لطیفے سننے کے اتنے مشتاق رہتے تھے کہ صبح ہی فون کر کے پوچھا کرتے تھے "آج کے ڈنر میں آپ کے ہاں شوکت تو موجود ہوں گے نا؟"

اپنی اسی خوش مزاجی اور شگفتگی کی وجہ سے وہ تمام معیاری محفلوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔

جب وہ جنگ میں ملازم ہو کر پہلے کراچی اور وہاں سے پنڈی گئے تو تعلقات پر اوس سی پڑ گئی۔ ایک دو دفعہ دوستوں سے سنا کہ شوکت لاہور آئے ہیں۔ مگر وہ ہم سے ملے بغیر واپس چلے گئے۔ وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ مصروفیت؟ کوئی غلط فہمی؟ اتفاق؟ جو کچھ بھی تھا۔ دل مکدر سا ہو گیا۔

ان سے آخری محفلی ملاقات ۲۳ مارچ سنہ ۶۳ء یوم پاکستان کے موقع پر

مہمانوں کا اژدہام تھا۔ دور سے انھوں نے سلام کیا۔ دور سے میں نے جواب دیا۔ پھر وہ امتیاز سے باتیں کرتے ہوئے مہمانوں کے ہجوم میں جا ملے۔

اس کے دوسرے یا تیسرے ہی دن سنا کہ شوکت سخت بیمار ہیں۔ اور ان کا مرض بغیر معلوم ہوئے پیچیدہ اور اندیشہ ناک صورت اختیار کر چکا ہے۔ ٹی۔ بی؟ دل؟ کینسر؟ بلڈ پریشر؟ ——— ڈاکٹر غور کر رہے تھے کہ کون سا مرض تشخیص کریں۔ اور مرض دن بدن بڑھ رہا تھا۔

میں انگشت بدنداں تھی۔ ابھی یوم پاکستان کے استقبالیہ میں تو وہ چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ اور آج ——— اتنی جلدی یہ حالت ہو گئی؟

پھر روز بروز ان کی بیماری تشویشناک صورت اختیار کرتی گئی۔ وہ نہ چاہتے تھے مگر دوستوں اور خیر خواہوں نے اصرار کر کے ان ہی کے آرام و سکون کے لیے انھیں البرٹ وکٹر ہاسپٹل میں داخل کرا دیا۔ ہم کو باقاعدگی سے اطلاعات ملا کرتیں کہ آج شوکت کو نیا خون دیا گیا۔ آج فلاں نئی دوا آزمائی گئی۔ آج طبیعت مقابلتہً بہتر رہی۔ میں اور امتیاز ہر روز ارادہ کرتے کہ شام کے وقت جا کر شوکت کو دیکھ آئیں۔ مگر سوار ہونے کے بعد کار سے اتر پڑتے۔ کسی طرح ہمت نہ پڑتی نہ طبیعت چاہتی کہ چہکنے والے شوکت کو بستر مرگ پر سسکتے دیکھیں۔ دل کہتا شوکت کی جگہ تو محفل و انجمن تھی ہسپتال نہیں

آخر اسی کشمکش و ذہنی انتشار میں ہم نے ایک ہفتہ ضائع کر دیا۔

آخر ایک دن دل کڑا کر کے اور ایک دوسرے کی ہمت بندھا کہ ہم دونوں ہسپتال جا پہنچے۔ ہسپتال کے لمبے لمبے برآمدے سخت ماتمی نظر آ رہے تھے۔ شام بے حد افسردہ تھی اور ہوائیں خاموش۔ ان کے کمرے کے آگے جا کر تردد کے عالم میں کھڑے ہو گئے۔ اندر جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ کیا معلوم۔ آج طبیعت کیسی رہی ہو گی! اسی تگ و دو میں کئی منٹ گذر گئے اچانک ان کے صاحبزادے باہر نکل آئے اور ہمیں دیکھ کر دروازہ کھول دیا اور اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم اندر گئے۔ سر ایک طرف ڈھلائے شوکت چپ چاپ پڑے تھے۔ چند ہی روز میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر ان کے مردنی چھائے ہوئے چہرے پر پہلے ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پھر وہ رو پڑے ——— ! دوستوں کو ہنسانے والے کا یوں رو پڑنا ناقابلِ برداشت تھا۔ کیا کہہ کر انھیں حوصلہ دلائیں۔ کس بات سے انھیں بشاش بنائیں۔ کچھ نہ سوجھتا تھا۔ اور سوجھتا بھی کیا۔ وہ اتنے ذہین تھے کہ ہماری طفل تسلیاں انھیں اطمینان بخش نہ سکتی تھیں۔

میں کمرے سے چپ چاپ باہر نکل آئی۔ دوبارہ اندر نہیں گئی باہر ان کی مغموم بیگم اور چاہنے والا بیٹا دم بخود کھڑے تھے۔

پھر ۴ مئی کی صبح اچانک سنا کہ شوکت نے ہم سے منہ موڑ لیا۔

امتیاز انتہائی اندوہ سے کہنے لگے: "کس کس کا صدمہ سہوں؟ راجہ غضنفر کا غم نہیں بھولا شوکت داغ دے گیا! پطرس گیا۔ سالک گیا۔ غضنفر گیا۔ اور اب شوکت بھی روٹھ گیا! ——— وہ اپنے ایک ایک دوست کا نام لینے لگے۔ جو اب ہم میں موجود نہیں لیکن جن کی یادوں کے چراغ نہاں خانۂ دل میں ہمیشہ روشن رہیں گے۔

میں سوچتی ہوں ان کی دائمی جدائی ان کی بیگم، ان کے بیٹے، ان کی بیٹیاں کیسے برداشت کرتی ہوں گی۔ دوست ماتم کناں ہیں تو ان کے وابستگان کی قلبی کیفیات کیا ہوں گی! انھیں صبر کی تلقین کرنا حماقت ہے۔ صبر بہت معمولی لفظ اور شوکت کا حادثۂ مرگ بہت عظیم ہے۔

آجکل جبکہ زندگی ایک پکّے گانے کی شکل میں منتقل ہو رہی ہے۔ شوکت کی ہلکی پھلکی باتیں یاد آتی ہیں تو دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ وہ بے وقت اور اچانک ہم سے چھن گئے۔ شوکت سے کوئی لڑائی ہو جاتی —— وہ عارضی طور پہ ہم سے الگ ہو جاتے، جیسے بعض وقت بعض دوست کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر جُدا ہو جاتے ہیں۔ وہ روٹھے روٹھے راولپنڈی میں رہتے اور ہم جلے جلے لاہور میں —— پھر کسی بڑی محفل، کسی استقبالیہ، کسی مشاعرے، کسی ڈنر پر اچانک مڈبھیڑ ہو جاتی، دل کے گلے اگر ہونٹوں پہ نہ آتے، جب بھی ان کا وزن ہلکا پڑ جاتا اور ان کی حاضر جوابی اور شگفتہ طبعی سارے شکوے پل بھر میں رفع کر ڈالتی —— کاش یوں ہوتا —— کاش یوں ہوتا ——! مگر اب یہ صرف تمنائیں ہیں۔ شوکت ہم میں نہیں رہے۔ یہ شمع اب گُل ہو چکی ہے اور روشنی کی دنیا میں چاروں طرف اندھیرا ہے۔

آہ! شوکت

محمد عبدالرؤف عباسی

سر کنم نالہ اگر تابِ شنیدن داری
سینہ بشگافم اگر طاقتِ دیدن داری

اواخر ۳۰ء یا اوائل ۲۹ء کی بات ہے دسمبر یا جنوری کا مہینہ ہے چلہ کا جاڑا پڑ رہا ہے کہ کاتب الحروف اپنی زندگی کا اہم ترین اقدام کر گزرا۔

سبب کو نظر انداز کیا۔ مسبب اعلیٰ کی کارسازی پر نگاہ رکھی اور طے کر لیا کہ قدم عشق پیشتر بہتر "حق" ہفتہ وار بہت نکل چکا اب یہ بھی ایک قدم آگے بڑھے۔

اس میں بالکل مبالغہ نہیں ہے کہ اس وقت سے لے کر آج تک میرا سرمایہ کارسازِ عالم کی کارسازی پر عین الیقین رہا اور آج بھی ہے۔ اس وقت نہ کوئی مشیر و معاون تھا نہ شریکِ کار، بہرنوع اللہ کا نام لے کر ؎

دریں دریائے بے پایاں دریں امواج شور افزا
دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

ہفتہ وار حق بہت کامیاب تھا، روزنامہ ہوا تو کہنے والوں نے چار دن کی چاندنی کہہ کر تمسخر کیا۔ بہرصورت گزشتہ ۳۵ برس سے یہ چاندنی ضیاء ریز اور نور بار ہے بقولیکہ ؎

فانوس بن کے آپ حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ تھا کہ اسٹاف میں اضافہ ہو آدمی ایسے ہوں کہ جو تنخواہ اتنی ہی لیں کہ جتنی حق کی وسعت کے اندر دیکھیں محنت اور تن دہی سے اپنا کام انجام دیں۔ نگاہِ انتخاب شوکت تھانوی پر پڑی اور اسی جگہ قائم ہو گئی۔

یہ وہ وقت ہے کہ سودیشی ریل چھوٹ چکی ہے۔ یہ اور اس قسم کے دیگر طنزیات دنیائے ادب سے خراجِ تحسین وصول کرنے لگے ہیں۔ اس کا دلکش اور ظرافت آمیز اندازِ تحریر مقبولِ عام ہی نہیں خواص پسند ہو چکا ہے۔

میں نے شوکت سے صرف اتنا کہا کہ سودیشی ریل بحمداللہ چل رہی ہے لیکن دنیا میں تم کو بہت کچھ کرنا ہے۔ اب اپنا اخبار

بھی دیکھو۔ روزانہ اخبار نکالنے میں جو ہمت شکن اور حوصلہ فرسا مصارف ہوتے ہیں وہ تم جانتے ہی ہو۔ مجھ کو تو واقعی ہمدرد کی تلاش تمہارے پاس لائی ہے۔ جواب ملا کہ آپ لوگ (میرے ساتھ میرے بھائی بھی تھے) اپنی نوعیت میں فرد ہیں۔ میں ضرور تشریف لاؤں گا، مگر کام کے اوقات کیا ہوں گے؟

میں نے کہا کہ یہ اور اس قسم کی بہت سی باتیں پیدا ہوں گی۔ باہمی مشاورت سے تقسیم کار کر لو۔ اوقات منضبط کر لو۔ کل تعطیل ہے، تمہارا اسٹیج بند ہوگا۔ صبح ہی آجاؤ، ناشتہ یہیں ہوگا۔

دوسرے دن یہ طے ہوا کہ جو اخبار کل شائع ہوگا وہ آج مرتب کر لیا جائے۔ خبروں کی جگہ چھوٹی رہے۔ انگریزی اخبارات سے خبریں لے کر تین آدمی منہ اندھیرے ترجمہ کرنے بیٹھ جائیں، ساتھ ساتھ کتابت ہوتی رہے۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر روزہ خبروں کے ساتھ "حق" بھی ۹ بجتے بجتے بازار پہنچ جاتا تھا۔

اس زمانہ میں شوکت نخاس میں رہتے تھے اور میں ہیوٹ روڈ پر۔ دو ڈھائی میل کا یہ راستہ طلوعِ آفتاب سے بہت پہلے بائیسکل پر طے کرنا بجائے خود ایک مجاہدہ ہوتا تھا۔

صبح کا یہ پروگرام بہت پر لطف ہوتا تھا۔ ہم لوگ انگیٹھی کو گھیرے بیٹھے ہیں۔ ترجمہ ہو رہا ہے اور چاء چل رہی ہے۔

اخبار پوری پابندی سے نکلنے لگا۔ شوکت صبح تڑکے آجاتے تھے اور رات بڑھے گھر جاتے تھے۔ دن بھر کام اور شام کی تفریح سب ساتھ ہونے لگی اور چند ہی دن میں شوکت فردِ خاندان ہو گئے۔ میرے بڑے بھائی اُن کے بھی بھائی جان ہو گئے۔

میرے والد مغفور کی نگاہ ہمارے احباب میں ہر شخص کا جائزہ تو لے لیتی تھی۔ شوکت پر یہ نگاہ شفقتِ مجسم ہو کے پڑی حتیٰ کہ اپنے حضرت پیر و مرشد کے حضور میں پیش کر دیا اور کمال یہ تھا کہ وہاں بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

شوکت بجائے خود ایک انجمن تھا۔ یہ جملہ بہتوں کے لیے کہا گیا ہے مگر جس حد تک شوکت پر صادق آیا میرے علم میں کسی دوسرے پر نہیں۔

اس کا جوہرِ اصلی ظرافت تھا۔ بات میں بات پیدا کرنا، حاضر جوابی، زندہ دلی، شگفتہ مزاجی محض عطیہ الٰہی کہی جا سکتی ہے کیونکہ لاانتہا تھی۔ ظرافت کی ایک قسم ایک انگریز ادیب پی۔ جی۔ وڈہاؤس کے ہاں ملتی ہے جہاں بات دیکھئے تو کچھ نہیں مگر لفظوں کے الٹ پھیر سے ہر جملہ زعفران زار...... بالکل یہی صورت شوکت کے ہاں ہے۔ وڈہاؤس زندہ قوم کا فرد تھا اس کا نام و کلام سب ایک مدت تک زندہ رہے گا اور شوکت کو دنیا چار ہی دن میں بھول چلی۔

اخبار جنگ کے پنڈی ایڈیشن کا مدیر اعلیٰ شوکت تھا۔ خیال تھا کہ کچھ نہیں تو مہینہ بیس روز اس کے مذاکرات سے اخبار کے صفحات لبریز نکلیں گے مگر یہ بھی نہ ہوا۔ رہے نام اللہ کا۔

اللہ نے شوکت کو وہ ذہنِ رسا دیا تھا کہ جو ہمہ گیر تھا۔ جدھر رخ کیا ایک نیا راستہ اپنے واسطے نکال لیا۔ شاعری ہو یا ادب سب میں اپنے جوہر دکھائے۔

شوکت من حیث الشاعر

افسوس یہ ہے کہ اس کا کلام پیشِ نظر نہیں ہے ورنہ یہ ثابت کرنا بہت دشوار نہیں تھا کہ اپنے ہم عصر شعراء میں بجز دو ایک کے

وہ کسی سے بہت پست نہیں تھا۔

انشا نصیر الدین حیدر کے دربار کا مایہ صد ناز شاعر، علم و فضل مسلم، عروض اور فن شعر کی باریکیوں پر پوری طرح حاوی اس کے متعلق خان آرزو ایسے مسلم الثبوت استاد نے کہ جس کے دامنِ تربیت سے میر و سودا وغیرہ نکلے اور شعر و سخن کے مطلع پر آفتاب عالمتاب ہو کر چمکے اس مبصر نے کہا کہ انشا کے علم و فضل کو شاعری نے کھویا اور شاعری کو سعادت علی خاں کی مصاحبت نے ڈبو دیا۔ مقصد یہ تھا کہ سعادت علی خاں نے اتنا موقع ہی نہ دیا کہ انشا غور و فکر سے شعر کہتے اور طبع خداداد کے جوہر دکھاتے۔

کسی سے مقابلہ نہیں ہے۔ شوکت انشا نہیں تھا۔ کہنا یہ ہے کہ شوکت نے کبھی غور و فکر سے شعر نہیں کہا اور نہ کہنے کے بعد نظر ثانی کی۔ اس کے باوجود جو کہا خوب کہا۔ ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ اس کا بے پناہ حافظہ اس کی بیاض تھا جو کہا وہاں درج ہو گیا۔ متعدد غزلیں ہوں گی کہ جو کبھی کاغذ پر نہ آئیں۔

شوکت من حیث المصنّف

اللہ نے شوکت کو بہت کچھ دیا مگر عمر نہ دی۔ جن لوگوں نے شوکت کو بہت قریب سے دیکھا ہے متحیر ہیں کہ اس ہنسنے ہنسانے والے کھلنڈرے کو اتنا وقت کہاں ملا کہ اتنی سی عمر میں کم و بیش پچاس کتابیں لکھ ڈالیں۔ ان میں سے بیشتر طبع ہو گئیں اور بہت ایسی بھی ہیں کہ جو مسودہ کی حد سے آگے نہ بڑھیں۔ ان کے پاکستانی احباب میں اگر کوئی صاحب اتنی ہمت کریں کہ مسودوں کو فراہم کر کے ان کو شائع کرا دیں تو اس کی معصوم خورد سال لڑکیاں کبھی کسی کی دست نگر نہ ہوں۔

ریڈیو کی طرف جھکا تو دیکھتے ہی دیکھتے اس کی صفِ اولین کی زینت ہو گیا۔ راقم الحروف کو کبھی یہ اندازہ نہ ہوا کہ شوکت کو موسیقی سے بھی کوئی مناسبت ہے۔ مشاعروں میں ترنم سے غزلیں پڑھنے ضرور رسا۔ نوخاستہ شعرا میں آج بھی بیسیوں ہیں کہ جو اس کی غزل سرائی کی نقالی کرتے ہیں۔

عالمگیر جنگِ ثانی میں حکومت وقت نے اپنے پروپیگنڈے کے واسطے دو آدمی منتخب کیے۔ پنجاب میں حفیظ جالندھری اور یو۔ پی میں شوکت، کام یہ تھا کہ شعر و نغمہ کے ذریعے سے عوام الناس کو حالاتِ حاضرہ سے باخبر رکھیں۔ ہزار روپیہ تنخواہ، بھتہ اور سفر خرچ مزید برآں مصارف کا بجٹ شاید ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ۔ اور بھی ہوں گے کہ جنہوں نے اتنے کم وقت میں ایسی محیر العقول ترقی کی مگر شوکت کا ایسا علوِ ظرف نہ دیکھا۔

شوکت کی ہر دلعزیزی

یہ ہرگز نہیں تھا کہ شوکت کا قلم محض گلباری کے لیے وقف ہو، آتشباری پر آجاتا تھا تو خوف معلوم ہوتا تھا کہ کہیں کاغذ آگ نہ پکڑ لے۔

حیرت یہ ہے کہ اس دریدہ دہنی کے باوجود میرے علم میں ایسا کوئی متنفس نہیں ہے کہ جو حقیقتاً اس کا بدخواہ ہو۔ کوئی پھبتی زیب برخود غلط آدمی اس کے منہ آیا، اس کے اعمال و افعال کا تجزیہ کر ڈالا۔ ہر فقرہ ایک طرف تو زعفران زار

اور دوسری طرف جوہرِ تیغ۔

ایک صاحب کو میں جانتا ہوں کہ جو اخبار میں اپنا تجزیہ پڑھ کے جان لینے پر آمادہ شوکت کی راہگذر پر ٹہل رہے تھے۔ وہ اپنے معمولی وقت پر گھر جا رہا تھا، ان کو بہت برافروختہ دیکھ کر بائیسکل سے اتر پڑا۔ دور ہی سے آواز دی کہ خیریت تو ہے، چہرہ نصیبِ اعدا اترا ہوا ہے۔ خدانا کردہ ایسا تو نہیں ہے کہ بیگم صاحب نے اپنی پاپوش کو "قم" کا حکم دے دیا ہو، مگر کیا بات ہے تمہارے حسن و جمال کی، چہرہ پر کسی قدر سیاہی مائل نور تو گردوں برس رہا ہے۔

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بروش بیک نگاہے

جملوں کا طرزِ ادا ایسا تھا کہ وہ خود ہی ہنس پڑے۔ عجب پاجی لونڈا ہے، اور شعر تو میں بھی پڑھتا ہوں سنیئے ؎

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خارا

اس وقت بھی یہ صورت ہے کہ اس کا جو جملہ خیال میں آ جاتا ہے دل تڑپ اٹھتا ہے۔ شوکت کہیں جا رہے ہیں۔ رات ریل میں کاٹنی ہے، ابن سلونوی یا کوئی اور ہم سفر ہیں۔ رات بڑھے ایک برتھ ملی۔ لیٹے اس طرح کہ جس طرف ایک کا سر تھا دوسرے کے پیر تھے (خود ہی لکھا کہ) معلوم ہوتا تھا کہ ڈبہ میں جوتے کا جوڑا رکھا ہے۔ ہے کوئی انتہا اس جملہ میں ظرافت اور بلاغت کی۔

ہندوستان میں شوکت نے اپنی جگہ بنالی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سوسائٹی کی صفِ اوّل میں پہنچ گیا۔ اب نہ دوسرا شوکت پیدا ہوگا اور نہ یہ جگہ پر ہوگی۔ خیر! یہ تو رفتارِ زمانہ ہے اس کا گلہ نہیں۔ صدیاں گزر گئیں دوسرا خسرو نہ پیدا ہوا کہ جو بیک وقت سپاہی، امیرزادہ، امیر، ماہرِ موسیقی، شاعرِ اعظم اور درویشِ کامل ہوتا۔ قرن پہ قرن گزرتے جا رہے ہیں مگر انشا کا جواب نہیں پیدا ہوتا۔

میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ شوکت ان کا ہم رتبہ تھا۔ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔ مگر اتنی مماثلت ضرور ہے کہ شوکت بھی کسی ایک راستہ کا پابند نہیں ہوا۔ جس راستہ پر چلا بڑھتا ہی چلا گیا۔

شوکت پاکستان میں

مشہور ہے کہ ؎

دو چیز آدمی را کشد زور زور　　یکے آب و دانہ دوم خاکِ گور

اس دوہری کشش سے شوکت کیسے نکلتا۔ پاکستان معلوم ہوتا تھا کہ اس کا راستہ ہی دیکھ رہا تھا، سوسائٹی میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اب معاشرت بھی امیرانہ تھی۔ پاکستان کے عمائدین میں کون تھا کہ جو اس کا مداح و گرویدہ نہ ہو۔

راقم الحروف کے ساتھ شوکت کا انداز اس سے کہیں زیادہ پُرخلوص اور برادرانہ تھا کہ جس سے ۳۲ برس پہلے اس کی ابتدا ہوئی تھی۔

۵۴ء میں راقم الحروف کا پاکستان جانا ہوا، اس وقت شوکت لاہور میں ریڈیو سے وابستہ تھے۔ غیر ممکن تھا کہ شوکت

کے ہاں قیام کیے بغیر ہی کراچی چلا جاتا۔ چنانچہ ان کے ہاں دو تین دن قیام ہو گیا۔ ایک روز ریلوے کے ایک آفیسر مسٹر معین الدین نے اپنی ترقی کے سلسلہ میں بہت بڑی دعوت دی کہ جس میں شوکت بھی مدعو تھے۔ اس نے ان کو لکھ دیا کہ لکھنؤ سے میرے بھائی صاحب آ گئے ہیں، میں حاضری سے معذور ہوں۔ خط دیکھ کے مسٹر معین الدین خود دوڑ پڑے۔

شوکت کی خاطر سے مجھ کو جانا پڑا۔ دعوت میں اعلیٰ حکام و عمائدین کا اجتماع تھا اور شوکت ان میں شمعِ محفل۔

شوکت کی عالی ہمتی اور علوِ ظرف کی انتہا ملاحظہ ہو کہ مجھ کو جس سے بھی متعارف کیا یہی کہا کہ آپ جس حال میں مجھ کو دیکھ رہے ہیں وہ انہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔ سچ ہے۔ نہد شاخ پُر میوہ سر بر زمیں۔

شوکت کی بیماری اور سفرِ آخرت

شوکت بیمار ہوا، مرض لاعلاج۔ جگر پر کینسر، علاج معالجہ کے سلسلے میں تمام تر دوا دوش بے کار ہوئی۔ اس نے ہر طرح کی تکالیف اٹھا کے گناہوں کا کفارہ دیا اور رہگرائے عالمِ جاودانی ہوا۔ رہے نام اللہ کا۔

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

تاریخِ انتقال

دلِ خوں گشتہ در فغاں آمد — خاک بر فرقِ این و آں کردم
نالہ چوں گشت ہم ردیفِ زباں — رخنہ در سقفِ آسماں کردم
بہرِ تاریخِ رحلتِ شوکت
سینہ از داغ گلستاں کردم

مسکراہٹوں کا سفیر

ماہر القادری

اللہ تعالیٰ کی اس میں بڑی گہری حکمت پنہاں ہے کہ انسان کو مستقبل کا علم نہیں دیا گیا۔ کوئی آدمی آنے والے ایک لمحہ کے بارے میں بھی قطعی طور پر حکم نہیں لگا سکتا کہ کیا ہوگا؟ عالم الغیب و الشہادہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہ خطاب اللہ کے سوا اور کسی کو زیب نہیں دیتا۔ یہ جوتشی، نجومی، پامسٹ، رمّال اور جفر داں جو انسانوں کے مستقبل کے حالات بتا کر خوب کمائی کرتے ہیں۔ اندھیرے میں اٹکل سے تیر چلاتے ہیں۔ سو نشانے چوک گئے، ایک آدھ نشانہ ٹھیک لگ گیا اور اس ایک نشانہ کی شہرت ہو جاتی ہے! کوئی بچہ بڑے ہو کر کیا بنے گا؟ اس کا حال کسی کو نہیں معلوم!

آج جو دنیا میں مشاہیر سمجھے جاتے ہیں، اپنی زندگی اور شعور کے آغاز میں وہ نہیں جانتے تھے کہ ہم بڑے ہو کر اتنے بڑے آدمی ہو جائیں گے اور یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بدوِ شعور کے بعد زندگی کا آغاز کسی پیشہ سے ہوتا ہے اور مستقبل میں جا کر زندگی کی یہ لائن ہی بدل جاتی ہے۔

شوکت تھانوی مرحوم تھانہ بھون کے رہنے والے تھے۔ یہ قصبہ حضرت اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت سے غیر معمولی شہرت رکھتا ہے۔ یہاں خانقاہِ امدادیہ بھی ہے جو کم و بیش نصف صدی سے دعوت، ارشاد و اخلاق کا مرکز رہی ہے۔ شوکت مرحوم مجھ سے بیان کرتے تھے کہ وہ اپنے بچپن میں بارہا حضرت مولانا تھانویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور ان کے دستِ شفقت سے مَس ہونے کی سعادت انہیں حاصل رہی ہے۔ تھانہ بھون پہلے ہی سے مشہور تھا۔ شوکت تھانوی نے اسے اور زیادہ مشہور کر دیا۔ مولانا تھانوی قدس سرہٗ کی ہم وطنی اور زیارت و صحبت کا یہ اثر تھا کہ شوکت نے اسلامی قدروں پر بعض دوسرے غیر محتاط ادیبوں اور شاعروں کی طرح طنز نہیں کی۔ دین سے وہ ذہنی و فکری لگاؤ رکھتے ہیں۔ ان کی خواب گاہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کا نقشہ آویزاں رہتا تھا اور دفتر جانے سے پہلے وہ اسے آنکھوں سے لگاتے تھے۔

شوکت تھانوی نے کئی مرثیے بھی کہے ہیں۔ ڈاکٹر یاور عباس صاحب کے یہاں کراچی میں سال کے سال بڑی دھوم کی مجلسیں ہوتی ہیں۔ شوکت ایک دن اپنا کہا ہوا مرثیہ پڑھتے اور سننے والوں سے بہت کچھ دادِ تحسین وصول کرتے۔ انہوں نے لکھنؤ میں میر انیس کے پوتے دولہا صاحب عروج، پیارے رشید، فائق اور دوسرے مشہور و معروف مرثیہ خوانوں کو پڑھتے سنا تھا۔ اس لیے

شوکت صاحب کی مرثیہ خوانی میں وہی جھلک پائی جاتی تھی۔ تلوار کی تعریف کا بند پڑھتے تو اپنے ہاتھ کو اس طرح اٹھاتے جیسے سچ مچ تلوار کھینچی ہوتی ہے۔ آواز پاٹ دار تھی جو "تحت لفظ" کے لیے بہت موزوں تھی۔

قصبہ تھانہ بھون جو مولویوں اور مولاناؤں کی مشہور بستی ہے۔ وہاں کے ایک پولیس افسر کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے اس کے بارے میں یہی سوچا جا سکتا تھا کہ وہ بڑے ہو کر یا تو مولوی بنے گا یا محکمہ پولیس کا کوئی عہدیدار! عربی کی مشہور ضرب المثل بھی ہے الولدُ سرٌ لابیہ۔ انگریزی میں یوں کہتے ہیں A CHILD TAKES AFTER HIS FATHER.

اور

ہندی اردو میں یہ کہاوت اس طرح مشہور ہے ——— باپ پر پوت پتا پر گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا

مگر ——— شوکت تھانوی ایک صحافت نگار کی حیثیت سے منظرِ عام پر آتے ہیں۔ شروع شروع میں وہ اخباروں میں سنجیدہ کالم لکھا کرتے تھے۔ یہ ان کا رجحانِ شباب تھا یعنی جوانی کا اُٹھان! جب وہ لکھنؤ پہنچے ہیں تو اچھی طرح مسیں بھیگ چکی تھیں۔ اُن دنوں روزنامہ "ہمدم" کے ایڈیٹر سید جالب دہلوی کی صحافت نگاری اور اخبار نویسی کی بڑی دھوم تھی۔ شوکت تھانوی کو اخباری دنیا میں سید جالب کی رفاقت میسر آئی اور اِس رفاقت سے اُنھوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔

شوکت تھانوی کی شاعری کا آغاز بھی سنجیدہ غزل گوئی سے ہوا اور دوسرے مشاعروں میں وہ غزلیں پڑھتے تھے۔ اُن کی غزلیں کتابی صورت میں چھپ چکی ہیں۔ جناب منظر صدیقی اکبرآبادی (سابق مدیر ماہنامہ "کنول" آگرہ) کا بیان ہے کہ اُن کے والد حضرت سیماب اکبرآبادی مرحوم نے شوکت تھانوی کے اس مجموعہ کلام کا تاریخی نام رکھا تھا۔

شوکت تھانوی شاعری میں مولینا عبدالباری آسی لکھنوی سے نسبتِ تلمذ رکھتے تھے۔ آسی شاگرد تھے حضرت ناطق گلاوٹھوی کے جو داغ کے شاگرد ہیں اور اللہ کے فضل سے ابھی تک بقیدِ حیات ہیں" ان کے نام کے ساتھ "پیرِ خمخانۂ سخن" لکھا جاتا ہے۔

مولانا عبدالباری آسی ضلع میرٹھ کی ایک بستی "اُلدُن" کے رہنے والے تھے۔ وطن کی نسبت کے ساتھ اُن کا نام یوں لکھا جاتا تھا "عبدالباری آسی الدُنی"۔

آسی مرحوم کے کانوں تک یہ خبر پہنچی کہ لوگ اُن کے نام کو "آسی الدُّنی" پڑھتے ہیں یعنی "الدُنی" کی بجائے عربی قاعدہ کے تحت "ل" ساکت اور "دال" مشدد، اس طرح "دَنی" تلفظ کرتے ہیں۔ "دَنی" عربی میں سفلہ، کمینہ اور نکس کو کہتے ہیں۔ اس کے بعد آسی صاحب اپنے نام کے ساتھ "الدُنی" کی بجائے "لکھنوی" لکھنے لگے۔ لکھنؤ اُن کا وطن ثانی تھا۔ نولکشور بُک ڈپو سے ملازمت کا تعلق تھا۔ شوکت تھانوی اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ جناب آسی لکھنوی سے اُنھوں نے شعر و سخن میں مشورہ اور استفادہ کیا ہے۔

شوکت تھانوی مرحوم کا غالباً پہلا افسانہ جس سے وہ دُنیائے اُردو میں متعارف ہوئے "اُردو کا جوڑ" ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب مُلا رموزی کی "گلابی اردو" بہت پسند کی جاتی تھی۔ اور اردو زبان و ادب میں مُلا رموزی شاید پہلے شخص ہیں جن کے مضامین کا معاوضہ دیا جاتا تھا۔

شوکت تھانوی کے مزاحیہ افسانے اور تیکھے رسالوں اور اخباروں میں آنے لگے۔ یہاں تک کہ "سودیشی ریل" نے انہیں خاصا مشہور کر دیا اور اس کے بعد ان کی جو کتاب بھی مارکیٹ میں آتی وہ مقبول ہوتی اور اربابِ ذوق اُن کی نئی نئی کتابوں کے مشتاق اور منتظر رہتے

اُردو مزاح نگاروں میں زبان و روزمرہ کا سب سے زیادہ صحیح استعمال مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریروں میں ملتا ہے۔ شوکت تھانوی بھی زبان کے معاملہ میں بہت زیادہ محتاط تھے اور نازک سے نازک خیال کو سلجھا کر پیش کرتے تھے، ان کی تحریروں میں کوئی الجھاؤ اور ابہام نہیں، وہ سیدھی سادی بات کو بلا وجہ دقیق، نازک اور فلسفیانہ بنانے کی کوشش نہیں کرتے، مزاحیہ مضامین میں بھی پڑھنے والے کے دماغ کو سوچنا پڑے تو یہ مزاح کا بگڑ ہے کچھ اور ہے۔ شوکت کے مضامین پڑھتے وقت ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آجاتی ہے۔ اور کبھی کبھی ہنسی اور قہقہہ کی آواز بھی نکل جاتی ہے۔ ان کا پیش کیا ہوا ادب "واہ" ہے "آہ" نہیں ہے۔ مگر جہاں "واہ" اور "آہ" کا امتزاج ملتا ہے، وہاں تاثیر کا عجیب عالم ہے۔

شوکت تھانوی ہر چیز کا مشاہدہ بڑی گہری نگاہ سے کرتے تھے۔ اس لئے ان کے یہاں سیرت نگاری اور منظر کشی میں ایک جزئیت کی تصویر ملتی ہے۔ طنزیہ مضامین میں بعض مقامات پر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "لیلیٰ کے خطوط" کے مصنف قاضی عبدالغفار مراد آبادی کا قلم حرکت میں ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ طنز نگاری میں قاضی عبدالغفار کے مقلد تھے، ہاں، غیر شعوری طور پر لکھنے کے انداز میں کبھی کبھار توارد ہو جاتا تھا۔ شوکت نے اپنی شخصیت، فن کاری اور شہرت و مقبولیت کی دُنیا خود بنائی تھی۔ وہ کسی پروپیگنڈے کے سہارے مشہور نہیں ہوئے "اُن کا فن" ان کی شہرت کا سبب ہے۔

بعض شاعروں اور انشا پردازوں کو دیکھا گیا ہے کہ ذرا سی شہرت ہوئی اور آپے سے باہر ہو گئے۔ ان کی عام زندگی کے توازن میں فرق آجاتا ہے۔ مگر شوکت تھانوی پاکستان و ہندوستان گیر شہرت حاصل کرنے کے باوجود اپنے کو سنبھالے رہے۔ یہ دلیل ہے اُن کے عالی ظرف ہونے کی۔ اب رہیں تھوڑی بہت انسانی کمزوریاں تو اس سے کون انسان خالی ہے۔ اس مضمون کا لکھنے والا سب سے پہلے اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتا ہے۔ شوکت تھانوی بھی انسان تھے فرشتہ نہ تھے۔ اب سے سات آٹھ سال پہلے کی بات ہے، ملتان میں مشاعرہ تھا، شاعروں کو نذرانہ دینے میں مشاعرے والوں کی طرف سے تاخیر ہو گئی، شوکت تھانوی اس پر اس قدر برہم ہوئے اور اتنے بگڑے کہ ہم دوسرے شاعروں کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ ان کی برہمی کے سبب ہمارے معاوضہ کی رقم میں کہیں کھنڈت نہ پڑ جائے۔

تقسیم ہند سے پہلے شوکت تھانوی مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے متعارف نہیں تھے۔ سب نے انہیں کسی مشاعرے میں نہیں دیکھا۔ اُنہوں نے اس زمانے میں لکھنؤ کے ایک بہت بڑے شیعہ مجتہد کی موت پر ایک طنزیہ مرثیہ البتہ کہا تھا جسے وہ پاکستان بننے کے بعد بھی خاص محفلوں میں سُناتے تھے۔

یہ اُس دَور کا ذکر ہے جب ہندوستان میں عنقا لکھنوی کے بھائی ظریف لکھنوی اور احمق پھپھوندوی کی مزاحیہ شاعری کی بہت شہرت تھی۔ سر سیتا رام جو برسوں یوپی لیجسلیٹو کونسل کے اسپیکر رہے ہیں اور پاکستان میں ہندوستان کے ہائی کمشنر بھی تھے۔ ان کی صدارت میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرے میں ظریف لکھنوی نے اپنی غزل کا مطلع پڑھا ؎

نر ہے یا مادہ عجب ترکیب ہے اس نام کی
کچھ حقیقت ہی نہیں کھلتی ہے سیتا رام کی

پاکستان بننے کے بعد شوکت تھانوی ایک مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے منظر عام پر آئے اور دیکھتے دیکھتے مشہور اور مقبول ہو گئے۔ بمبئی اور دہلی کے مشاعروں میں بھی اُن کو بار ہا بلایا گیا اور ہر مشاعرے میں کامیاب رہے۔

شوکت تھانوی شعر سنجیدہ انداز اور سادہ ترنم میں پڑھتے تھے۔ ان کے ترنم میں قدرے غنائیت بھی ہوتی تھی۔ آواز قریب قریب پاٹ دار تھی۔ مشاعرے میں اپنا مزاحیہ کلام سناتے تو سننے والے ہنسی کے مارے "لوٹن کبوتر" بن جاتے۔ مگر شوکت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی نہ آتی۔ بڑے تجربہ کی بات کہی تھی علامہ اقبال نے کہ اگر قوالی میں قوال کو بھی حال آجائے تو قوالی کا لطف ہی جاتا رہے۔

مشاعروں میں شاعروں کے ناموں کی فہرست کی ترتیب پھر انہیں مشاعرے کا رنگ دیکھ کر شعر خوانی کے لیے اسٹیج پر بلانا، یہ ایک طرح کا آرٹ ہے اور شوکت تھانوی کو یہ آرٹ آتا تھا۔ مشاعروں کے وہ کامیاب کنڈکٹر تھے۔ مگر اس کی بدولت انہیں بعض شاعروں کی خفگی بھی برداشت کرنی پڑتی۔ جو شاعر مشاعرے میں کامیاب نہ رہتا وہ اپنی ناکامی کا الزام شوکت تھانوی کے سر دھرتا کہ انہوں نے مجھے غلط نمبر پر اور ناساز گار فضا میں پڑھنے کے لیے بلایا۔ دُنیا میں یہی ہوتا ہے کہ جس کسی سے عوام کی ذمہ داری متعلق ہوتی ہے۔ اُسے کسی نہ کسی نوعیت سے ہدفِ ملامت ضرور بننا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اس دُنیا میں ہر کسی کو کوئی بھی خوش نہیں رکھ سکتا۔ جس سے کوئی بھی ناراض اور شکوہ سنج نہ ہو، سمجھ لو کہ وہ آدمی منافق ہے۔ ہمہ شمہ کا ذکر کیا ہے۔ نبیوں اور رسولوں تک سے لوگوں کو شکایتیں رہی ہیں، اور وہ سب کو خوش نہیں رکھ سکے۔ اور ہاں، انبیاء اور رسول تو پھر انسان ہیں اللہ میاں تک سے بعض جہلا اور سفہا شکایتیں رکھتے ہیں۔

اِنشا پردازوں اور خاص طور سے شاعروں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ رہنے سہنے اور لباس وغیرہ کے معاملہ میں بے پروا بلکہ بدسلیقہ ہوتے ہیں۔ مگر شوکت تھانوی بڑے قرینہ اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ میں نے انہیں کبھی میلے تو کیا ملگجے کپڑے پہنے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ ہمیشہ صاف ستھرا لباس، کنگھے کی ڈبیہ سے لے کر عینک کی کمانیوں تک ہر چیز اُجلی اور خوش منظر، چوڑی دار پاجامہ پہنتے تو کس اہتمام اور سلیقہ کے ساتھ اُس کی چُنٹوں کو جماتے۔

محفلوں میں اُن کے دم سے رونق تھی، کیسے کیسے مزیدار لطیف لطیفے بیان کرتے اور دوسروں کے لہجہ، گفتگو اور طرزِ ادا کی نقلوں سے محفل کو دیوار قہقہہ بنا دیتے۔ نقل کرتے ہوئے وہ ایک ایک جزئیہ کا خیال رکھتے۔ اِس فن میں وہ بڑے مشاق اور دیدہ ور تھے۔

شوکت تھانوی مرحوم کے لطائف تحریری بھی ہیں اور تقریری بھی۔ انجمن ترقی اُردو کا سالانہ اجلاس تھا۔ سردار عبدالرب نشتر مرحوم جو اس وقت مغربی پاکستان کے گورنر تھے، اس کے صدر تھے۔ شوکت نے اِس اجلاس میں اپنا مضمون سنایا۔ اُن کے اِس ایک جملہ پر ———

"بعض لوگ پڑھنے میں املا کی غلطی کرتے ہیں"
سب لوگ مسکرانے لگے اور سردار نشتر مرحوم تو جھومنے لگے۔

مولانا سہا بھوپالی نے بچگانہ قد و قامت اور صورت پائی تھی۔ اُن کے اس "بہ قامت کہتر" ہونے کی کس خوبصورتی اور پُرلطف انداز میں شوکت تھانوی نے ترجمانی کی ہے۔ ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک محفل میں بہت دیر تک گراموفون بجتا رہا۔ جب گراموفون کا ڈھکنا بند کیا گیا تو پتہ چلا کہ اُس کی آڑ میں مولانا سہا بھوپالی بیٹھے تھے۔

شوکت نے اپنی مشہور کتاب "شیش محل" میں متعدد شخصیتوں کے خاکے مُوئے قلم سے بنائے ہیں۔ ایک بزرگ "افقر موہانی" ان کے نام کے ساتھ "لسان الطریقت" لکھا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے جو انہیں ایک بار دیکھ لے گا وہ دوسری بار دیکھنے کی تمنا کرے گا۔ شوکت تھانوی نے ان کے بارے میں ایک حرف بھی اپنی طرف سے نہیں لکھا، اُن کا نام صفحہ کے سر نامہ پر لکھ کر اس کے نیچے یہ مصرع

لکھ دیا ہے

؎ بسیار خوباں دیدہ ام ، لیکن تو چیزے دیگری

فارسی کا مصرعہ کس قدر صحیح ، موزوں اور برمحل استعمال - اس ایک مصرعہ نے صاحب شخصیت کے اوصاف و خصائل ، حلیہ وضع قطع اور حرکات و سکنات کا ست نکال کر رکھ دیا ہے - اس مصرعہ کو شوکت تھانوی نے منتخب کر کے طنز و مزاح کا جو لطف پیدا کر دیا ہے اس کی تعریف ہی نہیں ہو سکتی ، مگر اس سے ان کے وجدان و ذوق کی لطافت کا بھی اندازہ ہوتا ہے -

شوکت تھانوی اور میں جس محفل میں یکجا ہوتے دونوں طرف سے خوب چھیڑ چھاڑ اور فقرے بازی رہتی - بعض اوقات مشاعروں میں وہ مجھے اس تعارف کے ساتھ بلاتے :- ——— "حضرات ! مشاعرے کو مقدس بنانے کے لئے اب حضرت مولانا الحاج ماہر القادری کو زحمت دی جاتی ہے ..." (حضرت اور الحاج کی "ح" کا قرأت کے ساتھ تلفظ ادا کرتے ہوئے) -

ایک محفل میں بولے ...... سب لوگ ہاتھوں سے تالیاں بجاتے ہیں اور یہ مولانا (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) پیروں سے تالیاں بجاتے ہیں -

مشاعروں میں اکثر و بیشتر مجھ سے "جمنا کا کنارا" پڑھنے کی فرمائش ہوا کرتی ہے - اس نظم کا آخری شعر یہ ہے ؎

اے بت کدۂ ہند کے بے ترشے ہوئے بت !
بخشم بہ نگاہ تو سمرقند و بخارا !

میں نے ایک ادبی نشست میں یہ نظم سنائی تو شوکت تھانوی بولے ! ماہر تم نے فارسی مصرعہ پڑھ کر اس بیچاری دیہاتی لڑکی کو بھگا دیا - اس قسم کی پھلجھڑیاں تو وہ ہر محفل میں چھوڑتے رہتے تھے -

تین سال پہلے کی بات ہے ——— کراچی میں "انڈو پاک مشاعرہ" تھا - میں نے باہر سے آئے ہوئے شاعروں کی دعوت کی ، شوکت تھانوی کو اس دعوت کا علم ہوا تو شکایت کی کہ تم نے مجھے نہیں بلایا - میں نے کہا کہ بھائی - میرے فلیٹ کا جو مردانہ کمرہ ہے اس میں چودہ آدمیوں سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے ، جگہ کی کمی کی وجہ سے آپ اور بعض دوسرے احباب کو بھی تکلیف نہ دے سکا - اس دن کے بعد جب وہ ملتے تو مزاحاً کہا کرتے تھے ——— "میرا شمار ان چودہ (۱۴) آدمیوں میں ہوگا یا پندرھواں سولھواں نمبر ہے ؟"

۱۹۶۰ء میں مظفر آباد (آزاد کشمیر) میں خاصا شاندار مشاعرہ ہوا - سب شاعروں نے اسٹیٹ ویگن میں سفر کیا - یہ راستہ ہے تو بڑا دلچسپ اور مناظر خیز - مگر جب جلدی جلدی موڑ آتے ہیں ، ساتھ ہی نشیب فراز بھی ، تو بعض مسافروں کو چکر آجاتے ہیں اور طبیعت مالش کرنے لگتی ہے - کوہ مری اور کوہالہ کے درمیان میری طبیعت بگڑنی شروع ہوئی یہاں تک کہ ویگن کو رکوانا پڑا اور میں نے نیچے اتر کر قے کر ڈالی ، استفراغ کے بعد طبیعت ہلکی ہوگئی - جب ہم سوار ہو کر روانہ ہونے لگے تو شوکت تھانوی مجھ سے بولے !

"تم نے بڑی قرأت کے ساتھ قے کی"

سب لوگ ہنسنے لگے اور میں بھی کچھ تلملا کر اور کچھ مسکرا کر رہ گیا -

شوکت تھانوی خود اپنی ذات سے مجموعہ لطائف و ظرائف تھے اور ساتھ ہی لطیفہ ساز اور لطیفہ گر تھے - وہ دوسروں کی کیسی کیسی نقلیں محفلوں میں کرتے - ایک دفعہ لکھنؤ کی پرانی صحبتوں کا ذکر چل پڑا - یہاں تک کہ وصل بلگرامی کا تذکرہ بھی درمیان میں آگیا ، شوکت تھانوی

نے کہا یہ شخص بڑا ہی ریش و نش عجیب پُر لطف حرکتیں کرتا تھا۔ ایک بار چند شعرا کسی مشاعرے میں جا رہے تھے۔ چار باغ جنکشن پر ایک نوجوان انگریز لڑکی ٹہل رہی تھی۔ سب دوستوں نے وصل بلگرامی سے کہا کہ اگر تم اس لڑکی کا منہ چوم لو تو دس روپیہ ہاتھ کے ہاتھ تمہاری نذر کئے جائیں گے۔ اس شخص نے ہامی بھر لی۔ سب لوگ حیران تھے کہ ایسا ہو کیسے سکتا ہے۔ یہ سب اب سے چالیس برس پہلے کی بات ہے۔ جب نیم انگریز ریلوے ڈرائیور سے ہاتھ ملانے میں ہندوستانیوں کے ہاتھ تھرا جاتے تھے۔

وصل بلگرامی اس انگریز لڑکی کے پاس پہنچے۔ اُسے غور سے دیکھتے جاتے ہیں اور آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ تھوڑی دُور جا کر وہ پلٹ آتے۔ اور لڑکی کے اردگرد چکر لگانے شروع کئے اور پھر ایکا ایکی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ کر اس کا منہ چوم لیا اور منہ چومنے کے بعد رونے لگے۔ پلیٹ فارم پر دوسرے مسافر اور اس لڑکی کے ساتھی سب ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔ وصل صاحب کی ڈاڑھی آنسوؤں میں تر ہوئی جا رہی ہے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہے ہیں۔ میری لڑکی کا عین مین یہی حلیہ تھا، بالکل اسی طرح کا ناک نقشہ، ایسا ہی بوٹا سا قد، اس جانہار کی اتنی ہی عمر ہوگی جب وہ اللہ کو پیاری ہوئی ہے۔ شوکت تھانوی کہتے تھے کہ وصل بلگرامی کی اس حرکت پر کسی قسم کا نوٹس لینا تو ایک طرف رہا اُس لڑکی کے رشتہ دار وصل صاحب کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنے لگے۔ وہ رو دھو کر پھر دوستوں کے پاس آئے، دس روپیہ کی نذر وصول کی۔ اور جن لبوں پر بناوٹی آہ و فریاد تھی ان پر اب سچی ہنسی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔

بے تکلفی کی محفلوں میں شوکت کی کتنی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اُن کی لطیفوں کی نقل بعض احباب کرتے ہیں مگر وہ بات کہاں آتی ہے۔

پاکستان بننے سے پہلے دو بار ان سے ملاقات ہوئی تھی مگر یہ بہت ہی سرسری اور رواروی کی ملاقات تھی۔ ان سے بے تکلفی پاکستان بننے کے بعد ہوئی۔ کیسا ہی سنجیدہ اور ثقہ آدمی کیوں نہ ہو اُسے بے تکلف کرنے میں شوکت تھانوی ید طولیٰ رکھتے تھے۔

ریل میں، لاری میں، بس میں اور ہوائی جہاز میں، نہ جانے کہاں کہاں میرا ان کا ساتھ اور ہمسفری رہی ہے۔ کئی کئی دن ایک جگہ ٹھیرے ہیں۔ کیا باغ و بہار آدمی تھا، مزاج میں کس درجہ شوخی اور طبیعت میں کس قدر شگفتگی تھی۔

ایک بار میں نے ان سے کہا کہ میں نے "لٹل سی" (LITTLE - SEA) میں غزل کہی ہے۔ بہت دیر تک سوچتے رہے کہ میں نے "زبانِ راز" میں کیا کہہ دیا۔ یہ دیکھ کر کہ یہ معمّا ان سے حل نہیں ہو رہا ہے۔ میں خود بول پڑا —— "چھوٹی بحر"! میرے اس کہنے پر زور سے قہقہہ لگایا۔ میں نے پھر کہا میں نے تمہارے نام کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ بولے کیا؟ میں بولا (GRANDEUR-OF POLICE STATION) اپنے نام کا انگریزی ترجمہ سن کر وہ ہنسے ہیں تو ہنستے ہی رہے۔ روزنامہ "جنگ" کے فکاہی کالم میں اس واقعہ کا ذکر بھی کیا۔

شوکت تھانوی بہت ہنس مکھ، ملنسار اور خوش مزاج تھے۔ مگر خلافِ طبیعت بات سُنتے تو چہرہ تمتما جاتا، اپنی ذات پر تنقید کم ہی برداشت کرتے۔

شوکت تھانوی مرحوم نے اُردو زبان و ادب کو قہقہے، مسکراہٹیں، چٹکیاں اور گدگدیاں دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو پُر بہار اور ان کی آخرت کو تبسم زار بنا دے اور جنت میں بھی وہ حوروں کے ساتھ شوخیاں اور اٹھکیلیاں کرتے نظر آئیں (آمین)

آہ شوکت تھانوی

امین سلونوی

اردو ادب کے مایہ ناز خدمت گزار، ہر وقت باغ و بہاری زندگی گزارنے والے شوکت تھانوی ۴ مئی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ ہماری شمع انجمن خاموش ہو گئی اور ایک سناٹا چھا گیا ہمیں یہ اطلاع ٹھیک اس وقت ملی جب کہ ہم لوگ لکھنؤ میں عید قربان کے روز نماز عید کے لئے عیدگاہ میں موجود تھے۔ اس وقت ہم لوگوں پر کیا کیفیت طاری ہوئی اور میں کیسے گھر تک پہنچا اور اس سانحہ کو کیسے برداشت کیا۔ اب یہ بتانے کا وقت نہیں۔ مشیت خداوندی سے کون لڑ سکتا ہے۔ اور اسی کا نام صبر ہے۔

شوکت تھانوی ایک بلند پایہ مزاح نگار، اخبار نویس ادیب اور شاعر تھے۔ لیکن ان کی رگ رگ میں مزاح رچا اور بسا ہوا تھا۔ ان کے قلم سے خواہ کتنا ہی سنجیدہ مضمون لکھا جاتا۔ ان کی فطری مزاح نگاری کی صلاحیتیں نمایاں ہو کر رہتیں۔ شادی ہو یا غم ہر موقع پر شوکت کی متین مزاحی فطرت پژمردہ سے پژمردہ انسان کو بھی بغیر ہنسائے نہ رہتی تھی۔ مگر افسوس کہ اسی شوکت تھانوی کا ایک مختصر علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ کافی عرصہ ہوا جب کہ مرحوم نے ایک خط کے ذریعہ یہ اطلاع دی تھی کہ انہیں حکومت نے تمغہ امتیاز عطا کیا ہے۔ اور اسی تمغہ امتیاز کے حاصل کرنے کے لئے وہ غالباً راولپنڈی سے لاہور آئے۔ اور پھر واپس جانے کی مہلت موت نے نہ دی۔ جب وہ اسپتال داخل ہوئے تو پھر ان کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ محفلوں کو زعفران زار بنانے والے، روتوں کو ہنسانے والے اپنے دوستوں اور عزیزوں کو سوگوار بنا کر رخصت ہو گئے۔

شوکت مرحوم کا آخری خط جو انہوں نے راولپنڈی سے ۸ ر فروری ۱۹۶۳ء کو لکھا تھا۔ وہ مجھے یہاں ۱۳ ر فروری ۱۹۶۳ء کو موصول ہوا۔ خط کا انداز ایسا تھا جو اب سمجھ میں آیا کہ وہ ان کا میرے نام آخری خط تھا جس میں انہوں نے اپنی عادات کے مطابق "میاں پیارے امین" لکھ کر مخاطب کیا تھا اور اپنی آخری کتاب "کچھ یادیں اور کچھ باتیں" مرتب کرنے میں مجھ سے یہ خواہش کی تھی کہ اس کے لئے لکھنؤ کے وہ حضرات جن سے مرحوم بے تکلف تھے۔ اور اس میں اولیت میرے نام کو دی گئی تھی اور اس کے بعد نسیم انہونوی۔ مولانا آسی۔ سید جالب دہلوی۔ وصل بلگرامی، رفیع احمد خاں سراج لکھنوی۔ قدیر لکھنوی، ظریف لکھنوی، حکیم ڈاکٹر محمد امین، عبدالرؤف عباسی ایڈیٹر حق۔ مسٹر انیس احمد عباسی، ایڈیٹر حقیقت، صباح الدین عمر وغیرہ حضرات کی تصاویر فوراً مہیا کروں۔ اور اپنی عادت کے مطابق خط میں لکھا تھا کہ پیارے امین، خیریت اور عافیت کے تمام تکلفات کو چھوڑ کر اپنے چند لمحات مجھ پر قربان کرو اور ابھی یہ کام

کر دو کہ ان حضرات کی تصاویر حاصل کر کے ان کے متعلق اور تفصیلات بھی جلد روانہ کر دو۔ مرحوم ہمیشہ اسی نوع کے خط لکھا کرتے تھے اور چونکہ ہم لوگوں میں کسی قسم کا تکلف نہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ وہ جب تک یہاں رہے ہمارا (میں نسیم انہونوی اور مرحوم) اتحاد ثلاثہ ہر زبان پر رہا۔ بلکہ اُسے لوگوں نے یہاں تک شہرت دی کہ بعض لوگوں نے باپ بیٹا روح القدس والی بات بھی کہہ ڈالی۔ اور اگرچہ ان کے پاکستان میں رہ جانے سے اس اتحاد ثلاثہ میں تھوڑا سا رخنہ پڑا۔ مگر عملاً یہ اتحاد شکست نہیں ہوا جس کی ابتدا ۱۹۲۸ء میں سرپنچ کے اجراء سے ہوئی تھی۔ شوکت مرحوم میں اور نسیم انہونوی کو ایک دنیا ایک جان تین قالب سمجھتی تھی اور تھا بھی یہی۔

میری اور ان کی ملاقات بالکل ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ میں اس زمانہ میں رسالہ نقاد کی ادارت کر رہا تھا۔ اور شوکت سے بذریعہ ڈاک متعارف تھا اور دونوں ایک دوسرے کو بڑا بزرگ اور بڑا جہاندیدہ سمجھتے تھے۔ لیکن ایک دن یہ پردہ اٹھا اور ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ اور اس ملاقات کے لیے پہلے سے خطوط کے ذریعے طے تھا مگر پھر بھی جب ایک دوسرے کے سامنے آئے تو دونوں حیرت میں تھے۔ شوکت نے کہا کہ ارے آپ امین سلونوی۔ میں نے کہا کہ اور آپ وہ شوکت تھانوی ہیں۔ دفتر نقاد میں کام کرنے والے لوگ بھی اس ملاقات کو دیکھ رہے تھے اور متحیر تھے کہ معاملہ کیا ہے۔ دونوں کی عمروں میں دو چار سال کا فرق تھا۔ بہرحال ایک دوسرے سے ملے۔ اور پھر یہ دوستی اور رفاقت آخر وقت تک قائم رہی۔ شوکت بڑے ذہین انسان تھے لکھنے پڑھنے میں وہ بالکل ریل سے مطابقت رکھتے تھے۔ لیکن ان کا فطری ذوق شعری اور مزاح نگاری رسالہ نقاد کے ذریعے پہلے اہل دنیا کے سامنے آیا۔ اور پھر اس کے بعد جب ہم تینوں یکجا ہو گئے تو نسیم انہونوی نے رسالہ انکشاف میں اُن کے مضامین شائع کیے اور ان کا مجموعہ بھی مرتب ہوا۔ میں شوکت مرحوم اخباری دنیا میں مدتوں ایک ساتھ رہے۔ روزنامہ ہمدم میں سید جالب دہلوی مرحوم کی عنایت اور مہربانی ہم دونوں پر یکساں رہی۔ شوکت نے وہاں دو دو باتیں لکھنا شروع کیا۔ اور میں نے مقامی خبروں کی ذمہ داری سنبھالی۔ اور اس کے بعد لکھنؤ کے سب سے بڑے اور وضعدار اخبار "اودھ اخبار" میں ہم دونوں ایک ساتھ کام کرتے رہے۔ وہاں بھی شوکت مزاحیہ کالم لکھتے تھے اور مجھے اداریہ سپرد کیا گیا تھا۔ لکھنؤ میں مسٹر رام لال ورما جو روزنامہ سرپنچ کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے لکھنؤ سے روزنامہ "ہند" کے نام سے اخبار جاری کیا میں اور شوکت دونوں وہاں بھی ساتھ رہے۔ اور سرپنچ میں تو مستقل طور پر ہم دونوں کام کرتے تھے۔ اور پھر شوکت نے خود بھی ایک روزنامہ طوفان کے نام سے جاری کیا ظاہر ہے کہ شوکت کا اخبار تھا۔ میرے اوپر پوری ذمہ داری تھی۔ سرپنچ کے دور میں ہم تینوں ایک ہی ساتھ سفر کرتے ایک ہی ساتھ روزانہ اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا اور دوسرے غلط اور صحیح مشاغل بھی عام طور پر ہم لوگ دہلی ہر مہینہ سفر کرتے۔ اور بعض لوگوں کے واسطے ہوٹل میں بیٹھ کر رات بھر میں متعدد مضامین لکھ کر سپرد کرتے تھے وہ ایسے لوگ تھے جن سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور انکار کس سے کیا جاتا۔ جنہیں دیکھنے اور ملنے لکھنؤ سے دہلی کا سفر کیا جاتا تھا؛ وہ دور یاد آتا ہے۔ دل روتا ہے۔ وہ بھی کیا دن تھے۔

لکھنؤ میں جب آل انڈیا ریڈیو کی بنیاد پڑی تو شوکت مرحوم مستقل طور پر آل انڈیا ریڈیو میں شامل ہو گئے۔ اس زمانہ میں جو لوگ ریڈیو کے عملے اور اسٹاف میں تھے۔ سبھی ادیب سبھی اعلیٰ اخلاق و کردار کے مالک لوگ تھے۔ انہوں نے اس اسٹیشن سے مزاح اور طنز کو کافی ترقی دی کبھی کبھی میرے اور شوکت کے درمیان آل انڈیا ریڈیو سے وقتی مزاحی مکالمے بھی نشر ہوتے تھے۔ اور ہم دونوں مختلف نوع کی تخلیقات برابر نشر کرتے رہتے تھے۔ جب تک لکھنؤ میں آل انڈیا ریڈیو کا اسٹیشن قائم نہیں ہوا تھا ہم لوگ دہلی اسٹیشن پر

کئے جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے دہلی اسٹیشن سے میں نے بیوی کے لکچر کا ایک ٹکڑا نشر کیا اور کافی پسند کیا گیا اور شوکت نے مزاحیہ انداز میں ایک افیمی کی جنت کا خاکہ پیش کیا تھا۔ یہ تھی وہ ابتدا جب کہ ہم لوگ نشری میدان میں داخل ہوئے۔ میں نے بیوی کے لکچروں کا مجموعہ مرتب کیا انہوں نے منشی جی کا کردار ادا اور یہ سلسلہ مدتوں جاری رہا۔

آل انڈیا ریڈیو ہی سے شوکت مرحوم کو پنچولی آرٹ والوں نے لاہور کھینچ لیا اور وہ وہاں دو ایک ہی سال رہے تھے کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ یہ زمانہ ۱۹۳۹ء کا تھا۔ ملک کا جو قومی ڈھانچہ ایک ہر دلعزیز حکومت نے قائم کیا تھا وہ ختم ہو گیا۔ کیونکہ ابھی تک برطانوی اقتدار باقی تھا۔ محض اسمبلیوں میں کانگریس آ گئی تھی۔ اور برطانوی اقتدار کے سامنے اپنی قومی عزت اور اپنی حیثیت کے سوا کوئی چیز نہ تھی۔ جنگی پراپیگنڈا کے واسطے جنگ کے دوسرے سال کل ہند بنیادوں پر مرکزی حکومت نے عوام و خواص میں بیداری اور جنگی سرگرمیوں سے آگاہی کے لئے "سانگ پبلسٹی" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا اور ہندوستان کے گوشے گوشے میں اسے وسعت دی جانے لگی۔ اتر پردیش میں بھی ریاستی پیمانہ پر "سانگ پبلسٹی" کی بنیاد رکھی جانے والی تھی۔ لیکن ابھی تک اس کا کوئی انچارج منتخب نہیں ہوا تھا۔ کل ہند سانگ پبلسٹی کا ڈائریکٹر ابوالاثر حفیظ جالندھری کو مقرر کیا گیا تھا۔ اور حفیظ صاحب ہی اس کی تنظیم میں لگے ہوئے تھے۔ ان کا ایک پیغام ہمارے پاس بھی پہنچا تھا۔ اسی زمانہ میں ہم لوگ شہر میں یوم اردو منانے کے لئے جد و جہد کر رہے تھے اور اس کے واسطے مختلف مقامات کے دورے میں اور حضرت قدیر لکھنوی کر رہے تھے۔ اور اسی یوم اردو کے سلسلہ میں دہلی بھی جانے کا اتفاق ہوا اور حفیظ صاحب سے دہلی ہی میں ملاقات ہوئی ان کی خواہش تھی۔ کہ میں اتر پردیش کی ذمہ داری سنبھال لوں میں ساری عمر نوکری سے بھاگتا رہا اور پھر برطانوی اقتدار کے ساتھ تعاون کرنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ اگرچہ میں کسی سیاسی پارٹی میں شامل نہ تھا۔ لیکن پھر بھی ملک کی آزادی کی تڑپ میرے دل میں بھی تھی۔ اور ملک میں جو تحریکات جنم پا رہی تھیں۔ میں پورے طور پر ان کے ساتھ تھا۔ اس لئے میں نے ایسے ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ جب کہ ملک کی آزادی کی جد و جہد شدت کے ساتھ جاری تھی اور آل انڈیا کانگریس کے ۴۹ ویں اجلاس کے موقعہ پر ایک قومی مشاعرہ میں اور پنڈت آنند نرائن ملا کہہ چکے تھے۔ اس لئے میں اس نظریے کا نہ تھا کہ اس ادارہ میں شامل ہو جاتا۔ لیکن میں نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ شوکت صاحب کو لاہور سے بلا لیں وہ اس کے واسطے موزوں ثابت ہوں گے اور اس لئے بھی کہ ان کے اندر سانگ پبلسٹی کے سنبھالنے کی صلاحیت بھی تھی۔ اور یہ بھی میری خواہش تھی۔ کہ شوکت پھر لکھنؤ آ جائیں چنانچہ حفیظ صاحب نے میری اس تجویز کو پسند کیا اور شوکت مرحوم کو اتر پردیش میں سانگ پبلسٹی کا ڈائریکٹر مقرر کر کے انہیں لاہور سے یہاں بلا لیا اور ہم دونوں پھر یکجا ہو گئے۔ انہوں نے لکھنؤ میں اس ادارہ کا دفتر قائم کیا۔ اور کام شروع ہو گیا۔ سانگ پبلسٹی کے ذریعہ شعراء کو بھی کچھ نہ کچھ نوازا جاتا تھا۔ مقصد سے متعلق دو چار اشعار لکھنے والے کو بھی دس بیس روپے ملتے تھے۔ گویا یہ سرکاری طور پر معاوضہ مقرر کیا گیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ اس ادارہ سے کون کون لوگ فیضیاب ہوئے۔ لیکن میں نے شوکت مرحوم سے ایک پیسہ بھی اس سلسلہ میں کبھی نہیں لیا۔ اس کے جاننے والے آج بھی وہ شعراء موجود ہیں جو مستقل طور پر اس ادارہ میں ملازم تھے۔ ان میں حضرت طیش لکھنوی اور بسمل الہ آبادی دونوں حضرات اس ادارہ سے متعلق تھے میں نے معاوضہ لینے سے انکار کر دیا۔ البتہ شوکت کی دوستی کی وجہ سے تعاون کا یقین دلایا اور وہ تعاون برابر دیتا رہا۔ اگرچہ حضرت حفیظ نے شوکت مرحوم سے شکوہ کیا کہ ان کے مخصوص دوست ان کے ساتھ اشتراک اور تعاون نہیں کر رہے ہیں لیکن جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے حفیظ صاحب سے بات چیت

کی اور انہیں بتایا کہ اشتراک اور تعاون کا مقصد معاوضہ حاصل کرنے سے نہیں پورا ہوتا ہے۔ میں شوکت سے تعاون کروں گا۔ لیکن اپنے نظریات چند پیسوں کے واسطے فروخت کرنے پر تیار نہیں ہوں۔ اور میں نے ان کی غلط فہمی بھی دور کی۔ خود شوکت مرحوم کو اقرار تھا کہ میرا تعاون انہیں رات دن حاصل رہتا ہے۔ بہرحال میرے اور شوکت مرحوم کے درمیان جو تعلقات قائم تھے وہ برابر قائم رہے۔ اس میں کبھی کوئی کمی نہیں ہوئی

آج شوکت کی موت نے ایک زبردست خلا پیدا کر دیا ہے۔ اور اس کا پر ہونا ممکن نہیں ہے۔ جب تک وہ لکھنؤ میں رہے طنز و مزاح کی دنیا میں اکثر بڑے بڑے معرکے ہوئے۔ اور سرپنچ کے ذریعہ مزاح نگاروں کا ایک وسیع حلقہ سا بن گیا تھا۔ اور اسی حلقہ کے لوگ کبھی کبھی عنوان مقرر کر کے مزاحیہ مضامین لکھتے اور حلقہ کے ممبران کو طبع آزمائی کی دعوت دی جاتی تھی۔ اور اکثر مضامین اسی سلسلہ میں لکھے گئے۔ سودیشی عنوان کے تحت شوکت نے سودیشی ریل لکھی میں نے سودیشی اردو لکھی کسی اور نے سودیشی کونسل لکھی غرضیکہ یہ ایک لمبا سلسلہ تھا ایک ڈیلیکیٹ شادی کا شروع ہوا اور اس کی ابتدا میں نے کی اور ختم شوکت نے کیا۔ اور درمیان میں اس سلسلہ میں نسیم انہونوی دیوانہ بریلوی۔ نظر بریلوی۔ شمیم بلہوری۔ سلیم نندوری وغیرہ نے حصہ لیا۔

لکھنؤ میں روز ہی شعر و شاعری کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ میں بھی شعر کہتا تھا۔ اور مولانا عبدالباری آسی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔

جب شوکت مرحوم ابتدائی دور میں مجھ سے ملے تو انہوں نے بتایا کہ وہ کسی سے اصلاح نہیں لیتے۔ میں نے شوکت مرحوم سے کہا کہ شعر و شاعری کی دنیا میں اگر واقعی کوئی جگہ حاصل کرنا ہے۔ تو پھر یہ ضروری ہے کہ ہم کسی سے رجوع کریں۔ شوکت مرحوم نے دریافت کیا کہ بھئی کس کے پاس جائیں۔ اس وقت بے اختیار میں نے مولانا آسی کا ایک شعر سنایا۔

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہو کر ہم نے آئین وفا بدلا

شوکت مرحوم فوراً یہ شعر سن کر پھڑک اٹھے۔ اور اسی وقت انہوں نے خواہش کی کہ مجھے انہیں کے پاس لے چلیے۔ یہ واقعہ مرحوم شوکت تھانوی نے اپنے آخری سلسلہ "کچھ یادیں اور باتیں" کے ابتدا ہی میں میرے حوالے سے اخباروں میں لکھا ہے۔ اور وہ شائع ہو چکا ہے کہ کس طرح وہ مولانا آسی کی خدمت میں پہنچے۔ اور اُسے مرحوم شوکت نے اپنے مزاحیہ انداز میں اسے پیش کیا ہے۔ اور پھر یہ سلسلہ قائم رہا۔ شوکت اپنا تمام کلام مولانا آسی کی خدمت میں پیش کرتے اور اصلاح لیتے اور اپنا ایک مجموعہ گہرستان کے نام سے مرحوم نے چھپوایا بھی۔

شوکت شاعر تھے۔ اور سنجیدہ اور طنز و مزاح دونوں ان کے حصہ میں آئی تھی۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ اگر شوکت طنز و مزاح کی شاعری پر زور دیتے تو آج ان کا پایہ بہت بلند ہوتا۔ اس لئے وہ فطرتاً مزاح نگار تھے۔ وہ اٹھتے بیٹھتے۔ جاگتے۔ سوتے طنز و مزاح کے موتی بکھیرتے رہتے تھے۔ مجھے بھی مزاح سے دلچسپی تھی۔ مگر میں سست رفتار تھا۔ اور شوکت تیز رفتار قلم برداشتہ لکھنے کے عادی۔ اکثر مجھ سے انہوں نے سر پر سوار ہو کر لکھوایا ہے۔ آہ! اُس دور کی سینکڑوں باتیں آج یاد آتی ہیں۔ اور اپنے دل و دماغ میں محفوظ ہیں لیکن یہ وقت ان تفصیلات کا نہیں ہے۔ کبھی انہیں یادوں پر ہنستا ہوں اور کبھی روتا ہوں میرے اور مرحوم شوکت کے درمیان کوئی پردہ نہ تھا ایک دوسرے کے گھروں میں آمد و رفت تھی۔ اس لیے ہر ایک بے تکلف تھا۔ جن لوگوں سے ملا ہوں اس پر ایک کتاب مرتب کی

جائے۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ اسے تین ابواب پر تقسیم کر کے لکھوں۔ ایک میں سیاسی خیال کی ذمہ دار ہستیوں سے ملنے کا تذکرہ ہو، دوسرے میں ادبی شخصیتوں کا ذکر اور تیسرے میں اپنے دوستوں اور احباب کو جمع کر دوں۔ میں فہرست مرتب کر ہی رہا تھا کہ شوکت نے شیش محل لکھ ڈالا۔ اور میرا آئینہ شبیہ گری کے پیچ و خم میں رہا۔ اگرچہ مرحوم نے مجھے بارہا توجہ بھی دلائی کہ میں اسے مرتب کر ڈالوں۔ مگر وہ فہرست صرف فہرست ہی رہی۔ اب سوچتا ہوں کہ اپنے مرحوم دوست کی یاد میں اسے مرتب کر ڈالوں۔ کاش میرے دل و دماغ میرا ساتھ دے جائیں۔ شوکت کے ساتھ میرے تعلقات کی دنیا کافی وسیع تھی۔ لیکن اس مختصر فرصت میں اپنی یادوں کے تاج محل کیسے سجاؤں!

شوکت اور نسیم

نسیم انہونوی

ستمبر ۳۱ء کی ایک شام ہم باپ بیٹے روح القدس یعنی امین سلونوی شوکت تھانوی اور راقم الحروف حسبِ معمول لکھنؤ کے امین آباد پارک میں بیٹھے تھے۔ کہ میں نے وہ منصوبہ شوکت تھانوی صاحب سے بیان کیا جو ان کی عدم موجودگی میں میں نے امین صاحب کے مشورہ سے بنایا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ ایک تثلیث قائم کی جائے۔

شوکت نے کہا ایسا ہی تثلیث پرستی کا شوق ہے تو بپتیسمہ لے لو۔ یہ تثلیث تو مدت سے قائم ہے۔

میں نے کہا: "وہ تثلیث پرانی ہو چکی ہے۔ اور پھر ہماری تثلیث اس سے مختلف ہو گی۔ ہم کسی مذہب کی نہیں ایک ہفتہ وار اخبار کی اشاعت کریں گے اور جس کا کام لوگوں کو ہنسا کر ان کی زندگی بڑھانا ہو گا۔ اس وقت ایسے اخبار کی اشد ضرورت ہے جو ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات کے ساتھ طنز و مزاح کو پیش کر سکے۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب اودھ پنچ کا دورِ جدید بھی دم توڑ رہا تھا۔ اس لئے کہ اس نے حال کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اشاعت ہوتی تھی مگر گنڈے دار اور یہی سب سے بڑا سبب ہوتا ہے کسی اخبار کے بند ہو جانے کا۔ اودھ پنچ کی جگہ کوئی اور پنچ نکالنا اس وقت موقع کی بات تھی۔ جو میرے کاروباری دماغ میں پیدا ہوئی تھی۔ اس لئے کہ انکشاف کے ظریف نمبر کی مقبولیت سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اگر کوئی اخبار یا رسالہ شوکت صاحب کی ادارت میں شائع کیا جائے تو یقیناً بہت مقبول ہو گا۔ مجھے اس وقت تین سال تک انکشاف اور ۹ ماہ تک حریم نکالنے کا تجربہ تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اگر شوکت صاحب راضی ہو جائیں تو ایک مزاحیہ اخبار نکالا جائے۔ امین سلونوی صاحب اس میدان کے مجھ سے بھی پرانے کھلاڑی تھے۔ اس لئے میں نے ان سے بھی رائے لی۔ اور انہوں نے نہ صرف اس خیال کو پسند کیا۔ بلکہ تعاون کا بھی وعدہ کیا۔ اس کے بعد ہم نے اسکیم شوکت صاحب کے سامنے پیش کی تھی۔

شوکت صاحب ادارت کے لئے راضی ہو گئے اور نام تجویز کرنے لگے۔ پنچ کا لفظ ضروری تھا۔ اس میں شوکت صاحب کی تجویز پر "سر" لگا کر سرپنچ کیا گیا اور لنگوٹی پر پھاگ کھیلتے ہوئے میں نے ایک مکان بھی موجودہ دفتر کے قریب ہی کرائے پر لے لیا۔ تاکہ اس میں دفتر قائم کیا جائے — ابھی تک حریم کا دفتر نیاز صاحب کے دفتر نگار ہی کے ایک گوشے میں قائم تھا۔ ستمبر ۳۱ء میں سرپنچ کا دفتر کھلا۔ ایک میز اور چند پرانی کرسیاں خریدی گئیں۔ پہلا پرچہ ۲۰×۳۰ سائز کے ۱۶ صفحات پر شائع کرنے کے انتظامات کئے گئے۔ اس

وقت تک دوسرے مضمون نگاروں کا تعاون بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے مکمل پرچہ یعنی اڈیٹوریل سے لے کر اشتہارات تک سب ہی شوکت صاحب نے لکھے۔ لکھنؤ کے مشہور زود نویس کاتب استاد مبارک حسین صاحب نے کتابت کی۔ اور پہلا پرچہ ایک ہزار کی تعداد میں چھپ کر ایجنٹوں کو بھیج دیا گیا۔ اور چند ہی ہفتوں میں اس کی اشاعت چار ہزار سے تجاوز کر گئی۔ شوکت صاحب کے رنگ تحریر نے تھوڑے ہی دنوں میں سرپنچ کو ایسی شہرت بخش دی جیسی دوسرے اخباروں کو برسوں میں نہیں ہوتی۔

اس زمانہ میں شوکت صاحب اخبار ہمدم میں کام کرتے تھے مگر جیسا کہ خود شوکت صاحب نے اپنے انتقال سے کچھ ہی عرصہ پہلے اپنے مضمون "کچھ یادیں کچھ باتیں" میں لکھا تھا۔

"اس زمانہ میں ہمدم ایک عجیب بحران میں مبتلا ہو چکا تھا۔ ملک نصر اللہ خاں صاحب عزیز سے ہمدم کے ڈائریکٹروں کی نبھ نہ سکی۔ خان بہادر احمد حسین رضوی نے مینیجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے استعفیٰ دے دیا۔ چودھری خلیق الزماں صاحب نگران مقرر ہوئے۔ مگر وہ بھی زیادہ وقت نہ دے سکے۔ مشہور کانگریسی کارکن گوپی ناتھ منتظم ہوئے۔ اور چودھری رحم علی ہاشمی نے ادارت سنبھالی۔ اس ہڑبونگ میں میرے لئے یہی چارہ کار رہ گیا کہ میں چپکے سے کھسک جاؤں۔ نسیم انہونوی اور امین سلونوی خوش تھے۔ کہ اب میں پورا وقت سرپنچ کو دے سکوں گا۔ مگر میں نے اپنا بار سرپنچ پر ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور منشی نولکشور کے اودھ اخبار کی ادارت سنبھال لی۔ سرپنچ کا کام بدستور جاری رہا اور اب سرپنچ نے اپنے لئے اہل قلم کا ایک ایسا حلقہ حاصل کر لیا تھا کہ سچ پوچھئے تو ان ہی کے بے لوث اور بیباکانہ تعاون سے سرپنچ دن دونی چوگنی ترقی کرتا رہا۔ نسیم صاحب خالص کاروباری قسم کے آدمی تھے۔ اُن کے حُسن انتظام نے سرپنچ کی بنیادیں نہایت مستحکم کر دیں ——"

اس تحریر کی تفصیل یہ ہے کہ سرپنچ اس وقت ہزاروں کی تعداد میں چھپنے کے باوجود اس قابل نہ تھا کہ شوکت صاحب کو اتنی تنخواہ دے سکتا جس سے ان کی گزر بسر بافراغت ہو سکتی۔ اس لئے ہمدم کے بعد وہ اودھ اخبار میں چلے گئے۔ سرپنچ کو ان کے پورے وقت کی ضرورت بھی نہ تھی۔ حاضر دماغ ہونے کے ساتھ ہی شوکت صاحب زود نویس بھی تھے اور بسیار نویس بھی۔ آپ یقین فرمائیں کہ جس روز سرپنچ نکلنا ہوتا اس سے ایک روز پہلے وہ قلم و کاغذ لے کر بیٹھتے اور کاتب کو بٹھا لیتے اور صرف چند ہی گھنٹوں میں اڈیٹوریل سے لے کر اشتہارات تک سب لکھ دیتے اور اخبار مکمل ہو جاتا۔

سرپنچ کا دفتر قائم ہوتے ہی وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ اسی عمارت میں آ گئے تھے۔ عقبی حصہ اور صحن شوکت دلہن کے تصرف میں تھا۔ اور باہر کے دو کمرے دفتر کے لئے وقف تھے۔ اور جب رات میں دفتر بند ہو جاتا تو یہ کمرے بھی شوکت صاحب ہی کے اختیار میں رہتے۔ شوکت دلہن اس وقت پردہ کرتی تھیں۔ مگر مجھ سے ان کے تعلقات کچھ ایسے معراج پر پہنچ گئے تھے کہ وہ میرے سامنے آنے لگی تھیں اور میں ان کی نظروں میں ان کے سگے دیور سے بھی زیادہ عزیز تھا۔

اودھ کا ایک ہفتہ وار اخبار جو بلا کسی معتد بہ سرمایہ کے نکالا گیا ہو کبھی اس قابل نہیں ہو سکتا کہ تین خوش پوش گھرانوں کی کفالت کر سکے۔ اس لئے امین صاحب اور شوکت صاحب دونوں ہی اودھ اخبار سے متعلق رہے۔ کچھ ہی دنوں بعد امین صاحب کی دلچسپیاں کم ہو گئیں اس لئے کہ انہوں نے انڈی پنڈنٹ نیوز سروس قائم کر کے اردو اخبار کو لوکل خبریں فراہم کرنا شروع کر دی تھیں۔

اور اس کے لئے انہیں ملازمت سے بچا ہوا تمام وقت صرف کرنا پڑتا تھا۔ ان کا نام معاون اڈیٹر کی حیثیت سے سرپنچ میں نکلتا رہا۔ مگر کام ادارت کا تمام تر شوکت صاحب ہی کرتے تھے۔ انہیں اس سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ اسے ہمیشہ اپنا ہی سمجھتے رہے۔ اور میں بھی پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے شوکت صاحب سے جو عقیدت، محبت اور خلوص تھا اسے نہ صرف شوکت ہی جانتے تھے۔ بلکہ ہر وہ شخص ان حقائق سے واقف تھا۔ جو ہمارے قریب تھا۔

شوکت صاحب کی قابلیت اور ذہانت سے کسی کافر کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود ان کی شہرت میں میرا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ میں نے انہیں مشہور کرنے کے لئے معلوم نہیں کیا کیا کیا تھا۔ سرپنچ کی ادارت نے جہاں سرپنچ کو شہرت بخشی وہاں خود انہیں بھی اس سے سارا ہندوستان جان گیا۔ اور ان کے جوہر اجاگر ہونے لگے۔ اس لئے کہ اس وقت بھی شوکت صاحب کے قلم میں اتنا زور تھا۔ جو پختہ کاروں کی تحریر میں بھی کمتر ہی ہوتا ہے۔

ایک ہی سال بعد سرپنچ کا دفتر بدلنا پڑا۔ اب ہم اس عمارت میں آگئے تھے، جہاں آج کل نسیم بک ڈپو کا دفتر قائم ہے۔ اس کے تین حصے تھے۔ دو میں دفتر تھا اور ایک حصہ شوکت صاحب کی رہائش کے لئے وقف تھا۔ اس میں کئی سال تک شوکت صاحب رہے۔ اس کے بعد انہوں نے خود اپنا اخبار طوفان نکالنے کا منصوبہ بنایا اور سامنے کی ایک کشادہ عمارت کرایہ پر لے کر اس میں چلے گئے تھے اس اخبار کے لئے انہیں قادیانی مشن سے ایک معتد بہ رقم مل گئی تھی۔ لیکن افسوس کہ وہ اخبار کو اپنے زورِ قلم کے باوجود نہ چلا سکے۔ اخبار کے لئے ایک بہترین منتظم ایڈیٹر سے زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں شوکت صاحب بالکل کورے تھے۔ کورے ہی نہ تھے بلکہ اپنی تنک مزاجی اور زود رنجی کے باعث اسٹاف کا تعاون بھی حاصل نہ کر پائے۔ اور انتظامی خرابیوں کے باعث طوفان کا زور بہت جلد کم ہو کر ختم ہو گیا۔

شوکت صاحب کی مزاجی کیفیت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے دفتر میں ایک بہت بڑے افسر کی حیثیت سے بیٹھتے تھے۔ نوکروں کو ہر طرح کے ضابطہ اور قانون کا پابند رکھنا چاہتے تھے۔ نوکر کی معمولی سی بات بھی انہیں اس درجہ مشتعل کر دیتی تھی کہ وہ اسے فوراً برخواست کر دیتے تھے۔ خواہ وہ کتنا ہی عمدہ کام کرنے والا کیوں نہ ہو۔ ان کا یہ طرزِ عمل ایک ایسے چھوٹے ادارے کے لئے کبھی مفید نہ ہو سکتا تھا۔ میں نے سرپنچ کا دفتر قائم کیا تو حال یہ تھا۔ کہ میں چپراسی، کلرک، اور منیجر سب ہی کی عزت کرتا تھا۔ کبھی ان کے پاس جاتا اور وہ احتراماً کھڑے ہونا چاہتے تو میں انہیں ایسا نہ کرنے دیتا۔ ان سے میری ایسی بے تکلفی تھی کہ کوئی نیا شخص دفتر آتا تو مالک و نوکر میں تمیز نہ کر پاتا۔ دوپہر کا کھانا میں دفتر ہی میں کھاتا تھا۔ اور یہ کھانا اتنا آتا تھا کہ میرا اسٹاف بھی میرے ہی ساتھ کھاتا تھا۔ میرے اس برتاؤ کا یہ اثر ہوا کہ میرے معاون و مددگار یا میرے دست و بازو میرے ملازم ہر حالت میں میرا ساتھ دیتے تھے۔ اس وقت سخت مالی مشکلات تھیں۔ صرف بارہ روپیہ سے میں نے اپنا کام شروع کیا تھا اور جیسا کہ شوکت صاحب نے میرے متعلق مضمون لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ میں لنگوٹی میں پھاگ کھیلتا تھا واقعی سچ ہے۔ میری جیب میں دس روپیہ ہوتے اور کام ہزار کا کرنے لگتا۔ لیکن یہ سب کچھ میری نرم مزاجی۔ ضبط و صبر اور مساوات کا طفیل تھا کہ گاڑی چلتی رہی۔ میں کبھی کبھی نوکروں کی ایسی باتیں بھی مصلحتاً برداشت کر لیتا تھا۔ جیسی کوئی دوسرا برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن شوکت صاحب نے ان باتوں سے کوئی سبق نہ لیا۔ وہ بلا سوچے سمجھے ہر کام کرتے اور نتیجہ خراب ہی نکلتا۔ وجہ ان کی فطرت تھی۔ جو سنا ہے بدلی نہیں جا سکتی۔ وہ برابر والے کی بھی کوئی بات برداشت نہ کر سکتے تھے۔ چہ جائیکہ نوکر۔ شوکت صاحب سے میں نے اتنی مدت تک کس طرح نباہ کیا۔ لکھوں تو ایک طویل مضمون اسی بحث پر ہو جائے گا۔ بس مختصراً اتنا سمجھ لیجئے کہ میں جتنا شوکت صاحب

سے ڈرتا تھا اتنا، دنیا میں کسی سے نہیں ڈرا۔ حد یہ ہے کہ خدا سے بھی نہیں۔ اگر میں اتنا پاس و لحاظ اللہ کے احکامات کا کرتا تو معلوم نہیں وہ مختارِ حقیقی مجھے کسی درجہ پر پہنچا دیتا۔ حالت یہ تھی کہ میں شوکت صاحب کا ان کی بیوی سے بھی بڑا مزاج داں تھا۔ اور ہر وقت بس یہی دیکھتا رہتا تھا کہ شوکت صاحب کیا چاہتے ہیں۔ کیا منشا ہے ان کا اور پھر میں اس کے خلاف نہیں کرتا تھا۔ خواہ میرا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو جائے۔

شوکت صاحب شاعر بھی تھے اور ادیب بھی۔ افسانہ نگار بھی تھے اور صحافی بھی۔ جس تیزی کے ساتھ وہ اوریجنل لکھ سکتے تھے اسی تیزی سے ترجمہ بھی کر سکتے تھے۔ لیکن شاعرانہ کمزوری کے وہ زبردست بیمار تھے۔ جو کچھ بھی لکھتے اسے سنائے بغیر نہ رہتے۔ اور ان کا یہ نزلہ سب سے زیادہ مجھ ہی پر گرتا تھا۔ اس لئے کہ اس وقت مجھ سے زیادہ قربت کسی کو حاصل نہ تھی۔ سرپنچ کے لئے وہ زیادہ تر رات میں لکھتے تھے اس لئے صبح جب میں دفتر آتا تو سب سے پہلا کام یہ ہوتا کہ میں شوکت صاحب کا لکھا ہوا مضمون سنوں۔ اس کے لئے میرا ہمہ تن گوش ہونا ضروری ہوتا۔ مجال نہ تھی کہ اس دوران میری معمولی سی توجہ بھی کسی اور طرف ہو سکتی۔ میں اس طرح اپنا منہ اُن کی طرف کر کے بیٹھ جایا کرتا تاکہ اور کسی کی کوئی خبر نہ ہوتی۔ اس وقت دفتر میں کوئی بھی آئے جائے میرا کسی سے مخاطب ہوتا شوکت صاحب کی نظروں میں ایک جرم ہوتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ دفتر آتے ہی کام شروع ہو جاتا۔ کوئی بات پوچھنے کاتب یا دفتری، کلرک یا منیجر میرے پاس آ جاتا۔ لیکن میں ذرا بھی مخاطب نہ ہوتا۔ گویا کہ اسے دیکھتا ہی نہ تھا۔ صرف اس لئے کہ شوکت چاہتے تھے کہ ان کا مضمون سنتے وقت میں اور کسی بھی بات کو اپنے ذہن و تصور میں نہ آنے دوں۔ حالانکہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میں بظاہر ہمہ تن گوش بنا ہوتا۔ مگر میرا دماغ کسی اور انجمن میں ہوتا۔ اور زبردستی مجھے شوکت کا مضمون سننا پڑتا۔ خصوصیت کے ساتھ اس وقت میں بڑی مشکل میں گرفتار ہو جایا کرتا تھا۔ جب ایسے موقعوں پر کوئی معزز شخص باہر سے آجاتا۔ چنانچہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار جبکہ شوکت صاحب ناول بڑھیس کا مسودہ مجھے سنا رہے تھے۔ ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب آدھمکے۔ یہ سرپنچ کے مداحوں میں تھے۔ اور ان کی عدالت میں میری جائیداد کا ایک مقدمہ بھی اسی زمانہ میں چل رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کی آمد پر بھی میں شوکت صاحب ہی کی طرف متوجہ نہیں رہ سکتا تھا۔ میری توجہ ڈپٹی صاحب کی طرف ہو گئی۔ کھڑے ہو کر میں نے ان کا خیر مقدم کیا اور انہیں عزت کے ساتھ بٹھایا۔ مگر خوف و دہشت سے میرے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ میں نے شوکت صاحب کی طرف دیکھا جو اب مسودہ میز پر رکھ کر خاموش ہو گئے تھے۔ ڈپٹی صاحب سے ان کا تعارف کرایا۔ مگر شوکت صاحب نے پھیکی مسکراہٹ سے ہاتھ ملایا اور اٹھ کر اپنے رہائشی فلیٹ میں چلے گئے۔ میں ڈپٹی صاحب سے باتیں کرتا رہا۔ اور اس سے پہلے کہ ڈپٹی صاحب رخصت ہوں۔ شوکت صاحب کا نوکر ایک پرچہ لئے ہوئے آیا۔ پرچہ میں وہی لکھا تھا جس کی مجھے امید تھی یعنی استعفا۔ لیکن ان کے استعفے سے میں زیادہ گھبراتا نہ تھا۔ وہ جہاں انتہا درجہ کے تنگ مزاج اور زود رنج تھے وہاں دل کے اتنے صاف تھے۔ کہ بڑے سے بڑے واقعہ کو بھی چند گھنٹوں یا دنوں میں اس طرح فراموش کر دیتے تھے۔ جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

سرپنچ کی اشاعت کے بعد ہی میں نے شوکت صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے مضامین کتابی شکل میں مرتب کریں۔ اور نسیم بک ڈپو سے اس کی اشاعت کی جائے۔ شوکت صاحب نے میری اس رائے سے اتفاق کیا اور موجِ تبسم کے نام سے اپنے ابتدائی منتخب مضامین کو مرتب کر کے دیئے۔ اس کی اشاعت $\frac{۲۶ \times ۲۰}{۱۶}$ سائز پر ہوئی۔ پورے کپڑے کی جلد بنی اور سنہرے الفاظ میں کتاب کا نام چھاپا گیا۔ جس طرح شوکت تھانوی کا نام میرے تعاون سے پہلی بار کسی اخبار پر اڈیٹر کی حیثیت سے لکھا گیا۔ اسی طرح یہ فخر بھی مجھ ہی

کو ملا کہ میں ان کی پہلی کتاب کا پبلشر بنا۔ اور اس کے بعد میں نے شوکت صاحب کی دیگر کتابیں بحرِ تبسم، بڑھبس، معمر خاتون، گرگٹ، مونڈی کاٹے، سوتیا چاہ، خانم خاں، دل پھینک اور شیطان کی ڈائری وغیرہ وغیرہ بھی شائع کیں۔

اوائل عمری میں مجھے شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ الکشاف کی اڈیٹری کے زمانہ میں شوکت صاحب سے جب میرے تعلقات بڑھے تو میں ان کے ساتھ ہی مشاعروں میں جایا کرتا تھا۔ وہ مجھ سے نہ صرف یہ کہ عمر میں بڑے تھے۔ بلکہ ذہانت و ذکاوت میں بھی برتر تھے۔ ان کا کلام اس وقت بھی معیاری ہوا کرتا تھا۔ وہ لکھنؤ کے مشہور شاعر جناب آسی کے شاگرد تھے۔ میں بھی آسی صاحب کی خدمت میں جایا کرتا تھا مگر کبھی ان سے اصلاح نہیں لی۔ ہاں شوکت صاحب نے اکثر میرے اشعار پر اصلاح کی اور کبھی کبھی جب وقت کی کمی یا اور کسی دشواری کے باعث میں غزل مکمل نہ کر پاتا تو شوکت صاحب اپنی غزل کے چند اشعار مجھے دے دیتے۔ یہی نہیں۔ اکثر مشاعروں میں میری غزل پڑھتے بھی شوکت صاحب ہی تھے اس لیے کہ وہ ذہن و دماغ کے ساتھ ہی آواز بھی مترنم رکھتے تھے۔ اور ان کے پڑھنے کا طرز اتنا دلکش ہوتا تھا کہ وہ مشاعرہ لوٹ لیا کرتے تھے۔

موجِ تبسم کی اشاعت کے بعد میں نے اور شوکت صاحب نے ایک ٹور کیا جس میں کانپور، دہلی، شاہجہان پور وغیرہ کا دورہ کرتے ہوئے ہم دونوں بھوالی پہنچے۔ اس زمانہ میں بھوالی سینیٹوریم میں ڈاکٹر زبیر صاحب انچارج تھے۔ یہ شوکت صاحب کے چچیا خسر تھے۔ انہیں کے ساتھ ہم دونوں نینی تال پیدل آتے تھے۔ اس سے پہلے ہم نے نینی تال نہ دیکھا تھا۔ تمام دن وہاں کی سیر کر کے ہم پھر بھوالی واپس آ گئے۔

اس سفر میں موجِ تبسم کی صدہا جلدیں فروخت ہو گئیں۔ کتاب اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت پسند کی گئی۔ اس وقت صرف مرزا عظیم بیگ چغتائی کی چند کتابیں شائع ہوئی تھیں مزاح پر۔ لیکن ان کا رنگ شوکت صاحب کے رنگ سے بالکل مختلف تھا۔ اور پھر نئی چیز ویسے بھی زیادہ دلکش ہوتی ہے۔ موجِ تبسم کی کامیابی کے بعد بحرِ تبسم چھپی اور وہ بھی پسند کی گئی۔

شوکت صاحب کو فلش کھیلنے کا بہت شوق تھا اور یہ ناممکن تھا کہ شوکت صاحب جو بات پسند کرتے ہوں میں اس سے انہیں روک لوں یا خود اس سے پرہیز کروں۔ تفریح کی باتیں تو خیر کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ اور اس عمر میں کون ہے جو کسی نہ کسی کھیل سے دلچسپی نہ رکھتا ہو۔ اس لئے اگر میں شوکت صاحب کی خاطر ان باتوں میں حصہ لیا کرتا تھا جو انہیں پسند تھے تو کوئی ایسی بات نہ تھی۔ حیرت تو مجھے یہ ہے کہ شوکت صاحب نے مجھے بے نمازی تک بنا دیا تھا۔ خدا مغفرت کرے اور مجھے بھی معاف کر دے۔ اب سوچتا ہوں تو سخت ندامت ہوتی ہے۔ ایک انسان کی خاطر مجھے معبودِ حقیقی کی ناراضگی کا بھی خیال نہ ہو سکا۔ بات یہ تھی کہ میں جو ننگِ دنیا ہوں۔ ایک بہت ہی متقی اور پرہیزگار باپ کا بیٹا ہوں۔ والد مرحوم کی نماز کبھی قضا نہ ہوئی تھی۔ مجھ پر بھی اتنا اثر اس زمانہ میں ہو گیا تھا۔ جب میں حریم و سرپنچ شائع کرتا تھا کہ پانچوں وقت کی نماز پڑھوں۔ لیکن شوکت صاحب اس وقت نماز پڑھتے ہی نہ تھے۔ اس لئے وہ مجھے بھی طرح طرح سے روکتے تھے۔ مثلاً میں مصلے پر ہوں اور قبل اس کے کہ میں سجدے میں جاؤں۔ شوکت صاحب لوٹا لا کر سجدے کی جگہ رکھ دیتے۔ کبھی کرسی اٹھا کر جانماز پر لے آتے۔ کبھی جانماز ہی الٹ دیتے۔ غرض ان کی ان حرکتوں سے عاجز آ کر توبہ توبہ، خوفِ خدا نہ محسوس کرتے ہوئے ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں ہی چھوڑ دیں۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ کہہ یہ رہا تھا کہ شوکت صاحب کو فلش کھیلنے سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس لئے میں نے ان کے اس

شوق کو پورا کرنے کے لئے ایسا انتظام کیا کہ ہر شام دفتر میں فلش ہوتی اس میں شوکت صاحب مرحوم طرزی صاحب مرحوم، پیارے لال، الطاف بھائی مرحوم اور عزیز بھائی کے ساتھ ہی میں بھی شریک ہوتا۔ رقم برائے نام یعنی دو پیسے کی چال ہوتی اور لمٹ دو آنے کی رکھی جاتی اور اس طرح کھیل گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے ہوتا تو بھی روپیہ دو روپیہ سے زیادہ ہار جیت ممکن نہ ہوتی۔ چال کی یہ لمٹ بھی صرف اس لئے رکھی گئی تھی۔ کہ شوکت صاحب تفریح کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ جوئے کی اسپرٹ سے کھیل کھیلتے اور چال اتنی بڑھا دیتے کہ تفریح ختم ہو جاتی۔ پتے اچھے ہوتے تو دوسرے بھی چال بڑھانے پر مجبور ہو جاتے اس لئے ہم نے سختی کے ساتھ لمٹ کر دی تھی۔ بہر حال اس سے شوکت صاحب کی تشفی ہوتی ہو یا نہیں۔ لیکن وہ اس صحبت کو چھوڑ کر کہیں اور نہ جاتے۔ لیکن جب وہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر چلے گئے تو میری صحبت بھی تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ اور ملاقات بس کبھی کبھی ہو جایا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ جب انہیں مجھ سے دور گھر سے آزادی ملی تو وہ کھل کھیلے۔ فلش سے رمی تک پہنچ گئے۔ اور تفریح کے بجائے جوا ہونے لگا۔ مجھ سے اور سعیدہ شوکت دلہن سے یہ سب کچھ پوشیدہ تھا۔ اس لئے جب مجھے معلوم ہوا تو بھی میں نے انہیں کوئی تنبیہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔

شوکت صاحب میں میرے خیال سے جو سب سے بڑی کمزوری تھی وہ یہ تھی کہ ان کی کسی کمزوری پر تنقید کر دی جائے اگر کبھی ایسا ہو جاتا تو شوکت صاحب اس طرح برہم ہو جاتے کہ الفاظ میں اس برہمی کا لکھنا آسان نہیں اور اسی لئے مجھے اعتراف ہے کہ میں شوکت صاحب کی کمزوریوں پر کبھی تنقید نہ کر سکا۔ حالانکہ مجھ سے زیادہ ان کی کمزوریوں سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ میں حق بات کہتے کبھی نہ ڈرا۔ حد یہ ہے کہ خود ایک بار اپنے والد مرحوم سے بھی حق کے لئے زبان لڑا بیٹھا تھا جس کا آج تک افسوس ہے۔ لیکن شوکت صاحب سے میں اتنا ڈرتا تھا کہ میری حق گوئی ان کے مقابل ہمیشہ شکست کھاتی رہی۔

ریڈیو کی سروس کے دوران شوکت صاحب سے میری ملاقات بھی بس کبھی کبھی ہوتی تھی۔ حالانکہ وہ میرے آفس کے سامنے ہی رہتے تھے۔ جن لوگوں نے شوکت صاحب کو قریب سے دیکھا ہے۔ یا وہ لوگ جو ان کے قریب رہ کر ان سے دور ہو گئے ہیں۔ وہ یقیناً اس بات سے واقف ہوں گے کہ شوکت صاحب پاس ہوتے تو بہترین دوست ہوتے اور دور ہو جاتے تو اس طرح بھول جاتے جیسے کہ کبھی ساتھ ہی نہ رہا ہو۔ اور جب کبھی وہ دور رہ کر خط لکھتے تو پھر اس انداز میں کہ پڑھنے والا ایسا محسوس کرتا جیسے کہ شوکت صاحب آج بھی اس سے اتنے ہی قریب ہوں جیسے پہلے تھے۔

لاہور جانے اور پاکستان بن جانے کے بعد شوکت صاحب کئی بار لکھنؤ آئے لیکن ان کا قیام نہ تو میرے یہاں رہا نہ امین صاحب کے یہاں۔ نہ ہی وہ کسی عزیز کے یہاں ٹھہرے۔ حالانکہ ان کے چچا سسر ظفر صاحب بھی یہیں رہتے ہیں۔ وجہ صرف یہ تھی کہ ہمارے یہاں قیام کے بعد رمی کھیلنے کا انہیں موقع نہ ملتا۔ جب کہ ان کا تقریباً تمام وقت اسی شغل میں ان احباب کے ساتھ صرف ہوتا جو ریڈیو اسٹیشن کی سروس کے زمانہ میں ان کے ہم پیالہ و ہم نوالہ تھے۔ ایک بار جب شوکت صاحب کو میں نے اس سلسلہ میں احتجاجی خط لکھا تو انہوں نے اپنے خط مورخہ ۱۴ اپریل میں مجھے لکھا تھا۔

”——— میں تم سے دور ہو چکا ہوں ——— اتنی دور سے یہ دل آزاری کرتے شرم نہیں آتی۔ میری بے مروتی کا شکوہ کرنے والوں میں تم بھی ہو لہٰذا سنو۔

لاہور سے تین مرتبہ ایک نہ ایک کام سے دہلی گیا۔ اور تینوں مرتبہ اس حالت میں کہ بھارت جا کر پاکستان والے ایک

ایک پیسہ دانت سے پکڑ کر صرف کرتے ہیں۔ میں نے روپیہ کی پرواہ نہ کی اور لکھنؤ بھی گیا۔ ایک مرتبہ تنہا اور دو مرتبہ مع بیوی بچوں کے۔ کیوں صاحب کیا کام تھا مجھ کو وہاں؟ کسی تجارتی مشن پر گیا تھا؟ ۔ کوئی جائیداد کا مرحلہ تھا؟ صرف دوستوں کو دیکھنے اور ان سے ملنے۔ آخری مرتبہ تم خود موجود نہ تھے نینی تال گئے تھے۔ بہر حال اس میں میرا قصور نہیں۔ بہر حال یہی بے مروت، یہی طوطا چشم، یہی محبت فراموش تین مرتبہ ان حضرات سے ملنے گیا ہے۔ جو اس دور میں محبت اور مروت کے قیس کے بعد سجادہ نشین بنے بیٹھے ہیں۔ اب ذرا اپنے گریبان میں تم بھی منہ ڈال کر دیکھو اور اگر غیرت دار ہو تو ایسی لکھو کہ کب لاہور آ رہے ہو۔ مع غزالہ اور شمو میاں اور بھابی اور ننھی بچی کے۔

وہ اپنے پرائے جو میری بے مروتی کے شاکی ہیں ان کی سلامتی کے لئے میں دعا کرتا ہوں تاکہ جب میں نہ رہوں تو ان کو میری مروت اور وفا بھی یاد آ کر کچھ تو سزا دے

طرزی صاحب کو تسلیم۔ شمو میاں کو پیار۔ اور بچی کو بہت بہت پیار۔

جاؤ ہم اپنا نام نہیں لکھتے۔

میں نے اس خط کا جواب دیا اور بلبلا کر یہ لکھ گیا کہ لکھنؤ آپ آئے رسی کھینچے یہی سب سے اہم مسئلہ ہے آپ کی زندگی کا۔ وغیرہ وغیرہ اور اس کا جواب شوکت صاحب نے ۲۷، اپریل ۱۹۵۷ء کو ریڈیو پاکستان سے لکھا جو حسب ذیل تھا۔

برادرم نسیم صاحب   آپ کا خط ملا۔

لکھا تھا کہ فاصلہ محبت کو جلا دیتا ہے اور بدگمانیوں کو ختم کر دیتا ہے مگر معلوم ہوا کہ بدگمانیاں جدائی اور بُعد کی فضاؤں میں بھی پروان چڑھتی ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تم میرے خلوص کے کبھی قائل نہ رہے۔ اور ہمیشہ پرورش کے طور پر مجھ سے خلوص برتتے رہے۔ بہر حال تم اپنی خو نہ چھوڑو ہم اپنی وضع نہ چھوڑیں۔ اور یہ تعلقات یوں ہی چلتے رہیں۔

یار ایک بات بتاؤں۔ مجھ ایسے لعنت زدہ ہستی کو بھول جاؤ۔ سمجھ لو کہ مر گیا۔   وہ بدنام کنندۂ وفا اور صبر کر لو۔ تمہارا اور تمہاری غزالہ کا خط پڑھنے کے بعد میں اپنی نظروں میں جس حد تک گرا ہوں اس گہرے غار سے شاید تم خود مجھ کو نہ نکال سکو گے یہ معاوضہ ہے میرے ان جذبات کا جو تمہارے لئے دل میں تھے۔ ہیں اور باوجود اس قدر افزائی کے ہمیشہ رہیں گے۔

تمہارا بے وفا
شوکت

میں نے اس کا جواب بھی لکھا اس لئے کہ اب شوکت صاحب سے میرا خوف دور ہو چکا تھا اس لئے کہ نہ وہ سرپنچ کے اڈیٹر تھے نہ ہی اپنا کوئی ناول مجھے اشاعت کے لئے دیتے تھے۔ لکھنؤ آتے تو ان لوگوں کے یہاں قیام کرتے جو صرف رسمی ناتے ان کے دوست تھے۔ پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ اب بھی میں حق بات کہتے ڈرتا۔ میرا خط پا کر شوکت صاحب نے پھر مجھے ریڈیو پاکستان سے ۲۴ مئی ۱۹۵۷ء کو جو خط لکھا تھا۔ وہ حسب ذیل ہے۔

میرے نسیم۔ اپنی بیوی کے نام میرا خط[1] پڑھ لو۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے تم دونوں کے سامنے اپنا سینہ چاک کر کے رکھ دیا اور اب اپنے متعلق جو کچھ مجھے معلوم ہے وہی تم دونوں کو بھی معلوم ہو گیا۔ میں تم سے کہتا ہوں تم میری ہر کمزوری سے واقف ہو۔ اور تم میرے اس حمام کے ساتھی ہو جس میں سب ننگے ہوتے ہیں۔ کہ میں نے لکھنؤ سے آنے کے بعد بحمد اللہ اپنے کو سنبھالا۔ اور کامیاب حد تک سنبھال لیا۔ یہاں کی اس بارہ سالہ زندگی میں کوئی ایک دھبہ اپنے دامن پر نہ لگنے دیا محض یہ خیال کر کے کہ ہو چکا جو کچھ ہونا تھا۔ .... بہرحال تم وہ خط پڑھ لو خواہ جھوٹ سمجھو یا سچ مگر غالباً تم اتنے سنگدل نہیں ہو سکتے کہ تم میرے اس بے نقاب دل کا بھی تمسخر اڑاؤ گے۔ اور حقیقت حال پر افسانہ طرازی کی تہمت رکھو گے۔ تمہاری غزالہ کے خلوص نے آج سب کچھ مجھ سے اگلوا لیا ہے۔ ورنہ تمہارے شوکت میں اب بھی اتنا ظرف ہے کہ وہ یہ سب کچھ دل میں چھپائے ہنستا ہوا ہی دنیا سے رخصت ہو جاتا اور کسی کو خبر نہ ہوتی کہ قہقہوں کے اس طوفان کی تہہ میں کتنے اشکوں کو پناہ ملی ہے۔

بہرحال تم مجھ سے بدظن ہو۔ میں تمہارے یہاں نہیں ٹھہرا۔ یہ میرا حرامی پن ہے۔ مگر تم تو حلالی ہو۔ میں تمہارے والد کو دیکھ چکا ہوں اور اپنا کوئی باپ تم کو کبھی نہ دکھا سکا۔ بحمد اللہ تمہارا حلالی ہونا طے ہے تم مجھ کو معاف کر دو۔ اب کے آیا تو خواہ تم مجھ کو دھکے دے کر نکالو ٹھہروں گا تمہارے ہی پاس۔

بھابی کی خدمت میں آداب۔ شمو میاں کو دعائیں۔ چندہ کو پیار ——— طرزی صاحب اگر قریب ہوں تو ذرا انگشت شہادت .....

تمہارا شوکت

اور اس کے بعد جب تک شوکت صاحب نہ آ سکے۔ افسوس کہ حالات سازگار نہ ہو سکے۔ اور پھر ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ میں کبھی کبھی خط لکھتا رہا۔ اور کبھی کبھی شوکت کے خطوط بھی آتے رہے۔

دفتر جنگ راولپنڈی سے ۲۸ جولائی ۶۲ء کو انہوں نے مجھے یہ خط لکھا تھا

نسیم پیارے۔ میری عمر بھی تم کو لگے۔

تمہارا خط ابھی ملا ہے۔ اور میں نے عالم تصور میں اس کو سرپنچ کے دفتر ہی میں بیٹھ کر پڑھا تھا۔ خدا تم کو خوش رکھے کہ تھوڑی دیر کے لئے تم نے مجھ کو وہیں پہنچا دیا جہاں کی سہانی یادیں اب صرف تڑپانا ہی جانتی ہیں۔

تمہاری غزالہ اور میری بیگم جانی[2] مجھ سے واقعی روحانی طور پر بہت قریب ہے۔ میں نے ایک دن اس کو ایسی جگہ یاد کیا کہ جہاں انسان خود اپنے کو بھول جاتا ہے۔ پیرس ٹاور دیکھنے گیا تھا۔ وہاں ایک مغربی خاتون کو دیکھا جو اس طرح ہنس رہی تھیں کہ دل میں خیال آیا کہ یہ ہنسی گوش آشنا ہے۔ اپنے حافظہ کو کریدا اور فوراً ہنستی ہوئی غزالہ سامنے آ گئیں کہ آپ مجھ کو ڈھونڈ رہے تھے۔ پھر لندن واپس آ کر میں نے غالباً غزالہ کو خط بھی لکھا تھا۔ یہ میں نے اس لئے لکھا کہ وہ

---

[1] یہ خط حریم لکھنؤ بابتہ جون میں شائع ہو چکا ہے۔

[2] میری بیوی کی عرفیت۔

عزیز جو روح میں سمائے رہتے ہیں۔ اسی طرح اچانک یاد آجایا کرتے ہیں۔ بیگم جانی ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ اس طرح میرے تصور میں ابھر چکی ہیں۔ اور یہ ایک روحانیت کا مسئلہ ہے کہ جن افراد سے روحانی تعلق ہوتا ہے۔ وہ اسی قسم کا مستحکم اور لازوال ہوتا ہے۔ بیگم جانی کو مجھ سے جو عقیدت ہے۔ وہ اس قلبی اور روحی تعلق کا نتیجہ ہے۔ خدا اس کو تمہاری خوش نصیب سہاگن رکھے۔ اور تم اس کے لئے سلامت رہو۔ غالباً اب میری اس دعا کا مفہوم واضح ہو گیا ہوگا کہ میری عمر بھی تم کو لگے۔

نسیم تم نے جس جدوجہد سے حالات کے ساتھ کشتی لڑی ہے اس سے میں بے خبر نہیں ہوں۔ اور تم کو فولادی عزم کا انسان سمجھتا ہوں۔ اپنا وقار قائم رکھنے کے لئے بغیر کسی کے سامنے دست سوال دراز کئے تم نے اپنے ادارے کو زندہ رکھ کر معجزہ کیا ہے۔ مگر تمہارے اس انہاک اور اس محنت سے میں ڈر رہا ہوں کہ صحت کی ناز برداری سے غفلت نہ برتنا شروع کر دو۔ بات یہ ہے کہ یا تو آدمی میرا ایسا بے حیا ہو کہ

غم ہائے روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ملا اسی کو ہنسی میں اڑا دیا

مگر تم میں یہ بات نہیں ہے۔ تم آدمی حساس بھی اور فطرتاً غم شرست بھی۔ لہٰذا تم بہت نازک آبگینہ کی حیثیت رکھتے ہو۔ مناسب یہی ہے کہ اب اپنی حفاظت خود کرو۔ شمو بیٹا اب بالغ ہو چکا ہے، عاقل تو پہلے ہی سے ہے۔ اس سے کہو کہ لو میاں سنبھالو۔ یہ گھر واگ اور خود ذرا آرام بھی کیا کرو۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ تم تندرست اور زندہ رہو۔ خواہ وصل بلگرامی کے شوق میں مبتلا ہو کر ہی کیوں نہ زندہ رہو۔

اپنی غزالہ کو ماموں جان کی دعائیں پہنچا دو۔ نجم السحر اور منے کو پیار شمو میاں کو دعا اور پیار دونوں بھاوج کو آداب۔

میرے یہاں بھی سب اسی قسم کی باتیں کہہ رہے ہیں۔ طرزی نمبر بھیجنا ضرور۔

تمہارا شوکت

اس خط سے پہلے ہی طرزی صاحب کے انتقال کی خبر پڑھ کر شوکت صاحب نے دفتر جنگ راولپنڈی سے، ۲۹ جون کو لکھا تھا۔

پیارے نسیم

خدا تم کو سلامت رکھے۔

آج صبح ناشتہ کرنے بیٹھا اور چائے کے پہلے ہی گھونٹ کے ساتھ نظر پڑی۔ اخبار میں اس نحس خبر پر جس نے چائے کی اس گھونٹ کو بھی حلق میں پھنسا دیا۔

محبوب طرزی ہمارا ایک خلوت و جلوت کا ساتھی اس طرح ہم سے بچھڑ گیا۔ کاش تم یقین کر سکو کہ آج دن بھر میں عالم تصور میں لکھنؤ ہی میں رہا ہوں۔ ہر اس محفل میں جس میں طرزی کا تصور لے گیا۔ اللہ جانے تم آج کل لکھنؤ میں ہو یا نینی تال میں بہر صورت کسی طرح میری تعزیت اس کے پس ماندگان تک پہنچا دو۔ مجھے اس کا پتہ معلوم نہیں۔ مگر آج

میرا دل ڈوب سا رہا ہے۔ نسیم اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب پت جھڑ شروع ہو گئی ہے کسی طرح ایک مرتبہ تو مل لو۔ میں کئی مرتبہ لکھنؤ بلا چکا ہوں مگر تم ـــــ کاش تم بھی ایک مرتبہ ہی سہی آ تو جاتے۔ اپنی بیگم، بچی اور میرے شمو میاں کو دعا کہو۔

تمہارا شوکت

آج مجھے صحت کی طرف سے غافل نہ رہنے اور کام کم کرنے کا مشورہ دینے والا خود اپنی صحت کی طرف سے ایسا غافل ہوا کہ اجل نے اُسے آ دبوچا۔ شوکت اپنے خیال کے باوجود بے حیا ہوتے ہوتے چل بسے اور میں آبگینہ ہوتے ہوئے بھی دنیا کی ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ طرزی صاحب کی اچانک موت نے جہاں ڈرا دیا تھا۔ وہیں شوکت کی جدائی نے موت کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اور ہمہ وقت اب یہی خیال رہتا ہے کہ نہ معلوم کس گھڑی میں بھی چل بسوں اور میری پیاری بیٹی نجم السحر بھی، شوکیہ، فوزیہ اور نفیسہ کی طرح پچھاڑیں کھا کھا کر دیواروں سے سر ٹکرانے لگے۔

شوکت تھانوی سودیشی ریل کے بعد

حکیم یوسف حسن

۱۹۲۸ء کا زمانہ تھا۔ متحدہ ہندوستان پہ ہر جگہ برطانوی پرچم لہرا رہے تھے۔ بھارت میں سودیشی تحریک زوروں پر تھی، پبلک پلیٹ فارم اور اخبارات کے صفحات پر حکومت پر شدید نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ ہندوستانی رائے عامہ کو بیدار کر کے سوراج حاصل کرنے کے لیے اُسے تیار و متحرک کیا جا رہا تھا۔

ہندوستان کی ادبی فضا پر "نیرنگ خیال" ایک کامیاب تجربہ ثابت ہوا تھا۔ اس کے صفحات پر بنگال، بہار، یو۔پی، حیدر آباد، بمبئی اور پنجاب کے چوٹی کے ادبا اپنے رشحاتِ قلم پیش کرتے تھے۔ اس کی کامیابی اور مقبولیت محیر العقول تھی۔ ہم نت نئی باتیں سوچا کرتے تھے۔ پرچہ کو آگے بڑھانے اور ریکارڈ توڑ نمبر نکالنے کی دھن ذہن پر سوار رہتی تھی۔

ذہن نے ایک نیا لفظ ایجاد کیا۔ یہ مختصر سا لفظ تھا "سالنامہ"۔ ہم نے گویا انگریزی لفظ ANNUAL کا صحیح ترجمہ کیا تھا "روزنامہ" کے وزن پر "سالنامہ" گویا سال بھر کا یا سال بعد کا نمبر ہونا چاہیے۔ نیرنگِ خیال نے سب سے پہلے سالنامہ ۱۹۲۸ء میں شائع کیا۔

یہ خیال ۱۹۲۷ء کے آخر میں سوجھا۔ ذہن رسا اس کے لیے قسم قسم کی جدتیں سوچنے لگا۔ مثلاً

اس کا سائز عام رسائل سے بڑا ہونا چاہیے۔

اس کا ٹائیٹل نئے انداز پر خاص قسم کے کاغذ پر رنگین چھاپا جائے۔

مشہور مصور عبدالرحمان چغتائی اس کے لیے ڈیزائن عطا کریں۔

کتابت اور طباعت بڑی دلکش اور دیدہ زیب ہو۔

چھ، سات ٹرائی کلر (رنگین) آرٹ کی تصاویر سے اسے مرصع کیا جائے۔

متعدد ہاف ٹون بلاک چھاپے جائیں۔

اس کا اشتہار خاص انداز سے جاری کیا جائے۔ اور سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ زمیندار سے معاملات کر لیے جائیں۔

ایک کالم مخصوص ہو۔ اس پہ عنوان ہو۔

سالنامہ نیرنگ خیال ۱۹۲۸ء۔ اور پھر اس کے نیچے ان اہم اہلِ قلم کے نام دیئے جائیں جو اُس میں مضامین لکھ رہے ہیں۔

ترتیب یہ ہو کہ پہلے دن کی اشاعت میں ایک نام ہو اور دوسرے دن دو نام ہوں۔ اور تیسرے دن میں تین نام ہوں۔ روزانہ ایک نام کا اضافہ کیا جائے۔ یہاں تک کہ تیسویں دن تیس نام ہوں اور پچاسویں دن پچاس نام ہوں۔ اور روز یہ سلسلہ بڑھتا جائے۔ یہاں تک کہ ایک کالم کی ساٹھ سطریں ساٹھ دنوں میں۔ ۶۰ بار اشتہار شائع کریں۔

آپ کو شاید اس قسم کے اشتہار کی کامیابی کا علم نہ ہو۔ یقین کیجئے کہ جس دن یہ سالنامہ شائع ہوا نیرنگ خیال کے دفتر کے سامنے دستی پرچہ خریدنے والوں کی قطار لگی تھی۔ اور لوگ ڈیڑھ روپیہ کا سینما کا ٹکٹ خریدنے کے انداز میں ڈیڑھ روپے میں سالنامہ نیرنگ خیال خریدنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔

اُن دنوں سستا زمانہ تھا۔ ہم نے ڈیڑھ روپے میں جو سالنامہ دیا وہ آج ۱۰ روپے میں بھی پیش کرنا مشکل ہے۔ سفید کاغذ ان دنوں ۴ روپے ریم تھا اور آج وہ ۳۲ روپے ریم ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔

اور سالنامہ کے مضامین۔ نیرنگ خیال کی ترقی کے لیے، اس کو آگے بڑھانے کے لیے ہم دن رات ایک ہی بات سوچتے تھے۔ نیرنگ خیال!!

خواہ ہمیں جنونی کہیے یا کچھ اور ہمارے اعصاب پر نیرنگ خیال بُری طرح سوار تھا۔ پھر سالنامہ کے مضامین کیسے ہوں؟ اس کے لیے ہندوستان کا سفر کرنے کی تیاری ہونے لگی۔ خاص خاص اہل قلم کو خطوط لکھے گئے۔ مقامی معاونین سے ملاقاتیں ہوئیں اور ہم لاہور سے امرتسر۔ لدھیانہ، میرٹھ، دہلی، کانپور اور سہارنپور تک ایک ہی چکر میں چلے گئے۔ ہمیں یہاں نیرنگ خیال کی داستان نہیں لکھنی یہ چند سطور بطور تمہید عرض کی گئی ہیں۔

ہاں تو بات تھی۔ حضرت شوکت تھانوی کی!

ان دنوں شوکت ایک نوخیز نوجوان تھے۔ کچھ تھوڑا بہت لکھ لیتے تھے۔ کبھی شعر و شاعری سے شوق فرماتے۔ کبھی افسانوں میں دلچسپی لیتے کبھی کسی اخبار میں کچھ کام کر لیتے کبھی کسی کی کتاب مرتب کر دی۔ دو چار ایسے مضامین بھی اُن کے قلم سے نکلے تھے۔ جن میں مزاح کی چاشنی اسی طرح تھی جس طرح ان کے منہ سے وہ پھولوں کی صورت جھڑتی رہتی تھی۔ ابھی ادب میں ان کی صحیح لائن یا مقام کا تعین نہ ہوا تھا۔

لکھنؤ میں نیرنگ خیال کے محسن اوّل ہمارے دوست حامد اللہ افسر مقیم تھے۔ آپ تھے تو میرٹھ کے لیکن لکھنؤ میں ان کا قیام اتنا طویل ہو گیا تھا کہ انہیں اب لوگ لکھنوی ہی سمجھتے ہیں۔ وہیں ہماری پہلی ملاقات شوکت صاحب سے ہوئی۔ اور متعدد ملاقاتیں ہوئیں اور لکھنؤ کی سیرگاہوں میں ہوئیں۔ وہ بطور رہنما کے لکھنؤ میں ہمارے ساتھ رہے۔ اور ان کے امداد و تعاون سے ہمیں اپنے مقاصد میں بڑی کامیابی ہوئی۔ ہم نے باتوں باتوں میں شوکت کے ذہن پر نیرنگ خیال کے آنے والے سالنامے کا ایسا خاکہ ابھارا کہ یہ نوجوان ادیب ٹھٹھک کر رہ گیا وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگتا اور سمجھتا کہ کسی علاؤ الدین چراغ کے ذریعہ دنیائے ادب کے سامنے ایک ایسا طلائی اور نقرئی محل پیش کرنے والا ہوں جس میں سینکڑوں کھڑکیاں ہوں گی۔ اور ہر ایک کھڑکی میں ایک نامور ادیب جلوہ افروز ہوگا۔ اور پھر کیا اس میں شوکت تھانوی بھی ہو سکتا ہے؟ یہ سوال تھا جو اس نوجوان ادیب کے ذہن پر بار بار اُبھر رہا تھا کیوں نہیں! اس میں شوکت تھانوی بھی ہو سکتا ہے۔ مگر ذرا محنت کر کے ایک ایسا شاہکار مضمون لکھو کہ لوگ محوِ حیرت رہ جائیں!

ہماری عادت تھی کہ ہم نوجوان اور نوخیز ادیبوں کو مختلف ڈھنگوں سے لکھنے اور اچھا لکھنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔

اور بعض کو بعض سے اصلاح لے لینے پر بھی مجبور کرتے تھے۔ نامور اور استاد قسم کے اہل قلم سے ہمارا طرز تکلم دوسری نوعیت کا ہوتا تھا۔ الغرض یہ تمام جادو ایڈیٹری کے تھیلے میں محفوظ رہتے تھے۔ اور ہم وقت وقت پر اُن سے کام لیا کرتے اور کام نکالا کرتے تھے۔

شوکت صاحب نے کہا افسانہ لکھوں؟

میں نے کہا افسانہ! افسانے تو بہت آجاتے ہیں۔ اور نظموں کے لئے تو جگہ نہیں نکلتی۔ نثری علمی مقالے کم ملتے ہیں لیکن اگر آپ مزاحیہ یعنی مزاحیہ افسانہ لکھیں تو بات دلچسپ رہے گی۔ اس انداز میں لکھنے والے عنقا ہیں۔ اور آپ میں بڑی صلاحیت ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ایک مزاحیہ افسانہ جب پوری کوشش سے لکھا جائے تو وہ کامیاب نہ ہو۔ ذرا ذہن پر زور دے کر کوئی پلاٹ سوچیے۔ اور مزاح کا رنگ بھرتے جائیے اور پھر دیکھئے کہ شوکت کے نام کا ڈنکا بجتا ہے یا نہیں۔"

ہم نوجوان کو اکساتے رہے۔ شوکت نے ایک گہری ٹھنڈی سانس بھری اور کہا میں کوشش کروں گا۔ اُس وقت میں بھی نہیں جانتا تھا کہ میں سودیشی ریل کے مصنف سے بات چیت کر رہا ہوں۔ یا میری اس تحریک کے نتیجہ میں ایک شاہکار مضمون کی تخلیق ہونے والی تھی۔

نیرنگِ خیال کے اس سالنامہ میں بڑے پایہ کے مضامین تھے۔ مگر جو چرچا سودیشی ریل کا ہوا وہ کسی دوسرے مضمون کو نصیب نہ ہوا۔

۱۹۲۸ء میں انگریزی حکومت ہندوستان پر اپنا تسلط مضبوط کرنے کی فکر میں تھی۔ اور ساتھ ساتھ وہ ان تمام تدابیر اور ذرائع کو ملیامیٹ کرنا چاہتی تھی جو سوراج حاصل کرنے کیلئے اختیار کئے جا رہے تھے۔ سودیشی ریل جس کو اردو ادب میں مزاحیہ رنگ میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ وہ دشمنانِ آزادی، ہندوستانیوں کے سوراج حاصل کرنے پر اس ملک کی جو گت بنے گی اس کے نقوش دکھانے کے لئے بطور دلیل کے پیش کر رہے تھے۔

سودیشی ریل کا بے ساختہ پن۔ ہندوستانیوں کی تحریک سودیشی کا ایمان کرنے والا ثابت ہوا۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا ریلوے ممبر اس مضمون سے بہت متاثر ہوا۔ اور محکمہ اطلاعات حکومت ہند نے اس مضمون کے انگریزی تراجم مختلف ذمہ دار افسروں گورنروں اور وائسرائے کو بھجوائے کیونکہ اس میں سودیشی تحریک کا مضحکہ جس انداز میں اڑایا گیا تھا وہ حکومت کے ہاتھ مضبوط کرتا تھا۔ اور انہیں سودیشی ریل جیسے متعدد مضامین کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

ہمیں سو فیصدی یقین ہے کہ شوکت تھانوی کا ذہن اور دامن اس قسم کی آلائشوں سے پاک تھا۔ اور انہوں نے سودیشی ریل خالص مزاحیہ انداز اور مزاحیہ بنیادوں پر استوار کی تھی۔ اُسے سیاسیات سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ لیکن انگریزی حکومت کے ارباب حل و عقد نے اس سے جو تاثر لیا اور اس سے اپنے مقاصد میں جو امداد حاصل کی اس سے اس کا مصنف ناواقف تھا۔

حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات کے سربراہ ان دنوں علامہ جعفری تھے۔ جو بڑے مدبّر اور مشہور اہل قلم تھے۔ اس مضمون کی وجہ سے شوکت تھانوی کا تعارف جعفری صاحب سے ہوا۔ اور بعد میں یہ تعارف شوکت صاحب کے سونگ پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ میں منسلک ہو جانے کا باعث بنا۔ جعفری صاحب نیرنگ خیال کے نہ صرف مداح تھے۔ بلکہ سرپرست بھی تھے۔ اور خود بھی نیرنگ خیال میں وقتاً فوقتاً لکھتے تھے۔

سودیشی ریل کے مندرجہ بالا تاثرات مطلقاً سیاسی تھے۔ جو نادانستہ منظرِ عام پر آ گئے اور حکومت کی مشینری نے اُن سے کچھ استفادہ کیا۔ لیکن اس مضمون کے ادبی تاثرات یہ تھے۔ کہ ادبی حلقوں میں یہ مضمون بے انتہا پسند کیا گیا۔ اس میں مزاحیہ رنگ اس بے ساختہ پن سے بھرا ہوا ہے۔ کہ سرتاپا آمد ہی آمد معلوم ہوتی ہے۔ آورد۔ بھرتی یا جبر و ضرورت کے ماتحت ایک جملہ بھی نہیں لکھا گیا۔ اس مضمون میں مصنّف کا ذہن ایک نہایت کامیاب بلند پایہ تخلیق کے لئے مصروفِ کار نظر آتا ہے جو آسمانِ ادب کے ایک درخشندہ ستارے کی زینت بننے والا تھا۔

اس زمانہ میں پطرس اور رشید احمد صدیقی کے نام مزاحیہ نگاروں میں سرِفہرست تھے۔ لیکن ان کی تخلیقات میں بعد آسمانی تھا۔ ایک مزاح کا بادشاہ تھا تو دوسرا فلسفیانہ طنز نگاری کا علمبردار پطرس کے کسی مضمون کے لئے تو آنکھیں ترس جاتی تھیں۔ برسوں کے بعد ایک آدھ مضمون رسائل کے صفحات پر نظر آتا تھا۔ یہی حالت رشید احمد صدیقی کی تھی۔ رسائل کی رسیا پبلک مزاحیہ مضامین کو سب سے زیادہ پسند کرتی تھی۔ اس لئے جو چند اہلِ قلم مزاح لکھنے کا شوق رکھتے تھے۔ وہ شوکت کی اس کامیابی سے بہت متاثر ہوئے انہوں نے دیکھا کہ بیک کششِ قلم۔ یا بیک پارہ مضمون، شوکت تھانوی ادب کی کتنی منزلیں طے کر گئے ہیں۔ اور انہوں نے فوراً ہی وہ مقام حاصل کر لیا ہے جو ایک ادیب برسوں کی مسلسل کاوش کے بعد حاصل کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان دنوں ملا رموزی، مرزا فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی اور بہت سے دیگر اہلِ قلم نے زیادہ توجہ اور فراوانی سے لکھنا شروع کیا۔ اور رسالہ کا ہر نمبر ایک دو مزاحیہ مضامین سے مزین ہونے لگا۔ مشہور ناولوں کے علاوہ قریباً ایک دو درجن دوسرے ادیبوں نے بھی اس سلسلہ میں خامہ فرسائی کی۔ مثلاً ابو طاہر، پروفیسر غلام سرور۔ ساحر، میر ولی اللہ ایبٹ آبادی، پروفیسر حسن جعفری وغیرہ وغیرہ اور ان کے مضامین بھی مزاحیہ ادب میں کچھ نہ کچھ مقام رکھتے ہیں۔ گویا ادب کے اس نوع پر بھی خاصی توجہ دی جانے لگی۔ بلکہ مزاح کی یہ مقبولیت اخبارات تک بھی جا پہنچی اور اکثر روزناموں نے مزاحیہ کالم اپنے لئے لازمی قرار دے دیئے۔ روزنامہ انقلاب کی مقبولیت کا باعث، ۹۰ فیصدی جناب سالک مرحوم کے لکھے ہوئے افکار و حوادث تھے۔ افکار و حوادث، علم، ادب، مزاح اور طنز کے شہ پارے ہوتے تھے۔ اگر ان کا انتخاب شائع کیا جائے تو ہمارے خیال میں وہ مجموعہ تمام مزاحیہ کتابوں سے گراں پا اور گراں بہا ثابت ہو گا۔ ہندوستان کے اخبارات میں ملا رموزی کی گلابی اردو اور زمیندار اخبار میں حاجی لق لق کے مزاحیہ کالم گو علمی ادبی رنگ سے محروم تھے لیکن کچھ نہ کچھ مزاح کا رنگ ضرور رکھتے تھے۔ یہ رسم یہاں تک بڑھی کہ آج بھی روزنامہ جنگ میں ابراہیم جلیس کا لکھا ہوا "وغیرہ وغیرہ" اور شوکت تھانوی کا "پہاڑ تلے"۔ روزنامہ نوائے وقت کا سرِراہے خاصے مقبول ہیں۔ شوکت تھانوی کی سودیشی ریل نے مزاحیہ ادب کی کامیابی کے راستے استوار کر دیئے۔ اس کامیابی کا ایک بیّن ثبوت شوکت تھانوی کی درجنوں مزاحیہ تخلیقات ہیں۔ جن کی مقبولیت اس بات کی شاہد ہے کہ ہر پڑھا لکھا اپنے دماغی سکون کے لئے تفریح و تنفس کے لئے اور غم و افکار کے ازالہ کے لئے جب کچھ پڑھنا چاہتا ہے۔ تو اس قسم کے لٹریچر کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے۔ افسانہ اور ناول ٹریجڈی سے بھرپور ہوتے تھے۔ اور خوش انجام ناول بھی جب تک مایوسیوں کو پوری طرح رنگ نہ جائیں۔ مسرت کی گھڑیوں کے قریب نہیں پہنچتے۔ اس لئے دو گھڑی ہنس بول لینے کے لئے اور تفکرات دنیا سے آزاد رہنے کے لئے مزاحیہ کتابوں کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے

شوکت تھانوی نے جو کچھ دیا ہے بہت کم دیا ہے۔ ان کا زیادہ وقت ریڈیو کی نذر ہو گیا، یا روزناموں میں کھو گیا۔ ریڈیو کی مصروفیت

سب سے ہلاکت زا ہوتی ہے۔ وقت بے وقت، بلا ضرورت، جبراً کچھ لکھنا پڑتا ہے۔ یہ آمد نہیں آورد ہوتی ہے۔ روٹی کا سوال ہمیشہ مقدم ہوتا ہے۔ پھر روٹی کے لیے جو ادب تخلیق کیا جائے گا۔ وہ یقیناً پست ہوگا۔ وقتی طور پر چند منٹ ہنسانے اور بہلانے کے کام تو آجاتا ہے۔ مگر اسے کوئی مستقل شکل نہیں دی جا سکتی۔ ریڈیو کی شدید مصروفیت نے شوکت تھانوی کی اڑان کے پر کتر ڈالے تھے۔ اور مرحوم وہ مقام حاصل نہ کر سکا، جو وہ اطمینان اور سکون سے لکھی ہوئی تحریروں سے حاصل کر سکتا تھا۔

شوکت تھانوی۔ ابتدا میں سب سے اول شاعر تھے۔ اس کے بعد افسانہ نگار بنے۔ اور آخر میں مزاح نگار ہوئے۔ بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ شوکت تھانوی اچھے شعر کہتے تھے۔ اب بھی جب کسی مشاعرہ میں مدعو ہوتے تو اپنا کلام سناتے تھے جو پسند کیا جاتا تھا۔ اگر آپ مزاح نگار نہ ہوتے تو یقیناً ایک نامور شاعر ہوتے۔

سنہ ۱۹۳۳ء کا سالنامہ نیرنگ خیال میرے سامنے ہے۔ اس میں جن شعراء کا کلام درج ہے۔ ان کے کلام ملاحظہ ہوں۔ کیفی چڑیا کوٹی، ساغر نظامی، جگر مراد آبادی، آرزو لکھنوی، اصغر گونڈوی، جلیل قدوائی، تپش لاہوری، احسن مارہروی، آزاد انصاری، عزیز لکھنوی، ہادی حسن، مرزا یاس، شوکت تھانوی، سید عابد علی، اختر شیرانی، حضرت سیماب، ، آغا حشر، رگھوپتی سہائے فراق، سید الطاف شاہ، میکش، ضیا فتح آبادی، احسان بن دانش، اکبر حیدری، محمود اسرائیلی۔ ان سب کے دوش بدوش شوکت تھانوی موجود ہیں۔ حضرت شوکت تھانوی کی غزل ملاحظہ ہو۔

نوائے شوکت

فریبِ ذوق کو ہر رنگ میں عیاں دیکھا
جہاں جہاں تجھے ڈھونڈھا وہاں وہاں دیکھا

جب اپنے آپ کو آمادۂ فغاں دیکھا
تو دردِ عشق نے لرزہ میں آسماں دیکھا

وہی ہے دشتِ جنوں اور وہی ہے تنہائی
ترے فریب کو اے گردِ کارواں دیکھا

عجب یہ دل ہے جسے باوجود تنہائی
گھرا ہوا ترے جلووں کے درمیاں دیکھا

جنوں نے ذوقِ محبت مٹا دیا دل سے
کچھ اب تو یاد نہیں ہے کسے کہاں دیکھا

ہے برق کو بھی کوئی لاگ نامرادی سے
گری تڑپ کے جہاں اس نے آشیاں دیکھا

ہمیں زمانہ میں کوئی نظر نہیں آتا
اجل کو دردِ وفا کا مزاج داں دیکھا
وہیں وہیں ترے جلووں نے آگ بھڑکائی
جہاں جہاں کوئی بے نام و بے نشاں دیکھا
لگا دی جان کی بازی غمِ محبت نے
جب اُن کے حسن کا سودا بہت گراں دیکھا

۱۹۳۳ء سالنامہ نیرنگ خیال۔ صفحہ ۲۰۴۔

یہ ہے شوکت تھانوی کا ۱۹۳۳ء کا کلام۔ آج سے ۳۰ سال قبل کا۔ اگر مزاح کا رنگ اُن کے ادب پر نہ چھا جاتا تو یقیناً وہ ایک نامور شاعر بھی ہوتے۔

حضرت شوکت تھانوی کی ایک خصوصیت جو اکثر عوام و خواص سے پوشیدہ رہی ہے۔ یہ تھی کہ آپ ہر شاعر کے طرزِ بیان کی ہوبہو نقل اتارتے تھے۔ اکثر تنہائی میں یہ مشغلہ بڑا دلچسپ اور پُرلطف رہتا تھا۔ کبھی آپ جگر کے انداز میں دو تین شعر سناتے۔ کبھی ساغر نظامی کے انداز میں پڑھتے۔ کبھی حضرت حفیظ جالندھری کے انداز میں پوری نقل اتارتے۔ اگر کوئی شخص دوسرے کمرے میں بیٹھ کر یہ کلام اُن کے منہ سے سن پاتا تو وہ یقیناً یہی کہتا کہ جناب جگر یا ساغر یا حفیظ صاحب پڑھ رہے تھے۔ نہ کہ شوکت تھانوی۔ خود تو وہ اپنا کلام تحت اللفظ سناتے تھے مگر ہر شاعر کی پوری اور ہوبہو نقل ترنم سے اتارتے تھے۔ اگر کارکنانِ ریڈیو کو حضرت شوکت تھانوی کی اس خصوصیت کا علم ہو جاتا تو وہ اُن سے محیر العقول کام لے سکتے تھے۔ یا کم از کم اگر اُن کا ایک ایسا ریکارڈ ہی تیار کر لیا جاتا جس انداز میں انھوں نے پاک و ہند کے ایک درجن شعراء کی ہوبہو نقل اتاری ہو تو یہ ریکارڈ یقیناً عجوبۂ روزگار سمجھا جاتا۔ جب کبھی ہم تنہائی میں شوکت سے ملتے تو اکثر ہماری فرمائش یہی ہوتی تھی کہ شوکت صاحب کچھ ہو جائے۔ اور کچھ سنائیے۔ ذرا ساغر صاحب کی نقل اتاریئے۔ شوکت صاحب زیرِ لب مسکراتے اور پھر بچوں کی طرح شروع ہو جاتے۔ اور درجنوں شعراء کو روندتے ہوئے نکل جاتے۔ اس وقت ہم اُن کی مزاحیہ خصوصیات کو بھول جاتے تھے۔ اور ہمیں اُن کی ان نقالیوں میں اتنا لطف آتا کہ دوسری ملاقات تک قلب و روح پر حاوی و طاری رہتا تھا۔

غرض شوکت تھانوی ہر فن مولا تھے۔ وہ جو کچھ چاہتے تھے کر لیتے تھے۔ جو کچھ چاہتے تھے لکھ لیتے تھے۔ یہ خوبی آج اُردو کے کتنے ادیبوں میں ہو گی؟ —— جو جانِ محفل بھی ہو۔ اور جانِ ادب بھی!

شوکت "میرا دوست"

سیّد عطا حسین کلیم

سودیشی ریل کے مصنف سے ملاقات کی تمنا کس کو نہ ہوگی۔ میں بھی شوکت تھانوی کے عقیدت مندوں میں شامل ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سودیشی ریل لکھ کر شوکت تھانوی نے ہندو سامراج پر بہت گہری چوٹ کی تھی۔ اُن کی اس تحریر کے بعد عوام کی نظروں میں ہندو کانگریس کے سودیشی راج کی کوئی وقعت باقی نہ رہی تھی۔ اس سے برصغیر میں برہمن راج کے منصوبے خوابِ پریشان ہو کر رہ گئے اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شوکت تھانوی کی سودیشی ریل نے پورے ملک میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اور وہ لوگ بھی جن پر اس میں طنز کیا گیا اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔

شوکت تھانوی سے ملاقات کی تمنا مجھے محض اس لیے تھی کہ میں اس شخص کو دیکھوں جس نے اپنی صرف ایک تحریر سے شہرت و ناموری کے تمام مراحل اس قدر جلد طے کر لیے تھے لیکن جب میں اُن سے ملا تو سودیشی ریل ہمارے درمیان موجود نہیں تھی۔ وہ ایک سنجیدہ اور متین، ہمدرد اور غمگسار دوست کی طرح ملے اور پھر ہم اُس وقت تک ملتے رہے جب تک موت نے ہمارے درمیان ایک نہ گرنے والی دیوار حائل نہ کر دی۔ یوں تو شوکت تھانوی سے میری یاد اللہ بہت مدت سے تھی لیکن جب وہ راولپنڈی میں "جنگ" اخبار کے مدیر ہو کر آئے تو ہمارے تعلقات اور بھی استوار ہوگئے۔ دن ہو یا رات روزانہ ملاقاتیں رہتیں۔ کبھی بالمشافہ اور کبھی ٹیلیفون پر۔ وہ ایک سچے دوست کی طرح میری زندگی میں داخل ہوئے اور مرتے دم تک میری ہر مشکل کو اپنی مشکل اور میری ہر تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے رہے۔ پچھلے سال جب میں بیمار ہوا اور مجھے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا تو اس کے باوجود کہ وہ خود پاؤں کے درد میں مبتلا تھے ہر شام اپنی بیگم کے ہمراہ عیادت کے لیے ہسپتال آتے رہے۔ اُن کے اور میرے تعلقات اب ہمارے گھروں تک پھیل گئے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے دکھوں سے واقف ہو چکے تھے لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شوکت نے اپنے سینے کے اندر اس نامراد بیماری کا جو دکھ پال رکھا تھا اُسے اُس نے کبھی کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ شوکت تھانوی بہت کم آمیز انسان تھے لیکن شہرت اور ان کے قدر دانوں کا حلقہ بہت وسیع تھا وہ جس سے ایک بار بھی ملتے وہ اُنھیں عمر بھر اپنا خیال کرتا۔ شوکت زندگی کے ہر معاملے میں نفاست اور ایک خاص قسم کے رکھ رکھاؤ کے پابند تھے اُن کی مثالی وضع داری اور کم آمیزی زبان زدِ عام تھی لیکن اس کے باوجود کوئی بھی اُنھیں غرور اور پندار کا طعنہ نہ

دے سکتا تھا۔

شوکت تھانوی ایک بزم آرا انسان تھے یا یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے جس جگہ بیٹھ جاتے زندگی چہک اٹھتی۔ بات کرتے ہوئے اُن کا چہرہ ہمیشہ پُرسکون اور سنجیدہ رہتا، ہونٹوں پر ایک معصوم مسکراہٹ کھیلتی نظر آتی اور گہرے رنگ کی عینک کے پیچھے اُن کی آنکھوں میں ایک نہ بجھنے والی چمک دیکھنے والوں کی نظر سے اوجھل رہتی، کسی بات کا تجزیہ کرنا اور اسے دلکش پیرایۂ اظہار عطا کرنا اُن پر ختم تھا وہ صرف ایک نکتے کو پھیلا کر داستان بنا لیتے تھے اُن کی باتوں سے لوگوں کے دلوں میں گدگدی ہونے لگتی محفل کشتِ زعفران بن جاتی لیکن وہ خود یوں پُرسکون اور سنجیدہ بیٹھے رہتے جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

مجھے شوکت تھانوی کی رفاقت میں متعدد مشاعروں میں شرکت کا موقع بھی ملا، یوں تو ہر جگہ اُن کی طبیعت کی شگفتگی اور حاضر جوابی نے سفر کی بوریت کو آرام اور سکون سے بدل دیا۔ مگر مظفر آباد اور مری کے مشاعرے تو عمر بھر یاد رہیں گے۔ مولانا ماہر القادری اور صابر دہلوی سے مرحوم کے دیرینہ مراسم تھے مولانا سے ان کی محبت اور بے تکلفی تو بعض اوقات گستاخی کی حدوں کو چھو لیتی تھی مگر چونکہ دونوں جانب یکساں خلوص اور محبت کارفرما تھے اس لیے کبھی بدمزگی کی نوبت نہیں آئی۔ مظفر آباد کے مشاعرہ میں مولانا ماہر القادری کو رات بھر جگائے رکھنا۔ اُن سے پرانے وُرود کا کلام مجبور کر کے سننا پھر ان کی سادہ لوحی کو کسی فرضی محبوبہ اور مشاعرہ کا جھانسہ دے کر صبح تک عشقیہ اشعار سنتے رہنا یہ سب شوکت کی زندہ دلی کے مظاہرے تھے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ شوکت مولانا کی عزت نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی تاویل یوں کی جا سکتی ہے کہ شوکت کی سدا بہار طبیعت اُنھیں چین سے بیٹھنے نہ دیتی تھی اور اُن کی حاضر دماغی سنجیدہ سے سنجیدہ گفتگو میں بھی مزاح کے نکات ڈھونڈھ لیتی تھی۔ مری میں گذشتہ سال جشنِ مری کے سلسلہ کا سالانہ مشاعرہ تھا دیگر شعرا کے ساتھ شوکت، سیّد محمد جعفری اور میں بھی مدعو تھے منتظمین سے طے پایا تھا کہ ہم تینوں برائٹ لینڈ ہوٹل میں اکٹھے ٹھہریں گے شوکت نے پہلے تو یہ شرارت کی کہ شام کے وقت جب ہم مال روڈ پر گھوم رہے تھے ایک بہت طویل القامت انسان کو عجب ڈرامائی انداز میں پکڑ کر لے آئے اور اُس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے پھر عرض کی "بندہ پرور ہماری زندگی وبال ہو گئی ہے کیا آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں آپ کا کرم ہو تو ہم اس مصیبت سے نجات پا سکتے ہیں۔"

وہ شریف آدمی حیران ہوا کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے شوکت تھانوی جیسا مشہور ادیب اور گفتگو کا یہ انداز! خدا جانے انھیں کیا مشکل درپیش ہے اس دوران سید محمد جعفری ملتجی نظروں سے اُسے دیکھتے رہے جیسے کہہ رہے ہوں بھائی خدا کے لیے ہماری مدد کرو ہم مظلوم ہیں بہرحال وہ صاحب قدرے پریشان ہو کر گویا ہوئے "فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔" "بس آپ تھوڑی دیر کے لیے ہمارے ساتھ تشریف لے چلیے وہیں معاملہ طے ہوگا۔" شوکت نے کہا۔ میں ڈاکخانے کے سامنے حیران کھڑا سوچ رہا تھا کہ خدا جانے اِن دونوں پر کیا افتاد پڑی ہے جو اس طرح ایک اجنبی کی خواہ مخواہ منت سماجت کر رہے ہیں۔ اب جو دیکھتا ہوں تو شوکت

اور جعفری اُن صاحب کو ساتھ لیے میری سمت چلے آ رہے ہیں۔ قریب پہنچ کر شوکت نے للکار کر مجھے مخاطب کیا "کیوں بے اب بات کہ زندگی اجیرن کر رکھی ہے چھ فٹ تین انچ قد کیا ہوا ہمارے لیے مصیبت بن گیا بھلا اب ان کے سامنے تیری کیا حیثیت ہے اور ہاں تعارف کے لیے یہ بھی سُن لے کہ یہ عوج بن عنق کی اولاد میں سے ہیں۔" میرا ہنسی کے مارے بڑا حال تھا اور وہ صاحب ہنسنے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی نظر آ رہے تھے وہ تو کہیے خیر گذری اور مشاعرہ میں مدعو شعرا کی ایک ٹولی ادھر آ نکلی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

لاہور کے ایک مشاعرہ میں ایک وہابی قسم کے باریش بزرگ سید محمد جعفری کو ہر مصرع پر بڑھ بڑھ کر داد دے رہے تھے کہ شوکت کو جو شرارت سوجھی تو اپنی جگہ سے اُٹھ ایک لمبا چکر کاٹ کر مولانا کے پاس جا پہنچے مولانا نظم سننے اور داد دینے میں محو تھے کہ شوکت اُن کے قریب مُنہ لے جا کر بولے ——— "شرم تو نہیں آتی آپ کو انھیں داد دیتے ہوئے" وہ بزرگ بہت جز بز ہوئے اور غصے میں کہنے لگے یہ کیا بد تہذیبی ہے مُنہ سنبھال کر بات کرو سخن فہم نہیں ہو تو مشاعرہ میں کیوں آئے ہو" اب شوکت نے دوسرا وار کیا "حضرت یہ شیعہ ہے" اب کیا تھا مولانا ایسے چپ ہوئے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو اور مشاعرہ کے اختتام تک پھر کسی نے اُن کی آواز نہ سُنی ——— شوکت تھانوی ایک صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔ شیعہ، سُنی، وہابی کے امتیازات سے بالا تر۔ اُن کے بہترین دوست سید محمد جعفری اور ظریف جبلپوری کی عمر بھر کی رفاقت اس امر کی شاہد ہے کہ کسی فرقہ کی دل آزاری اُن کے نزدیک گناہِ عظیم تھی اس کا مظاہرہ انھوں نے ایک مشاعرہ کی صدارت کرتے ہوئے بھی کیا تھا شوکت زود رنج بھی تھے اور جلدی من بھی جاتے تھے میں نے انھیں دوستوں کے لیے کڑھتے دیکھا ہے۔ میرے علم میں ایسی کئی مثالیں ہیں جب انھوں نے اپنے آرام اور فائدہ پر دوستوں کے فائدے کو ترجیح دی وہ مشاعروں میں شرکت کے تمنائی نہیں تھے لیکن جب کسی مشاعرہ میں بلائے جاتے تو اپنی طرف سے تمام شرائط اور معاملات کا پہلے سے تصفیہ کر لیتے اور پھر منتظمین کی طرف سے اس معاملے میں ذرا سی کوتاہی بھی گوارا نہ کرتے۔ عام طور پر وہ مشاعروں میں تنہا جایا کرتے لیکن اگر کبھی دوسرے دوستوں کو اُن کی رفاقت میسر آتی تو نہ صرف یہ کہ سفر بہت عمدگی کے ساتھ کٹتا بلکہ اُن کے رفیقوں کو ہر قسم کا آرام بھی ملتا اور شوکت خود تکلیف اُٹھا کر بھی اُن کی آسائش کا خیال رکھتے۔

شوکت تھانوی کو قدرت نے ایک سدا بہار ذہن عطا کیا تھا۔ وہ ایک ہی بات کو سو طرح بیان کرنے پر قدرت رکھتے تھے، ان کی نظم میں بے ساختہ پن ہوتا تھا اور ان کی نثر بے خوفی اور بے باکی کی مظہر تھی۔ طنز و مزاح پیدا کرنے کے لیے انھیں کسی تکلف یا بناوٹ کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ وہ مزاح میں طنز کے ساتھ ساتھ اصلاح کو بھی پیشِ نظر رکھتے تھے۔

ان کا کردار "قاضی جی" ریڈیو پاکستان کے جس اسٹیشن سے بھی وابستہ رہا قومی اور ملی مسائل کو سلجھانے میں بے حد مددگار ثابت ہوا۔

"قاضی جی" گو ایک مزاحیہ فیچر تھا لیکن اس میں شوکت تھانوی کا دل پوری شدت سے دھڑکتا تھا۔ وہ قوم اور وطن کی اصلاح و تعمیر کے لیے اس کردار کے روپ میں کچھ اس طرح نمایاں ہوئے کہ عوام اور خواص یکساں اُن کی شخصیت سے مانوس و متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

۲۳ر مارچ سے پہلے وہ قدرے علیل ہو گئے وہ اس طرح اکثر بیمار ہو جایا کرتے تھے لیکن میں نے کبھی انھیں اس قدر مشوش نہیں دیکھا تھا۔ اگر کوئی اُن کی علالت پر ان کے روبرو پریشانی کا اظہار کرتا تو وہ اُسے گوارا نہ کرتے۔ جیسے اپنی صحت پر سے ان کا اعتماد اُٹھ گیا ہو۔ لیکن ان کی تکلیف بظاہر ایسی نہ تھی کہ اس پر فکر مندی کا اظہار کیا جاتا۔ ۲۳ر مارچ کو انھیں گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں حکومت کی طرف سے تمغۂ امتیاز ملنے والا تھا ——— وہ لاہور گئے اس تقریب میں شریک ہو کر ایوارڈ حاصل کیا لیکن پھر واپس نہ آسکے اُن کے احباب یہاں اس اعزاز پر اُنھیں استقبالیہ دینے کی سوچ رہے تھے کہ خبر ملی "شوکت تھانوی میو ہسپتال میں داخل ہو گئے ہیں" ——— پھر خبر آئی "ان کی حالت تشویشناک ہے" پھر ڈاکٹروں کی فکر مندانہ رپورٹ کا پتہ چلا۔ میں مرحوم کے عزیز دوست سید محمد جعفری اور ظریف جبلپوری کے ہمراہ لاہور گیا ہسپتال میں شوکت سے ملا۔ مگر شوکت مل نہ سکے وہ تو شوکت تھانوی کا بے روح جسد تھا۔ وہ جس تکلیف کے ساتھ سانس لیتے تھے اس سے خود مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

میں تین چار روز لاہور میں رہا مگر مجھے شوکت تھانوی ایک دن بھی یوں نہ مل سکے جیسے وہ کبھی ملا کرتے تھے، ان سے جو باتیں ہوئیں وہ بجائے خود اس درد کی ٹیسیں تھیں جسے شوکت تھانوی نہ جانے کب سے اپنے سینے میں چھپائے بیٹھے تھے۔ اور جو آج ایک مہلک اور آخری روگ بن کر ظاہر ہو گیا تھا۔

اپریل کے آخری ہفتے میں مجھے اپنے فرائضِ منصبی کے سلسلہ میں مشرقی پاکستان جانا پڑا اور پھر وہیں مجھے یہ خبر ملی کہ شوکت تھانوی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ۴ر مئی ۱۹۶۳ء کو میں چاٹگام میں تھا دل صبح سے اُداس تھا عالمِ غربت میں یوں بھی دوستوں اور عزیزوں کی یاد ستاتی ہے ——— اور میں تو اپنے جان سے پیارے دوست شوکت کو نزع کی حالت میں چھوڑ کر آیا تھا مجھے بے حد پریشانی تھی پونے نو بجے (مشرقی پاکستان کے وقت کے مطابق) ریڈیو پر خبریں سنیں شوکت کی موت کی خبر نے میرے حواس کھو دیئے میں رات بھر سو نہ سکا۔ اُف! کس قدر بھیانک تھا یہ خیال کہ میں اب قیامت تک اپنے عزیز دوست کو دیکھ نہ سکوں گا۔

میں لاہور سے ڈھاکہ آتے ہوئے شوکت سے ملا تھا۔ اور شوکت کا یہ فقرہ کہ "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ مجھے کفن میں لپیٹے دفنانے جا رہے ہیں" میرے کانوں میں گونج رہا تھا شوکت جسے میں نے اپنا عزیز ترین دوست جانا اور مانا اور جس نے مجھ سے اپنی زندگی کا کوئی راز نہ چھپایا ہمیشہ کے لیے میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ میری بدقسمتی کی انتہا یہ ہے کہ میں جو اُس کے ہر اچھے بُرے میں شریک تھا اُسے سفرِ آخرت میں کندھا بھی نہ دے سکا۔

زندگی کی مجبوریاں

بے شک میں نے اُنھیں شدید بیماری کی حالت میں بھی دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ شخص جسے زندگی سے والہانہ عشق تھا، جو دوسروں کو بھی زندگی کرنے کے گُر سکھاتا تھا یوں اچانک موت سے ہمکنار ہو سکتا ہے ——؟ لیکن یہ ہمارے وہم و یقین پر منحصر نہیں، موت کا ایک وقت معیّن ہے جب وہ وقت آ جائے تو زندگی آپ ہی آپ موت کی تاریک وادیوں میں چپ چاپ اُتر جاتی ہے۔

شوکت تھانوی مرگئے یا نہیں —— لیکن یہ ایک اذیت ناک حقیقت ہے کہ اب وہ ہم میں موجود نہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے رائٹرز گلڈ کے جلسے اُن کے بغیر سونے پڑے ہیں ہمارے مشاعرے بے کیف ہیں ہمارے ریڈیو کے "قاضی جی" کہیں نظر نہیں آتے اور جنگ اخبار کا کالم "پہاڑ تلے" اپنے قارئین کی نگاہوں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہوگیا ہے۔

دنیائے ادب کی طرف سے شوکت صاحب کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ لیکن میں سوچتا ہوں مجھے کیا کہنا چاہیئے میں کیا کہہ سکتا ہوں اور پھر میرے سامنے ایک بھیانک خلا پھیل جاتا ہے میں سوچتا ہوں یہ خلا جسے شوکت کی موت نے پیدا کیا ہے کبھی پُر نہ ہو سکے گا۔ ہم اس بہت ہی پیارے دوست کو اب کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ اور اس احساس کے ساتھ ہی بے اختیار میرا دل ڈوب جاتا ہے میری پلکیں بھیگ جاتی ہیں۔ ڈھاکہ سے واپسی پر میں لاہور ٹھہرا تھا۔ اپنی بدنصیب بھاوج زہرا شوکت سے ملنے گیا ہم دونوں مرحوم کو یاد کر کے آنسو بہاتے رہے پھر میانیر کے قبرستان میں گیا جہاں دنیائے ادب کا یہ درخشندہ ستارہ دھندلکوں میں کھو گیا ہے۔

ایک کچی قبر دُنیا اور دنیا والوں کے عہدِ محبت کی ناُاستواری پر نوحہ کناں ہے اور صبح و شام کی اُداسیاں شوکت کے طنز و مزاح کی جاوداں شگفتگی پر خندہ زن نظر آتی ہیں۔

بیگمات نے کہا

محمد طفیل

ملک اور کافور کی اس دنیا میں، اگر کسی کو ثبات حاصل ہے تو وہ اہلِ قلم ہی ہیں۔ جو اپنے فن کے بوتے پر، صدیوں زندہ رہ سکتے ہیں اور رہے ہیں۔

شوکت تھانوی جسم کے اعتبار سے اس دنیا میں موجود نہیں۔ مگر وہ کسی رنگ میں موجود تو ہیں۔ ورنہ کیوں دل کی ویرانیاں قلم کے لیے روک بنتیں ؟

ان دنوں میں اپنی دلی کیفیات کا اظہار کاغذ اور قلم کی مدد سے آپ پر واضح نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایسی "مرحوم مگر زندہ شخصیت" پر لکھنے کے لیے، جس دل گردے کی ضرورت ہے۔ وہ مجھے میسر ہی نہیں۔ میں تو یادوں کے ہجوم میں خود ہی گم ہوا جا رہا ہوں۔

میں جس حال میں بھی رہا۔ انھوں نے میرا ساتھ دیا۔ وہ مجھے چھوٹا بھائی کہتے تھے۔ میں انھیں بڑا بھائی سمجھتا تھا۔ مگر انھوں نے میرے ساتھ تعلقات کو کچھ ایسے نبھایا کہ جیسے وہ مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے تھے اور میں انھیں بڑا بھائی کہتا تھا۔

ادیب کی حیثیت سے میرا سب سے پہلا واسطہ شوکت صاحب ہی سے پڑا۔ اُس دن سے لے کر مرنے کی گھڑی تک، اُس واسطے کو نبھانا کچھ آسان کام نہ تھا۔ اس عرصے میں ہم متعدد بار روٹھے، متعدد بار "خوخیائے" مگر آفریں ہے شوکت صاحب پر کہ وہ ابھی روٹھتے تھے اور ابھی مان جاتے تھے۔ اگر یہ خوبی اُن میں نہ ہوتی تو ہم دو برس بھی ایک ساتھ نہ چل سکتے۔

شوکت تھانوی کون تھے۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں۔ میں بھی جانتا ہوں۔ مگر کیا تھے ؟ یہ سب نہیں جانتے اور یہی بتانا ہے بھی مشکل، اس مشکل کو حل کرنے کے لیے، میں نے مرحوم کی بیگمات سے مضمون لکھوانے کی کوشش کی۔ مگر مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ اگر میں مرحوم کے بارے میں باتیں بھی کرتا تھا تو آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی۔

باتوں باتوں میں، مختلف اوقات میں، میرے تجسس نے ان کے آنسوؤں کے درمیان جو کچھ دیکھا اور سُنا وہ آپ کو بھی دکھائے اور سُنائے دیتا ہوں :۔

(اس وقت میرے سامنے شوکت صاحب کی بڑی بیگم سعیدہ خاتون بیٹھی ہیں۔ میں ان سے ۱۹۴۳ء سے واقف ہوں اُس وقت سے لے کر آج تک میں نے انھیں حد درجہ سنجیدہ، رکھ رکھاؤ والی اور مصلّے تسبیح والی خاتون پایا)

بھابی! — یہ تو بتائیں۔ آپ کی شادی کس سن میں ہوئی تھی اور اس وقت آپ دونوں کی عمر کیا تھی؟

طفیل بھائی! میرا نکاح ۱۹۲۴ء میں ہوا، تاریخ اور مہینہ ٹھیک سے یاد نہیں اور رخصتی دسمبر ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ رخصتی کے وقت ہم دونوں کی عمر بہت کم تھی۔ شوکت صاحب تقریباً بائیس سال کے تھے اور میری عمر تقریباً سولہ سال ہوگی۔“

چھ سال کا فرق تھا۔ ٹھیک! — کیا شوکت صاحب آپ کے رشتہ دار بھی تھے؟ یا یہ بندھن ایسے ہی انسانی برادری والا قصہ تھا۔

جی ہاں! شوکت صاحب میرے رشتے کے چچا ہوتے تھے۔ میرے والد حکیم مولوی سجاد حسین صاحب شوکت صاحب کے قریبی رشتے کے خالہ زاد بھائی تھے۔“

بھابی گستاخی معاف! یہ تو بتائیں آپ کی شادی میں کچھ ہاتھ شوکت صاحب کا بھی تھا یا یہ شادی بھی قرعۂ فال کے قاعدے کے مطابق ہوئی تھی؟

طفیل بھائی! شوکت صاحب قرعۂ فال کے قائل نہیں تھے اور یہ شادی سولہ آنے ان کی اپنی پسند سے ہوئی تھی جس کا ذکر انھوں نے خود اپنی کتاب ”مابدولت“ میں کیا ہے۔ کہ وہ کس طرح مین پوری میرے گھر آئے، مجھ کو دیکھا، پسند کیا اور اپنے ماں باپ سے کہہ کر شادی کا پیغام بھجوایا۔ حالانکہ اس وقت تک میری بڑی بہن کی شادی نہیں ہوئی تھی اور میرے والد صاحب کی خواہش تھی کہ پہلے بڑی لڑکی کا عقد ہو جائے اس کے بعد منجھلی کی نسبت پر غور کیا جائے۔ لیکن شوکت صاحب کی ضد کی وجہ سے والد صاحب کو پہلے میری ہی شادی کرنا پڑی۔ لیکن ابھی صرف نکاح کی رسم ادا ہوئی تھی، والد صاحب قبلہ کی خواہش یہ تھی کہ شوکت صاحب جب انٹرنس پاس کر لیں گے تو اس وقت رخصتی کی رسم ادا کی جائے گی۔ شوکت صاحب کو یہ شرط منظور تھی لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد شوکت صاحب کی بے قرار طبیعت نے ایک بار پھر والد صاحب کو مجبور کر دیا کہ وہ شوکت صاحب کے انٹرنس پاس کرنے کا انتظار نہ کریں اور میری رخصتی کر دی جائے۔

یہ بات تو ٹھیک ہے کہ شوکت صاحب کو جس بات کی دُھن سوار ہوتی تھی۔ اُس سلسلے میں جلدی کے قائل تھے۔ پھر یہ معاملہ تو شادی کا تھا (جب میں نے یہ فقرہ کہا تو مجھے بڑی شرم آئی۔ مگر میں آنکھیں نیچی کر کے کہہ ہی گیا) اچھا یہ تو بتائیے اس وقت شوکت صاحب کیا تھے؟ اور آپ کی ان کے بارے میں کیا رائے تھی؟

اس وقت وہ صرف محمد عمر تھے شوکت تھانوی انھوں نے بننا شروع کیا تھا۔ شاعری اور مضمون نگاری کی طرف ان کا رجحان ہو چکا تھا۔ نکاح کے بعد رخصتی سے پہلے ان کا پہلا مزاحیہ مضمون جس کا عنوان ”میٹھے چاول“ تھا۔ امین سلونوی صاحب کے رسالے ”ترچھی نظر“ میں شائع ہوا اور کافی مقبول عام ہوا، مجھے بھی بہت پسند آیا۔ میری اس وقت عمر ہی کیا تھی جو میری رائے کی کوئی اہمیت ہوتی مگر جب میں نے ان کا یہ مضمون پڑھا تو نہ معلوم میرے دماغ میں یہ کیوں بیٹھ گیا کہ شوکت صاحب ایک بڑے ادیب ہیں اور میں اپنے آپ ہی ان سے بے انتہا متاثر ہو چکی تھی۔

یہ بتائیں کیا شوکت صاحب آپ سے ڈرنے تھے؟ مابدولت میں بھی اس امر کا سراغ ملتا ہے اور ان کے دوسرے مضامین بھی اسی امر کی چغلی کھاتے ہیں؟

طفیل بھائی! میرے خیال میں مابدولت میں کسی جگہ بھی یہ تاثر پیدا نہیں ہوا کہ وہ مجھ سے ڈرتے تھے۔ آپ پھر سے غور سے

پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ان واقعات میں ڈر اور خوف کا تو کوئی شائبہ تک نہیں تھا بلکہ محض ایک جھجک تھی اور وہ بھی اس لیے کہ وہ کسی قیمت پر میری دل آزاری نہیں چاہتے تھے اس لیے اکثر وہ باتیں جو ان کے خیال میں میری دلآزاری کا سبب بن سکتی تھیں وہ مجھ سے چھپائے جاتے تھے اور جو آپ نے ان کے بعض مضامین کی طرف اشارہ کیا ہے تو اس کو بھی صرف مضمون نویسی ہی سمجھئے، سنجیدہ زندگی میں ان واقعات کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان کا مقصد صرف ہنسانا تھا، کبھی مجھے چھیڑ دیا، کبھی آپ کو گدگدا دیا اور کبھی خود رو دیئے اور لوگ ہنس پڑے۔

ہاں ہنسنا ہنسانا تو ان کی زندگی کا معمول ہی تھا۔ مگر میں یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ شوکت صاحب آپ سے ڈرتے نہ تھے۔ مابدولت میں صاف لفظوں میں سب کچھ لکھا ہوا ہے۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ اس کرۂ ارض میں نوّے فیصد شوہر ایسے ہی تو ہیں جو اپنی بیویوں سے ڈرتے ہیں۔ چلئے اس قصے کو چھوڑیے کہ وہ آپ سے ڈرتے تھے کہ نہیں۔ مگر یہ بتا دیجئے آپ کی ازدواجی زندگی کیسی کٹی؟ کیا تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے یا نبھائے چلے جانے کا سا انداز تھا؟

ہماری ازدواجی زندگی بڑی پُرسکون تھی اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بے تحاشہ محبت کرتے تھے اور کسی قیمت پر بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ دونوں میں سے کسی کے بھی جذبات مجروح ہوں اور جہاں یہ جذبہ ہو وہاں ناخوشگواری کا سوال ہی کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی اگر میں یہ کہوں کہ ہماری زندگی ہمیشہ خوشگوار رہی تو یہ بھی مبالغہ آرائی ہوگی۔ برتن پاس ہوتے ہیں تو کھڑک ہی جاتے ہیں بس احتیاط یہ ہے کہ ٹوٹیں نہیں۔

ہاں صاحب برتن ضرور کھڑکتے ہیں۔ ویسے بھی زندگی میں لطف پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کبھی کبھی برتنوں کو کھڑکا ہی دیا جائے۔ یکسانیت ہی یکسانیت سے، خواہ وہ خلوص اور پیار ہی پر مبنی کیوں نہ ہو۔ اس سے آدمی بور ہو جاتا ہے۔ میرے ایک دوست کہا کرتے ہیں کہ صرف پیار ہی پیار، وہ بھی ایک لمبے عرصے کے لیے، کیا بد مذاقی ہے —— ویسے میں نے یہ تو محسوس کیا اور دیکھا کہ شوکت صاحب کو اپنے بچوں اور رشتہ داروں سے بڑی محبت تھی۔

شوکت صاحب کو اپنے تینوں لڑکوں سے بے انتہا پیار تھا اور ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ بچوں کی ہر خواہش کو پورا کریں اور اسی بات پر میری ان سے جھڑپ بھی ہو جاتی تھی کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس طرح بچوں کی ہر ضد پوری کرنے سے بچے خراب ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس معاملے میں شوکت صاحب میری ایک نہ سنتے اور بچوں کی ہر جائز و ناجائز ضد کو پورا کرتے رہتے۔ خود ان کے ساتھ بچہ بن کر کھیلتے مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے اپنے تینوں لڑکوں میں سے کسی کو مارا بھی ہو اگر کبھی کسی بات پر ڈانٹ بھی دیا تو خود ہی تھوڑی دیر میں گلے لگا کر چمکار بھی لیا رات کو جب تک کوئی بچہ ان کی بغل میں نہ لیٹے ان کو نیند نہیں آتی تھی اسی وجہ سے بچے بھی مجھ سے زیادہ ان سے مانوس تھے۔ شوکت صاحب کا اپنے رشتہ داروں سے سلوک بہت مشفقانہ تھا اور وہ اسی وجہ سے تمام رشتہ داروں میں ہر دلعزیز تھے۔

ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے کہ شوکت صاحب ہر دلعزیز رہے۔ دوست احباب کے دلوں میں بھی ان کے لیے ہمیشہ ہی جگہ رہی۔ مگر شوکت صاحب اپنے دوستوں سے ایسے ایسے بھی مذاق کر لیا کرتے تھے جو حد درجہ خطرناک ہوا کرتے۔ گھر میں ان کا کیا عالم تھا؟

جی ہاں! جب ان کا مذاق کا موڈ ہوتا تھا تو وہ گھر میں بھی کسی کو نہیں چھوڑتے تھے چاہے والدہ ہوں چاہے بہن، مجھ سے،

بچوں سے اور حد یہ کہ نوکر چاکر سے بھی مذاق کرنے سے نہیں چوکتے تھے اور وہ اس وقت ایک شریر لڑکے کی طرح ہر ایک کو چھیڑتے پھرتے تھے —— میں نماز پڑھ رہی ہوں تو میرے گلے میں ہینڈ بیگ لٹکا دیا۔ اب نہ میں رکوع میں جا سکتی ہوں نہ سجدے میں ایک عجیب مخمصہ میں جان ہے اور وہ ہیں کہ لطف لے رہے ہیں اور ایک ایک کو بلا کر تماشہ دکھا رہے ہیں —— یا کبھی نماز پڑھتے ہوئے مجھے چوکی سے اٹھا کر زمین پر کھڑا کر دیا، کبھی میں سجدے میں ہوتی تو کسی بچے کو میری پیٹھ پر سوار کر دیا اور میں سجدے ہی میں رہ گئی —— اپنی ماں کے کان میں نہ معلوم کیا بات کہہ دی کہ وہ ان کے پیچھے "خبیث، بکمبخت" کہہ کر دوڑیں —— اسی طرح ایک دفعہ پڑوس میں ایک دھوبی کے گھر کوئی تقریب تھی۔ شوکت صاحب کی بڑی بہن نے ان سے کہا کہ "دھوبی کے گھر کے ماش اور چاول کھانے کو جی چاہ رہا ہے" یہ سننا تھا کہ شوکت صاحب چپکے سے اُٹھے اور دھوبی کے گھر جا کر کہہ دیا کہ "ہماری بہن صاحبہ ماش اور چاول مانگ رہی ہیں" اور یہ کہہ کر غائب ہو گئے —— تھوڑی دیر بعد دھوبی ماش اور چاول کا تھال لیے دروازے پر تھا۔ اس تحفہ پر ان کی بہن صاحبہ حیران ہوئیں، تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ یہ سب شرارت شوکت صاحب کی ہے۔ اور وہ گھر سے غائب ہیں۔ کبھی نوکر کو بلایا کہ لاؤ تمہارا شیو بنا دوں اور اس کی مونچھیں، بھویں اور پلکیں تک مونڈھ کر رکھ دیں اور وہ بیچارہ سب سے منہ چھپائے پھر رہا ہے۔ اسی طرح بعض دفعہ کچھ ایسی خطرناک شرارت بھی کر جاتے کہ جس سے سارا گھر پریشان ہو جاتا تھا۔ ۱۹۴۶ء کا ذکر ہے کہ ایک دن پتہ نہیں کیا سوجھی کہ ایک دم اپنے ہاتھ پیر ٹھنڈے کر کے لیٹ گئے۔ آنکھیں اوپر کو چڑھا لیں دانت بھینچ لیے، پکارو تو بولتے نہیں ہلاؤ تو جنبش نہیں، پانی کے چھینٹے دیے تو بھی کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ سارا گھر پریشان ہو گیا کہ یا اللہ یہ ایک دم سے کیا ہو گیا۔ لڑکے تینوں چھوٹے تھے، وہ حیران و پریشان، گھبرائے ہوئے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے، میں گھر میں بالکل تنہا، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ بے حد پریشان ہو کر بڑے لڑکے سعید سے کہا کہ "میاں جاؤ، جلدی دوڑو سامنے کی کوٹھی میں اطلاع کرو کہ تمہارے ابا کی طبیعت بیحد خراب ہے فوراً کسی ڈاکٹر کو فون کر کے بلا دیں۔" ابھی سعید جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ ایک زوردار قہقہہ لگا کر اُٹھ بیٹھے۔ اب ہم لوگ ہیں کہ ان کا منہ تک رہے ہیں اور وہ ہیں کہ ہنسے جا رہے ہیں، یہ ان کی اتنی خطرناک شرارت تھی کہ اگر ذرا دیر اور قائم رہتی تو میں اپنے حواس کھو بیٹھتی۔

جی ہاں، خود تفریح کا موڈ ہوتا تو دوسروں کی پریشانیوں کا مطلق خیال نہیں رکھتے تھے۔ میرے سامنے بھی ایسے بہت سے واقعات ہیں مگر میں آپ سے وہ کیا کہوں۔ جبکہ آپ کی معلومات مجھ سے کچھ زیادہ ہی ہوں گی۔ یہ تو خیر شوکت صاحب کا سلوک، اپنے دوستوں اور اپنے ملنے والوں کے ساتھ تھا۔ خود آپ کی شوکت صاحب کے دوستوں کے بارے میں کیا رائے تھی۔ یہ میں نے اس لیے پوچھا ہے کہ بعض تو اُن میں سے ایسے تھے جو ہر وقت کے "رمیٹے" (رمی کھیلنے والے) تھے۔ بعض ایسے تھے کہ صرف ہاہا ہُو ہُو اور سبحان اللہ، جزاک اللہ کرنے والے تھے۔

طفیل بھائی! شوکت صاحب کے دوستوں کی فہرست بہت لمبی چوڑی ہے اور میں ان ہی لوگوں کو جانتی ہوں جن کا کہ میرے گھر آنا جانا تھا لیکن سچ پوچھئے اور کسی کو بُرا نہ لگے تو ان دوستوں میں سے کوئی بھی ایسا نظر نہیں آیا جو کہ دوستی کے معیار پر پُورا اُترے وہ سب شوکت صاحب کی تفریحات کے ساتھی تھے جیسا کہ ابھی آپ نے کہا کہ بعض تو ان میں سے ایسے تھے

جو ہر وقت کے "رسیے" تھے۔ بعض صرف مشاعرے کے ساتھی تھے اور بعض محض یونہی خوش گپیوں کے لیے مل بیٹھتے تھے پھر بھلا میری ان کے متعلق کیا رائے ہو سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی چند ایک شخصیتیں ایسی ضرور ہیں کہ جن کو شوکت صاحب کا پُر خلوص دوست کہا جا سکتا ہے کم سے کم میں تو ایسا ہی سمجھتی ہوں اب پتہ نہیں شوکت صاحب کی خود کیا رائے تھی۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ ہر آدمی کے اچھے بُرے سبھی قسم کے دوست ہوتے ہیں، مخلص بھی، "وقتیے" بھی اور جھانسہ دینے والے بھی، یہ بات صرف شوکت صاحب کے ساتھ ہی نہ تھی۔ ساری دنیا کو اسی ماحول میں اپنی زندگی گزارنی پڑتی ہے — یہاں پر ایک اور بڑا بے ڈھب سا سوال ذہن میں آیا ہے۔ اگر آپ اس پر روشنی ڈال سکیں تو بڑا اچھا ہو۔ وہ سوال یہ ہے کہ مرحوم کو شیخی بگھارنے کا بڑا ہوکا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ غلط سلط، جھوٹی سچی باتیں کر کے بھی، اپنی فوقیت اپنے ہم چشموں پر جتلاتے رہیں۔

طفیل بھائی! آپ مجھ سے یہ سوال نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ میں اپنے جواب سے آپ کو مطمئن نہ کر سکوں۔ بات یہ ہے کہ مجھے تو آپ کے اس سوال کی بنیاد ہی پر اعتراض ہے۔ اللہ تعالےٰ نے شوکت صاحب کو ہر لحاظ سے اس قدر نوازا تھا کہ اب انھیں شیخی بگھارنے کی بھلا کیا ضرورت تھی بہرحال پھر بھی ہو سکتا ہے انھوں نے اپنی باہر کی محفلوں میں تفریحاً کچھ ایسی باتیں کی ہوں کہ جن سے آپ نے یہ اندازہ لگایا۔ لیکن میں ان باتوں سے بالکل اجنبی ہوں۔

ہاں صاحب، بیویوں کے اتنے حوصلے کہاں کہ وہ کسی سے اپنے شوہر کی بُرائی سُن سکیں۔ ویسے چاہے خود ہزار بُرائیاں نکالتی رہیں مگر وہ کسی دوسرے کی بات نہیں سُن سکتیں۔ آپ شوکت صاحب کی اتنی تعریفیں کر رہی ہیں۔ وہ سب ٹھیک ہے۔ مگر خود شوکت صاحب کا ایک خط ایسا چھپا ہے، جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ میرا ایک عورت سے غیر شرعی تعلق بھی رہا ہے۔ آخر وہ عورت کون تھی؟

جی ہاں! وہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں ایک ڈرامہ آرٹسٹ تھی وہیں شوکت صاحب کی اس سے ملاقات ہوئی اور مراسم پیدا ہو گئے مجھے جس وقت اطلاع ہوئی تو شوکت صاحب اپنی اس لغزش پر بیحد پشیمان تھے اور اس سے بے تعلقی کا عہد کر چکے تھے۔ میرے خیال میں اس بات کو یہیں پر ختم کر دیجیے گندی باتوں کو کریدنے میں کچھ مزا نہیں آتا۔

واقعی بُری باتوں کو کُریدنا ہے تو بُرا، مگر بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر اُن پر سرے سے غور ہی نہ کیا جائے تو اس کے نتائج چپ رہنے سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ مجھے اس نمبر کی ترتیب کے سلسلے میں یہ دقت پیش آئی ہے کہ بیشتر مضمون نگاروں نے اس بات کا ذکر کیا چونکہ ذکر مناسب الفاظ میں نہ تھا۔ اس لیے میں نے ان باتوں کو حذف کر دیا۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ اس بات کا کچھ تو سرا ملے — اچھا بھابی یہ ذکر چونکہ تکلیف دہ ہے اس لیے ہم کیوں نہ مرحوم کی خوبیوں کا ذکر جی بھر کے کریں۔

آپ نے ایک مختصر سا سوال کیا لیکن میرے جواب کے لیے ایک مضمون پیدا کر دیا ہے۔ شوہر جیسا کچھ بھی ہو لیکن ہر بیوی کو اپنا شوہر خوبیوں کا ایک مجسمہ ہی نظر آتا ہے۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے کس کس پہلو کی خوبیاں اجاگر کروں کچھ خوبیاں تو ان کی ایسی ہیں کہ جن پر آپ بھی اتفاق کریں گے مثلاً ان کی نفاست پسندی ہر پہلو میں نمایاں تھی، لباس بھی نفاست سے پہنتے اور اس پر بلا کے جامہ زیب تھے کیا مجال جو کسی کپڑے پر کوئی داغ، دھبہ یا شکن پڑ جائے۔ کھانے کے سلسلے میں یہی حال تھا، اچھا کھانے کے شوقین تھے اور اس سے بڑھ کر کھانے کا سلیقہ تھا اسی طرح ان کی تحریر میں بھی آپ یہی دیکھیں گے۔ الفاظ کے مناسب چناؤ کے ساتھ ساتھ خط نہایت نفیس تھا اور ان کی تحریر میں آپ کہیں کاٹ چھانٹ نہیں دیکھیں گے —

خود اعتمادی کا یہ حال تھا کہ ایک بار لکھ کر اپنی تحریر کو کبھی دوبارہ نہیں پڑھا جیسے کہ ان کو یقین ہوتا تھا کہ ان کے قلم سے نکلا ہوا کوئی لفظ کبھی غلط نہیں ہو سکتا — دھن کے پکے تھے اور یہ ان کی مستقل مزاجی ہی تھی جس کی بدولت وہ محمد عمر سے شوکت تھانوی بنے "مابدولت" میں ایک جگہ انھوں نے خود ذکر کیا ہے کہ میں نے جو پہلی غزل اپنے نام سے سب کو سنائی وہ چرائی تھی۔ جب اس بات کا بھانڈا پھوٹا تو اس خفت کو مٹانے کی خاطر خود کچھ کہنے کی کوشش کی، کئی بار ناکامی ہوئی لیکن ہمت نہ ہاری اور بعد ازیں ان کا شمار چوٹی کے شاعروں میں ہونے لگا، پھر جب مزاح نگاری کی طرف رُخ کیا تو بڑے بڑے مزاح نگار ان کا لوہا مان گئے۔ ریڈیو میں ملازم ہوئے تو "قاضی جی" جیسا ایک زندہ و جاوید کردار ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے، جب صحافت کے میدان میں قدم رکھا تو ایک نیا رنگ پیدا کیا — خودداری کا یہ عالم تھا کہ اس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے سے نہ چوکتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ سنہ ۱۹۴۲ء میں جب شوکت صاحب پنچولی آرٹ پکچرس میں ملازم تھے تو ایک زیر تکمیل فلم کی کہانی میں پنچولی آرٹ کے جنرل منیجر دیوان سرداری لال نے شوکت صاحب کی غیر موجودگی میں ان کی لکھی ہوئی کہانی میں کچھ ردّ و بدل کر دیا۔ کسی کے مشورے پر اپنے قلم سے تو وہ ردّ و بدل کر سکتے تھے لیکن بھلا یہ کیونکر برداشت کرتے کہ ان کی غیر موجودگی میں کوئی اور ان کی تحریر میں تبدیل کر دے — نتیجہ یہ کہ فوراً استعفےٰ دے دیا اور کہانی ساتھ لے کر گھر پہنچ گئے۔ اس وقت مالی طور سے حالات بہتر نہیں تھے لیکن وہ اپنی خودداری کو کسی قیمت پر بھی بیچ نہیں سکتے تھے — آخر کار دیوان سرداری لال نے ان سے معافی مانگی تب کہیں جا کر انھوں نے اپنا استعفیٰ واپس لیا۔ مہمان نوازی کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی دشمن بھی کبھی مہمان بن کر آ جائے تو وہ اس کے آگے بچھے جاتے اس کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے یہ تو دشمن کے ساتھ سلوک تھا اور اگر کبھی خوبیٔ قسمت سے کوئی دوست مہمان بن کر آ جائے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انھیں کوئی خزانہ مل گیا ہو، مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے تھے۔ مالی حالت جیسی بھی ہو لیکن خاطر مدارت میں کمی نہ ہونے پاتی چاہے اس کی خاطر جو کچھ بھی کرنا پڑے۔ مجھے یاد ہے جب شوکت صاحب لکھنؤ میں اسسٹنٹ پبلسٹی آرگنائزر کی حیثیت سے تعینات تھے تو ان کے ایک دوست کا آل انڈیا ریڈیو دہلی سے لکھنؤ تبادلہ ہو گیا۔ شوکت صاحب تو اس تلاش ہی میں رہتے تھے کہ کوئی دوست آئے اور وہ اس کی مہمان نوازی کریں بس اب کیا تھا ان کو پا کر اپنی حسرتیں پوری کرنا شروع کر دیں۔ خیال یہ تھا کہ جب تک انھیں کوئی مکان نہیں ملتا وہ ہمارے ہی گھر رہیں گے۔ لیکن شوکت صاحب کی پُرخلوص شخصیت نے ان کو اپنے جال میں ایسا جکڑا کہ پھر وہ اپنے لیے مکان نہ ڈھونڈ سکے اور جب تک وہ محکمہ قائم رہا اور ہم لوگ اس سرکاری کوٹھی میں رہے وہ ہمارے ہی ساتھ رہے اور اس طرح جیسے کہ وہ مہمان نہ ہوں بلکہ ہم لوگ ان کے مہمان ہوں اور مزے کی بات یہ کہ جب وہ محکمہ ٹوٹا اور وہ سرکاری کوٹھی خالی کرنا پڑی تو شوکت صاحب کو اس بات کی فکر نہیں تھی کہ ہم لوگوں کے لیے دوسرے مکان کا کیا بندوبست ہوگا فکر تھی تو یہ کہ ان کے ان دوست کے رہنے کا اب کہاں انتظام ہوگا۔ حاضر جوابی کا یہ حال تھا کہ جس محفل میں پہنچ گئے سب کو لاجواب کر دیا۔ ایک دفعہ میرے چھوٹے لڑکے رشید کے حلق میں کچھ تکلیف تھی ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ غدود بڑھ گئے ہیں اس لیے آپریشن کرا دینا چاہیے۔ شوکت صاحب آپریشن سے بہت گھبراتے تھے سوچا کہ لاؤ یونانی علاج کرا کے دیکھیں لہٰذا رشید کو لے کر حکیم نیّر واسطی صاحب کے پاس مشورہ کرنے کے لیے گئے۔ حکیم صاحب نے بہت ہی توجہ سے رشید کو دیکھا اور ایک ایلوپیتھک نسخہ تجویز کر دیا جس میں آپریشن کا ہونا

لازمی تھا۔ حکیم صاحب ایلوپیتھک اور یونانی علاج دونوں کرتے ہیں۔ شوکت صاحب کو غالباً اس وقت اس بات کا علم نہیں تھا۔ یہ نسخہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ حکیم صاحب نے مسکرا کر کہا "شوکت صاحب! آپ حیران نہ ہوں یہ نسخہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر تجویز کیا ہے۔ شاید آپ کو یہ معلوم نہیں کہ میں آدھا تیتر آدھا بٹیر ہوں" شوکت صاحب نے بڑی معصومیت سے برجستہ جواب دیا "تو قبلہ پہلے بٹیر سے بسم اللہ کی ہوتی۔" یہ سننا تھا کہ حکیم صاحب ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے اور اسی وقت نسخہ پھاڑ کے یونانی علاج شروع کر دیا۔ اور صاحب سو خوبیوں کی ایک خوبی ان کی "مابدولت" ہے اپنی خامیوں کا اس بھولے پن سے ذکر کرتے چلے گئے ہیں کہ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ اپنی غلطیوں کا اس طرح اعتراف کر لینا کردار کی بہت بڑی خوبی ہے۔

بھابی مزا آ گیا۔ آپ نے اس ضمن میں بڑی تفصیلی باتیں کیں۔ کیا آپ اس روانی کے ساتھ ان کی کچھ کوتاہیوں کے بارے میں بھی مجھے بتائیں گی یا صرف ان کی تعریف ہی کرتی چلی جائیں گی؟

جی ہاں! ہر انسان میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ کچھ خامیاں بھی ہوتی ہیں اور بھلا کون سا انسان ایسا ہے جو برائیوں سے بالکل مبرا ہو قدرت کا کچھ اصول ہی ایسا ہے کہ ہر بڑے سے بڑے انسان میں کوئی نہ کوئی خوبی ہوتی ہے اور ہر اچھے سے اچھے انسان میں کوئی نہ کوئی برائی ضرور پائی جاتی ہے اور جب کہ شوکت صاحب اپنی برائیاں خود اپنے قلم سے "مابدولت" میں بیان کرنے سے نہیں جھجکتے تو مجھے کیا تکلف ہو سکتا ہے۔ شوکت صاحب کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ جہاں وہ ہر ایک سے ہر طرح کا مذاق کر لیتے تھے وہاں وہ اپنے لیے کسی اور کا مذاق برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ شوکت صاحب اس قدر ہنس مکھ واقع ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کی جنونی کیفیت بھی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، ذرا سی بات ناگوار گزری اور تمام گھر کو سر پر اٹھا لیا اور اس غصہ میں وہ اکثر اپنا بڑے سے بڑا نقصان بھی کر لیا کرتے تھے۔ ماں باپ کے بےحد لاڈلے تھے اور بڑے ناز و نعم سے پرورش پائی تھی اور چونکہ وہ بچپن میں اکثر بیمار رہتے تھے اس لیے ان کی ہر جائز و ناجائز ضد پوری کی جاتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی ہر ضد منوانا ان کی عادت بن گئی اور بچپن کی خوشامد پسندی کے جیسے کہ وہ عادی سے ہو کر رہ گئے تھے اور بڑے ہو کر بھی ان کی طبیعت میں شامل رہی اور جہاں ان کو یہ چیز نہیں ملتی تھی تو یہ ان کی طبیعت پر ناگوار گزرتا تھا۔ ان کی ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ جو کام بھی وہ کریں اس کو سب سراہیں اور کسی قسم کا اعتراض نہ کریں۔ اسی طرح ایک دفعہ وہ ایک بہت ہی خوبصورت چائے کا سٹ خرید کر لائے جو مجھے اور میری مرحومہ بہن رابعہ کو بہت پسند آیا۔ ہم دونوں کی تعریف سے بہت خوش ہوئے لیکن جب انھوں نے اس کی قیمت بتائی تو میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا کہ جتنا اچھا سٹ ہے اتنی اچھی قیمت بھی تو ہے۔" یہ سننا تھا کہ ہنستا ہوا چہرہ ایک دم سے آگ برسانے لگا اور اس سیٹ کو فٹ بال کی طرح اوپر اچھال دیا اور وہ چکنا چور ہو گیا اس حسین سیٹ کے ٹوٹنے کا مجھے اب بھی افسوس ہے۔

ہاں صاحب، ان کے غصے سے تو مجھے بھی ڈر لگتا تھا۔ مگر میں نے اس کا ایک علاج ڈھونڈھ رکھا تھا کہ جب مرحوم غصے میں ہوتے تھے تو میں ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیا کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ خود ہی شور و در مچا کے چپ ہو جایا کرتے تھے۔ دوبارہ ملتے تھے تو پچھلی رنجش کا ذکر تک نہ کرتے تھے۔ انہی باتوں سے تو میرا خیال بھی ہے کہ مرحوم بڑی دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کا ان کا بڑا لمبا ساتھ رہا۔ آج دو چار باتیں اس نوع کی بھی سنا دیں۔

طفیل بھائی! شوکت صاحب کی تمام زندگی دلچسپیوں سے بھری ہوئی ہے اس سے پہلے بھی میں نے جو باتیں بیان کیں۔ ان میں بھی بعض شوکت صاحب کے دلچسپ واقعات ہیں بہرحال پھر بھی اس سوال کے ضمن میں ایک واقعہ اور سن لیجیے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب شوکت صاحب آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں ملازم ہوئے تھے ہم لوگوں کا گھر سرپنچ اخبار کے دفتر کے بالکل سامنے تھا وہیں سرپنچ اخبار کے دفتر میں ایک ہندو رہتا تھا، نام ٹھیک سے مجھے یاد نہیں۔ پتہ نہیں انھیں کیا سوجھی کہ اس بیچارے کو پہلے تو اس خوش فہمی میں مبتلا کیا کہ تم بہت خوبصورت ہو، بہت حسین ہو، لڑکیاں تم پر جان دیتی ہیں اور پھر اس غلط فہمی میں ڈال دیا کہ میرے گھر پر ایک شمیم نامی لڑکی ہے جو میری بیوی کی سہیلی ہے اور تمھاری ایک جھلک دیکھ کر تم پر سو جان سے فدا ہو چکی ہے اور یہاں سے اب شوکت صاحب کا ڈرامہ شروع ہوا کبھی فرضی لڑکی کے نام سے پرچے لکھے جا رہے ہیں، کبھی اندھیرے میں برآمدے میں پڑی ہوئی چک کے پیچھے سے دوپٹہ نکال کر باہر لٹکایا جا رہا ہے جب اس بیچارے کو اچھی طرح مجنوں بنا لیا تو یہ بھانڈا پھوٹا کہ یہ فرضی لڑکی شمیم اور یہ اس کے خطوط یہ سب شوکت صاحب ہی کی کارستانی ہے۔ اس واقعہ سے وہ بیچارا اس قدر شرمندہ ہوا کہ منہ چھپا کر ایسا بھاگا کہ پھر نظر نہیں آیا اور یہی واقعہ پھر شوکت صاحب کی کتاب "خانم خان" کا پلاٹ بن گیا۔

اچھی بھلی باتیں ہو رہی تھیں کہ بھابی اپنے خیالوں میں دُور نکل گئیں۔ اس کے بعد میں نے بڑی کوشش کی کہ یہ مجھ سے کچھ باتیں اور بھی کریں مگر میں اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہوا۔ ایک چُپ سی لگ گئی۔

"بھابی! — میں آپ سے باتیں کرنے آیا ہوں۔"

"میں اس وقت آپ کی کسی بات کا جواب نہ دے سکوں گی۔"

بھابی سعیدہ بھی میرے سامنے ایسے ہی خاموش ہو گئیں، جیسے شوکت تھانوی، بس فرق اتنا تھا کہ ایک میرے سامنے بیٹھی تھیں اور دوسرے کو اپنے کندھوں پہ اٹھا کر دفن کر آیا تھا۔

---

(۲)

ابھی بھابی زہرا کی شادی نہیں ہوئی کہ دو خواتین ہمارے دفتر تشریف لائیں اور انھوں نے شوکت تھانوی کی خود نوشت سوانح "مابدولت" طلب کی۔

اتفاق کی بات کہ اُس وقت شوکت صاحب کے منجھلے صاحبزادے خورشید عمر بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا "مابدولت پڑھ کر کیا کیجیے گا؟"

"دیکھنا چاہیے کہ ادیب کیسے ہوتے ہیں!"

"ارے صاحب یہ لوگ ایسے نہیں ہوتے۔ جیسے تحریروں میں نظر آتے ہیں۔"

یہ گفتگو سنی تو میں نے ٹوکا ـــ "خورشید ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔"

بعد میں معلوم ہوا کہ اُن خواتین میں ایک زہرا تھیں۔ جو بعد میں زہرا شوکت ہوئیں۔ میں نے اس کی تصدیق آج تک نہیں کی۔ ضرورت ہی کیا تھی۔ مگر اس واقعہ کے کوئی دس پندرہ دن بعد، شوکت صاحب نے مجھ سے پوچھا تھا ـــ "آپ کے ہاں خورشید کی اُن خواتین سے کیا کیا باتیں ہوئی تھیں؟"

شوکت صاحب جھنجلائے ہوئے تھے۔ اس لیے میں نے بات ہنسی مذاق میں ٹال دی۔

جب پہلی بار میری زہرا شوکت سے ملاقات ہوئی تو یہ بڑی اچھی تھیں۔ خوبصورت سی، سفید سا رنگ، ہنستا ہوا چہرہ، بڑا متناسب جسم ـــ مگر اب بھابی ویسی نہیں رہیں۔ شوکت صاحب کی زندگی میں بھی ویسی نہ رہیں۔ پہلے "پنجاب دی کڑی" لگتی تھیں اب یو۔ پی کے کسی گھرانے کی خاتون دکھتی ہیں۔ دُبلی پتلی، ہلکا سانولا رنگ، پان زدہ دانت! ـــ انھوں نے بھی اپنے آپ کو خوب ڈھالا۔ شوکت صاحب پنجابی نہ بنے، مگر یہ لکھنوی بن گئیں۔

شوکت صاحب کے انتقال نے انھیں بجھا دیا ہے۔ دہلا دیا ہے۔ اب یہ مستقبل کے اندھیروں میں اکیلی نہیں۔ تین معصوم بچیوں کا ساتھ بھی ہے۔

زندگی کی ایسی اندھیری رات میں، جب کہ بظاہر، زندگی کا آدھا سفر ہی طے ہوا ہو۔ کیا کیا نہ وسوسے آن گھیرتے ہوں گے۔ مگر ان کی زندگی کا سہارا یہی تتلیاں تو ہیں۔ جو اُڑتی پھرتی، دل کی تسکین کا بہانہ ہیں۔ دل کی جراحتوں کا مداوا ہیں۔ بچوں کی یتیمی کا احساس انھیں خون کے آنسو رُلاتا ہوگا۔ مگر بچیوں کے خوشگوار مستقبل کے خواب میں جگنو کی روشنی بھی ڈھارس بندھاتی ہوگی۔

شوہر کے بعد بیوی کی زندگی امید و بیم کے جن وسوسوں سے دوچار ہوتی ہے۔ اس کی تفسیر زہرا شوکت ہیں۔ حال تکلیف دہ، مستقبل مشکوک!

جس نے زندگی بھر ہنسایا ہو، اس کا تذکرہ منہ بسور کے لکھنا کچھ اچھا معلوم نہیں ہو رہا۔ مگر کیا کریں۔ کس طرح ہنس کے دکھوں کو ٹال دیں؟"

کوشش کرتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے، ذہن کو جھٹک کر زہرا شوکت سے باتیں کروں۔ بے شک آپ بھی سُن لیں، پڑھ لیا ہے۔

"بھابی! شوکت صاحب بڑے کٹّر قسم کے یو۔ پی والے تھے، پھر انھوں نے آپ سے شادی کیوں کی، جبکہ آپ کا تعلق ایک پنجابی گھرانے سے ہے؟"

"طفیل صاحب! میں نے شادی کے بعد، شوکت صاحب کو کٹّر قسم کا یو۔ پی والا نہیں پایا۔ دوسرے آج کل تو ایسی بہت سی شادیاں ہو رہی ہیں۔ پنجابی گھرانوں میں یو۔ پی کی بہو بیٹیاں آ رہی ہیں اور پنجاب کی بہو بیٹیاں یو۔ پی والوں کے ہاں بیاہی جا رہی ہیں۔"

"چلئے میری غلط فہمی دُور ہوئی۔ واقعی اب ہمیں علاقائی بنیادوں پر سوچنا نہیں چاہیے۔ اب ہم سب پاکستانی ہیں۔ سب ایک ہیں ـــ شادی کے وقت آپ کی اور شوکت صاحب کی عمر کیا تھی؟"

”جو بعض شریف گھرانوں کی میاں اور بیویوں کی ہوا کرتی ہیں۔“

بھابی! آپ نے تو بڑے خوبصورت انداز میں ٹال دیا۔ عمر بتا دینے میں حرج تو کچھ نہ تھا۔ آپ بے شک اپنی عمر دو چار سال کم بتا دیں۔ مگر کچھ بتائیں تو!“

”میں اُن عورتوں میں نہیں ہوں، جو اپنے آپ کو لڑکپن کے فریب میں مبتلا رکھنے کے خواب دیکھتی ہوں۔“

چلیے آپ کی منطق کی روشنی میں عمر والی بات گول ہوئی۔ میں خود ہی اندازہ کر لوں گا کہ شادی کے وقت آپ کی عمر اکیس بائیس سال ہوگی اور شوکت صاحب کی عمر اکتالیس بیالیس سال ہوگی (حالانکہ حساب کے مطابق اس وقت شوکت صاحب کی عمر ۴۴ سال تھی)۔ اگر عمر کی طرح یہ معاملہ بھی راز کا نہ ہو تو اتنا ہی بتا دیجئے کہ شادی کے وقت، جو شرائط طے ہوئی تھیں۔ وہ کیا تھیں؟

”طفیل صاحب معلوم ہوتا ہے کہ آج جو آپ کھُرچ کھُرچ کے مجھ سے باتیں پوچھ رہے ہیں تو وہ ضرور چھاپنے کے لیے پوچھ رہے ہیں۔“

بھابی! ویسے تو میں یہ باتیں اپنی معلومات کے لیے پوچھ رہا ہوں۔ اگر چھپ جائیں تو حرج بھی کیا ہے۔ اس لیے کہ شوکت صاحب کے بارے میں جتنا کچھ آپ جانتی ہیں اتنا ہر ایک تو نہیں جانتا۔ لہذا جو میں پوچھوں، وہ بتاتی چلی جائیں۔ اس لیے کہ ادیب قوم کی امانت ہوتے ہیں۔ ان کی باتیں قوم کی امانت ہوتی ہیں۔ انھیں عام لوگوں کی طرح خاندان کی ملکیت نہیں سمجھنا چاہیے۔“

”یہ بات تو ٹھیک ہے۔ اسی خیال سے اپنی ذاتی مگر راز میں رکھنے والی بات بتائے دیتی ہوں۔ شادی کے وقت شوکت صاحب نے بہ طور شرائط ہمیں جو کچھ لکھ کے دیا تھا۔ وہ یہ ہے:-

(۱) میرا نام محمد عمر ہے۔ لوگ مجھے شوکت تھانوی کے نام سے جانتے ہیں۔

(۲) میرے والد مرحوم کا نام صدیق احمد صاحب تھا۔ جو یو۔ پی پولیس میں انسپکٹر اور بھوپال میں انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔

(۳) میں شیخ فاروقی ہوں۔ حنفی ہوں۔ میری عمر ۳۵ سال ہے۔

(۴) تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کا رہنے والا ہوں۔

(۵) میری تعلیم انٹرمیڈیٹ تک ہوئی اور بعد میں انٹرمیڈیٹ کا ممتحن بھی رہ چکا ہوں۔

(۶) میری تنخواہ اس وقت ساڑھے چار سو روپے ماہوار ہے۔

(۷) میرا خاص مشغلہ کتابوں کی تصنیف ہے۔ جس سے اوسطاً دو سو روپے ماہوار آمدنی ہے۔ اس وقت تک پینتالیس کتابوں کا مصنف ہو چکا ہوں۔

(۸) میں اب تک چھ روزانہ اخباروں کا اور چار ماہناموں کا ایڈیٹر رہ چکا ہوں۔

(۹) . . . .

(۱۰) مجھے اس عقد کے سلسلے میں تمام شرائط منظور ہوں گی اور میں مہر وغیرہ کے لیے ہر قسم کی لکھا پڑھی کیلئے تیار ہوں۔

(۱۱) رہائش کا انتظام الگ کروں گا۔ میری زوجہ ثانیہ کو پہلی بیوی سے کوئی تعلق کسی قسم کا نہ ہوگا۔

"بھابی! ان باتوں سے بہت سی نئی باتوں کا علم ہوا۔ اس کے لیے شکر گزار ہوں۔ مگر میں نوویں شرط کا اظہار کسی طرح مناسب نہیں سمجھتا۔ اس لیے کہ اس سے بعض آبگینوں کو ٹھیس لگنے کا احتمال ہے۔ میرا مقصد آپ کے ذریعہ صرف ضروری اور ذاتی تاثرات کی فراہمی ہے۔ کسی کی دل آزاری مقصود نہیں۔"

تب شوکت صاحب نے اپنی شرائط میں ایک یہ بات بھی لکھی ہے تو ذکر اس کا بھی ہونا چاہیے۔ بعض باتوں کے اخفا اور بعض باتوں کی تشہیر سے آپ دیانتداری کا ثبوت نہ دیں گے۔"

"بھابی! میں دیانتدار نہ سہی مگر مفسدہ پردازی کا الزام اپنے سر نہ لوں گا۔ میں تو لواحقینِ شوکت میں رنجش کا باعث بننا نہیں چاہتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے شوکت صاحب کی پہلی بیگم سے، دوسری شادی کے بارے میں پوچھا تک نہیں تاکہ نہ پیمانہ چھلکے، نہ بات بڑھے۔"

"بڑی احتیاطیں ہو رہی ہیں —— اس کے باوجود خدا آپ کا انجام بخیر کرے۔"

"بھابی! انجام بخیر ہی ہوگا انشاء اللہ! لہٰذا ہمیں اِدھر اُدھر کی باتوں میں اپنا وقت خرچ نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ مجھے تو آپ یہ بتائیں کہ۔ آپ لکھنے میں شوکت صاحب کی کچھ مدد کرتی تھیں؟ اور وہ لکھتے وقت کس قسم کا ماحول چاہتے تھے؟"

"شوکت صاحب سلیقہ مند اور سکون پسند انسان تھے۔ لیکن لکھنے میں انھیں کسی کی اعانت پسند نہ تھی۔ البتہ پُرسکون اور خوشگوار ماحول چاہتے تھے۔ بڑے خوبصورت کاغذ پر بہترین قلم سے، بڑا باریک باریک لکھا کرتے تھے۔ اگر کوئی ان کی تحریر دیکھے تو وہ اندازہ لگا سکے گا کہ وہ پوری دلجمعی اور اطمینان کے ساتھ لکھا کرتے تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ بچے شور مچا رہے ہیں اور وہ لکھ رہے ہیں۔ غرض وہ ہر قسم کے حالات میں، اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے لکھنے پر قادر تھے۔"

"شوکت صاحب آپ کو ہر محفل میں لے جاتے تھے۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ آپ کا اصرار ہوتا تھا یا یہ اُن کی خواہش ہوتی تھی؟"

"شوکت صاحب مجھے ہر محفل میں نہیں لے جاتے تھے۔ صرف وہیں لے جاتے تھے جہاں میرا جانا مناسب ہوتا تھا۔ ایک بار ایک کاک ٹیل پارٹی میں غلطی سے چلی گئی تھی۔ وہاں پہنچ کر میری طبیعت خراب ہو گئی۔ اس کے بعد سے ایسی "معززانہ دعوتوں" میں کبھی شریک نہیں ہوئی۔ چونکہ شوکت صاحب کو بھی شراب سے نفرت تھی۔ اس لیے وہ بھی ایسی دعوتوں سے بچا کرتے تھے۔ بہرحال میرا دعوتوں میں شریک ہونا نہ میرے اصرار پر منحصر تھا نہ شوکت صاحب کی خواہش پر، بلکہ یہ منحصر تھا دعوت کی نوعیت پر یا صاحبِ خانہ سے مراسم پر۔"

"شوکت صاحب کے مذہبی خیالات کیا تھے۔ میرا خیال ہے انھوں نے کبھی نماز نہیں پڑھی۔ نہ روزے رکھے۔ مگر اب شوکت صاحب کے دوست کہہ رہے ہیں کہ وہ بڑے مذہبی آدمی تھے۔"

"شوکت صاحب نے نمازیں بھی پڑھیں۔ روزے بھی رکھے۔ وہ واقعی ذہناً مذہبی قسم کے آدمی تھے۔ گو روزے نماز کے معاملے میں پابندی تو نہ کرتے تھے مگر اللہ اور رسول کا نام لیتے ہوئے آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے —— بقول سید محمد جعفری کے ——

"شوکت صاحب کہا کرتے تھے کہ جب میں اپنے خالق کے حضور میں نماز کے بعد دعا مانگتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حرم کعبہ میں کھڑا ہوں۔ کعبہ کا پردہ اٹھا ہے اور اس نے میرے سر پہ سایہ کیا ہے اور اس سے مجھے سکون قلب حاصل ہوتا ہے" —— اس کے علاوہ ایک واقعہ اور بھی ہے کہ جب راولپنڈی میں غلاف کعبہ کی زیارت کرائی گئی تو اُن دنوں شوکت صاحب بڑے بیمار تھے۔ اور وہ اپنی بیماری کی وجہ سے خود سے جا کر غلافِ کعبہ کی زیارت نہیں کر سکتے تھے

اس پر وہ بڑے آزردہ تھے۔ میر خلیل الرحمٰن صاحب کو جب شوکت صاحب کی اس آرزو کا علم ہوا تو انھوں نے شوکت صاحب سے کہا۔ جب غلافِ کعبہ کی زیارت ہو چکے گی تو میں رات کو جا کر غلافِ کعبہ یہاں لے آؤں گا! — جب یوں ہوا اور میر صاحب غلافِ کعبہ گھر پر لے آئے تو اُسے متعدد بار آنکھوں سے لگایا اور چُوما اور اس کا اظہار کیا کہ میں دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوں۔" —

"بھابی مجھے یہ باتیں سُن کر بڑی خوشی ہوئی۔ مگر میرا خیال ایسا نہ تھا اور یہ تغیر بھی ان کی آخری عمر میں آیا۔ اس لیے کہ انھوں نے جب تک جوانی کی حدود کو بڑھاپے کی حدود سے چھو نہ لیا۔ انھوں نے اپنی شوخیوں کو خیر باد نہ کہا۔ شوخیاں مذہب کے معاملے میں بھی روا رکھتے تھے اور زندگی کے باقی معاملات میں بھی، میری اس بات کی تائید شوکت صاحب کی پہلی بیگم کے بیان سے بھی ہوتی ہے کہ جب وہ نماز پڑھا کرتی تھیں تو کبھی شوکت صاحب ان کے گلے میں ہینڈ بیگ لٹکا دیا کرتے تھے اور کبھی انھیں چوکی پر سے اٹھا کر زمین پر کھڑا کر دیا کرتے تھے بہرحال مجھے ان کے موجودہ خیالات سے بےحد خوشی ہوئی۔ جس کا علم مجھے اس سے پہلے نہ تھا۔ چلیے یہ تو بات ہو گئی ان کے مذہبی عقائد کے بارے میں، اس اچھی بات کے ساتھ، ان کی طبیعت میں بے حد غصّہ بھی تھا۔ آپ کے خیال میں کیا وہ بلا وجہ غصّے ہو جایا کرتے تھے یا باوجہ غصّے ہوتے تھے؟"

"یہ وقتی جوش اور عارضی جذبہ ہوا کرتا تھا۔ وہ ایکدم بھڑک کر، ایکدم نرم ہو جایا کرتے تھے اور یہ سب کچھ دنیاوی تفکرات اور دنیاوی اُلجھنوں کی بنا پر ہوا کرتا تھا۔ انسان آخر انسان ہے۔ وہ اچھی باتوں سے خوش ہونا اور بُری باتوں سے کبیدہ خاطر رہتا ہے۔ وہ بھی اس سے متاثر تھے۔ چونکہ بے حد حساس تھے۔ اس لیے برہم بھی ہو جایا کرتے تھے اور جب انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو جایا کرتا تھا تو بے حد نادم ہوا کرتے تھے۔ پھر وہ بلا تفریق مرتبہ اور عمر کے معافی بھی مانگ لیا کرتے تھے۔"

"شوکت صاحب سچ نما جھوٹ بولا کرتے تھے۔ ایسا وہ کیوں کرتے تھے؟"

"آپ کا یہ سوال بڑا چھوٹا سا ہے۔ مگر اس کے جواب کے لیے مجھے سوچنا پڑ گیا ہے۔ اگر آپ کی مراد دروغ مصلحت آمیز سے ہے تو اس کی مرتکب ساری دنیا ہے۔ آپ بھی ہوں گے۔ اس میں اکیلے شوکت صاحب کا کیا قصور ہوا۔ وہ یقیناً ایسی باتوں کے سلسلے میں جھوٹ بولتے تھے۔ جن باتوں کے سچ کہنے سے کسی کی دل آزاری ہوتی ہو۔ وہ کسی کے خوف یا اپنے لالچ کے لیے جھوٹ نہیں بولا کرتے تھے۔ بعض اوقات محض تفریحاً بھی جھوٹ بول دیا کرتے تھے۔ تاکہ ذرا لطف رہے — ایک واقعہ بتاتی ہوں — رات کے بارہ بجے ہوں گے کہ ایک دفعہ شدید زلزلہ آیا تھا۔ حد درجہ کھڑکھڑاہٹ کی وجہ سے بڑا بھیانک ماحول تھا۔ شوکت صاحب ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ مجھے گھبرائے ہوئے انداز میں آواز دی اور پوچھا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے کہا زلزلہ ہے۔ کہنے لگے تو پھر اچھا لا الٰہ الا اللہ۔" — زلزلہ آیا تھا۔ چلا گیا۔ مگر شوکت صاحب کی گھنٹوں سانس پھولی رہی۔ حد درجہ پریشان رہے۔ ممکن ہے یہ سوچتے ہوں کہ پھر زلزلہ نہ آ جائے — اتفاق کی بات کہ اُن دنوں میرے دانت میں تکلیف تھی۔ دوسرے دن میں شوکت صاحب کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں گئی۔ وہاں زلزلے والی بوکھلاہٹ کا قصّہ میرے نام سے منسوب کر کے ڈاکٹر صاحب کو سُنا دیا۔ میں دانت کے درد کی وجہ سے منہ دبائے بیٹھی تھی۔ بولنے سے مجبور تھی۔ مگر وہ جھوٹ بول کر بھی لطف لے رہے تھے۔"

"شوکت صاحب میں ایسی کیا انسانی بڑائیاں تھیں۔ جن کی بنا پر وہ اتنے ہر دلعزیز تھے؟"

"اس کا جواب خود آپ کے پاس بھی ہے۔ مگر آپ ہر بات کا جواب مجھ سے چاہتے ہیں۔ یہ اچھی زبردستی ہے۔ شوکت صاحب کی

دلکش شخصیت ہی ان کی ہردلعزیزی کا باعث تھی۔ انھیں روتوں میں بٹھا دیتے تو وہ انھیں ہنسا کے اُٹھتے تھے۔ زندگی سے بیزاری ان کے ہاں گناہ کا درجہ رکھتی تھی۔ اس ضمن میں اگر ان کا مضمون "تعزیت" دیکھ لیا جائے تو شوکت صاحب کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے کہ وہ کس طرح تعزیت ایسے نازک معاملے میں بھی دل لگی اور تفریح کے پہلو ڈھونڈھ لیتے تھے۔ پھر ان کے دماغ کی اپج بھی اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی — راولپنڈی کی بات ہے۔ سید محمد جعفری اور ہم اکٹھے ایک ہی مکان میں رہتے تھے اور ہمارا مکان سڑک کے کنارے تھا۔ گرمیوں کی ایک رات کو، کوئی بارہ ایک بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو دیکھتی کیا ہوں۔ چارپائی خالی ہے۔ میں گھبرا کر اٹھی۔ مکان چھان مارا، شوکت صاحب نہ ملے۔ دروازہ کھول کے دیکھا تو شوکت صاحب اور جعفری صاحب سڑک کے کنارے، زمین پر بیٹھے تھے۔ میں نے پوچھا۔ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ شوکت صاحب نے جواب دیا۔ گھر میں سخت گرمی ہے۔ سڑک پر اس لیے آ کے بیٹھ گئے ہیں کہ آتے جاتے ٹرکوں کی وجہ سے ہوا لگتی رہے۔
ایک اور بات یاد آئی — یہ جو میں نے آپ کو تصویر دکھائی تھی۔ جس میں شوکت صاحب صدر سے ہاتھ ملا رہے ہیں، اُس وقت بھی ایک لطیفہ ہوا تھا۔ صدر نے از رہ پیار کہا — "شوکت تو ہمیں اپنے سفید بالوں سے ڈراتا ہے۔" تو شوکت صاحب نے برجستہ کہا تھا — "جی نہیں، نزلہ گرا ہے" — اس پر صدر بھی ہنس دیئے تھے اور باقی سامعین بھی۔ یہ تھیں وہ ساری باتیں، جس کی وجہ سے وہ ہر ایک کے دل میں گھر کر لیتے تھے۔"

"بھابی! ساری بیویاں اپنے شوہروں کی تعریفیں ہی کرتی ہیں۔ مگر ہر شوہر میں کچھ نہ کچھ ہلکے پن کی بھی باتیں ہوتی ہیں۔ اگر آپ تھوڑی سی بہادر اور تھوڑی سی عام عورتوں سے اونچی ہو کر، اس ضمن میں بھی روشنی ڈالیں تو اچھا ہو۔"

"طفیل صاحب! کمزوریاں ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ مگر شوکت صاحب کی خوبیاں ان کی کمزوریوں پر غالب تھیں۔"

"بھابی! آپ نے یہ جواب دے کر، میرے ہی سوال کو تقویت پہنچا دی۔ جب شوکت صاحب کی خوبیوں کی بات چلی تو آپ نے فرفر چند ایک بڑی اچھی باتیں بتائیں۔ جب کمزوریوں پر کچھ کہنے کے لیے کہا تو یہ کہہ کر گزرنا چاہ رہی ہیں کہ کمزوریوں پر خوبیاں غالب تھیں۔ آخر وہ کمزوریاں کیا تھیں جن پر خوبیاں غالب تھیں۔"

"طفیل صاحب میرا یہ خیال نہ تھا کہ آپ بھی شوکت صاحب کے دشمنوں میں سے نکلیں گے۔ ایسی کرید کرید کے برائیاں تو دشمن ہی نکالا کرتے ہیں۔ میں کوئی ان کی دشمن تھوڑی ہوں کہ ان میں کیڑے ڈالنے بیٹھ جاؤں۔ وہ اچھے تھے۔ ہر طرح اچھے تھے۔"

"میں کہتا ہوں۔ وہ برے تھے۔ ہر طرح برے تھے۔ پھر؟"

"توبہ ہے صاحب! لیجئے اُن کی بُرائیاں مجھ سے سُن کے خوش ہو جایئے۔ ابھی جو میں نے کہا تھا کہ ان کی برائیوں پر خوبیاں غالب تھیں تو وہ بات غلط نہ تھی — شوکت صاحب کو اپنی برتری جتانے میں خاص لُطف ملتا تھا۔ ایک بار ہم کسی کے ہاں دعوت پر گئے۔ بیٹھے بیٹھے کسی نے وقت پوچھا۔ کسی نے کہا نو بجے ہیں۔ شوکت صاحب نے کہا نو بج کے دس منٹ ہوئے ہیں۔ وہ صاحب کہیں میری گھڑی ٹھیک ہے۔ یہ کہیں میری گھڑی ٹھیک ہے۔ یہ تکرار کہ میری گھڑی ٹھیک ہے۔ میری گھڑی ٹھیک ہے منٹوں جاری رہی۔ بالآخر شوکت صاحب نے غصّے میں آ کر کہا۔ اگر میری گھڑی غلط ہوئی تو اسی وقت توڑ دوں گا اور یہ کہتے ہی گھڑی کلائی سے اُتار لی۔ ٹیلیفون کر کے وقت پوچھا گیا تو شوکت صاحب کا ٹائم ٹھیک تھا۔ اگر شوکت صاحب کی گھڑی کا وقت غلط

نکلتا تو وہ اُس وقت سات آٹھ سو کی گھڑی توڑ دیتے ——— کسی زمانے میں شوکت صاحب رمی بہت کھیلتے تھے۔ اس کی وجہ سے ہاتھ بھی تنگ رہتا تھا۔ مگر یہ شوق بھی وہ دوستوں کی خوشنودی کے لیے ہی پورا کیا کرتے تھے۔ مگر صاحب توبہ ہے۔ رمی کیا ہوتی تھی۔ ایک عذاب ہوتا تھا۔ دو دو دن بیٹھے ہیں۔ تین تین دن بیٹھے ہیں۔ زیادہ تر یہ اُن دنوں ہوتا تھا جب جگر صاحب آتے تھے ورنہ کھیلتے تو تھے۔ یوں دنیا کو بھول کر نہ کھیلتے تھے۔ بعد میں مَیں نے طریقوں طریقوں سے یہ عادت بھی چھڑا دی تھی۔ اس کے لیے وہ میرے شکر گزار بھی تھے ——— طفیل صاحب! شوکت صاحب اپنی زندگی کے آخری پانچ برسوں میں، اتنے اچھے ہو گئے تھے کہ حد نہیں۔”

“ویسے جب وہ ہر طرح سے اچھے ہو گئے تھے تو پھر ان کی برائیوں کا ذکر بھی بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ ویسے ان میں ایسی خرابیاں بھی نہ تھیں جن پر بہ طور خاص زور دیا جائے ——— اچھا تو بھابی اب یہ بتائیں کہ اس کی کیا وجہ تھی کہ شوکت صاحب کے تعلقات بڑے لوگوں سے زیادہ تھے اور چھوٹے درجے کے لوگوں سے نہ تھے یا کم تھے۔”

“طفیل صاحب آپ ہیر پھیر کے باتیں تو وہی کرتے ہیں۔ مگر آپ نے اپنے خیال کے مطابق موضوع کو بدل دیا ہے۔ ویسے مجھے تو یہ معلوم ہے کہ وہ گھر کے ملازم اور دفتر کے چپراسی کو بھی اتنا ہی عزیز رکھتے تھے۔ جتنا کہ کسی اور کو، بات یہ ہے کہ وہ چھوٹے لوگوں سے ملتے تھے۔ باتیں کرتے تھے۔ شرارتیں کرتے تھے تو لوگ کہتے تھے۔ تختۂ مشق بناتے ہیں۔ بڑے لوگوں سے ملتے تھے۔ باتیں کرتے تھے۔ شرارتیں کرتے تھے تو لوگ کہتے تھے۔ خوشامد کرتے تھے۔ یہ دنیا عجیب و غریب ہے۔ کیا کیا جائے۔”

“بھابی اس دنیا کے عجیب و غریب ہونے میں تو کوئی شک نہیں۔ اس معاملے میں آپ کا تجزیہ بالکل صحیح ہے۔ دنیا مطمئن کسی طرح بھی نہیں ہو سکتی ——— آپ پھر کہیں گی کہ میں اُلٹے سیدھے ہی سوال کرتا چلا جا رہا ہوں۔ مگر میں کیا کروں۔ بعض باتیں میرے ذہن میں صاف نہیں ہیں۔ اوروں کے ذہن میں بھی صاف نہیں ہیں۔ اس لیے پوچھنی پڑ رہی ہیں۔ مگر آپ یہ سوچے بیٹھی ہیں کہ آپ کو صرف شوکت صاحب کی مدافعت ہی میں کچھ کہنا چاہیے۔ یہ جذبہ غلط ہے۔”

“جی ہاں آپ کا یہ جذبہ بڑا صحیح ہے کہ شوکت صاحب کے بارے میں آپ نے کوئی ایسا سوال نہیں پوچھا جس سے میری بھی خوشی وابستہ ہو۔”

“لیجیے صاحب! حد ہو گئی۔ گویا میں شوکت صاحب کا دشمن ٹھہرا۔ آپ کا یہ خیال ٹھیک ہو گا مگر میں اس کے بارے میں خود سے کیا کہوں۔ بہر حال آپ مجھے شوکت صاحب کا دشمن ٹھہرائیں، لڑیں یا ناخوش ہوں۔ مگر میں چند ایک باتیں ضرور پوچھوں گا۔”

“پوچھیے۔ پوچھیے!”

“یہ بتائیں کہ شوکت صاحب اپنے سے بہتر لکھنے والا کسی کو نہ سمجھتے تھے۔ جبکہ ان سے بھی بڑے لکھنے والے موجود تھے اور ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟”

“شوکت صاحب نے اس قسم کی کوئی بات، میرے سامنے کبھی نہیں کی۔ اس لیے اس کے بارے میں، مَیں کیا بتا سکتی ہوں۔ ویسے وہ حد درجہ مقبول مصنف تھے۔ ان کی کتابیں خوب بکتی تھیں۔ اس لیے اگر انھوں نے ایسا سوچا ہو تو غلط بھی نہ سوچا ہو گا۔ بہر حال انھوں نے میرے سامنے کبھی نہیں کہا کہ میں سب سے بڑا لکھنے والا ہوں۔”

“جس وقت آپ کی شادی ہوئی تھی۔ اس وقت آپ کی صحت بڑی اچھی تھی۔ بعد میں خراب ہو گئی۔ اس کی وجہ کوئی گھریلو پریشانی تھی؟”

“اوّل تو یہ سوال شوکت صاحب کے بارے میں نہیں ہے۔ اگر اسے کسی بھی طریقے سے شوکت صاحب ہی سے متعلق کچھ لیا جائے تو میں

عرض کروں گی کہ میری صحت کی خرابی کا کوئی تعلق گھریلو پریشانی سے نہیں۔ بلکہ بچوں کی پیدائش، گھر پہ شاعروں اور ادیبوں کا رات گئے تک مجمع رہنا، ان کی خاطر مدارات کے سلسلے میں جاگنا، گھر کی ذمہ داریاں، ان سب باتوں نے مل ملا کر میری صحت کا ناس مارا ہے۔ پھر میرے ہاں تین بچیاں ہی ہوئیں۔ مجھے اس کا بھی خیال تھا کہ لڑکا بھی ہوتا اور میری یہ خواہش، زندگی کے اس گھُپ اندھیرے میں اور رُلا رہی ہے۔ مگر شوکت صاحب تھے کہ بے حد خوش تھے۔ انھوں نے بچیوں کو خدا سے منتیں مان مان کے لیا ہے۔ جب شوکیہ ہوئی تو انھوں نے بڑی خوشیاں منائیں، نذریں نیازیں دیں۔ جیسے خزانہ مل گیا ہو —— پھر پان تمباکو کے استعمال نے بھی میری صحت کے ساتھ خوشگوار سلوک نہیں کیا۔ ورنہ میرا گھریلو ماحول بڑا پُرسکون اور شاندار تھا۔"

"اب آپ کچھ تھکی تھکی سی لگ رہی ہیں۔ ایک آدھ بات پوچھ کے چلا جاؤں گا۔ اس لیے کہ مجھے بڑی سخت بھوک لگ رہی ہے —— ہاں تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ حکومت نے آپ کی جس حد تک مدد کی ہے۔ کیا آپ اُس سے مطمئن ہیں؟"

"طفیل صاحب! بات یہ ہے کہ خدا کی مرضی پر شاکر اور مطمئن ہوں۔ جب اللہ ہی نے ہم سے شوکت صاحب کو چھین لیا تو ہماری اس سے بڑھ کر اور کیا بدنصیبی ہوگی۔ اب زندگی کا لمبا سفر طے کرنے ہیں، مجھے جس طرح بھی جینا پڑا، جیوں گی۔ اس لیے کہ اکیلی میری جان کا سوال نہیں ہے۔ تین معصوم بچیوں کا ساتھ ہے۔ ان کے مستقبل کا سوال ہے۔ شوکت صاحب تو انھیں تنہا چھوڑ گئے ہیں۔ میں ان کے غموں اور ان کی ننھی ننھی خوشیوں کو پورا کرنے کی سعی کروں گی —— حکومت نے ہمیں جتنا سہارا دیا۔ اس کی وجہ سے ہمارے آنسو خشک ہو گئے —— مگر اتنی امداد پر، میری بچیوں کی تعلیم سے لے کر، ان کے بیاہ شادیوں تک کا بندوبست ہو گیا ہے؟ —— یہ سوال میرے علاوہ اور بھی صاحبِ اختیار حضرات کے سوچنے کا ہے۔"

میں شوکت صاحب کی بیگمات کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے دُکھوں اور اپنی پریشانیوں کے باوجود میری باتیں سنیں اور ان کے جوابات عنایت فرمائے۔ الفاظ کی حد تک یہ سارا کیا دھرا میرا ہے۔ مفہوم کی حد تک، میں نے مرحوم کی بیگمات کا ساتھ دینے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اتنی اہم معلومات کو بھی، معتبر نہیں سمجھتا۔ اس لیے کہ عین ممکن ہے کہ کہیں کہیں میں نے مفہوم کے اظہار کے سلسلے میں کوتاہی کا ثبوت دیا ہو۔ اس لیے اس گفتگو کے سلسلے میں، جتنی بھی عجیب سی باتیں آپ کے ذہن میں اُبھریں، اُنھیں بلا تکلف میرے کھاتے میں ڈال دیجئے گا۔

اس گفتگو کے سلسلے میں میرے لیے بڑی مشکلیں تھیں۔ بہت سی باتوں کو جانتے بوجھتے، پھر سے پوچھا۔ تاکہ میرے ذہن میں وہ باتیں زیادہ صاف ہو جائیں اور آپ کے لیے "انکشاف" کا درجہ رکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دوران میں کئی مواقع ایسے تھے کہ بیگمات میرے سوالوں کو سُن کر سٹپٹا گئیں اور میرے خلوص پر بھی شبہ ہوا مگر میں سر نیہوڑے وہ ساری باتیں کر گزرا جو میں کرنی چاہتا تھا تاکہ مرحوم کی شخصیت کے وہ پہلو سب کے سامنے آجائیں جو ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ازبس ضروری تھے۔

میں نے اُن باتوں کی بھی وضاحت چاہی۔ جو شوکت صاحب کے کمزور پہلو تھے۔ ہم دور کے تماشائی، جو کسی شخصیت کو پوری طرح نہ جانتے ہوئے، اعتراضات کر بیٹھتے ہیں —— اُن کی صراحت بھی تو مطلوب تھی —— اور اس کے ساتھ ساتھ، میرا مدعا یہ بھی تھا کہ معلوم کروں کہ بیویاں اپنے شوہر کے بارے میں، کس حد تک حسنِ ظن رکھتی ہیں۔ سو الحمدللہ شوکت صاحب کی بیویاں

سولہ آنے پوری اُتریں — جذبے ہیں، معلومات ہیں! — تکو بنا تو ہیں، دیکھئے ـ میں نے آپ کی خاطر کتنا خطرناک کھیل کھیلا۔

سبھی یہ کہہ رہے ہیں کہ شوکت تھانوی مر گئے۔ ایسے ہی ہو گا، مگر میں تو یہ سُن رہا ہوں کہ آج کے دانشور اس امر کی بھی کوشش کر رہے ہیں کہ ہزاروں برس پہلے کی آوازوں کو بھی سنوا دیا جائے۔ جب انسان کسی نہ کسی روپ میں باقی ہے تو پھر ہم اُسے مُردہ کیوں کہیں ؟

میں انسان کی عظمت اور اس کی صلاحیتوں پر یقین رکھتا ہوں۔ اس کے باوجود یہ کہنے کی جسارت کروں گا — آدمیوں کے اس بھرے جنگل میں شوکت صاحب ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوں گے۔

میرا بھیا

خاتون ارشد

میرا بھیا بچپن ہی سے ذہین تھا۔ عجیب عجیب حرکتیں سوجھتیں وہ بھی ایسی جن سے دوسرے لوگ بجائے خفا ہونے کے ہنسنا شروع کر دیتے۔ میں جتنا اُسے چاہتی تھی اُتنا ہی وہ مجھے ستاتا اور تنگ کرتا۔ میں بھی اُس کی شرارتوں کا بھانڈا پھوڑتی رہتی۔ ہماری ایک تائی اماں تھیں۔ بیچاری کانوں سے بہری اور عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے کچھ کچھ سنکی ہوئی سی سیدھی سادی تو وہ شروع ہی سے تھیں ہمارے تائے ابا جن کو ہم بابو ابا کہتے تھے مدت ہوئی ہندوستان سے باہر چلے گئے تھے اور ۲۵-۳۰ برس سے لندن میں مقیم تھے۔ اس فراق نے تائی اماں کی دماغی حالت خراب کر دی۔ پھر بھی وہ اُن کی واپسی کی لو لگائے بیٹھی تھیں۔ محمد عمر یعنی شوکت کی عمر کوئی ۱۱ سال کی تھی۔ ایک مرتبہ اُس نے ماموں زاد چھوٹے بھائیوں کو آمادہ کیا کہ اندر جا کر کہو کہ بابو ابا آ گئے۔ اور خود سوٹ پہن کر ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ مغرب کا وقت تھا کچھ اندھیرا ہو چلا تھا تائی اماں بیچاری کو یقین آ گیا کہ سچ مچ ان کے میاں آ گئے۔ اور خوش خوش پیٹھ کر کے بیٹھ گئیں اور سر پر سے دوپٹہ ماتھے پر جھپکا کر گھونگھٹ کی طرح کر لیا۔ کچھ منٹ انتظار کرنے کے بعد گردن موڑ کر کن انکھیوں سے دیکھا۔ تو بھتیجے کو دیکھ کر پیٹھ پر دوہتڑ مار کر مجھ کو بنانے چلا ہے۔

اسی طرح ایک دن ایک کاغذ پر کچھ خانے بنائے اور اس میں کچھ ہندسے لکھے اور تعویذ کی طرح موڑ کر ان کے تکیہ میں رکھ دیئے۔ جب دوسرے دن دھوبی کو کپڑے دیئے جانے لگے اور تکیہ کا غلاف اُتارا گیا تو وہ تعویذ نکلا۔ تائی اماں بیچاری پرانے زمانے کی عورت تھیں تعویذ گنڈوں اور جادو۔ ٹونے کی بہت معتقد تھیں۔ بدحواس ہو کر رونے لگیں۔ کہ کسی نے میرے اوپر سفلی عمل کیا ہے۔ اب مجھ پہ کچھ بن جائے گی۔ میری اماں اُنکی دیورانی تھیں اور ان کی پوزیشن بہت نازک تھی۔ اس لیے کہ وہی ان کو ساتھ رکھے تھیں۔ اور کفالت کرتی تھیں وہ پریشان ہو گئیں کہ کہیں ان کو یہ بدگمانی نہ ہو جائے کہ میرا بوجھ ٹالنے کے لیے دیورانی نے تعویذ گنڈے کئے ہیں۔ ان کو پریشان دیکھ کر میں نے کہا ہو نہ ہو یہ حرکت محمد عمر کی ہے۔ ماموں زاد بھائی جو ان کے شریک تھے وہ کیوں بتلاتے۔ تائی اماں کو میں نے سمجھایا مگر ان کے پاس تو یہ تعویذ دستاویزی ثبوت موجود تھا۔ میں نے اُسے لے کر دیکھا اور فوراً کہا ارے یہ تعویذ تو سلمان الارشد کے لیے ماموں لائے تھے (سلمان الارشد میرا بڑا لڑکا اس وقت شیر خوار تھا) یہ میں کہیں رکھ کر بھول گئی تھی پھر انہیں کے سامنے کپڑے میں باندھ کر

سلمان کے گلے میں ڈال دیا۔ تب جا کر تائی اماں کو سکون ہوا۔ اب بھیا کی گوشمالی بھی کرنا تھی۔ وہ مجھ سے چار پانچ سال چھوٹا تھا۔ میں جتنا چاہتی تھی اتنا ہی ڈانٹتی بھی رہتی تھی۔ علیحدہ لے جا کر خوب پھٹکارا۔ اور کہا کہ اگر ابا کو خبر ہوگئی تو خوب پٹائی ہوگی۔ ان حضرت کو بچپن ہی سے صاحب بہادر بننے کا بہت شوق تھا اماں ابا سے اور تو سب ضدیں پوری کرا لیتا تھا مگر والد صاحب (منشی صدیق احمد) اس شوق پر کہتے تھے کہ جب تک تم میٹرک نہیں کر لوگے سوٹ نہیں پہن سکتے۔ ۱۵ سال کی عمر تھی یہ میرے پاس اچھاور آئے۔ یہ ریاست بھوپال کا ایک بڑا تھانہ ہے۔ اور میرے شوہر (ارشد تھانوی) جو شوکت کے چچا زاد بڑے بھائی ہیں وہاں سب انسپکٹر تھے۔ شوکت نے ان سے کہا کہ بھائی جان میرے لیے ایک سوٹ سلوا دیجیے۔ ارشد صاحب خود ابا سے ڈرتے تھے۔ کہنے لگے چچا جان خفا ہوں گے کہ ننھے ننھے شوق قبل از وقت پورے کرتے ہو۔ لیکن میری سفارش پر انھوں نے سوٹ بھی تیار کرا دیا اور میرے کہنے پر ہیٹ بھی منگا دی۔ بھیا بہت خوش ہوئے ان کے بھائی جان (ارشد تھانوی) ان کو گھوڑے کی سواری بھی سکھایا کرتے تھے۔ آدمی لگام پکڑے ساتھ رہتا تھا۔ پھر بھی شوکت اس سے کتراتے تھے۔ مگر سوٹ پہن کر ہیٹ لگانے کے بعد خود ہی سائیس سے جا کر گھوڑا تیار کرایا۔ اور سوار ہو کر قصبہ میں گھومے۔ واپس آئے تو مجھ سے کہا کہ باجی دیہاتی عورتیں مجھے گھوڑے پر آتے دیکھ کر گھبرا گئیں اور ایک دوسرے سے کہنے لگیں ہٹو ہٹو صاحبوا آ رہا ہے۔ میں جانتی تھی۔ یہ بات غلط ہے۔ نواح بھوپال میں صاحبوا کوئی نہیں کہتا یہ پوربی بولی ہے۔ مگر اپنے بھیا کا دل رکھنے کو میں نے کہا۔ تم مجھے بھی تو صاحبوا معلوم ہوتے ہو۔

ایک روز ان کے بھائی جان نے کہا کہ صاحب لوگ شیر کا شکار بھی کرتے ہیں تم صاحب تو ہوگئے ہو مگر بہادر نہیں بنے آؤ تمھیں بندوق چلانا سکھائیں پھر تم صاحب بہادر بن جاؤ گے۔ تھانہ کے پیچھے ایک میدان تھا وہاں لے جا کر اپنے آگے بٹھایا اور بندوق ہاتھ میں لے کر شوکت سے چلوا دی۔ اس کا ایک ہلکا سا جھٹکا کندھے کے قریب چھاتی پر لگا بندوق پھینک کر دوڑ کر گھر میں میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ بھائی جان سے کہہ دیجیے کہ میں صرف صاحب رہنا چاہتا ہوں صاحب بہادر بننا نہیں چاہتا۔ پھر کبھی بندوق کی مشق نہیں کی اور گھوڑے پر بیٹھنا بھی چھوڑ دیا۔ یہ ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے۔

۱۹۲۶ء کا ذکر ہے۔ شوکت میرے پاس پیکلون آئے۔ یہ ریاست بھوپال کی ایک دور افتادہ تحصیل ہے۔ ارشد صاحب وہاں تحصیلدار بھی تھے اور مجسٹریٹ پرگنہ بھی۔ اتفاق سے تحصیل کی عمارت کی مرمت ہو رہی تھی۔ اور ارشد صاحب سکونتی مکان کے بیرونی حصے میں اجلاس کیا کرتے تھے شوکت وہاں جا کر بیٹھ جاتے تھے اور مقدمات کی کارروائی دیکھتے۔ ایک دن ایک ہندو عورت کا بیان لیا گیا اس کو سن کر عورت نے ہندی میں تیزی سے دستخط کر دیے۔ شوکت یہ دیکھ کر تیزی سے اندر آئے اور مجھ سے کہنے لگے باجی کمال ہے۔ یہاں کے دیہات کی عورتیں بھی انگریزی جانتی ہیں شوکت نے دور سے یہ دیکھا تھا کہ عورت نے بائیں سے دائیں کو قلم چلایا۔ انگریزی اور ہندی کی تحریر بھی اسی رخ سے ہوتی ہے وہ اس کو انگریزی سمجھا جب رات کو کھانے پر ارشد صاحب سے اس کا ذکر ہوا تو انھوں نے اس غلط فہمی کو باقی رکھا۔ اور شوکت کو جو اسکول میں زیر تعلیم تھے کہا جب تم روانی سے انگریزی لکھنے لگو گے اور فر فر انگریزی بولنے لگو گے تو پیکلون

کی کسی انگریزی داں لڑکی سے تمھاری شادی کر دیں گے۔ اس وقت تو شوکت کچھ سوچ کر چپ رہے اور بعد میں ہم ان کو چڑاتے رہے۔

لکھنؤ میں جب یہ خبر پہنچی تو گھر میں سب نے ان کو چھیڑنا شروع کر دیا یہاں تک کہ لفظ پتلون اُن سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ یہ تو ان کے لڑکپن کی باتیں ہیں۔ جوانی میں بھی ان کی شرارتیں پوری دلچسپی کے ساتھ جاری رہیں۔ بھوپال کے مسلمان حلوائیوں کا قلاقند ان کو بہت پسند تھا جب وہ یو۔ پی کے سانگ پبلسٹی افسر تھے۔ میں لکھنؤ گئی تو ان کے لیے بھوپال کا قلاقند بھی لیتی گئی۔ میرے خالہ زاد بھائی مولوی محمد عثمان صاحب سے ارشد صاحب کی بہت دوستی تھی۔ ان کے لیے بھی قلاقند لے لیا تھا۔ جب لکھنؤ میں قلاقند گھر میں دیا گیا۔ تو بھائی عثمان کا حصہ الگ کر کے باقی خرچ کر دیا۔ ارشد صاحب نے شوکت سے کہا کہ دیکھو تم بھائی عثمان کے حصہ میں سے نہ چرانا۔ اس پر شوکت نے کہا آپ کو بھروسہ نہیں تو بھائی عثمان کے حصے کے ٹکڑے گن کر رکھ دیجیے۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا جب دوسرے روز رات کو کھانا کھانے بیٹھے تو شوکت نے کہا کہ دسترخوان پر کچھ میٹھی چیز بھی تو ہونا چاہیے۔ پھر خود ہی کافی مقدار میں قلاقند لا کر رکھ دیا۔ ارشد صاحب نے اُسے دیکھ کر کہا کہ گھر کا قلاقند تو ختم ہو چکا تھا تم نے ضرور بھائی عثمان والا قلاقند چرایا ہے۔ شوکت نے جواب دیا کہ آپ اپنے قلاقند کے ٹکڑے دیکھ کر گن لیجیے۔ الماری کھولی گئی تو ٹکڑے تعداد میں پورے نکلے۔ مگر میں سمجھ گئی اور اُسے اُٹھا کر دیکھا تو اس کی موٹائی کم تھی۔ جناب سانگ پبلسٹی افسر صاحب نے رات کو کسی وقت اُٹھ کر نیچے سے آدھے آدھے ٹکڑے چاقو سے تراش لیے تھے۔ راز فاش ہونے پر شوکت بولے یہ آج کل کی بہن ہیں کہ بھائی کی پردہ پوشی کرنے کے بجائے اس کو مجرم بناتی ہیں۔

اس سے بھی زیادہ مزیدار بات یہ ہے کہ ارشد صاحب لکھنؤ سے بھوپال سندیلہ کے لڈو لے کر آئے۔ یہ لڈو بطور تحفے کے دُور دُور کے شہروں تک جاتے ہیں اور کوری ہانڈیوں میں رکھ کر فروخت کیا جاتا ہے۔ ہانڈیوں کی منہ پر لال کپڑا رکھ کر ڈوری سے باندھ کر گرہ پر لاکھ کی مہر لگا دی جاتی ہے۔ بھوپال آ کر دو خرچ ہوئی تھیں کہ ۳-۴ دن بعد نواب صاحب کی جشن سالگرہ میں شرکت کی غرض سے شوکت بھی آ گئے۔ گھر میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ ارشد صاحب نے کہا کہ تیسری ہانڈی بھی کھولو۔ شوکت جلدی سے بولے میں اس میں سے لڈو کھا چکا ہوں میں نے حیران ہو کر کہا کہ یہ تو سر بمہر ہے۔ اور لکھنؤ سے جیسی لائی ہوں ویسی ہی رکھی ہے کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ شوکت نے کہا اچھا آپ کو یقین نہیں آتا تو کھول کر گن کر دیکھ لیجیے کہ ان کی تعداد پوری ہے یا کم ہے۔ میں نے مہر دیکھی لگی ہوئی تھی ہانڈی کھولی گئی اور گننے لگے تو مقررہ تعداد سے واقعی دو کم تھے۔ اب سب کو حیرت ہو رہی تھی کہ یہ کیا جادو کیا ہے۔ آخر ان ہی جادوگر صاحب نے بتایا کہ لکھنؤ میں جب یہ ہانڈیاں خریدی گئی تھیں اور روانگی سے ایک دن پہلے گھر میں رکھدی تھیں۔ تو میں نے آدھی رات کو اُٹھ کر ہر ہانڈی میں سے دو دو لڈو نکالے۔ اور پھر دفتر میں نیچے سے اپنی مہر لاکھ لا کر لگا دی۔ اب آپ کو تو سر بمہر ملیں کیسے شبہ ہوتا اس پر ہم لوگ ہنسنے لگے کہ ماشاء اللہ بھیا کو چوری کا سلیقہ بھی آتا ہے۔ حالانکہ مقصد قلاقند یا لڈو کھانا نہیں ہوتا تھا بلکہ سب کو حیرت میں ڈالنے کے لیے اس قسم کی حرکتیں ہوتی تھیں

بعض دفعہ مجھ کو بھی جوابی حرکتیں کرنا پڑتی تھیں۔ جیسا کہ ایک دفعہ ہوا۔

جب وہ لاہور پنچولی آرٹ پکچرز میں ڈرامہ نویس ہو کر آ گئے تھے۔ ان کے ساتھ بھی ڈرامہ کیا گیا۔ یہ واقعہ فروری ۱۹۴۷ء کا ہے۔ میں کسی ضرورت سے لکھنؤ گئی وہاں میرا لڑکا عمران الارشد پڑھتا تھا وہاں جا کر معلوم ہوا کہ شوکت دلہن میری بھاوج بھی اپنی بیمار بہن کو دیکھنے آئی ہوئی ہیں۔ اور شوکت کی غلطی پر جلد لاہور واپس جا رہی ہیں۔ میں اس اتفاقیہ ملاقات پر خوش بھی ہوئی اور جب سنا کہ دوسرے دن لاہور جا رہی ہیں تو غمگین بھی کہ میں آئی اور تم جا رہی ہو انھوں نے کہا آپ بھی لاہور چلئے بھائی سے مل کر چلی جائیے گا۔ میں نے کہا صرف ایک ہفتہ کے لیے آئی ہوں چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر زیادہ دن کیسے لگا دوں لاہور جاؤں گی تو شوکت جلدی سے واپس نہیں آنے دے گا۔ ان کا اصرار بڑھا دل میرا بھی بھائی کو دیکھنے کو تڑپ رہا تھا۔ عمران الارشد (میرا لڑکا) نے کہا جائیے میں بھوپال ابا کو لکھے دیتا ہوں کہ ماموں جان کو دیکھنے لاہور چلی گئیں۔ میں تیار ہو گئی اور سعیدہ شوکت دلہن اور بابا میاں (رشید عمر) کے ہمراہ لاہور کے لیے روانہ ہو گئی ریل میں ہم نند بھاوج نے ایک پروگرام بنایا اور بابا کو بھی جو چھوٹا تھا پیار محبت سے سمجھا لیا کہ ابا کو نہ بتانا کہ پھوپھی اماں آئی ہیں۔ میں نے کہا شوکت بہت تنگ کرتا ہے اب کی اس کو بھی ستانا ہے۔ جب لاہور اسٹیشن قریب آیا تو برقع کی نقاب اچھی طرح ڈالی۔ جب لاہور کا اسٹیشن آ گیا تو شوکت اور منجھلا لڑکا خورشید اسٹیشن پر لینے آئے ڈبے میں سے متعدد خواتین اتریں ان کے ساتھ میں بھی اتری۔ اور چند قدم فاصلے سے دوسری عورتوں کے ساتھ گیٹ تک آئی بس ایک غلطی ہوئی کہ میرا ٹکٹ بھی سعیدہ شوکت دلہن کے ہاتھ میں تھا۔ جب وہ ٹکٹ دے کر گیٹ سے نکلنے لگیں تو شوکت نے کہا یہ دو ٹکٹ کیسے گھبرا گئیں کہ راز نہ کھل جائے مگر سنبھل کر کہا ایک بیوی میرے ساتھ آئی ہیں اس کے ساتھ کوئی نہیں ہے یہ ان کا ٹکٹ ہے۔ میں نے جب یہ سن لیا تو پھر ساتھ ساتھ چلنے لگی جب تانگہ کرنے جانے لگا تو بھاوج نے کہا تین کر لو ان کا سامان بھی ہے۔ اور جب سب بیٹھنے لگے تو میں کھٹ سے بھاوج کے برابر بیٹھ گئی وہاں شوکت خود بیٹھنا چاہتے تھے۔ برا لگا مگر دوسرے تانگہ میں بیٹھ گئے بابا کو بلا کر بٹھانا چاہا تو ہم نے اس ڈر سے کہ یہ ناٹک جو ہو رہا ہے بچہ گڑبڑ نہ کر دے اپنے پاس ہی بیٹھا رہنے دیا شوکت چیں بہ جبیں ہو رہے تھے کہ بیوی نے ایک غیر عورت کو اپنے پاس بٹھایا، بچہ کو بھی نہ آنے دیا۔ اور میں دل میں خوش ہو رہی تھی کہ بہت دوسروں کو بیوقوف بنا کر خوش ہوتا ہے آج میں بھی خوب تنگ کروں گی حضرت کے تیور بدلے ہوئے تھے اور ہم دونوں کو ہنسی آ رہی تھی۔

شوکت دوسرے تانگہ میں پنچولی کی طرف چل دیئے اور ہم لوگ سیدھے گھر پہنچ گئے اور خورشید نے تانگہ سے اترتے ہی کہا۔ امی جان ایک تانگہ واپس نہ کریں (میری طرف اشارہ کر کے کہا، آپ کو ماڈل ٹاؤن بھی پہنچانا ہے (سعیدہ نے رستے میں کہا تھا یہ ماڈل ٹاؤن جائیں گی) شوکت دلہن بولیں نہیں بھائی اشارہ سے کہا چائے وغیرہ سے فارغ کر کے پھر لے کر جانا۔ خورشید کو بہت ناگوار گزر رہا تھا کہ ماں کو تو دیکھو کیا ہو گیا ہے۔ خورشید نے گھر میں جب سب آ کے سامان اتروا دیا تو اکیلے میں ماں سے کہا آپ کو معلوم ہے ابا ناخوش ہو رہے ہیں اسی لیے سیدھے گھر نہیں آئے

ہیں کہہ رہے تھے تمھاری ماں بھی کیا عذاب ساتھ لگا لیتی ہیں اور پھر اُس عورت کے چپک گئی ہیں میں جاتا ہوں جب یہ محترمہ چلی جائیں جب بلا لینا۔ شوکت دُلہن نے کہا بیٹا بڑی بات ہے اس بیچاری کے ساتھ کوئی نہیں آیا نہ اسٹیشن لینے کوئی آیا اب کھانا کھا کر اطمینان سے پہنچا آنا۔ میں اس وقت بیڈ روم میں چلی گئی تھی۔ اور شوکت کی آمد کی انتظار میں برقع اوڑھے بیٹھی تھی کہ کوئی دیکھ نہ لے اور بھانڈہ پھوٹ جائے۔ خورشید نے کہا امی جان آپ نے غضب کیا ابا اگر وہاں جائیں گے کپڑے تبدیل کریں گے وہاں کہیں بٹھا دیا دوسرے کمرے میں بھیج دیجئے۔ یہاں شدومد سے شوکت کی آمد کا انتظار تھا جب آدمی بلانے گیا تو کہا وہ بلا گئی یا ابھی ہے خیر گھر آئے تو بیوی نے کہا آپ رستہ میں رک کیوں گئے تھے۔ اشارہ سے بیوی سے پوچھا وہ گئی۔

میں نے سوچا کہ کہیں پھر گھر سے نہ حضرت چل دیں اب کھیل ختم کرنا چاہیئے میں نے پیچھے سے آ کر دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے مگر چشمہ لگا تھا مضبوطی سے آنکھیں نہیں بند کر سکی تھی پلٹ کر مجھ کو دیکھا تو دیوانہ وار لپٹ گیا اوئے میری باجی تم کہاں سے ہاتھ لگ گئیں مجھ کو اتنا پریشان کرنے میں تم کو کیا ملا۔ بیوی سے کہا اتنی کوفت دی ہے دل چاہتا تھا اس عورت کا برقع نوچ لوں اور نکال دوں، ہم دونوں نے کہا کیا ہوتا ایسا تو پھر تم کامیاب ہوتے ہماری اسکیم فیل ہو جاتی۔ بہت یہاں سب کو ستاتے ہیں آج پتہ چلا دوسروں کو کتنی کوفت ہوتی ہے تم کو مزہ آتا ہے۔

بیوی سے کہا اتنی کوفت تم نے دی انھوں نے کہا ایک تو آپ کی بہن کو لے آئے اور آپ کو غصہ آ رہا تھا کہنے لگے پتہ بھی ہو کہ میری باجی آ گئی بلکہ میرا تو غصے کے مارے برا حال تھا اچھا ہوا ورنہ اب اور تم لوگ تنگ کرتے تو بغیر کھانا کھائے چلا جاتا کہ اب اس بلا کو گھر میں رکھے رہو جب چلی جائے گی تب آؤں گا۔ اس پر میں نے کہا آج ہی جاتی ہوں مجھ کو سوار کر دو کہنے لگے جی ہاں جتنا مجھ کو تنگ کیا اتنا ہی تنگ کر کے جانے دونگا۔ میں نے کہا اچھا اب سنو کہ راستہ میں یہ سب پروگرام بنایا ورنہ مجھ سے کہاں ضبط ہو رہا تھا۔ کہنے لگے جی ہاں جبھی تو تنگ کیا ہے۔ ورنہ ہمیشہ دوڑ کر لپٹ جاتی تھیں۔ اب آسانی سے تھوڑی جانے دونگا نہ بدلہ لیا ہو تو شوکت نام نہیں اب ایک سال رہنا پڑے گا۔ میں نے کہا نہ بھیا چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر آئی ہوں کہنے لگے آج ہی بھائی جان کو لکھتا ہوں کہ ہمارے یہاں جب تک دولہا لینے نہ آئے لڑکی بھیجی نہیں جاتی سچ کہتا ہوں جب تک لینے نہ آئیں گے نہیں بھیجوں گا۔ اور یہی کیا کہ ارشد صاحب کا جب بلانے کا خط آتا کہ لڑکیاں گھبرا رہی ہیں یہاں سے خط جاتا خود آ کر لے جایئے، ورنہ نہیں بھیج سکتے۔ ہماری لڑکی کو تکلیف ہے ہم نے میکہ میں بٹھا لیا ہے۔

غرض ارشد صاحب کو آنا پڑا بجائے ۱۰ دن کے ۲۵ روز روکے رکھا، روز بستر بندھتا مزیدار ناشتہ تیار ہوتا تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتے ہیں ناشتہ سب کو کھلایا جا رہا ہے بستر کھولا جا رہا ہے۔ صبح کو جاگنے سے پہلے ایک صاحب جو لکھنؤ کے تھے اور پنچولی میں ستار بجایا کرتے تھے اور داڑھی رکھنے کی وجہ سے شوکت ان کو مولانا کہتے تھے ان کو پابند کیا تھا کہ روزانہ ستار لاؤ اور بھائی جان کے سرہانے کھڑے ہو کر بجاؤ۔ پہلے روز انھوں نے

ہچکچانا شروع کیا تو شوکت نے کہا کہ جھکنے کیوں ہو چائے میز پر آگئی ہے ان کو جگانے کا یہی طریقہ ہے۔ ورنہ بھائی جان نہیں جاگیں گے۔ ان بیچاروں نے بجانا شروع کیا ارشد صاحب آواز سن کر جاگے اور کہا شوکت یہ کیا بد معاشی ہے شوکت بولے ہمارے یہاں تہذیباً پکارا نہیں جاتا۔ ایسے ہی جگایا جاتا ہے۔ غرض دن رات یوں ہنستے گذرتے رہتے۔ وہ دن یاد آتے ہیں۔ اور مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میرا بھائی اب بھی زندہ ہے۔ اپنے منہ سے اس کو کیسے کوسوں بچپن سے لے کر اب تک اس کی زندگی میری نظروں کے سامنے پھر رہی ہے۔ شوکت کیا مجھے چاہتا تھا اور اس کی ہر چیز ہر بات سے میں کیسا کیسا خوش ہوتی تھی۔

لڑکپن میں سب سے پہلے جب سائیکل چلانا سیکھی تھی تب مجھے پکارا تھا کہ باجی۔ باجی جلدی آیئے دیکھو مجھ کو سائیکل چلانا آگئی اور باجی اپنے بھیا کی ہر بات سے مارے خوشی کے پھولی نہ سماتی۔ دنیا کی کوئی ایسی بات نہ تھی جس میں باجی سے مشورہ نہ کیا جاتا ہو باجی اور بھائی جان اس کی چیزوں سے جتنا خوش ہوتے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا جتنی داد ہر نئی ذہانت کی اس کو میں اور ارشد صاحب دیتے اور کوئی نہ دے سکتا بڑے ہونے پر بھی وہ ہمارے ساتھ بچہ بن جاتا اور ارشد صاحب بھی اس کے ہم جولی بن جایا کرتے تھے حالانکہ وہ اس سے ۱۸ سال بڑے تھے۔

ایک بار ۲۶ء میں جب لکھنؤ سے میرے پاس آیا تو ہم لوگ ریاست بھوپال کی ایک دور افتادہ تحصیل میں تھے اسی لیے اماں نے لیچیاں اور بہت سے پھل بھیجے تھے اور شوکت اپنے دونوں بھانجوں سلمان اور سلطان کے لیے گیند اور دو بیٹ اور منے عمران کے لیے ننھا بڑا سا کھلونا لائے۔ بڑی بھڑیں جن کو تتیا بھی کہتے ہیں۔ پھلوں کے ٹوکرے پر آ جا رہی تھیں ایک بھڑ ادھر آئی جہاں ہم سب بیٹھے تھے۔ ارشد صاحب بیٹ لے کر کھڑے ہو گئے بھڑ کو مارا وہ نیچے گری اور پاؤں بڑھا کر جوتا سے کچل دیا۔ اب بھلا شوکت سے کہاں صبر ہوتا دوسرا بیٹ لے کر وہ بھی کھڑے ہو گئے اور جس طرف بھڑیں آ جا رہی تھیں اس طرف جا کر کہنے لگے آیئے بھائی جان مقابلہ ہو جائے دیکھیں کون زیادہ بھڑوں کو مارتا ہے پھر کیا تھا دونوں بھائی جٹ گئے کچھ نہیں کچھ نہیں تو سو سوا سو بھڑیں مار ڈالیں اگر چائے نہ لگا دی جاتی تو معلوم نہیں کب تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ لیکن نتیجہ کسی کے حق میں نہ نکلا بغیر ہار جیت کے یہ بازی ختم ہو گئی۔

ایک روز بستی میں گھومنے گئے وہاں کچھ ہندوؤں کو چوسر کھیلتے ہوئے دیکھا گھبرا کر بولے ہم بھی چوسر کھیلیں گے چوسر منگوائی گئی اور کھیلنے والے کو بلا کر اس کے قاعدے سیکھے اور کئی روز تک یہی مشغلہ رہا۔ لکھنؤ جاتے وقت مجھ سے اس کی بساط سلوائی اور کہا کہ کوڑیاں اور گوٹیں لکھنؤ میں خرید لوں گا۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ کا خط آیا کہ پچیسی کے علاوہ میں نے شطرنج کی بھی مشق کر لی ہے اب کے آپ لکھنؤ آئیں گے تو اس پر بھی میری ذہانت کا اندازہ کیجئے گا۔ اور جب کچھ عرصے کے بعد ہم لوگ لکھنؤ گئے تو شوکت اپنے بھائی جان کے ساتھ پچیسی بھی کھیلتے رہے اور شطرنج بھی پھر جلدی اکتا گئے ادبی ذوق کی تکمیل کا وقت ضائع ہوتا تھا شوکت اور میں مزے مزے کی باتیں کرتے اور پھر وہ قلم لے کر بیٹھ جاتا اور مضمون لکھتا ہم دونوں میں جو باتیں ہوتیں اسی پر مضمون تیار ہو جاتا میں بھوپال میں چلی آتی تھی اور جب وہ مضمون چھپ کر آتا تو خاص طور سے مجھ کو بھیجتا۔

اپنے بھائی جان کے اتنے عاشق زار تھے کہ بہانہ ڈھونڈھ کر ان کو لکھنؤ بلواتا جب میرا پہلا لڑکا (سلمان ارشد) پیدا ہوا میں لکھنؤ میں تھی۔ اماں نے کہا اپنے بھائی جان کو اطلاعی تار دے دو۔ لکھو نیا زچہ بچہ خیریت سے ہیں۔ آپ کو ارشد صاحب کو بلانے کا موقع ہاتھ آگیا اور تار میں اپنی طرف سے یہ ترمیم کر دی کہ باجی سخت بیمار ہیں فوراً آئیے۔ ارشد صاحب نے گھبرا کر اسپیشل چھٹی لی لکھنؤ پہنچے معلوم ہوا سب خیریت ہے۔ جب پوچھا گیا ایسا تار کیوں دیا تو شوکت نے کہا آپ کو بلانے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس سے میری وابستگی کا یہ عالم ہے کہ میرے لڑکوں میں اس کی خصوصیات الگ موجود ہیں۔ بڑا لڑکا سلمان ماموں کی طرح قلم کا دھنی ہے دوسرا سلطان خوش گفتاری اور بذلہ سنجی خوش لباسی میں بالکل ماموں کی طرح ہے تیسرا عمران اس میں ماموں کی وہ سنجیدگی ہے جو چٹکی لینے کے بعد وہ اختیار کر لیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے شوکت کو بھی ۳ بیٹے دیئے ہیں ان کے نام میرے اور ارشد صاحب کے رکھے ہوئے ہیں لیکن شوکت کو لڑکی کی تمنا بھی بہت تھی اور ایک دفعہ لکھنؤ سے خط میں لکھا لڑکی پیدا ہوئی ہے زچہ بچی بخیریت ہیں مگر کمزور بہت ہے۔ شوکت کو معلوم تھا کہ جب تک سعید عمر نہیں ہوا تھا تو بھائی کی اولاد کی بہن کو کتنی تمنا تھی اور ان لڑکوں کے ہونے کے بعد باجی کو بھی ارمان تھا کہ بھتیجی بھی ہو اسی لیے یہ لکھا تھا کہ میں خوش ہو جاؤں گی سب نے کہا جب لکھنؤ آئیں گی تو کہاں سے لڑکی دکھاؤ گے کہنے لگے دو تین روز میں لکھ دونگا کہ ختم ہو گئی تو بھاوج کے منہ سے نکلا خدا نہ کرے کہنے لگے اچھا ہوئی بھی نہیں اور برا مانتی ہو۔

خدا نے اس کی یہ تمنا بعد کو پوری کر دی لاہور میں جب زہرہ خاتون سے شادی ہوئی تو سب سے پہلے بچی ہوئی جس کا نام برسوں پہلے سے میں نے شوکیہ رکھ رکھا تھا۔ اس کے بعد دوسری بچی فوزیہ پیدا ہوئی پھر تیسری شاہدہ۔ اس طرح انسانیت کا حساب برابر رہا یعنی پہلی بیوی کے ۳ لڑکے سعید عمر۔ خورشید عمر۔ رشید عمر۔ دوسری بیوی کے ۳ لڑکیاں شوکیہ، فوزیہ شاہدہ۔ بچیاں بڑی پیاری معصوم ہیں مگر ان پر سے اللہ میاں نے باپ کا سایہ جلد اٹھا لیا۔ ان بچے بچیوں سے اس لیے بھی محبت ہے کہ ان میں بہت چیزیں شوکت کی ہیں۔ اور خود اپنے بچوں میں جب یہ خصوصیات دیکھتی ہوں تو ان کو بھی اس لیے چاہتی ہوں کہ میرے بھائی کی یہ چیزیں ان میں موجود ہیں۔ شوکت کو اس لیے چاہتی تھی کہ اس میں بہت سی چیزیں ابا کی تھیں ابا جب یاد آتے تھے تو بھائی کو دیکھ کر دل کو تسلی دیتی تھی کہ باپ نہ سہی بھائی تو موجود ہے۔ اب میں کیا کروں کیسے یقین کروں میرا بھیا ہمیشہ کے لیے مجھ سے روٹھ گیا۔ میں بدنصیب اپنی شدید علالت کی وجہ سے دیکھ بھی تو نہ سکی کیسے دل کو سمجھاؤں دل یقین نہیں کرتا کہ وہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا میرے باپ کے گھر کا چراغ گل ہو گیا۔ میرے دل پر قیامت گزرتی ہے مگر پھر سوچتی ہوں نہیں اس کے لڑکے اس کی لڑکیاں سب اسی چراغ سے چراغ روشن ہوتے ہیں ان کو کلیجے سے لگاؤں دل کو سمجھاؤں ہائے میرے بھیا تو کہاں ہے تیری ماں جائی تڑپتی ہے تو صرف تنہا بھائی تھا بتا کیا کروں تجھ کو کس طرح بھلاؤں ہائے میرا بھائی کہاں چلا گیا۔ رات رات بھر آنکھوں میں کاٹتی ہوں۔ تجھ کو کسی نے یہ تک نہ بتایا کہ ماں جائی سخت بیمار ہے۔ ہائے سوچتا ہو گا کیسی بہن ہے جو نہیں آئی۔ معلوم نہیں کیا کیا سوچتی ہوں روتی ہوں کیا کروں، اللہ تو بتا کیا کروں۔ سعید، خورشید، رشید۔ شوکیہ، فوزیہ، شاہدہ تم نہ روؤ مجھ کو رونے دو اپنی پھوپھی کو دھاڑیں مارنے دو تڑپنے دو۔ میرا تو صرف ایک بھائی تھا اب کچھ نہیں۔ تم بچے ہو تم چھ بھائی بہن ہو اپنی ماؤں کو تسلیاں دو ان کے کلیجے

سے لگ جاؤ خوش رہنے کی کوشش کرو۔ میرا دل تڑپ رہا ہے اب لکھا نہیں جاتا کیسے یقین کروں کس طرح دل کو سمجھاؤں۔ دل چاہتا ہے آنکھ کھل جائے اور یہ سب خواب ہو میرا بھائی زندہ ہو کاش ایسا ہو سکتا۔ کراچی سے جانے کے بعد میں نے دیکھا ہی نہیں بہت دل کو سمجھاتی ہوں کہ وہ تو پنڈی میں ہے نہ یقین کروں ہائے میرے قلم سے آج تک لفظ مرحوم نہیں نکلا کیسے لکھوں۔ میں نے تو پروگرام بنایا تھا کہ لڑکیوں کی چھٹیوں میں پنڈی جاؤں گی اب کس کے پاس جاؤں پیارا بھائی اب کبھی دیکھنے کو نہیں مل سکتا۔ کبھی نہیں مل سکتا۔

ہائے شوکت تو کہاں چلا گیا!

شوکت سلمہٗ

(جو اب مرحوم و مغفور ہو گیا)

ارشد تھانوی

"طفیل صاحب! شوکت نمبر کے لیے جو کچھ لکھ سکا ارسال ہے۔ بعض واقعات سابقہ مضمون سے ماخوذ ہیں مگر بیشتر حقائق پہلی بار زیرِ قلم آئے ہیں۔"

ارشد

لوگ اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی، بروں میں بھی کچھ اچھائیاں ہوتی ہیں اور اچھوں میں بھی کچھ برائیاں۔ شوکت میں خوبیاں بہت زیادہ تھیں اور ناخوبی بہت کم۔ اگرچہ یہ سالہا سال کے استعمال سے بہت عامیانہ ہو گیا ہے مگر مرگِ شوکت پر زبان سے نکل ہی جاتا ہے کہ ؏

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

وہ ناظم بھی تھا، ناثر بھی۔ شعر بھی کہتا تھا، مضامین بھی لکھتا تھا۔ ریڈیو کی نشریات میں بھی بالالتزام حصہ لیتا تھا۔ فیچر اس نے لکھے، ڈرامے اس نے لکھے، مختصر افسانے اس نے لکھے، ناول اس نے لکھے، متعدد روزناموں کی ادارت اس نے کی اور طنز و مزاح کا ایسا اسلوب اس نے پیدا کیا جس نے ہندوستان و پاکستان کے ہر صاحبِ علم کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ خواص تو خواص عوام بلکہ معمولی شد بد رکھنے والوں کا دل بھی اس نے موہ لیا تھا۔ اس پر خامہ فرسائی کرنا میرے لیے مناسب نہیں ہے۔ یہ دوسرے اہلِ قلم کا موضوع ہے۔ وہ میرا جان سے زیادہ عزیز چھوٹا بھائی تھا لیکن حقیقی نہیں بلکہ عم زاد۔ اگرچہ عام طور پر اس کو میرا حقیقی بھائی سمجھا جاتا ہے اور اس کی ننھی عمر کے دیکھنے والے تو بعض حضرات اب تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ میرا بیٹا تھا۔ ساغر نظامی نے اپنے مجموعہ مکتوبات میں اسے میرا سوتیلا بھائی لکھ دیا۔ اس غلط فہمی کے اسباب، کی بنیاد ہمارے خاندانی روابط اور معاشرتی ہم آہنگی ہے۔ شوکت بچپن میں میری گود میں کھیلا، طفولیت میں میرا ہمزاد رہا، سنِ شعور کو پہنچ کر اپنے آپ کو "تھانوی" لکھنے لگا حالانکہ وہ تھانہ بھون میں کبھی نہیں رہا۔ کم سنی میں ایک بار صرف ایک دن کے لیے تھانہ بھون گیا، پھر جوانی میں اپنی رفیقۂ حیات سعیدہ خاتون کو وہاں اعزہ سے روشناس کرانے کے لیے صرف دو دن اپنے آبائی وطن میں رہا۔ واقعہ کے طور پر وہ تھانوی نہیں لکھنوی تھا۔ چچا جان منشی صدیق احمد صاحب (شوکت تھانوی کے والد) ایک رومانی ناکامی کی وجہ سے نوعمری ہی میں تھانہ بھون سے چلے آئے تھے

عرصہ دراز تک محکمہ پولیس میں ملازمت کر کے لکھنؤ ہی میں رہے اور لکھنؤ ہی کے ایک ممتاز صدیقی خاندان میں شادی کی جس کا سلسلہ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی تک پہنچتا ہے۔ ان کی بیگم سجادی بیگم جن کو میں بڑے پیار سے چچی جان کہتا تھا، اودھ کے زمانہ شاہی کے وزیر اعظم کی پوتی تھیں۔ یوں تو چچا جان یوپی کے مختلف اضلاع میں بسلسلہ تبادلات مقیم رہے لیکن مستقل سکونت لکھنؤ ہی میں اختیار کر لی۔ وہیں ذاتی مکان بنایا جو زرد کوٹھی کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ زرد کوٹھی محلہ آغا باقر میں چھوٹی شہزادی کی حویلی کے سامنے وکٹوریہ سٹریٹ پر تھی جو اب تقسیم ملک کے بعد کسی شرنارتھی کے قبضہ میں ہے۔ سعدی علیہ الرحمۃ نے سچ کہا ہے ؎

ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت
رفت منزل بدیگرے پرداخت

۱۹۲۷ء میں میری شادی شوکت کی بڑی بہن ظہور فاطمہ بیگم صاحبہ سے اسی زرد کوٹھی میں ہوئی اور مدتوں اسی کے بالائی حصہ میں میرا قیام رہا۔ میرے والد شیخ سلطان احمد بھوپال ہائیکورٹ کے مشہور وکیل فوجداری تھے۔ ماہ فروری ۱۹۰۵ء میں ان کو اپنے چھوٹے بھائی صدیق احمد کا تار ملا کہ لڑکا پیدا ہوا ہے۔ ان دنوں چچا جان بندرابن ضلع متھرا میں کوتوال تھے۔ میرے والد نے اس مولود کا نام "تسخیر احمد" از روئے اعداد ابجد نکالا جس سے ۱۳۲۳ھ برآمد ہوتا ہے۔ چچا جان، ان کی بیگم اور دوسرے افرادِ خاندان ایک تارک الدنیا بزرگ کے جو بڑے مولانا صاحب کہلاتے تھے، بہت معتقد تھے۔ ان ہی مقدس انسان کے صاحبزادے حضرت مولانا عین القضاۃ بانی مدرسہ فرقان تھے جہاں سے حفاظ و قرآن کی دیندار جماعتیں اب بھی نکلتی رہتی ہیں۔ چچا جان کے یہاں شادی کے بعد عرصہ دراز تک اولاد نہ ہوئی، بڑے مولانا صاحب سے دعا کرائی گئی اور ۱۹۰۱ء میں چچا جان کے یہاں رنکتہ ضلع آگرہ میں ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ چونکہ یقین یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اولاد بڑے مولانا صاحب کی دعا قبول فرما کر دی ہے، انہی سے نام رکھنے کی استدعا کی گئی، انہوں نے "ظہورا" نام تجویز کیا۔ میرے والد نے بھتیجی کے نام کو سلیقے کا بنا کر تاریخی حیثیت دے دی اور ظہورا کو ظہور فاطمہ بیگم بنا دیا جس سے سنہ پیدائش (۱۳۱۸ھ) برآمد ہوتا ہے۔ اس بچہ کا نام بھی بڑے مولانا صاحب کے ارشاد کے مطابق محمد عمر رکھا گیا۔ اس محمد عمر یا تسخیر احمد کی پیدائش کے چند ہی روز بعد چچا جان ریاست بھوپال آ کر پہلے میونسپل بورڈ کے سرکاری چیئرمین ہو گئے، پھر منتظم پولیس کے عہدہ پہ تقرر ہو گیا۔ یہ عہدہ سپرنٹنڈنٹ ضلع اور انسپکٹر جنرل کے درمیان وزارت کی زیرِ نگرانی ہوتا تھا۔ شیر خوار محمد عمر بھی اپنے والدین کے ساتھ وہاں پہنچا۔ میرے والد چار بھائی تھے سوائے میرے اور کوئی لڑکا ان بھائیوں کے یہاں نہ تھا۔ مجھے یہ دودھ پیتا منا بھیا بہت ہی اچھا لگا۔ میں خود بھی نو عمر یعنی ۱۸۔۱۹ سال کا تھا اور ریاست کے قوانین رٹ رٹ کر امتحان وکالت کی تیاری کر رہا تھا۔ اس مصروفیت سے جتنا وقت ملتا ممدو سے یعنی محمد عمر کی ناز برداری میں گزرتا۔ اسے گھٹنوں پہ بٹھا کر جھو جھو کرتا، کندھے پر بٹھا کر صحن میں ٹہلتا، دونوں ہاتھوں میں لے کر اچھالتا، جب وہ کھلکھلا کر ہنستا تو میں بھی باغ باغ ہو جاتا۔ کمرہ میں ایک منقش چھت گیری لگی ہوئی تھی، ایک طرف کا بند کھل گیا اور کپڑا نیچے جھک آیا۔ میں نے حسبِ معمول منے بھیا کو نچاتے، کداتے اوپر اٹھا کر چھت گیری سے لگاتے ہوئے کہا، "آ تجھے آسمان پر پہنچا دوں"۔ چچی جان جو رواجی توہمات سے بالاتر نہ تھیں، گھبرا کر بولیں۔ ابھی بُری فال زبان سے نہ نکالو۔ میں نے جواب دیا کہ یہ بُری نہیں بلکہ فرخندہ فال ہے، شہرت و عزت کی فال! آپ اسے بُری فال کیوں کہتی ہیں۔ کاش چچی جان عمر طبعی کی انتہائی حد تک زندہ رہتیں

اور اپنے چاند کو مہرِ نیم روز بنتے اور آسمانِ شہرت پر تابندہ و درخشندہ دیکھیں تو میری اس توجیہہ و تاویل کی قائل ہو جائیں۔ اس بچے میں شروع ہی سے اس کے آثار نمایاں تھے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ 'پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آتے ہیں'، محمد عمر پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ دو سال بعد یو۔ پی گورنمنٹ نے چچا جان کو ریاست سے واپس طلب کر لیا۔ چونکہ بھوپال میں ان کو ایک وسیع حلقۂ احباب مل گیا تھا اس لیے واپس آکر انگریزی کی نوکری میں ان کا دل نہ لگا اور قبل از وقت پنشن لے کر بھوپال آ گئے۔ کچھ عرصہ تک نواب سلطان جہاں بیگم نے ایک اہم خفیہ خدمت پر مامور رکھا۔ اس دوران میں پولیس کا نظم و نسق بدل گیا تھا۔ سی۔ پی پولیس کے ایک دیرینہ تجربہ کار عہدہ دار خان بہادر شیخ محمد سرور، انسپکٹر جنرل مقرر ہو کر ریاست میں آ گئے تھے اور افسرِ اعلیٰ نظام پولیس کہلاتے تھے۔ صدیق احمد صاحب ان کے نائب یعنی ڈپٹی انسپکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ اگرچہ دونوں کے اختیارات الگ الگ تھے، پھر بھی دونوں میں چپقلش ہو جاتی تھی۔ اس کی بنیاد بعض نجی باتوں پر بھی استوار ہوتی چلی گئی۔ افسرِ اعلیٰ سیاہ فام، موٹے تازے اور کافی عمر کے انسان تھے، داڑھی منڈاتے، مونچھوں پر خضاب لگاتے اور سر کے بال بہت چھوٹے مشینی قینچی سے کترے ہوئے رکھتے تاکہ سفیدی زیادہ نمایاں نہ ہو۔ ایک روز چچا جان ان کے بنگلے پر گئے، وہ ننگے سر کرتہ پہنے بیٹھے تھے، نائب افسرِ اعلیٰ صاحب کی اطلاع پر اسی طرح باہر نکل آئے۔ چچا جان نے دیکھتے ہی بڑے سادہ انداز میں کہا۔ 'میں ٹھہر جاتا، آپ نے ناحق غسل خانے سے آنے کی زحمت کی۔' افسرِ اعلیٰ نے کہا 'نہیں تو۔' چچا جان 'لیجیے سر پر صابن کا پھین جو لگا ہوا ہے اس سے میں نے سمجھا۔' افسرِ اعلیٰ صاحب نے گھبرا کر سر پر ہاتھ پھیرا، 'معاف کیجیے گا سفید چھوٹے بالوں پر مجھے صابن کے پھین کا شبہ ہوا۔' افسرِ اعلیٰ اس پھبتی کو سمجھ تو گیا مگر کسی ناگواری کا اظہار کیے بغیر جواب دیا۔ 'آپ کی نظر زیادہ کمزور ہو گئی ہے، چشمہ لگایا کیجیے' مگر محمد عمر سلمہٗ نے تو غضب ہی کر دیا۔ آٹھ نو برس کی عمر ہو گی مگر پھبتی بڑوں جیسی کس دی۔ ہوا یہ کہ اپنے ابا سے پوچھ کر میرے ساتھ بازار گئے۔ واپسی پر چچا جان نے پوچھا 'کہو بازار ہو آئے؟' محمد عمر نے جواب دیا۔ 'جی ہاں! ابا وہاں ایک جگہ آپ کے افسرِ اعلیٰ پیٹ پر گھڑی باندھے کھڑے تھے۔' واقعہ یہ تھا کہ ایک گھڑی والے کی دوکان پر ایک موٹے تازے حبشی کا مجسمہ رکھا تھا جو کوٹ پتلون پہنے توند نکالے کھڑا تھا، اس پر گھڑی کا ڈائل بنا تھا۔ یہ پھبتی خاں بہادر محمد سرور پر اس قدر چسپاں ہوئی کہ

زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

چچا جان اور عالی مرتبت سر لیاقت علی نے جو اتفاق سے وہاں بیٹھے تھے، اس اسٹیچو کو منگوا کر دیکھا اور ہنستے ہنستے لوٹ ہو گئے۔ ریاستوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہوتی جو "با ما شراب خورد و بزاہد نماز کرد" پر عمل کرتے ہیں۔ چچا جان کے حاشیہ نشینوں نے جو افسرِ اعلیٰ کے التفات کے بھی جویاں رہتے تھے، موصوف کو بھی یہ خبر مزید حاشیہ آرائی کے ساتھ پہنچا دی۔ انہوں نے بہت برا مانا اور دلی کبیدگی اس قدر بڑھی اور باہمی تلخی نے اس قدر شدت اختیار کی کہ چچا جان کو مستعفی ہو کر لکھنؤ چلا آنا پڑا۔ حکیم انشاء اللہ خاں نے فرمانروائے اودھ کے دعویٰ نجابت پر 'انجب' کہہ کر اپنے حق میں جو کانٹے بوئے تھے ان صاحبزادے نے اپنے والد کے حق میں بو دیے لیکن اسی ذہانت اور تیزیٔ طبع سے اپنی زندگی میں خوب پھلے پھولے اور ادبِ اردو میں وہ شاہکار پیش کیے جو اپنی جگہ اختراع فائقہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ اگر اس کچی عمر میں محمد عمر عرف ممدوے لکھنؤ آکر نشو و نما نہ پاتے تو وہ بھوپال میں رہ کر قطعی ایسے شوکت تھانوی نہ بنتے جیسے اپنی صلاحیتوں کے استعمال سے بن کر رہے۔ لکھنؤ کی شہری فضا اور شعری ماحول نے ان کی ذہنی قوتوں کو ابھارنا شروع کر دیا۔ مادری زبان تو لکھنؤ کی بیگماتی زبان کے آغوش میں پروان چڑھ رہی تھی، لکھنؤی معاشرت بھی پورے طور پر اثر انداز ہونے لگی۔

جس محلے میں گھر تھا وہاں زیادہ تر امامیہ عقیدے کے اصحاب رہتے تھے اور ہم سے سب کے تعلقات عزیزوں جیسے تھے زنانہ مجالس میں شوکت کو بھی اپنی والدہ کے ساتھ جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ کسی مجلس میں ایک ذاکرہ نے مرثیہ یا سلام بصورت مستزاد پڑھا تھا، عمر اس پر غور کرتا ہوا گھر آیا۔ ان کے ابا اس وقت کسی کا ذکر کر رہے تھے کہ "دم جھڑ گئی پر گر گئے پھرتے ہیں لنڈورے!" شوکت نے اسے مستزاد جیسا مصرعہ قرار دے کر فوراً اگلا ٹکڑا چسپاں کر دیا "عباس کے آگے" جو بالکل فٹ بیٹھ گیا ؂

دم جھڑ گئی پر گر گئے پھرتے ہیں لنڈورے
عباس کے آگے

میں نے اس سے پہلے بھی اس کا ایک غیر ارادہ شعر نما جملہ سن کر کہا تھا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر ضرور شاعر ہوگا اور وقت آنے پر یہ ہونہار بروا شاعر ہی نہیں انشا پرداز بھی ہو گیا۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ میں نے ننھی ظہور فاطمہ کے نام اخبار "پھول" جاری کرا دیا تھا۔ پتہ کی چٹ چھپی ہوئی تھی۔ جب چھوٹے بھائی نے اردو پڑھنے لکھنے کی تھوڑی سی استعداد پیدا کر لی تو مجھے فرمائش کی کہ جس طرح باجی کا نام چھپا ہوا آتا ہے میرا نام بھی اخبار میں چھپوا دیجئے۔ میری ایک مختلف البطن بہن جو شوکت سے ۶ ماہ بڑی تھی، دونوں بھائی بہن آپس میں بہت مانوس تھے، اس نے بھی بڑی للک سے یہی بات کہی۔ یہ اس وقت کا قصہ ہے جب چچا جان بھوپال ہی میں تھے۔ میں نے دو کہانیاں دونوں کے نام سے الگ الگ لکھ کر بھیج دیں۔ عنوان تھا "بڑھیا کا لڑکا" یہ ننھے بھائی کی طرف سے اور دوسری کہانی "سفید بلّی" افسر بیگم کی طرف سے۔ جب وہ چھپ کر آئیں تو میاں ممدوے جو اس وقت شوکت کا پیار کا نام تھا، دوڑے ہوئے اپنی ماں کے پاس گئے اور کہا "دیکھئے اماں! بھائی جان آپ کو بڑھیا سمجھتے ہیں اور پھول کے شروع صفحہ کی فہرست مضامین دکھا کر بولے۔ یہ دیکھئے لکھا ہے "بڑھیا کا لڑکا" محمد عمر" اور "سفید بلّی" افسر بیگم" جب میں باہر سے آیا تو یہی بات مجھ سے کہی کہ ہماری امی زیادہ عمر کی تو نہیں جو آپ نے مجھے "بڑھیا کا لڑکا" لکھ کر چھپوا دیا۔ میں نے کہا۔ تم بڑے شریر ہو اپنی ذہانت سے الفاظ کا مطلب بدل دیتے ہو۔ تم خوب سمجھتے ہو کہ کہانی کا نام "بڑھیا کا لڑکا" ہے اور لکھنے والے کا نام "محمد عمر"! چچی جان یہ سن کر ہنس پڑیں۔ اس دن سے حضرت نے افسر بہن کو "سفید بلّی" کہنا شروع کر دیا۔ بیگم صاحبہ فرمانروائے بھوپال نے شاہی خاندان اور معزز عہدہ داروں کے لئے ایک ابتدائی درس گاہ "نوبل اسکول" کے نام سے قائم کی تھی۔ محمد عمر بھی اس میں داخل تھے۔ دوپہر کا کھانا گھر سے ایک اردلی لے کر جایا کرتا تھا۔ محمد عمر اپنا مزے دار کھانا اپنے ہم جماعت دوستوں کو کھلاتے اور چھٹی ہونے پر بڑے ابا کے یہاں یعنی ہمارے گھر بھوک سے بلبلاتے ہوئے آتے اور آتے ہی کہتے۔ "سفید بلّی! لہسن کی چٹنی پیسو!" میری وہ حقیقی بہنیں جو دونوں سے بہت بڑی تھیں کہتیں "سالن سے کیوں نہیں کھاتے۔ انڈا تلوا لو، کباب منگوا دیں؟" معلوم نہیں سفید بلّی اور بڑھیا کے لڑکے کو کیا دھن تھی کہ لہسن کی چٹنی مزے لے لے کر کھایا کرتے۔ یہ روز کی بات تو نہیں تھی ہفتہ میں دو ایک بار ایسا ضرور ہوتا۔ ان کی امی کو خبر ہوئی، انہوں نے بھی سمجھایا کہ اوّل تو ہمارا بھیجا ہوا کھانا دوسروں کو نہ کھلایا کرو اور اگر کبھی کھلا بھی دو تو گھر آ کر یا بڑے ابا کے گھر جا کر دال سالن سے روٹی کھایا کرو لیکن لہسن کی چٹنی کے چٹخارے سے وہ باز نہ آئے۔ میں لہسن کی بو سے بہت چڑتا ہوں۔ میں نے کہا سنو جی ممدوے تم لہسن کھا کر میرے پاس نہ آیا کرو، تم باتیں کرتے ہو تو مجھے لہسن کی بدبو آتی ہے۔ ایک روز آپ کو مجھ سے کچھ کہنا تھا۔ چٹپٹی روٹی کھا کر بیٹھے تھے، مجھے دیکھ کر جلدی سے کلی کی اور بڑی اماں سے

جا کر الائچیاں مانگیں، انہیں چبا کر میرے پاس آئے اور مجھ سے بولے آج میں نے لہسن کے بدلے الائچیوں کی چٹنی کھائی ہے دیکھئے میرے منہ سے ان کی خوشبو آرہی ہے۔ یہ بچپن کی بات ہے، ہوش سنبھال کر تو وہ بہت نفیس کھانا کھاتا تھا۔ میٹھے چاول بالائی اور سیب کے مربّے کے بغیر حلق سے نیچے نہ اترتے تھے۔ یہاں مجھے ان کے آغازِ شباب کی ایک بات یاد آئی۔ حضرت لکھنؤ سے اپنے بڑے ابا کے یہاں بھوپال آئے۔ سعیدہ بی بھی اب جوان ہو چکی تھی، آپ کا جذبۂ خلوص شدت سے عود کر آیا۔ میں اس زمانہ میں ایک بعید مقام "تجے نگاری" میں تحصیلدار تھا، میاں محمد عمر وہاں پہنچے اور اپنی باجی سے جو اب میری بیوی اور تین بچوں کی ماں بن چکی تھیں کہنے لگے۔ باجی! میں ریل سے اتر کر تیس میل کا یہ پہاڑی راستہ آپ سے ملنے کے لیے طے کر کے آیا ہوں۔ بیل گاڑی میں جھٹکے کھاتے کھاتے ہڈی پسلی ایک ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے بہن کا جذبۂ محبت اس ایثار پر کس قدر بھڑک اٹھا ہوگا بہت متاثر ہو کر شفقت بھری دعائیں دیں۔ دو روز تک اسی طرح باجی کو متاثر کر کے حرفِ مطلب زبان پر لائے اور بڑی تمہید کے بعد فرمانے لگے۔ میری شادی نیلی بی، نہیں نہیں افسر بیگم سے کرا دو۔ وہ حیران ہو کر اس کی صورت دیکھنے لگیں۔ پھر بولیں۔ وہ تم سے چھوٹی نہیں بلکہ ۶ ماہ بڑی ہے۔ تمہاری شادی تم سے کم عمر لڑکی سے ہونا چاہئے۔ آپ نے جواب دیا کہ باجی تم نے ہی تو بہت دن ہوئے شاید بہشتی زیور یا اور کسی کتاب میں پڑھ کر مجھے بتایا تھا کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بی بی حضرت خدیجہؓ رسولِ پاکؐ سے ۱۲، ۱۵ سال عمر میں بڑی تھیں۔ افسر تو مجھ سے ۶ مہینے ہی بڑی ہے۔ باجی صاحبہ نے گویا اعتراض تسلیم کر لیا اور بات ٹالنے کو کہا مگر بڑے ابا یہ جوڑ کب منظور کریں گے۔ خواستگار بیتاب بولے۔ بڑے ابا بھائی جان کا کہنا بہت مانتے ہیں۔ بہن کو یہ منظور نہ تھا، بولیں، اور خود اپنے ابا جو نہیں مانیں گے۔ اس پر بیتاب نے کہا" بھائی جان چاہیں تو وہ بھی رضامند ہو جائیں گے۔ آخر یہ بات مجھ تک پہنچی، بعض خاندانی پیچیدگیوں کی وجہ سے اس تجویز سے متفق نہ ہو سکا تو محمد عمر جو بحیثیت "مغز" شوکت بن چکے تھے، میرے اور بہن کے جذبات سے اس خطرناک اپیل پر اتر آئے کہ میں ریل کی پٹری پر لیٹ کر ٹرین سے کٹ جاؤں گا۔ میری بیوی گھبرا اٹھیں۔ انہوں نے دو چار روز پہلے ایسے ہی معاملہ میں کسی نوجوان کی خودکشی کی خبر پڑھی تھی۔ انہوں نے بدحواس ہو کر مجھے مجبور کیا۔ میں نے ایک خط اپنے والد کو لکھا اور دوسرا چچا جان کو، اس میں اپنا اختلاف، شوکت کی خودکشی کی دھمکی تفصیل سے لکھ دی بھوپال سے والد صاحب نے تو یہ اطلاع دی کہ افسر کی خالہ کے بیٹے سے نسبت طے ہو چکی ہے اور لڑکا عنقریب منگلور سے یہاں آنے والا ہے۔ اب اس بات پر توجہ نہیں کی جا سکتی۔ چچا جان کا لکھنؤ سے خط آیا کہ محمد عمر کو فوراً واپس لکھنؤ روانہ کر دو، اس کی والدہ سخت علیل ہیں۔ شوکت لکھنؤ چلے گئے۔ تفصیلات تو معلوم نہیں، شاید کہ وہاں بھی خودکشی پر آمادگی ظاہر کی اور جب یہ صاحبزادے پولیس افسر باپ کے سامنے پیش ہو کر بھی اپنی ضد پر اڑے رہے تو انہوں نے اپنا بھرا ہوا ریوالور نکال کر سامنے رکھ دیا کہ میرے سامنے اپنے کو گولی مار لو، پھر ریوالور کی نالی ان کی کنپٹی پر چھوا کر کہا۔ اس جگہ گولی لگتے ہی بھیجا پاش پاش ہو جائے گا۔ بہادر بیٹے کا تن بدن کھڑا ہو گیا اور جسم تھر تھرانے لگا، چچا جان یہ کہتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے ؎

ایں نہ عشق است ایں کہ در مردم بود
ایں فساد از خوردنِ گندم بود!

بعد میں اس برادرِ عزیز نے از راہِ مصلحت اندیشی مجھے اور اپنی بہن کو اس تجویز کا بانی قرار دیا کہ انہوں نے مجھے اس پر

تیار کیا تھا اور اس معصومیت سے باور کرایا کہ سب نے یقین کر لیا اور عرصہ تک یہ غلط فہمی باقی رہی۔ اسی کے ساتھ ہماری چچی جان کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ لڑکا جوان ہو گیا ہے اور خیالات ڈانواں ڈول ہو رہے ہیں، جلدی سے شادی کر دینا چاہیے اور کچھ عرصہ بعد یہ مرحلہ طے ہو گیا اور خاندان ہی میں ایک مناسب عزیزہ سے شادی کر دی گئی اور عزیزم شوکت کچھ دنوں تک اس الزام ہی پر جھینپے جھینپے رہ کر پھر اپنے بھائی جان کے پیارے بھیا بن گئے۔ یہ قصہ تو بہت بعد کا ہے ذکر تو اس وقت کا ہے جب پہلے پہل انہوں نے اخبار "پھول" میں اپنا نام چھپا ہوا دیکھا اور مجھ سے مزید فرمائشیں کیں، علاوہ پھول اخبار کے بچوں کے ایک ماہانہ پرچے "عزیز" میں ان کی طرف سے ہلکی پھلکی نظمیں چھپوائیں۔ اس سے ان کی تشنگیٔ شوق میں اور اضافہ ہوا اور جذبۂ شہرت پسندی اندر ہی اندر نشوونما پاتا اور اضافہ عمر کے ساتھ مختلف طریقوں سے اس کا اظہار ہوتا رہا جیسا کہ اپنی لکھی ہوئی "کچھ یادیں کچھ باتیں" میں انہوں نے خود بھی لکھا۔ وہ میری غزلیں اپنا تخلص لگا کر مشاعروں میں پڑھتے رہے۔ میں نے جب پہلے پہل ان کا تخلص شوکت سنا تو کہا کہ تم نے اپنی ممانی جان کا نام کیوں چرا لیا (ان کی حقیقی ممانی جو ساتھ ہی رہتی تھیں ان کا نام شوکت جہاں ہے) تو میاں محمد عمر المتخلص بہ شوکت نے بتایا کہ ایک تو ارشد کے وزن پر ہے بآسانی آپ کا مقطع شوکت کا مقطع بن جاتا ہے دوسری بات یہ ہے کہ علی برادران کی اعلیٰ شخصیتوں سے نسبت دینا چاہتا تھا۔ مولانا محمد علی کے نام سے تو تخلص بنایا نہیں جا سکتا مولانا شوکت علی کے نام سے مدد لی ہے۔ یہ عقیدت اس درجہ تھی کہ کافی عرصہ کے بعد میری اور اپنی تصویر امین سلونوی کے رسالہ میں ساتھ ساتھ اس لئے چھپوائی کہ اس کے نیچے علی برادران کے اتباع میں "تھانوی برادران" لکھ سکیں اور عرصہ تک لکھنؤ کے ایک حلقہ احباب میں ہمیں تھانوی برادران ہی کہا جاتا رہا۔ میری شادی ان کی بڑی بہن سے ۱۹۱۷ء میں ہوئی جب یہ ۱۳ برس کے تھے۔ اس جدید رشتے سے برادر عزیز نے فائدہ اٹھا کر اپنی فطری شوخی و شرارت کا استعمال مجھ پر بھی شروع کر دیا اور وہ گل کھلائے کہ مجھے کہنا پڑا "اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی" میں ہی نہیں گھر کا کوئی فرد ماں، باپ، بہن، بھائی خاندان کے قریب و بعید افراد اس کی دلچسپ اور برمحل فقرہ بازی سے محفوظ نہ تھے مگر محظوظ ہوتے تھے۔ ۱۹۱۸ء کا ذکر ہے لکھنؤ میں ایک سکھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سردار بل سنگھ کوتوال شہر تھے۔ ننھے شوکت اپنے ابا کے ساتھ کبھی کبھی ان کے یہاں جاتے اور متحمل بالطبع بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ میں بھی لکھنؤ گیا ہوا تھا۔ عزیز گرامی مجھے دیکھتے ہی باغ و بہار ہو گئے کیونکہ ان کی ذہانتوں کی داد گھر بھر میں میں ہی دیا کرتا تھا۔ بے چین تھے کہ موقع ملے تو کوئی کارنامہ دکھا کر داد لیں کیونکہ یہ داد بیشتر لفظوں کے ساتھ مادی صورتوں میں بھی ہوتی تھی۔ اتفاق سے میری بیوی بالاخانے پر جا کر نہانے لگیں، جب نہا چکیں تو کسی ضرورت سے گلشن خادمہ کو پکارا، بہن کی آواز سن کر بطور سعادت مندی آپ اوپر پہنچ گئے اور وہاں جاتے ہی چیخ چیخ کر مجھے پکارنے لگے۔ بھائی جان! بھائی جان! جلدی آئیے۔ میں گھبرا کر زینہ پر چڑھا کہ نہ معلوم کیا غیر معمولی واقعہ پیش آ گیا۔ دیکھا تو ان کی باجی نے سر کے بالوں کو نچوڑ کر ماتھے کے اوپر جوڑا سا باندھ لیا ہے۔ چادر اوڑھے چوکی پر بیٹھی تنگ مہری والا سورتی شروع گھٹنا دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر پہن رہی تھیں۔ شوکت بولے: "دیکھیے بھائی جان! سردار بل سنگھ برجس پہن رہے ہیں۔" ان کی باجی ہنس کر سوڑ، پاجی، بدمعاش بنانے لگیں اور حضرت ہنستے ہوئے بھاگ گئے۔ ان ہی دنوں کا ذکر ہے، میرے ایک دوست ابو تراب المتخلص بہ طرب مجھے ملنے آئے۔ کہنے لگے اب کے بہت دنوں میں لکھنؤ کی طرف توجہ کی کوئی تازہ غزل سنائیے۔ میں نے بیاض اٹھا کر ایک مطلع پڑھا، وہ کچھ چونک سے پڑے مگر کہا کچھ نہیں۔ میں نے بعد کا شعر پڑھا۔ بولے، ذرا ٹھہریئے یہ غزل آپ نے کب کہی ہے

میں نے کہا دو ہفتے ہوئے۔ کہنے لگے آج چوتھا روز ہے، رشید صدیقی نے ایک مشاعرہ کیا تھا وہاں آپ کے چھوٹے بھائی شوکت نے یہ غزل پڑھی تھی۔ سب نے بہت داد دی کہ اس چھوٹی عمر اور نومشقی میں ایسی منجھی ہوئی غزل کہی ہے۔ میں ہنس کر چپ ہو رہا۔ وہ بھی اصلی بات سمجھ گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے شوکت کو بلا کر سمجھایا کہ میری غزل چرا کر نہیں مانگ کر پڑھا کرو اور خود بھی شعر کہنے کی کوشش کرو۔ پوری غزل نہ ہو سکے تو مجھے بھیج دیا کرو۔ میں مکمل کر دیا کروں گا۔ پھر کچھ دنوں تک ایسا ہی ہوتا رہا جب پوری طرح طبیعت موزوں ہو گئی تو اپنی جولانیٔ طبع کا ثبوت دینے کے لئے ایک بہت ہی دلچسپ حرکت کی۔ میں پانچ چھ ماہ بعد بھوپال سے پھر لکھنؤ گیا۔ راستہ میں کانپور کا اسٹیشن پڑا تو دیکھا کہ ایک انتخابی پروپیگنڈے کا پوسٹر فریقِ مخالف نے دیوار پر سے اتار لیا ہے۔ ایک ٹکڑا کاغذ کا چپکا رہ گیا جس پر یہ الفاظ پڑھے جاتے تھے جو بخطِ جلی تھے "تائید نہیں کرتے" "قیام الدین فرنگی محلی اور حضرت مانی جائسی میرے ہم سفر تھے۔ میں نے دونوں سے کہا جو قافیہ اور ردیف ہے اور دعوتِ فکر دے رہی ہے، کچھ ہو جائے۔ مانی صاحب طویل سفر سے اکتائے ہوئے تھے انھوں نے میری بات سُنی اَن سُنی کر دی۔ مولوی خاندان کے فرنگی محلی بولے۔ آپ ہی طبع آزمائی فرمائیے۔ میرے ساتھ بڑے سائز کی ڈائری تھی اس پر شاعری نہیں قافیہ پیمائی شروع کر دی۔ لکھنؤ پہنچ کر میں نے ڈائری اس میز پر ڈال دی جس پر شوکت تھانوی اپنی ذہنی کاوشوں کو سپردِ قلم کیا کرتے تھے۔ دوسرے دن کچھ احباب ملنے آئے باتوں باتوں میں اس تفریحی غزل کا ذکر آ گیا، میں نے شوکت سے کہا ذرا میری ڈائری اٹھا لاؤ۔ حضرت اندر گئے اور بڑی دیر کے بعد آکر بولے "مجھے نہیں ملتی' بہت تلاش کی" میں جھنجھلا کر اٹھا، اندر گیا تو میز پر ڈائری بند پڑی تھی لے کر واپس آیا، دیکھا تو برادرِ عزیز غائب۔ میں ذرا ڈانٹنا چاہتا تھا۔ سمجھا اسی ڈر سے غائب ہو گئے ہیں۔ ڈائری کھولی تو اور بھی گل کھلا ہوا نظر آیا۔ پوری غزل کے پہلے مصرعوں پر چٹ لگی ہوئی تھی اور میرے مصرع ہائے ثانی پر اور بھی مصرعے بہم پہنچائے گئے تھے۔ ۸، ۹ شعر تھے، سب تو یاد نہیں دو شعروں کی درگت یہ ہے۔ اصل مطلع تھا۔

ہم ذوقِ نظر تیری تائید نہیں کرتے
اس درجہ بھی کورانہ تقلید نہیں کرتے

اب وہ اس طرح ہو گیا تھا۔

ہم روزے تو رکھتے ہیں پر عید نہیں کرتے
اس درجہ بھی کورانہ تقلید نہیں کرتے

دوسرا شعر تھا۔

ہم اہلِ وفا کو تم الزام دیے جاؤ
ہے پاسِ ادب مانع تردید نہیں کرتے

شوکت نے بہت ہی واہیات مگر دلچسپ مصرع لگایا۔

ہم گھاس تو کھاتے ہیں پر عید نہیں کرتے
ہے پاسِ ادب مانع تردید نہیں کرتے

اس کے بعد شوکت برائے تخلص نہیں بلکہ سچ مچ سخن گو ہو گئے اور مشاعروں میں دھڑلے سے جانے لگے۔ پھر بھی کبھی کبھی مجھ سے رجوع کرتے تھے۔ ایک بار جبکہ میں ریاست بھوپال کے ایک بعید علاقہ میں تحصیلدار تھا، لکھنؤ سے آئے۔ چلتے وقت کہنے لگے، علیگڈھ کے مشاعرہ میں جا رہا ہوں۔ پریشانی دیکھتا ہوں، گمنامی دیکھتا ہوں، ردیف و قافیہ ہے مگر عنوان دیکھتا ہوں نہیں بندھتا میں نے ذرا تامل کے بعد کہا، یہ شعر کیسا رہے گا ؎

پڑھا ہے میں نے ہر افسانۂ عشق
تمھی کو زیبِ عنواں دیکھتا ہوں

پسند کر کے اپنی بیاض میں ٹانک لیا پھر کہا میری ایک اور غزل ہے:۔

حجاب حسن کی توہین ہے حجاب نہ کر

"اس میں 'خواب نہ کر' بھی ہونا چاہیئے" میں نے کہا "تمہارے رنگ سے ملتا ہوا نہیں ہے، چاہو تو لکھ لو ؎

مجھے اذیتِ بیداریٔ دوام نہ دے
دکھا دکھا کے مجھے اہتمامِ خواب نہ کر"

کہنے لگے "بہر صورت قافیہ تو آگیا" یہ تو شوکت کی ابتدائی مشق کی باتیں ہیں، پھر تو اس نے اتنی غزلیں کہیں کہ چند سال بعد ہی دیوان مکمل کر لیا جو بعد میں "گہرستان" کے نام سے چھپ کر شائع بھی ہو گیا۔ اگرچہ شاعری میں اسے کوئی امتیازی مقام حاصل نہیں ہے، پھر بھی ایک خاص انداز اس کا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ایک عظیم الشان نمائش ہوئی، نواب چھتاری کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ خان بہادر حبیب الدین کلکٹر یا ڈپٹی کلکٹر اس کے باضابطہ سیکرٹری تھے مگر اس کے تمام فرائض شوکت انجام دے رہے تھے میں بھی مشاعرہ میں بلایا گیا تھا۔ شوکت کی دن رات کی مصروفیت دیکھ کر میں بھی ہاتھ بٹانے لگا۔ شوکت نے مجھ سے کہا "غالب کا مصرع دے دیا ہے ع ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں۔ مجھے فرصت نہیں مل رہی ہے جو سکون سے بیٹھ کر غزل کہوں آپ ہی میرے لیے غزل کہہ دیجیے۔ میں نے کہا، میری کہی ہوئی غزل کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ شوکت نے کچھ سوچا، پھر کہا، "اچھا 'طور' کا قافیہ تو موزوں کیجیے" میں نے کچھ سوچا پھر کہا، سنو ؎

جلوہ یوں عام ہو تیرا مجھے منظور نہیں
میری دنیا میں کہیں برق نہیں طور نہیں

شوکت نے اتنی دیر میں خود بھی مطلع کر لیا تھا۔ کہنے لگا میں نے اس طرح سوچا ہے ؎

بے حجابی ہی تری بزم کا دستور نہیں
ورنہ وہ کونسا ذرہ ہے جو خود طور نہیں

میں نے ہنس کر کہا جس طرح مشرق 'مشرق' ہے اور مغرب 'مغرب'! اسی طرح تھانہ بھون 'تھانہ بھون' ہے اور لکھنؤ 'لکھنؤ'۔ تم اپنی غزل خود کہو اور میں اپنی غزل آپ۔ شوکت نے کہا، ٹھیک ہے! اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ! حقیقت یہ ہے کہ اپنے آپ کو موزوں طبع تو سمجھتا ہوں مگر شاعر نہیں، یہی رائے میری شوکت کے متعلق بھی ہے۔ آخر میں شوکت بھی اسی نتیجہ پر پہنچ گیا تھا اور سنجیدہ بیانی

چھوڑ کر مزاحیہ شعر موزوں کرنے لگا تھا۔ "اقبالِ جرم" کے عنوان سے ایک اچھا شیرازہ کلام اس نے مجھے چند سال پہلے دکھایا تھا جس میں ڈاکٹر اقبال کے اشعار کی بہت ہی دلچسپ پیروڈی کی گئی تھی۔ وہ درحقیقت صاحبِ طرز نثر نگار تھا اور اتنا تیزی سے لکھتا تھا کہ میں اس کی حاضر دماغی پر حیران رہ جاتا تھا۔ لکھنؤ کے جس مشاعرہ کا میں نے ذکر کیا ہے اسی کے ساتھ دو دن کے وقفہ سے الہ آباد اکیڈمی کے اجلاس بھی منعقد ہوئے۔ شوکت کو اس میں "لکھنؤ" پر ایک مقالہ پڑھنا تھا مشاعرہ میں ہر حصہ ملک سے آنے والے شعراء کی تعداد کافی تھی اور شوکت ہر وقت ان میں گھرے رہتے تھے۔ روزِ مقررہ پر جلسے کا آغاز ۹ بجے ہونے والا تھا۔ میں سویرے اٹھا، ضروریات سے فارغ ہوا، ناشتہ کرنے بیٹھا تو شوکت کو آواز دی۔ شوکت کی دلہن نے کہا "کئی راتوں کے جاگے ہوئے تھے، غافل سو رہے ہیں۔" میں نے جاکر جھنجھوڑا کہ تمہیں مقالہ پڑھنا ہے، اکیڈمی کا جلسہ شروع ہونے والا ہے، جلدی سے اٹھو۔ وہ اٹھا تو سہی مگر میرے ساتھ چلنے کو تیار نہ ہوا۔ کہنے لگا "آپ ناشتہ کرکے جائیے مجھے ابھی شیو کرنا، نہانا اور مقالہ لکھنا ہے۔" میں نے بڑی حیرانی سے کہا، "مقالہ اب تیار کروگے اور وہ بھی دوسری ضروریات کی تکمیل کے بعد۔" بڑی بے پروائی سے شوکت نے جواب دیا۔ "آپ بے فکری سے جائیے، میرا نمبر دو مقررین کے بعد ہے۔ اتنی فرصت مجھے کافی ہے" اور باتھ روم چلا گیا۔ میں ناشتے سے فارغ ہوکر ٹہلتا ہوا وکٹوریہ پارک چلا آیا جہاں اکیڈمی کا جلسہ وقتِ مقررہ پر شروع ہوگیا۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ گزرا ہوگا، دوسرے مقرر مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی عالمانہ تقریر ختم ہو چلی، میں گھبرا گھبرا کر بار بار پیچھے نظریں دوڑاتا تھا کہ شوکت آئے یا نہیں۔ دل میں مایوس تھا کہ اپنی باری پر وہ نہ آسکیں گے بعد از وقت آکر کوئی مزیدار عذر پیش کردیں گے مولانا عبدالماجد جیسے ہی ڈائس سے اترے اور شوکت بڑے اطمینان سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ نام پکارا گیا اور شوکت نے اپنی بہت ہی پُرلطف تقریر پڑھنا شروع کی جس میں بیرونی حضرات کے ان تصورات کو طنز و مزاح کا رنگ دے کر پیش کیا گیا جو قدیم لکھنؤ کی مبالغہ آمیز روایات پر مبنی تھے۔ شوکت کو بہت ہی پسند کیا گیا اور کئی روز تک تعریف ہوتی رہی۔ اگر میں کہتا کہ اس مقالہ کی جو فکاہی بھی ہے اور تاریخی بھی، ایسی رواروی اور کم وقت میں تکمیل کی گئی ہے تو کوئی یقین نہ کرتا۔ میں نے واپس گھر جاکر اس کی مزید تصدیق بلکہ تحقیقات کی کہ پہلے کوئی یادداشت یا ابتدائی حصہ اس کا لکھا ہوا رکھا تھا تو معلوم ہوا مطلق نہیں۔ انشاء اللہ خاں کے قلم کو شکوہ تھا جس کو انہوں نے وہی کانوں سے سُن کر کہا ؎

کہتا ہے یہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں
بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے

مگر شوکت کا قلم پوری تیزی کے ساتھ اس کے خیالات کا ساتھ دیتا تھا۔ عموماً لوگوں کی زبانِ قلم کچھ اور رہتی ہے اور زبانِ ذہن کچھ اور مگر شوکت کی دونوں زبانیں ایک تھیں، اس کے قلبی و ذہنی احساسات کی ترجمانی پوری بے ساختگی کے ساتھ اس کی زبان کرتی۔ اسے اپنی نسبت اہلِ زبان ہونے کا بھی یقین تھا گو وہ اس کا اظہار کبھی صراحتاً نہیں کرتا تھا اور نو عمری ہی سے اس پر اپنی باجی سے چونچم چونچا کرتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ ایک نئے رنگ کی شیروانی بنوائی۔ خوش پوشی کا ذوق ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہا اور ساتھ شوقِ نمائش بھی مگر تنک مایانہ انداز میں نہیں۔ نئی شیروانی پہن کر اپنی چھب دکھانے بڑی بہن کے پاس آئے اور کہا "باجی دیکھو دھانی شیروانی!" باجی نے گرفت کی "دھانی چوڑیاں سب کہتے ہیں، دھانی شیروانی تم سے ہی سنا ہے۔" شوکت نے کہا "باجی! آپ اب زیادہ تر بھوپال میں رہتی ہیں۔ لکھنؤ میں مستقل رہنے والوں کی زبان پر آپ اعتراض نہیں کرسکتیں۔ بھائی جان اہلِ زبان تو نہیں مگر زبان داں ضرور ہیں ان سے پوچھ لیجئے میں نے دھانی کا صحیح استعمال

کیا ہے یا غلط' آکی ہتک ہو چکی تھیں وہ میری اہمیت اپنے مقابلہ میں کیسے مان لیتیں۔ کہنے لگیں تمہارے بھائی جان کچھ ہی پہلے بڑھے خود ہی کہہ دیتے ہیں 'میرا بچپن شہر میرٹھ' آس پاس کے قصبات 'مظفر نگر' تھانہ بھون' پھیرولی اور کچھ دہلی میں گزرا ہے' کتابیں پڑھ کر شین قاف درست کر لیا ہے۔ تمہارے شعر وعر درست کرتے رہتے ہیں' تم ہی ان کی دھاک مانو۔ میں دور بیٹھا بہن بھائی کی باتیں سن رہا تھا' اپنی توہین کا بدلہ لینے فوراً بڑھا اور شوکت سے کہا' ملبوسات کو بھی ان کے رنگ کی مناسبت سے دھانی کہا جاتا ہے۔ میری بیوی بولیں بھیرنیل میں! کیا پیارے نام کی بستی ہے۔ میں نے کہا' نہیں جناب لکھنؤ اور اس لکھنؤ میں جو خالص شاہی لکھنؤ تھا اور امانت نے اندر سبھا لکھی تھی۔ سبز پری کہتی ہے ؎

معمور ہوں شوخی سے شرارت سے بھری ہوں
دھانی مری پوشاک ہے میں سبز پری ہوں

شوکت نے یہ شعر سن کر اصل بات کا رخ تفریح کی طرف پھیر دیا اور شیروانی پر ہاتھ پھیر پھیر کر گانا شروع کر دیا ؎

معمور ہوں شوخی سے شرارت سے بھرا ہوں
دھانی مری پوشاک ہے میں سبز پرا ہوں!

پری سے پرا تو شوکت نے نوعمری میں بنایا تھا' ایسی تانیث سے تذکیر کا قیاسی لفظ ساٹھ برس کی عمر میں بنایا۔ گڑھی میں شوکت کے نئے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے میں نے نوکر لڑکے کو آواز دی "کڑیے، کڑیے!" زہرہ بیگم' شوکت کی پنجابی دلہن نے کمرہ سے نکل کر پوچھا بھائی جان آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ "لڑکے سے چائے بنانے کو کہتا تھا" شوکت سمجھ گئے کہ میری مراد کیا تھی' ہنس کر کہنے لگے 'کڑی' پنجابی میں لڑکی کو ضرور کہتے ہیں مگر لڑکے کو 'کڑا' نہیں 'منڈا' کہتے ہیں۔ شوکت کی ادبی دیانت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ میری نوشتہ کہانیوں' غزلوں وغیرہ کے اپنے نام سے شائع ہونے کا اظہار اپنی کتابوں اور مضمونوں میں بار بار کیا ہے۔ اگر وہ اس جرأت اخلاق سے کام نہ لیتا تو میں بھی اس مضمون میں ان کو حذف کر دیتا۔ جب اس کی صلاحیت پورے طور پہ ابھر آئی تو بڑے بڑے ادبی لطیفے نظم اور نثر دونوں میں اس سے سرزد ہوئے۔ ایک بار خواجہ عزیز الحسن جو بر بنائے نیک نفسی ڈپٹی کلکٹری کرتے کرتے کوشش کر کے انسپکٹر آف اسکولس کے عہدہ پر منتقل ہوئے اور خان بہادر ہونے پر کبھی اس خطاب کا استعمال اپنے نام کے ساتھ جائز نہ رکھا' وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ مشاعرہ میں غزل پڑھنے بیٹھے' مجذوب تخلص کرتے تھے اور بڑی وارفتگی کے عالم میں غزل پڑھتے تھے۔ اہل محفل ہمہ تن گوش تھے۔ مجذوب صاحب نے مطلع پڑھا ؎

کیا سے کیا تو نے یہ اے شوقِ فراواں کر دیا
پہلے جاں پھر جانِ جاں پھر جانِ جاناں کر دیا

یہ سن کر شوکت سے ضبط نہ ہو سکا۔ خواجہ صاحب کو روک کر کہنے لگے پہلے میرا مطلع سن لیجئے۔ حاضرین مجلس نے بہت کچھ کہا کہ غزل پوری کر لینے دیجئے پھر آپ ارشاد فرمائیے مگر شوکت کہاں ماننے والے تھے' آخر اجازت مل گئی تو پہلے آپ نے خواجہ صاحب کا مطلع دہرایا اور مصرعہ ثانی پہ زور دیا کہ پہلے جاں' پھر جانِ جاں' پھر جانِ جاناں کر دیا اور کہا میں عرض کرتا ہوں ؎

کیا سے کیا بیرم کو اکبر تو نے ہاں ہاں کر دیا   پہلے خاں پھر خانِ خاں' پھر خانِ خاناں کر دیا

یہ سن کر محفل قہقہوں سے گونج اٹھی۔ مجذوب صاحب کے مصرعِ ثانی کے نچلے نقطے اوپر کر دیے تھے۔ شوکت پر اس کے جاننے والے بمشکل ہی چوٹ کرنے کی جرأت کرتے تھے مگر بعض برخود غلط حضرات جب اس کے منہ آتے تو وہ ازراہِ مروت جواب دینے سے گریز کرتا کہ ؎

جوابِ جاہلاں باشد خموشی

مگر جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا تو شوکت کا جوابی جملہ بڑے سے بڑے غماز کا بیڑا غرق کر دیتا۔ اس کی ماموں زاد بہن کی شادی تھی، ماموں صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ خود شوکت بھی سایۂ پدری سے محروم ہونے کے بعد گھر کے ذمہ دار فرد قرار پا گئے۔ ساتھ پلی ہوئی انوار جہاں (ماموں زاد بہن) کی شادی کا اہتمام کر رہے تھے۔ دو اک چلبلی طبیعت کے نوجوانوں نے انعقادِ نکاح کے وقت پُر معنی مسکراہٹ کے ساتھ فرداً فرداً سوال کیا، "کیوں صاحب! یہ لڑکی جس کی شادی ہو رہی ہے آپ کی بہن ہے؟" شوکت نے ذرا بلند آواز سے جواب دیا۔ "آپ کو ناحق تعجب ہو رہا ہے، ہم لوگ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی شادی ہی کیا کرتے ہیں۔" چٹکیاں لینے والے حضرات کو جیسے سانپ سونگھ گیا، گردنیں جھکا کر رہ گئے۔ ایک صاحب جو برات میں آئے تھے اور دولہا کے عزیز تھے بار بار شوکت پر بھونڈے بھونڈے فقرے کس رہے تھے، بالکل سیاہ فام اور چوڑے چکلے آدمی تھے۔ شوکت سنتے اور ہنستے رہے۔ جب وہ ادھر اُدھر ٹہلتے ہوئے قابلِ لحاظ شخصیتوں کے درمیان آ کر بیٹھے تو شوکت بڑے مہذب انداز میں ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور پوری سنجیدگی سے ہاتھ جوڑ کر ان سے کہا۔ "میری ایک بہت ہی مؤدبانہ درخواست ہے۔" وہ اور بعض دوسرے اصحاب سمجھے کہ یہ ان سے اپنے اوپر فقرہ بازی نہ کرنے کو کہیں گے۔ ان سیاہ فام صاحب نے اپنے آپ کو کامیاب سمجھ کر بڑی خندہ پیشانی سے کہا "فرمائیے کیا ارشاد ہے؟" شوکت نے اور عاجزانہ انداز بنا کر کہا "جب آپ وفات پانے لگیں تو مجھے اطلاع دے دیجیے گا۔ میں آپ کی کھال کا سوٹ کیس بنواؤں گا۔" یہ سنتے ہی قہقہوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ہر شخص ان کی طرف دیکھتا اور ہنستا تھا۔ ان حضرت پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شوکت کے والد اور والدہ اپنے عقیدوں کے تحت عورتوں کے پردے کے شدید پابند تھے، ایسے کہ جب میں خاتونِ ارشد (ان کی صاحبزادی) کو لکھنؤ سے لے کر بھوپال جاتا اور جھانسی میں گاڑی تبدیل ہوتی تو چچا جان ریلوے سٹیشن کے سب انسپکٹر کو تار دے کر پلیٹ فارم کے ایک طرف سے دوسری طرف جانے کے لیے ڈولی کا انتظام کرا دیتے۔ میں نے پھر بھی حضرت گنج لکھنؤ کی انگریزی دکان میں جا کر اپنا، ان کا، شوکت کا، اس کی چھوٹی بہنوں کا یکجائی فوٹو گروپ تیار کرا لیا۔ شوکت تو گھریلو معاملات میں میرے قدم بقدم چلا کرتے تھے۔ جب ان کی شادی ہوئی تو انہوں نے بھی یہی جرأتِ رندانہ کی۔ میرا واقعہ تو کھل چکا تھا مگر انہوں نے فوٹو احتیاط سے رکھے، میں لکھنؤ گیا تو مجھے خوش ہو کر دکھائے۔ میں نے ایک فوٹو لے کر اپنے بکس میں رکھ لیا۔ اس زمانہ میں شوکت میرے ایک دوست کے خلاف مقامی رسائل اور اخبارات میں مضامین لکھ رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے شکایت کی، میں نے تنہائی میں شوکت کو سمجھایا اور باز رکھنے کی کوشش کی۔ جواب ملا کہ "بھائی جان آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر مگر میری شخصی ذمہ داریاں بھی کچھ ہیں، یہ فرض تو بہر صورت مجھے انجام دینا ہی پڑے گا۔" مجھے بھی ایک ترکیب سوجھی۔ چچا جان ان دنوں بھوپال گئے ہوئے تھے اور سر لیاقت علی کے یہاں مقیم تھے۔ میں نے شوکت سے پوچھا، "چوک کے ڈاکخانہ میں کتنے بجے تک رجسٹری لی جاتی ہے؟" کہنے لگے "وقت ختم ہو گیا، کیا آپ کو کوئی رجسٹری کرنا ہے؟" میں نے کہا "ہاں! — سر لیاقت علی کو تمہارا اور شوکت دلہن کا فوٹو بھیجنا ہے کہ مبارک ہو۔ آپ کے آزاد خیال بھتیجے نے اپنی دلہن کے ساتھ فوٹو لیا ہے" یہ سنتے ہی شوکت گھبرا گیا۔ وہ جب سے خودکشی کی دھمکی کے نتیجہ میں بھرے ہوئے ریوالور کو کنپٹی سے مس کرا چکے تھے، باوجود تنہائی

شفقتوں کے اپنے ابا سے بہت ڈرنے لگے تھے۔ پہلے تو مذاق سمجھے، جب میں نے سنجیدگی برتی تو کہنے لگے۔ لیاقت علی خود بھی پردہ کے سخت حامی ہیں یہ فوٹو وہ ابا کو دیں گے اور ابا مشتعل ہو کر یہاں آتے ہی میرے گولی مار دیں گے۔ میں نے روکھے پن سے جواب دیا۔ چچا جان کے احساساتِ خاندانی اور ایقانِ دینی کی حفاظت کرنا میری بھی شخصی ذمہ داری ہے۔ یہ فرض تو بہر حال ادا کرنا ہی پڑے گا۔ شوکت سمجھ گئے یہ میری نافرمانی کا علاج ہے۔ کچھ ہار مانتے ہوئے بولے، میں آپ کے دوست کی مخالفت میں کچھ نہ لکھوں گا۔ قسم کھاتا ہوں، پھر تو آپ مسٹر لیاقت علی کو رجسٹری نہ کریں گے۔ چنانچہ معاملہ طے ہو گیا لیکن شوکت نے میری زیادتی کا انتقام کئی برس بعد اس طرح لیا کہ ایک بار میں، بیوی، بچوں کو لکھنؤ پہنچا کر بھوپال واپس آ رہا تھا، شوکت اور ان کے ماموں زاد بھائی محمد اسلم و محمد اکرم اور میرے بعض اعزا مجھے پہنچانے اسٹیشن آئے، قلی نے سامان گاڑی میں رکھا، میں پلیٹ فارم پر ان لوگوں سے باتوں میں مشغول تھا، شوکت ڈبہ میں میرا سامان رکھوا رہے تھے وہاں ایک مردِ معقول اور بیٹھے تھے شوکت نے ان سے کچھ کھسر پھسر کی اور جب میں ٹرین میں سوار ہوا تو بستر کھول کر بچھایا کیونکہ رات کے ۱۰ بجے تھے۔ پھر یہ کہہ کر میرے جوتے کے تسمے کھولنے لگے کہ آرام سے لیٹ کر سو جائیے۔ میں نے کہا بھی کہ یہ سعادت مندی کیوں فرمائی جا رہی ہے۔ بڑی معصومیت سے باتیں کہہ کے رخصت ہو گئے۔ جب ٹرین چلی اور میں نے پان کھانے کو ڈبیہ کھولی تو ایک گلوری ان ہم سفر کو بھی پیش کی۔ انھوں نے سر کو پیچھے ہٹاتے ہوئے بولے نہیں نہیں میں پان نہیں کھاتا، حالانکہ ان کے سرخ ہونٹ ان کے پان خور ہونے کی گواہی دے رہے تھے۔ میں اس زمانہ میں سگریٹ بھی پیتا تھا تھوڑی دیر بعد میں نے سگریٹ کیس ان کی طرف بڑھایا کچھ بوکھلاتے ہوئے لہجہ میں اس سے بھی انکار کیا۔ دو اک باتیں کیں تو کچھ مہمل سے جواب دے کر اور سرک کر بیٹھ گئے۔ میں یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ وہمی سے آدمی ہیں۔ جب گاڑی کانپور کے قریب گنگا کے پل پر پہنچی تو میں یہ دیکھنے کو اٹھا کہ چاندنی میں سطحِ آب پر کیا دلچسپ منظر ہے، تو وہ صاحب کھڑکی کے آگے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے۔ آرام سے بیٹھے رہیے، جھانکیے نہیں۔ اب تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ صاحب ضرور سنکے ہوئے ہیں۔ میں نے ڈانٹ کر کہا بھی کہ آپ کوئی خدائی فوجدار ہیں مگر وہ مزاحم بنے رہے اور عاجزانہ درخواست کرتے رہے کہ کھڑکی سے سر نہ نکالیے۔ میں یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ فاتر العقل معلوم ہوتا ہے، کہیں الجھ نہ پڑے۔ اور گاڑی کانپور اسٹیشن پر رک کر آگے روانہ ہو گئی۔ میں سو گیا۔ ٹرین لیٹ ہو گئی تھی، جھانسی پہنچنے سے پہلے ہی دن نکل آیا۔ ایک صاحب کسی درمیانی اسٹیشن سے سوار ہوئے اور پچھلی سیٹ پر دراز ہو گئے تھے، صبح ہوتے ہی وہ اٹھے، میں بھی بیدار ہو گیا تھا۔ مجھے بیٹھا دیکھ کر وہ صاحب بڑے تپاک سے بڑھے اور السلام علیکم کہہ کر بولے، تحصیلدار صاحب آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟ یہ صاحب سید افسر علی اکسائز انسپکٹر تھے اور میرے ملاقاتی تھے۔ میں نے بتایا کہ بیوی بچوں کو پہنچانے ایک ہفتہ کی رخصت پر لکھنؤ گیا تھا۔ وہ مردِ معقول جن کا رویہ مجھ سے بہت نامعقول تھا حیران ہو کر ہماری باتیں سننے لگے، پھر معذرت آمیز لہجے میں کہنے لگے، صاحب معلوم ہوتا ہے مجھے بیوقوف بنایا گیا تھا۔ یہ صاحب جو لکھنؤ اسٹیشن پر بہت ہی ادب و احترام سے پیش آ رہے تھے وہ کون تھے؟ میں نے کہا ”شوکت تھانوی!“ بے ساختہ کہہ اٹھے، ارے! کیوں نہ ہو، شوکت تھانوی، شوکت تھانوی جو ٹھہرے۔ جناب کا اسم گرامی؟ میں نے کہا، ارشد تھانوی! کہنے لگے وہ تو آپ کے چھوٹے بھائی ہیں؟ میں نے کہا، جی ہاں! عم زاد، مزید برآں سالے بھی۔ سن کر ہنسے اور بتایا کہ آپ کے سوار ہونے سے پہلے انھوں نے مجھ سے بڑے نیاز مندانہ لہجہ میں کہا تھا کہ آپ اگر دور تک جا رہے ہوں تو ان کا خیال رکھیے گا۔ یہ میرے بڑے بھائی تھے!

اچھے تعلیم یافتہ بہترین ادبی و شعری ذوق کے مالک، مگر دو سال سے دماغی خلل میں مبتلا تھے، علاج معالجے سے افاقہ تو ہو گیا ہے مگر اچھے خاصے موضوع پہ بات کرتے کرتے شخص مخاطب کے اس زور سے چانٹا مار دیتے ہیں کہ وہ بیچارہ گال سہلاتا رہ جاتا ہے۔ اسی سلسلے میں آپ کی مخاطبت اور تواضع سے بچ رہا تھا۔ ان حضرت نے یہ بھی کہا تھا کہ کسی دریا، ندی، نالے پر جھانکنے نہ دینا۔ اندیشہ ہے کہ اس میں کود نہ پڑیں۔ اگر آپ نے روک تھام نہ کی تو ان کی جان کا مواخذہ آپ پر ہوگا۔ میں نے کہا، شوکت نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ آپ کی نظر میں مجھے اور میری نظر میں آپ کو پاگل بنایا۔ میں نے گھر پہنچ کر بازی بازی باریش بابا ہم بازی کے عنوان سے یہ قصہ سرپنچ میں چھپوا دیا کہ عزیز از جان اس میں گل بوٹے لگا کر موضوعِ سخن نہ بنائیں مگر وہ کہاں باز آنے والے تھے ہندوستان سے لے کر پاکستان تک اپنے اور میرے احباب میں ایک دلچسپ داستان بنا کر مدتوں دہراتے رہے۔ میں تو خیر ان کا بڑا بھائی ہوں، جان چھڑکنے والی ماں بھی ان کی زبانِ ظرافت ترجمان سے نہ بچ سکتی تھی۔ شوکت کا ایک چھوٹا بھائی تھا شفیق احمد، وہ ایک مستقل عارضۂ جسمانی میں مبتلا تھا، اس لیے سب اور خاص طور پر چچی جان مامتا سے مجبور ہو کر حدِ انتہا اس کی ناز برداری کرتی تھیں۔ چچا جان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد میں لکھنؤ گیا تو چچی جان نے مجھ سے کہا کہ شوکت اس معذور بھائی سے بہت نفور رہتا ہے تم ذرا اس کو سمجھا دو۔ میں نے کہا آپ کسی وقت میری موجودگی میں اس کو فہمائش کیجیے، پھر میں اس میں دخل انداز ہو کر اسے اچھی طرح سمجھا دوں گا۔ انہوں نے اس پر عمل کیا اور کمرہ میں بیٹھ کر اسے سمجھانے لگیں۔ میں دالان میں تھا۔ چچی جان شوکت سے کہہ رہی تھیں، بھیا یہ تو تمہارا بھائی نہیں بیٹا ہے۔ میں اندر بڑھا، مجھے آتے دیکھ کر شوکت نے چچی جان سے کہا۔ اماں! شفیق کو آپ میرا بیٹا کہہ رہی ہیں، آپ کا میرا یہ رشتہ مناسب نہیں۔ چچی جان بیچاری اس کا مفہوم نہیں سمجھیں، میں نے کہا بدمعاش! اماں سے بھی مذاق سے باز نہیں آتا۔ جواب میں ایک پیاری مسکراہٹ تھی۔ ایک بار لکھنؤ کے ریلوے انسٹیٹیوٹ میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا۔ بھوپال سے میں اور تربینی سرن شاد جج ہائیکورٹ بھی مدعو تھے۔ کانپور کے ایک ممتاز و ذی علم تاجر اس کے صدر تھے شوکت تو عموماً مشاعروں کے اناؤنسر لازمی طور پر ہوا کرتے ہیں وہ سیکرٹری شپ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اگلے صوفوں پر خواتین کی نشست تھی، ان میں شوکت کی دلہن بھی تھیں جو گھر سے میرے اور شوکت کے ساتھ گئی تھیں۔ کافی وقت گزرنے پر ایک ایک دو دو کر کے سب بیگمات چلی گئیں، شوکت کی دلہن اس لیے بیٹھی رہیں کہ ہمارے ساتھ گھر آئیں۔ صدرِ مشاعرہ نے شوکت سے کہا، یہ ایک بیچاری بہت دیر سے اکیلی بیٹھی ہیں۔ شوکت نے کہا، کہیے تو آپ کے پاس لا کر بٹھا دوں۔ صدر صاحب نے پوچھا، یہ ہیں کون؟ شوکت نے بڑی سادگی سے جواب دیا، میری بیوی ہیں۔ جناب صدر کچھ جھینپ کر رہ گئے۔ ان کا نام یاد نہیں، شاید حلیم تھا یا صدیق، شوکت کی یہ بیوی ایک محترم عزیز عالم باعمل کی بیٹی ہیں۔ بعض رکاوٹوں کی وجہ سے میں ان کی شادی کی تقریب میں شریک نہ ہوا تھا، بعد میں لکھنؤ پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مسٹر شوکت تھانوی مولوی محمد عمر بنے ہوئے ہیں اور پانچوں وقت کی نماز پوری پابندی سے پڑھتے ہیں۔ سعیدہ خاتون فرائضِ مذہبی کی پوری پابندی کرتی ہیں۔ سسرال میں آتے ہی اپنے شوہر کو بھی پکا نمازی بنا لیا۔ میں نے شوکت سے کہا، تم نے یہ کیا غضب کیا کہ حضرت عمر فاروق کی آنکھیں حضرت صدیق اکبر کے سامنے نیچی کر دیں۔ حضرت ابوبکر نے عالمِ ارواح میں حضرت عمر سے کہا کہ تمہارے ہم نام پوتے عمر بن صدیق نے خدا کے حکم سے نماز نہ پڑھی، رسولِ کریمؐ کے ارشاد کی تعمیل میں نماز کی پابندی نہ کی۔ والدین، بزرگوں، استادوں کی ترغیب پر ادائے نماز پر آمادہ

نہ ہوا، ایسے سخت تارک الصلوٰۃ کو میری پوتی سعیدہ نے نمازی بنا دیا۔ تم کو چاہیے تھا کہ بیوی کے دباؤ میں آکر خود تو کیا نماز پڑھتے خود بیوی کو بھی تارک الصلوٰۃ بنا دیتے۔ بعد میں چاہے توبہ استغفار کر کے ولی کامل بن جاتے۔ اس وقت تو یہ بات آئی گئی ہو گئی مگر ۳۱، ۳۲ برس بعد شوکت نے بہت ہی پُر لطف طریقہ پر اس کا اعادہ مسٹر معین الدین کی کوٹھی پر کراچی میں کیا۔ پُر تکلف ڈنر اور مشاعرے کے جب سب ہی مراحل طے ہو گئے تو شوکت نے لکھنؤ کی روضہ والی عورتوں کی نقل ان ہی کے لہجہ میں کی جو قلمی تصویروں کی کتاب کے ورق الٹتی ہوئی کہتی جاتی تھیں "یہ بی بی فاطمہ کا لوٹا ہے جس سے وہ وضو کیا کرتی تھی، یہ اس عورت کی تصویر ہے جس نے اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر غیر بچے کو دودھ پلایا۔ اب دو سانپ اس کا دودھ پی رہے ہیں وغیرہ وغیرہ" شوکت نے یہ سب دہراتے ہوئے کہا" اور یہ سید محمد جعفری کی تصویر ہے جس نے خدا کے حکم سے نماز پڑھی نہ رسولؐ کے حکم سے نہ ماں باپ کے حکم سے مگر بیوی کے حکم سے بلا چون و چرا نماز پڑھنے لگے۔ قیامت کے روز ایک تو ان کے ماتھے پر سجدوں سے پڑا ہوا گٹا چمکے گا، دوسرے جگنو کی دم۔" اس آخری فقرہ پر ساری محفل کشتِ زعفران بن گئی۔ مدتوں پہلے کی وہ باتیں جو میں بطور مزاح کہتا تھا شوکت اپنے لطیف اضافوں سے کہیں کا کہیں پہنچاتا رہا۔ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے ریاست بھوپال کے ایک دور افتادہ سب ڈویژن میں بحیثیت تحصیلدار، منصف و مجسٹریٹ پرگنہ میں تعینات تھا۔ نو عمر شوکت وہاں گئے۔ میرا مستقر "بیگلون" نام کی بستی میں تھا۔ وہاں سے ریلوے اسٹیشن 'باموره'، کا فاصلہ دس بارہ میل تھا۔ سڑک خام، بیل گاڑی میں آتے جاتے تھے۔ شوکت نے واپسی کا قصد کیا اور کہا لکھنؤ جانے والی ٹرین شام کو چار بجے جاتی ہے۔ میں ابھی سے باموره چلا جاؤں۔ ان کی باجی نے کہا دوپہر ہو چلا ہے، دھوپ کی تیزی میں نہ جاؤ۔ میں نے کہا، شام کو جانا۔ اسٹیشن ماسٹر میرے ملاقاتی ہیں وہ پلیٹ فارم پر ہی تمہارے پلنگ بچھوا دیں گے۔ رات کو آرام سے سونا سویرے تمہاری گاڑی ملے گی۔ ضروریات سے فارغ ہو کر چلے جانا ناشتہ کے ساتھ تازہ چائے بھی وہی پلا دیں گے۔ چھوٹا اسٹیشن ہے وہاں چائے وغیرہ نہیں ملتی۔ شوکت بولے تو باجی بھی ساتھ چلیں۔ اگر اسٹیشن پر مجھے نیند نہ آئی تو وہ کہانیاں سنا کر مجھے سلا دیں گی۔ میں نے کہا، کاش لوا جعفری خانم باموره کی اسٹیشن ماسٹر ہوتیں تو ہمارے بھیا کو بہت آرام ملتا۔ اٹھنے میں بھیا کو دیر ہوتی تو اپنے ممدوے (محمد عمر) کے لیے وہ آتی ہوئی ٹرین کو بہت دیر روکے رکھتیں۔ اس پر سب جعفری خانم کی اسٹیشن ماسٹری، ان کے انتظامات پر بہت مضحکہ آمیز گفتگو کر کے ہنستے رہے۔ یہ باتیں شوکت کے حافظہ میں مدت تک محفوظ رہیں اور ایک وقت ایسا آیا، لاہور کے ایک رسالہ میں 'سودیشی ریل'، کے عنوان سے ایک بہت ہی پھڑکتا ہوا مضمون شائع ہوا جو بہت ہی مقبول ہوا۔ مولوی محمد عثمان صاحب نے جو شوکت کے قریبی رشتہ سے خالہ زاد بھائی اور شوکت دلہن کے چچا تھے، چودھری سر ظفر اللہ سے ملایا۔ چودھری صاحب ان دنوں وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے۔ انہوں نے شوکت کے اس مضمون کو سرکاری حلقے میں موضوعِ سخن بنایا۔ سیاسی نقطۂ نظر سے اس وقت کی غیر ملکی حکومت کے لیے یہ مضمون بہت کارآمد تھا۔ شوکت کو ایک معقول معاوضہ دیا گیا۔ نظر ثانی اور کچھ اضافے کے بعد کتابی صورت میں اس کی اشاعت ہوئی، انگریزی میں ترجمہ ہو کر لندن میں شائع ہوا۔ یہاں ایک اور لطیفہ یاد آگیا۔ جعفری خانم ہماری بچی کی مزاج داں اور موقع شناس ماما تھی اور بتدریج ان کی مشیرِ خاص کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ یہاں تک کہ خانگی معاملات میں بھی اس کی رائے کو بہت دخل تھا۔ میں اسے خاطر میں نہیں لاتا تھا اور شوکت میرے قدم بقدم چلنے کی وجہ سے اس کے گھرلوٹتا

کو تسلیم نہ کرتے تھے، اسی لیے اپنی تضحیکات کا اُسے موضوع بنائے رکھتے تھے، آخر وہ قبل از وقت بتقضائے الٰہی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ چچی جان کو بہت رنج ہوا۔ اس کی فاتحہ درود کا عرصہ دراز تک سلسلہ جاری رہا۔ ایک روز اس کی فاتحہ کا تورہ تیار کیا گیا۔ چچی جان نے ہر قسم کے کھانے پکائے، پلاؤ، مزعفر، پراٹھے، قورمہ، شامی کباب وغیرہ مربہ، نورتن چٹنی، اچار، بالائی فیرنی ایک خوان میں سجائی گئی۔ فاتحہ دے کر غربا کو کھلانے کو بھیج دیا۔ ایسے پُر تکلف کھانے کے خوان کو لکھنؤ میں تورہ کہتے ہیں اور عزیز ہستیوں کی وفات پر یہ اتنی ہی مقدار میں تیار ہوتا ہے جو فاتحہ کے لیے ضروری۔ گھر کا کوئی آدمی ان چیزوں کو چکھتا بھی نہیں۔ جعفری خانم کا یہ تورہ دیکھ کر شوکت کا جی بہت للچایا کہ اپنے ہی گھر میں یہ مزے دار اور طرح طرح کی چیز ہو اور ہم ہی محروم رہیں۔ اگلے دن اپنی والدہ سے کہنے لگے، اماں، آپ ہمارا مرنا، ہماری زندگی میں کر دیجئے۔ وہ بولیں، کیا بکتے ہو، ایسی بُری بات زبان سے نہ نکالو۔ نکالوں کیسے نہیں آپ میرا تورہ تیار کریں گی تو میں خود تو کھا سکوں گا۔ جعفری خانم کے تورے کا تو اُسے ثواب ہی پہنچے گا۔ یہ خوان نعمت تو اُسے نصیب نہیں ہو سکتا۔ کچھ عرصہ بعد میں لکھنؤ گیا تو پھر ایک ایسی ہی پُر تکلف فاتحہ چچی جان نے کی۔ میں نے شوکت سے کہا، آج بڑے ٹھاٹھ کی چیزیں پک رہی ہیں، شوکت نے بتایا کہ بھک منگے فقیر یہ سب چٹ کر جائیں گے ہمیں کسی کو ایک لقمہ بھی نہیں ملے گا۔ ابھی پچھلی فاتحہ کے تورے کو دیکھ کر میں نے اماں سے کہا تھا میرے سب جیتے جی میرا مرنا کر دیجئے۔ میں نے کہا، یہ مال مصالحہ تو ہم تم ضرور کھائیں گے۔ پھر اس کو ایک ترکیب بتائی۔ جب شام کو تورے کا خوان گھر کی پروردہ گلشن لے کر چلی، تو میں اور شوکت بھی پیچھے پیچھے ہو لیے۔ کچھ دُور جا کر گلشن سے شوکت نے کہا، دیکھو وہ سامنے چند یتیم بچے مسجد میں بیٹھے ہیں۔ لاؤ میں ان کو یہ تورہ کھلا دوں، تم یہ خوان مجھے دے دو، اور گھر جاؤ۔ اُس سے وہ خوان نعمت لے کر کچھ دیر ہم دونوں رُکے رہے، پھر آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلے اور باہر کے کمرہ میں بیٹھ کر اطمینان سے کھاتے رہے، جو کچھ بچا ایک فقیر کو دے دیا۔ سامنے ہی سکرو نامی دھوبن رہتی تھی۔ وہ یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس وقت تو چُپ رہی، اگلے دن چچی جان سے آکر کہہ دیا کہ دولہا میاں (یعنی میں) اور اپنے بھیا نے تورے کا کھانا باہر بیٹھ کر کھایا تھا۔ ہم نے خالی برتن یہ کہہ کر واپس کیے تھے کہ یتیموں کو کھلا آئے ہیں۔ چچی جان دھوبن کی رپورٹ سُن کر مجھ پر بگڑنے لگیں کہ اللہ کے فضل سے جوان ہو، بیوی بچوں والے ہو، نوکر چاکر ہو، خود بھی بدنیتی کرتے ہو اور چھوٹے بھائی کو بھی بدنیت بناتے ہو، شرم نہیں آتی۔ لوگ سُنیں گے تو کیا کہیں گے میاں تحصیلدار ہیں اور نیت کے ایسے خوار ہیں کہ فقیروں کے حصّہ کا کھانا چوری سے کھا گئے۔ میں نے کہا چھوٹے بڑے ہو کر بھی بزرگوں کے سامنے بچے ہی ہوتے ہیں اور طفلانہ شرارتیں ان میں عود کر آتی ہیں۔ شوکت تو آخر عمر تک خاندان کے بزرگوں میں چونچال بچہ بنا رہا۔ چچا جان کی وفات کے بعد وہ میرے پاس بھوپال آیا۔ میں ان دنوں ایک تحصیل کا انچارج تھا۔ اور نواب صاحب کے وزیر خصوصی بسلسلہ دورہ آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے شوکت کی ملازمت کے لیے عرض کیا اور وہ تحصیلدار مقرر کرنے پر آمادہ ہو گئے، شوکت گھر میں باجی کے پاس جا کر رونے لگے کہ بھائی جان مجھے لکھنؤ چھڑا کر دیہاتی ماحول میں قید کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے خبر ہوئی تو سمجھایا کہ بھیا، تمہاری بیوی ہے، کچھ دنوں میں بچے ہو جائیں گے۔ انگریزی حکومت میں ملازمت کے لیے تمہارے پاس تعلیمی سہولتیں نہیں تمہارے ابا کی دیرینہ خدمات اور باقیماندہ رسوخ کی وجہ سے تمہیں یہ سنہری موقع مل رہا ہے، کیوں کفرانِ نعمت کرتے ہو، آگے چل کر ترقی پاؤ گے۔ نائب ناظم (ڈپٹی کلکٹر) ہو سکتے ہو، اور قسمت نے یاوری کی تو ناظم ضلع یعنی کلکٹر بھی بن سکتے ہو۔

شوکت بظاہر رضامند ہو گئے اور بڑے ابا یعنی میرے والد سے مشورہ کا بہانہ کر کے بھوپال آئے اور وہاں سے لکھنؤ پہنچ گئے۔ بعد

میں معذرت آمیز خط کے ذریعے مجھے اطلاع دی کہ میں نے روزنامہ "ہمدم" کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں ملازمت کر لی ہے۔ میں علمی، ادبی اور صحافتی کام کرنے والوں کا مستقبل اُس وقت کی ملکی فضا کے اعتبار سے کچھ امید افزا نہ سمجھتا تھا، افسوس کر کے رہ گیا۔ اس کی تعلیم حسین آباد ہائی اسکول کے آٹھویں نویں درجے تک تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو دماغی و ذہنی صلاحیتیں اس قدر ارزانی فرمائی تھیں کہ اسی لائن میں اُس نے روز افزوں ترقی کی اور میں ہر اعتبار سے اُس سے پیچھے رہ گیا۔ جب اخباری لائن سے نکل کر ریڈیو سے وابستہ ہوا، اور بھوپال کے شاہی مشاعرہ میں آیا تو مسٹر سلام الدین وزیر قانون و انصاف کے نیم سرکاری اخبار "ندیم" کی ادارت ایک معقول مشاہرہ کی پیش کش کی۔ شوکت نے کہا، فی الحال ریڈیو میں جو ماہانہ رقم مجھے مل رہی ہے۔ آپ اس سے دُگنی قیمت پر مجھے لینا چاہتے ہیں، اس کا بہت بہت شکریہ مگر ریاستی فضا میں صلاحیتوں کا جو خون ہوتا ہے، اُس کی مثال میرے سامنے بھائی جان (ارشد تھانوی) موجود ہیں۔ اب میں سوچتا ہوں کہ اگر وہ تحصیلدار ہو جاتا اور آگے ترقی بھی کرتا۔ تو یہ شہرت یہ ہر دلعزیزی اور یہ وقار جو اُسے اپنی خوشگوار ذہنی زندگی میں حاصل ہوا! اس کا عشر عشیر بھی میسر نہ آتا۔ اُس کی تمام ذہنی اُمنگیں ادائے فرائض اور ملازماتی قید و بند میں گھٹ گھٹ کر ختم ہو جاتیں۔ یا وہ برخاست یا مستعفی ہونے پر مجبور ہوتا۔ اس کی زبان جب گھر کے بزرگوں اور خاندان کے چھوٹے بڑوں کو نہ بخشتی تھی، تو ریاستی غلامانہ ذہنیت رکھنے والے اصحاب کبار کب اس سے بچ سکتے تھے۔ نتیجہ خطرناک ہوتا۔ اگرچہ اُس کا مذاق اور طنز و مزاح بہت لطیف، بالواقع اور اتنا شائستہ ہوتا تھا کہ موضوع شخصیت بھی داد دیے بغیر نہ رہتی تھی، اسی کے ساتھ حفظِ مراتب کا بھی پورا لحاظ رکھتا تھا۔ مجھ سے انتہائی بے تکلف اور ہم ذوق ہونے کے باوجود ادب و احترام کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس کے ماشاء اللہ تین ہونہار اور سعادت مند بیٹے ہیں پہلے کا نام سعید عمر ہے، جو ماں اور باپ دونوں کے ناموں کا مرکب ہے۔ دوسرے کا نام، خورشید عمر، بلحاظ قافیہ ان کی پھوپھی (خاتون ارشد) نے رکھا۔ جب تیسرا بیٹا ہوا اور شوکت نے مجھے تار پر اطلاع دے کر نام رکھنے کی استدعا کی تو میں نے اپنے نام پر اس کا نام رشید عمر تجویز کیا چونکہ میرا نام رشید احمد ہے اور بچے چچا سب مجھے "رشید" کہتے تھے اس لیے شوکت اور اس کی بیگم نے اپنے بچے کو رشید کہہ کر پکارنا میری بے ادبی سمجھا اور اُسے بابا کہنے لگے، اب وہ خدا کے فضل سے جوان ہو گیا ہے۔ مگر سب اُسے بابا ہی کہتے ہیں۔ کیسی رنجدہ بات ہے کہ ان خصوصیات کے باوجود ۱۹۵۲ء میں وہ اپنی بہن یعنی میری بیوی اور اسی کے ساتھ مجھ سے سخت کشیدہ ہو گیا، اور مرتے دم تک یہ آزردگی رہی۔ حالانکہ اُسی کی اصرار آمیز طلبی پر میں اپنے ارادے سے کچھ پہلے ہی پاکستان آیا تھا۔ اور ہم لوگوں کے یہاں پہنچنے پر اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ شوکت ان دنوں لاہور میں تھے اور ریڈیو اسٹیشن سے متعلق۔ میرے لیے انھوں نے ایک ادبی و علمی کاروبار اعلیٰ پیمانہ پر چلانے کی تجویز سوچ رکھی تھی۔ مگر بعض خانگی مصلحتوں کی بنا پر شوکت کی مرضی کے خلاف میں کراچی چلا آیا اور ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ ہو گیا۔ مگر شوکت کی آزردگی کا سبب یہ نہ تھا حقیقت کچھ اور ہے۔ بیگم ایک سلیقہ مند کفایت شعار اور معاشرتی ربط ضبط سے محتاط رہنے والی خاتون ہیں، شوکت حد درجہ فیاض، احباب نواز، عزیزوں رشتہ داروں کی دل کھول کر مدارات کرنے والا سیر چشم بلند نظر انسان تھا۔ اس لیے میاں بیوی کی افتادہ طبیعت میں ذرا بھی ہم آہنگی نہ تھی، شوکت جو ابتدائے عمر سے "با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا" پر عامل تھا۔ اپنی شریک زندگی کی خاطر شکنی کیسے گوارا کرتا۔ اُس نے اپنے احباب کی پذیرائی کا جداگانہ انتظام کر لیا۔ اس کی سن گن پر ناگواریاں پیدا ہوئیں۔ دو ایک بار میں نے ان ناگواریوں کو خوشگواریوں میں تبدیل بھی کر دیا۔ لاہور آنے کے بعد ۱۹۴۵ء میں آخر شوکت نے لاہور کی ایک لکھی پڑھی خاتون سے عقد کر لیا۔ اس سلسلہ میں سعیدہ خاتون سے تلخی پیدا ہوئی اور اس قدر

بڑھی کہ شوکت اپنی کنال پارک والی شاندار سجی سجائی کوٹھی چھوڑ کر گڑھی شاہو کے ایک چھوٹے سے مکان میں نئی بیوی زہرہ بیگم کے ساتھ آ رہے۔ اُس وقت سے اب تک کہ پندرہ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اِن میاں بیوی نے ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھی۔ یہاں تک کہ جب شوکت مرض الموت میں مبتلا لاہور کے میو اسپتال میں زیرِ علاج تھے (غالباً ڈاکٹروں کے مشورہ پر) سعیدہ خاتون ان کو دیکھنے نہیں گئیں۔ گھر پر بیٹھی کسی خطرہ کے احتمال سے لرزتی سر بسجدہ ہو کر دعائیں مانگتی رہیں۔ پھر وفات ہو جانے پر بھی جسدِ بے جان کا آخری دیدار بھی نہ کیا۔ زہرہ بیگم دن رات مریض شوہر کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں اور ہسپتال سے اُنہی کے گھر پر جانے کے دو تین روز بعد مرنے والے نے جانِ شیریں جان آفریں کے سپرد کی۔ اس پندرہ سالہ علیحدگی کے دوران میں میاں بیوی کے درمیان مراسلت کا سلسلہ جاری رہا اور شوکت ایک رقم اپنی بڑی بیوی کو پوری پابندی سے ماہ بماہ بھیجتے رہے۔ شوکت کی اپنی بہن سے کھٹ پٹ رہی۔ ان کا اصرار تھا کہ اس بے تعلقی کو ختم کرو اور دونوں کے ساتھ رہنے سہنے میں انصاف کرو، میں بھی اسی بات پر زور دیتا تھا ان کے بیٹے بھی زہرہ بیگم والے گھر پر نہ جا سکتے تھے، ریڈیو اسٹیشن پر ضرورتاً جا کر مل لیتے تھے۔ پھر جب وہ روزنامہ جنگ کے ادارہ میں کراچی آ کر شامل ہوئے تب بھی ان کے بیٹے ان کے گھر نہ جا پاتے تھے۔ پھوپھی یا خالہ کے یہاں رہتے اور دفتر روزنامہ جنگ میں جا کر ملتے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شوکت کو اپنے بیٹوں سے محبت نہ رہی تھی۔ وہ رفعِ شر کے لیے ایسا کرتے تھے ورنہ بچوں کی بہبود کا پوری شدت سے خیال رکھتے تھے۔ ایک موقع پر تار دے کر سعید عمر کو لاہور سے بلایا۔ اپنے تعلقات سے کام لے کر پی آئی۔ اے کے شعبہ انجینیری میں بھرتی کرایا۔ جہاں اب وہ آٹھ سو روپیہ ماہوار پاتے ہیں۔ دوسرے بیٹے کو واپڈا میں ایک معقول جگہ دلوائی۔ دونوں کی شادیوں میں شریک تو نہیں ہوئے۔ مگر مصارف کے لیے بڑی بڑی رقوم بھیجیں، ایک سہرے کا شعر ہے؂

سیم و زر کا ہے نہ ہے لعل و گہر کا سہرا
ہے سعیدہ کی دعاؤں کے اثر کا سہرا

زہرہ بیگم بقول شوکت "اچھی عورت ہے" اس کا ثبوت یہ ہے کہ شوکت کے جس لڑکے نے ایک بار اپنی سوتیلی ماں کی سخت توہین و تذلیل کی تھی، جب وہ اپنی بیوی کو لے کر شوکت کے دورانِ علالت میں میو اسپتال گیا۔ تو اس کی دلہن کو زہرہ بیگم نے چھاتی سے لگا کر پیار کیا۔ مٹھائی منگا کر ساتھ کی۔ اور کہا دلہن تم ایسی جگہ ملی ہو کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ میرے متعلق اگرچہ یہ حقیقت نہ تھی۔ شوکت میرے متعلق یہ یقین رکھتے تھے کہ سعیدہ کی طرفداری میں، میں زہرہ بیگم کا سخت مخالف ہوں، اسی لیے جب ان کے بیٹے کسی عدم شفقت کی شکایت دفتر جنگ میں جا کر کرتے تو ان کو یہ بدگمانی ہوتی کہ میں نے ان کو بھڑکایا ہے۔ اور وہ میری شکایات کر کے ان کو میرے پاس نہ ٹھہرنے کی ہدایت کرتے۔ باایں ہمہ میرے احترام و محبت میں کوئی کمی نہ آتی تھی۔ وہ لاہور میں تھے۔ میں کراچی میں سخت علیل ہوا اور مایوسی آمیز خط لکھا، یہ چند سال پہلے کی بات ہے شوکت نے جواب میں ہمیں لکھا کہ پچیس تیس سال پہلے علی برادران کی تصویریں اخباروں میں چھپا کرتی تھیں تو میری اور آپ کی تصویریں بھی "تھانوی برادران" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ آپ اطمینان رکھئے کہ موت کے سلسلہ میں بھی ہم تھانوی برادران، علی برادران ثابت ہوں گے۔ یعنی چھوٹے بھائی مولانا محمد علی کی وفات پہلے ہوئی اور شوکت علی بعد میں فوت ہوئے۔ اسی طرح پہلے میں مروں گا اور بعد میں آپ کا نمبر آئے گا۔ جب تک میں زندہ ہوں، آپ نہیں مر سکتے۔ شوکت کے شفیق ترین محسن دوست جناب احمد سلمان صاحب کو یہ خط دکھایا تو وہ بولے بڑی سعادت مندی کی

بات ہے لیکن اُس نے یہ پیشین گوئی کسی غیبی احساس سے کی تھی جو ۴؍مئی ۶۳ء کو سچی ثابت ہوئی۔ میں ۷۶ برس کا بوڑھا زندہ ہوں اور وہ ۵۹ برس کچھ ماہ کی عمر میں داغِ مفارقت دے گیا۔ بعض اخبارات و رسائل میں اس کی عمر ۵۵-۵۶ سال بھی شائع ہوئی ہے۔ جو دوسرا عقد کرنے کے بعد اُس نے قرار دے لی تھی اور ۱۹۰۵ء کے بجائے ۱۹۰۹ء کے ماہ فروری کو اپنا ماہ پیدائش بنا لیا تھا۔ اس سے پہلے اپنی کتاب "مابدولت" وغیرہ میں خود اپنا تاریخی نام تسخیر احمد اور ۱۳۲۳ھ سنہ ولادت لکھ چکا تھا۔ فرہنگ عامرہ میں جو شعر لئے قدیم و جدید کی فہرست شامل ہے، اُس میں شوکت کا سنہ پیدائش صحیح لکھا ہے۔ اسی طرح کلکتہ اور علیگڈھ میں اس کے زیر تعلیم رہنے کی بھی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن میں تفریحی حصہ ملنے کے لیے ضرورتاً بعد میں اضافہ کر لیا تھا۔ اس کی صورت پر عمر کی ۴-۵ سال کی کمی بھی زیب دیتی تھی اور اس کی زبان و قلم سے اولڈ بوائے ہونے کی تائید بھی ہوتی تھی۔ جن لوگوں نے "قاضی جی" کو ریڈیو پر سنا ہے کیا وہ کہہ سکتے تھے۔ کہ یہ آواز محمد عمر کی تھی اور اصلی قاضی کی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ لکھنؤ میں تو وہ خالص لکھنوی تھا ہی، بھوپال میں جہاں اکثر الفاظ کے زبر کو زیر کر دیا جاتا ہے۔ بالکل بھوپالی لہجہ میں بولتا تھا اور تھانہ بھون کے کوئی بزرگ مل گئے تو اب سے نصف صدی پہلے کی متشدد زبان استعمال کرتا تھا اور کسی کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ بقول حافظ ؎

معشوق ما بشیوہ ہر کس برابر است
باما شراب خورد و بزاہد نماز کرد

مرحوم نے خواہ اپنی عمر کسی وجہ سے کم کی ہو، اگر زیادہ بھی ہوتی تو بھی کچھ فرق نہیں پڑتا۔ وہ آخر وقت تک جوان تھا۔ اُس کا دل جوان تھا۔ اُس کا دماغ جوان تھا۔ اُس کی زبان جوان تھی، اس کا قلم جوان تھا اور مجھے تو وہ ہمیشہ ایک چلبلا لڑکا ہی نظر آیا۔ اکثر اُس سے باتیں کرتے ہوئے میں اپنی طفولیت کا کوئی واقعہ بیان کرتا تو کہا کرتا تھا۔ شوکت جب میں تمہاری برابر تھا تو وہ ہنس کر کہتا۔ بھائی جان، اب میں لڑکا نہیں رہا۔ اب میں تو لڑکوں کا باپ ہوں، چھوٹی بیوی زہرہ بیگم کے بطن سے اس کی تین لڑکیاں ہیں۔ بڑی بچی کا نام شوکیہ ہے، منجھلی کا فوزیہ اور چھوٹی کا فیضیہ۔ شوکیہ ترکی لفظ ہے، جس کے معنی تابانی اور درخشندگی کے ہیں، اس نام کی بھی ایک خاص وجہ ہے۔ بھوپال سے کسی زمانہ میں ایک نسوانی رسالہ "الحجاب" کے نام سے نکلتا تھا۔ اس میں ایک ترکی افسانہ کا ترجمہ شائع ہوا۔ شوکیہ اس کا عنوان تھا۔ شوکت کی باجی کو یہ نام بہت پسند آیا۔ کہا کرتی تھیں کاش یہ نام میرا ہوتا تھا۔ جب اُن کے بھیا نے اپنا تخلص شوکت رکھا تو انھوں نے کہا، میں اس کی بچی کا نام شوکیہ رکھوں گی۔ شوکت بھی باجی کے اس خیال میں شریک ہو گئے، مگر ان کے متواتر لڑکے تو ہوتے رہے، لڑکی کوئی نہ ہوئی اور ولادت کا یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ شوکت اور ان کی باجی کی یہ خواہش دل کی دل ہی میں رہی، یہ نام اگر پیشِ نظر نہ بھی ہوتا تو بھی شوکت کو منی بٹیا کو کھلانے کا بہت شوق تھا۔ میری لڑکی شہربانو بہت ہی چھوٹی سی تھی، شوکت جشن سالگرہ کے مشاعرے میں بھوپال آئے، جب تک گھر میں رہتے، ننھی بھانجی کو گود میں لیے رہتے۔ ایک روز قاضی محمد مکرم تحصیلدار کے یہاں مخصوص مشاعرہ تھا۔ شوکت شہربانو کو بھی لیے ہوئے چلے گئے اور مشاعرے میں پہنچ کر اپنے گھٹنوں پر شہربانو کو لٹا لیا۔ جگر صاحب برابر بیٹھے تھے۔ جب جگر صاحب غزل پڑھ چکے تو شوکت نے شہربانو سے کہا۔ بیٹی تم بھی شعر کہا کرو۔ ننھی بانو نے فوراً پوچھا۔ کسے؟ شوکت کے ذہن میں بھی نہ تھا کہ بچی شعر کو شیر سمجھے، ہنس کر جگر صاحب کی طرف اشارہ کر دیا۔ اب شہربانو ماشاءاللہ بڑی ہو گئی۔ ایم۔ اے بی۔ ایڈ ہے۔ مگر شوکت اس کو ابھی تک شیر والی بانو کہتے رہے۔ مگر اللہ نے ان کی یہ آرزو پوری کر دی۔ جب انھوں نے دوسرا عقد کیا اور بچی پیدا ہوئی تو بہن کو خط لکھا۔ اللہ کا شکر ہے

بڑے انتظار کے بعد آخر شوکیہ آگئی۔ اب اس غریب شوکیہ کو کیا خبر کہ اس کا چاہنے والا باپ کیسی کیسی تمناؤں کو دل میں لیے ابدی نیند سو رہا ہے۔ شوکیہ نے ایک تازہ خط میں اپنی پھوپھی جان (خاتون ارشد) کو لکھا ہے:۔

> "ہم تینوں بہنیں ابا کو یاد کر کے روتی ہیں اور ہر وقت ابا کی محبت کی باتیں یاد آتی ہیں۔ کئی بار ابا کی قبر پر تینوں بہنیں ماموں کے ساتھ گئیں، وہاں جا کے جی چاہتا ہے کہ کسی طرح اپنے ابا کو دیکھیں لیکن کیسے دیکھ سکتے ہیں، رو کر واپس آجاتی ہیں پھوپو۔ اب آپ ہی ہمارے ابا ہیں، ہمارے لیے کچھ دعا کیجیے۔"

پھوپھی پہلے ہی بھائی کے صدمے سے صاحب فراش ہیں، ان کا اور میرا دل ان معصوم بیٹیوں کی یتیمی پر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ان معصوم پھول جیسی بچیوں کی ماں پر کیا گزرتی ہو گی جس کا آدھی عمر سے بھی پہلے سہاگ اجڑ گیا۔ ان ننھی ننھی اَن کھلی کلیوں کی نگہداشت اور پرورش کا بوجھ اس پر آ پڑا۔ وہ ہنس مکھ زہرہ جو ہر وقت مسکرا کر اس وقت میرا خیر مقدم کرتی تھی جب میں ہندوستان سے لاہور آیا۔ قیام تو کنال پارک والی کوٹھی میں تھا۔ زہرہ والے گھر میں گنجائش نہ تھی۔ دوپہر کا کھانا سعیدہ کے ساتھ کھاتا اور رات کے کھانے کے لیے شوکت و زہرہ نے سختی سے گرمی شام ہو آکر کھانے کا پابند کر رکھا تھا۔ خاص طور سے پُرتکلف کھانے بڑے اہتمام سے تیار کرتی، پھل بھی ضرور ہوتے اور دسترخوان پر تفریحات بھی۔ میری عادت ہمیشہ سے پلاؤ میں قورمہ ڈال کر کھانے کی ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب میں اس کو گنوارپن سمجھا جاتا ہے۔ پہلے دن جو میں کھانے بیٹھا اور ڈونگے سے پلیٹ میں پلاؤ نکالا۔ زہرہ بیگم نے چمچہ بھر کر قورمہ اس میں انڈیل دیا۔ اُس نے تو اپنی تہذیب کے مطابق مجھے زحمت سے بچایا تھا۔ میں سمجھا شوکت نے میری عادت سے واقف کر دیا ہو گا۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ شوکت کی پلیٹ میں بھی زہرہ نے قورمہ ڈال دیا تو کہا، جناب شوکت صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ، کیا آپ بھی میری طرح گنوارپن اختیار فرمانا پسند کرتے ہیں۔ زہرہ نے حیرانی سے پوچھا، کیا بات ہوئی، میں نے کوئی بدتمیزی کی۔ میں نے کہا، تمہارے لکھنوی الاصل تھانوی شوہر صاحب ہمیشہ قورمے سے سالن کھانے کو میرا اُجڈپن سمجھا کرتے ہیں۔ زہرہ بولی، پلاؤ اور قورمے کا تو جوڑ ہے۔ میں نے شوکت سے کہا، سنو وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ شوکت نے پیروڈی تو کیا کی، کسی فارسی شعر کا ستیاناس مارا ہے

حکم زہرہ بیگم از حکم خدا است　　　اینچہ این زہرہ بفرماید بجاست

افسوس کہ بعض غلط فہمیوں نے یہ فضا ہی بدل دی۔ آخری مرتبہ جب شوکت راولپنڈی سے کراچی آئے اور یونیورسٹی کے کسی مشاعرہ میں میری لڑکیاں ملیں تو دونوں کو چھاتی سے لگا لیا اور بہت دیر دونوں بچیوں کو ساتھ لیے ہوئے اپنی کار تک آئے اور اقبال صاحب صفی پوری سے جن کے ہاں ٹھہرے تھے آ کر کہا مجھے شہر بانو، مہر بانو تو ملیں تھیں، مگر باجی اور بھائی جان نے مجھے چھوڑ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس کی زندگی کے تیسرے دَور نے اس کی باغ و بہار زندگی کو اندرونی طور پر خزاں آلودہ بنا دیا تھا۔ وہ آخری دورِ حیات میں شدید دماغی کشمکش اور ذہنی اذیت کا شکار رہا۔ جن شخصیتوں سے اس کے دل کی گہرائیوں میں محبت ہی محبت تھی۔ زبانی ان سے نفرت کا اظہار کرتی تھی، جن اعزہ کی طرف جذبات کھنچتے تھے، تصورات ان سے روگردانی کرتے تھے، اس کے اندرونی تقاضے کچھ اور تھے اور بیرونی اصدارات کچھ اور، اُس میں انا بالکل نہیں تھی لیکن اپنی شخصیت کے وقار کا حد درجہ لحاظ اور پاس اس درجہ کہ اس کے لیے جیتے جی قربانی دے دی۔ اُسے جگر کے سرطان کا مرض ہو گیا تھا، اگر نہ ہوتا تو اس کے دل کے ناسور اسے زیادہ زندہ نہ رہنے دیتے۔ میرے سامنے تو اس کی گھریلو اور نجی زندگی ابتدا سے رہی، اس لیے سب کچھ جانتا، سب کچھ سمجھتا ہوں لیکن اس کی اندرونی الم پذیری کو اس کے بالغ نظر احباب بھی محسوس کرنے لگے تھے، ابوالاثر حضرت حفیظ جالندھری نے اپنی تعزیتی ریڈیائی تقریر میں اس کے متعلق دو شعر ایسے بھی پڑھے جن میں اس کی

قلبی اذیتوں کی طرف اشارے تھے اور جناب قدرت اللہ شہاب نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ "شوکت تھانوی نے بے شمار لوگوں کو ہنسایا لیکن اس کے اپنے دکھ اندر ہی اندر ناسور بنتے گئے۔ یہاں تک کہ اس ناسور نے چپکے چپکے گھن کی طرح اس کی زندگی کو کھا لیا" ——

معلوم ہوتا ہے کہ شوکت کو اپنی موت کے دن کا ادراک ہو گیا تھا۔ ان کا بڑا بیٹا سعید عمر باپ کی علالت کی خبر پا کر کراچی سے لاہور گیا۔ باپ کی حالت دیکھ کر رخصت اور بڑھائی۔ جب وہ بھی ختم ہو گئی اور بظاہر شوکت کی حالت سنبھلتی ہوئی معلوم ہوئی تو واپسی کا قصد کیا اور باپ سے روانگی کی اجازت چاہی تو شوکت نے کہا، بس بیٹے ایک دن اور ٹھہر جاؤ۔ سعید نے اگلے دن کا سفر ملتوی کر دیا۔ رات کے ایک بجے تک باپ کے قریب بیٹھا۔ شوکت نے کہا، جاؤ میاں اب سو رہو، شب بخیر۔ خدا حافظ۔ سعید گڑھی شاہو سے اپنی والدہ کے گھر پہنچا۔ رات رہ کر دوسرے دن سویرے جب زہرہ کے مکان پر آیا۔ اس کے پہنچنے کے چند منٹ رات کو خدا حافظ کہنے والے باپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، شام کو جنازہ اٹھا اور میاں میر کے قبرستان میں بیٹے نے باپ کے جسد بے روح کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا، شاید اسی آخری خدمت کے لیے شفیق باپ نے بیٹے کو روک لیا تھا۔ ہمدرد صحت والے حکیم سعید صاحب دہلوی نے جو کراچی سے عیادت کے لیے لاہور گئے تھے اور شوکت لاہور سے اس وقت اپنے سسرالی گھر میں آ چکے تھے۔ ان کے کمرہ قیام کی حدت محسوس کر کے کہا تھا کہ میں کل اس کو ایئر کنڈیشنڈ کرانے کا انتظام کرتا لیکن اگلے دن اس کی ضرورت باقی نہ رہی، اور اسی شام کو یہ مریض سپرد خاک کر دیا گیا۔ منجھلے بیٹے نے اک دلدوز آہ کے ساتھ مٹی دیتے وقت کہا، ابا آپ کی اس آرام گاہ کو ایئر کنڈیشنڈ کرنے کی ضرورت نہیں — بالآخر

ہوئے موت رخصت ہوئی قبر بند
کھلا اب کہ کوئی کسی کا نہیں

مگر شوکت کے لیے یہ کہنا غلط ہے، اس کے سب کوئی ہیں۔ اس کی ماں جائی، اپنے بیرن کی تشویشناک بیماری کی خبر پاتے ہی صاحب فراش ہو گئی اور بیس دن گزر جانے پر بھی ہنوز مریض ہے، اس کی بڑی بیگم پیکر غم ہے، چھوٹی بیگم کی حالت تو ناقابل بیان ہے۔ بیٹے، بیٹیاں، بھانجے بھانجیاں، سب ہی تو اسے اپنائے ہوئے ہیں جتنا زندگی میں بھی نہ اپنایا تھا۔ میں انھیں سمجھانے میں لگا رہتا ہوں کہ ؎

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

ہندوستان اور پاکستان میں اس کے دوست، اس کے قدرشناس جن میں عوام و خواص، اعلیٰ و ادنیٰ سب ہی شامل ہیں حد و شمار سے باہر ہیں، سب ہی تو ماتم گسار ہیں اور دعائے مغفرت میں مصروف، کثیر التعداد، دلوں سے نکلی ہوئی یہ دعائیں اللہ تبارک تعالیٰ نے ضرور قبول کی ہوں گی، کیونکہ مرنے والے نے مخلوق خدا کے دلوں کو مسرت و راحت پہنچا کر حاصل کی ہیں، اور اللہ تعالیٰ جو بڑا رحیم و کریم ہے، اسے ابدی مسرت و شادمانی عطا فرمائے گا۔

ابّا

رشید عمر تھانوی

اپنے دکھ درد کو سینے میں چھپا کر دوسروں کو ہنسانے والا البرٹ ہسپتال کے کمرہ نمبر ۵ میں پڑا تھا۔ جگر کا سرطان، دل کا عارضہ تنفس کا یہ عالم کہ باہر کھڑا شخص سانس کی آواز سن سکے۔ کھانسی جب آتی تو تھوک میں خون کی آمیزش۔ کتنی تکالیف تھیں لیکن پھر بھی اپنی کسی تکلیف کا اظہار نہ کیا۔

زندگی بھر جس کے وجود سے دوسروں کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلی، جس کے چھوڑے ہوئے شگوفوں سے مرجھائے ہوئے چہرے کھل اٹھے۔ اب وہی شگوفوں کا منبع اپنے روگ سے، اپنے دکھ درد سے دوسروں کی آنکھیں نم کرتا یہ ان کا شیوہ نہ تھا۔ وہ خود اپنے ہی دکھوں کے بوجھ تلے دبتا گیا۔ اور اُن حالات میں بھی انہوں نے اپنی آخری ہچکیوں تک دوسروں کے لبوں کو تبسم دیا چہروں کو شگوفہ بنایا۔

سب سے شوکت تھانوی چھن گیا مجھ سے میرا باپ — سب کو اس کی ظرافت یاد آتی، مجھے اس کی شفقت۔ شوکت تھانوی تو اب بھی زندہ ہے۔ اور مدتوں اپنی تصانیف کے پردے میں زندہ رہے گا، لیکن میرا باپ! وہ —— میٹھی نیند سو رہا ہے۔ سکھ کی نیند، چین کی نیند، جس میں نہ تو اسے تنفس کی تکلیف ہے کہ "ہر اک سانس ہے مستقل مدت گریا" نہ وہ دکھ درد، نہ وہ زندگی کی تلخیاں جو آخر کار جگر کا ناسور بن کر ابھریں۔ اب میں کس سے کہوں کہ کوئی اسے اس نیند سے چونکا دے اور میرا بچپن پھر لوٹ آئے' اس موڑ پر —— جب میں اپنے پنگوڑے پر لیٹا چسنی یا ہاتھ کا انگوٹھا چوستا اور آغوں آغوں کی گردانیں گردانتا۔ ابا آتے اور دور ہی سے "بابا" کہہ کر پکارتے، میں اپنی تمام مصروفیت چھوڑ' اس مانوس آواز کی طرف دھیان دیتا، ابا میرے پالنے پر جھک کر اپنی انگلی میرے ہونٹوں پر رکھ کر کہتے: میرا بابا ہے' بتو ہے' گڈو ہے' ان کو اپنے پر جھکا دیکھ کر میری چسنی منہ سے ڈھلک جاتی میں کھلکھلا پڑتا۔ اور اپنے ہاتھ پیر ہلانے لگتا وہ مجھے اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر "بتو - بتو" کہہ کر اچھالتے اور نا معلوم کیا کیا کہتے پھر مجھے پالنے پر لٹا دیتے اور میں انہیں "آغوں آغوں" کرکے تکا کرتا اور سوچا کہ "یہ کون حضرت ہیں؟ کہاں سے آگئے ہیں؟ لیکن ہیں پھر بھی بھلے آدمی، اچھے لگتا چاہتے ہیں۔ جبھی تو، اس طرح منہ بنا بنا کر، چٹکی بجا بجا کر "بابا، بابا" کہہ کر پکارتے ہیں؟ جب وہ مجھے پنگوڑے پر تنہا چھوڑ کر چلتے تو مجھے دکھ ہوتا اور میں اس کا اظہار اپنے منہ کا پورا دہانہ کھول کر مختلف سُروں سے کرتا، کبھی کبھی میرے آنسو امڈ آتے اور کبھی ان آنسوؤں سے پہلے ہی ابا پلٹ آتے۔

امی جان نے اب اپنے خطوط کو رٹنا شروع کر دیا۔ اور اپنی گود میں مجھے بٹھا کر ابا کی طرف اشارہ کرکے کہتیں "ابا"

"کہہ بابا" "ابا" یہ ہیں تمہارے "ابا"۔ امّی جان کی محنت اور اپنی کوششوں سے کچھ ہی دن اور ان سے اس حد تک متعارف ہو گیا کہ ان کا نام ابا ہے۔ اور اب جب مجھے ان کی دور سے آواز آتی "بابا" تو میں "ابا ابا" کہہ کر ہاتھ پیر ہلانے لگتا اور اپنے پالنے سے مڑ مڑ کر ان کو دیکھنے کی کوشش کرتا تاکہ وہ جلد ہی میرے قریب آئیں، مجھے "بتو، گڈو" کہہ کر پکاریں اور پھر اپنی گود میں اٹھالیں مجھے خوب اچھالیں۔ میں کھلکھلا پڑوں۔ اور جب وہ مجھے چھوڑ کر چلیں تو پھر میں اپنا ریاض شروع کر دوں اور میری تانوں سے مرعوب ہو کر، متاثر ہو کر ابا پھر پلٹ آئیں۔

پھر کچھ عرصہ انہی کی گود میں رہ کر مجھے معلوم ہوا کہ دراصل ان کا نام ابا نہیں بلکہ یہ ابا میرے ہیں ان کا نام تو شوکت تھانوی ہے۔ اور پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ میرا نام صرف بابا نہیں بلکہ اب جو کوئی میرا نام پوچھتا تو اس کو ابا کا سکھایا ہوا پورا نام رشید عمر بابا تھانوی بتاتا۔

ابا لکھنؤ میں "سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن" کے افسرِ اعلیٰ مقرر ہوئے۔ بالائی منزل پر ہم لوگوں کی رہائش تھی اور نیچے دفتر۔ ابا کی افسرانہ شان اور دفتر کی ٹھاٹ باٹ دیکھ کر مجھے بھی افسری کا شوق چرایا اور اپنی مستقل ضد پر ابا کے ماتحت کے ساتھ والا کمرہ ہمیں افسری کے لئے مل گیا اس میں میز سے لے کر گھنٹی، ردّی کی ٹوکری سے لے کر پانی کی صراحی غرضیکہ سب کچھ موجود تھا۔ افسر صرف میز کرسی لے کر بیٹھا رہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچا کرتا۔ اور پانچ منٹ بعد چپراسی کو بلا کر ڈانٹتا اور الٹے سیدھے حکم دیا کرتا۔ اتنا تو معلوم ہی تھا جو دفتر میں کام کرتا ہے اسے تنخواہ بھی ملتی ہے۔ لہٰذا ہر پہلی تاریخ پر اکاؤنٹنٹ کے پاس موجود ایک پوٹلی ملتی جس میں دو روپوں کے ادھنّے ہوتے، اس پوٹلی کو لے کر فوراً گھر جاتا اور ابا کی نقل کرتے ہوئے دور ہی سے امّی جان کو پکارتا۔ "بھئی جلدی تنخواہ لے لیجئے مجھے ابھی دفتر کا بہت کام کرنا ہے"۔ امّی جان اپنے کماؤ بیٹے سے تنخواہ لے لیتیں اور ہم پھر اپنے کمرے میں آکر الٹی سیدھی لکیریں کھینچنے میں مصروف ہو جاتے۔

دفتر کے آگے لان میں ابا اپنی زیرِ نگرانی مشاعرہ کراتے۔ فرشی مشاعرہ ہوتا۔ تمام بڑے بڑے شعراء آتے، رات بھر محفل جمی رہتی اور کشمیری چائے کے دور چلتے، اب یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ تمام شعراء اپنا کلام سنائیں اور میں چپ رہوں۔ جونہی مشاعرہ شروع ہوتا ہم ابا کی گود میں ٹھنکتے "ابا ہم بھی غزل پڑھیں گے"۔ آخرکار میری ضد ابا پوری کرتے اور میں مائیکروفون پر اپنا کلام سناتا۔

ملکا چل رہا ہے اور صاحب جا رہے ہیں۔

جب یہ محکمہ ختم ہوا۔ تو ابا لاہور آگئے اور یہاں "پنچولی آرٹ پکچرس" میں ملازم ہو گئے۔ ہم سب کو لاہور آنا پڑا۔ ابا کو یقیناً لکھنؤ چھوٹنے کا غم تھا۔ لیکن فکرِ معاش پر مجبور تھے اور مجھے جو غم تھا وہ اپنی افسری چھننے کا۔

اب میں کافی قابل ہو چکا تھا۔ اور ابا کی سکھائی سیکڑوں گالیاں ازبر تھیں۔ بڑے بھائی سعید عمر تھانوی اور منجھلے بھائی خورشید شوکت کو اکثر بیشتر ابا کا سکھایا سبق سننا پڑتا، بھائی جان کے ہاتھ میں گیند دیکھی اور فوراً کہا "بھائی مجھے گیند دو" ان کے انکار پر پہلے تو اپنے سبق سے نوازتا اور پھر خود ہی روتا ہوا، منہ بسورتا ہوا ابا کے پاس پہنچ جاتا اور فی البدیہہ کہانی گھڑ دیتا "بھائی مجھے گیند نہیں دیتے اور بہت مارا ہے"۔ پھر فوراً مجھے گیند مل جاتی۔ میری التجا پر نہیں بلکہ دھونس سے۔ گھر کے تمام افراد کے علاوہ ابا کے

کئی دوست بھی میری اس قابلیت کے تختۂ مشق بنے۔ ان میں سے چنگل چچا (سلطان احمد) اب بھی مجھ کو یاد ہیں۔ جب پہلی دفعہ ابا کے ساتھ اُن کے گھر گیا تو پارو چچی (بیگم سلطان احمد) میری اس قابلیت سے واقف تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی اپنی گود میں بٹھالیا اور پوچھا "بھلا بیٹا تم ٹافی کھاتے گا؟" میں نے بے پوچھے بوجھے فوراً "ہوں" کہا — پھر کہنے لگیں "ہم اپنے بیٹے کو بہت سی ٹافیاں دیں گے لیکن ایک شرط ہے وہ یہ کہ ڈرائنگ روم میں تمہارے ابا کے ساتھ تمہارے چچا بیٹھے ہیں۔ ان کے پاس جاؤ اور خوب گالیاں دے کر آؤ۔ بھلا میں کیوں چوکتا فوراً سینہ تان کر چل دیا۔ جیسے ہی ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، ابا نے کہا "چنگل صاحب! آپ ان کو جانتے ہیں" وہ ابھی ہاں یا نہ بھی نہ کہنے پاتے تھے کہ میں نے ایک لمبی چوڑی گردان شروع کر دی۔ وہ حیران، ابا ششدر کہ پارو چچی ہنستی ہوئی آئیں اور مجھے گود میں اٹھالیا، لیکن ٹافی دینے کا وعدہ پورا نہیں کیا، اسی لئے تو یہ واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے — ابا جب بھی پوچھتے "میں کون ہوں" اور میں ان کو الف سے لے کر یے تک سنا دیتا، ابا شاباشی دیتے اور قریب کھڑی امی جان کی طرف اشارہ کر کے پوچھتے "یہ کون ہیں؟" پہلے تو میں امی جان کی غصیلی آنکھیں اور تیوریاں دیکھتا پھر آہستہ آہستہ کھسک کر ابا کی گود میں بیٹھ جاتا۔ اور جب ہر طرح سے اپنے آپ کو امی جان کی مار سے محفوظ پاتا تو فر فر دس بیس گالیاں دے مارتا، امی جان "خبیث" کہہ کر بڑھتیں اور ابا مجھے چھپا لیتے، امی جان اس حرکت پر برستیں اور ابا کے قہقہے بلند ہوتے۔

امی جان کو عطر جمع کرنے کا شوق تھا اور مجھے اس کو تباہ کرنے کی عادت۔ ابا امی جان کو جونہی باتوں میں مصروف پایا چپکے سے کھسک گیا، کمرہ بند کیا، الماری سے عطر دان نکالا تیل کی خالی بوتلیں جمع کیں۔ اور امی جان کے تھوڑے سے عطر کو تیل کی بوتلوں میں منتقل کر کے پانی بھر دیا۔ پھر عطر سے تیار کردہ اس محلول کو اپنے بدن پر بھی چپڑا، کپڑوں کو بھی بسایا اور کمرے کے ہر گوشے کو معطر کرنے کی خاطر خوب چھڑکاؤ کیا۔ جونہی عطر کی خوشبو اڑ کر امی جان کی ناک تک پہنچتی وہ مجھ پر لعنت ملامت کرتیں اور ابا میری اس حرکت پر جی بھر کے ہنستے اور پر خطر حالات میں پناہ بھی انہی کی گود میں ملتی۔ اسی لئے امی جان سے میری نہیں بنتی تھی، وہ میری قابلیت کو سراہتی ہی نہیں تھیں۔ بلکہ الٹا مجھے "خبیث" کہہ کر مارنے دوڑتیں اور منہ میں انگارہ رکھنے کی دھمکی دیا کرتیں — اس کے برخلاف ابا میری ہر حرکت پر خنداں ہوتے۔ میری کسی شرارت پر دھول دھپا کرنے کی بجائے اپنے سینے سے لگا لیتے، اسی لئے ابا سے خوب دوستی تھی۔ اٹھنا، بیٹھنا، سونا سب کچھ ان ہی کے ساتھ ہوتا۔ حالانکہ اکثر رات ابا کو "نہلایا" بھی لیکن وہ مجھے اپنے ساتھ سلاتے۔ اور میں بھی جب تک ان سے چمٹ کر نہ لیٹوں نیند نہیں آتی تھی۔ ابا بھی میرے بغیر نہیں سو سکتے تھے۔ اس کا اندازہ مجھے اب ابا کے اس خط سے ہوا جو کہ انہوں نے امی جان کو ۱۵؍ جون ۱۹۴۵ء کو لکھا جب کہ وہ تنہا لکھنؤ تھے۔ اور ہم تینوں بھائی اور امی جان بھوالی (نینی تال) گئے ہوئے تھے۔

"بابا مجھے اس قدر یاد آتا ہے کہ کیا بتاؤں۔ اب تک یہ حال ہے کہ رات کو آنکھ کھل جاتی ہے کہ بابا کو پیشاب کرالوں۔ اور مجبوراً خود ہی پیشاب کر کے سو رہتا ہوں۔"

جب تک ابا گھر میں رہتے ہیں خیر تھا جو دل چاہا وہ کیا۔ لیکن جونہی وہ دفتر روانہ ہوئے۔ مجھے بھیگی بلی بننا پڑتا۔ اور امی جان نے لیا ہمیں آڑے ہاتھوں، میری لاکھوں دھمکیوں کے باوجود کہ "شام کو ابا سے شکایت کروں گا۔ کہ آپ نماز پڑھ کر ہاتھ اٹھا کر ابا کو دیر تک گالیاں دیتی رہتی ہیں" پھر بھی مجھے پڑھنا ہی پڑتا۔ تھوڑے ہی دن میں میں اس قابل ہوگیا۔ کہ بڑی بڑی گالیاں بکنے کے علاوہ چھوٹی

موٹی کہانیاں بھی پڑھ لیا کروں۔ پھر کیا تھا جب ابا دفتر جاتے وہ مجھ سے کاپیوں کی فرمائش کرتے اور میں کہانی کی کتابوں کی۔ دن بھر میں تنہا اردو کی پہلی کتاب، سیپارہ اور امی جان ان کے ہاتھ میں پنکھا رہتا چاہے گرمی ہو چاہے سردی یہ پنکھا ہاتھ میں رکھنا ضروری تھا تاکہ مجھے بھی اس کی ڈنڈی سے نواز سکیں اور جب دل چاہے اسے جھل بھی سکیں۔ امی جان کی مار کھانے کے بعد، ٹسوے بہانے کے بعد تھوڑا بہت رو رو کر پڑھنے کے بعد ابا کے انتظار کی گھڑیاں شروع ہو جاتیں۔ پھر ابا آتے اور میری امید سے زیادہ بہت ساری خوبصورت سرورق والی کہانی کی کتابیں لاتے۔ میں ابا سے مارے خوشی کے لپٹ جاتا۔ ابا خوب پیار کرتے پھر میں ان کتابوں میں منہمک ہو جاتا اور سوچتا کتنے اچھے ہیں ہمارے ابا۔"

محمد طفیل صاحب (مالک ادارہ فروغ اردو) اکثر ابا کے پاس آتے تھے، جب ان کو ابا کے مسودات لے جاتے دیکھا تو ابا سے پوچھا کہ "ابا یہ آپ کے لکھے ہوئے کاغذ کیوں لے جاتے ہیں"۔ ابا سے معلوم ہوا کہ ان کاغذات سے ابا کا ناول چھپے گا۔ ابا کی کتابیں چھپیں گی اور میری نہیں یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اب میں ہر وقت طفیل صاحب کا انتظار کرتا کہ وہ آئیں اور میں ان کو چھپنے کے لئے کہانی لکھ کے دوں۔ طفیل صاحب آتے تو کاغذ کے چند پرزے طفیل صاحب کے حوالے کر دیتا اور اپنی چھپی ہوئی کتاب کا انتظار شروع ہو جاتا۔ ابا سے برابر اپنی کتاب کی بابت پوچھتا اور ابا پیار سے کہتے "بس جلد ہی چھپ کر آجائے گی۔"

جب میری کوئی شرارت، شرارت کے دائرے سے بڑھ کر بدتمیزی بن جاتی تو ابا مجھ سے خفا ہو جاتے لیکن مجھ پر زندگی بھر غصے میں بھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔ بس زیادہ سے زیادہ یہ کرتے کہ میرا بستر گول کیا، ہتھیلی میں آٹھ آنے رکھے اور کہا "چلیے گھر سے تشریف لے جائیے"۔ پہلے ابا کی طرف رونی صورت بنا کر دیکھتا لیکن ان کے دوبارہ کہنے پر چل دیتا۔ کہاں باہر نکل کر گھر کا ایک چکر کاٹتا پھر کسی چور دروازے سے اندر آجاتا اور کہیں چھپ کر بیٹھ جاتا۔ تھوڑی دیر بعد ابا کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان سے معافی مانگ لیتا۔ ابا مجھے نہ صرف معاف کرتے، چمٹا لیتے بلکہ اپنی جیب سے کچھ پیسے نکال کر بھی دیتے اور گھر سے نکلتے وقت کی اٹھنی اس کے علاوہ ہوتی۔ ایک دفعہ کھانے کی میز پر کوئی بدتمیزی مجھ سے سرزد ہوئی اور ابا نے ایک اٹھنی میری ہتھیلی پر رکھی اور گھر سے نکل جانے کو کہا۔ مجھ کو مجبوراً نکلنا پڑا۔ کوٹھی کا چکر کاٹا اور کوٹھی کے پیچھے نوکروں کے پیخانہ میں چھپ گیا۔ کافی دیر جب ٹھڈیوں پر بیٹھا بیٹھا تھک گیا تو سوچا کہ چلو کسی دروازے سے اندر جھانکیں اور دیکھیں کہ ابا دفتر چلے گئے یا نہیں۔ اب جو اندر جھانکا تو کمرے میں کوئی نہ تھا۔ وہاں سے ہٹ کر گیراج کے پہلو سے کوٹھی کے آگے دیکھا تو ابا کوٹھی سے باہر نالے کے پل پر کھڑے تھے۔ اور امی جان ان کے ساتھ تھیں۔ اتنے میں سعید بھائی، خورشید بھائی اور اقبال ماموں (اقبال صفی پوری) اپنی اپنی سائیکلیں لے کر آئے اور ابا نے ان سب کو مختلف سمتوں پر روانہ کر دیا۔ ابا کے چہرے سے پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ میں بے خیالی میں اب جھانکنے کی بجائے ان دونوں کے بالکل سامنے تھا۔ کہ اتنے میں امی جان کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ میں پھر چھپ گیا۔ لیکن دوسرے لمحے امی جان مجھ تک پہنچ گئیں اور مجھے گھر لے گئیں، جونہی ابا کو دیکھا میں نے رونا شروع کر دیا اور انہوں نے مجھے گود میں اٹھا لیا میری ہچکیاں رک گئیں۔ اور میں پہلے کی طرح شاداب ہو گیا۔

جب میرا بچپن اور جوانی آپس میں گلے مل رہے تھے، میری مسیں بھیگ رہی تھیں تو ابا کی فکر معاش انہیں کراچی لے گئی۔ اور وہ روزنامہ جنگ کراچی کے مدیر ہو گئے۔ میری تعلیم نے مجھے لاہور ہی میں رکھا۔ اکثر ابا کی یاد اس درجہ ستاتی کہ دل چاہتا کہ میرے پر لگ جائیں اور میں اڑ کر اپنے پیارے ابا تک پہنچ جاؤں۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوتیں تو ہم سب کراچی چلے جاتے۔ میں گھنٹوں ابا

کے دفتر میں بیٹھا رہتا وہ میری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے اور جب وہ لکھنے میں مصروف ہوتے تو میں پیار بھری نظروں سے ان کو ٹکٹکی باندھ کے تکتا۔ صرف میں ہوتا اور میرے پیارے ابا۔

پھر جب روزنامہ "جنگ" راولپنڈی سے بھی نکلنے لگا تو ابا راولپنڈی آ گئے۔ اب گرمیوں کی چھٹیوں میں کراچی جانے کی وہ کشش ختم ہو جاتی تھی۔ لیکن سعید بھائی کراچی ہی میں ملازم ہیں۔ اس لئے امی جان کے ساتھ کراچی جانا ہی پڑتا پھر بھی کراچی جانے سے پہلے ہی کم از کم ایک ہفتہ کے لئے کوہ مری ضرور رہتا۔ مری جانا تو فقط ایک بہانہ تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ابا کو دیکھنے کو جی چاہتا تھا اور میں مری جانے سے پہلے راولپنڈی میں ایک دن ابا کی صحبت میں گزارتا۔ جس میں وہ کبھی محبت بھری باتیں کرتے، کبھی اپنی بذلہ سنجی سے ہنساتے اور کبھی صرف خاموش ہو کر مجھے ان آنکھوں سے دیکھتے جس میں کہ صرف محبت، پیار اور شفقت کی جھلک ہوتی پھر مری سے واپسی پر بھی ایک دن ایسا ہی گزرتا —— ابا بھی وقتاً فوقتاً لاہور آتے، ہم لوگوں سے ملتے اور وہی بیتے لمحات لوٹ آتے جب کبھی اپنی بے پناہ مصروفیت کی وجہ سے ہم لوگوں سے ملے بغیر راولپنڈی چلے جاتے تو ہم سب کو بہت دکھ ہوتا۔ اور میں اسی وقت شکایتوں سے بھرپور خط بھیجتا —— گزشتہ سال مجھے معلوم ہوا کہ عید الفطر کے موقع پر ابا لاہور ہی میں تھے۔ لیکن ہم لوگوں سے ملے نہیں۔ تو مجھے بہت دکھ ہوا۔ اور میں نے فوراً ان کو شکایت آمیز خط لکھا۔ جس کے جواب میں اور باتوں کے علاوہ مجھے یوں سنایا۔

"میں عید منانے کے لئے نہیں بلکہ چیف سیکرٹری مغربی پاکستان کی خواہش پر ایک ضروری باریابی کے لئے ۷؍ مارچ کو رات کے تین بجے خیبر میل سے روانہ ہو کر ۸؍ مارچ کو صبح نو بجے لاہور پہنچا اور اسی شام کو پانچ بجے کے ہوائی جہاز سے پنڈی واپس آ گیا۔ میں وہاں کسی سے نہ مل سکا نہ ملنے کا وقت تھا۔ میرا قطعی عزم ہے کہ کم سے کم ایک ہفتہ کی چھٹی لے کر لاہور پہنچوں اور اپنے روٹھے ہوئے بچوں کو کلیجے سے لگا کر منا دوں، مگر میری یہ خواہش بہت جلد اس لئے پوری نہ ہو سکے گی کہ انتخابات سر پر ہیں۔ دوسرے ابھی دلی کے لئے چھٹی لے چکا ہوں۔"

اور پھر ایک سال کی مدت کے بعد ابا واقعی لاہور آ گئے۔ ہم کو کلیجے سے لگا کر منانے کے لئے نہیں بلکہ موت سے گلے ملنے کے لئے —— اپنے روٹھے بچوں کو منانے کی بجائے وہ خود ہم سے روٹھ گئے۔

۴؍ مئی کو سورج طلوع ہوا اور اپنی کرنوں میں رات کی سیاہی کے ساتھ ساتھ، میری ماں کا سہاگ بھی سمیٹ لے گیا۔ ایک چھنکے سے امی جان کی چوڑیاں ٹوٹیں اور پھر وہ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتی رہیں —— اور پھر کلمۂ شہادت فضاؤں میں گونجا اور ابا کی بارات خدا کے گھر چل دی۔ وہ بارات جس میں خوشی کے شادیانے نہ تھے بلکہ ہم سب کے بہتے آنسو، ابھرتی ہچکیاں ——

آج لڑکھڑاتی زبان سے کہنا پڑ رہا ہے: "کتنے اچھے تھے ہمارے ابا، کتنے پیارے تھے ہمارے ابا" —— اتنے پیارے کہ خدا کو پیارے ہو گئے —— اپنے کہنے پر یقین نہیں آتا، اس وقت بھی کونسا یقین تھا۔ جب اپنی آنکھوں سے ان کے بے جان چہرے کو دیکھا۔ اپنے کاندھے پر سہارا دے کر ان کو ان کی آخری آرام گاہ تک لے گئے؛ اپنے ہاتھوں سے مٹی ڈالی —— جب سب کہتے ہیں تمہارا باپ مر گیا۔ تم یتیم ہو گئے تو بہتے آنسو ان کی اس بات کی صداقت تسلیم کر لیتے ہیں۔

پیارے ابّا شوکت تھانوی

شوکیہ تھانوی

میرے ابّا کو بچے سے لے کر بوڑھے تک کون نہیں جانتا ہوگا۔ جو لوگ شوکت تھانوی کو نہیں جانتے وہ قاضی جی کو ضرور جانتے ہوں گے اُن کے جنگ اخبار کے کالم پہاڑ تلے رکھیے یادیں کچھ باتیں، ریڈیو اسٹیشن کے پروگرام قاضی جی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ میں اپنے ابّا کے گھر ۱۹۵۱ء میں پیدا ہوئی۔ یوں ان کی زندگی کی تمنّا پوری ہوئی۔ جس کے لئے انہوں نے بہت سی منتیں مانی ہوئی تھیں۔ شاید کوئی لڑکے کے ہونے پر بھی اتنی خوشی نہ مناتے۔ جتنی کہ میرے پیدا ہونے پر منائی گئی تھی۔ ۴۰ دن کے بعد مجھے داتا صاحب کی حاضری کے لئے لے جایا گیا۔ امّی اور ابّا بہت ساری ریزگاری بھی فقیروں میں تقسیم کرنے کے لئے لے گئے تھے۔ دعا مانگنے کے بعد ابّا نے ریزگاری بانٹنی شروع کر دی۔ لیکن اُس زمانے میں سنا ہے کہ فقیر اتنے تھے کہ خدا کی پناہ۔ کسی نے ابّا کا کوٹ پکڑا کسی نے ہاتھ پکڑا مجھے دو مجھے دو کی رٹ لگانا شروع کر دی۔ ابّا تنگ آ گئے اور شرارت جو سوجھی ساری کی ساری ریزگاری ایک طرف زمین پر پھینک کر کہنے لگے کہ جاؤ بھائی آپس میں لڑو مجھ سے کیوں لڑتے ہو۔ اور خود ایک طرف کھڑے ہو کر اُن کا تماشہ دیکھ کر ہنسنے لگے۔ اور کہنے لگے جو (امّی کو زہرہ کہنے کے بجائے جو کہتے تھے) کتنی اچھی کشتیاں تھیں۔

میری عمر اس وقت بارہ سال ہے۔ آج سے آٹھ سال پہلے کی کچھ باتیں تحریر کرتی ہوں۔ جب میں پانچ برس کی تھی تو مجھے کنونیٹ سکول میں داخل کرایا گیا۔ ابّا ریڈیو اسٹیشن پر رہتے ہی۔ اسکول ابّا کے راستے میں پڑتا تھا۔ اس لئے اُن کے ساتھ آنے جانے میں بہت خوشی محسوس کرتی۔ شام کے وقت فرش پر گھوڑا بننا، ہم کو اپنی پیٹھ پر سوار کرنا ابّا کا خاص مشغلہ تھا۔ جب پیٹھ پر بیٹھا کر اِدھر اُدھر ہوتے تو امّی کو ہمارے گرنے کی بہت فکر ہوتی۔ لیکن ابّا ہنستے ہوئے کہتے کہ میں اس نسل کا گھوڑا ہوں جو کہ مالک کے گرنے پر بسم اللہ پڑھتا ہے اور چوٹ نہیں لگتی۔ تین سال کی عمر میں ہم نے گھر میں ایک کتّا پال رکھا تھا۔ جس کا نام جیکی تھا۔ ایک دن میں نے ابّا کی ڈبیا جس میں پان کتھا اور چونا تھا ابّا سے چوری اٹھا کر جیکی کے پاس لے گئی اور جا کر کہا جیکی "تماکو" کھائے گی۔ ابّا نے مجھے دیکھ لیا اور گود میں اُٹھا کر کہنے لگے میری بیٹی بہت مہمان نواز بنے گی۔ ایک مرتبہ جگر صاحب مرحوم ہمارے گھر آئے۔ مجھے بلایا گیا۔ میں جگر صاحب کو دیکھ کر سہم گئی۔ اور ان کی گود میں جانے سے انکار کر دیا۔ ابّا کہنے لگے یہ تمہارے بڑے ابّا ہیں۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ یہ دنیا کے ابّا ہیں۔ دنیا اُن دنوں بڑے لمبے لمبے بالوں والی ایک کُتیا ہمارے گھر میں تھی۔ ابّا اس مشابہت سے سخت تلملائے۔ لیکن جگر صاحب بھانپ گئے اور کہنے لگے شوکت یہ لڑکی بڑی ذہین نکلے گی۔ اور وہی

کا نوٹ نکال کر دیا۔

۱۹۵۹ء میں ابا ولایت چلے گئے اور واپس آ کر جنگ میں شمولیت کر لی اور ہم لاہور کی بجائے کراچی چلے گئے۔

کراچی میں ہمیں جس گھر میں رہنا پڑا۔ اُس کی اوپر کی منزل میں چچا سید محمد جعفری رہتے تھے چونکہ اُن کے اور ہمارے گھریلو معاملات میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں تھا۔ اس لئے وقت بہت اچھی طرح گزرنے لگا۔ لیکن کراچی کی آب و ہوا نے ابا اور امی دونوں کی صحت پر برا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد چچا جعفری کی تبدیلی راولپنڈی ہو گئی۔ جس کا ابا کے دل پر بہت اثر پڑا اور ابا نے دل سے دعا کی یا اللہ مجھے بھی میرے بھائی کے پاس بھیج دو۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ کراچی کی بجائے راولپنڈی دارالخلافہ بن گیا اور روزنامہ جنگ بھی راولپنڈی سے نکلنا شروع ہو گیا اور ہم لوگ بھی کراچی سے راولپنڈی آ گئے۔

راولپنڈی میں جو ہمیں گھر ملا وہ بہت چھوٹا تھا۔ لیکن پھر بھی ابا بہت خوش تھے اور کہتے تھے مجھے یہ آب و ہوا بہت پسند ہے۔

ڈھائی سال کی کوشش کے بعد ہمیں اب بہت اچھا گھر ملا۔ جو کہ دیکھنے میں بہت خوبصورت تھا۔ لیکن ہمارے لئے بہت منحوس ثابت ہوا۔ اور اُس میں بدقسمتی سے چار مہینے ہی رہے۔

پہلے مہینے میں اسی مکان میں یہ بدشگونی ہوئی کہ میرے ساتھ سخت حادثہ پیش آیا۔ میں نہانے کے لئے غسل خانے میں گئی کہ گیس نے مجھ پر اتنا اثر کیا کہ میں بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔ اس حادثہ کا ابا پر بہت اثر ہوا اور رات کو مجھے اُٹھ اُٹھ کر دیکھتے رہتے تھے۔ مارچ میں ابا کو بخار اور کھانسی نے آ گھیرا اگرچہ علاج کرانے سے بخار اور کھانسی کو آرام تو آ گیا۔ لیکن باوجود اس کے ابا بڑے سنجیدہ رہنے لگے تھے پھر چند دن بعد یہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ کھانسی بخار ہو جاتا اور کبھی آرام آ جاتا۔ کمزوری دن بدن بڑھتی رہی تھی ان دنوں غلاف کعبہ کی زیارت پنڈی میں ہو رہی تھی۔ لیکن ابا اپنی کمزوری اور لوگوں کی بے پناہ بھیڑ سے کچھ مایوس سے ہو گئے۔ اور امی سے کہنے لگے میری قسمت میں زیارت نہیں ہے۔ خلیل صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ کہنے لگے کہ شوکت فکر مت کرو۔ میں جلوس کے ختم ہونے پر غلاف آپ کے گھر لا کر آپ کی خواہش پوری کر دوں گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ ابا کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اس کو چوما آنکھوں سے لگایا۔ اور سب کمروں میں لے جایا گیا۔ کہنے لگے میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ میں نے گھر پر ہی زیارت کر لی اور کہنے لگے۔ شوکیہ دعا کرو میں اور تمہاری امی وہاں جا کر حج کے موقعہ پر بھی زیارت کریں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہ تھا۔

۲۳، مارچ کو ابا اپنا تمغۂ امتیاز حاصل کرنے کے لئے لاہور تشریف لائے اور ان کی یہ خواہش تھی کہ میں اپنا مکمل علاج لاہور جا کر ہی کراؤں گا۔ ۲۲، مارچ کو جب ابا لاہور ریلوے اسٹیشن پر اترے تو اُسی وقت اُن کو ۱۰۰ بخار تھا۔ اور میرے بھائی ہمیں لینے کے لئے آئے تھے۔ دوسرے دن ابا کو ۱۰۱ بخار تھا اور گورنمنٹ ہاؤس جانا تھا۔ اسی حالت میں آپ وہاں گئے۔ وہاں آپ کی ملاقات نیاز صاحب سے ہوئی۔ جو کہ ابا کے خاص دوستوں میں سے ہیں۔ نیاز صاحب اُن کی حالت دیکھ کر سخت حیران ہوئے اور کہنے لگے۔ کل میں آپ کو اپنے ہاں بلاؤں گا۔ میرے ہاں ڈاکٹر صالح میمن جو کہ پاکستان کے چند ڈاکٹروں میں سے ہیں۔ دکھایا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور ڈاکٹر صاحب معائنہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ جگر میں پھوڑا ہے۔ ہسپتال داخل ہو جانا چاہیئے۔ لیکن ابا کا اصرار تھا کہ نیاز صاحب میں ہسپتال میں داخل نہیں ہوں گا۔ البتہ گھر پر ہی علاج کراؤں گا۔ کیونکہ ابا انجکشنوں اور دواؤں سے بہت گھبرائے ہوئے تھے۔

گھر پہ ہی کرنل یوسف کا علاج شروع ہو گیا۔ لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے رؤف یوسف نے جو کہ میو ہسپتال کے انچارج بھی ہیں معائنہ کیا اور کہا آپ فوراً ہسپتال میں داخل ہو جائیں۔ لیکن ابّا اب تک اس بات پر بضد تھے کہ میں کسی قیمت پر ہسپتال نہیں جاؤں گا۔ آخر جب گھر پہ کسی قسم کا افاقہ نہ ہوا۔ تو ابّا کے چند مخلص دوستوں نے اصرار کیا مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر امی نے کہا کہ شوکت صاحب اگر آپ اپنے لئے نہیں تو کم از کم ان بچیوں کے لئے ہی ہسپتال چلے جائیے۔ رضامند ہو گئے۔ لیکن اس شرط پر کہ میرا اپریشن نہ ہو۔ ۱۰ اپریل کو ابّا البرٹ وکٹر کمرہ نمبر ۵ میں بستر علالت پر لیٹ گئے۔ اور علاج شروع ہو گیا۔ امی نے بہت محنت کی رات دن تیمارداری کے لئے کھڑی رہتی تھیں اور دعا کرتی رہتی تھیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ہسپتال میں ابّا کو دیکھنے کے لئے ابّا کے دوستوں اور عزیزوں کا ہر وقت جمگھٹا رہتا تھا۔ جس سے نرسیں بہت گھبراتی تھیں۔

۱۹ اپریل کو ڈاکٹروں کا ایک بورڈ بیٹھا۔ ڈاکٹروں نے کینسر ہونے کا اعلان کیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اس بیماری کا مکمل علاج تو ہمارے پاس ہے نہیں۔ البتہ جو انجکشن ہم لگا رہے ہیں۔ اُن سے شوکت صاحب کچھ عرصہ کے لئے اور زندہ رہ سکیں گے۔ جس سے ہم سب مایوس ہو گئے۔ اور ابّا کی زبردست خواہش کے مطابق ۲۸ اپریل کو گھر لایا گیا۔ گھر آ کر ابّا بہت خوش ہوئے اور ہومیو پیتھک کا علاج شروع کر دیا۔ تقریباً چھ دن یہ علاج ہوا لیکن طبیعت دن بدن گرتی ہی گئی۔ ۳۰ اپریل کی شام کو حالت بہت نازک ہو گئی۔ ۱۵۔۱۰ منٹ تک بے ہوشی کے عالم میں پڑے رہے۔ جب ہوش آیا تو امی نے پوچھا کہ آپ کو کیا ہوا تھا۔ تو کہنے لگے شوکیہ میرے سامنے آ کر بیٹھی تھی۔ اور اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُسے دیکھ کر مجھے محسوس ہوا جیسے میرے دل پہ انگارے ہیں۔ اس لئے میں بے بس ہو گیا۔ اور بعد میں مجھے ہوش نہیں تھا کہ کیا ہوا۔

۴ مئی کو صبح پانچ بجے امی کو ابّا نے آواز دی۔ اس وقت امی مسلسل جاگنے کی وجہ سے سو رہی تھیں۔ میں بھاگی ہوئی اندر ابّا کے کمرے میں گئی۔ ابّا کہنے لگے آؤ میری بچی میرے پاس بیٹھو اور بتاؤ کہ اس مرتبہ عید کا کیا پروگرام ہے۔ میں نے کہا کہ اس مرتبہ تو امی نے ہمارے کپڑے نہیں بنائے اور یہ خواہش ہے کہ آپ کے ٹھیک اور تندرست ہونے پر راولپنڈی جائیں گے اور وہیں جا کر میلاد شریف کرائیں گے اور نئے کپڑے پہنیں گے۔ اسی دوران امی بھی جاگ اٹھیں اور ابّا کہنے لگے ہاں بیٹی صرف ایک گھنٹے کا پروگرام ہو گا۔ اس کے بعد امی نے تھرمامیٹر لگایا۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب کو حال بتانا تھا۔ امی نے ناشتہ بنانا شروع کیا کہ چچا جعفری کے لڑکے علی جعفری تشریف لے آئے اور کہنے لگے۔ مجھے مکمل حالت بتائی جائے تاکہ میں ابّا کو جا کر بیان کر سکوں۔ خالو نے کہا آپ اندر جا کر خود ہی دیکھ لیں۔ کیونکہ ابّا اُس وقت بالکل خاموش تھے۔ اور کچھ کانپ رہے تھے۔ خالو نے امی سے کہا کہ باجی دیکھیں یہ کانپ کیوں رہے ہیں۔ اس عرصہ میں گھر کے سب لوگ اکٹھے ہو گئے۔ اور امی سے نحیف آواز میں دو مرتبہ کچھ کہا جو سمجھ میں نہ آیا۔ اور لمبی سانسیں لینا شروع کر دیں۔ اسی وقت کورامین ان کے منہ میں ڈالی اور چھوٹے ماموں ڈاکٹر کی طرف بھاگے۔ لیکن ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ابّا ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے۔

پیارے ابّا

خورشید شوکت

جولائی ۱۹۶۲ء کا غالباً آخری ہفتہ ہوگا۔ تاریخ ٹھیک سے مجھے یاد نہیں۔ بہرحال اُنہی دنوں، میں ایک روز اپنے دفتر کے کمرے میں کام سے فرصت پاکر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا کہ کسی نے دروازے کو آہستہ سے کھٹکھٹایا۔ میں نے بڑی لاپرواہی کے ساتھ بہت ہی افسرانہ انداز میں کہا "YES COME IN"

دروازہ آہستہ سے کھلا اور دیکھا کہ ابّا مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔ ابّا کی اس غیر متوقع آمد نے مجھے کچھ بوکھلا دیا۔ اور میری پیچھے جھکی ہوئی کُرسی گرتے گرتے بچی۔ ابّا کے ساتھ اُن کے لاڈلے نسیم ممتاز سید بھی تھے جن کو ابّا بڑے پیار سے میجر کہا کرتے تھے۔ حالانکہ اُن بیچارے کا بندوق کی گولی سے کہیں دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ میری اور ابّا کی آخری ملاقات ہے تو میں کیوں اُن کو اتنی جلدی جانے دیتا۔ میں اُن کو لے کر کہیں دُور تنہائی میں چلا جاتا جہاں میرا بچپن پھر لوٹ آتا، میں اُن کی گود میں سر رکھتا، اُن کے بالوں سے کھیلتا، اُن کی گردن میں بانہیں ڈال کر جھولا جھولتا اُن سے اتنی بہت ساری باتیں کرتا، اتنی بہت ساری باتیں کہ جو کبھی نہ ختم ہوتیں۔ لیکن افسوس کہ میں کوئی خاص بات نہ کر سکا۔

میرے ساتھی ابّا سے ملنے کے بے حد متمنی تھے اور اس وقت کی غیر متوقع ملاقات سے بہت خوش تھے اور ان کی خواہش تھی کہ اس تھوڑے سے وقت میں زیادہ سے زیادہ باتیں کرلیں اور میں خاموش بیٹھا ہوا بڑی فراخدلی کے ساتھ اُن کو یہ موقع فراہم کر رہا تھا۔ کاش میں جان سکتا کہ یہ لمحے میرے لیے کس قدر قیمتی ہیں۔

میں خاموش تھا لیکن میری آنکھیں ابّا پر تھیں اور دماغ زندگی میں پہلی مرتبہ ابّا کے جسمانی تغیر پر حیران تھا کہ ایک دم سے کیا ہو گیا — بال سفید۔ آنکھوں میں چمک کی بجائے ایک مستقل سوچ۔ چہرے پر جھرّیوں کے آثار۔ جھکے ہوئے شانے۔ ایکدم سے اتنی ضیعفی پتہ نہیں کیسے اُن پر ٹپک پڑی تھی۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے پوچھ ہی لیا۔

"ابّا آپ کو یہ ایک دم سے کیا ہو گیا ہے، آپ اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے شاید؟"

ابّا نے میرا مطلب سمجھ لیا اور مسکراتے ہوئے بولے "بیٹا صحت کا خیال تو رکھتا ہوں لیکن عمر کی رفتار کیسے روک سکتا ہوں اُس کے بھی تو کچھ تقاضے ہیں جو پورے ہو رہے ہیں اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔"

ابا کے اس جواب سے میں مطمئن نہ ہوا لیکن اس موضوع پر زیادہ اصرار کر کے میں ابا کو کسی ذہنی انتشار میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے بات یہیں پر ختم ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد جانے کے لیے اُٹھے تو میرے گال پر بڑے پیار سے ایک ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے بولے "سعید تو انشاءاللہ اب چند دنوں میں دولہا بن جائے گا۔ تم کب دلہن لا رہے ہو؟"

میں نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔

ابا نے میجر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "دیکھئے جناب انھوں نے تو ابھی سے شرمانا شروع کر دیا۔"

ابا واپس گئے تو کچھ دن کے بعد ابا کے خط آنا یکلخت بند ہو گئے۔ میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی کیونکہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کافی دنوں کے لیے ابا غوطہ کھا جاتے تھے اور پھر پتہ چلتا تھا کہ کہیں باہر مشاعرے وغیرہ میں گئے ہوئے تھے یا ایسی ہی کوئی خاص مصروفیات تھیں کہ جو اتنے عرصے خط نہ لکھ سکے۔ لہٰذا میں بھی خاموشی کے ساتھ اُن کے خط کا انتظار کرتا رہا۔ اُسی دوران اتفاقاً میری حمید بٹ صاحب سے ملاقات ہوئی جو ایک دن پہلے پنڈی سے لاہور تشریف لائے تھے۔ حمید بٹ صاحب کی زبانی مجھے اس بات کی اطلاع ملی کہ پچھلے دنوں ابا کی طبیعت کافی خراب رہی ہے اُن کے پَیر کے انگوٹھے میں گاؤٹ ہو گیا ہے۔

خلافِ توقع ابا کا خط ملا جو انھوں نے ۲۳؍اکتوبر ۱۹۶۲ء کو لکھا تھا۔

پیارے خورشید جیتے رہو

میاں مجھ کو گاؤٹ ہو گیا ہے۔ پیر کے دونوں انگوٹھوں نے مجھ کو "گاوتم بدھ" بنا کر رکھ دیا۔ مرض خطرناک ضرور ہے مگر تم مطمئن رہو کہ اب میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا ہوں۔ چمڑے کا جوتا تو ابھی نہیں پہن سکتا۔ مگر ربڑ کے جوتے پہن کر رینگ لیتا ہوں۔ پرہیز نہایت شدید ہو رہا ہے صرف اُبلی ہوئی ترکاریاں کھاتا ہوں۔ کوشش یہی ہے کہ یہ مرض دل تک نہ آ سکے اور میں اسے پیر ہی سے ٹھکرا دوں اور پیر کے ٹھینگے ہی پر مار دوں۔ تم نہ خود گھبراؤ نہ کسی کو گھبرانے دو۔

دلہن کو میری بے پناہ دعائیں پہنچا دو۔ بابا کو بھی دعائیں اور اپنی امی کو نہایت ادب سے آداب۔

خط مختصر اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اس بیماری نے ذرا کام چور بنا دیا ہے۔ بہرحال تم کو میری خیریت کی ضرورت ہے وہ تم کو مل گئی۔ یہ عذرِ لنگ نہیں ہے بلکہ عذرِ لنگ ہی دراصل میرا مرض ہے۔

تمہارا شوکت

امی جان کو جب سے ابا کی اس بیماری کی اطلاع ملی تھی وہ بے حد پریشان تھیں اور ہر وقت ابا کی صحت و تندرستی کی دعائیں مانگتی رہتی تھیں ابا کے اس خط نے بھی امی جان کو مطمئن نہ کیا اور انھوں نے پھر ابا کو خط لکھا کہ اپنی اس بیماری کی پوری تفصیلات لکھیے۔ ابا نے امی جان کو جواب میں ایک مفصل خط بھیجا جو ۶؍نومبر ۶۲ء کو لکھا گیا تھا۔

بیگم صاحبہ!

آداب۔ آپ کا خط موصول ہوا۔ آپ میری بیماری کی تفصیلات پوچھنا چاہتی ہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ

یہ تفصیلات نہ پوچھیں اس لیے کہ ہر بیماری خطرناک بھی ہوتی ہے اور اگر خدا پر بھروسہ رکھا جائے تو کوئی بیماری خطرناک نہیں۔ بہرصورت جس طرح میں اپنی طرف سے مطمئن ہوں اسی طرح میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی مطمئن رہیں۔ ویسے یہ گاؤٹ آپ کے لیے جیسا کہ آپ نے لکھا ہے نئی بیماری نہیں ہے یہ وہی بیماری جس میں رفیع احمد خاں کا انتقال ہوا تھا۔ لیکن یہ سوچنے کی کوشش کیجئے کہ اگر یہ بیماری نہ ہوتی تو بھی وہ کسی اور بہانے سے مرتے۔

دراصل ہر انسان کے جسم میں حسبِ ضرورت تیزابیت ہوتی ہے وہ اگر ضرورت سے زیادہ بڑھ جائے تو جسم کے کسی نشیبی حصے میں جمع ہو جاتی ہے اور ہڈیوں کے کسی جوڑ میں تکلیف پیدا کر دیتی ہے اور اُس کے ذرات خون میں شامل ہو کر دورانِ خون کے ساتھ دل سے بھی گذرنے لگتے ہیں لہٰذا اگر اس کا کوئی ذرہ دل سے نہ گزر سکے اور اٹک جائے تو مخدوش ہو سکتا ہے۔

مگر مجھے اُمید ہے کہ یہ نوبت انشاء اللہ نہ آنے پائے گی البتہ مجھے تکلیف بہت شدید ہے۔ کچھ دن پہلے تو یہ حال تھا کہ چلنا پھرنا کیا معنی اگر میرے بستر کے پاس سے بھی کوئی گزر جاتا تھا تو اُس کے پیر کی دھمک سے میری جان پر بن جاتی تھی پھر میں بمشکل تمام غسلخانہ تک جانے لگا اور رفتہ رفتہ اس قابل ہو گیا کہ ربڑ کا جوتا پہن کر تھوڑا بہت چل پھر سکوں۔ اب میں چل پھر سکتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے دفتر بھی آ جاتا ہوں، دل بہلانے کے لیے ایک آدھ پارٹی میں بھی شرکت کر لیتا ہوں مگر اب تک اس قابل نہیں ہوا ہوں کہ چمڑے کا جوتا پہن سکوں۔ پیر کے دونوں انگوٹھوں میں ابھی درد موجود ہے۔ گائے کا گوشت۔ ماش کی دال۔ گوبھی۔ آلو۔ اروی۔ کرم۔ کلّا اور اسی قسم کی دوسری چیزیں مع چاول کے زندگی بھر کے لیے حرام کر دی گئیں ہیں اور آج کل تو پرہیز اتنا سخت ہے کہ ڈیڑھ مہینے سے صرف اُبلی ہوئی بے مسالہ چیزیں کھا رہا ہوں۔ حد یہ ہے کہ پالک کے ساگ کا نہایت بدمزہ سُوپ تک پینا پڑتا ہے جب تک یہ درد موجود ہے یہی کرنا پڑے گا اور اس درد کے جانے کے بعد بھی شدید احتیاطیں کرنا پڑیں گی۔ اس لیے کہ یہ گھُن تو اب لگ ہی چکا ہے۔

دفتر والوں نے فی الحال یہ اجازت دے رکھی ہے کہ میں کم سے کم کام کروں اور جتنا کام چاہوں گھر پر کروں اور جتنا چاہے دفتر میں کروں بہرصورت اُمید ہے کہ انہی احتیاطوں کے سہارے چلتا رہوں گا۔

یہ میری بہو[1] کے مبارک قدم ہیں کہ میں اس سخت حملے سے بچ گیا اور خورشید اس سخت حادثے[2] کے باوجود محفوظ رہا۔ خدا کرے خورشید اب بخیریت ہو میری دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔

بچوں کو میری طرف سے متفکر نہ ہونے دیجئے گا اور یہ واقعہ بھی ہے کہ خطرہ بڑی حد تک ٹل چکا ہے۔

بس اب دعا کیجئے کہ دوسرا حملہ نہ ہو۔

معلوم نہیں دلہن لاہور میں ہیں یا کراچی روانہ ہو گئیں۔ سعید کو چاہیئے کہ جب تک کوئی معقول اور

---

[1] سعید بھائی جان کی بیوی

[2] اسی دوران میرا اسکوٹر ACCIDENT ہوا تھا۔

مستقل انتظام نہ کر لیں دلہن کو نہ بلائیں بہر حال وہ خود سمجھداری سے کام لیں گے۔

دلہن۔ خورشید اور بابا کو بہت بہت دعائیں۔

خیر اندیش شوکت

اچانک میری شادی کا پروگرام بنا۔ ابا کو تاریخ سے مطلع کیا گیا۔ گھر میں شادی کی چہل پہل تھی اور ہر شخص بڑی بے چینی سے ابا کا منتظر تھا کہ شام کی ڈاک سے ایک خط ابا کا بھائی جان کے نام پہنچا اور گھر کی ساری چہل پہل جیسے سو گئی۔ خط کا مضمون تو مجھے یاد نہیں کیونکہ وہ خط بھائی جان کے نام تھا اور ان ہی کے پاس محفوظ ہے البتہ یہ ضرور یاد ہے کہ انھوں نے لکھا تھا کہ وہ شادی کے دوسرے روز ولیمہ میں ضرور شریک ہوں گے اور میرے سہرے کے کچھ شعر لکھ کر بھیجے تھے جو میری زندگی کا ایک عظیم سرمایہ ہیں۔

گوندھ کر لاؤ میرے تارِ نظر کا سہرا
میرے بیٹے میرے خورشیدِ عمر کا سہرا
سیم و زر کا ہے نہ ہے لعل و گہر کا سہرا
ہے سعیدہ[1] کی دعاؤں کے اثر کا سہرا
گوندھ دے دل بھی مرا سہرے کی لڑیوں میں کوئی
کیوں نہ ہو یہ ہے میرے لختِ جگر کا سہرا
ہنستے ہیں سعید[2] اور کھلے جاتے ہیں سعید[3]
دیکھ کر بھائی کے سر پہ گلِ تر کا سہرا
چاندنی ایک دلہن اور ہے دولہا خورشید
کیوں نہ پھر اس کو کہیں شمس و قمر کا سہرا
ہوئے دختر کے فرائض سے سبکدوش رشید[4]
شاد ہیں دیکھ کے اب بیٹی کے سر کا سہرا
حاصلِ زیست ہے یہ دن کہ ہے دیکھا شوکت
شبِ امید کی تابندہ سحر کا سہرا

شادی کے روز یہ سہرا میرے چھوٹے بھائی بابا نے پڑھا اور جس نے بھی سنا اسے اس قدر پسند آیا کہ اسے بار بار پڑھنے کی فرمائش کی۔ میرے خسر جناب ایم اے رشید صاحب نے سہرے کو سن کر بے ساختہ کہا "یہ سہرا کوئی بڑے سے بڑا شاعر نہیں کہہ سکتا صرف باپ ہی کہہ سکتا ہے۔" پتہ نہیں اس سہرے میں کیا بات تھی۔ شاید جذبات کی اس قدر فراوانی تھی کہ جس نے بھی سنا آنکھ میں آنسو بھر لایا۔

میں بھی دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا کہ ابا کیوں نہیں آئے کہ دوسرے روز ابا کا ایک مختصر سا خط پہنچا کہ "بیٹا! میرے نہ آسکنے پر اپنا دل میلا نہ کرنا۔ بخدا میں آنے کے لیے بالکل تیار تھا کہ ایکدم بلڈ پریشر اتنا بڑھ گیا کہ ڈاکٹروں نے سفر کی قطعی ممانعت کر دی اور میں آنے سے مجبور ہو گیا۔ بہر صورت میں اپنی بہو کا خیر مقدم انشاء اللہ جلد ہی کسی اور موقع پر کروں گا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیروں گا۔ فی الحال تم مجھ کو روحانی طور پر وہاں موجود سمجھو۔"!

۱۶ جنوری ۱۹۶۳ء کو مجھے خوب تیز بخار چڑھا اور میں پسلیوں میں شدید درد لے کر بستر پر لیٹ گیا۔ پہلے تو ڈاکٹر نے نمونیہ تشخیص کیا لیکن جب مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی تو ڈاکٹر صاحب نے بھی اپنی رائے بدلی۔ خون ٹسٹ ہوا، ایکسرے کرایا گیا اور آخر مجھے شدید قسم

---

[1] میری والدہ محترمہ [2] میرے بڑے بھائی جان [3] میرا چھوٹا بھائی (بابا) [4] میرے خسر کا نام

پلورسی بتا دی گئی۔ ایک پورا پھیپھڑا پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ سارا گھر پریشان تھا ڈاکٹر نے پورے تین ماہ کے لیے مجھے بستر پر لٹا دیا تھا۔ میں ملازمت کی طرف سے بے حد فکر مند تھا اور رو رو کر اپنی جان ہلکان کئے جا رہا تھا کہ "ابا یاد آ رہے ہیں" امی جان نے میری یہ تمام کیفیت ابا کو لکھ کر بھیج دی تھی جس کے جواب میں ابا نے ۲۶ر جنوری ۶۳ء کو راولپنڈی سے مجھے یہ خط لکھا۔

پیارے بیٹے خورشید۔ جیتے رہو

تم نہایت بیوقوف آدمی ہو کہ بیماری اور بیماری کے سلسلے میں ملازمت سے پریشان ہو گئے ہو۔ تم اطمینان رکھو کہ تمہارا باپ تم سے دُور سہی مگر تم سب اس کی دعاؤں سے بہت قریب ہو۔ میں اللہ تعالےٰ سے تم سب کی صحت اور زندگی کی بھیک مانگتا رہتا ہوں اور مجھے پورا اعتقاد ہے کہ میری یہ دعائیں وہ بے نیاز قبول بھی کرتا ہے

میں نے ابھی حکیم نیر واسطی کو خط لکھ دیا ہے وہ ضرور تم کو آ کر دیکھیں گے۔ میں نے صفدر میر صاحب کو بھی خط لکھ دیا ہے وہ بھی تمہاری رخصتوں میں تم کو نقصان نہ پہنچنے دیں گے۔ اور ہر اعتبار سے اللہ کا فضل رہے گا۔

تم ہرگز نہ گھبراؤ اور پوری طرح اطمینان رکھو کہ تم کو انشاءاللہ میری زندگی میں کوئی نقصان نہ پہنچ سکے گا۔

میں نے سُنا ہے کہ تم روتے رہتے ہو۔ نہایت احمق ہو۔ تمہاری دلہن بھی کیا کہتی ہو گی کہ کیسا رونا میاں ملا ہے۔ اپنے دل کو مضبوط کرو۔ علاج اور پرہیز کا خیال رکھو۔ ملازمت کی فکر نہ کرو۔ اللہ مالک ہے۔ یہ فکر تمہاری نہیں میری ہے۔ اچھا بس آج سے تم یہ یقین کرو کہ تم اچھے ہو رہے ہو اور انشاءاللہ بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔

میں عنقریب لاہور آ کر اپنے بیٹے سے ضرور ملوں گا اور تندرست بیٹے سے ملوں گا۔ بابا کو حکیم صاحب کے پاس بھیجدو، وہ ان کو لے آئے اور ٹیلیفون پر ان سے وقت مقرر کر لے۔ اپنی امی کو تسلی دو۔ خود بھی اطمینان رکھو اور اپنی دلہن سے نخرے بھی نہ کرو۔ اس کے آنسو پونچھو۔ دلار کرو اس کا اور ٹھیک ہو جاؤ۔

سعید دلہن کو اور خورشید دلہن کو دعائیں کہو۔ بابا کو پیار کرو۔ اپنی امی کو آداب کہو۔

تمہارا دعا گو ابا
شوکت

ابا کے اس خط نے مجھے بہت بڑا سہارا دیا اور میں نے جلدی جلدی سنبھلنا شروع کر دیا۔ حکیم نیر واسطی صاحب مجھے آ کر دیکھ گئے تھے اور بھائی جان بھی میری بیماری کی اطلاع پا کر کراچی سے چھٹی لے کر لاہور آ گئے تھے۔ علاج پورے زور شور کے ساتھ ہو رہا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے روز میری خیریت معلوم کرنے کے لیے ابا کا خط امی جان کے پاس آتا تھا۔

۸ر فروری ۱۹۶۳ء کو ابا کا ایک اور خط میرے نام پہنچا۔

میری جان۔ میری عمر تجھے لگے۔

خورشید خدا کے لیے یقین کر لو کہ میں راولپنڈی میں ہوں مگر میری روح تمہارے پاس ہے کہ تم جلد میرے لیے تندرست ہو جاؤ گے۔ دیکھو میں تم کو بتاؤں۔ تم کو یاد ہو گا لکھنؤ میں میرے ایک دوست تھے یوسف مرزا۔

ان کو شدید پلوریسی تھی۔ خدا کے فضل سے اب تک ڈنڈے بجاتے پھرتے ہیں۔ تمھاری جان سے دور، جگر صاحب کو شدید پلوریسی تھی مگر انتقال قلب کی وجہ سے ہوا اور نہ جانے پلوریسی کے کتنے مریض ہنس کھیل کر تندرست ہو چکے ہیں۔ میرا چاند بھی اسی طرح ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ۔ حکیم نیر واسطی صاحب کا اطمینان بخش خط مجھ کو مل چکا ہے۔ سعید کا خط بھی مل گیا ہے مگر میں جس قدر بھی جلد ہو سکا اپنے بیٹے کی دیدہ جوئی کے لیے آؤں گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ تم مجھ سے تندرست ملو۔

اچھا اب ایک کام فوراً کرو کہ بابا کو بلا کر حکم دو کہ وہ میری کتابوں اور تصویروں وغیرہ میں ڈھونڈھ کر خواہ گروپ میں ہوں یا علیحدہ علیحدہ مندرجہ ذیل لوگوں کی جتنی تصویریں بھی مل سکیں فوراً رجسٹری کے ذریعہ مجھے بھیج دے ایک کتاب کے لیے شدید ضرورت ہے۔ بیٹے! یہ کام میں تم سے لیتا مگر تم بیمار ہو تو اپنی نگرانی میں بابا سے یہ کام کرا دو۔ جن لوگوں کی تصویریں درکار ہیں، وہ یہ ہیں: (۱) مولانا آسی (۲) سید جالب دہلوی (۳) وحشی بلگرامی (۴) امین سلونوی (۵) نسیم انہونوی (۶) سراج (۷) قدیر (۸) رفیع احمد خان (۹) ظریف لکھنوی

ان میں سے سب نہ سہی جن جن کی تصویریں ملیں اور میری اگر پرانی تصویریں ہوں تو بھیج دو۔ مثلاً داڑھی والی تصویر بہت ضروری ہے۔ میں یہ سب تصویریں بلاک یا فلم بنوا کر واپس کر دوں گا۔ میری کچھ دن پہلے کی تصویریں بہت ضروری ہیں۔

اچھا اب تم تندرست ہو جاؤ اور میری بقیہ عمر کا تحفہ قبول کرو۔ اپنی امی کو تسلیم کہو۔ دلہنوں کو دعا۔ بابا کو پیار۔

تمھارا ابا شوکت

میری طبیعت بہتر ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود ابا کی غیر موجودگی کی وجہ سے میں نے آزاد ہو کر میں نے خط لکھا۔ جس کا جواب ابا نے ۸ مارچ ۱۹۶۳ء کو مجھے دیا۔ جو کہ میرے نام ابا کی زندگی کا آخری خط ہے۔ بلکہ میرے نام کیا غالباً اس خط کے بعد انھوں نے کسی کو خط نہیں لکھا اور یہ ان کے خطوط کی آخری تحریر ہے اگر پھر اس کے بعد کسی اور کو خط لکھا ہو تو میرے علم میں نہیں ہے۔

۸؍ مارچ ۱۹۶۳ء

پیارے خورشید سلامت رہو!

تمھارے ہاتھ کا لکھا ہوا خط میرے لیے بہت بڑی نعمت ثابت ہوا۔ اللہ تعالیٰ تم کو صحت عطا فرمائے۔

میں نے بھی حامد جلال صاحب کو خط لکھ دیا ہے۔ تم کوئی فکر ملازمت وغیرہ کی نہ پالو۔ جان ہے تو جہان ہے۔

میاں کاش میں تم کو لکھ سکتا کہ میں صحت کے سلسلہ میں کن حالات سے گزر رہا ہوں۔ صحت بگڑتے بگڑتے اس حالت پر آ پہنچی ہے کہ اب پندرہ دن سے بالکل صاحب فراش ہیں۔ بخار تو نہ جانے کب سے شام کو ہو جایا کرتا تھا اور اندر ہی اندر مجھ کو گھلا رہا تھا مگر میں نے اس کی پروا نہ کی۔ لاہور کے مشاعرے میں گیا تو بابا اور رشید صاحب کو خود دکھا دیا تھا کہ لو دیکھ لو بخار اس وقت بھی ہے۔ بہرحال اس بخار کے بعد کھانسی اور کھانسی کے بعد بلغم کے معائنے اور نہ جانے کیا کیا شروع ہوا اور مجھ کو بالکل لٹا دیا گیا۔ مجھ سے اب تک کہا تو یہی جا رہا ہے کہ کوئی

خاص بات نہیں کوئی خطرناک بات نہیں مگر بہت سی باتیں میں خود اپنے عزیزوں اور بچوں سے چھپا رہا ہوں کہ سب کو خواہ مخواہ پریشان کیوں کروں۔

میں انشاء اللہ زندہ رہوں گا صرف اس لیے کہ تم کو خوش رہنے کا موقع ملے تم ہرگز متفکر نہ ہونا۔ ۲۳ر تاریخ کو تمغۂ امتیاز گورنر صاحب عطا کریں گے لہٰذا میں ۲۳ر تاریخ کو کسی نہ کسی طرح لاہور میں ہوں گا۔ پھر لاہور کے ڈاکٹروں سے اپنا معائنہ بھی کراؤں گا۔ اس دوران تم سے بھی انشاء اللہ ضرور ملوں گا۔ سب کو سلام دعا کہہ دو۔ بابا کو پیار۔ اپنی دلہن کو بے حد دعائیں کہو۔

تمہارا — شوکت

ابا کے اس خط نے سارے گھر کو بدحواس کر دیا۔ امی جان نے خیریت معلوم کرنے کے لیے فوراً ایک خط راولپنڈی روانہ کیا جس کا پھر کوئی جواب نہیں ملا۔ دو یا تین دن بعد ۲۳ر مارچ بھی آ گئی کہ جب ابا کو لاہور آنا تھا۔ ۲۴ر مارچ کی صبح اخبار سے یہ اطلاع ملی کہ کل ابا نے گورنر ہاؤس میں گورنر صاحب سے تمغۂ امتیاز لیا ہے۔ اس خبر سے قدرے اطمینان ہوا اب ہر لمحہ ابا کا انتظار تھا۔ جب تین چار دن گزر گئے تو ہم لوگوں نے سمجھ لیا کہ ابا واپس پنڈی چلے گئے کیونکہ اتنے دن پنڈی سے غیر حاضر رہنا ابا کے لیے بہت مشکل تھا۔ میں اس خیال سے کہ ابا پھر ہم لوگوں سے ملے بغیر واپس چلے گئے بہت غمگین تھا۔ اس دوران میں نے ایک خط ابا کو لکھنا شروع کیا لیکن پتہ نہیں کیوں وہ نامکمل رہ گیا اور آخر وہ منحوس گھڑی بھی آ گئی جب مجھے ابا کی تشویشناک حالت کی اطلاع ملی۔

یہ یکم اپریل ۱۹۶۳ء کی بات ہے۔ میرا چھوٹا بھائی بابا اپنی بھابی فریدہ کے ساتھ مل کر اپنے دوستوں کو فرسٹ اپریل فول بنا رہا تھا کسی کو نمکین کھیر کھلائی جاتی اور کسی کو پان میں پسی ہوئی سرخ مرچ ڈال کر کھلائی جاتی اور کھانے والا "تھو تھو" کر کے بھاگتا۔ رات کے ۹½ بجے ہوں گے کہ مجھے اطلاع ملی کہ ابوالحسن نغمی صاحب تشریف لائے ہیں۔ نغمی صاحب میرے پاس کمرے میں آ گئے اور بابا، فریدہ نے جلدی جلدی نمکین کھیر تیار کی لیکن اس سے پہلے کہ نغمی صاحب وہ نمکین کھیر کھاتے انھوں نے یہ کہہ کر ہم لوگوں کے حلق میں تیزاب انڈیل دیا کہ "شوکت صاحب کی حالت بہت تشویشناک ہے۔ ان کے جگر پر کینسر ہو گیا ہے اور وہ اس وقت گڑھی شاہو اپنی چھوٹی بیگم کے گھر پر زیر علاج ہیں" مجھے نہیں یاد کہ پھر اس کے بعد میں نے نغمی صاحب سے کیا باتیں کیں یا انھوں نے کیا کچھ کہا۔ جب میرے ذرا حواس درست ہوئے تو نغمی صاحب جا چکے تھے اور بابا بیٹھا ہوا مجھ کو سمجھا رہا تھا "بھائی جان اپنے آپ کو سنبھالئے، دیکھئے آپ کی طبیعت خود ٹھیک نہیں ہے اگر آپ نے اتنا اثر لیا اور خدانخواستہ آپ کی طبیعت پھر گڑبڑ ہو گئی تو کیا ہو گا۔ اللہ پر بھروسہ رکھئے انشاء اللہ یہ خبر غلط ہو گی۔"

امی جان کو جب ابا کی بیماری کی خبر ہوئی تو وہ ایکدم سے اپنے حواس کھو بیٹھیں اور ہر وقت جھولی پھیلائے اللہ کے آگے گڑگڑاتی رہتیں ان کی حالت بھی نہیں دیکھی جاتی تھی رات دن جائے نماز بچھائے بیٹھی رو رہی ہیں اور ابا کی صحت و تندرستی کی دعائیں مانگ رہی ہیں۔

بھائی جان کو بھی بابا نے اطلاع دے دی تھی اور وہ لاہور آنے کے لیے چھٹی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے ابھی تک مجھ کو چلنے پھرنے کی اجازت بالکل نہیں دی تھی اور میں ابا کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔

۶ اپریل ۱۹۶۳ء کو ابا میو ہسپتال البرٹ وکٹر میں داخل ہو گئے۔ میں ابا کی بیماری اور امی جان کی بدحواسی سے بہت گھبرایا ہوا تھا۔ ۷ یا ۸ تاریخ کو بھائی جان بھی لاہور پہنچ گئے اور آتے ہی ابا کی تیمارداری میں مصروف ہو گئے۔ بھائی جان صبح ہسپتال جاتے اور رات گئے گھر واپس آتے۔ بابا اور رشید چچا کا بھی زیادہ وقت اسپتال ہی میں گزرتا یہاں گھر پر امی جان، فریدہ اور ہر وقت اللہ کے حضور گڑگڑاتے رہتے۔ میری زبان پر تو جیسے یہ کلمہ ورد ہو گیا تھا کہ "خدا میرے ابا کو اچھا کر دے۔ خدا میرے ابا کو اچھا کر دے۔" سوتے جاگتے ہر وقت یہی کلمہ زبان پر ہوتا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور ایک روز میں ڈاکٹر سے زبردستی اجازت لے کر بھائی جان کے ساتھ ابا کو دیکھنے اسپتال پہنچ گیا۔ اب میں کیا بتاؤں وہاں جا کر میں نے کیا دیکھا۔ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ پلنگ پر پڑا ہوا تھا۔ اگر بھائی جان میرے ساتھ نہ ہوتے اور مجھے نہ بتاتے تو میں ابا کے پاس سے گزر جاتا اور انھیں نہ پہچان سکتا۔ ابا کو اس حال میں دیکھنے کے لیے میں بالکل تیار نہ تھا اور مجھے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

ابا نے مجھ کو دیکھا تو آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے "بیٹا تم کیوں آئے۔"

بھائی جان نے جلدی سے آگے بڑھ کر ابا کو تسلی دی کہ میں ڈاکٹر کی اجازت لے کر ہسپتال آیا ہوں اور اب مجھے ڈاکٹر نے اتنی اجازت دے دی ہے کہ میں تھوڑا بہت چل سکتا ہوں۔

ابا نے آنکھ کے اشارے سے مجھے کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا اور پھر ان پر غشی طاری ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے آنکھیں کھولیں اشارے سے بھائی جان کو بلایا اور بہت ہی آہستہ بولے "بیٹا تمھاری دلہن کراچی میں ہے خورشید کی دلہن کو دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔"

بھائی جان نے ابا کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا "خورشید تو آج ہی فریدہ کو ساتھ لا رہے تھے لیکن میں نے روک دیا کیونکہ اسپتال کے ڈاکٹر زیادہ آنے والوں پر اعتراض کرتے ہیں بہر حال کل فریدہ بھی آ جائیں گی۔"

میری تینوں بہنیں شوکیہ، فوزیہ اور فیضیہ بھی اپنی بھابھی سے ملنے کے لیے بے تاب تھیں۔ میں نے وعدہ کیا کہ کل ضرور فریدہ کو لے کر آؤں گا۔ اتنے میں میجر صاحب (نسیم ممتاز سید) بھی آ گئے۔ ان بیچارے نے تو ابا کی محبت میں اپنے کو بالکل وقف کر لیا تھا۔ ابا نے میجر صاحب کو دیکھا تو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور بڑی محبت سے بولے "سید اپنے ہاتھ سے ایک پان تو کھلا دو۔ شاید سید کے ہاتھ کا پان کھا کر شفا ہو جائے۔"

ادھر امی جان کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی کسی بات کا ان کو ہوش نہیں تھا نہ کھانے پینے کا اور نہ کپڑوں کا۔ دن میں دو تین بار اختلاجی دورہ پڑتا تھا اور بلڈ پریشر ایکدم خطرے کی حدوں میں پہنچ گیا تھا اور وہ مچل رہی تھیں کہ کسی طرح مجھ کو اپنے ابا کے پاس اسپتال پہنچا دو جبکہ ڈاکٹر اور ابا کے دوستوں کی قطعی رائے نہیں تھی کہ اس عالم میں امی جان اسپتال آئیں قطعی ممکن تھا کہ اس حال میں ابا کو دیکھ کر وہ اپنے آپ کو نہ سنبھال پائیں اور پھر اس کا اثر مریض پر کتنا خراب پڑے گا۔ اس لیے ہم لوگ ہر طرح سے امی جان کو ٹال رہے تھے کہ ابھی ابا سے ملنے کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔ ہم لوگ بھی باہر ہی باہر سے خیریت معلوم کر کے آ جاتے ہیں۔ ذرا ان کی طبیعت سنبھل جائے پھر جا کر دیکھ لیجئے گا۔

دوسرے دن جب میں اسپتال گیا تو فریدہ بھی میرے ساتھ تھی۔ شوکیہ، فوزیہ اور فیضیہ بڑی دیر سے اسپتال میں اپنی بھابھی کی منتظر تھیں جیسے ہی ہم دونوں کو آتا دیکھا تینوں دوڑ کر اپنی بھابھی سے لپٹ گئیں۔ ابا نے فریدہ کو دیکھا تو مارے محبت کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے

فریدہ نے جھک کر نہایت ادب سے سلام کیا تو بہت ساری دعائیں دے کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور پھر مجھ کو اور بھائی جان کو مخاطب کر کے بولے۔ ”دیکھو یہ لڑکی صرف میری بہو ہی نہیں ہے بلکہ اس سے ایک اور رشتہ بھی ہے کہ یہ رشید کی بیٹی بھی ہے (رشید چچا اور ابا کے تعلقات اتنے پرانے اور زیادہ رہے ہیں کہ بہت سے لوگوں نے رشید چچا کو ہمیشہ ابا کا چھوٹا بھائی سمجھا تھا)

پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ ”خورشید میں کہہ دیتا ہوں اس لڑکی کی کبھی دل آزاری نہ ہونے پائے ورنہ مجھے بے حد دکھ ہوگا۔ اور سعید بیٹے جس طرح تمھاری یہ تین بہنیں ہیں اسی طرح فریدہ کو بھی اپنی چوتھی بہن سمجھنا۔“ اتنا کہہ کر پھر نقاہت سے آنکھیں بند کر لیں۔

۲۸ر اپریل کو ابا ہسپتال سے واپس گڑھی شاہو، اپنی دوسری بیگم کے ہاں چلے گئے۔

بھائی جان کی چھٹیاں پھر ختم تھیں ایک ہفتہ پورا ہو گیا تھا۔ ابا کو ان سب باتوں کی فکر تھی مجھے پاس بلا کر کہنے لگے۔ ”بیٹا کل سعید کراچی جا رہا ہے؟“ — میں نے کہا۔ ”جی ہاں جا تو رہے ہیں لیکن صرف دو دن کے لیے۔ ہوائی جہاز کا سفر ہے دو گھنٹہ میں پہنچ جائیں گے اور پہنچتے ہی چھٹی کی کوشش شروع کر دیں گے۔ ہو سکتا ہے کل صبح جائیں اور پرسوں شام واپس بھی آ جائیں۔ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟“

بہت ہی نقاہت سے بولے۔ ”گھبراتا نہیں ہوں بیٹا بس دل چاہتا تھا کہ سعید کل اور رُک جاتا۔“

میں نے پوچھا۔ ”کل کیا کوئی خاص بات ہے؟“

کہنے لگے۔ ”ہاں بیٹا کل تم آنا اور دیکھنا یہ میرا کمرہ ایئر کنڈیشنڈ کر دیا جائے گا اور میری یہ مسہری بدل دی جائے گی۔“

اس بات کا مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اس دن صبح ہمدرد دواخانہ کے حکیم سعید ابا کی مزاج پرسی کے لیے آئے تھے اور انھوں نے یہ بات کہی تھی کہ یہ کمرہ بہت چھوٹا اور گرم ہے لہذا اس کو ایئر کنڈیشنڈ ہونا چاہیے اور اس کام کو انھوں نے حکیم اعجاز کے سپرد کر دیا تھا کہ کل شوکت صاحب کا کمرہ ایئر کنڈیشنڈ کر دیا جائے اور ان کی یہ مسہری بدل دی جائے۔

اب سوچتا ہوں کہ ابا کا یہ کہنا کہ کل میرا کمرہ ایئر کنڈیشنڈ کر دیا جائے گا اور میری مسہری بدل دی جائے گی۔ اپنی طنز نگاری کا ایک آخری طنز تھی۔ ان لوگوں پر جو کل کا پروگرام بنا رہے تھے — وہ جانتے تھے کہ کل کیا ہونے والا ہے تب ہی تو وہ کہہ رہے تھے کہ ”کاش سعید کل اور رُک جاتا۔“

ابا کی طبیعت اب کافی سنبھل گئی تھی اور بڑے مزے میں باتیں کر رہے تھے رات کے گیارہ بجے خود سے بولے۔ ”بیٹا اب تم لوگ جاؤ، میرا سونے کا پروگرام ہے۔“

ہم لوگ رخصت ہونے لگے تو بابا نے کہا۔ ”ابا وعلیکم السلام“

مسکرا کر بولے۔ ”دیکھو کتنا شریر ہو گیا ہے۔“

میں بابا کو لے کر گھر واپس آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بھائی جان بھی آ گئے اور اپنی صبح کی روانگی کی تیاری کرنے لگے۔

صبح ناشتہ سے فارغ ہوئے تو کہنے لگے ”رات ابا سے کہہ تو آیا ہوں لیکن پھر سوچتا ہوں جا کر سلام کر لوں اور دیکھ آؤں۔“

امی جان نے کہا۔ ”ہاں ہو آؤ لیکن جلدی واپس آ جانا۔“

اور واقعی بھائی جان بہت جلدی یتیم ہو کر گھر واپس آ گئے۔ ہم لوگ لٹ گئے، ہمارا گھر تباہ ہو گیا۔ امی جان پچھاڑیں کھا رہی

تھیں۔ سینہ کوٹ رہی تھیں۔ بال نوچ رہی تھیں اور ہر ایک سے لپٹ لپٹ کر پوچھ رہی تھیں "بتاؤ یہ کیا ہوا۔ کہہ دو کہ یہ خبر غلط ہے۔" جو بھی ان کی یہ حالت دیکھتا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ رشید چچا، فریدہ اور فریدہ کی والدہ رو بھی رہی تھیں اور امی جان کو بھی سنبھال رہی تھیں۔ بابا بیچارہ ایک طرف مچل رہا تھا۔ بھائی جان مجھے سینے سے لگائے کھڑے خود رو رہے تھے اور میرے آنسو پونچھ رہے تھے۔ جب میں زیادہ نڈھال ہونے لگا تو بھائی جان مجھے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لا کر سمجھانے لگے۔ "خورشید ہم لوگ تو خوش قسمت ہیں کہ ایسے شخص کے بیٹے ہیں کہ جس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا اور جب تک شوکت تھانوی کا نام زندہ ہے ہمارا باپ زندہ ہے۔ اور دیکھو تم اس طرح روؤ گے تو ابا کی روح کو کس قدر تکلیف ہوگی۔ تمھیں یاد ہے ایک خط میں انھوں نے تم کو لکھا تھا کہ "میری بقیہ عمر کا تحفہ قبول کرو"۔ انھوں نے اپنا تحفہ دے دیا۔ اٹھو اب تم بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کرو۔"

میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو اوپر اٹھایا اور بے ساختہ میری زبان سے نکلا "خدا میرے ابا کو اچھا کر دے۔"

”جو نہ مرتا کوئی دن اور ——“

عادل رشید

شوکت تھانوی۔ ! جی ہاں! یہی وہ نام ہے جس کی اہمیت کو میں نے زندگی میں سب سے پہلے جانا تھا۔ ۲۱-۲۲ء میں شوکت صاحب محمد عمر تھے، وہ ابھی شوکت تھانوی نہیں بنے تھے۔ اس وقت وہ گورنمنٹ حسین آباد ہائی اسکول میں نویں جماعت کے طالب علم تھے اور میں اس وقت اپنی ماں کی گود میں بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت میری عمر سال دو سال کی تھی۔

۱۹۲۶-۲۷ء میں محمد عمر صاحب لکھنؤ کے ”ہمدم“ اخبار میں جسے مولانا جالب دہلوی صاحب ایڈٹ کرتے تھے، اسسٹنٹ مقرر ہو گئے وہ جالب دہلوی صاحب سے اپنے مضامین پر اصلاح بھی لینے لگے تھے۔ وہ اپنے مزاحیہ خاکوں پر جب جالب دہلوی صاحب سے اصلاح لے رہے تھے میں اپنے گاؤں رشید سی میں کاشت کاروں، نائیوں اور دُھنے جولاہوں کے لڑکوں کے ساتھ گلیوں، گلیاروں، کھیتوں اور باغوں میں کھیل رہا تھا۔ اور جب یہ محمد عمر صاحب روزنامہ ”ہمدم“ کا مزاحیہ کالم ”دودھ و بالائی“ ”شوکت تھانوی“ کے نام سے باقاعدہ لکھ کر مشہور ہونے لگے۔ تو میں اپنی حویلی کے باہر مردانے میں مولوی صاحب کے پاس بسم اللہ شروع کرنے کے لیے بٹھا دیا گیا۔ میری بسم اللہ جتنی دھوم دھام سے ہوئی تھی شوکت تھانوی صاحب کا مزاحیہ کالم اس سے کہیں زیادہ دھوم دھام سے پڑھا جانے لگا۔ ان کے مزاحیہ فقرے ادبی حلقوں میں زبانوں کو مزا دینے لگے۔

میں اپنے مولوی صاحب سے جب الف دو زبر آن اور بے دو زیر بن پڑھ رہا تھا اس وقت شوکت تھانوی صاحب کی شہرت دن دونی رات چوگنی کے حساب سے بڑھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ جب میں میونسپل مڈل اسکول، مٹھی گنج، الہ آباد میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا تو شوکت تھانوی صاحب ”سرپنچ“ لکھنؤ کے مدیر محترم ہو کر اپنے مزاح سے لوگوں کو پاگل اور دیوانہ بنا رہے تھے۔ ہر ہفتہ ”سرپنچ“ لکھنؤ کی آمد کا انتہائی بے صبری کے ساتھ انتظار کیا جاتا۔ اور جب نئے ہفتہ کا ”سرپنچ“ آجاتا تو لوگ ہنس ہنس کر اور قہقہہ لگا لگا کر پاگل ہو جاتے۔

ایک دفعہ تو شوکت صاحب کی اس مزاح نگاری نے ہم سب پر بڑا احسان کیا۔ ہمارے حساب اور اردو کے ماسٹر صاحب انتہائی بدمزاج، روکھے، پھیکے اور مارتے خاں ٹائپ کے انسان تھے۔ وہ کلاس لیتے تو ہم سب کا ڈر کے مارے خون خشک ہو جاتا۔ وہ کسی نہ کسی بات پر ہم لوگوں کو گدھے کی طرح پیٹنے لگتے تھے۔ حساب کا گھنٹہ آیا اور وہ چنگیز خاں، ہلاکو اور نادر شاہ کی شکل میں ہماری کلاس پر حملہ آور ہو گئے۔

ہم سب اپنے اپنے چہروں پر ہوائیاں لئے اور دل ہی دل میں "جل تو جلال تو" کا وظیفہ پڑھتے ہوئے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ہم سب سوچ رہے تھے۔ دیکھیں آج سب سے پہلے کس کمبخت کی شامت آتی ہے۔ کہ وہ یکبارگی کلاس میں آتے ہی اپنی کرسی کے پاس کھڑے ہو کر مسکرائے، پھر ہنسنے لگے۔ اُن کے ہاتھ میں کوئی اخبار تھا۔ وہ اُسے ہم سب کو دکھا کر مسکراتے ہوئے بولے۔

"جانتے ہو یہ کیا ہے۔۔؟

پھر خود ہی فرمانے لگے۔

"یہ "سرپنچ" ہے، لکھنؤ کا ہفت روزہ مزاحیہ اخبار۔"

ہم سب دم بخود کھڑے تھے، حیرت اور تعجب سے "سرپنچ" کے اس شمارہ کو تک رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اس "سرپنچ" میں آخر وہ کون سی دیوار قہقہہ کھڑی ہے۔ جسے دیکھ دیکھ کر یہ مارتے خاں صاحب اپنی سدا کی خونخوار اور عمر کی صورت پر مسکراہٹیں پھیلائے کھڑے ہیں۔ کہ وہ یکبارگی کرسی پر بیٹھ گئے۔ مسکرا کر ہم سب سے بڑی شفقت کے ساتھ بولے۔"

"بیٹھ جاؤ۔۔۔"

ہم سب بیٹھ گئے۔ حیرت و تعجب میں غرق کر بولے۔

"شوکت کا نام سنا ہے کبھی۔۔؟"

"جی ہاں۔۔۔" میں انتہائی ڈرے اور سہمے ہوئے انداز میں مری ہوئی آواز سے بولا۔ "شوکت آج اسکول نہیں آیا ماسٹر صاحب۔ اس کی درخواست آئی ہے۔ وہ بیمار ہے۔"

"ابے چپ۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے "میں اُس گدھے شوکت کی بات نہیں کر رہا۔ میں ہندوستان کے مزاح نگار شوکت تھانوی کی بات کر رہا ہوں۔"

میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جانتے ہو تم شوکت تھانوی کو۔۔؟"

"جی نہیں۔" میں ڈرتے ڈرتے ادب سے بولا۔

"گدھے ہو۔" انہوں نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ "سنو تم لوگ، میں شوکت تھانوی صاحب کا ایک مضمون تم لوگوں کو سناتا ہوں۔"

مجھے افسوس ہے کہ مجھے اس وقت یہ یاد نہیں آرہا کہ وہ شوکت تھانوی صاحب کا کونسا مضمون تھا۔ لیکن اتنا یاد ہے مجھے کہ وہ مضمون اتنا دلچسپ تھا کہ ہم لوگ جو کہ ان ماسٹر صاحب کو شیر ببر اور بھیڑیا سمجھتے ہوئے ہمیشہ اُن کے سامنے چہروں پر ہوائیاں لئے ڈرے ڈرے رہتے تھے۔ یکدم سے مسکرانے لگے۔ اور پھر ہم سب ان شیر ببر اور بھیڑیئے صاحب کے سامنے اُن کی موجودگی میں شوکت تھانوی صاحب کی مزاح نگاری کے جادو سے مسحور ہو کر زور زور سے ہنسنے اور قہقہے لگانے لگے اور یہ گھنٹہ' یہ پیریڈ یونہی ہنستے ہنستے ختم ہو گیا۔

جب چپراسی نے پیتل کے اس ٹنگے ہوئے گول گھنٹہ پر ایک زور کی ضرب لگائی اور گھنٹہ کے ختم ہونے کا اعلان کیا تو ماسٹر صاحب جو کہ خود ہنستے ہنستے پاگل ہو گئے تھے۔ جن کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اپنے رومال سے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے بولے۔

"آج کا یہ پورا پیریڈ تو شوکت تھانوی صاحب کی مزاح نگاری کھا گئی۔ اچھا۔ اب کل سہی۔"

وہ اٹھ کر چلے گئے۔ اور ہم سب نے شوکت تھانوی کی اس نہ بھلائی جانے والی مہربانی پر دل ہی دل میں انہیں ہزاروں اور لاکھوں دعائیں دیتے ہوئے اطمینان کا ایک طویل سانس لیا۔

"شوکت تھانوی صاحب زندہ باد" ہم سب نے مل کر نعرہ لگایا۔ اور میں دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ "کتنا بڑا جادوگر ہے۔ یہ شوکت تھانوی جس نے اپنے سحر سے شیر ببر کو چوکڑی بھرتا اور کلیلیں کرتا ہوا پیارا پیارا ہرن بنا دیا۔ سدا کی محرمی صورت یک دم سے اُس کے جادو سے ہنس مکھ ہو گئی۔"

شوکت تھانوی صاحب کا نام اور اُن کی مزاح نگاری کا جادو میرے دل و دماغ پر ایسا چھایا کہ میں انہیں نہ بھلا سکا۔ ۳۵-۱۹۳۴ء میں جب کہ میں اسلامیہ ہائی اسکول الٰہ آباد میں پڑھتا تھا۔ یہ میرا روز کا معمول تھا کہ اسکول سے آتے ہی گھر میں کتابیں میز پر رکھ کر اور منہ ہاتھ دھو کر سیدھا مسلم لائبریری پہنچتا تھا۔ اس وقت تک شوکت تھانوی کی ادبی شخصیت اور شہرت بام عروج پر پہنچ چکی تھی۔ "سرپنچ" ہندوستان کا مقبول ترین مزاحیہ اخبار تھا اور شوکت تھانوی صاحب کے مضامین کے چار مجموعے "موجِ تبسم" "بحرِ تبسم" "سیلابِ تبسم" اور "طوفانِ تبسم" کے نام سے شائع ہو چکے تھے۔ میں خوشامد کر کے لائبریرین صاحب سے شوکت تھانوی صاحب کے انہی مجموعوں میں سے کسی ایک کو اپنے نام لکھوا کر لے لیتا۔ اور وہیں بیٹھ کر پڑھنے لگتا۔ پڑھتے پڑھتے بے اختیار مسکراہٹیں لبوں پر کھیلنے لگتیں۔ زور سے قہقہہ لگانے کو جی چاہتا۔ مگر لائبریری کا خیال ہو بڑی مشکل سے میں اپنے ان قہقہوں کو ضبط کرتا۔ پھر میرے دوست سید حامد حسن صاحب (مرحوم) بھی شوکت تھانوی کے دیوانے بن کر میرے ساتھ مسلم لائبریری جانے لگے۔ ہم دونوں شوکت کے دیوانے اُن کے ان تبسموں میں غرق ایک دوسرے کو اُن کے ایک ایک فقرہ کو دکھاتے جاتے۔ اور کھو کھو، کھو، کھی کھی، کھی کھی کرتے رہتے۔ یہاں تک کہ لائبریری میں اور دوسرے آنے والے ہم دونوں لونڈوں سے چڑ گئے۔ اور ہمیں لائبریری میں خونخوار اور بیزار کن نظروں سے دیکھا جانے لگا۔

ایک دن لائبریرین صاحب کی طرف سے حکم ہوا۔ "شرافت سے کتابیں پڑھو تو آیا کرو۔ ورنہ تم لوگوں کا داخلہ لائبریری میں بند کر دیا جائے گا۔"

پھر ایک دن وہ آیا کہ ہمیں شوکت تھانوی کی مزاح نگاری پر کھی کھی کھو کھو کرنے کے جرم میں لائبریری سے بے عزت کر کے نکال دیا گیا۔

ہمارے اپنے محلہ میں (الٰہ آباد میں ہمارے عزیزوں کا پورا ایک محلہ دائرہ شاہ رفیع الزماں کے نام سے آباد ہے) دائرہ شاہ رفیع الزماں کے نام سے بھی ایک لائبریری تھی۔ میں وقت کا زیادہ حصہ اسی لائبریری میں گزارتا۔ شوکت تھانوی صاحب کا "سرپنچ" بھی آیا کرتا تھا۔ اسی کی ورق گردانی کیا کرتا۔ پڑھتا تھا تو شوکت تھانوی کو۔ باتیں کرتا تو شوکت تھانوی کی۔ اور اگر کسی ادیب کا احترام کرتا تھا تو شوکت تھانوی کا۔ پھر "سرپنچ" ہی کے ادارہ سے شوکت تھانوی صاحب کا ایک ادبی رسالہ "شباب" آنے لگا۔ شوکت تھانوی، نسیم انہونوی، امین سلونوی، اویس احمد ادیب، ایم اے ربی، اے۔ آر۔ ترا اور رخسان محبوب طرزی (مرحوم) کے نام بار بار نظروں کے سامنے آنے لگے۔ اور میں ان ناموں میں کھویا رہنے لگا۔ لیکن ان سب ناموں میں شوکت تھانوی کا نام ایسا تھا جو دل و دماغ میں کبھی نہ مٹنے والا نقش بن کر رہ گیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے ایک کہانی لکھ کر اس زمانہ میں شوکت تھانوی کے پاس اصلاح کے لئے بھیجی۔ خط میں یہ لکھا تھا کہ اگر آپ اس کہانی پر اصلاح فرما دیں گے تو میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ اور اگر آپ اسے اپنے "شباب" میں شائع فرما دیں گے تو اور بھی احسان مند رہوں گا۔ لفافہ میں کہانی کی رجسٹرڈ واپسی کے لئے میں نے ٹکٹ بھی رکھے تھے۔ یہ کہانی رجسٹری سے پوسٹ کر چکنے کے بعد میں ہر لمحہ شوکت تھانوی صاحب کے جواب اور کہانی کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن وہ اصلاح ہو کر نہ آئی اور نہ اُن کا کوئی خط ہی آیا۔ کوئی دو ہفتہ کے بعد "سرپنچ" میں ایک خط پر نظر پڑی جس میں کسی نے شوکت صاحب سے کہانی پر اُس کی فرمائش کی تھی۔ جواب تھا۔ ہمارے پاس اتنا وقت کہاں کہ ہم اصلاح کرتے پھریں وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ میرے ہی خط اور میری ہی حماقت کا جواب تھا۔ یہ بات اور ہے کہ وہ خط کسی اور کے نام سے چھپا تھا۔ میں سمجھ گیا۔ اور پھر نہ شوکت صاحب کی طرف سے کوئی خط آیا نہ کہانی ہی واپس ملی۔ ظاہر ہے کہ وہ ٹکٹ ضبط ہو گئے اور کہانی ردی کی ٹوکری کھا گئی۔ لیکن اس واقعہ سے شوکت صاحب کی وقعت اور ان کی اہمیت میرے دل سے کم نہیں ہوئی۔

۱۹۳۶ء میں "شاہد" ماہنامہ بریلی کا ایڈیٹر ہو کر جب میں بریلی پہنچا تو جاتے ہی میں نے دس یا پندرہ روپیہ معاوضہ دے کر "شاہد" کے لئے شوکت صاحب سے ایک کہانی منگوائی۔ کہانی کا عنوان تھا "مینار میں گنبد"۔ یہ کہانی اتنی اچھی تو نہیں تھی۔ لیکن چونکہ میرے محبوب ادیب کی کہانی تھی۔ لہٰذا "شاہد" میں میں نے اُسے شائع کر دیا۔

اس کے بعد کسی کام سے لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ تو اب مجھے یاد نہیں رہا کہ کہاں اور کس دفتر میں شوکت صاحب سے ملاقات ہوئی لیکن میں اپنے پسندیدہ ادیب سے ملا۔ شوکت تھانوی میرے سامنے موجود تھے۔ لیکن بات چیت نہ ہونے کے برابر اس لئے ہوئی کہ وہ ملک کے مانے ہوئے مزاح نگار تھے۔ اور میں بزعمِ خود "شاہد" ماہنامہ کا ایڈیٹر تھا۔ دونوں ہی کچھ کھنچے کھنچے سے رہے۔ وہ اپنی جگہ شاید درست اور میں اپنی جگہ پر خود غلط۔

شوکت صاحب کے کسی دوست کی طرف سے انہیں کے ایما پر دبے چھپے انداز میں اس بات کی بھی خواہش ظاہر کی گئی کہ میں اپنے رسالہ "شاہد" کے لئے اُن سے مضمون مانگ لوں۔ لیکن میں نے اس کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ شاید اس لئے کہ شوکت تھانوی صاحب کا "مینار میں گنبد" مجھے دل سے پسند نہ آیا تھا۔ یا شاید اس لئے کہ انہوں نے مجھے کوئی خاص لفٹ نہیں دی تھی۔ البتہ شوکت صاحب کی حالت سے مجھے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ ہندوستان کا یہ عظیم مزاح نگار مالی اعتبار سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں ہے۔

پھر اس کے بعد کوئی ملاقات برسوں نہ ہو سکی۔ اُن کے مضامین البتہ میں پڑھتا رہا۔ اُن کے وہ مضامین جو اچھے بھی تھے اور بہت اچھے بھی اور بُرے بھی تھے۔

۱۹۴۰ء میں شوکت تھانوی صاحب کی چچازاد بہن کی بیٹی عذرا سے میرے رشتہ کی بات چیت اتفاقیہ طور پر شروع ہوئی۔ شوکت تھانوی صاحب کے بھانجے سلمان الارشد صاحب میرے دوست تھے۔ عذرا اُن کی سگی پھوپھی زاد بہن تھی۔ عذرا کے ماں باپ کا انتقال اس کے بچپن ہی میں ہو چکا تھا۔ اُس کی پرورش اس کے ماموں ارشد تھانوی صاحب نے اپنی سگی اولاد ہی کی طرح کی تھی۔ جب یہ بات چیت شروع ہوئی تو میں شادی کے حق میں دل سے نہیں تھا۔ لیکن اس بات کا چارم ضرور تھا کہ عذرا شوکت تھانوی کی بھانجی ہے۔

بہرحال میری شادی ۱۹۴۲ء میں عذرا کے ساتھ ہو گئی۔ ارشد تھانوی صاحب بھوپال میں رہا کرتے تھے۔ وہ وہاں کے مشہور وکیل تھے۔ عذرا کی شادی پر نہ جانے کس وجہ سے شوکت تھانوی صاحب شریک نہ ہو سکے ۔ وہ اپنی بھانجی کی شادی پر لکھنؤ سے بھوپال نہیں آئے

تھے۔ اس شادی کے بعد اُن کا ایک مضمون "عذرا بیٹی" "شاہد" کے لئے بغرض اشاعت مجھے موصول ہوا۔ ساتھ ہی ایک خط بھی میرے نام تھا جس میں لکھا تھا: "عذرا کو دلہن بنتے میں اپنی بے پناہ مصروفیت کی وجہ سے نہ دیکھ سکا اور نہ اس کے دولہا کو یعنی تمہیں میں نے سہرا باندھے دیکھا جس کا قلق تا مرگ رہے گا۔ ایک مضمون "عذرا بیٹی" بھیج رہا ہوں۔ تم "شاہد" کے شادی نمبر میں اُسے شامل کر لو۔ یہ اپنی عذرا بیٹی کے لئے میرا قلمی جہیز ہے۔"

یہ مضمون اتنا پُرکشش، اتنا دلچسپ اور قیمتی تھا کہ "شاہد" میں چھپنے کے بعد اُسے بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے ایک انتخاب میں شوکت تھانوی کے بہترین ادبی شاہکار کی حیثیت سے شامل کیا۔

اس کے بعد چونکہ میں شوکت تھانوی صاحب کا داماد بن گیا تھا لہذا ان کے خطوط کبھی کبھار میرے پاس آتے رہتے تھے۔ لیکن کبھی کبھار ہی۔ اس سے آگے نہ وہ بڑھے اور نہ میں بڑھا۔

۱۹۴۴ء میں "میر صاحب" میری ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ یہ میرے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ تھا۔ میری خواہش ہوئی کہ اپنی اس پہلی کتاب پر میں شوکت تھانوی صاحب سے دیباچہ لکھواؤں۔ چنانچہ اس غرض کے لئے میں نے شوکت تھانوی صاحب کو لکھا۔ اُن کا جواب آیا کہ میں کتاب کا مسودہ انہیں بھیج دوں وہ اس پر بڑی خوشی کے ساتھ دیباچہ لکھ دیں گے۔

میں نے وہ مسودہ شوکت صاحب کو لکھنؤ بھجوا دیا۔ مسودہ کی رسید تو آگئی۔ لیکن دیباچہ کافی دن گزر جانے کے بعد بھی جب نہ آیا تو میں نے انہیں اصرار کے ساتھ یہ لکھا کہ وہ مجھے بغیر دیباچہ کے مسودہ واپس کر دیں۔ بڑی بحثا بحثی کے بعد مسودہ مجھے لکھنؤ سے بھیج دیا گیا۔ ساتھ میں شوکت صاحب کا یہ خط بھی تھا کہ وہ اس پر دیباچہ لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن میری سخت تاکید کے بعد کہ مسودہ بغیر دیباچہ کے بھجوا دیا جائے۔ انہوں نے مسودہ بھجوا دیا ہے۔ خط میں انہوں نے تاخیر کی معذرت اس بنا پر کی تھی کہ وہ سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن کے سلسلے میں بہت مصروف ہیں۔ اور اس تمام عرصہ میں وہ لکھنؤ سے تقریباً باہر رہے ہیں۔ لہذا تاخیر ہوئی ——

میں نے اُن کے اس خط کا انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ یہ کتاب "میر صاحب" بمبئی سے مکتبہ سلطانی بمبئی کی طرف سے سید ابوطاہر کے دیباچہ کے ساتھ چھپ گئی —— قصہ ختم ہو گیا۔

"میر صاحب" چھپنے کے کچھ دن بعد جب میں بھوپال گیا تو مجھے کسی کی زبانی معلوم ہوا کہ شوکت صاحب نے اس کتاب پر دیباچہ اس لئے نہیں لکھا کہ وہ ایک کمزور کتاب تھی۔ کہنے والے نے کہا کہ یہ خود شوکت صاحب نے اُس سے کہا تھا۔

مجھے یہ سن کر ملال ہوا۔ غصہ آیا۔ اس لئے نہیں کہ شوکت صاحب نے میری اس کمزور کتاب پر دیباچہ کیوں نہیں لکھا یا یہ کہ انہوں نے میری اس کتاب کو کمزور کیوں بتایا۔ بلکہ اس لئے کہ اگر واقعی "میر صاحب" کے مضامین میں کمی تھی یا کمزوری تھی تو انہوں نے مجھے اپنا سمجھتے ہوئے اس طرف میری توجہ مبذول کیوں نہ کرائی۔ غیروں کی طرح وہ گول کیوں ہو گئے۔

کہنے والے نے یہ بات کہہ تو دی لیکن وہ یہ نہیں سمجھ پایا کہ اس کی اس بات سے کتنی بڑی بات پیدا ہو گئی ہے۔ مجھے شوکت صاحب کی اس بات پر غصہ آیا ہوا تو تھا ہی، جب میں بمبئی واپس آیا تو میں نے اُن کے ناول "بکواس" پر ترش اور ایک انتہائی سخت قسم کی تنقید لکھی۔ تنقید بہت کڑوی تھی۔ بیحد ترش۔ لیکن میں شوکت صاحب کو آئینہ دکھانا چاہتا تھا کہ وہ خود کیا ہیں۔ لہذا یہ تنقید چھپ بھی گئی لیکن چونکہ میں اپنا نام لکھ کر شوکت صاحب کو بہت زیادہ افسردہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لہذا یہ تنقید عادل رشید کے نام سے نہیں بلکہ اے آر راہ گیر

کے نام سے بمبئی ہفتہ وار اخبار "نظام" میں شائع ہوئی۔ "نظام" کے ایڈیٹر فردوس صہبائی صاحب تھے۔ جو بھوپال ہی کے رہنے والے تھے۔ اور ہم سب کے جاننے والوں میں سے تھے۔ میں نے اُن سے اس رازداری کا وعدہ لے کر یہ تنقید انہیں "نظام" میں اشاعت کے لئے دی تھی۔ لیکن انہوں نے ظلم یہ کیا کہ جب یہ شمارہ انہوں نے شوکت صاحب کو بھجوایا تو ساتھ میں ایک خط بھی لکھ دیا کہ یہ تنقید آپ کے داماد صاحب عادل رشید نے آپ پر کی ہے۔

ظاہر ہے کہ شوکت صاحب کو اس سے ملال ہوا اور انہیں بجا صدمہ پہنچا اس بات سے کہ میں نے اُن کی کتاب "بکواس" پہ اتنی کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ لیکن انہوں نے مجھے اس سلسلہ میں کچھ نہیں لکھا اور میں ان تمام باتوں کی طرف سے انجان ہی رہا۔

۱۹۵۷ء میں، میں دہلی میں تھا۔ شوکت صاحب بھی اسی سانگ پبلسٹی کے سلسلہ میں دہلی آئے ہوئے تھے۔ اور حفیظ جالندھری صاحب کے پاس مقیم تھے۔ انہیں اپنے بھانجے عمران الارشد سے معلوم ہوا کہ میں دہلی میں ہوں۔ انہوں نے عمران سے کہا کہ وہ مجھے اپنی دہلی میں موجودگی کی اطلاع دیں اور مجھے اپنے ساتھ لے کر آئیں۔

لہٰذا جب عمران نے مجھے کہا کہ ماموں جان دہلی میں ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ تو عمران کے ساتھ میں ان سے ملنے کے لئے شام کے وقت حفیظ صاحب کے بنگلے پہ پہنچا کہ میری اور شوکت صاحب کی بات چیت فون پہ ہو چکی تھی۔ اور وہ میرے منتظر تھے)

شوکت صاحب نے مجھے گلے لگا لیا اور میں نے انتہائی سعادت مندی کے ساتھ انہیں اپنا بڑا سمجھ کر اُن سے گفتگو کی ہم سب یعنی میں، عمران، حفیظ جالندھری صاحب اور شوکت صاحب بنگلہ کے لان پر کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔

شوکت صاحب مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔ اور بار بار میرے لباس کو اس انداز سے دیکھ رہے تھے جیسے کہ وہ میرے لباس سے مجھے پرکھنا چاہتے تھے۔ (رئیس لکھنؤ کی پہلی ملاقات کے بعد یہ میری ان کی دوسری ملاقات تھی) میں اس وقت انتہائی شاندار اور قیمتی گرم سوٹ پہنے ہوئے تھا۔

مجھے شوکت صاحب کی یہ پرکھ کچھ اچھی نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن میں خاموش رہا۔ اور اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا تھا البتہ میں نے دل ہی دل میں یہ ضرور سوچا کہ وہ آج اپنی بھانجی کی شادی کے پورے ساڑھے چار سال بعد اپنے داماد کی مالی حیثیت کا اندازہ اس کے لباس سے لگا رہے ہیں۔ اب جبکہ بقول شخصے۔

اب پچھتائے کا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

باتوں کے درمیان شوکت صاحب نے مجھے کہا۔

"میاں! کتنے سال ہو چکے کہ تم ہمارے داماد بنے ہو اور اب تک تمہاری سسرال والوں نے تمہیں دیکھا بھی نہیں ہے۔ لکھنؤ میں بھی تمہاری بہت بڑی سسرال ہے۔ میرے ساتھ لکھنؤ چلو۔"

پھر مسکرا کر بولے۔

"وہاں تمہاری حسین حسین سالیاں بھی تمہیں ملیں گی۔ سالیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنا اور اُن کے ماں باپ سے سلامی وصول کرنا اب کہو؟"

"جی ـــــــ!" میں نے اُن کی اس بزرگی پر دل ہی دل میں اُن کی شگفتہ مزاجی کا اعتراف کرتے ہوئے سعادت مندی سے

کہا: "میرا خود اُن سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ لکھنؤ آنے کا اتفاق ہی نہ ہوا۔"

"تو اب درست کر دو۔" وہ مسکرائے۔ "میرے ساتھ ہی چلو۔ سب سے سلامی وصول نہ کروا دوں تو پھر کہنا۔"

اور ابھی وہ مجھے لکھنؤ اپنے ساتھ چلنے پر اُکسا ہی رہے تھے کہ حفیظ جالندھری صاحب مسکرا کر بولے۔ "اور وہاں وہ حسین حسین سالیاں اس بیچارے کا جوتا چرا کر جو اس کی ساری سلامی وصول کر لیں گی وہ —" حفیظ جالندھری صاحب نے مجھ سے مسکراتے ہوئے کہا: "دیکھو عادل یہ شوکت بڑا مسخرا ہے۔ تم اس کی باتوں میں نہ آنا۔ یہ لکھنؤ میں تمہاری حجامت کرنے پر تُلا ہوا ہے۔"

ہم سب مسکرانے لگے۔ شوکت صاحب نے مسکراتے ہوئے فیصلہ سُنایا۔

"تم عادل میاں میرے ساتھ لکھنؤ چل رہے ہو۔"

اور پھر اُسی وقت انہوں نے عمران کو اپنے پرس میں سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر دیا۔

"عمران! تم ابھی اسٹیشن جاؤ اور کل کے لئے دہلی لکھنؤ ایکسپریس سے سیکنڈ کلاس کی ایک اور برتھ ریزرو کرا لو۔"

دوسرے دن رات کے نو بجے میں شوکت صاحب کے ساتھ لکھنؤ کے لئے روانہ ہو گیا۔ رات کے کوئی دس بجے تک وہ مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ عزیزوں کی باتیں، خاندان کی باتیں اور ارشد تھانوی کی باتیں۔ شوکت صاحب ارشد صاحب کو بھائی جان کہتے تھے۔ اور میں ارشد صاحب کو ابّو کہتا ہوں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ ہم دونوں ہی ان خاندانی باتوں کے علاوہ ادبی نیز مجلسی باتوں سے گریز کر رہے تھے۔ نہ شوکت صاحب نے "شاہد" کا ذکر کیا اور نہ اس میں اپنے مضمون لکھنے کا اور نہ میں نے ہی یہ ذکر کیا کہ اپنے "شاہد" میں "مینار ہی گنبد" لکھتا تھا۔ نہ انہوں نے میری ادبی کاوشوں کا ذکر کیا۔ اور نہ میں نے اس کا اظہار ضروری سمجھا کہ میں اپنے اسکول کے زمانے سے آپ کا مداح ہوں۔

لکھنؤ جب ہم پہنچے تو وہاں میری خوش دامن صاحبہ امّی، اور ارشد صاحب ابّو موجود تھے۔ وہ لوگ بھوپال سے لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ اور یہ بات شوکت صاحب نے مجھے دہلی میں نہیں بتائی تھی۔ شاید ایک سرپرائز دینے کے لئے۔ میں ان دونوں کو وہاں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ارشد صاحب (ابّو) شوکت صاحب کی اس بات پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے کہ شوکت صاحب دہلی سے اصرار کر کے مجھے اپنے ساتھ لکھنؤ لے آئے۔

شوکت صاحب اُن دنوں بڑی خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے۔ یو۔ پی کے وہ سانگ پبلسٹی آرگنائزر تھے اور اس لعنت سے وہ بے نیاز تھے کہ اخبارات و رسائل میں لکھو یا پبلشر کے لئے سر کھپاؤ تو روکھی سوکھی ملے۔ وہ ایک شاندار کوٹھی میں رہا کرتے تھے۔ نوکر چاکر تھے۔ اور ہر طرح کا ذہنی سکون اُنہیں میسر تھا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ کوٹھی کے نچلے حصّہ میں اپنے خاص الخاص شاندار ڈرائنگ روم میں شوکت صاحب بیٹھے تھے۔ میں بھی بیٹھا تھا۔ میرے خسر صاحب یعنی ارشد صاحب اور میرا ایک دوست بھی بیٹھا تھا جو کہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔ میرے رشتے کے ایک بھائی بھی تھے جو لکھنؤ ہی میں پڑھ رہے تھے۔ ایک صاحب اور بھی بیٹھے تھے۔ شوکت صاحب کے دوست تھے۔ اسی ڈرائنگ روم میں سعید اور خورشید (شوکت صاحب کے بیٹے) ابھی کھیل رہے تھے۔ یہ دونوں ابھی چھوٹے تھے۔ کہ یکبارگی شوکت صاحب نے اپنے بیٹوں سے کہا۔ "میاں! تم لوگ اوپر جاؤ۔ یہاں نہ آنا تم لوگ۔ ہم اس وقت ذرا شعر و شاعری کے موڈ میں ہیں۔" میں سوچنے لگا کہ آخر یہ کس قسم کا شعر و شاعری کا موڈ ہے

کہ سعید اور خورشید نکالے جا رہے ہیں

سعید اور خورشید کو اوپر بھگا کر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"شعر سنوگے عادل میاں۔"

"جی۔ ماموں جان۔" میں کمال ادب سے بولا۔ "جی ہاں۔"

میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ شوکت صاحب رفیع احمد خاں (مرحوم) کے ہزلیہ اشعار سنانے شروع کر دیں گے۔ انہوں نے پہلا شعر سنایا۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا۔ اب میں ہوں کہ سب سے نظریں چرا رہا ہوں۔ چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی ہیں کہ وہ میری طرف غور سے دیکھ کر بولے۔

"ہاں یہ کیا بدمزاقی — خدارا داد تو دو۔ تم تو چوتھی کی دلہن کی طرح گھٹنوں میں سر دیے رہے ہو۔"

اور میری حالت اس لئے اور بھی زیادہ خراب ہو رہی تھی کہ ارشد تھانوی صاحب میرے برابر ہی بیٹھے تھے۔ اس جگہ میرے رشتے کے بھائی بھی تھے اور دوست بھی۔ میری پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی کہ انہوں نے رفیع احمد خاں کا مشہور شعر "قدم قدم پہ جبرے لگر نے پاسبانی کی" — سنا دیا اور بولے۔

"یہ شعر یقیناً تمہیں پسند آیا ہوگا۔ کیوں ہے نا قابل داد شعر۔"

"جی ہاں۔" مجبوراً مجھے جی ہاں کہنا پڑا۔ وہ بے ساختہ بولے۔ "دراصل میں تمہارے جمالیاتی ذوق کو پرکھنا چاہتا ہوں۔"

پھر فوراً ہی وہ ارشد صاحب کی طرف مخاطب ہوئے۔

"کیوں ہے نا بھائی جان —؟"

"بیشک صاحب۔" ارشد صاحب پان چباتے ہوئے بولے۔ "اس رنگ میں رفیع احمد خاں کا جواب نہیں تھا۔" انہوں نے گویا کہ تشریح کی۔

"صاحب! بہت بڑی قیمتی چیز، بہت بڑی بات ظالم نے کہی ہے۔ حقیقت ہے —"

اور پھر نتیجہ یہ ہوا کہ شرم اور لحاظ کو کسی حد تک بالائے طاق رکھ کر مجھے بھی اس شعر و شاعری میں دلچسپی لینی پڑی۔ شوکت صاحب نے میری اس قدرے بے تکلفی کو غنیمت جانا۔ بیحد خوش ہوئے اور پھر بہت سے شعر بھی سنا ڈالے۔ اپنے بھی شعر سنائے اور رفیع احمد خاں کے بھی پھر مجھ سے فرمائش ہوئی۔

"تم بھی تو اس رنگ میں شعر کہتے ہوگے۔ سناؤ میاں!! اپنے بھی شعر سناؤ۔ جہالت کی باتیں چھوڑو۔ ہم سب آپس میں دوست ہیں۔" وہ کہتے رہے اور میں معذرت کرتا رہا۔ لاکھ بے تکلف بننے کی کوشش پر بھی میں ارشد صاحب کی موجودگی میں جاہل کا جاہل ہی رہا۔ میری جہالت نہ گئی۔

ایک دن دسترخوان پر انہوں نے اسی قسم کا ایک لطیفہ اور سنا ڈالا۔ دسترخوان لگ چکا تھا۔ پلیٹیں لگ رہی تھیں اور کھانا لگنا تھا کہ انہوں نے اُن نواب صاحب کا ایک لطیفہ سنا ڈالا جو دسترخوان پر اکڑوں بیٹھے تھے۔ اور جن کی میانی کھل گئی تھی۔ اپنی بیگم کے ہوں، ہوں کے اشارے پر انہوں نے گردن جھکا کر نیچے دیکھا۔ بڑی ادا کے ساتھ بولے۔ "کام چور ذرا اے حاضر —"

"یہ کام چور نوالے حاضر" کا لطیفہ جسے وہ انتہائی معصومیت اور سنجیدگی سے مجھے سنا رہے تھے۔ اور دسترخوان پر ہم سب بیٹھے تھے۔ میں، ارشد صاحب، میری خوش دامن صاحبہ اور ان کی مسز، یعنی میری ممانی جان اور سعید اور خورشید بھی۔ معصوم بابا میاں (شوکت صاحب کا سب سے لاڈلا اور سب سے چھوٹا بیٹا) بھی بیٹھا تھا۔

ممانی جان (مسز شوکت) نے شوکت صاحب کو گھورا، خشمگیں نظروں سے ہم سب کی طرف دیکھ کر بولیں۔ "کبھی تو شرم کیا کیجئے۔ داماد کا ہی خیال کر لیجئے۔"

ممانی جان کی تیوریوں پر بل پڑے ہوئے تھے۔ اور وہ نہایت ہی معصومیت سے فرما رہے تھے۔

"لو بھئی! ہماری سدو کی بات سنو (وہ ممانی جان کو پیار سے سدو کہا کرتے تھے۔ ممانی جان کا نام سعیدہ ہے اور وہ شوکت دلہن بھی کہی جاتی ہیں) کام چور نوالے حاضر کا لطیفہ بھی ان کی دانست میں بے حیائی ہے۔"

امی اور ابا (مسز ارشد اور ارشد صاحب) مسکرا رہے تھے۔ اور میں شوکت صاحب کی اس زندہ دلی پر دل ہی دل میں ان پر قربان ہوا جا رہا تھا کہ ممانی جان نے نوکر کو ڈانٹا۔

"تو کیا دانت نکالے کھڑا ہے۔ جا جلدی سے بالائی کی پلیٹ لے کر آ ——"

ایک رات آپ فرمانے لگے ——

"بھئی عادل میاں تم کو اپنے ساتھ دہلی سے یہاں لا کر تو میں نے سخت حماقت کی ہے۔"

"جی —— !" میں چونک پڑا۔ "یا الٰہی یہ کیا ہو گیا۔" میں نے دل میں سوچا کہ وہ فرمانے لگے۔ "یہ ہماری سدو تو تم پر عاشق ہو گئی ہیں۔ کہاں یہ کسی کو لفٹ ہی نہیں دیتی تھیں۔ اور کہاں یہ حالت کر دی ہے۔ انہوں نے کہ لکھنؤ والوں کو تمہارے آنے کے بعد سے بالائی نہیں میسر آ رہی۔ کل شام میں نے دیکھا تھا کہ یہ تمہاری انگلی پکڑے پکڑے احاطے چلی جا رہی تھیں۔"

انہوں نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

"جانتے ہو۔ ! میرے دل پر کتنے زور کا گھونسہ پڑا تھا۔"

میری جان میں جان آ چکی تھی۔ اور اب میں مسکرا رہا تھا۔ کہ ایک سرد آہ کھینچ کر بولے۔

"ہاں میاں مسکراؤ۔ خوب ہنسو۔ اپنی فتح اور دوسروں کی شکست پر لوگ اسی طرح مسکراتے ہیں۔"

غرضیکہ میرے لکھنؤ کے دن اور میری لکھنؤ کی راتیں شوکت صاحب کی بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی سے باغ و بہار بنی ہوئی تھیں۔ مجھے یہاں آئے ہوئے آٹھ دن ہو چکے تھے۔ کہ ایک دن بڑا ناخوش گوار آیا۔ صبح کا وقت تھا۔ میں میز کے سامنے بیٹھا شیو کر رہا تھا شوکت صاحب اسی کمرے میں تھے۔ اور تخت پر بیٹھے اپنی کتابوں پر میرے لئے آٹوگراف کر رہے تھے۔ کہ میں نے خورشید سے کہا۔

"خورشید میاں لانا تو کتابیں۔ دیکھیں ہمارے ماموں جان نے ہمارے لئے کیا کیا لکھا ہے۔"

خورشید نے ایک کتاب لا کر مجھے دی۔ یہ شوکت صاحب کی کتاب "بیوی" تھی۔ لکھا تھا: "اس جرم میں کہ عادل بھانجی کے شوہر ہیں" یہ کتاب کے پہلے صفحہ پر یعنی "بیوی" کے نیچے انہوں نے یہ فقرہ لکھا تھا۔ میں مسکرانے لگا۔ دوسری کتاب "شیش محل" تھی۔ لکھا تھا۔ "عزیزی عادل رشید کے لئے تاکہ وہ بھی اس کی قسم کا ایک تبصرہ اس پر بھی کریں۔"

اس کے بعد سے شوکت صاحب کی میری ملاقات برسوں تک نہیں ہوئی۔ خط و کتابت بھی نہیں ہوئی۔ ہاں مگر جب میں دہلی واپس جا رہا تھا تو وہ مجھے سی۔ آف کرنے کے لئے اسٹیشن آئے تھے۔ اور بہت سے میرے مداح اور دوست تھے جو مجھے الوداع کہنے کے لئے اسٹیشن پر موجود تھے۔ ارشد صاحب (راقم) بھی تھے اور سعید، خورشید بھی تھے۔

میں بہت پریشان اور گھبرایا گھبرایا سا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ میری برتھ ریزرو نہیں تھی۔ صرف سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ میرے پاس تھا۔ اور مجھے یہ فکر دامن گیر ہو رہی تھی کہ اگر کوئی برتھ خالی نہ ملے گی تو رات میں کس طرح گزاروں گا۔ میرے قلی نے میرا سامان سیکنڈ کلاس کے ایک کمپارٹمنٹ میں رکھ دیا تھا۔ اور میں اس کمپارٹمنٹ کے سامنے ان سب کے ساتھ کھڑا تھا۔ اور الجھ رہا تھا کہ شوکت صاحب میری الجھن اور ذہنی کوفت کا اندازہ لگاتے ہوئے چہک کر بولے۔

"اماں تم عجیب ہو عادل میاں۔ اگر مجھے کوئی کہے تو میں سر کے بل کھڑا رہ کر پوری طرح اس کوچ میں سفر کر دوں۔ مجھے تو واللہ تمہاری خوش قسمتی پر رشک آ رہا ہے اور تم ہو کہ منہ بنا رہے ہو۔"

بات دراصل یہ تھی کہ سیکنڈ کلاس کے اس کوچے میں انتہائی حسین حسین قسم کی کئی عورتیں بیٹھی تھیں۔ بے حد خوبصورت، دلکش، دل نشین اور بڑے گھر کی تندرست عورتیں۔ وہ پھر فرمانے لگے۔

"یہ تو تم نے یوں سمجھو کہ دہلی کا نہیں بلکہ جنت کا ٹکٹ لے رکھا ہے۔ اندر حوریں تمہاری منتظر ہیں۔"

پھر وہ ارشد صاحب کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کیوں بھائی جان! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا —؟"

"ہاں صاحب۔!" ارشد تھانوی صاحب مسکرائے۔ "ایک سے ایک مہ لقا بیٹھی ہیں۔ خود میری رال اس عمر میں ٹپکی پڑ رہی ہے۔ دیکھو نا ایک سے ایک پٹاخہ موجود ہے۔"

"اور یہ حضرت ہیں کہ کفرانِ حسن فرما رہے ہیں۔" شوکت صاحب خورشید کی طرف مخاطب ہوئے۔ "میاں تم اپنی امی جان سے جا کر کہہ دینا کہ ابا دہلی چلے گئے۔ میں تو دہلی جا رہا ہوں۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ شوکت صاحب بولے۔

"میاں دہلی پہنچ کر اپنی خیریت کا خط ہم لوگوں کو ضرور لکھ دینا۔ ورنہ ہمارا جی لگا رہے گا۔ کیا پتہ کوئی حسینہ تمہیں اپنے حسن کے جادو سے مینڈھا بنا کر اپنے پیچھے پیچھے بھاگنے پر مجبور کر دے۔ آخر ہمیں اپنی عذرا کی بھی تو فکر ہے۔"

پھر گاڑی چھوٹ گئی اور میں اپنے ماموں جان شوکت تھانوی سے جُدا ہو گیا تھا۔ راستہ بھر اُن کی باتیں مجھے یاد آتی رہیں اور میں اُس بکواس والے ناخوشگوار حادثہ پر افسوس کرتا رہا۔ سچ مچ اے۔ آر۔ راہ گیر پر مجھے غصہ آ رہا تھا جس نے اتنے پیارے پیارے انسان، ہنسا ہنسا کر لٹا دینے والے ادیب پر تنقید لکھی تھی۔ سخت قسم کی تنقید جس سے دوسروں کو ہنسانے والا خود کبیدہ خاطر اور غمگین ہو گیا تھا جیسے ایسا محسوس ہوا تھا۔ کہ اچانک اس کا ہاتھ کرنٹ پر پڑ گیا ہو۔

میں نے اس واقعہ کے بعد سے اے۔ آر۔ راہ گیر کے نام سے پھر کبھی کچھ نہیں لکھا۔ کوئی مضمون نہیں۔ کوئی تنقید نہیں۔ میں نے اس اے۔ آر۔ راہ گیر کو زندہ زمین میں دفن کر دیا ہے۔ جس نے ہنسا ہنسا کر لٹا دینے والے شوکت تھانوی کو افسردہ اور غمگین کیا تھا۔ جس نے

اسی لکھنؤ کے قیام کے دوران میں مجھ سے ایک دن کہا تھا۔

”تمہیں اس بات کا افسوس ہو رہا ہوگا کہ تم نے شادی میں جلدی کی۔“

”وہ کیوں ماموں جان۔؟“ میں نے حیران ہو کر سوال کیا۔ جواب دیا گیا۔

”اس لیے کہ تمہیں شاید یہ نہیں معلوم تھا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔“

”جی ——!“

”ارے بھئی، تم کچے احاطے روز جاتے ہو نا۔ گھنٹوں وہاں بیٹھے رہتے ہو۔“

میں سٹ پٹا گیا۔ کچے احاطے میں ماموں جان کے سسرال والے رہتے تھے۔ وہ سب کے سب اُن کے اعزا تھے۔ اور وہاں خوبصورت خوبصورت لڑکیاں بھی تھیں۔ جوان اور حسین کنواری لڑکیاں۔

بات کچھ ایسی نہیں تھی۔ لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ مجھ سے فوری طور پر کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ جیسے بڑبڑائے۔ ”لیکن ہماری بی عذرا بھی لاکھوں میں ایک ہے۔“

بلی کی بات پر مجھے ایک بات اور یاد آ گئی۔

ایک روز ہم لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ کھڑکی سے ایک موٹا تازہ بلا باہر سے کود کر آیا۔ شوکت صاحب نے اُسے مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہمارے گھر میں ایک عذرا اور ہے۔“

شوکت صاحب کے گھر میں ایک بلی پلی ہوئی تھی ——

بمبئی کے ایک گجراتی فلم پروڈیوسر دلسکھ ایم پنچولی تقسیم ہند سے پہلے لاہور کے سرکردہ اور مانے ہوئے فلمساز تھے۔ پنچولی آرٹ پکچرز ان کا تھا۔ یہ لاہور کے بڑے اثر و رسوخ والے فلمساز تھے۔ ”خزانچی“ اور ”خاندان“ ان کی مقبول ترین اور بہت بڑا بزنس کرنے والی فلمیں تھیں۔ شوکت صاحب ریڈیو کی ملازمت چھوڑ کر اُن کے پاس اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے نوکر ہو گئے۔ ”پونجی“ اور ”شاہدہ“ شہر سے دور، ان کی لکھی ہوئی فلمیں تھیں۔ انھوں نے اُن کی کاسٹیوم پکچر ”شیریں فرہاد“ لکھی تھی۔ اور یہ فلم بمبئی میں جب ریلیز ہونے لگی تو پنچولی صاحب خود بمبئی آئے۔ شوکت صاحب نے مجھے ایک خط لکھا کہ تم سیٹھ صاحب سے جا کر ملو۔ اور اُن سے کہو کہ لاہور سے ماموں جان کا خط آیا ہے۔ میں آپ کی ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ یہ اُن کا حکم ہے میرے لیے۔ اسی لفافہ میں شوکت صاحب نے پنچولی صاحب کے نام بھی انگریزی میں ایک خط لکھ کر رکھ دیا تھا۔ کہ یہ خط میں اُنہیں لے جا کر دے دوں۔ اُس میں بھی یہی لکھا تھا کہ یہ عادل رشید میرا داماد ہے۔ بمبئی میں اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ ایک ویکلی ”شاہد“ نکالتا ہے۔ پبلسٹی میں ماہر ہے۔ اس سے آپ جو کام چاہیے لیجیے۔ اِس خط میں شوکت صاحب نے پنچولی کو سیٹھ جی لکھا تھا۔

مجھے شوکت صاحب کی اس ذہنیت پر بڑا غصہ آیا — میں نے وہ دونوں خطوط پھاڑ ڈالے۔ شوکت صاحب کو میں نے لکھا۔

ماموں جان! تسلیم

آپ کا خط مجھے مل گیا۔ میں غلامی، جی حضوری اور ”سیٹھ جی“ کی دُنیا سے

بہت دور ہوں۔ جس دن یہ ذہنیت مجھ میں پیدا ہوئی میں اسی روز خودکشی کر لوں گا۔)

میں "ہر خدمت" والی طبیعت سے یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ انسان کو اگر روٹی نہ ملتی ہو تو وہ زہر کھا کر مر جائے۔ میں پنچولی جیسے انسان کی جی حضوری کو گالی سمجھتا ہوں۔

میں نے آج تک کسی کو سیٹھ نہیں کہا۔ حالانکہ بمبئی میں رہتا ہوں۔ جہاں کا تکیہ کلام ہی سیٹھ ہے۔ میں آپ کی اس "خدمت" سے معذور ہوں۔

اس خط کے بعد پھر شوکت صاحب کا کوئی خط مجھے کبھی نہیں ملا۔ اور ہمارے مراسم اندرونی طور پر کچھ خراب ہو گئے اور یہاں تک کہ شوکت صاحب کو غالباً میرے وجود اور میرے نام سے بھی چڑ ہونے لگی۔

غالباً ۶۲ء میں دہلی میں ایشین رائٹرز کانفرنس تھی۔ اور پھر اس کے بعد ہی انڈو پاک کلچرل کانفرنس بھی تھی۔ میں ان دونوں کانفرنسز میں دعوت پر بمبئی سے دہلی گیا تھا۔ انڈو پاک کلچرل کانفرنس کے سلسلہ میں پاکستان سے شوکت صاحب بھی آئے تھے۔ وگیان بھون (جہاں یہ کانفرنس ہو رہی تھی) ہماری ان کی ملاقات ہوئی۔ صرف علیک سلیک کی حد تک اور بس۔

کانفرنس کے خاتمہ والے دن، شام کے پانچ بجے تقریباً ڈھائی تین سو ادیب چمسفورڈ کلب میں مدعو تھے۔ میں بھی تھا اور شوکت صاحب بھی تھے۔ اتفاقاً ہم دونوں باتھ روم سے نکل رہے تھے کہ ہمارا آمنا سامنا ہو گیا۔

"مجھے تم سے ایک بڑی شکایت یہ ہے کہ تم ۱۹۶۰ء میں پاکستان آئے۔ تمہارا پورا خاندان تمہارے ساتھ تھا۔ عذرا اور تمہارے بچے تم لاہور دس دن رہے۔ لیکن تم مجھ سے ملنے کے لئے راولپنڈی نہیں آئے۔"

میں بری طرح سٹ پٹا گیا۔ میں نے کہا۔

"وہ بات دراصل یہ تھی ماموں جان کہ میری چھوٹی بچی شاہینہ تنویر بیمار ہو گئی تھی۔ اور ——"

انہوں نے میری بات اچک لی۔

"بیکار باتیں ہیں یہ۔ وہ قدرے ملال کے ساتھ بولے۔" تم اور وہ عذرا کی بچی ہم لوگوں سے ملنا ہی نہیں چاہتے۔"

اور یہ کہہ کر وہ باتھ روم سے باہر آگئے۔ میں بھی آگیا۔ اس کے بعد پھر ہماری کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ حالانکہ ہم لوگ وہاں اس کے بعد بھی کافی دیر تک رہے۔ اور یہی میری اور شوکت صاحب کی آخری ملاقات تھی۔

دوسرے دن یونس دہلوی مدیر "شمع" کی کوٹھی پر پاکستانی ادیبوں کا ایک ڈنر تھا۔ اور اس ڈنر میں ہندوستان کے اردو کے چیدہ ادیب بھی مدعو تھے۔ میں بھی مدعو تھا۔ یونس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر تم نہ آئے تو میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔" ایلس نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "عادل بھائی، دیکھئے آیئے گا ضرور۔ ورنہ ہماری آپ کی کُٹّی۔"

لیکن اس ڈنر پر میں جان بوجھ کر اس لئے نہیں گیا کہ میں اسی رات ایک دوسری جگہ پر مدعو تھا۔ اور یہ ڈنر بطور خاص میرے لئے ارینج کیا گیا تھا۔ اور ڈنر دینے والا مالکان "شمع" کی طرح بڑا آدمی نہیں تھا۔

تیسرے یا چوتھے دن الیاس نے مجھے بتایا کہ ڈنر پر آپ نہیں آئے اور شوکت نے آپ کو نہ جانے کیوں بار بار پوچھا جیسے کہ وہ اس ڈنر پر آپ کی کمی کو بار بار محسوس کر رہے تھے۔

اور یہ احساس مجھے آج ہو رہا ہے کہ شوکت صاحب اُس ڈنر پر بار بار مجھے کیوں پوچھ رہے تھے۔ شاید اس لئے کہ یہ آخری ڈنر ہوتا جو ہم ایک ساتھ لیتے۔ اس کے بعد پھر کبھی ہمیں ایک دوسرے سے ملنا جو نہیں تھا۔

شوکت تھانوی صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ہمارا اُن سے زندگی کا رشتہ قیامت تک کے لیے ٹوٹ چکا ہے۔

شوکت تھانوی صاحب بہت بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ سب سے بڑی خوبی اُن میں یہ تھی کہ وہ ہر جگہ اور ہر نئے ماحول میں اپنے آپ کو اڈجسٹ کر لیا کرتے تھے۔ اُنہیں دوسروں پر چھا جانا آتا تھا۔ وہ ہر محفل کو اپنے لیے سازگار بنا لیا کرتے تھے۔ اور ہر محفل اُن کی وجہ سے باغ و بہار بن جایا کرتی تھی۔ تعلیم اُن کی (ڈگری کے لحاظ سے) بہت زیادہ نہیں تھی۔ کہنے کو تو وہ ہائی اسکول بھی پاس نہیں تھے۔ نہ اُنہوں نے ادیب ماہر، ادیب فاضل، منشی اور نہ ہی کامل کا امتحان ہی پاس کیا تھا لیکن قابلیت ان میں اتنی تھی کہ بڑے بڑے پڑھے لکھے اور ڈگری یافتہ اُن کے سامنے محض جاہل مطلق معلوم ہوتے تھے۔

اپنے لیے جگہ بنانے کی صلاحیت بھی اُن میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ بڑے بڑے آئی سی ایس اور گزیٹیڈ آفیسر اُن کے سامنے جھکتے تھے۔ اور اُن کا احترام کرتے تھے۔ سرکاری افسران اُن کی قدر کرتے تھے اور وزرا اور امرا اُن کے گرویدہ تھے۔

بڑے سے بڑے جملے باز اور حاضر جواب اُن کی حاضر دماغی کے آگے سرنگوں ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ ایک محفل میں ایک صاحب جو اپنے آپ کو بہت بڑا تیس مار خاں سمجھتے تھے۔ شوکت صاحب سے از راہ تمسخر فرمانے لگے۔ "جناب آپ کا تھان کہاں ہے۔ جہاں آپ بندھتے ہیں۔" اُنہوں نے "تھانوی" کی رعایت سے یہ فائدہ اٹھانا چاہا تھا۔ شوکت صاحب نے پہلے تو اُن کی اس بکواس کو سنی ان سنی کر دینے کی کوشش کی۔ لیکن جب انہوں نے پھر یہی بات اس انداز میں دہرائی جیسے کہ انہوں نے شوکت صاحب کو لاجواب کر دیا ہو تو شوکت صاحب نے کمال سنجیدگی سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔

"جب میں آپ کی ہمشیرہ محترمہ یا آپ کی دختر نیک اختر کے لئے اپنا پیام آپ کو دوں گا۔ تو اس وقت اپنا تھان، اپنی حیثیت اور اپنا اتا پتہ سب آپ کو بتا دوں گا۔"

اس پر ایک پُر زور قسم کا فرمائشی قہقہہ بلند ہوا اور وہ تیس مار خاں صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ بالکل اسی قسم کا ایک واقعہ میرے خسر محترم ارشد تھانوی صاحب کے ساتھ بھی پیش آ چکا تھا۔ اُنہوں نے بھی ایک محفل میں ایک صاحب کو اسی قسم کا جواب دیا تھا۔ اور وہ صاحب بھی اپنا سا منہ لے کر رہ گئے تھے۔

شوکت تھانوی صاحب کی ایک عزیزہ کی شادی تھی۔ ایک صاحب نے شوکت صاحب سے لڑکی والے ہونے کی حیثیت سے اس ڈھنگ سے مذاق فرمایا جیسے کہ ان کی کور دب رہی ہو۔ شوکت صاحب نے اُن کے اس بیہودہ مذاق پر فرمایا۔

"جناب ہمارے یہاں کا اور ہر شریف آدمی کے یہاں کا یہی دستور ہوتا ہے کہ جب لڑکیاں شادی کے قابل ہو جاتی ہیں تو اُن کی ہم لوگ شادی کر دیا کرتے ہیں۔ شاید آپ کے یہاں ایسا نہ ہوتا ہو گا۔ آپ لوگ لڑکیوں کی شادی کے بجائے انہیں کوٹھوں پر بٹھا دیا کرتے ہوں گے۔" وہ صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

شوکت صاحب ایک صاحب طرز ادیب ہی نہیں تھے۔ بلکہ وہ ایک مانے ہوئے صحافی بھی تھے۔ "سرپنچ" "ہفت روزہ" "شباب" ماہنامہ، اور "جنگ" راولپنڈی اُن کے بلند پایہ ایڈیٹر اور صحافی ہونے کی روشن مثالیں ہیں۔

شوکت صاحب نے بہت لکھا ہے۔ ایک پورا دفتر کا دفتر لکھ ڈالا ہے۔ انہوں نے اچھا بھی لکھا ہے۔ اور بہت اچھا بھی۔ برا بھی لکھا ہے انہوں نے۔ لیکن دُنیا کا کون ایسا ادیب یا شاعر ہے جو ہر چیز اچھی ہی لکھتا ہو۔ دُنیا کے بڑے سے بڑے ادیب کو اس کسوٹی پر پرکھئے۔ آپ کو اس کا اندازہ ہو جائے گا۔ شوکت صاحب نے جتنا کچھ لکھا ہے اگر ہم اس میں سے اُن کی شاہکار چیزیں چھانٹنا شروع کر دیں تو وہ بھی اتنی ہوں گی کہ اُس سے بیک وقت کئی مجموعے بڑی آسانی کے ساتھ ترتیب دئے جا سکیں۔ اُن کے یہ کئی حسین مجموعے ایسے ہوں گے۔ جن پر اُردو ادب کو بجا طور پر ناز ہو گا۔ جنہیں ہم بڑی آسانی کے ساتھ دُنیا کے بڑے سے بڑے ادب کے مقابلہ میں فخریہ رکھ سکیں گے۔

ادیب کو بلند اور صاحب طرز بنانے کے لئے تو ایک کتاب کافی ہوتی ہے۔ یہاں تو شوکت تھانوی نے ایسی ایسی متعدد کتابیں لکھی ہیں جو شاہکار کہلاتی ہیں۔

شوکت صاحب کا طرز نگارش اپنا تھا۔ اس پر کسی دوسرے ادیب کی چھاپ ہرگز نہیں تھی۔ شوکت صاحب کے تراشے ہوئے جملے، اُن کے مزاح کا بے ساختہ پن، ان کے جملوں کا لوچ، اُن کا نکھار، اُن کی ادائیگی، ان کی بندشیں ایسی نہیں تھیں جن سے پڑھنے والا آسانی کے ساتھ گزر جائے۔

اُن کے فقرے ایسے ہوتے ہیں جو پڑھنے والے کو بے ساختگی کے ساتھ ہنسنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اپنے مضمون "تعزیت" میں لکھتے ہیں۔

"مرحوم کو بیماری کیا تھی؟" انہوں نے پوچھا۔ جواب دیا گیا۔ "بڑھاپا خود ایک مستقل مرض تھا" فوراً بولے۔

"جی ہاں، جی ہاں۔ یہ مرض کمبخت اب عام ہوتا جا رہا ہے۔ ابھی کل ہی میرے دوست کا تین سالہ بچہ اسی مرض کا شکار ہو کر مرا ہے۔"

"سودیشی ریل" میں لکھتے ہیں۔

"فائرمین سر پر کوئلہ سے بھرا ہوا ٹوکرا لئے چلا آ رہا تھا۔ آتے ہی ہانپتے ہوئے بولا۔ "یہ لو" اس نے انجن ڈرائیور سے کہا۔ "کوئلہ کا انتظام پہلے سے رکھا کرو۔ نخاس سے کوئلہ لے کر آ رہا ہوں۔ میرے گھٹنے بھی چھل گئے۔" یا۔ ٹکٹ دینے والے بابو نے کہا۔

"اچھا لاؤ دو روپیہ چار آنے ہی نکالو۔ بوہنی کا وقت ہے۔"

جواب ہے اس بوہنی کے وقت کا۔ یا اس کا کہ انجن کے لئے ٹوکرا بھر کوئلہ نخاس کی ایک دوکان سے لایا گیا ہے لانے والے فائرمین کے گر پڑنے کی وجہ سے گھٹنے بھی چھل گئے ہیں۔ یا اس کا کہ میرے دوست کا تین سالہ بچہ اسی بڑھاپے کے مرض میں مبتلا ہو کر مرا ہے۔ یا اس بات کا کہ باپ کے مرنے کا پرسہ جوان بیٹے کو اس طرح دیا جا رہا ہے کہ "اللہ تمہیں اس کا نعم البدل جلد دے۔"

مجھے ٹھیک سے نہ تو یاد ہے اور نہ اس وقت یہ مضامین ہی میرے پاس کہ انہیں میں صحیح طور پر نقل کر سکوں۔ لیکن باتیں کچھ اسی قسم کی تھیں۔ کوزے میں دریا بند ہوتے تو سنا ہے۔ لیکن شوکت صاحب کے یہاں اُن کے ایک ایک فقرے میں کئی کئی سمندر ایک

وقت بند ملتے ہیں۔ مزاح کے ایسے سمندر جو ہنسا ہنسا کر پاگل بنا دیں۔ اور پڑھنے والے اُن میں بہہ جائیں۔

شوکت صاحب کے جملوں میں بے ساختگی ہوتی ہے۔ بناوٹ نہیں۔ اور یہی فرق انہیں دوسرے مزاح نگاروں سے ممتاز بناتا تھا۔

آپ خیر سے شاعر بھی تھے۔ سنجیدہ شاعری کی بات تو میں اس لئے نہیں کروں گا کہ ان کی وہ شاعری میری نظروں سے بہت کم گزری ہے۔ البتہ اُن کی ایک نظم ”کراچی کی بس“ کا ذکر سن لیجئے۔ بمبئی میں انڈو پاک مشاعرہ تھا۔ آپ بھی پاکستان سے اس مشاعرے میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے تھے۔ اس وقت مسٹر چاوان مہاراشٹر گورنمنٹ کے چیف منسٹر تھے (آجکل یہ ڈیفنس منسٹر ہیں) چاوان صاحب میرے برابر ہی دوسرے صوفے پر بیٹھے تھے۔۔ اردو شاعری اُن کی سمجھ سے باہر کی بات ہے۔ لیکن وہ بھی شوکت صاحب کے ایک شعر پر اتنا ہنسے اتنا ہنسے کہ لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اور آپ نے ”مقرر ارساد“ مکرر ارشاد کا نعرہ بھی لگایا۔

شوکت صاحب نے اپنی نظم ”کراچی کی بس“ میں کراچی کی بسوں میں انتہا سے زیادہ بھیڑ بھاڑ کا نقشہ کھینچا تھا۔ فرماتے ہیں۔
”اتنی بھیڑ تھی کہ جب ہمارے جسم میں کھجلی ہوئی اور ہم نے کھجاتا چاہا تو معلوم ہوا کہ دوسرے کو کھجا رہے ہیں۔“

اس مفہوم کا یہ شعر تھا۔ ہزاروں سننے والے شوکت صاحب کے اس شعر پر دیوانے ہو گئے۔ چاوان جیسے اُردو سے ناواقف شخصیت نے اس شعر کی اتنی داد دی کہ ہنستے ہنستے دیوانے ہو گئے۔

شوکت تھانوی کی موت یقینی طور پر اُردو ادب کے لئے ایک سانحۂ عظیم ہے۔ یہ موت شوکت تھانوی کی اپنی ہی موت نہیں ہے۔ بلکہ یہ موت اُردو ادب کے اُن ہزاروں لاکھوں پڑھنے والوں کی مسرتوں، شادمانیوں اور قہقہوں کی موت بھی ہے۔ جو شوکت تھانوی کی موشگافیوں سے جنم لیتے رہے تھے۔

وہ محفلیں اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سونی ہو گئیں جو شوکت تھانوی کی وجہ سے کشتِ زعفران بنی رہتی تھیں۔ جہاں وہ شمع محفل بنے ہوئے ہر خاص و عام کی توجہ کا مرکز بنے رہتے تھے۔ اُن کے قہقہوں سے دُنیا خالی ہو گئی۔ اور اُن کے اُٹھ جانے سے اب بہت دنوں تک ایسا محسوس ہوتا رہے گا۔ جیسے کہ ماحول، المناک سناٹوں اور ویرانیوں سے دوچار ہو گیا ہے۔ جیسے —— ”اِک سکوتِ مضمحل گاڑی گذر جانے کے بعد۔“

میرا دل بار بار مچلتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ میں شوکت صاحب سے کسی طرح بڑے پیار کے ساتھ پوچھوں۔

”کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور“

شوکت بھائی

اقبال صفی پوری

شوکت بھائی جنہیں "مرحوم" لکھتے ہوتے نہ صرف دل پارہ پارہ ہو جاتا ہے بلکہ روحانی اذیت بھی محسوس ہوتی ہے مرحوم نثر نگاری میں ید طولےٰ رکھتے تھے ان کی نثر نگاری کا صحیح اندازہ انہی حضرات کو ہو سکتا ہے جنہوں نے انہیں نثر لکھتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان کا قلم صفحۂ قرطاس پر اس روانی کیساتھ چلتا تھا کہ دیکھنے والے محو حیرت ہو جاتے تھے۔ وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے بلا تکلف صفحے کے صفحے لکھتے چلے جاتے تھے اور انکی مہارت اور قدرت کا یہ عالم تھا کہ ایک دو نہیں دس بیس صفحات لکھنے کے بعد بھی کوئی لفظ نہ کاٹتے تھے نہ ہی کوئی فقرہ تبدیل کرتے تھے۔ انہیں اپنی صلاحیتوں پر کامل اعتماد تھا اور جو موضوع ان کے سامنے آتا تھا وہ اپنی اعلیٰ ذہانتوں کے بل پر اسے تشنۂ تکمیل نہ چھوڑتے تھے لیکن جس چیز نے انہیں برصغیر ہند و پاک میں غیر معمولی شہرت و عظمت عطا کی وہ ان کا منفرد طرز نگارش اور مخصوص انداز طنز و مزاح تھا۔

شوکت تھانوی بسیار نویس تھے۔ یہ بات مشہور ہے کہ بسیار نویس اچھا ناثر اور بسیار گو اچھا شاعر نہیں ہوتا لیکن شوکت صاحب کی تصانیف۔ اداریے۔ ادبی مضامین۔ مقالے۔ خاکے۔ فکاہی کالم اور ریڈیائی فیچر غرضیکہ تمام نثری کائنات پر نظر ڈالنے کے بعد یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انکی نثر میں کوئی دلکشی نہ تھی۔ بلکہ ایک ایک لفظ اپنی جگہ نگینے کا کام دیتا ہے۔

شوکت بھائی ایک کامیاب اور صاحب طرز نثر نگار ہی نہیں تھے۔ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کی غزلیات کا اولین، مجموعہ "گہرُستان" پڑھنے کے بعد اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے ذہن رسا اور قلب سلیم عطا کیا تھا ان کی غزلوں میں سوز و گداز۔ کیف و اثر۔ لطف زبان و بیان۔ مختصر یہ کہ وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو لازمۂ غزل ہیں بر ایں ہمہ یہ بات یقیناً باعث حیرت و استعجاب ہے کہ وہ ایک کامیاب مزاح نگار بھی تھے اور ایک سنجیدہ غزل گو بھی۔ چند سال سے انہوں نے اپنی سنجیدہ غزل گوئی کا رخ مزاحیہ شاعری کی طرف موڑ دیا تھا۔ اسکا سبب غالباً شوکت بھائی کے عزیز ترین دوست اور ملک کے مشہور اور منفرد مزاح و طنز نگار شاعر سید محمد جعفری کی رفاقت اور دوستی تھی۔ لیکن اس میدان میں بھی انہوں نے اپنی ذہانت کا سکہ بٹھا کر چھوڑا۔ پاکستان و ہندوستان میں ایک دو نہیں نہ جانے کتنے مشاعرے پڑھے اور عوام و خواص سے داد و تحسین حاصل کی ان کی ہمہ گیر طبیعت اور خوبیوں کا اندازہ صحیح طور پر انہیں کو ہو سکتا ہے جو ان کے بے تکلف رفیقِ خلوت رہے ہیں اور جنہوں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے۔

آج سے تقریباً ۲۸ سال پہلے غالباً ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ جب پہلی بار شوکت صاحب سے متعارف ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ امین آباد ہائی اسکول لکھنؤ میں نویں جماعت کا طالبعلم تھا اور شوکت بھائی ملک کے مشہور ارباب قلم میں شمار ہوتے تھے۔ میری شعرگوئی کا آغاز ہوچکا تھا لیکن شعرگوئی و شعرخوانی محض مدارس کے انعامی مشاعروں تک ہی محدود تھی۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے ترنم کی دولت سے بھی نوازا ہے۔ میں ان انعامی مشاعروں میں دوسرے اسکول کے طلباء کے مقابلے میں بالعموم کامیابی سے ہم کنار ہوتا۔ اور انعام جیت کر اپنے اسکول کے وقار بلند کرتا تھا۔ لیکن میرے دل میں رفتہ رفتہ یہ خواہش نشوونما پا رہی تھی کہ میں بھی ملک کے کسی بڑے مشاعرے میں شریک ہو کر غزل پڑھوں۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں "انجمن بہار ادب" کا طوطی بول رہا تھا اور تمام بڑے مشاعرے اس بزم کے زیر اہتمام منعقد ہوا کرتے تھے۔ شوکت بھائی اس بزم کے سرگرم کارکن تھے۔

۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ایک آل انڈیا نمائش ہوئی جسکے پروگرام میں ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد بھی تھا۔ اس مشاعرے کے سکریٹری جناب جمیل الدین صاحب سٹی مجسٹریٹ لکھنؤ تھے۔ شوکت بھائی بھی ان چند مخصوص منتظمین میں سے تھے جنہیں اس کا حق حاصل تھا کہ وہ جسے مناسب سمجھیں دعوت شرکت دیں۔ ہندوستان کے اکابر شعراء مولانا صفی لکھنوی۔ جگر مرادآبادی۔ مولانا بیخود موہانی۔ مرزا جعفر علی خان اثر۔ حکیم آشفتہ۔ افسر میرٹھی۔ آغا شاعر قزلباش۔ دل شاہجہانپوری۔ نوح ناروی۔ سیماب اکبرآبادی۔ مولانا آسی۔ سراج لکھنوی۔ احسن مارہروی۔ ارشد تھانوی۔ ناطق لکھنوی۔ پنڈت آنند نرائن ملا اور ثاقب لکھنوی وغیرہ جیسی عظیم شخصیتیں مدعو تھیں۔ اس دور کا شاید ہی کوئی اچھا شاعر ہوگا جسے اس مشاعرے میں دعوتِ شرکت نہ دی گئی ہو۔ یہ مشاعرہ طرحی اور دو نشستوں پر مشتمل تھا۔ غالب کا مصرعہ "ہم کو منظور تنگ ظرفی منصور نہیں" طرح کے طور پر دیا گیا تھا (اسوقت تک غیرطرحی مشاعروں کا رواج نہیں ہوا تھا) اس مشاعرے کی لکھنؤ اور قرب و جوار میں بڑی دھوم تھی۔ شوکت بھائی کی ذہانت اور محبت کا مجھے اسوقت اندازہ ہوا جب انہوں نے میرے اظہارِ مدعا کے بغیر ہی میرے جذبہ شوق کا اندازہ کرلیا اور میرا نام مدعو کردہ شعراء کی فہرست میں شامل کرادیا۔ میں اپنی اس مسرت کے اظہار سے قاصر ہوں جو مجھے اس اولین عظیم الشان مشاعرے میں شرکت سے حاصل ہوئی۔ اور یہی مشاعرہ میری شہرت کا باعث ثابت ہوا۔ اس مشاعرے کے صدر نواب صاحب چھتاری تھے۔

فہرست شعراء کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے تھی اور اگر ترتیب اس انداز سے نہ بھی ہوتی تو بھی شاید مبتدی اور کم عمر شاعر ہونے کی حیثیت سے مجھ سے مشاعرے کی ابتدا ہوتی۔ شوکت بھائی میری کامیابی پر خوش اور اپنے حسن انتخاب پر نازاں تھے یہ کامیابی میری ادبی زندگی کا پہلا موڑ تھا جس کے لئے شوکت بھائی کا ہمیشہ ممنون رہوں گا۔ اسلئے کہ میں نے اپنی نومشقی اور سن و سال کے اعتبار سے اس عظیم اور تاریخی مشاعرے میں شرکت کا اہل نہ تھا۔ اس مشاعرے میں کامیابی کے بعد میرے لئے مقامی و بیرونی مشاعروں میں شرکت کی راہیں از خود ہموار ہوگئیں۔ اس سے شوکت صاحب کی وسیع النظری، عالی ظرفی اور کشادہ دلی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ عام طور پر شعراء اور ادباء میں حسد و رقابت کا جذبہ پایا جاتا ہے لیکن شوکت بھائی اس سطح سے بلند تھے۔

انہوں نے دوسروں کے کمال کا اعتراف کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ اور کامیاب نثر نگاروں اور مشاعروں کی ہمیشہ عزت کی۔ برسبیل تذکرہ یہ لکھنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ شوکت صاحب نے ادبی دنیا میں جو منفرد مقام حاصل کیا اسکے اسباب و محرکات کیا تھے۔ وہ لوگ جنہوں نے روزنامہ "جنگ" میں ان کے حالیہ کالم بعنوان "کچھ یادیں کچھ باتیں" (افسوس کہ جنہیں وہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے) پڑھے ہیں وہ بخوبی جان گئے ہیں کہ شوکت صاحب نے اپنی ابتدائی زندگی میں تحصیل علم و فن کے لئے کس قدر

دماغ سوزی۔ عرق ریزی۔ اور شبانہ روز محنت کی ہے۔ اور یہ اسی کوشش و کاوش اور پر خلوص مشق کا نتیجہ تھا کہ وہ ملک کے صاحب طرز اہل قلم تسلیم کئے گئے اور دائمی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر جلوہ گر ہوا۔

شوکت بھائی رونق انجمن۔ حاضر جوابی اور طنز و مزاح کے رنگ میں ڈوبے ہوئے چست و برمحل جملوں سے آن واحد میں ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ وہ ہر شاعر کے انداز میں اسکی کامیاب نقل اتار سکتے تھے۔ آواز و لہجہ ہی نہیں بلکہ چہرے کے اتار چڑھاؤ سے وہ محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے لیکن چند مخصوص احباب و اعزا کے علاوہ شاید ہی کسی کو اسکا علم ہو کہ وہ شخص جو دوسروں کو ہنسانے اور محفلوں کو زعفران زار بنائے رکھتا تھا وہ خود اندرونی طور پر کس قدر دکھی تھا۔ اسکی نجی زندگی پریشانیوں الجھنوں اور آلام و مصائب کا مرقع تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں قوت برداشت ضرور عطا فرمائی تھی وہ اپنی اندرونی کشمکش اور ذہنی الجھنوں کو چھپانے میں عزیزوں کی محفلوں میں ہمیشہ کامیاب رہے۔ اسلئے بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں۔ چونکہ شوکت بھائی سے مجھے نسبت قرابت داری بھی ہے۔ وہ یوں کہ انکی پہلی بیگم سعیدہ خاتون میری رشتہ کی بہن ہوتی ہیں اس بنا پر مجھے انکی نجی زندگی کو جاننے اور سمجھنے کا موقع ملتا رہا۔

شوکت بھائی قیام پاکستان سے قبل ہی لکھنؤ کو خیرباد کہہ کر لاہور آ چکے تھے اور پنچولی آرٹس سے وابستہ ہو گئے تھے۔ مجھے اس مفارقت کا بیحد قلق تھا۔ اسے امر اتفاقی سے تعبیر کیجئے یا میری خوش قسمتی سے کہ جون ۱۹۴۸ء میں جناب ایس۔ ایم توفیق صاحب مرحوم سابق ڈائرکٹر کراچی میونسپل کارپوریشن کے برادر خورد مسٹر ایس۔ ایم۔ عتیق جو میرے عزیز دوست ہیں اور اپنے وطن کانپور میں مقیم ہیں۔ انکی بارات میں مجھے لاہور آنا پڑا۔ باراتیوں میں مولانا حسرت موہانی صاحب مرحوم اور مولانا کرم علی صاحب بھی شامل تھے۔ شوکت بھائی لاہور سے بارات میں شریک ہو گئے۔ مجھ سے ملکر بیحد خوش ہوئے اور کہنے لگے اب تمہیں بمبئی واپس نہیں جانے دیا جائے گا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ اب میں نکاح کے وقت لڑکی والوں کی طرف سے شرکت کے لئے جناب سید سعید جعفری سی۔ ایس۔ پی جو اسوقت لاہور میں ڈائرکٹر فوڈ پرچیز کے عہدے پر فائز تھے تشریف لائے۔ جعفری صاحب نے بھی مجھ سے اصرار کیا کہ میں مستقلاً پاکستان آ جاؤں۔ شوکت بھائی بولے "انہیں واپس ہی کیوں جانے دیا جائے"۔ جس سے موصوف نے اتفاق کیا چنانچہ دونوں حضرات کے اصرار پر مجھے سپر انداز ہونا پڑا۔ بارات دوسرے روز واپس گئی اور میں شوکت بھائی کے مکان نمبر ۱ کینال پارک میں منتقل ہو گیا۔ میرے بارات کے ساتھ واپس نہ جانے کی وجہ سے عتیق صاحب کو ایک مدت تک شکایت رہی۔

جعفری صاحب نے چند ہی دنوں میں میرا تقرر فوڈ پرچیز انسپکٹر کی حیثیت سے کر دیا اور فرمایا کہ اب جا کر بیوی بچوں کو لے آؤ۔ چنانچہ میں ہندوستان گیا اور سب کو ہمراہ لے کر ۲ ہفتے میں لاہور واپس آ گیا۔ لاہور آنے کے بعد۔ میں۔ میری بیوی اور میرا ایک بیٹا شوکت بھائی کے اسوقت تک مہمان رہے جب تک کہ اسی کوٹھی کا نصف حصہ مجھے الاٹ نہیں ہو گیا۔ میرے اور میری شریک زندگی کے مسلسل اصرار کے باوجود شوکت بھائی اس بات پر رضامند نہ ہوئے کہ ہم لوگ اس مختصر مدت کے لئے اپنے خورد و نوش کا علیحدہ انتظام کر لیں۔ یہ انکی محبت۔ خلوص اور فراخدلی کا ایک روشن ثبوت ہے چونکہ کوٹھی کا نصف حصہ مجھے الاٹ ہو گیا اس لئے ہم لوگ اکٹھے رہنے لگے اب وہ ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک ہو چکے تھے۔ ہم دونوں اپنی ملازمت کے فرائض انجام دینے کے بعد کس لطف سے وقت گزارتے تھے آج بھی اسے یاد کر کے دل بے چین ہو جاتا ہے۔ یوں تو ان کی زندگی کے نہ جانے کتنے دلچسپ واقعات ذہن میں محفوظ ہیں اور جی بھی

چاہتا ہے کہ انہیں یادگار کے طور پر پابند تحریر کر دیا جائے کاش مجھے کبھی اتنی فرصت میسر آسکے کہ میں یہ فرض محبت بطریق احسن ادا کر سکوں تاہم ایک اہم واقعہ جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت دلچسپ بھی ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے تحریر کرتا ہوں اس واقعہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے۔ کہ میرے ایک دوست نے جنہیں جھوٹ بولنے میں شاید کوئی خاص لطف آتا تھا شوکت بھائی سے پہلی ملاقات پر ایک بات ایسی بیان کی جس کا انہیں یقین آگیا۔ لیکن جب انہیں اس بات کے جھوٹ ہونے کا علم ہوا تو نہ صرف انہیں ندامت ہوئی بلکہ اذیت پہنچی کہ ایک شخص نے ان جیسے ذہین انسان کو بیوقوف بنا دیا۔ چنانچہ انہوں نے اسکا جو انتقام لیا وہ نہ صرف ان کی ذہانت پر پوری پوری روشنی ڈالتا ہے۔ بلکہ اس کا ایک مفید نتیجہ یہ بھی ہوا کہ ان صاحب نے غالباً زندگی بھر کیلئے جھوٹ نہ بولنے کا عہد کر لیا۔ جھوٹ کی کئی قسمیں ہیں۔ کوئی مصلحتاً جھوٹ بولتا ہے تو کوئی مجبوراً کوئی مذاقاً جھوٹ بولتے ہیں اس کا اہم پہلو یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی بڑائی اور اہمیت جتانے کے لئے ہی اکثر و بیشتر جھوٹ بولنے لگتے ہیں اور رفتہ رفتہ عادی ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب سے متعلق یہ واقعہ ہے وہ جھوٹ کی اس قسم میں آتے ہیں۔

واقعہ یوں ہے کہ ہمیں ابھی یہاں رہتے ہوئے کچھ عرصہ ہی گزرا ہو گا کہ ایک روز میرے ہندوستان کے ایک ہمہ وقت کے ساتھی اور عزیز دوست کا کراچی سے تار پہنچا کہ وہ کل میل سے لاہور پہنچ رہے ہیں اس غیر متوقع تار کے ملتے ہی میں خوشی سے اچھل پڑا اور میں نے شوکت بھائی سے اپنی مسرت کا اظہار کیا ساتھ ہی اپنے آنے والے دوست کا غائبانہ تعارف بھی کرایا۔ یہ ہندوستان کے ایک باعزت اور بلند خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ان کے بڑے بھائی صاحب اُن دنوں قائداعظم مرحوم (جو اس وقت بسلسلہ علالت زیارت میں قیام پذیر تھے۔) کے خصوصی اور قریبی اسٹاف میں کسی ذمہ دار عہدے پر فائز تھے۔ اس بات کا بھی تذکرہ میں نے شوکت بھائی سے کر دیا۔ ظاہر ہے شوکت بھائی نے آنے والے مہمان کے متعلق ایک اچھی رائے قائم کی ہوگی۔ اور ان سے ملنے کے مشتاق ہونگے۔ قائداعظم کی علالت کی وجہ سے ہم سب رنجیدہ تھے اور ہر ایک کو انکی صحت اور حالت کی صحیح کیفیت معلوم کرنے کی فکر رہتی تھی اور ہر شخص ان کی صحت کیلئے دست بدعا تھا۔

میں اور شوکت بھائی اپنے دوست کو دوسرے روز اسٹیشن پر خوش آمدید کہنے گئے۔ ان سے تعارف کے بعد شوکت بھائی نے پہلا سوال یہ کیا "میاں قائداعظم کا صحیح حال کچھ معلوم ہے ان کا مزاج کیسا ہے؟" میرے دوست بلا تامل بولے "میں تو بھائی جان کے پاس ہی تھا۔ زیارت سے پرسوں کراچی پہنچا اور دوسرے روز یہاں کے لئے چل دیا۔ زیارت سے چلنے کے ایک روز قبل قائداعظم کی صحت کی خوشی میں بھائی جان نے انہیں ڈنر پہ مدعو کیا تھا جہاں میری بھی ان سے ملاقات بھی ہوئی۔ بحمداللہ وہ اب روبہ صحت ہیں۔ معمولی کمزوری رہ گئی ہے۔ وہ بھی رفتہ رفتہ جاتی رہے گی۔" یہ سن کر شوکت بھائی کو بیحد مسرت ہوئی اسلئے کہ اسوقت اخبارات میں قائداعظم سے متعلق واضح طور پر کوئی خبر نہ آئی تھی میں اس بیان کی صداقت سے کما حقہٗ واقف تھا لیکن میں نے شوکت بھائی سے فوری طور پر اُس دوست کی کمزوری کا اظہار کرنا مناسب نہ سمجھا جس سے ابھی ابھی تعارف ہوا تھا۔ لیکن اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ یہ بات کہاں تک پہنچے گی تو اس کا فوری اظہار بھی نامناسب نہ ہوتا۔

ہم دونوں اپنے مکان پر آگئے اور شوکت بھائی ریڈیو اسٹیشن چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے اس خوش خبری کو اسٹاف میں آن واحد میں پوری تفصیل کے ساتھ نشر کر دیا۔ لوگ مسرت سے ناچنے۔ گانے لگے۔ مٹھائیاں تک تقسیم ہو گئیں۔ اپنے

محبوب قائدِ اعظم کی صحت کی خوشی کوئی معمولی خوشی تو نہ تھی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن شومئی قسمت تو دیکھئے کہ تیسرے روز ہی قائدِ اعظم کے انتقالِ پُر ملال کی خبر آگئی اور ہر طرف ایک کہرام مچ گیا۔ ریڈیو اسٹیشن کو ہر اہم خبر کی اطلاع پہلے ہی ہو جایا کرتی ہے چنانچہ خبر آنے کے ساتھ ہی ریڈیو اسٹیشن لاہور کے چھوٹے بڑے افسران نے شوکت بھائی کے کمرے پر دھاوا بول دیا اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگے "بھائی یہ کس چنڈو خانے کی خبر لائے تھے آپ" کوئی بولا "اگر مٹھائی ہی کھانا مقصود تھی تو یوں بھی کھائی جاسکتی تھی اتنی بڑی شخصیت کو درمیان میں لانے کی کیا ضرورت تھی" وغیرہ وغیرہ۔ شوکت بھائی اپنا سا منہ لئے سر پکڑے بیٹھے اپنے کئے پر سخت نادم اور شرمندہ تھے لیکن ہمارے دوست کے خلاف ان کا جذبۂ انتقام بھڑکتا چلا جارہا تھا۔

میرے دوست کا تقرر حکومتِ پاکستان کے ایک محکمہ میں ہوا تھا اور وہ اس سلسلے میں لاہور آئے ہوئے تھے وہ اپنے عہدے کا چارج ایک روز قبل لے چکے تھے۔ جب شوکت بھائی ریڈیو اسٹیشن سے گھر واپس آئے تو ان کا چہرہ ان کے جذبات و احساسات کی پوری ترجمانی کر رہا تھا۔ آتے ہی انہوں نے میرے دوست سے پوچھا کہ بھائی عجیب بات ہے ابھی چار روز قبل حضرت قائدِ اعظم ماشاءاللہ اتنے تندرست تھے کہ وہ آپ کے بھائی صاحب کی طرف سے دی ہوئی دعوت میں شریک تھے اور آج اچانک ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ کیا ماجرا ہے۔ میرے دوست نے حاضر جوابی سے کام لیتے ہوئے کہا "شوکت بھائی زندگی اور موت کا کیا بھروسہ اچھا خاصا تندرست انسان چلتے چلتے ٹھوکر لگنے سے گر جاتا ہے۔ اور وہیں دم توڑ دیتا ہے۔ قائدِ اعظم تو ضعیف اور کمزور ہو چکے تھے" "سچ کہتے ہو میاں" شوکت بھائی نے ان کے بیان کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ مجھے علیحدہ لے جاکر شوکت بھائی رازدارانہ طور پر بولے "یہ حضرت پہنچے ہوئے درویش معلوم ہوتے ہیں۔ انکو بھی وہ مزا چکھاؤں گا کہ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔ اور آئندہ جھوٹ بولنے کی ہمت نہ کریں گے"! دوسرے روز شام کو میں اور میرے دوست مکان کے سامنے نہر کے کنارے چہل قدمی کر رہے تھے کہ ناگاہ شوکت بھائی ریڈیو اسٹیشن سے واپس آتے ہوئے دکھائی پڑے۔ ہم لوگ بھی ان کی طرف بڑھے۔ وہ بہت خوش نظر آرہے تھے۔ قریب پہنچ کر انہوں نے مجھ سے کہا "اقبال میں نے تمہارے دوست کو آسمان پر پہنچا دیا ہے لیکن قبل اسکے کہ میں اس بات کو بتلاؤں انہیں مٹھائی کھلانے کا وعدہ کرنا ہوگا۔" میرے دوست نے کہا "شوکت بھائی آپ کیلئے مٹھائی ہر وقت حاضر ہے" "نہیں صاحب پہلے مٹھائی کے لئے دس روپیہ کا نوٹ اقبال کے پاس رکھا دو تب بات بتاؤں گا اور شرط یہ ہے کہ اگر اس غیر متوقع اعزاز سے تم کو مسرت نہ ہو تو بیس روپے کی مٹھائی میرے ذمہ رہی۔ میرے دوست نے بالآخر دس روپے کا نوٹ اپنی جیب سے اور شوکت بھائی نے ایک لفافہ اپنے بیگ سے نکال کر بیک وقت میرے ہاتھ میں رکھے۔ لفافہ کھول کر میں نے ٹائپ شدہ خط نکالا اور پڑھ کر اس کی تہ تک پہنچ گیا۔ اور اپنے دوست کی جانب بظاہر رشک کی نظروں سے دیکھتے ہوئے خط بڑھا دیا۔ شوکت بھائی بولے آج سے انکا شمار پاکستان کی چند مخصوص اور بلند ترین شخصیتوں میں ہوگیا ہے۔ جسکے لئے یہ تاعمر میرے شکر گزار رہیں گے۔

وہ خط ریڈیو پاکستان لاہور کے اسٹیشن ڈائرکٹر کی جانب سے ان کے چھپے ہوئے لیٹر ہیڈ پر تھا اور اس میں تحریر تھا "جناب والا ہمیں شوکت تھانوی صاحب کے ذریعہ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کو حضرت قائدِ اعظم سے ان کی وفات سے چند روز پہلے اپنے بڑے بھائی کے یہاں دئیے ہوئے عشائیہ پر شرفِ ملاقات کا حاصل ہوا۔ ہم ممنون ہوں گے اگر آپ فلاں فلاں تاریخ ۹ بجے شب ایک تقریر ہمارے ریڈیو اسٹیشن سے نشر فرمائیں۔ اور قائدِ اعظم سے آخری ملاقات

کے تاثرات کا اظہار فرمائیں۔ آپ پاکستان کی ان چند خوش نصیب ہستیوں میں سے ہیں جنہیں مرحوم سے انکے آخری ایام میں ملاقات کا شرف حاصل ہو۔ مزید برآں ہم نے کراچی ریڈیو اسٹیشن کو بھی مطلع کر دیا ہے کہ وہ آپکے بھائی صاحب کی خدمت میں اس نوع کی تقریر کے لئے گزارش کریں۔"

خط کا پڑھنا تھا کہ یار کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ چہرہ فق ہو گیا۔ زبان لکنت کرنے لگی اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں یوں گویا ہوئے "شوکت بھائی........ جی .... کچھ .... میرا مطلب ہے کہ .... یہ اچھا نہیں ہوا"۔

"اچھا کیوں نہیں ہوا" شوکت بھائی بولے "میاں مٹھائی کے پیسے تو اقبال کی جیب میں پہنچ چکے ہیں آپ ان باتوں سے بیوقوف بنانے کی کوشش نہ کریں" اور مجھ سے کہا کہ تم تانگے پر جا کر بیڈن روڈ سے بڑھیا قسم کی مٹھائی ابھی لے آؤ آج میں نے اسی خاطر دن کا کھانا چھوڑ دیا کلیجہ کھرچ رہا ہے۔ اور دیکھو کچھ نمکین بھی لیتے آنا جب تک میں چل کر چائے بنواتا ہوں" ——

"شوکت بھائی مٹھائی کی کیا بات ہے آپ فرمائیں تو دس روپیہ کا ایک نوٹ اور پیش کر دوں لیکن ....."

"لیکن کیا؟" —— "یہی کہ یہ تقریر کا چکر بہت برا ہوا" میرے دوست نے کمزور اور نحیف آواز میں کہا شوکت بھائی فوراً بات کا رخ موڑتے ہوئے بولے "اچھا میں سمجھ گیا۔ ارے بابا تم کیوں پریشان ہو تقریر تو ساری میں لکھ دوں گا اور ایسی لکھوں گا کہ دوسروں کی تقریریں تمہاری تقریر کی گرد کو بھی نہ پا سکیں۔ تم صرف اس دعوت کی موٹی موٹی باتیں ایک پرچے پر لکھ دو باقی میری ذمہ داری ہے۔" اور میری طرف مخاطب ہو کر کہا کہ آپ ابھی تک یہیں کھڑے ہیں جلد جائیے اور مٹھائی لے کر آئیے۔

چنانچہ میں چل دیا اور تقریباً ایک گھنٹے میں مٹھائی لے کر واپس آ گیا۔ ہمارے اصرار کے باوجود وہ مٹھائی میں شریک نہیں ہوئے۔ اتنے میں میری بیگم جن کو اس ڈرامے کا علم ہو چکا تھا رازدارانہ اور ہمدردانہ انداز میں مجھ سے بولیں "آپ دونوں نے انہیں کس عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا ہے۔ منہ پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ ایسے مذاق سے کیا فائدہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔"

میں نے کہا ابھی عجلت کیا ہے۔ ذرا صبر کرو اور تماشہ دیکھو۔ چائے کے بعد شوکت بھائی نے ہمارے دوست کی طرف کاغذ کا ایک شیٹ بڑھاتے ہوئے فرمایا آپ اس پر اس دعوت کی نمایاں باتیں مثلاً قائد اعظم مرحوم کس لباس میں ملبوس تھے ان کے داہنے بائیں کون بیٹھا تھا۔ کھانے کے وقت کس قسم کی گفتگو ہوتی رہی اس دعوت میں اور کون شخصیتیں موجود تھیں وغیرہ وغیرہ یادداشت کے طور پر نوٹ کر دیں تاکہ میں تقریر ابھی لکھ دوں اور آپ دو روز میں اسے کئی بار پڑھ کر رواں کر لیں۔"

ہمارے دوست نے وہ کاغذ تو لے لیا لیکن پھر شوکت بھائی کی منت وسماجت کرنے لگے "اگر آپ نے یہ پروگرام منسوخ نہ کرایا تو مصیبت آ جائے گی۔ میرے اور بھائی جان کے تعلقات خراب ہو جائیں گے اس لئے کہ انہوں نے مجھے ہدایت کی تھی کہ اس دعوت کا کہیں تذکرہ نہ کرنا۔ میں نے آپ کو اپنا سمجھکر بتلا دیا۔"

شوکت بھائی نے پوچھا کہ آخر اس کو صیغۂ راز میں رکھنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے"؟

ہمارے دوست برجستہ بولے اصل بات یہ ہے کہ آج کل بھائی جان کے تعلقات وزیر اعلیٰ سے کچھ بہتر نہیں ہیں اور موصوف کو اس میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی تھی اب اگر اس کا چرچا ہوتا ہے۔ اور ان کے علم میں یہ دعوت آجاتی ہے تو بھائی جان کی پوزیشن اور خراب ہو جائے گی"۔

"سبحان اللہ کیا استدلال ہے" اماں یہ دعوت ہوئی بھی تھی کہ تم نے یوں ہی اڑا دیا۔" شوکت بھائی نے پوچھا۔

میرے شیر نے سینہ تان کر جواب دیا "نہیں صاحب دعوت تو ضرور ہوئی تھی۔ اور محترمہ فاطمہ جناح بھی شریک تھیں"۔ "تو پھر تقریر بھی ضرور ہوگی میں مجبور ہوں اس لئے کہ ریڈیو کے پروگرام میں تنسیخ میرے بس کی بات نہیں" شوکت بھائی نے ذرا لہجہ بدل کر کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ انہیں دل کا دورہ پڑتے پڑتے رہ گیا۔ ان کی عدم موجودگی میں میری بیگم اور میں نے شوکت بھائی سے درخواست کی کہ اب اس کی خطا معاف کر دیجئے ورنہ صبح تک اس کا بُرا حال ہو جائے گا لیکن وہ ابھی کہاں معاف کرنے والے تھے۔ انہوں نے کہا کہ خاموشی سے تماشہ دیکھتے جاؤ۔ وہ واپس آئے تو شوکت بھائی نے سوالات کی بوچھار کر دی جو کچھ اس قسم کے تھے؟

قائد اعظم کے داہنے۔ بائیں کون بیٹھا تھا"؟

"اُن کے داہنی طرف محترمہ فاطمہ جناح تشریف فرما تھیں اور بائیں جانب بھائی جان"

قائد اعظم کس لباس میں ملبوس تھے؟

"ڈنر سوٹ پہنے ہوئے تھے"

محترمہ فاطمہ جناح کون سا اور کس رنگ کا لباس زیب تن فرمائے تھیں؟

"سیاہ رنگ کی ساڑھی پہنے تھیں"۔

تو یوں کہئے کہ انہوں نے اپنے بھائی کے سوگ میں ۴-۶ یوم پہلے ہی سے ماتمی لباس پہن رکھا تھا۔ ورنہ یوں تو بالعموم وہ سفید لباس پسند فرماتی ہیں۔ اچھا میں اب سمجھ گیا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں مضمون لکھ لوں گا؟

میرے دوست بولے شوکت بھائی وقت گزرتا جا رہا ہے آپ خدا کے لئے کسی صورت سے کراچی ٹیلی فون کریں اور انہیں روکیں ورنہ اگر کہیں بھائی جان کے پاس اس تقریر کے لئے خط چلا گیا تو غضب ہو جائے گا اور میں کہیں کا نہ رہوں گا"۔ اب کوئی ۹ بجے کا عمل ہو گا۔ میرے دوست کی حالت غیر تھی اور ہر لحظ بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ بار بار پانی پیتے تھے پھر بھی ہونٹ اور زبان خشک نظر آ رہے تھے بالآخر میرے دوست مجھے علیحدہ لے گئے اور کہا کہ اگر بھائی جان کی تقریر کو ملتوی نہ کرایا گیا تو قیامت آجائے گی۔ میں نے کہا کہ ممکن ہے۔ کہ ریڈیو پاکستان کا خط فرضی اور جعلی ہو شوکت بھائی نے مذاقاً ایسا کیا ہو تو فرمانے لگے "تم پاگل ہو گئے ہو، خط پر اسٹیشن ڈائرکٹر کے دستخط موجود ہیں۔ (جیسے وہ دستخط پہچانتے ہوں) بات یہ ہے کہ جب انسان بوکھلایا ہوا ہوتا ہے تو اس کی ساری دماغی صلاحیتیں جواب دے دیتی ہیں۔ اس وقت یہ اسی منزل میں تھے۔ میں نے پوچھا۔ اچھا مجھے تو صحیح بتا دو ڈنر کی بات غلط ہے نا۔ اس ڈھٹائی سے بولے غلط کون کہتا ہے ڈنر ہوا اور میں بھی موجود تھا۔ تو پھر تقریر کرنے میں کیا قباحت ہے۔ جب کہ شوکت

بھائی پوری تقریر لکھنے کا وعدہ کر چکے ہیں۔" کہنے لگے مجھے اپنی تقریر سے زیادہ سر دست یہ بات پریشان کئے ہوئے ہے۔ کہ میرے حوالے سے بھائی جان کو اس موضوع پر تقریر کرنے کے لئے دعوت دی جائے گی۔ میں مصلحتاً اپنا حوالہ مناسب نہیں سمجھتا یوں اگر کراچی ریڈیو والے چاہیں تو خود دعوت دیں لیکن میرا نام کسی صورت سے درمیان میں نہ آنا چاہیے۔

میرے دوست کی حالت لحظہ بہ لحظہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ چنانچہ ہم سب نے ایک زبان ہو کر ان سے کہا کہ شوکت بھائی کو اس بات پر ہم لوگوں نے رضامند کر لیا ہے کہ وہ نہ صرف جی۔ پی۔ او۔ جا کر کراچی ٹرنک کال کریں گے اور بھائی جان کی تقریر منسوخ کرائیں گے بلکہ تمہاری بھی تقریر منسوخ کرانے کی کوشش کریں گے بشرطیکہ تم اس بات کا اقرار کرو کہ تم جھوٹ بولے تھے اور اب کبھی نہ بولو گے۔" لیکن صاحب توبہ کیجئے وہ ایسی کچی گولیاں تو نہیں کھیلے تھے اسی طرح اکڑ کر بولے بات تو اپنی جگہ بالکل صحیح ہے۔ میں بلاوجہ جھوٹ کیوں بولتا۔ اب اگر زبردستی آپ لوگ یہ کہلوانا چاہتے ہیں کہ دعوت نہیں ہوئی تو بات دیگر ہے۔ اب میں سمجھ چکا تھا کہ ان میں اقرار جرم کا حوصلہ نہیں ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی مناسب نہ تھی کہ پوری رات اس کی نیند حرام کر دی جاتی چنانچہ میں نے کھل کر شوکت بھائی سے سب کی موجودگی میں کہا کہ صاحب یہ عادتاً جھوٹ بول دیا کرتے ہیں۔ نہ قائد اعظم کی دعوت ہوئی اور نہ ہی یہ وہاں موجود تھے۔ چونکہ یہ کہہ چکے ہیں اسلئے اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔ اگر آپ نے کراچی کی تقریر کو نہ رکوایا تو ان کے بھائی صاحب سے تعلقات خراب ہو جائیں گے۔ اور ان کی ملازمت بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

یہ سن کر شوکت بھائی ان کی طرف مخاطب ہو کر بولے "کیوں بھائی اقبال جو کچھ کہہ رہے ہیں درست ہے"؟ اس بار ذرا لجاجت سے انہوں نے جواب دیا اب آپ جو کچھ سمجھیں ٹھیک ہے۔ لیکن خدا کے لئے اب عجلت کیجئے میں تانگہ لینے جاتا ہوں۔ دس بج چکے ہیں۔ جی۔ پی۔ او۔ چل کر ٹیلی فون کرنا ہے۔" اب شوکت بھائی کو بھی اس کے حال زار پر ترس آ گیا تھا اور وہ چلنے کیلئے تیار ہو گئے۔ تانگہ آ گیا ہم تینوں جب مکان سے نکلنے لگے تو شوکت صاحب کی بیگم صاحبہ نے کہا کہ آپ ادھر جا رہے ہیں تو انار کلی سے موتی چور کے لڈو ضرور لیتے آیئے گا۔" شوکت صاحب نے ان سے پیسے مانگے تو میرے دوست نے ان کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف کھینچتے ہوئے کہا کہ پیسے میرے پاس ہیں آپ خدا کے لئے جلد چلیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جب ہمارا تانگہ جی۔ پی۔ او کے قریب پہنچا تو وہ خود ہی بولے کہ شوکت بھائی یہ پندرہ روپے ٹرنک کال کے لئے آپ لیجئے۔ ارجنٹ بک کیجئے گا۔ میں اور اقبال اتنی دیر میں اسی تانگہ پر جا کر انار کلی سے لڈو لے کر آتے ہیں۔ دو سیر لڈو ہم خرید کر کوئی بیس منٹ میں واپس آئے تو شوکت بھائی جی۔ پی۔ او کے باہر دروازے پر کھڑے ہم دونوں کا انتظار کر رہے تھے۔ فرمانے لگے کہ میں نے ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل سے گفتگو کر لی ہے۔ تار انہیں مل گیا تھا۔ کل صبح تمہارے بھائی جان کو خط لکھ دیا جاتا لیکن میں نے ان سے کہہ دیا کہ یہ تار کسی غلط اطلاع پر روانہ کر دیا گیا تھا۔ اس پر کوئی کارروائی نہ کی جائے اور اسے کالعدم تصور کیا جائے وہ میری بات مان گئے ہیں۔" یہ سننا تھا کہ میرا دوست خوشی سے اچھل پڑا چہرے پر رنگ آ گیا۔ شوکت بھائی نے کہا ٹیلی فون کرنے میں تین روپے دس آنے مزید خرچ ہوئے تھے جو میں نے دے دئے ہیں۔ یہ سنتے ہی انہوں نے پانچ روپے کا ایک نوٹ زبردستی شوکت بھائی جیب میں ڈال دیا۔ حالانکہ وہ تکلفاً نہیں نہیں .... اس کی کیا ضرورت ہے کہتے رہے۔

ہم لوگ ساڑھے گیارہ کے قریب مکان واپس پہنچے۔ اس وقت تھوڑی بہت مٹھائی کھائی گئی بقیہ صبح ناشتے کے لئے رکھ دی گئی۔ اب شوکت بھائی نے ہمارے دوست سے کہا کہ آپ کے بھائی صاحب کی تقریر کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ کیلئے کیا صورت ہونی چاہئے۔ تھوڑے توقف کے بعد فرمایا کہ اپنے دفتر سے دو یوم کی رخصت علالت لے لو۔ ریڈیو کے تمام پروگرام مقررہ وقت پر پابندی کے ساتھ ہوتے ہیں تمہاری تقریر پرسوں شب میں ہونی ہے۔ میں وہاں کہہ دوں گا کہ وہ اتفاقی طور پر سخت علیل ہو گئے ہیں اور تقریر کرنے کے قابل نہیں ہیں لیکن اس بات کا لحاظ رکھیں کہ ان دونوں دنوں میں آپ مکان کے باہر نہ نکلیں اور نہ ہی کوٹھی کے لان پر کھلی فضا میں بیٹھیں اس لئے کہ ریڈیو کے افسران کبھی کبھی میرے پاس آجاتے ہیں اگر کسی نے آپ کو دیکھ لیا تو میں جھوٹا پڑوں گا" اسکے باوجود کہ انکی شکل سے ریڈیو کا کوئی فرد بھی آشنا نہ تھا لیکن کچھ سوچے سمجھے بغیر وہ غریب اس عارضی قید کے لئے بھی رضامند ہو گئے اور اس صورت سے ہمارے دوست دو روز مکمل قید میں رہے۔

تیسرے روز یعنی جس تاریخ کو تقریر ہونی تھی شوکت صاحب نے دفتر سے واپسی پر ہم سب کو اپنے ڈرائنگ روم میں جمع کیا میں۔ میری بیگم۔ شوکت صاحب کی بیگم۔ ان کے بچے اور میرے دوست سب ہی موجود تھے۔ شوکت صاحب ہمارے دوست سے یوں مخاطب ہوئے "میاں اب تو ساری بات ختم ہو گئی"

اب اپنی زبان سے بھی کہہ دو کہ دعوت کی بات غلط تھی۔ ہمارے دوست نے شرم سے آنکھیں تو جھکا لیں لیکن زبان سے اقرار جرم نہ کیا۔ اس کے بعد شوکت صاحب نے فرمایا "جھوٹ بولنے کے لئے بھی ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بے وقوف جھوٹ بول کر طرح طرح کے عذاب میں گرفتار ہو جاتا ہے اور عقل مند جھوٹ بولتا ہے۔ تو مٹھائی بھی کھاتا ہے۔ اور لطف بھی لیتا ہے۔" تم جھوٹ بولے تو تمہارے کم و بیش پچاس روپے خرچ ہوئے دو روز قید محض میں رہے اور جو تمہارے دل و دماغ پر گزری تم سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ اور میں نے جھوٹ بولا تو تم سے روپے بھی لئے اور مٹھائی بھی کھائی" اسکے بعد مبلغ اٹھارہ روپے (یعنی ٹیلی فون کا خرچ) ان کو واپس کئے اور ان سے آئندہ جھوٹ نہ بولنے کا عہد لے کر اس ڈرامے کو ختم کیا۔

انہی دنوں کا ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ قائد اعظم کی وفات کے ساتھ ہی بھارتی گورنمنٹ نے ریاست حیدر آباد دکن پر قبضہ کرنے کے لئے فوج کشی کر دی تھی۔ قاسم رضوی صاحب کی انجمن اتحاد المسلمین کے رضاکاروں نے دلیرانہ انداز میں ایک مسلح فوج کا کئی روز تک مقابلہ کیا اس کا علم کس کو نہیں۔ ہر پاکستانی اپنے محبوب رہنما کی بے وقت وفات سے یوں ہی کیا کم رنجیدہ تھا اس پر ستم بالائے ستم کہ اچانک حادثہ سے لوگوں پر جو قیامت گزری اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ گنتی کے نہتے جانباز ایک منظم فوج کا کب تک مقابلہ کرتے نتیجہ بالآخر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ جس وقت سقوط حیدر آباد کی خبر نشر ہوئی میں اپنے دفتر ہی میں تھا اس خبر سے ہر کس و ناکس کو دلی صدمہ پہنچا اور سارے ملک میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ میں دفتر سے سیدھا ریڈیو اسٹیشن شوکت بھائی کے پاس پہنچا۔ وہ بھی بہت رنجیدہ تھے اور اپنے دلی صدمے کا کئی بار اظہار بھی کیا۔ بالآخر ہم دونوں گھر کے لئے روانہ ہو گئے۔ کوٹھی کے اندر ابھی داخل نہ ہونے پائے تھے کہ شوکت بھائی کو اس عالم میں بھی ایک مذاق سوجھا۔ مجھ سے کہنے لگے۔ "دیکھو میں پاگل بنا جاتا

ہوں لیکن تم ہنس کر کھیل بگاڑ نہ دینا۔" میں خاموش رہا۔ انہوں نے اپنی بش شرٹ اتار کر مجھے دے دی۔ جوتے اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ سر کے تمام بال الجھا کر کھڑے کر لئے۔ آنکھیں ایسی بنالیں کہ دیوانے کی آنکھیں بھی کیا ہوں گی۔ مجھ سے بولے کہ میرا بازو پکڑ کر اندر لے چلو چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ پاگلوں جیسی آنکھیں بنا لینا آسان کام نہیں۔

مجھے تو آج تک ان کی وہ مصنوعی ڈرامائی شکل یاد ہے۔ ہم لوگ جوں ہی مکان کے اندر داخل ہوئے۔ میری بیوی اور ان کے بچے شوکت بھائی کو اس عالم میں دیکھتے ہی بدحواس ہو کر دوڑے اور ان کا حال پوچھنے لگے۔ میں نے شوکت بھائی کی ہدایت کے مطابق انہیں بتایا کہ جس وقت سے سقوط حیدرآباد کی خبر سنی ہے نہ جانے ان پر کیا گزری کہ بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں اور اپنا پاگلوں جیسا حال بنا رکھا ہے۔ ریڈیو والوں نے مجھے ٹیلی فون پر اطلاع دی میں بھاگا بھاگا گیا اور انہیں اپنے ہمراہ لایا ہوں۔" شوکت صاحب کی بیگم صاحبہ عصر کی نماز برآمدے میں بچھے ہوئے تخت پر پڑھ رہی تھیں سب سے پہلا حملہ انہوں نے اپنی بیگم پر ہی کیا۔ انہیں جا کر اپنی گود میں اٹھا لیا اور اندرونی صحن میں رقص کرنے لگے نہ صرف وہ بلکہ ہم سب چیخ رہے تھے لیکن وہ کسی کی نہیں سن رہے تھے۔ میں بالآخر انہیں شوکت بھائی کی گرفت سے چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب وہ میرے پیچھے پڑ گئے اور صحن میں مجھے پچھاڑ کر میرا گلا دبانے لگے یہ دیکھ کر میری بیگم چیخ پڑیں۔ "ارے خدا کے لئے انہیں بچاؤ" اس وقت شوکت بھائی کے اس مذاق سے کم از کم مجھے اپنی شریک حیات کی محبت کا اندازہ لگانے کا موقع تو ملا۔ میں رندھے ہوئے گلے سے چیخ رہا تھا۔ حالانکہ شوکت بھائی کی گرفت بہت معمولی تھی۔ میری بیوی کی چیخ پکار کی وجہ سے سب کے سب شوکت بھائی پر جھپٹ پڑے اور انہیں زبردستی علیحدہ کیا لیکن وہ غصے کے عالم میں یہی کہتے رہے۔

"اس نے میری بیوی کو مجھ سے کیوں چھین لیا۔ یہ کون ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ" میں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور ان سے معافی مانگی تب کہیں جا کر ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ ان کی بیگم خاص طور پر ان سے یہ کہہ رہی تھیں کہ حیدرآباد کی فتح یا شکست سے آپ کا کیا تعلق؟ آپ نے خواہ مخواہ اپنے دل پر اس بات کا اتنا اثر کیوں لیا؟ آپ اپنی جان کیوں ہلکان کر رہے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ" لیکن شوکت بھائی کا جواب بھی خوب تھا بولے "مجھ سے کوئی تعلق نہیں؟ ایک ادیب۔ ایک فن کار کا کس چیز سے تعلق نہیں ہوتا۔ قائد اعظم اگر موجود ہوتے تو کوئی فکر کی بات نہ تھی لیکن ان کی وفات کے بعد ہماری ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ .... کل اگر ہندوستان نے پاکستان کو یوں ہی ہڑپ کر جانا چاہا تو بھی آپ یہی فرمائیں گی کہ تم سے کیا مطلب؟ .... کیا خوب بات کہی آپ نے .... میں یہ سوچ سوچ کر اور پریشان ہو رہا ہوں کہ اللہ میاں کے ہاں جب قائد اعظم مجھ سے محاسبہ کریں گے اور پوچھیں گے کہ دنیا سے میرے چلے آنے کے ایک ہفتہ بعد ہی ہندوستان نے حیدرآباد پر قبضہ کر لیا تو میں کیا جواب دوں گا۔" یہ کہہ کر رونے لگے۔ گھر کے ہر فرد کو اب ان کے مکمل پاگل ہونے کا یقین ہو چکا تھا۔ عرق بید مشک وغیرہ انہیں زبردستی پلایا گیا لیکن بے سود۔ ان کے بچے رو رہے تھے اور نہ صرف ان کی بیگم بلکہ میری بیوی بھی بدحواس تھیں۔ اب سورج غروب ہو چکا تھا گرمیوں کا زمانہ تھا۔ صحن میں پلنگ پر بستر بچھا کر انہیں زبردستی لٹا دیا گیا۔ اور ان سے کہا گیا کہ آپ باتیں نہ کریں۔ اس واہمہ کو دل سے نکالیں اور ذرا دیر آرام کریں اس وقت تک نہ جانے کتنے ایسے نازک مقامات آچکے

تھے جہاں مجھے اپنی زبان کو دانتوں سے کاٹ کر ہنسی کو برداشت کرنا پڑا لیکن آخر تابہ کے شوکت بھائی پلنگ پر لیٹے تھے۔ ہم سب ان کے ارد گرد جمع تھے کوئی پنکھا جھل رہا تھا تو کوئی انہیں تسلی دے رہا تھا لیکن وہ جس کی طرف نظر بھر کر دیکھ لیتے تھے وہ اپنی جگہ سہم کر رہ جاتا تھا۔ ہر شخص چوکنا تھا کہ نہ جانے ان کی توجہ کا مرکز کون بنے اب چاند پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہو چکا تھا بھائی لیٹے لیٹے چاند کو کچھ دیر غور سے دیکھتے رہے۔ اچانک پلنگ پر ہی کھڑے ہو کر چاند سے پہلے اشاروں میں باتیں کیں اُسکے بعد اپنا ہاتھ کمر پر رکھ کر کسی مشہور فلمی گانے کا ٹکڑا جس میں چاند کا ذکر تھا ایسی دھن میں مٹک مٹک کر یوں گانے لگے کہ نہ صرف میں بلکہ ان کی بیوی اور بچے بھی ان کی اس حرکت پر اپنی بے تحاشہ ہنسی کو روک نہ سکے لیکن اس کے فوراً بعد ہی ان کی بیگم نے اپنے بڑے بیٹے سعید عمر سے کہا کہ کیا دیکھ رہے ہو فوراً جا کر ڈاکٹر کو بلا لاؤ دیکھتے ہو ان کا کیا حال ہو رہا ہے۔ سعید نے قریب کی کسی کوٹھی سے غالباً شوکت صاحب کے خاندانی معالج ڈاکٹر ممتاز حسین کو ٹیلی فون کیا اور وہ نصف گھنٹے کے اندر آ گئے۔ افسوس کہ وہ بیچارے بھی ان حضرت کو نہ پہچان سکے۔ انہیں بھی شوکت صاحب کو اس حالت میں دیکھ کر صدمہ پہنچا۔ وہ تادیر شوکت صاحب کو سمجھاتے بجھاتے رہے تفصیلی حال سننے اور پورے معائنے کے بعد نسخہ لکھ کر وہ انجکشن لگانے کی فکر اور کوشش میں تھے کہ شوکت بھائی نے انہیں ایسی بھرپور نظروں سے دیکھا کہ وہ بغیر انجکشن لگائے اور بغیر فیس لئے شوکت صاحب کو آرام کرنے کی تلقین فرماتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اب سعید عمر دوا لینے کے لئے جانے والے ہی تھے کہ شوکت بھائی نے دوسروں کی نظریں بچا کر مجھے اشارہ کیا کہ انہیں روکو۔ چنانچہ میں نے کہا کہ آپا نو بجنے والے ہیں۔ مال روڈ اور انار کلی کی دوکانیں بند ہو گئی ہوں گی اسوقت اس مقصد کے لئے سعید کو بھیجنا فضول ہے۔ رات گزرنے دیجئے اگر خدا نخواستہ صبح تک ان کی حالت نہ سنبھلی تو دیکھا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا لیکن اس پریشانی کے عالم میں کوئی کھانے کے لئے تیار نہ ہوا۔ میری بھی آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا میں نے شوکت بھائی سے کہا کہ میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔ اب مجھ میں ضبط کا یارا نہیں رہا۔ خدا کے لئے یہ ڈھونگ ختم کیجئے دیکھئے تو سب کا کیا حال ہو رہا ہے۔“

میرا یہ کہنا تھا کہ سب سمجھ گئے کہ یہ حضرت بنے ہوئے ہیں۔“

”انکی بیگم بہت خفا ہوئیں کہ ایسا مذاق بھی کیا۔ اختلاج کے مارے میرا نہ جانے کیا حال ہو گیا ہے۔ بالآخر شوکت بھائی اپنی اصلی حالت اور قدرتی شکل میں واپس آ گئے اور سب سے اپنی مہارت کی داد چاہنے لگے۔ سب نے یک زبان ہو کر ان کی اہلیت کو تسلیم کر لیا اور ان کے فن کی داد دیتے ہوئے کہا کہ اصلی پاگل بھی آپ سے آکر آداب دیوانگی سیکھے۔ رات کے دس بجے جب یہ ڈرامہ ختم ہوا تو سب کو کھانا نصیب ہوا۔ اس مذاق سے یہ ضرور ہوا کہ حیدرآباد کی خبر سے دل جس قدر رنجیدہ تھے اس کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا۔“

شوکت بھائی کے ساتھ رہ کر مجھے ان کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ انکی نجی زندگی حرف بحرف اس شعر کے مصداق رہی ؎

اے شیخ تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح
میں نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

میں ان کی نجی زندگی کی تفصیلات میں جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ تاہم یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جس شخص کی زندگی میں تلخیاں ہی تلخیاں ہوں اور قدم قدم پر ناخوشگواری کے کانٹے ہوں اسکے ہونٹوں پر محفل احباب میں تبسم کیوں کر رقصاں ہو سکتا ہے یہ بڑے ظرف اور بڑے حوصلہ کی بات ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ بہت کم پائے جاتے ہیں جو مصیبتوں۔ کلفتوں، رنجشوں اور تکلیفوں کا مقابلہ نہایت صبر و ضبط سے کرتے ہیں اور ان کی زبان پر حرف شکایت بھی نہیں آتا۔ شوکت بھائی جن کے متعلق میں اپنی صحیح معلومات کی بنا پر اگر یہ کہوں کہ ؎

"دل ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم" تو مبالغہ نہ ہوگا۔ وہ اپنے دل میں نہ جانے کتنے زخم چھپائے پھرتے تھے جن میں سے شاید کوئی زخم سرطان کی شکل میں ظاہر ہو کر ان کے معالجین کے علم میں آیا اور بالآخر ان کے حق میں ابدی سکون اور مداوائے کامل ثابت ہوا اور وہ اپنے معبود حقیقی سے جا ملے لیکن نہ جانے کتنے دوستوں، عزیزوں اور مداحوں کو سوگوار و اشکبار چھوڑ گئے۔ غالباً ان کی نجی زندگی کی یہ تلخیاں ہی تھیں جنہوں نے انہیں دوسری شادی پر مجبور کیا۔ لیکن ان کے دکھ کا یہ بھی مداوا نہ بن سکی اسلئے کہ اب انہیں ہر دو طرف کی ذمہ داریوں نے اپنی گرفت میں لے لیا اور یہ امر واقعہ ہے کہ دو شادیاں کرنے کے بعد امن و سکون کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی پہلی بیوی اور بچوں کی ذمہ داریوں سے بے خبر ہو جاتے تو شاید ان کے مصائب و افکار میں کچھ کمی ہو جاتی لیکن وہ فطرتاً ایک ذمہ دار شریف النفس انسان تھے اس لئے وہ دوسری شادی کے باوجود اپنی پہلی بیوی اور بچوں کی طرف سے غافل نہ رہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے ان کی کفالت کے لئے جو معقول رقم مقرر کر دی تھی وہ دو لڑکوں کے برسر روزگار ہو جانے کے باوجود تادم واپسیں باقاعدگی سے دیتے رہے۔ یہ بات بظاہر بڑی معمولی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دو گھروں کے چلانے کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انہیں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے اور اپنے آرام و سکون کا لحاظ کئے بغیر شبانہ روز جس محنت و جانفشانی سے کام کرنا پڑا وہ ان کی صحت کے لئے کسی طرح بھی مناسب نہ تھا۔ غالباً یہ اس بے پناہ محنت اور دماغی کاوش کا نتیجہ تھا کہ وہ بیک وقت دو تین امراض میں ایسے مبتلا ہوئے کہ جان بر نہ ہو سکے۔ شوکت صاحب کی پہلی بیگم کے بطن سے تین لڑکے ہیں۔ جن میں سے دو الحمد للہ برسر روزگار ہیں اور تیسرے نے اس سال ایف ایس سی کا امتحان دیا ہے۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ دوسری بیوی سے تین کم عمر بچیاں ہیں جو ابھی تعلیم کے ابتدائی مراحل میں ہیں۔

میں ۱۹۵۵ء میں کراچی آ گیا۔ مجھے شوکت بھائی کی جدائی کا ایک مرتبہ پھر غم برداشت کرنا پڑا لیکن میری خوش قسمتی کہ کچھ عرصے بعد وہ بھی ادارہ جنگ سے منسلک ہو کر کراچی آ گئے میری خواہش کے مطابق ناظم آباد میں میرے قریب ہی کرایہ پر مکان لے لیا۔ اس مکان کی بالائی منزل میں ان کے دوست جناب سید محمد جعفری اور نچلی منزل میں شوکت صاحب رہنے لگے۔ اب ہم لوگ ایک بار پھر اکٹھے ہو گئے اور کافی وقت ساتھ گزرنے لگا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میں دفتر جاتے ہوئے ان کو بھی ساتھ لے لیتا۔ انہیں جنگ کے دفتر پر چھوڑ کر میں اپنے دفتر چلا جاتا۔ ایک دن صبح میری آنکھوں نے جو واقعہ دیکھا اسے اگر کوئی دوسرا بیان کرتا تو شاید مجھے مشکل ہی سے یقین آتا۔

شوکت صاحب کا معمول تھا کہ صبح ضروریات سے فارغ ہو کر دفتر جانے کے لئے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد ناشتے کی میز پر آ جاتے اور ناشتہ کرنے کے بعد اپنا ہینڈ بیگ (جس میں ضروری کاغذات کے علاوہ پان کی ڈبیہ مختلف اقسام کے

تمباکو اور قوام کا ہونا ضروری تھا) لے کر دفتر روانہ ہو جاتے۔ ایک دن صبح میں اپنے گھر سے نکل کر ان کے پاس پہنچا تو انہیں ناشتہ کرتے ہوئے پایا۔ ایک چائے کی پیالی زبردستی میری طرف بڑھا کر کہنے لگے کہ بس میں چل رہا ہوں یہ کہہ کر وہ اپنے بیڈ روم میں چلے گئے میں بھی چائے کی پیالی ہاتھ میں لئے یوں ہی انکے پیچھے چلا گیا۔ بیڈ روم کے دروازے پر پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ وہ اپنی مسہری کے سرہانے پر آویزاں ایک طغرے کو عقیدت کے ساتھ والہانہ چوم رہے ہیں اور آنکھوں سے مس کر رہے ہیں ان کا چشمہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ جوں ہی ان کو میری موجودگی کا علم ہوا وہ ٹھٹھک گئے۔ میری حیرت اور مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ وہ طغرہ جس کو وہ یوں والہانہ بوسہ دے رہے تھے اس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر کی شبیہ مبارک تھی یہ وہ روضہ اطہر ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے ؎

ادب گا ہے است زیر آسمان از عرش نازک تر

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید این جا

شوکت بھائی کی دُنیوی زندگی سے کماحقہ واقف ہونے کے بعد یہ واقعہ اپنی نوعیت کا نہایت عجیب و غریب واقعہ تھا۔ مجھے اس کے بعد شوکت بھائی کے اُس دل پر رشک آنے لگا جس میں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس طرح جلوہ افروز تھی جس کا اظہار بھی شاید ان کی نظروں میں ریاکاری کے مترادف تھا کون جانے کہ رسول عربی کی ذات گرامی سے والہانہ محبت اور عقیدت کا صلہ انہیں وہ ملے جس کا ملنا تمام عمر کی عبادت و ریاضت کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتا۔ میں نے بڑی حیرت سے انہیں دیکھا تو کہنے لگے ”تم کو حیرت کس بات پر ہے۔ میں گنہگار سہی لیکن ہوں تو انہیں کا نام لیوا“ مجھے اس بات کو اپنے دل میں محفوظ رکھنے کے لئے تلقین کی اور کہا کہ ایک بات اور تم کو بتلاتا ہوں جو میرے معمول میں ہے اور تم بھی اسے اپنا معمول بنا لو۔ وہ یہ کہ صبح اٹھتے ہی اپنے داہنے ہاتھ کی چھنگلی کو یوں موڑو کہ ہائے ہوز نظر آئے اور باقی انگلیوں کو اس طرح کشادہ رکھو کہ ”اللہ“ بن جائے۔ مجھے وہ شکل بنا کر بھی دکھائی۔ بولے کہ اس ہاتھ کو صبح اٹھتے ہی چوم کر اپنے چہرے پر مل لیا کرو اس عمل سے بہت برکت حاصل ہوگی اور تمام دن اللہ کا کرم شامل حال رہے گا۔ اس واقعہ سے یہ پتہ چلتا ہے۔ کہ مرحوم کو اللہ اور اسکے رسول سے کس درجہ گہرا تعلق تھا۔ خوش نصیب ہیں وہ جنہیں خدا اور اس کے رسول کی محبت کی دولت لازوال میسر ہے۔“

ہم لوگ خوش خوش دن گزار رہے تھے کہ ایک روز شوکت بھائی نے میرے گھر آ کر اپنے راولپنڈی تبادلے کی خبر سنائی۔ میر خلیل الرحمن صاحب نے راولپنڈی سے ”جنگ“ کے اجرا پر موصوف کو ادارتی ذمہ داریاں سونپ کر وہاں بھیجنا طے کر لیا تھا۔ چنانچہ شوکت بھائی کو با دل ناخواستہ و باچشم نم خدا حافظ کہا لیکن کون جانتا تھا کہ یہ عارضی جدائی کچھ مدت کے بعد دائمی اور یقینی مفارقت میں بدل جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی دونوں کی پُرخلوص اور بے لوث محبت کا نتیجہ تھا کہ ان کی علالت کے دوران آخری بار ملنے کی صورت خود بخود نکل آئی۔ میں دہلی کے مشاعرے میں شریک ہونے کے بعد ۱۴؍اپریل ۱۹۶۳ء کو لاہور واپس آیا۔ دہلی کے مشاعرے میں وہ بھی مدعو تھے ان کا وہاں بے حد انتظار رہا لیکن شوکت تھانوی نہ پہنچے اور نہ ہی عدم شرکت کا کوئی سبب معلوم ہو سکا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ راولپنڈی میں ہوں گے۔ میرا پروگرام دوسرے روز اپنے بھائی کے پاس پشاور جانے کا تھا۔ میرے ساتھ میری اہلیہ بھی تھیں اور ہم دونوں

یہ طے کر چکے تھے کہ شوکت بھائی سے ملنے کے لئے راولپنڈی بھی ضرور جائیں۔ ۶ر اپریل کی شام کو ہم لوگ میل سے پشاور روانہ ہونے کو تیار تھے کہ اسی روز ۳ بجے دن کو انارکلی میں اتفاقاً عشرت رحمانی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے علیک سلیک کے بعد سب سے پہلے شوکت بھائی کی تشویشناک علالت کا تذکرہ کچھ اس انداز میں کیا کہ میرا جی دھک سے رہ گیا۔ میں اسی وقت اپنی بیوی کو ساتھ لے کر ان کی سسرال واقع گڑھی شاہو پہنچا جہاں وہ مقیم تھے۔ جوں ہی ہم لوگ ان کے کمرے میں داخل ہوئے اور ہماری نگاہیں ملیں آنکھوں میں آنسو آگئے اور صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا عجیب عالم تھا۔ خود شوکت بھائی ان کی دوسری بیگم میں اور میری اہلیہ چاروں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اور دلوں کی عجیب کیفیت تھی۔ شوکت بھائی کو پہلی بار اس عالم میں دیکھ کر دل پر جو گزری وہ ناقابل بیان ہے۔ ان کی بیگم ان کے ہاتھ اور منہ دھلا رہی تھیں اس لئے کہ ۵ بجے شام شوکت بھائی کو میو ہسپتال لے جایا جانا تھا جس کے لئے معلوم ہوا کہ وہ بمشکل رضامند ہوئے تھے۔ مجھ سے بولے "اقبال تم جانتے ہو کہ میں نے (اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ان سے زندگی میں اس طرح کا کوئی کام نہیں لیا تھا۔

اب یہ بے چاری رات دن جس صورت سے میری تیمار داری اور خدمت کر رہی ہیں اس سے میرے دل کو بے حد تکلیف ہے۔ میں اس کا بدل ان کو اس سے زیادہ کیا دے سکتا ہوں کہ آخری دم تک اپنے کو بچانے کی کوشش کروں یہ کہہ کر بے تحاشہ رونے لگے اور ہم لوگ بھی پھوٹ پڑے۔ میں نے کہا کہ شوکت بھائی آپ پریشان نہ ہوں خدا نے چاہا تو آپ جلد ہی ہسپتال سے صحت یاب ہو کر گھر واپس آجائیں گے اور ہم لوگ انشاءاللہ آپ کے غسل صحت کا شاندار جشن منائیں گے۔ اور وہ اس کا وقت نہ آیا۔ اس کے بعد اپنی بیگم سے کہا کہ تم میری فکر چھوڑو۔ دیکھو اقبال کی دولہن پہلی بار تمہارے مایکے آئی ہیں انکی خاطر و مدارات کرو۔ ہم دونوں یک زبان ہو کر بولے کہ شوکت بھائی ہم تو آپ کی عیادت کے لئے آئے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہیں کہ وہ آپ کو شفائے کامل عطا فرمائے۔ اس وقت کسی قسم کی خاطر و مدارات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تاہم انہوں نے اپنی قسم دے کر مجھے اور میری بیوی کو کچھ پھل کھانے پر مجبور کر ہی دیا۔ میں نے پوچھا کہ ابھی ۳ر مارچ ۱۹۶۳ء کو آپ سے لاہور کے مشاعرے میں ملاقات ہوئی تھی اس وقت تک آپ بالکل تندرست نظر آرہے تھے۔ یہ ایک ماہ میں آپ کا کیا حال ہوگیا ہے۔ مسکراتے ہوئے بولے بھائی بحمداللہ میں وسیع القلب ہو گیا ہوں لیکن ڈاکٹر اسے دل بڑھ جانے کی بیماری بتلاتے ہیں اگر وسیع القلبی بھی کوئی عارضہ ہے تو اس عارضہ کو میں بخوشی قبول کرتا ہوں اب شوکت بھائی کو میو ہسپتال لے جانے کی تیاری ہونے لگی چنانچہ ہم دونوں بھی ان سے باچشم نم رخصت ہو کر شام کی ٹرین سے پشاور چلے گئے۔ یہ ہماری ان کی آخری اور بالکل آخری ملاقات تھی۔

شوکت بھائی کے قہقہے۔ چست و برمحل جملے اور بے مثل لطیفے آج بھی سرمایہ گوش و دماغ ہیں۔ ان کی بے پایاں محبت۔ ان کا اخلاص۔ ان کی شرافت نفس۔ ان کی بے غرضی اور بے لوثی کس کس بات کا ذکر کیا جائے اور کس کس وصف کو قلم بند کیا جائے۔ شوکت بھائی ایک نہایت اچھے مخلص دوست۔ ایک صاحب الرائے شفیق اور ایک سچے محب وطن تھے جب تک اردو زبان زندہ ہے شوکت زندہ رہیں گے۔ اور جب تک ان کے احباب اور ان کے مداح باقی ہیں ان کا تذکرہ ہوتا رہے گا لیکن ہر محفل میں اور ہر بزم سخن میں ان کی کمی

محسوس کی جاتی رہے گی۔

یہ ایک ایسا خلا ہے جسے گردشِ ماہ و سال کبھی پُر نہ کر سکے گی۔ یہ ایک ایسی جدائی ہے جس کے بعد اس دنیائے آب و گل میں امکانِ وصل ہی نہیں رہتا۔ یہ ایک ایسی مفارقت ہے جس کے بعد تصورِ قرب ایک واہمہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود محبت کا رشتہ ایک ایسا رشتہ ہے جو جسم و روح کی قیود ٹوٹ جانے کے بعد بھی قائم رہتا ہے شوکت بھائی آج بھی مجھے چلتے پھرتے۔ ہنستے۔ بولتے۔ اور لکھتے پڑھتے نظر آتے ہیں اور میں اکثر اپنا یہ شعر گنگنانے لگتا ہوں ؎

اگرچہ تو درمیاں نہیں ہے مگر تری روشنی ہے اب بھی
ضیائیں پھیلی ہیں انجمن میں چراغ پردے میں جل رہا ہے

شوکت تھانوی

سید امتیاز علی تاج

۱۹۲۸ء میں جب شوکت تھانوی سے پہلی بار ملنے کا اتفاق ہوا تو مجھے گمان بھی نہ گزرا کہ یہ وہ محمد عمر ہیں جو اپنے لڑکپن میں اخبار پھول کے لیے مضامین، ارشد تھانوی کی نظموں کے لفافے میں ڈال کر بھیجا کرتے تھے۔ مجھے پھول کے مضامین کی ڈاک کھول لینے کی اجازت تھی۔ اُس میں جن مضمون نگاروں کے مضامین کسی اعتبار سے غیر معمولی معلوم ہوتے۔ وہ مجھے یاد رہ جاتے تھے چنانچہ شوکت صاحب اگر اپنی پھول کی مضمون نگاری کا تذکرہ کرتے تو ملاقات میں گرمجوشی ہوتی مگر تعلقات زیادہ بڑھ جانے کے بعد بھی وہ نہ بتا سکے کہ انھیں کیوں ایک نئے اہلِ قلم کی طرح مجھ سے ملنا قرینِ مصلحت معلوم ہوا۔ اِس ملاقات میں میرے متعلق وہ جو رائے قائم کر گئے، اُس کا اظہار انھوں نے اپنی کتاب شیش محل میں کیا لیکن بعد میں ایک بار خود ہی مجھ سے کہا کہ اُن کی وہ رائے صحیح نہ تھی۔

کئی سال بعد شوکت صاحب سے ایک دو ملاقاتیں اُس وقت ہوئیں جب ۱۹۴۳ء میں وہ لاہور کی پنچولی آرٹ پکچرز میں بحیثیت مصنف کے آئے۔ افسوس کہ اُن کے آنے سے پیشتر میں پنچولی آرٹ پکچرز میں تین سکرین پلے لکھنے کا معاہدہ ختم کر چکا تھا اور پربھات فلم کمپنی کے لیے ایک فلمی کہانی لکھ کر ڈائرکٹ کرنے کی غرض سے پونا لے جایا جا رہا تھا۔ اس لیے اس موقع پر شوکت صاحب سے ایک دو سے زیادہ ملاقاتیں نہ ہو سکیں، وہ بھی بہت مختصر اور رسمی قسم کی۔ پھر جب بعض مجبوریاں پیش آ جانے سے میرا لاہور چھوڑنا ممکن نہ رہا اور پونا جانے کا خیال مجھے قطعی طور پر ترک کرنا پڑا تو اُس وقت تک شوکت پنچولی آرٹ پکچرز کی ملازمت ترک کر کے سونگ پبلسٹی کا کام کرنے یو۔ پی جا چکے تھے۔

آخر ۱۹۴۶ء میں شوکت صاحب سے تعلقات زیادہ بڑھنے کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ سونگ پبلسٹی کا کام چھوڑ کر وہ دوبارہ پنچولی آرٹ پکچرز میں آئے تو اُس زمانے میں میں بھی اِس کمپنی کے لیے کام کر رہا تھا۔ کمپنی کے مالک نے مجھ سے ایک فلمی ڈرامہ لکھنے کی فرمائش کر رکھی تھی جسے میں کمپنی ہی کے دفتر میں اِس خیال سے جا کر لکھا کرتا تھا کہ کوئی بات مالک کمپنی سے پوچھنے کی ہو تو وہیں کے وہیں تبادلہ خیال کر لوں۔ وہاں میرے کمرے کے برابر کے کمرے میں شوکت بیٹھتے تھے۔ وہ اپنے کام سے اُکتاتے تو میرے کمرے میں آ جاتے۔ کسی شگفتہ طبع ادیب سے گفتگو کر کے جس قسم کی فرحت ملتی ہے وہ تو اِن ملاقاتوں سے ضرور حاصل ہوتی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُس زمانے میں ہم نہ ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہو سکے اور نہ اُن کے کمالات مجھ پر کھل

سکے۔ میرے فلمی ڈرامے کے لیے گانے لکھنے کا سوال پیدا ہوا تو یہ کام شوکت صاحب کے سپرد کیا گیا۔ میں اور وہ گانوں کے مواقع اور انداز کے متعلق مل کر غور کیا کرتے۔ دو ایک گانے شوکت صاحب نے لکھ کر مجھے دیئے بھی جو میرے پرانے کاغذوں میں کہیں دبے پڑے ہوں گے۔ اسی زمانے میں ملک کے سیاسی حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ یہ فلم بنانا ۴۷ء کے ستمبر پر اٹھا رکھا گیا۔ مگر تقسیم ملک کے بعد پنچولی آرٹ پکچرز کا کاروبار بند ہو گیا اور اس فلم کے بننے کی نوبت نہ آئی۔ شوکت اس ملازمت سے فراغت پا کر ریڈیو پاکستان لاہور کے اسٹاف میں شامل ہو گئے۔ اتفاق کی بات کہ اُس زمانے میں میرے لیے بھی ریڈیو پاکستان لاہور میں ایک ایسا کام نکل آیا جس کے لیے مجھے کئی مہینے روزانہ وہاں صبح سے رات تک کا وقت صرف کرنا پڑا۔

ہوا یوں کہ تقسیم ملک کے تھوڑے ہی عرصے بعد ظفر الاحسن صاحب نے جو اُس زمانے میں لاہور کے ڈپٹی کمشنر تھے، ایک موقع پر مجھ سے فرمایا کہ مہاجر طرح طرح کی مصیبتیں سہہ کر کے بُرے حالوں پاکستان پہنچ رہے ہیں اور اُن کا مورال مجھے کچھ اونچا نظر نہیں آتا، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ روزانہ اخباروں کے پہلے صفحے پر کچھ جگہ اِس غرض کے لیے مخصوص کرانے کی کوشش کروں کہ اُس میں لوگوں کا مورال اونچا کرنے کے لیے آپ روزانہ مناسب مضامین لکھنے کی ذمہ داری سنبھال لیں۔ میں نے اِس تجویز پر چند روز غور کرنے کے بعد اُن کی خدمت میں عرض کیا کہ کئی کئی اخباروں کے لیے یہ خدمت روزانہ سرانجام دینا نہ صرف بہت محنت طلب کام ہے بلکہ اِس طرح بعض پیچیدگیاں پیدا ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔ اس لیے میری دانست میں مناسب یہ ہوگا کہ یہ خدمت ریڈیو پاکستان کے ذریعے سرانجام دینے کی کوشش کی جائے۔ احسن صاحب نے میری اس تجویز سے اتفاق فرمایا چنانچہ میں نے ریڈیو پاکستان لاہور سے روزانہ نشر کرنے کے لیے ایک مرکب پروگرام کا منصوبہ تیار کر لیا اور ریڈیو کے متعلقہ افسروں سے اُس پر تفصیلی بحث کی۔ اُنھوں نے میری اس تجویز کو پسند کیا اور یہ کام میرے سپرد کر دیا۔ پروگرام کا نام "پاکستان ہمارا" تجویز ہوا۔ ریڈیو پاکستان نے اس کام میں میری امداد کے لیے شوکت تھانوی کو مقرر کیا۔ شوکت صاحب نے بعد میں مجھے بتایا کہ شروع شروع میں انھیں اندیشہ تھا کہ روزانہ اکٹھے کام کرنے میں اختلاف رائے سے کہیں بدمزگی نہ پیدا ہو جائے لیکن جب کام شروع ہوا تو ایسی خوش اسلوبی سے سرانجام پاتا رہا کہ ہر دن ہمیں ایک دوسرے سے قریب تر کرتا گیا۔

ہم دونوں ایک ہی کمرے میں اور ایک ہی میز پر آمنے سامنے بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ کام کرنے کا طریق یہ تھا کہ صبح کو دفتر پہنچتے ہی طے کرتے کہ اُس دن کے پروگرام کا موضوع کیا ہوگا۔ موضوع کے انتخاب میں اخباروں کی خبریں اور رپورٹروں کی رپورٹیں ہماری رہنمائی کرتیں۔ ان دونوں ذریعوں سے امداد نہ ملتی تو عام حالات کا خیال کر کے ایک دوسرے کے مشورے سے کوئی مناسب موضوع خود طے کر لیتے۔ جو موضوع بھی طے ہوتا اُس پر کلام پاک۔ حدیث اور تاریخ میں سے ایسی چیزیں نکالتے جن سے اسلامی نقطۂ نظر واضح ہوتا۔ اس کے بعد ہنگامی حالات پر توجہ کی جاتی کیمپوں کے واقعات پر مکالمے۔ اسکٹ۔ نظمیں وغیرہ لکھنا تجویز ہوتا۔ یوں بہت سی اہم اور مفید مطلب چیزوں کی ایک فہرست دوپہر سے پہلے تیار ہو جاتی۔ اس کے بعد ہم کام تقسیم کرتے کہ فہرست کی کون کون سی چیزیں شوکت لکھیں گے اور کون کون

سی ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد دونوں لکھنے میں مصروف ہو جاتے۔ اور سہ پہر تک اپنے اپنے حصے کی تحریریں تیار کر لیتے اور ایک دوسرے کو سناتے۔ دونوں ایک دوسرے کی چیزوں پر بے تکلفی سے اظہار رائے کرتے اور جو قائل ہو جاتا وہ اپنی چیز دوبارہ لکھتا یا اس میں مناسب ترمیم کر دیتا۔ نقلیں تیار ہونے کے لیے مسودہ کئی لوگوں کو دے دیا جاتا۔ نقلیں تیار ہو کر آتیں تو جلدی جلدی ہم انھیں پڑھتے اور کتابت کی غلطیاں درست کرتے۔ پھر مختلف حصے مختلف آوازوں کے سپرد کر کے ان کی ریہرسل کراتے۔ اتنے میں براڈکاسٹ کا وقت ہو جاتا۔ اس میں حسبِ ضرورت حصہ لیتے۔ راوی کے جملے میں بولتا، شوکت عموماً کسی اسکٹ میں حصہ لیا کرتے تھے۔

اسی زمانے میں میں نے شوکت کو "علامہ" کہہ کر مخاطب کرنا شروع کر دیا، بات یہ تھی کہ آمنے سامنے بیٹھ کر لکھتے لکھتے جب کبھی مجھے کسی واقعے یا محاورے کے متعلق کچھ شبہ ہوتا تو میں سر اٹھاتا اور شوکت سے استفسار کرتا۔ ان سے جو جواب ملتا، کتاب اور لغت ہمیشہ اسی کی تصدیق کرتی۔ خاص موقع تو اب مجھے یاد نہیں رہا لیکن اسی نوعیت کی کوئی اہم معلومات حاصل ہونے پر بے اختیار میرے منہ سے نکلا "یار آپ کو تو علامہ کا لقب ملنا چاہیئے"۔ بولے "لقب چونکہ مدح و ذم دونوں پر دلالت کرتا ہے اس لیے "علامہ" کے لیے خصوصیت سے موزوں ہے"۔ اس کے بعد میں نے انھیں علامہ کہہ کر مخاطب کرنا شروع کر دیا۔ چند روز وہ اس لقب سے بے چین سے رہے۔ بعد میں اس کے عادی ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ شوکت میں ادعا مطلق نہ تھا۔ پہلی ملاقات میں وہ کسی طرح "ٹھوس" آدمی معلوم نہ ہوتے تھے۔ لیکن اگر ان سے کچھ پوچھا جاتا تو پتہ چلتا کہ ان کی معلومات غیر معمولی ہیں۔

"پاکستان ہمارا" کے سلسلے میں شوکت کے قاضی جی کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ہم اکثر سوچا کرتے تھے کہ اس میں ظرافت کی چاشنی پیدا کرنے کے لیے کیا کیا جائے۔ سوچ سوچ کر شوکت نے آخر قاضی جی کا کردار تجویز کیا، ایک بزرگ جو پاکستان کے سلسلے میں ہر بات پر نامعقول قسم کی ایسی نکتہ چینی کیا کریں۔ جو ہر ایک کو مضحکہ خیز معلوم ہو۔ شوکت نے ان کا ایک اسکٹ لکھا اور قاضی جی کا بولنے کا انداز اس زمانے کی ایک مزمن شخصیت سے لیا۔ یہ ایک حکیم صاحب تھے جن سے کئی سال پیشتر میری ملاقات آبو پہاڑ پر ہوئی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد وہ لاہور آئے تو حسنِ اتفاق سے مسلم ٹاؤن میں شوکت صاحب کے ہمسائے بنے۔ میں ان سے اپنی ملاقات اور آبو میں ان کا میزبان بننے کی داستان شوکت کو سنا چکا تھا۔ لاہور میں وارد ہونے کے بعد شوکت سے ان کی ملاقات ہوئی تو یہ انھیں بہت دلچسپ شخص معلوم ہوئے۔ فراغت کے وقت ان کے تازہ کارنامے مجھے سناتے رہتے۔ کبھی ان کی گفتگو بیان کرتے تو بات کو زیادہ پر لطف بنانے کے لیے بڑے کمال سے ان کے بولنے کی نقل اتارتے چنانچہ قاضی جی کا خیال آتے ہی شوکت نے فی الفور انھیں حکیم جی کے قالب میں ڈھال لیا۔ قاضی جی کا پروگرام ریڈیو پر بہت مقبول ہوا اور اس نے "پاکستان ہمارا" میں ظرافت کی مطلوبہ چاشنی پیدا کر دی۔

ہمارے یہ پروگرام حیرت انگیز حد تک پسند کیے گئے۔ ریڈیو اسٹیشن کے اور باہر کے لوگ اکثر ہم سے کہتے کہ اس پروگرام کی ایسی غیر معمولی مقبولیت ریڈیو کی تاریخ کا ایک اہم اور بے مثال واقعہ قرار دی جا سکتی ہے۔ میں نے ان

پروگراموں کو بعد میں پڑھا تو اُن میں بعض خامیاں نظر آئیں لیکن ہمارا خلوص اور جوش شاید اُن کے ہر عیب کو ڈھانپ لیتا تھا۔ بہرحال حالت یہ تھی کہ اس پروگرام کو سننے کے شوق میں کئی لوگوں نے شام کے وقت سینما تک جانا چھوڑ دیا۔ مہاتما گاندھی نے اپنی اُسی زمانے کی شام کی تقریروں میں میرا اور شوکت کا نام لے کر اس پروگرام کو سراہا۔ اس کی تعریف میں روزانہ جو خطوط اور دن بھر جو فون ریڈیو اسٹیشن کو موصول ہوتے تھے اُن کا تو شمار ہی نہ تھا۔

مجھے یاد ہے ایک روز صبح صبح ہمیں اطلاع ملی کہ کئی مہاجر جو ٹھکانہ میسر نہ آنے کے باعث کہیں ریلوے لائن کے قریب سردیوں کے آسمان تلے پڑے رہتے تھے رات میں ٹھٹھر کر جاں بحق ہو گئے۔ یہ اطلاع پا کر سبھی بے حد متاثر ہوئے۔ چنانچہ اُس روز کا پروگرام ہم نے شدید احساسِ درد کے ساتھ لکھا۔ اس پروگرام کے لیے شوکت نے ایک نظم "بعد از وقت" کہی جس کا مضمون یہ تھا کہ کوئی سوشل ورکر کسی مہاجر عورت کی بچی کے لیے کمبل لے کر پہنچتا ہے تو بچی سردی سے ٹھٹھر کر ختم ہو چکی ہے۔ نظم مؤثر تھی اور بہت خوبی سے پڑھی گئی۔ سارا پروگرام ہی ایسا تھا کہ سننے والوں پر اس کا بے حد اثر ہوا۔ چنانچہ اگلے روز بیت المال سے اسٹیشن ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان کے نام فون آیا۔ کہ پچھلی شام کا پروگرام سن کر لوگ گرم کپڑے اور لحاف اور توشکیں لے لے کر اتنی زیادہ تعداد میں بیت المال پہنچ رہے ہیں کہ اُن سب کی لائی ہوئی چیزوں کو سنبھالنا ہمارے سٹاف کے لیے ناممکن ہو رہا ہے اور اس سے بھی زیادہ مشکل اس بات سے پیدا ہو رہی ہے کہ عورتیں اپنی طلائی چوڑیاں اور انگوٹھیاں اور بالیاں لے لے کر آ رہی ہیں۔ اِن زیوروں کو وصول کرنے میں کئی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ زیوروں کو تولنے یا اُن کی صحیح قیمت جانچنے کا ہمارے پاس کوئی انتظام نہیں اور اس کے بغیر انھیں وصول کر لیا جائے تو ممکن ہے عملے کا کوئی شخص بددیانتی سے وزنی زیور لے کر اُن کی جگہ ہلکے زیور رکھ دے، اس لیے براہِ کرم ریڈیو کے ذریعے خواتین کو ہدایت دیجئے کہ وہ بیت المال کو اپنے زیور فی الحال نہ دیں۔

مہاتما گاندھی پر گولی چلی تو اُس روز ایک پورا پروگرام اُن پر کیا گیا۔ اِس میں شوکت نے مہاتما گاندھی کی آواز کی نقل ایسی خوبی سے اُتاری کہ کئی سننے والوں کو شبہ ہوا۔ کہ ریڈیو اسٹیشن کے پاس مہاتما گاندھی کا کوئی ریکارڈ موجود ہے۔ یہ پروگرام برِعظیم میں بے حد پسند کیا گیا۔ بعض ہندو خواتین نے پروگرام لکھنے والوں کے لیے چیک بھیجے جو شکریے کے ساتھ انھیں واپس کر دیئے گئے۔ راجہ غضنفر علی مرحوم اُس وقت مرکز کے وزیرِ بحالیات تھے۔ ہندوستانی ڈپٹی ہائی کمشنر مسٹر کے۔ ایل پنجابی خاص طور سے راجہ صاحب سے ملے اور کہا کہ میری طرف سے اِس پروگرام کی داد لکھنے والوں کو پہنچا دیجئے کئی روز بعد مسٹر پنجابی نے راجہ صاحب کی معرفت لنچ پر بھی مدعو کیا اور اُس موقعے پر کہا۔ کہ آل انڈیا ریڈیو سے روزانہ مہاتما گاندھی پر پروگرام نشر کیے جا رہے ہیں لیکن اُن میں کے ایک پروگرام میں بھی وہ اثر و تاثیر نہیں جو "پاکستان ہمارا" کے پروگرام میں تھی۔ میں نے عرض کیا " اس کی وجہ تو عیاں ہے۔ آپ ریڈیو پر ایک ایسی مصنوعی زبان استعمال میں لاتے ہیں جو نہ دل سے اُٹھتی ہے اور نہ دل پر گرتی ہے۔ ایسی صورت میں اثر و تاثیر کہاں سے آئے ؟"

کوئی ایک سو پروگرام لکھنے اور پیش کرنے کے بعد تھک کر میں نے تو ریڈیو پاکستان سے رخصت کی اجازت چاہی۔ شوکت کا تعلق چونکہ اس محکمے سے مستقل تھا، وہ اس کام میں برابر مصروف رہے۔

تین چار مہینے کی اِس یکجائی سے میرے اور شوکت کے تعلقات بہت بڑھ گئے۔ "پاکستان ہمارا" چھوڑنے کے بعد میں جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا، بے اختیار جی چاہتا، کاش اِس میں شوکت بھی میرے شریک ہوتے۔ ایک بار کوشش کی کہ دونوں مل کر اُردو ڈراما ایڈٹ کرنے کا کام کریں۔ شوکت کو اس پر آمادہ کر لیا، فرصت کی چند دوپہریں اس شغل میں صرف بھی کیں لیکن کام چلا نہیں۔ آپ جانیئے اُردو کے پُرانے ڈرامے بہت پھسپھسے ہیں۔ اُن میں ایسی گرفت نہ تھی کہ ہمیں کام میں مصروف رکھ سکتی۔ شوکت کی باتوں میں لذّت زیادہ تھی چنانچہ باتیں زیادہ ہوتیں اور کام کم۔ رفتہ رفتہ باتیں ہی باتیں ہونے لگیں۔ ڈرامے کا مسودہ کھولنا تک بند ہو گیا۔ یہ صورت دیکھ کر میں نے یہ کام خود ہی لپیٹ دیا۔ گپ البتہ چلتی رہی۔ ریڈیو اسٹیشن سے میرا گھر قریب ہے۔ وہاں سے اُٹھ کر شوکت اکثر میرے ہاں آجاتے۔ بعض اوقات میں خود انھیں بُلا لیتا۔ گھنٹوں گپ رہتی۔ شوکت سا محفل آرا جہاں موجود ہو، ناممکن تھا کہ وہاں سے قہقہے نہ سُنائی دیں۔ قہقہوں کی آواز سُن کر حجاب اور یاسمین بھی آجاتیں۔ شوکت فی الفور ایسی باتیں شروع کر دیتے جن سے وہ دونوں بھی محظوظ ہوتیں۔ اس طرح وہ ہمارے فیملی ممبر سے بن گئے بلکہ اس دوران یہ بھی دریافت ہوا کہ میرا اُن سے واقعی دُور کا کچھ رشتہ بھی ہے۔ میرے پھوپھی زاد بھائی سیّد سجاد حسین مرحوم کی اہلیہ محترمہ تھانہ بھون کی اور شوکت کے عزیزوں میں سے تھیں۔

کچھ عرصہ بعد ایک فلم کمپنی نے مجھ سے اسکرین پلے لکھنے اور ڈائرکٹ کرنے کی فرمائش کی تو اُس کی مکالمہ نویسی میں نے شوکت کے سپرد کر دی۔ شوکت ریڈیو کے بہت مشاق مکالمہ نویس تھے لیکن ریڈیو اور فلم کے مکالموں میں بہت فرق ہے۔ ریڈیو کے مکالموں میں ہر عمل کا اظہار لفظوں میں کیا جاتا ہے، فلم کے مکالموں میں کوشش کی جاتی ہے کہ الفاظ کی بجائے حتی الامکان عمل سے کام لیا جائے۔ دونوں مکالمے سوچنے کا طریق ہی مختلف ہے۔ اِس سلسلے میں ہماری دلچسپ بحثیں ہوتیں۔ شوکت کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ کج بحثی کبھی نہ کرتے تھے۔ ذہین بے حد تھے۔ بات سمجھ میں آگئی تو فوراً نئے ڈھب پر پڑ گئے اور کئی مناظر کے مکالمے بہت لذیذ لکھ کر لے آئے۔ میں نے کسی جگہ تبدیلی کی فرمائش کی تو کبھی اُس سے بُرا نہ مانے اور فی الفور میری مرضی کے مطابق مکالمے میں تبدیلی کر دی۔

یہ فلم بننا تو شروع ہوا مگر تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد ایک اور فلم کمپنی نے میری ایک پرانی کہانی "گلنار" کو فلم بنانے کے لیے پسند کیا اور فرمائش کی کہ اس کہانی کو میں لکھنؤ کی معاشرت میں ڈھال دوں۔ اِس کام میں شوکت سے مجھے قابلِ قدر امداد ملی۔ پھر گلنار میں انھوں نے نہ صرف مکالمے لکھے بلکہ میرے اصرار پر اس میں نواب دلشاد کا پارٹ کرنے پر بھی رضامند ہو گئے۔ شوکت اسکرین پر پہلی بار آرہے تھے۔ بعض پُرانے ایکٹر شوکت کو مروجہ روش سے ہٹ کر مکالمے بولتے سُنتے تو لہجے کی تازگی اور اچھوتے پن پر جلتے اور انھیں ڈرانے کے لیے کہتے۔ کمرے میں بیٹھ کر مکالمے بول لینا کچھ مشکل نہیں۔ آزمائش کا مقام اسٹوڈیو کا فلور ہے۔ جب ایک طرف روشنیاں گھیر کر چکاچوند کا عالم پیدا کر دیں اور دوسری طرف کیمرہ گھڑر گھڑر کر کے چلنا شروع ہو جائے تو اُس وقت لہجے کی سب جدّتیں اور نفاستیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ شوکت خاموشی اور بہت بے پروائی سے یہ باتیں سُنتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود

مجھے بھی اندیشہ تھا کہ کیمرے کے سامنے شوکت کہیں جھینپ نہ جائیں۔

سیٹ پر شوکت کا پہلا شاٹ مجھے بخوبی یاد ہے۔ نہ جانے کہاں سے وہ کسی لکھنوی نواب کی تصویر لے آئے تھے مجھے دکھا کہ اپنا میک اپ اُس کے مطابق کرایا مناسب کپڑے کا انگرکھا اپنی نگرانی میں سلوایا۔ اُس کے ساتھ چوڑی دار پاجامہ اور دھلی کی جوتی پہن کر اور سر پر دو پلی ٹوپی رکھ کر سٹ پر آئے تو جس نے دیکھا یہی کہا کہ عین بین لکھنؤ کے نواب معلوم ہوتے ہیں۔ سین یہ تھا کہ نواب دلشاد صولت کے ہاں اپنے مصاحبوں سمیت مشاعرے میں آئے ہیں۔ ڈیوڑھی میں صولت ان کا استقبال کرتا ہے اور اپنے ساتھ دیوان خانے میں لے جاتا ہے جہاں محفلِ مشاعرہ کا اہتمام ہے۔ شوکت بڑے اعتماد سے سٹ پر آئے۔ روشنیاں ٹھیک جما لی گئیں۔ ایک دو ریہرسلیں بھی خاطر خواہ ہو گئیں اور اس کے بعد "ٹیک" کا مرحلہ آیا۔ ریہرسل میں شوکت کی خود اعتمادی دیکھ کر ایک پُرانے ایکٹر نے ان کا پہلا شاٹ خراب کرنے کے لیے ایک نامناسب حرکت کی۔ شاٹ لینے کے لیے جب میں بلند آواز سے "خاموش رہیے" کہہ چکا تھا اور شوکت شاٹ دینے کے لیے موڈ میں تیار کھڑے تھے تو وہ صاحب لپک کر اُن کے قریب پہنچے اور ان کا دھیان ہٹانے کے لیے اُن کے انگرکھے کا دامن ہاتھ میں پکڑ کر کہنے لگے "خوب کپڑا ہے۔ کے روپے گز کا ہے؟" لیکن ان حضرت کی اِس کوشش کے باوجود شوکت نے اپنے پہلے شاٹ میں ایسی ساختہ بے ساختگی سے کام کیا اور تمام تفاصیل کو ایسے مکمل طور پر صحیح ادا کیا کہ شاٹ ختم ہونے پر "کٹ" کی آواز کے ساتھ ہر طرف سے واہ وا اور سبحان اللہ کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے شوکت سے مصافحہ کیا۔ شوکت اپنی کامیابی سے بے حد خوش ہوئے۔ پھر تو انھوں نے ایسے بے دھڑک طریقے سے شاٹ دیئے گویا انھیں احساس ہی نہ تھا کہ سٹ پر کیمرہ بھی کام کر رہا ہے۔ نواب دلشاد کا کردار انھوں نے ایسے کمال سے پیش کیا کہ لکھنوی نوابوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ چال ڈھال نشست و برخواست۔ حرکات سکنات ہر اعتبار سے وہ لکھنوی نواب تھے۔ افسوس اس فلم کی ریڈٹنگ میری مرضی کے مطابق نہ کی گئی۔ کئی اہم حصے بے دردی سے کاٹ دیئے گئے اور ایڈٹ ہونے کے بعد فلم سنسر ہونے سے پہلے مجھے دیکھنے کا موقع بھی نہ دیا گیا۔ ورنہ اس کی صورت بہت مختلف ہوتی۔

گلنار کے شوٹنگ کے دوران میں شوکت کے ساتھ وقت بہت لطف میں گزرا۔ وہ سٹ کے کسی کونے میں اپنے پسندیدہ آرٹسٹوں کے ساتھ بیٹھے گفتگو کی آتش بازی چھوڑتے رہے۔ میں تھک ہار کر دم لینے کو ذرا سی دیر اِس محفل میں شریک ہوتا تو شوکت ہنسا ہنسا کر تازہ دم کر دیتے تھے۔ اس زمانے کی ساری باتیں مجھے یاد نہیں۔ اس خیال سے حافظے پر زور دینے کو جی بھی نہیں چاہتا کہ پڑھنے والوں کو شاید اُن سے دلچسپی نہ ہو۔

گلنار کے بعد کوئی کام مل کر کرنے کا موقع ہی نہ ملا لیکن تعلقات ہموار انداز میں برابر جاری رہے۔ یہاں تک کہ وہ لاہور چھوڑ کر کراچی چلے گئے۔ خط میں ضرورت کے سوا لکھتا نہیں چنانچہ شوکت سے خط و کتابت نہ رہ سکی۔ البتہ ایک خط انھیں اسی مضمون کا لکھنا یاد ہے کہ میں مہدی حسن احسن کے ڈرامے ایڈٹ کر چکا ہوں۔ اُن کے حالاتِ زندگی کی تلاش ہے۔ کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو رہی۔ آپ احسن سے مل چکے ہیں اُن کی ایک قلمی تصویر لکھ کر بھیج دیجئے جسے میں آپ ہی کے نام

سے اپنے مقدمے میں شامل کر لوں گا۔ چوتھے ہی روز اِس خط کا جواب آ گیا جس میں احسن کی قلمی تصویر تھی۔ یہ تصویر میرے پاس محفوظ ہے۔ ایک بار میں کراچی گیا تو وہاں قیام کا بیشتر وقت شوکت کے ساتھ گزرا۔ کراچی اور پھر پنڈی سے جب کبھی وہ لاہور آئے تو انھوں نے ملنے کا وقت عموماً نکال لیا۔

شوکت کثیر الاحباب شخص تھے۔ مجھے یقین ہے اُن کے کئی دوستوں نے اُن کی شخصیت کے نمایاں پہلوؤں پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہو گا۔ بعض چھوٹی چھوٹی ایسی باتیں ہیں جن کے متعلق میرا خیال ہے کہ شاید دوسروں کی توجہ حاصل نہ کر سکی ہوں مختصراً میں لکھے دیتا ہوں۔

اپنے لباس میں شوکت خاص اہتمام سے کام لیتے تھے۔ شیروانی پہنتے یا سُوٹ، کپڑے کے رنگ اور ڈیزائن سے ہمیشہ اُن کی خوش مذاقی کا ثبوت ملتا۔ تنگ پاجامہ پہنتے تو اُس کی چوڑیوں میں سلیقہ نظر آتا۔ کرتوں کی آستینیں چُنی ہوئی ہوتیں۔ شیروانی کی تراش ایسی ستھری کہ دیکھ کر فرحت ہوتی تھی۔ سُوٹ پہنتے تو قمیص کا رنگ سُوٹ پر اور ٹائی کا رنگ قمیص پر پھبتا۔ ٹائی اور رومال اور موزے ہمیشہ بہت اعلیٰ استعمال کرتے۔ شو ہمیشہ پالش سے دمک رہے ہوتے۔

شوکت کھانا بڑی نفاست و شائستگی سے کھاتے تھے۔ چپاتی اور چاول دونوں کا نوالہ ایسی فنکارانہ خوبصورتی و احتیاط سے بناتے کہ نظر پڑتی تو اُن کی انگلیوں کے سِروں کی کارگزاری دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔

تقریر و تحریر میں شوکت کی ظرافت پر غالباً اُن کے کئی احباب اظہارِ خیال کریں گے لیکن یہ بات شاید کم لوگوں کو معلوم ہو کہ شوکت نے طبیعت کی شوخی ورثے میں پائی تھی۔ ایک بار اپنے والدِ ماجد محمد صدیق صاحب کی شوخیٔ طبع کے کئی واقعات انھوں نے مجھے سنائے، اُن میں کا ایک مجھے یاد ہے۔ اُن کے والد ایک زمانے میں بھوپال پولیس میں ملازم تھے۔ وہاں کے کسی رئیس کے ہاں سری پائے بہت اچھے پکتے تھے۔ صدیق صاحب نے ایک بار اُن سے سری پائے کھلانے کی فرمائش کی۔ انھوں نے کسی تعطیل کے روز دوپہر کے کھانے پر اُنھیں مدعو کر لیا۔ یہ کھانے کے وقت پہنچے تو اتفاق سے اُن رئیس کے ایک ہندو دوست نازل ہو گئے۔ ایسے جم کر بیٹھے کہ کھانے کا وقت آ کر گزر بھی گیا مگر انھوں نے سرکنے کا نام نہ لیا۔ رئیس اِن ہندو دوست کو بوجوہ کھانے میں شریک نہ کرنا چاہتے تھے۔ مروّت کے مارے یہ بھی مناسب نہ سمجھتے تھے کہ انھیں رخصت کرنے کی کوئی کوشش عمل میں لائیں۔ ادھر کھانے میں تاخیر ہونے کے سبب مہمان سے ندامت ہو رہی تھی۔ اور کچھ نہ سوجھا نہیں کاغذ کے پرزے پر یہ فقرہ لکھا کہ کیا کروں — یہ حضرت سریش بن کر چپک گئے ہیں۔ پیچھا چھوڑیں تو دسترخوان بچھواؤں۔" یہ رقعہ لکھ کر اُنھوں نے خاموشی سے صدیق صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ آپ نے رقعہ پڑھا تو مسکرا دیئے۔ پھر یہ رقعہ بڑے ادب سے اُن ہندو دوست کی خدمت میں پیش کر دیا۔ میزبان لاحول ولا قوۃ کہہ کر زنان خانے کی طرف بھاگے اور ہندو دوست ندامت سے پسینہ پسینہ ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

شوکت کی ایک بات مجھے اکثر حیران کرتی کہ بے تکلّف احباب کی صحبت میں بھی اُن کا دماغ فراغت سے کبھی راحت اندوز نہ ہوتا تھا بلکہ ہر وقت اور بہرحال کسی نہ کسی بات کا ظریفانہ پہلو دیکھنے میں منہمک رہتا تھا۔ ناممکن تھا کہ موقع ملے اور شوکت ظرافت کی پھلجھڑی چھوڑنے سے چوک جاتے۔ جہاں موقع نہیں ہوتا تھا، وہاں بھی اُنھیں یکایک ہنسی کی

کوئی ایسی بات سوجھ جاتی تھی کہ بعض اوقات میں دیر تک اُن کے ذہنی عمل کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ قائدِ اعظم کی رحلت کے بعد پاکستان کے نئے صدر کا اعلان ابھی نہ ہوا تھا۔ شوکت سمیت ہم کئی لوگ ریڈیو اسٹیشن پر غم زدہ بیٹھے سوچ رہے تھے کہ پاکستان کا آئندہ صدر کون بنے گا۔ ایک صاحب بولے "سر آغا خاں مناسب صدر ہوں گے دلکش شخصیت رکھتے ہیں اور بھرپور اثر اور بین الاقوامی شہرت کے مالک بھی ہیں۔" شوکت نے فی الفور کہا "وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن سر آغا خاں صدر بنے تو قائدِ ملت کو شاید وزیرِ اعظم نہ رہنے دیں۔" پوچھا گیا کہ کیوں وہ کسے وزیرِ اعظم بنانا پسند کریں گے؟" شوکت بولے "یہی کسی جُگی دُگی کو۔"

میں دیکھتا تھا کہ ظرافت کی کوئی بات کرنے سے پیشتر شوکت کی آنکھیں ذرا تنگ ہو جاتیں اور اُن میں ایک عجیب سی چمک آ جاتی تھی۔ اُن کی بات پر سب ہنستے تو وہ خود بھی ہنسی میں دل کھول کر شریک ہوتے البتہ اُن کی ہنسی با آواز کم ہوتی تھی۔

شوکت کی ظرافت پر نقّاد حضرات مجھ سے بہتر اظہارِ خیال کر سکتے ہیں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ محفل آرائی میں وہ اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اُن کی باتیں اُن کی تحریروں سے زیادہ دلچسپ اور ظریفانہ ہوتی تھیں مگر اُن کی تحریروں کے متعلق یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ وہ کاروباری مصنّف تھے اور اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لیے اُنھیں چار و ناچار تصنیف کا کام کرنا پڑتا تھا۔ لکھتے قلم برداشتہ تھے اور ایک ہی نشست میں فل سکیپ سائز کے ایسے کئی کئی صفحے خوشخط لکھ جاتے جن میں ایک سطر بلکہ ایک لفظ بھی کٹا ہوا نہ ہوتا تھا۔

شوکت بہت باکمال نقّال بھی تھے۔ کسی سے پہلی بار ملتے تو باتیں کم کرتے تمام وقت اُس شخص کی ایک ایک حرکت اور لہجے کی ایک ایک خصوصیت کا مطالعہ بہت غور سے کرتے رہتے۔ بے تکلف احباب کے ساتھ تنہائی کا موقع ملتا تو بے حد اعتماد سے اُس کی ایسی مکمل نقل اُتارتے یا اِس خوبی سے اُس کی پیروڈی کرتے کہ اُن کی قوتِ مشاہدہ کا قائل ہونا پڑتا تھا۔

اس کے ساتھ ہی ایک بڑے کمال کی بات اُن میں یہ تھی کہ جب کبھی اُن سے درخواست کی جاتی کہ فلاں واقعے یا فلاں صاحب کی نقل سُنا دیجیے تو انکار کبھی نہ کرتے۔ اُنھیں یہ خیال بھی نہ آتا کہ جس شخص کی جبات طبع کے لیے ان سے یہ فرمائش کی جا رہی ہے، وہ اس قابل ہے بھی کہ اُس کی خاطر یہ زحمت برداشت کی جائے۔ وہ صرف فرمائش کرنے والے سے اپنے تعلقات کا خیال کرتے اور بلا تأمل اُس کی فرمائش پوری کر دیتے تھے۔

گمان تک نہ گزرا تھا کہ اس ہنسنے اور ہنسانے والے شوکت کا چہرہ ایک روز کفن میں لپٹا ہوا دیکھنا پڑے گا۔ دل کندھوں کی ناتوانی پر کُڑھے گا کہ اپنے عزیز دوست کو اُس کی آخری منزل تک پہنچانے سے معذور رہے۔ آنکھیں اُسے مٹی میں ملتا ہوا دیکھیں گی اور بے بسی کے آنسو بہاتی رہ جائیں گی۔

شوکت تھانوی کے آخری ایّام

فضل احمد کریم فضلی

میں ڈھاکہ میں تھا کہ خبر وحشت اثر سنی کہ شوکت تھانوی بہت سخت بیمار ہیں۔ ویسے تو کون بیمار نہیں پڑتا۔ شوکت کی شخصیت کا ذہن میں تصور کچھ ایسا صحت بخش تھا کہ اس شخصیت سے کوئی بیماری منسوب کرنا عجیب سا لگا۔ اور یقین نہ آیا۔ میں ڈھاکہ سے سیدھا لاہور گیا۔ وہاں نیاز احمد صاحب (سی۔ ایس۔ پی۔ ممبر بورڈ آف ریونیو) نے بتایا کہ شوکت جب ۲۳ مارچ کو تمغۂ امتیاز لینے لاہور آئے تو انہیں بخار تھا۔ دوسرے دن ایک ادبی محفل میں بھی وہ بخار کی حالت میں شریک ہوئے۔ تیسرے دن بھی یہی ہوا۔ نیاز صاحب نے انہیں ڈاکٹر صالح میمن کو دکھایا جو اتفاق سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر میمن نے بتایا کہ اُن کے جگر میں سرطان ہے یا پھوڑا۔ اور جگر اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کا دباؤ دل اور پھیپھڑوں پر پڑ رہا ہے۔ فوراً سرطان یا پھوڑے کی تشخیص ہونی چاہیئے۔ اور اسی کے مطابق علاج۔ یہ ۲۵، ۲۶ مارچ کی بات ہے۔ مگر جن ڈاکٹروں کو بعد میں دکھایا گیا۔ انہوں نے ڈاکٹر میمن کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ بلکہ دل کی شکایت تجویز کی۔ جس کا علاج وہ کرتے رہے۔ اور شوکت صاحب کی حالت تیزی سے خراب ہوتی گئی۔ اور اب وہ نقل و حرکت بھی نہیں کر سکتے۔

میں ۷ اپریل کی صبح کو انہیں دیکھنے گیا۔ کمرہ میں دبے پاؤں داخل ہوا تو مجھے پلنگ پر ایک باغ و بہار آدمی کی جگہ ایک یاسی بار پڑا ہوا نظر آیا۔ شوکت نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے مجھے دیکھا۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں کہ یہ شخص کہاں سے آ گیا۔ پھر انہوں نے بڑے پیار سے میرا نام لیا۔ اور بار بار ایسے انداز میں جیسے پوچھ رہے ہوں کہ آیا میں وہی ہوں جو وہ سمجھ رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ ہاں میں فضلی ہی ہوں: انہوں نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ دبایا، پھر کہنے لگے مجھے بات کرنا منع ہے۔ اور کہتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ وہ شخص جو پھول برسایا کرتا تھا اب آنسو برسانے پر مجبور تھا۔ یہ منظر دیکھ کے دل ہل گیا۔ اور یہ حقیقت شوکت کے اشکبار چہرے کی صورت میں سامنے آ گئی۔ کہ ہم کیا اور ہماری حقیقت کیا۔ تندرستی کی حالت میں ہم اپنے آپ کو جو چاہیں سمجھیں لیکن کوئی موذی مرض آ دبوچے تو پھر ہماری حیثیت اس کبوتر سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ جسے بلی نے اس طرح منہ میں بھر لیا ہو کہ پھڑک بھی نہ سکے۔ میں نے جی کڑا کر کے کہا کہ بھائی یہ شعر کہا تو اپنے لئے تھا۔ لیکن یہ صادق آپ کے حال پر زیادہ آیا ہے کہ۔

غم دوراں کے آگے سر جھکا دیں؟
اب ایسے بھی گئے گذرے نہیں ہم

عمر بھر ہنستے ہنساتے گذاری۔ سبھی پر ہنستے رہے۔ اب اس موذی مرض کو بھی ہنس ہنس کے اُڑائے" یہ شعر اور باتیں سن کر وہ خفیف سا مسکرائے۔" مجھے ایسا لگا جیسے یہ مسکراہٹ نہیں طنز ہے اور مجھ سے کہہ رہی کہ ساحل پر کھڑے ہونے والے کو بھنور میں ڈوبنے والے کی حالت کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ان کی بیوی نے مجھے پان دینا چاہا۔ میں نے کہا رہنے دیجئے۔ انہوں نے کہا "کیوں، کیا پان کھانا چھوڑ دیا؟" میں نے کہا۔ "نہیں جب صاحب بہادری کے زمانے میں نہیں چھوڑا تو اب کیا چھوڑوں گا۔ لیکن اس وقت اچھا نہیں لگتا۔" انہوں نے کہا "نہیں نہیں کھائیے۔" شوکت صاحب کی نگاہیں بھی مجھ سے یہی کہنے لگیں۔ میں نے ایک آخری عذر جو حقیقت پر مبنی تھا اور پیش کیا "کہ قوام کی شیشی کھو گئی ہے وہ قوام یہاں ملتا نہیں، بغیر قوام کے پان کیا کھاؤں" وہ چپ ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد شوکت صاحب نے اُن سے کہا "میرا وہ بیگ دینا" انہوں نے پوچھا کون سا، شوکت صاحب نے جواب دیا "دفتر والا" بیگم نے کہا "اب دفتر والے بیگ کا کیا کیجئے گا۔ آپ کو کام کرنا منع ہے" شوکت صاحب نے قدرے زور دار آواز میں کہا "لاؤ"۔ میں نے کہا۔ "اس میں قوام ہے۔" وہ بیگ لائیں تو کہا۔ "کھولو۔ فلاں خانہ دیکھو اس کی تہہ میں، قوام کی شیشی رکھی تھی۔ بیگم نے کہا۔ "دیکھئے چھپاتے رکھتے تھے، مجھ سے چھپاتے" شوکت صاحب نے شیشی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور کچھ دیر انگلیوں میں گھماتے رہے، جیسے پس و پیش کر رہے ہوں، پھر میرے ہاتھوں میں دی اور دیتے ہی رو پڑے۔ اُن کی بیگم نے کہا "ارے رونا کاہے کا۔ اللہ رکھے اچھے ہو جانا تو خوب کھانا" میں نے کہا "یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ انہیں یہ احساس ستا رہا ہے۔ کہ ایسی حالت میں مجھے تحفہ بھی دے رہے ہیں۔ تو کیا۔ پھر میں نے اُن سے مخاطب ہو کر کہا کہ "ارے بھئی یہ تحفہ اس وقت میرے لیے بڑا بیش قیمت ہے۔" یہ سن کے اُن کے آنسو تھم گئے۔ اور خفیف مسکراہٹ اُن کے ہونٹوں پر آ گئی۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ اس حال میں بھی یہ تک یاد ہے کہ ایک قوام کی شیشی فلاں جگہ رکھی ہے میں نے پھر ان سے کہا۔" ایک دفعہ میں بھی اسی طرح اسپتال میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں کا حکم تھا کہ بات کرنا تو درکنار میں لیٹے لیٹے کوئی کتاب بھی نہ پڑھوں اور نہ پڑھوا کے سنوں۔ میں نے دل میں کہا خوب یہ سب نہ کروں تو کیا پڑے پڑے یہی سوچا کروں کہ اب ملک الموت صاحب تشریف لائے، اب انہوں نے گلا دبایا، اب دم نکلا۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ اللہ نے مجھے شعر کہنے کا ملکہ عطا فرمایا ہے۔ میں کیوں نہ شعر کہوں۔ بڑے اطمینان سے شعر کہنے لگا۔ اور بُرا وقت اچھی طرح گذرنے لگا۔ بلکہ جب کوئی اچھا شعر ہو جاتا تو روح میں بالیدگی و توانائی کا احساس بڑھ جاتا۔ یہ آزمودہ نسخہ آپ بھی آزما کے دیکھئے۔" "یہ آزمودہ نسخہ آپ بھی آزما کے دیکھئے۔" شوکت صاحب نے اس طرح مسکرا کے سر ہلایا جیسے انہیں یہ تجویز پسند آئی ہو۔

بیگم نے بتایا کہ اور تو سب ٹھیک ہے مگر نہ کچھ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں۔ اور روز بروز کمزور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ پانی بھی بمشکل پیتے ہیں ——— اسی وقت ڈاکٹر آ گئے۔ میں نے پوچھا۔ "انار کا تازہ رس دینے میں کوئی حرج ہے۔" ڈاکٹر نے کہا کہ "اگر یہ پئیں تو بڑے شوق سے پلائیے۔ ہمیں تو فکر ہی یہی ہے کہ انہوں نے کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے۔ میرے پاس اعلیٰ قسم کا جواہر مہرہ تھا۔ میں نے سوچا اس سے بہتر اس کا استعمال کیا ہو سکتا ہے۔ کہ شوکت کے کام آئے۔

دوسرے دن میں جواہر مہرہ لے کے اسپتال گیا۔ دو انار کا رس ایک گلاس میں آیا۔ ایک چمچے میں جواہر مہرہ اس میں گھسا گیا۔ سید امتیاز علی تاج صاحب کے بھتیجے نے گھسا۔ میں نے شوکت صاحب کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہ یہ بہترین جواہر مہرہ ہے۔ اسے

پی لیجیے۔ انہوں نے پی لیا۔ پھر رس بھر بھر کے ایک کے بعد ایک چمچہ انہیں پلانا شروع کیا۔ اور وہ پیتے گئے۔ یہاں تک کہ رس ختم ہوگیا۔ کہنے لگے ایک سید نے گھسا ایک نے پلایا۔ شوکت صاحب کے لڑکوں اور بیگم شوکت نے کہا کہ یہ پہلا موقع کئی دن کے بعد آیا ہے کہ انہوں نے اتنی غذا قبول کی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ روز اپنے ہاتھ سے رس پلاؤں گا۔ میں نے پوچھا "آپ نے کوئی شعر کہا" شوکت صاحب نے جواب دیا "یاد نہیں آتا کہ یہ اسی دن کا واقعہ ہے یا دوسرے دن کا، جی ہاں رات بھر مجھے نیند نہیں آتی۔ فجر کے وقت اذان کی آواز سنی۔ دل پر بڑا اثر ہوا، اور میں نے یہ شعر کہا۔

میں تیرا بندہ ہوں لیکن بندگی سے بے نیاز
تو خدا ہے اور خدا ہو کر بھی تو غافل نہیں۔

اس دن ڈاکٹر امیرالدین بھی میرے سامنے تھے اتنے میں ایک نرس انجکشن لگانے آئی، پوچھا کہاں لگاؤں؟ شوکت صاحب نے بڑی حسرت سے کہا: "کہیں بھی لگا دو، اب کیا فرق پڑتا ہے، پنبہ کجا کجا نہم" میں نے ان کی توجہ دوسری طرف منعطف کرانے کی غرض سے کہا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پر مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آگیا۔ میں ہسپتال میں تھا۔ ذرا اچھی شکل و صورت کی نرس آئی نبض دیکھنے کے لئے اس نے ہاتھ بڑھایا۔ مجھے حسب عادت مذاق سوجھا۔ میں نے بجائے ہاتھ کے انگلی بڑھا دی۔ اس نے کہا "یہ کیا"؟ میں نے کہا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ جہاں بھی تم انگلی رکھ دو گی وہیں نبض چلنے لگے گی۔" وہ ہنس پڑی۔ اور اس نے ایک عجیب ستم ظریف مریض کا ڈھنڈورا سارے ہسپتال میں پیٹ دیا۔ شوکت صاحب مسکرائے پھر بھی سنجیدگی سے کہنے لگے "یہ بات فضلی صاحب نے اس وقت کہی ہوگی۔ جب بیگم صاحبہ نہ رہی ہوں گی۔ میں اگر یہی بات کہوں تو میری بیوی جوتی لے کر ڈاکٹر امیرالدین بن جائے۔ سارا جسم پلپلا کر دے۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا اچھا ہے massage ہو جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب جب معائنہ کر چکے تو شوکت صاحب نے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "ڈاکٹر صاحب پھاڑیے گا تو نہیں؟" انہوں نے جواب دیا "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" شوکت صاحب نے کہا "دیکھئے ڈاکٹر صاحب، اگر آپ نے چیرا پھاڑا۔ اگر خدانخواستہ میں مر گیا تو میرے شیعہ دوست اس شعر سے کسی نہ کسی طرح میرے مرنے کی تاریخ نکال لیں گے۔

ہر عمر کا ایک ہی انجام ہے۔
پیٹ شوکت کا بھی پھاڑا ہی گیا۔

(اپنے نام محمد عمر کی طرف اشارہ قابلِ داد ہے) ایسا لگتا تھا کہ یہ شعر انہوں نے یا تو اسی وقت یا اسی دن کہا ہے۔ میں سوچنے لگا کہ اللہ نے اس شخص کو کیا دماغ دیا ہے۔ موت کا خونیں پنجہ اسے ہر طرف سے اپنی گرفت میں لے رہا ہے۔ لیکن اس کی حاضر دماغی اور ظرافت نہیں جاتی۔

ڈاکٹر صاحب باہر نکلے تو انہوں نے بتایا کہ حالت بہت خطرناک ہے۔ انہیں جگر کا سرطان ہے۔ اور بظاہر یہ چند دنوں کے مہمان ہیں۔ پوری تشخیص امروز فردا میں ہو جائے گی۔ جب میں کمرے میں واپس آیا تو شوکت صاحب نے مجھ سے پوچھا "ڈاکٹر نے کیا کہا؟" میں نے جواب دیا "اب کیا بتاؤں اور میرے اور آپ کے جگری دوست کا نام بیچ میں آتا ہے۔ مگر ساری خرابی انہی حضرت جگر کی ہے۔" اس پر وہ کچھ سوچنے لگے اور کہنے لگے "آپ نے کبھی سنا ہے کہ ڈاکٹروں کے پاس ——— جگر کا علاج ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ مجھے مار ڈالیں گے آپ مجھے یہاں سے لے چلئے اور یونانی علاج کرائیے۔" میں نے پوچھا آپ کو اس علاج پر اعتقاد ہے؟ کہنے لگے "سو فیصدی۔"

میں نے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم ایک نئی دوا آزمانا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے اس سے افاقہ ہو۔ اور [illegible]

طاقت آجائے کہ انہیں بیرونی ممالک میں لے جا کر آپریشن کرایا جائے۔ اس کے بعد میں نے اعزا سے باتیں کیں اور یہی طے پایا کہ ڈاکٹروں کو موقع دینا چاہیے۔ اس کے بعد میرا معمول ہو گیا کہ میں روز جاتا اور انہیں انار کا رس مع جواہر مہرے کے پلاتا۔ اور وہ پورا پی لیتے۔ میری ایک دن طبیعت خراب تھی تو میں نے بیگم شوکت کو فون کیا کہ آج میں حسب معمول دن کو نہ آسکوں گا۔ وہ رس پلا دیں شام کو اگر صحت نے اجازت دی تو حاضر ہوں گا۔ شام کو گیا تو معلوم ہوا کہ جب اُن کی بیوی رس پلانے لگیں تو انہوں نے میرے بارے میں دریافت کیا۔ بتانے پر خفا ہو گئے اور بمشکل دو یا تین قسطوں میں رس پیا۔

ایک دن میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ جانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ میں نے پوچھا کیا ڈاکٹروں نے جانے کو کہا ہے۔ بیگم شوکت اور لڑکوں نے کہا ڈاکٹروں نے تو اجازت نہیں دی لیکن یہ کسی طرح مانتے ہی نہیں۔ آپ کے کہنے پر شاید راضی ہو جائیں۔ حسن اتفاق سے اس دن میر جمیل الرحمٰن صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ ہم دونوں کی یہ رائے ہوئی کہ نئی دوا آزمانے کا موقع ملنا چاہیے۔ ورنہ اس طرح گھر سے جانا تو موت کو دعوت دینا ہے۔ چنانچہ ہم دونوں اور ہمارے ساتھی میجر ریاض صاحب نے انہیں بہت سمجھایا۔ بات کرنے سے معلوم ہوا کہ شوکت صاحب کو اندیشہ تھا کہ شاید ڈاکٹر ان کا آپریشن کر دیں گے۔ ہم نے یہ اندیشہ دور کیا تو انہوں نے اپنے بڑے بیٹے میاں سعید کا سہارا لینا چاہا۔ انہوں نے بھی ہماری تائید کی تو کہنے لگے: "اچھا لیکن اگر میرا آپریشن ہوا تو میرے بچوں کا خون آپ لوگوں کی گردن پر۔" پھر کہنے لگے کہ بس اتنی طاقت آجائے کہ میں بیٹھنے لگوں پھر مرض کو پچھاڑ لوں گا۔ دوسرے دن انہیں خون دیا گیا۔ اور پھر نئی دوا کا استعمال شروع ہو گیا۔ بظاہر اُن کی حالت بہتر معلوم ہوتی۔ رات کو نیند بھی آنے لگی اور انہوں نے ناشتہ میں دلیہ بھی کھایا۔ اس سے کچھ اطمینان سا ہونے لگا۔ مجھے ۲۴ تاریخ کو کراچی واپس آنا تھا۔ اس دن جب ان سے ملنے گیا تو حسب معمول رس پلانے کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ اور پھر میں بغیر اسے کوئی اہمیت دیئے ہوئے اپنے جانے کا ذکر کیا۔ انہوں نے بڑے پیار سے میرا ہاتھ دبایا اور میرے مصرعے "فضلی، فضلی میرے فضلی میرے پیارے فضلی" سے مجھے مخاطب کیا۔ یعنی ۲۳ تاریخ تک اُن کا حافظہ اتنا اچھا اور ذہن اتنا صاف تھا کہ یہ مصرعہ وہ بلا تکلف سنا سکے۔ ڈاکٹروں نے مجھے بتایا تھا کہ اگر نئی دوا نے اثر کیا تو چند ہفتے شاید چل جائیں ورنہ چند دنوں کی بات ہے اس لئے مجھے اندیشہ تھا کہ شاید میں اُن کا آخری دیدار کر رہا ہوں۔ لیکن ان کے حافظے کی حالت دیکھتے ہوئے یہ امید بھی تھی کہ جب میں ۷ مئی کو لاہور واپس آؤں گا تو انہیں اس وقت بھی مرض اور موت سے نبرد آزما پاؤں گا۔ بیگم شوکت نے یہ بھی بتایا کہ میر خلیل الرحمٰن صاحب نے ٹیلیفون پر کہا ہے کہ وہ شوکت صاحب کو ولایت لے جا کر اُن کا علاج کا پورا خرچ خوشی سے برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ اس خبر سے شوکت صاحب کے اعزا اور احباب میر صاحب کے بیحد ممنون ہوئے۔

کراچی واپس آنے پر ہر ایک سے شوکت صاحب کی خیریت دریافت کرتا رہتا۔ جمعہ ۱۰ مئی کو معلوم ہوا کہ انہیں ہسپتال سے منتقل کیا جا چکا ہے۔ اس خبر سے بڑی تشویش پیدا ہوئی۔ کیونکہ اس کے یہ معنی تھے کہ نئی دوا ناکام رہی۔ اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔

جمعہ کی شام کو میرے ہاں جگر کی ماہانہ نشست تھی اس میں شوکت صاحب کی علالت کا مذکورہ بالا حال میں نے حاضرین کو تفصیل سے بتایا اور دیر تک شوکت ہی کی گوناگوں صفات کا ذکر ہوتا رہا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس غیر معمولی انسان کو کتنی غیر معمولی ہر دلعزیزی حاصل ہے۔ اور آج یہ خبر ریڈیو نے سنائی کہ یہ بلبل ہزار داستان ہمیشہ کے لیئے خاموش ہو گیا۔ اس وقت صفی صاحب کا وہ شعر بے اختیار یاد آ رہا ہے جو انہوں نے اپنے برادر عزیز ظریف لکھنوی کی موت پر کہا تھا۔"

جو اٹھ نہ سکتا تھا بے سہارے وہ شورِ محشر اٹھا کے اٹھا
ستم ظریفی تو کوئی دیکھے ہنسانے والا رُلا کے اٹھا"

۱۱ر مئی ۱۹۶۳ء، جنگ، کراچی

شوکت تھانوی

(چند یادیں[1])

عشرتِ رحمانی

"شاعر ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے" اس مقولہ کا اطلاق صرف شاعر ہی پر نہیں بلکہ ہر فنکار ادیب پر بھی ہوتا ہے۔ اور یہ مقولہ جس حد تک شوکت تھانوی پر صادق آتا ہے شاید اردو ادب میں گنتی کی ایسی ہستیاں ملیں گی۔ شوکت کا شعری یا نثری ادب جس طرز اور انداز کا بھی ہے، سب کا سب تخلیقی ہے۔ اس کی زبان اور قلم میں ذرا بھی فرق نہیں، جس انداز میں باتیں کرتا تھا وہی پیرائے پر لکھتا بھی تھا۔ ہر موقع محل جس طرح بات میں بات پیدا کرنا اور فقرے چست کرنا اس کی فطری خصوصیت تھی، وہی کیفیت تحریر میں بھی تھی۔ جس روانی اور تسلسل سے گفتگو کرتا تھا اسی طرح بے تکلف مسلسل لکھتا چلا جاتا تھا حتیٰ کہ اس کا قلم اس کے تخیل کی روانی کا ساتھ نہ دے سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پیدائشی طور پر ایک صاحبِ طرز، حاضر جواب، حاضر دماغ ظریف، اور مزاح نویس شاعر و ادیب تھا۔ قدرت نے زبان و بیان کی جو قدرت عطا کی تھی، اس کا اندازہ شاید خود شوکت کو بھی نہ تھا۔ زبان کے معاملہ میں اس کا مکتب ماں کی آغوش ہی تھا۔ جہاں کمسنی میں اس کی آنکھ کھلی اور شعور کے سن کو پہنچتے پہنچتے لکھنؤ کا دبستانِ شعر و ادب اس کا پہلا اور آخری دار العلم تھا۔ جس کے ماحول نے اس کی زبان کو نکھار اور بیان کو روانی ملی۔ اور یہی پہلی اور آخری سند تھی جس نے محمد عمر کو شوکت کی شان بخشی اور رفتہ رفتہ یہ نوبت ہوئی کہ لوگ عام طور پر اصل نام سے واقف ہی نہ رہے۔ اور یہی سمجھتے تھے کہ بقول

نام کا نام، تخلص کا تخلص شوکت،

شوکت کے تخیل کی آمد اور سلامت روی ایک ایسی امتیازی خصوصیت تھی جس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔ کسی قدر مبالغہ کے ساتھ یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ شوکت کا تخیل اس تیزی اور روانی سے کام کرتا تھا کہ فقرے آگے آگے ہوتے اور سوچ پیچھے۔ یعنی ہر موقعہ محل کے لحاظ سے تقریر ہو یا تحریر چست و برجستہ فقرے شوکت کی سوچ کی پیشوائی کرتے۔ جن حضرات نے تھوڑی دیر بھی اس سے گفتگو کی ہو یا لکھتے دیکھا ہو وہ اس حقیقت کی شہادت دے سکتے ہیں اور انہیں پورا پورا اندازہ ہوگا کہ شوکت کی قوتِ متخیلہ کتنی حساس اور زود رس تھی اور بیان کی خداداد صلاحیت کس درجہ رواں دواں — اس کے دل و دماغ میں بہت کم فرق تھا۔ اس حقیقت کا ثبوت شوکت کی ہر تحریر ہے۔ جس کی نسبت بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب وہ لکھنے بیٹھتا تو بس بے سوچے مسلسل بلا تکان لکھے جاتا۔ اور ہزاروں سطور لکھتے ہوئے ایک سطر

---

[1] زیرِ طبع کتاب سے چند اوراق

میں ایک لفظ بھی کبھی قلمزد نہ کرتا۔ یہ اس ذہین و طباع انسان کی صاف گوئی اور صاف بیانی کی دلیل تھی۔ شوکت نے طویل داستانیں لکھیں۔ مختصر مضمون۔ افسانے یا ڈرامے لکھے لیکن کبھی ان میں سے کسی مسودے کی نظرِ ثانی نہیں کی۔ وہ اپنے ہر لکھے کو حرفِ آخر سمجھتا۔ ممکن ہے وہ لکھنے سے پہلے سب کچھ سوچ کر اپنے دماغ میں محفوظ کر لیتا ہو۔ اور پھر اسے اکٹھا لکھ ڈالتا ہو۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ افسانہ، یا مضمون کا پلاٹ یا موضوع اسی وقت دیا گیا اور لکھنے کی فرمائش کی گئی اور لکھنا شروع۔ جتنی دیر میں ایک مسودہ نقل کیا جائے اتنی ہی مدت میں طبعزاد چیز مخصوص طرزِ بیان کی ہمارے سامنے موجود ہوتی۔ اُردو ادیبوں میں سے اب تک کسی صاحبِ طرز ادیب کے بارے میں ایسی مثال دیکھنے یا سُننے میں نہیں آئی۔ البتہ مشہور مغربی مصنف ڈی ایچ لارنس نے خود اپنی نسبت یہ خصوصیت بیان کی ہے کہ وہ مسلسل لکھے جاتا تھا اور اپنی تحریر میں کتر بیونت یا کانٹ چھانٹ ہرگز گوارا نہیں کرتا۔ اِس کی پہلی تحریر ہی آخری مسودہ کی حیثیت ہوتی گو ان دونوں میں کوئی قدر مشترک نہیں لیکن سوچنے اور لکھنے کا انداز یکساں نظر آتا ہے۔

لکھنؤ، رنگ و بُو کا شہر، شعر و ادب کا گہوارہ، آل انڈیا ریڈیو کا اسٹیشن وہاں قائم ہوا فن و ادب کے رسیا اس اسٹیشن کے کارکن مقرر ہوئے۔ لکھنؤ ریڈیو اچھا خاصہ اہلِ ادب کا مرکز بن گیا۔ ملک حسیب احمد پروگرام ڈائرکٹر تھے اور غلام قادر فرید، سیّد انصار ناصری، میاں لطیف الرحمٰن، فیروز نظامی، کرشن چندر اور یہ خاکسار پروگراموں کے مختلف شعبہ جات کے ناظم یعنی پروگرام اسسٹنٹ تھے۔ شوکت تھانوی مصنف اور صداکار مقرر ہوئے۔ ہمہ وقت محفلِ فکر و فن آراستہ رہتی۔ نئی نئی تجویزیں، نئے پروگرام۔ رات دن سب کو فکر تھی تو یہی کہ کوئی ایسی جدت پیش کی جائے جو سامعین کو حیرت میں ڈال دے۔ اور ان کی دلچسپیوں میں اضافہ ہو۔ سرکاری فرائض کی ادائیگی کا تو ہر ایک کو احساس تھا ہی لیکن اس سے زیادہ ہر ایک کو اپنے ذوق کے مطابق ایک ہی دُھن تھی جس میں مگن نظر آتے تھے۔ ریڈیو اسٹیشن کیا تھا ایک خاندان تھا اور یہ سب اراکین ایک ہی خاندان کے افراد معلوم ہوتے تھے۔ چونکہ آپس میں سب ایک دوسرے سے پیشتر ہی سے بخوبی آشنا تھے اور ملک کے تمام نامور ادیبوں شاعروں سے معاصرانہ تعلقاتِ یگانگت ہموار تھے اور سب مِل جُل کر اسی تگ و دو میں رہتے کہ ان تعلقات سے جس جس طرح بن پڑے کام لیں اور پروگراموں میں نت نئے تجربے دلچسپیاں اور مفید حرکتیں پیدا کر کے سامعین کو اپنی طرف مخاطب رکھیں۔ اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی اس کے شاہد برصغیر پاکستان و ہند کے وہ بے شمار باخبر سامعین ہیں جو لکھنؤ ریڈیو کی طرف ہمہ تن گوش رہتے۔ یہ مقبولیت نشری عملہ کے لئے عذابِ جان بھی بن گئی تھی کیونکہ دوسرے اسٹیشنوں سے صحت مند معاصرانہ چشمک اور مقابلے شروع ہو گئے۔ چنانچہ لکھنؤ کے اراکین نے ہر ممکن سعی کی کہ اس کا ہر قدم جدت آفریں ترقی کے ساتھ آگے بڑھتا رہے۔ لکھنے والوں میں یوں تو سارے ملک کے مشاہیر (شاعروں اور ادیبوں) کا تعاون ہمیں حاصل تھا۔ اور ان کی اعانت ہی نے ہمارے اسٹیشن کو صاحبِ استطاعت و اقتدار بنایا ہوا تھا۔ لیکن بعض پروگراموں کی نوعیت کچھ ایسی تھی جو "خود ساختہ" کی مہر لگائے بغیر قابو میں آنے والے نہ تھے۔ اِس سلسلہ میں شوکت تھانوی کی فطری ذہانت اور زود نویسی ہر ہر قدم پر ہمارے آڑے آئی۔ نیز ان کی فنی صلاحیتیں ایک کامیاب صداکار کی حیثیت سے بھی غیر معمولی تھیں۔ بچوں کے پروگرام میں جو "ایک تھا راجہ" کے عنوان سے ہفتہ ہفتہ میں تین روز نشر کیا جاتا تھا۔ شوکت صاحب "چاچا" کا مخصوص کردار ادا کرتے تھے۔ وہی اس خاص پروگرام کے خالق تھے۔ خود ہی مسودہ لکھتے اور "چاچا" کا کردار ادا کرتے۔ "بچوں کے پروگرام" کی حیرت انگیز شہرت اور محبوبیت کے مالک بنے ہوئے تھے۔ اِن کے ساتھ ہی "چھوٹے چاچا" (چاچا کا بھائی) تھا اور غلام قادر فرید "بدھو میاں" کا توتلا کردار ادا کرتے۔ اس کے علاوہ مختلف ڈراموں، فیچروں اور خاکوں کے لاجواب مسودات شوکت صاحب نے لکھے اور اپنی طبعی

صداکاری سے اِن میں جان ڈالی۔ اس سلسلہ میں ایک قابلِ ذکر سلسلہ "مون شائین تھیٹریکل کمپنی آف کاٹھ گودام" کا تھا۔ اس پروگرام میں قدیم تھیٹر کی گرج "پیروڈی" کے انداز میں پیش کی جاتی تھی جس کے مصنف شوکت تھے۔ ہر ہفتہ ایک ڈرامہ نشر ہوتا جس میں کچھ اس طرح سے اعلان ہوتا:

"معزز شائقین! مون شائن کمپنی آف کاٹھ گودام آج شب آپ کی خدمت میں اپنا مشہور و معروف کھیل "لال کوا" عرف سفید کبوتر، پیش کر رہی ہے جس میں کمپنی کے نامی گرامی ایکٹر اور ایکٹرسیں اپنے زرق برق لباس میں آپ کے سامنے آئیں گی اور اپنی اپنی حیرت انگیز اداکاری کے جوہر دکھائیں گی"

اور اس کے بعد قدیم طرز کے حاضرین کی تالیوں، سیٹیوں اور قہقہوں کی گونج اور شاباش کی آواز کے بعد سہیلیوں کا کورس شروع ہوتا اور دقیانوسی قسم کے شاہی پلاٹ پر لکھا ہوا ڈراما مقفی و مسجع مکالموں اور شعلہ بار نغموں کے ساتھ پیش کیا جاتا۔ یہ پروگرام لکھنؤ اسٹیشن کی خصوصیتِ خاصہ اور مدتوں ملک گیر شہرت و مقبولیتِ عامہ کا ضامن بنا رہا۔ جو شوکت کی تخلیقی ظرافت اور ذہانت کا ادبی نمونہ تھا۔ اس کے علاوہ ان کے ہفتہ وار خاکوں کا سلسلہ "منشی جی" تھا (جو روزمرہ کی عام معاشرتی زندگی پر نہایت دلکش انداز میں لطیف طنز تھی۔ اس میں "منشی جی" کا کردار قدیم تھیٹر کا ایک مزاحیہ اداکار رونق علی مرحوم ادا کرتا اور روشن منیران کی جھگڑالو بیوی کے روپ میں اپنی لاجواب فطری صداکاری کے جوہر دکھاتی۔ شوکت صاحب اس سلسلہ کے مصنف بھی تھے اور ہدایت کار بھی۔ اس پروگرام کی کامیاب مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ رونق علی کو "منشی جی" کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ دراصل لاہور ریڈیو کا سلسلہ "قاضی جی" مرحوم "منشی جی" ہی کی پرواز پر تھا جس نے شوکت صاحب کو پاکستان کی نشری دنیا میں شہرتِ دوام بخشی اور جس کی بدولت انہوں نے اپنی اصلاحی ظرافت و طنز نگاری کا لوہا منوایا۔ غرضیکہ لکھنؤ اسٹیشن کی رونق زیادہ تر شوکت کے ہنگاموں پر موقوف تھی۔ گویا وہی ہمارے دستِ راست تھے اور وہی دستِ چپ۔ ہم تقاضے کرتے تھے کہ اور کوئی نئی "حرکت" ہو جائے۔ وہ کہتے تھے جو کچھ سب مل کر سوچتے کسی کو کچھ سوجھ جاتی فوراً اس پر بحث ہونے لگتی۔ بات سے بات نکلتی اور اچھا خاصا ایک دلچسپ سلسلہ "نئے" پروگرام کا شروع ہو جاتا۔ شوکت صاحب لکھتے۔ ہم میں سے کوئی اس کی ہدایت کاری اور پیش کش کا ذمہ لیتا یا وہ خود ہی پیشکار بھی بن جاتے اور اداکار بھی۔ عملہ میں تین لکھنے والے، شوکت صاحب، سید انصار ناصری اور میں رات دن اس فکر میں رہتے کہ کوئی تازہ واردات، ہم تینوں نے مل کر ایک مرتبہ پروگرام بنایا کہ ایک پندھواڑہ ڈراموں کا منایا جائے۔ بات یہیں تک نہ رہی بلکہ ہم آگے بڑھ کر پورے مہینہ تک پہنچ گئے۔ سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ملک حبیب احمد کا تو پہلے ہی یہ حال تھا کہ جب تک وہ خود دیر نہ سوچ لیں یا کسی سے نہ سن لیں کہ کل سے کوئی نیا پروگرام شروع ہو رہا ہے، کھانا ہضم نہ ہوتا اور نہ رات کو چین سے نیند آتی۔ جب انہیں یہ خبر ملی تو مارے خوشی کے ایک ایک سے گلے ملنے لگے۔ گویا پیشگی مبارکباد شروع ہو گئی۔ مجلس مشاورت ہوئی۔ کئی گھنٹے بحث مباحثے میں گذرے۔ چائے کی متعدد کیتلیاں لنڈھائی گئیں۔ سینکڑوں سگرٹ پھونک ڈالے۔ ہنسی۔ قہقہے۔ گرماگرمی۔ شوکت کی فقرہ بازی۔ لطیفے اور دوسرے کا چست فقرہ سن کر تنک مزاجی کا اظہار۔ غرض ایک پُرلطف معرکہ گرم رہا۔ اور گرمیٔ محفل کا باعث محض شوکت کی ذات۔

تجویز ہوا کہ پروگرام سٹاف کا ہر اعلیٰ ادنیٰ رکن ایک ڈرامائی پروگرام ضرور لکھے۔ بحث کا سوال نہ تھا۔ طے پا گیا۔ جو لکھنے والے

نہ تھے وہ بھی خوشی سے آمادہ تھے کہ اس بہانہ ع

"لہو لگا کے شہیدوں میں نام کر لیں گے"

اور نتیجہ یہ ہوا کہ جب پروگرام کی تفصیل لکھ کر پڑھی گئی تو کل کا مجموعہ چالیس تھا کیونکہ باہر کے ادیبوں سے بھی تو لکھوانا تھے اور مہینہ صرف تیس دن کا۔ چنانچہ سوچا گیا کہ کیا کیا جائے مگر کسی کا یہ تو جی نہ چاہا کہ دس پروگرام خواہ مخواہ خارج کر دیں اور مہینے کی مجبوری سے صرف تیس رکھیں۔ شوکت صاحب نے کہا "ڈراموں کی ماہواری کے بعد چالیسواں کیوں نہ ہو!" میں نے کہا " چالیسویں کی نوبت کیوں آئی۔ بلکہ تھوڑی سی زیادتی ایسی کی جائے کہ مہینہ بند ہو جائیں۔ سب نے کہا وہ کیسے؟ میں نے کہا۔ " چالیس پروگرام تک تو نوبت پہنچ ہی گئی ہے صرف بیس کی کمی ہے۔ ساٹھ پورے کر کے دن میں دو ڈرامے یعنی صبح اور شام ایک ایک "

میری بات نامکمل ہی تھی اور وہاں تالیوں کی گونج شروع ہو گئی اور متفقہ طور پر ایک مہینے میں ساٹھ ڈرامائی پروگرام نشر کیا جانا طے پایا گیا جس کی فہرست مرتب ہو گئی۔ ان میں سے تمام مزاحیہ ڈرامے اور خاکے شوکت صاحب کے ذمے تھے۔ جب اس پروگرام کا آغاز ہوا تو وقتی طور پر ایک ہنگامہ تھا۔ عموماً ایک ریڈیو اسٹیشن سے ہفتہ میں ایک دو ڈرامے یا فیچر پروگرام نشر ہوا کرتے ہیں۔ اور یہاں ایک دن میں دو کی اوسط تھی۔ ہدایت کار مختلف تھے۔ مگر صدا کاروں کی تعداد محدود۔ نقل نویسوں کے ہاتھ پارٹ اور مسودات کی نقلیں کرتے ہوئے شل ہو رہے تھے۔ ہر ہدایت کار کو فکر تھی تو یہی کہ اسے بہتر صدا کار ملیں۔ زیادہ سے زیادہ ریہرسل کا وقت ملے۔ لیکن حالت یہ تھی کہ ہر پروگرام کی ریہرسل کو بمشکل چند گھنٹے میسر آ سکتے تھے۔ شوکت صاحب کا ڈرامہ صبح نو بجے نشر ہونا ہے۔ گذشتہ شب ان کا ایک کھیل نشر ہو چکا ہے۔ اب وہ کچھ حصہ گھر سے لکھ لائے ہیں، سات بجے پہلی مجلس کے پروگرام حسب معمول نشر ہونا شروع ہو چکے ہیں۔ ڈرامے کے صدا کار، ہدایت کار متعلقہ کے ساتھ ادھر ادھر گھومتے پھر رہے ہیں اور شوکت صاحب کا انتظار ہے۔ سامنے سے شوکت کو دیکھتے ہیں ان کے گرد جمع ہو گئے کہ ڈرامے کا مسودہ دیجئے تو جلدی سے پارٹ لکھے جائیں نشر کا وقت آ رہا ہے۔ ہدایت کار سخت پریشان ہے۔ شوکت صاحب حسب معمول نہایت اطمینان سے تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں "بس ابھی دیتا ہوں" اور "ڈیوٹی روم" میں جا کر میز پر اپنا بیگ رکھ کر ڈلی سے چھالیہ کتھہ اور چونا وغیرہ نکال کر چبانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہدایت کار پر بدحواسی طاری ہے۔ شوکت مسکراتے ہیں اور آرام سے بیگ میں سے چند کاغذات نکال کر انہیں الٹ پلٹ کے دیکھتے اور بلا تکلف لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہدایت کار اب یہ دیکھتا ہے کہ جو ڈراما نو بجے نشر ہونا ہے اس کے مسودے کا چوتھا صفحہ اب شروع ہوا ہے۔ ڈرامے کی نشری مدت نصف گھنٹہ ہے۔ شوکت صاحب کی تحریر گنجان ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کو ابھی مسودہ مکمل کرنے کے لئے چھ سات صفحات اور لکھنے ہیں۔ آٹھ بجنے کا عمل ہے۔ ہدایت کار اور صدا کاروں پر جیسے غشی طاری ہونے لگتی ہے کہ اب ہو گا کیا۔ کب مسودہ ختم ہو گا، کب نقل ہو گا، اور ریہرسل کس طرح ہو گی۔ اس ڈرامے میں کل چار کردار ہیں۔ ہدایت کار مسلسل شوکت سے اپنی پریشانی اور وقت کی تنگی کا اظہار کر رہا ہے۔ آخر وہ اس پر ترس کھا کر چار مکمل ورق اس کے ہاتھ میں دیتے ہیں مطمئن انداز میں کہتے ہیں "میری جان۔ گھبراؤ نہیں۔ یہ لو، تم ریہرسل شروع کرو۔ اور میں ایک ایک ورق اس دوران میں تمہیں دیتا جاتا ہوں" اور پھر یہ دیکھ کر سب کی کچھ تسلی ہو جاتی ہے کہ ان چار ورقوں کی پانچ پانچ کاربن نقلیں کی ہوئی ہیں۔ جو شوکت نے اصل مسودہ لکھتے وقت کاربن کاغذ رکھ کر کر لی ہیں۔ سب خوشی خوشی جلدی سے اسٹوڈیو میں داخل ہو کر اپنے اپنے پارٹ پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔

چار صفحے ختم ہونے تک ایک ایک ورق اور پہنچا دیتا ہے اور ڈرامے کا آغاز ہونے سے پہلے مکمل مسودہ ہدایت کار اور صداکاروں کے پاس موجود ہوتا ہے لیکن ریہرسل ——؟ وہ نشر کے دوران ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ پوری ریہرسل کا وقت ہی نہیں ہوتا —— یہی خیریت ہے کہ ڈراما لکھا گیا۔

لیکن صداکار اس قدر پختہ کار منجھے ہوئے تھے کہ صرف ایک بار اپنے اپنے کردار کو پڑھ لینا ان کے لئے کافی تھا۔ کہیں کہیں ہدایت کار کسی لفظ کے تلفظ کی تصحیح کرا دیتا یا کہیں کسی فقرے کی ادائیگی کا انداز سمجھا دیتا اور ڈراما قابلِ اطمینان کامیابی کے ساتھ براڈکاسٹ ہوتا۔ اس تعجیل میں لکھا ہوا مسودہ بھی کبھی تیسرے درجہ کی چیز نہیں بلکہ شوکت صاحب کے مخصوص طرز و معیار کے مطابق ہی ہوتا۔ اور اسٹاف کے اراکین میں سے تقریباً اکثر لکھنے والوں کے مسودے اسی طرح مکمل ہوتے۔ میں، برادرم انصاری، حبیب صاحب سب ہی نشر کے وقت سے کچھ دیر پہلے ہی مکمل کر پاتے کیونکہ دوسرے متعلقہ فرائض کی ادائیگی میں جو مصروفیت ہوتی وہ اس سے زیادہ وقت لیتی۔ میری اور شوکت صاحب کے ان ہنگامی نشری مسودات کی مدتِ نشر کے سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ مشہور ہو گیا تھا جو حسنِ اتفاق یا سوءِ اتفاق سے حقیقت کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ یعنی اگر شوکت صاحب کے کسی ڈرامے کی مدت ۴۵ منٹ نشر ہونے کے لئے مقرر ہے تو وہ اصل نشر کے وقت صرف ۳۵ منٹ کا ہوگا اور میرے نام سے جو ڈراما درج ہے اس کے لئے ۵۵ منٹ یا ایک گھنٹہ درکار ہوگا۔ ہم دونوں جب عجلت میں لکھتے لکھتے مسودہ مکمل کرتے تو مدت کا اندازہ کئے بغیر کمی بیشی کا لحاظ نہ رکھ سکتے۔

ڈراموں کے سلسلہ میں کئی مواقع ایسے آتے کہ شوکت صاحب کو مجھے یا انصار صاحب کو کوئی ڈراما لکھنا ہے۔ عین وقت تک مسودہ نا تمام ہے۔ صداکار چُن لئے گئے۔ ابتدائی حصّہ صداکاروں کے حوالے کیا اور ہدایت کار نے وقت مقررہ پر ڈرامے کا آغاز کر دیا مصنف اسٹوڈیو کے باہر ایک طرف گیلری میں بیٹھا بقیہ حصّہ لکھ رہا ہے اس کے سامنے نقل نویس پارٹ نقل کر رہے ہیں۔ ایک پہریدار جلدی جلدی، ورق ورق اسٹوڈیو کے اندر پہنچا رہا ہے۔ اور ڈراما مسلسل نشر ہو رہا ہے۔

دراصل اس میں صداکاروں کی پختگی اور حاضر دماغی کا بھی بڑا ہاتھ تھا جو اس عجلت کے دوران پیشتر مسودہ پڑھے بغیر اپنے اپنے پارٹ اس طرح ادا کرتے تھے کہ سامعین کو بھی اس حقیقت کا احساس نہ ہونے پایا کیونکہ کبھی کسی سے کوئی غلطی یا سہو کا امکان ہی نہ تھا صداکاروں میں مقررہ اسٹاف آرٹسٹوں سے علاوہ زیادہ تر مستقل اسٹاف کے اراکین شوکت تھانوی۔ ملک حبیب۔ انصار ناصری۔ غلام فرید۔ یہ خاکسار شریک ہوتے۔ اور سب کو اپنے کام پر کامل عبور و اعتماد تھا۔

پھر اس نوع کے پروگراموں کی کثرت رہتی تھی کہ اس عجلت اور روا روی کے بغیر چارہ کار ہی نہ تھا۔ دن میں دو ڈراموں کا پروگرام تو سال میں کئی بار ہونا معمول ہو گیا تھا اور پھر سب مسودات نئے ہوتے۔ لیکن اس کے علاوہ مختلف النوع پروگراموں کا تقرر و تسلسل جاری رہتا۔ اب ریڈیو پاکستان کے ڈرامائی پروگرام کی حالتِ زار دیکھ کر جب اس دور کا خیال کرتے ہیں تو شرم و ندامت سے سوچنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ کیا ہمارے ان خوابوں کی یہ تعبیر مقدر تھی !

اس وقت ہر ریڈیو اسٹیشن کی ایک خصوصیت خاصہ ہوتی تھی۔ مثلاً لاہور سٹیشن خالص طور پر ڈراموں کے لئے مشہور تھا۔ یہاں لکھنے والے، ہدایت کاروں اور صداکاروں میں تجربہ کار حضرات کی خاصی تعداد موجود تھی۔ سید امتیاز علی تاج۔ رفیع پیرزادہ۔ آغا بشیر احمد وغیرہ

اصحاب نئے نئے ڈرامے لکھنے اور پیش کرنے میں مصروف رہتے۔ ان میں زیادہ تعداد تراجم کی تھی ۔ دہلی اسٹیشن تقاریر کے لئے مخصوص تھا۔ بمبئی میں کلاسکی موسیقی کے اعلیٰ فن کار اور موسیقار مشاہیر جمع تھے اس لیئے وہاں موسیقی کے پروگرام نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ لکھنؤ اور اس کے قرب وجوار میں فنکاروں، ادیبوں اور شاعروں کا مجمع تھا اور خاص لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر حُسنِ اتّفاق سے چند اہلِ ذوق آ موجود ہوئے تھے جن میں سر پھرے قسم کے فنکار زیادہ تھے اور سب کے سب فن کے میدان میں مجاہدانہ زندگی گذار رہے تھے اس لیئے یہاں یہ جدّ و جہد جاری تھی کہ یوں تو ہر پروگرام میں خاص جدّت و خصوصیت شامل رہے لیکن دوسرے اسٹیشنوں کی طرح اس کی خصوصیتِ خاصہ غنائیہ فیچر اور اوپیرا تھا ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ نشری اوپیرا اس برّصغیر میں سب سے پہلے لکھنؤ ریڈیو سے شروع کیا گیا کیونکہ سرزمینِ اودھ میں ماہر خوش گلو موسیقار ۔ اور صداکار معقول تعداد میں پہلے ہی سے موجود تھے ۔ انہیں نشری ضروریات کے لئے آسانی سے تربیت دی جا سکتی تھی۔۔

اس نوع کے پروگراموں کا آغاز اوّلین منظوم ناٹک اندر سبھا سے کیا گیا اور اسی کے انداز میں مشہور اردو مثنویوں "بے نظیر بدرِ منیر" "زہرِ عشق" "گلزارِ نسیم" "ترانۂ شوق" وغیرہ کو نشری اوپیرا کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا ۔ ان پروگراموں کی ترتیب کی ذمہ داری شوکت صاحب اور میں نے اپنے ذمّے لے لی تھی ۔ اور سب مل جُل کر پیش کرتے ۔ سلطان واجد علی شاہ کا مشہور ناٹک 'رہس' رادھا کنھیا' بھی اسی ذیل میں نشر کیا گیا ۔ جب تمام مشہور مثنویات تمام ہو چکیں تو سوچا گیا کہ اب کوئی نئی چیز ہونی چاہیئے ۔ طے پایا کہ ایک جدید مثنوی تصنیف کرائی جائے جس سے اوپیرا تشکیل ہو سکے ۔

چنانچہ اس مقصد کے لئے کہانی کا خلاصہ دے کر حضرت جگر مراد آبادی مرحوم کی خدمت میں عرض داشت پیش کی گئی اور اصرار و تقاضہ کے بعد میں اور شوکت جگر صاحب سے مثنوی لکھوانے میں کامیاب ہو گئے ۔ لیکن جگر صاحب نے جو مثنوی لکھی وہ خالص طور پر پڑھ کر لطف اُٹھانے کے قابل تو تھی جس کے شاعرانہ محاسن لا کلام لائقِ داد تھے ۔ سب سے بڑی خصوصیت اس کی یہ تھی کہ جگر صاحب نے مثنوی کے انداز میں اپنے مخصوص تغزّل کی دل کش و رنگین کیفیت پیدا کی تھی ۔ لیکن اس کو نشری ڈراما بنانا ممکن نہ تھا کیونکہ اس میں ڈرامائی ازم خصوصاً عمل و حرکت سرے سے مفقود تھی ۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ شوکت صاحب اور میں اسی کہانی پر ایک مثنوی لکھیں اور جگر صاحب کے منتخب اشعار مناسب موقعوں پر شامل کر لیں جو ڈرامائی شکل میں ترتیب پا سکے ۔ سیّد انصار ناصری اس پروگرام کی پیشکش کے ذمّہ دار تھے کیونکہ وہ ڈرامے کے انچارج تھے ۔ یہ سنہ ۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے ۔ اس وقت لکھنؤ کے اسٹیشن ڈائرکٹر مسٹر کندن سروپ ملک تھے جو کے ایس ملک کے نام سے مشہور تھے اور ایک باذوق فنکار ہونے کے ساتھ لکھنے کا شوق بھی رکھتے تھے ۔ اور "پرویز" کے نام سے نشری ڈرامے اور خاکے لکھا کرتے تھے۔ ملک صاحب ۔ انصار صاحب، شوکت صاحب اور میں چاروں اصحاب ایک ساعتِ سعید میں ملک صاحب کے کمرے میں بیٹھ گئے اور یہ مثنوی (جس کا نام اسکی خاص کردار (ہیروئن) دُردانہ کے نام پر" دردانہ" رکھا گیا) کی مہورت کی گئی ۔ تین چار گھنٹے ہم سب سر جوڑ کر وہاں بیٹھے۔ میں اور شوکت شعر پر شعر کہتے جاتے انصار ناصری لکھتے جاتے اور ملک صاحب اظہارِ رائے کرتے ۔ چائے کیک پیسٹری سگریٹ ۔ پان غرض شاندار تواضع جاری رہتی ۔ ملک صاحب کی حالت یہ تھی کہ جہاں کہیں نہیں کوئی مصرع یا شعر پسند نہ آتا تو صاف گوئی سے کام لینے کے بدلے صرف آہستہ سے اتنا کہنے پر اکتفا کرتے کہ "اسے کسی اور طرح کہہ کر دیکھئے" یا شوکت کو یا مجھے مخاطب کر کے کہہ دیتے ۔ کہ "کیا خیال ہے آپ کا ۔ یوں ٹھیک رہے گا؟" کئی بار اس دوران میں شوکت کی تنک مزاجی ہنگامہ خیز ثابت ہونے لگتی ۔ کسی موقع پر ہم میں سے

کوئی اس کے مصرع پر اتفاق نہ کرتا اور اپنی بات کی پچ کرتے ہوئے اکثر تیز ہو جاتا۔ میرے اور شوکت کے درمیان بعض اوقات گرما گرم بحث ہو جاتی۔ کبھی شوکت میرے کسی شعر یا مصرع پر اعتراض کر کے اسے بدلنے کو کہتا۔ یا کبھی میں اس کے شعر کی ادائیگی سے اختلاف کرتا اس پر وہ اڑ جاتا۔ آخر ملک صاحب کی صلح جوئی اور انصار صاحب کی مصلحت کوشی امن قائم کرنے میں معاون ہوتی۔ یہ سلسلہ کئی روز اسی طرح جاری رہا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے دفتری کاموں میں گڑبڑ ہونے لگی کیونکہ تین چار گھنٹے شعر و شاعری میں گزاریں تو دفتری ضوابط و فرائض کب انجام دیں۔ ہماری میزیں کاغذات اور فائلوں سے بھر گئیں۔ اُدھر شوکت صاحب کے ذمے جو روزمرہ کے اور پروگرام تھے وہ کس وقت لکھیں اور پیش کریں اور اس کا حل یہ تلاش کیا گیا کہ دن کی نشست برخاست ہو۔ اور دفتر کے اوقات کے بعد شام کو یہ تصنیفی سلسلہ جاری کیا جائے۔ اِس مقصد کے لئے پہلے انصار صاحب کے مکان پر مجلس آرائی ہوتی رہی۔ بعد ازاں میرے مکان پر۔ شوکت صاحب اپنے شام کے پروگراموں سے فارغ ہو کر رات کو آٹھ نو بجے آ جاتے اور ہم تینوں بارہ ایک بجے شب تک اس کام میں مصروف رہتے۔ کیا وقت تھا۔ موسم سرما کی خنک اور طویل راتیں۔ تین ہم خیال دیوانے مل بیٹھتے۔ کھانا پینا ایک ساتھ۔ چائے کا دور چل رہا ہے۔ سگرٹ، حقّے کے کش جاری ہیں۔ پانوں پہ پان چبائے جا رہے ہیں۔ مصرعہ پہ مصرعہ اور شعر پہ شعر کہے جا رہے ہیں۔ انصار صاحب لکھ رہے ہیں کبھی اچھے شعر پہ تینوں خود ہی جھومنے لگے ہیں گانے لگتے۔ پھر اس خیال سے کہ گھر والوں کی نیند خراب نہ ہو جلدی سے آہستہ آہستہ گانے لگے۔ کڑی تنقید جاری ہے۔ نوک جھونک ہو رہی ہے۔ شوکت صاحب بگڑ گئے۔ روٹھ کر جا رہے ہیں کہ میرا شعر اچھا نہیں تو خود ہی سب کہہ ڈالو۔ میرے جھک مارنے کی کیا ضرورت ہے۔ انصار صاحب منا رہے ہیں۔ میں ہنس رہا ہوں، شوکت چڑھ کر پھر بیٹھ گئے خود ہی مسکرانے لگے اور بولے چلو آگے کہو۔ میں یونہی چھیڑنے کے لئے کہہ دیتا۔ اب میں نہیں کہتا تم ہی جھک مارو۔ شوکت نے میرے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔

"میرا بھیا کہہ دے، کہہ دے۔ شاباش۔ چل یہ ہے مصرع۔ اس پر مصرع لگاؤ" اور سلسلہ جاری ہو گیا۔ اس بگاڑ میں گرد و کدورت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ مقصد سب کا ایک تھا۔ سادگی اور خلوص کی جنگ تھی۔ لطف تھا۔ ایک خاص کیفیت تھی بیان میں آنے کے قابل نہیں۔ جوش و خروش کے عالم میں حقّہ زمین پر الٹ جاتا۔ اگالدان قالین پہ گل بوٹے بنا دیتا۔ بگڑنا۔ رُوٹھنا، اور منانا سب کچھ اخلاص و محبت اور سبھاؤ کے لیے تھا۔ غرض ایک یہی تھی کہ پروگرام شاندار ہو۔ چنانچہ پندرہ بیس افراد کی اس ہنگامہ آرائی اور بزم شعر گوئی کے نتیجہ میں ہم نے مل جل کر نہایت دلکش اور کامیاب مسودہ تیار کر لیا۔ جگر صاحب کے اشعار استعمال کرنے کی اجازت بھی ان سے حاصل ہو گئی۔ انصار صاحب کے ذمہ اِس پروگرام کی ہدایت کاری تھی۔ فنکاروں میں کلکتہ سے فلم اور تھیٹر کی مشہور و مقبول اداکارہ جہاں آرا کجن مرحومہ ہیروئن کے لئے بلائی گئیں اور لکھنؤ سے آجکل کے محبوب گلوکار طلعت محمود ہیرو کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔ دوسرے صداکاروں میں منّا بائی مرحومہ (الہ آبادی) اختری بائی فیض آبادی (جو اب اختر اشتیاق ہیں) ستارہ بائی کانپوری اور دو درجن دوسرے اعلیٰ فنکار جمع کئے گئے۔ تقریباً دو ہفتے دن دن بھر ریہرسلیں ہوتی رہیں۔ اسٹیشن بھر کا عملہ تمام فنکار اور دیگر اہلکار افسران وغیرہ سب ہی کسی نہ کسی کام میں مصروف تھے۔

آخر یہ جدید انداز کا اوپیرا بڑی دھوم دھام سے مقررہ تاریخ کو نشر ہوا اور اپنی دلکشی و جاذبیت کے لحاظ سے سامعین

کے کانوں میں اس کی طرزیں گونجتی رہیں۔

غرض لکھنؤ ریڈیو کا وہ زمانہ اسی قسم کے ادبی فنّی ہنگاموں میں گزرتا اور شوکت ہماری مجلس نشاط کا ایک نمایاں رکن تھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد لاہور کی "پنچولی آرٹ پکچرز" نے شوکت کو فلم نگار کی حیثیت سے بُلا لیا۔ اور وہ ہم سے رخصت ہوئے۔ پھر جنگِ عظیم شروع ہونے کے چند ماہ بعد سونگ پبلسٹی آرگنائزیشن کے نام سے حکومت نے ایک محکمہ قائم کیا جس کے سربراہ مکرمی حفیظ جالندھری (ابو الاثر) مقرر ہوئے۔ انہوں نے مختلف علاقوں میں ادیب و شاعر احباب کو پبلسٹی آفیسر مقرر کیا۔ لکھنؤ میں شوکت تھانوی نے یہ عہدہ سنبھالا۔ اور سونگ پبلسٹی کا دفتر امین آباد سے متصل ایک محل میں قائم ہو گیا۔ شوکت لاہور سے لکھنؤ آ گئے۔ اور جنگی ترانوں کے لئے گیت لکھوانے اور ان کی طرزیں تیار کرانے میں مشغول ہو گئے۔ یہ کام بظاہر شوکت کے لیے نیا تھا لیکن انہوں نے اپنی فطری ذہانت اور طبّاعی سے تمام دشواریوں پر عبور حاصل کر لیا۔ اور اس خوبی و خوش اسلوبی سے اِن ذمّہ داریوں کو نبھایا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک مزاحیہ ادیب نہیں بلکہ بنیادی طور پر تبلیغی موسیقی کے ماہر تھے۔ صوبہ اور مرکز دونوں پر اپنی اہلیت کا سکّہ جما دیا۔ نشریات کی جانب سے لکھنؤ میں رہنے کے باوجود ان کی دلچسپی کچھ کم ہی رہی۔ کیونکہ اپنے عہدے کی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں ان کو گاؤں گاؤں منڈلیاں لے کر گھومنا پھرنا پڑتا تھا۔ شوکت ہر رنگ اور ہر صورت میں ایک فطری فنکار تھے۔ اور انہیں اپنی فنّی صلاحیتوں کو ہر جگہ نمایاں کرنے کا خاص ملکہ تھا اور بہر حال وہ ایک ممتاز نشری شخصیت کے مالک بن چکے تھے۔ علاوہ ازیں محکمہ نشریات میں ان کے مخصوص احباب موجود تھے اس لیے وہ جہاں بھی رہے ریڈیو سے الگ نہ ہو سکے۔

شوکت کی دوسری ادبی مصروفیات اس محکمہ میں رہ کر بھی کم نہ ہوئیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنا ایک مقبول ترین ناول "بیوی" اسی زمانہ میں لکھا جس کی تصنیفی مدّت صرف ایک رات ہے۔ اس ناول کے ناشر برادرم محمد طفیل (مدیر نقوش و مالک ادارہ فروغِ اردو لاہور) اس کے شاہد ہیں جنہیں رات بھر شوکت کے ساتھ بیٹھ کر یہ ناول لکھنا اور لکھانا پڑا۔ شوکت صاحب بے تکان واقعات بیان کرتے جاتے اور کہیں سے ربط و تسلسل میں فرق نہ آنے پایا۔ جب طفیل صاحب لکھتے لکھتے تھک جاتے تو، سونگ پبلسٹی کے ایک منشی لکھنا شروع کرتے۔ لکھنے والے تھک گئے مگر شوکت کی روانی اور واقعات کے جوڑ توڑ میں کہیں تذبذب پیدا نہ ہونے پایا۔ سب کی حالت یہ تھی کہ

انگلیاں فگار اپنی ، خامہ خوں چکاں اپنا

رات کو نو بجے کھانے سے فراغت کر کے ناول شروع کیا گیا تھا اور صبح سات بجے ناشتہ کے وقت مکمل ہو چکا تھا۔ قدیم شاہی عہد میں داستان سرائی کا یہی انداز ہوا کرتا تھا کہ بادشاہ سلامت رات بھر قصہ کہانی سنتے اور داستان گو ساری رات ایک طویل داستان فی البدیہہ تصنیف کر کے سناتے جاتے۔ شوکت صاحب کی ابتدائی تربیت بلکہ جوانی کا زمانہ بھی لکھنؤ کی الف لیلوی فضا میں بسر ہوا اور انہوں نے بھی اپنی ادبی زندگی کا آغاز اسی انداز سے کیا۔ شوکت کی تصنیفی قوّت واقعی حیرت انگیز اور تخلیقی مادّہ بے پناہ تھا۔ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی یہ صلاحیت خداداد علمیت اور مطالعہ سے بہت زیادہ بڑھ چڑھ کر تھی۔ قدرت نے شوکت کو طنز و مزاح کا جو قدرتی ملکہ عطا کیا تھا۔ خصوصاً طنز و مزاح کی جو دولت اِن کے حصّہ میں آئی اور جس فیّاضی سے انہوں نے دوسروں میں تحریری اور زبانی ہر طرح تقسیم کی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہو گی۔ شوکت کو مجسّم ظرافت بلکہ متکلّم ظرافت کہنا بجا تھا۔ اس کی بذلہ سنجی میں تکلّف کو دخل نہ تھا نہ بدیع گوئی میں تصنّع کو ——— چونکہ لکھنؤ میں رہ کر سنِ شعور کو پہنچا۔ زبان کھولی تو کوثر کی دھلی ہوئی زبان بولنا شروع

اور تحریر میں بھی وہی فصاحت و سلاست موجود تھی۔ وہ عام زندگی میں بھی نفاست پسند واقع ہوئے تھے۔ آرائش و لباس کے معاملہ میں ان کا انداز اچھا خاصا "فصاحت و بلاغت" کی قسم کا تھا۔ خوش وضع خوش قطع اور خوش پوش و خوش مزاج انسان نازک طبع اور تنک مزاج بھی بلا کا واقع ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دوسروں پر فقرے پہ فقرے کستا جاتا اور خوش طبعی پر نازاں و مسرور نظر آتا لیکن جواب میں کسی کا ایک فقرہ اپنے اوپر چسپت ہوتے دیکھ کر بھڑک اٹھتا۔ فقرہ بازی ختم ہو جاتی اور منہ لٹکا کے بیٹھ جاتا۔ گھریلو زندگی میں بھی بعض اوقات شوکت کی نازک مزاجی بد مزاجی کی حد میں داخل ہو جاتی خصوصاً بیگم کے ساتھ اس کی عام خوش طبعی کبھی اچانک تبدیل ہو کر ایک بد مزاج سخت گیر شوہر کی حیثیت اختیار کر لیتی۔ لیکن عام طور پر وہ اولاد کے حق میں ایک شفیق باپ اور بیوی کے لئے پیارا شوہر تھا۔ بعض نجی حالات کے پیش نظر شوکت نے سنہ ۱۹۴۹ء میں لاہور میں عقد ثانی کیا۔ لیکن پہلی بیگم (سعیدہ بانو) اور تینوں لڑکوں کی نگہداشت میں ان سے علیحدہ رہ کر بھی کوئی کمی نہ کی۔ قدرتی طور پر سعیدہ بانو کو اپنی جگہ ہر قسم کی شکایات رہیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ شوکت نے ان سے نباہ کی وہی صورت اختیار کی جو ایک معقول شریف شوہر کا فرض تھا اور بچوں کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ میں کوئی کسر نہ رکھی۔ ان کی تعلیم و تربیت، شادی بیاہ (کیونکہ دو لڑکوں کی شادی ہو چکی ہے) کے سلسلہ میں پورا پورا حق ادا کیا۔ اس کے باوجود مطعون قرار پاتے رہے۔ اور دوسری بیگم (زہرہ شوکت) نے فطری طور پر جو سلوک ممکن تھا۔ آخری دم تک رہا۔ اور بیگم نے شوہر کی آخری دم تک خدمت گزاری و اطاعت میں ہر ممکن حق ادا کیا۔ بعض اعزا و متعلقین نے اس سلسلہ میں عجیب و غریب انداز اختیار کیا اور مبالغہ آرائی کی حد تک شوکت کو مطعون بنانے کی سعی لاحاصل کی۔ اور افسوس یہ ہے کہ ان میں سے اکثر وہ اصحاب ہیں جن کے ساتھ شوکت نے ہی نہیں بیگم زہرہ شوکت نے پیار محبت کا سلوک روا رکھا اور ان احسانات کے عوض ان لوگوں نے شوکت کی وفات کے بعد اس کے حق میں تلطف تو درکنار مدارات تک گوارا نہ کیا۔ بہرحال یہ دنیا ہے۔

صد حیف کہ یہ بلبل ہزار داستان جس نے زندگی بھر اپنوں اور ہزاروں غیروں کو ہنسایا مرض الموت کے چنگل نے اسے بے بسی کے عالم میں ایسا رلایا کہ دوستوں کے دل شق ہوتے تھے اور چند نام نہاد اپنوں نے وفات کے بعد ہر ممکن طریقہ پر اس کے لئے جگ ہنسائی کے اسباب پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ یقیناً انہیں اپنی موت یاد نہیں ع

ورنہ دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

اور حقیقت تو یہ ہے کہ شوکت کی موت تو اس کی زندگی سے زیادہ شان و شوکت کا نمونہ بنی۔ کیونکہ ع

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس

دراصل شوکت کی موت طب انگریزی پر ایک ایسا شدید طنز ہے کہ اس پر جتنا ہنسا جائے کم ہے۔ کس قدر عبرت ناک ہے یہ حالت کہ نامی گرامی حاذق ماہرین نے ایک عرصہ تک اس کے مرض کی تشخیص میں شک و شبہ کا اظہار ہی کیا۔ اور حتمی طور پر اس وقت صحیح مرض کا اعلان کر سکے جب وہ داعی اجل کو لبیک کہنے کے لئے تیار آخری سانسیں لے رہا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ شوکت صاحب اپنی ادبی خصائص کا شکار ہوئے۔ وہ صاحب مزاح و ظرافت ہر بات میں لطیفہ پیدا کرنے کے عادی تھے۔ چنانچہ چند ماہ پیشتر جب وہ علیل ہوئے اور ڈاکٹروں نے انہیں احتیاط و علاج کی تاکید بھی کی تو انہوں نے دوا اور معالج سب کا مذاق اڑایا اور معالجہ کی مطلق پروا نہ کی۔ آخر مرض رفتہ رفتہ شدائد کی صورت اختیار کرتا رہا۔ وہ بیگم سے بھی چھپاتے رہے لیکن تابہ کے۔ جب تکیہ سے سر لگایا تو اٹھنا نصیب نہ ہوا۔

علالت کے دوران ہی میں شوکت صاحب لاہور آئے۔ اور ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۶۳ء کو جشن اعزاز میں شریک ہو کر تمغۂ امتیاز حاصل کیا۔

۲۴ مارچ سے ان کی حالت بدتر ہونا شروع ہوگئی۔ جب ڈاکٹر یوسف (ماہر امراض قلب) نے تجویز کیا کہ انہیں قلب کے بڑھ جانے کی بیماری ہے اور جگر بھی خراب ہے تو دوستوں کو اپنے مخصوص انداز میں خطوط لکھ کر یوں دل لگی کرتے رہے کہ برادرم میر خلیل الرحمٰن (مالک روزنامہ جنگ) کو لکھا "ڈاکٹروں نے طے کیا ہے کہ میری بیماری میں تمام خرابی حضرت جگر مراد آبادی کی ہے" کسی کو لکھا "حضرت معالج بتاتے ہیں کہ، میں نہایت وسیع القلب ہوگیا ہوں" حالانکہ ڈاکٹروں کی ابتدائی تشخیص سے انہیں اپنے بارے میں مایوسی ہو چکی تھی۔ اور عزیزوں، دوستوں اور بچوں کو گلے لگا کر بے اختیار روتے رہتے تھے لیکن طبعی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کا وہی عالم تھا۔ روتے رلاتے بھی کوئی شگوفہ ایسا چھوڑ دیتے کہ روتوں کو ہنسی آجاتی۔ اور اپنے رونے کو مذاق میں اڑا دیتے۔

شوکت طبعاً نرم دل واقع ہوتے تھے۔ بلّی کی صورت دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا جیسے ان کے سامنے شیر کھڑا ہے۔ کانپنے لگتے بخصوصاً بیماری کے بہت کچے تھے۔ معمولی بخار آجاتا تو معلوم ہوتا کہ نہایت شدید ابتلا میں ہیں۔ یہ سبب بھی ان کی علالت کو خطرناک درجہ تک پہنچانے کا ضامن ہوا۔ کیونکہ ابتدا میں محض بیماری کے خوف سے علاج کی طرف توجہ نہ کی۔

لاہور میں قیام کے دوران میں جب ڈاکٹروں نے باقاعدہ تشخیص اور طبی معائنہ کی غرض سے ہسپتال میں داخل ہونے کی تجویز کی، تو اُنہوں نے بچوں کی طرح بسورنا اور رونا شروع کر دیا۔ مجھ سے گڑگڑا کر کہنے لگے "بس مجھ پر ایک احسان یہ کرو کہ ہسپتال سے بچا لو۔ میں ہسپتال میں جا کر مر جاؤں گا۔" میں نے تسلی دی اور منت سماجت سے سمجھانے کی کوشش کی کہ ہسپتال میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہر قسم کی آسانی میسّر آ سکے گی وغیرہ وغیرہ۔ اِس پر ایک روز کہنے لگے "دیکھو مَیں ایک راز کی بات بتا دوں، میں نے خواب دیکھا ہے کہ مَیں ہسپتال داخل ہوں اور کفن میں، لپٹا ہوا گھر لایا جا رہا ہوں۔ اس لئے مجھے اس عذاب سے بچانا ہے تو ہسپتال سے دُور رکھو۔ مَیں یہاں یونانی علاج کراؤں گا۔ اور تندرست ہو جاؤں گا۔"

مَیں نے کہا "اس خواب کی کھلی تعبیر یہ ہے۔ کہ انشاء اللہ تم صحت مند ہو کر وہاں سے آؤ گے۔ کیونکہ ایک تو ہسپتال میں کوئی مر جاتے تو وہاں سے کفن پہنا کر نہیں لایا جاتا دوسرے کسی بیمار کا اپنے کو مُردہ دیکھنا صحت اور زندگی کی علامت ہے" کہنے لگے "اچھا ایک دو دن ٹھہر جاؤ۔ ذرا طبیعت کو آمادہ کر لوں پھر لے چلنا"۔ اور ہم آپس میں باتیں کرنے لگے کہ یہ خواب کی بات محض افسانہ طرازی ہے۔ جو ہسپتال سے بچنے کے لئے بنائی ہے۔ گمان بھی نہ تھا کہ شوکت کا افسانہ حقیقت بن جائے گا اور اس خواب کی تعبیر زندہ دلی کی موت ثابت ہوگئی۔ بہرحال چند قریبی عزیزوں اور دوستوں کے اصرار و منّت سے شوکت ہسپتال میں داخل ہونے کے لئے رضامند ہو گئے۔ جہاں ہم نے ان کے ساتھ ۶۔ اپریل سے ۲۶۔ اپریل کے دوران اس دنیا کی عبرت ناک سیر کی۔ حقیقت میں یہ ایک نیا اور عجیب جہان ہے جس کے حالات اپنی بے بسی کے آپ ہی شاہد ہیں۔

شوکت جس روز ہسپتال گئے تو خود بیٹھ اُٹھ بلکہ تھوڑا چل پھر سکتے تھے لیکن اس کے بعد سے ان کی حالت روز بروز اور پھر لمحہ بلمحہ ابتر ہونے لگی۔ تیماردار تو خیر بے بس ہی تھے۔ مگر واقعہ یہ تھا کہ معالجین کے بس میں بھی کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اعلیٰ ماہرین دن رات کامل توجہ سے تشخیص و علاج میں مصروف تھے لیکن کسی کے کئے کچھ نہ بن رہا تھا۔ بالآخر ؏

مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی!

بیگم زہرہ شوکت ہسپتال میں شوکت کے ساتھ تھیں، اور ان کی تیمارداری و خدمت گذاری میں شب و روز مصروف۔ رات دن

کے چوبیس گھنٹوں میں سے بمشکل ۴ گھنٹے انہیں کچھ آرام کے میسر آتے ہوں گے۔ ورنہ ہمہ وقت بیمار کی پٹی سے لگی کھڑی رہتیں اور ذرا دیر کے لئے کسی کام سے وہاں سے الگ ہوتیں تو شوکت کی نحیف آواز انہیں پکارتی سنائی دیتی۔

چند ہی روز بعد شوکت نے گھر چلنے کا اصرار شروع کیا۔ اور جو کوئی ان سے ہسپتال میں رہنے کو کہتا ڈانٹ کھاتا۔ مجھ سے روزانہ اسی بات پر جھگڑا ہوتا۔ پہلے وہ خوشامد کرتے کہ اب مجھے گھر لے چلو اور جب میں ڈاکٹر صاحبان کی رائے ظاہر کر کے کہتا کہ ابھی ان کی اجازت نہیں۔ انشاء اللہ چند دنوں میں صحت ہو جائے گی تو لے چلیں گے۔ تو روٹھنا اور بگڑنا شروع ہو جاتا۔ عزیزوں اور دوستوں سے میری عدم موجودگی میں شکایت کرتے کہ "عشرت کو سمجھاؤ، اسکو رضامند کرو کہ مجھے یہاں سے لے چلے"۔

چونکہ ڈاکٹروں نے شوکت صاحب کے پاس لوگوں کو زیادہ آنے جانے سے منع کیا تھا اس لئے اخبارات میں ان کی علالت وغیرہ کی خبر تک پر ہم نے پابندی لگا دی تھی۔ تاہم قریبی عزیزوں اور دوستوں کو اطلاع کیسے نہ ہوتی اور وہ آنے سے کیونکر باز رہتے۔ چنانچہ ممانعت کے باوجود صبح سے شام تک اچھا خاصہ مجمع لگا رہتا۔ اکثر اصحاب کو کمرے کے باہر ہی بٹھا دیا جاتا اور چند مخصوصین ہی ان کے پاس جاتے، جنہیں وہ دور سے دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لاتے۔ اسوقت ایسا محسوس ہوتا جیسے ان کی نگاہیں سفینۂ خواب کی گہرائیوں میں تیر رہی ہیں۔ لیکن دنیا امید پر قائم ہے۔ باوجودیکہ بیماری خطرناک صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ حالت بد سے بدتر نظر آتی تھی۔ اور ڈاکٹروں کے بیان امید افزا معلوم نہ ہوتے تھے مگر یہ تو گمان ہی نہ ہوتا تھا کہ شوکت کو موت آ سکتی ہے لیکن ع

موت سے کس کو رستگاری ہے

شوکت کی آئی کیسے ٹل سکتی تھی۔ اور ۴ مئی ۱۹۶۳ء کو وقت کی گھڑی آ پہنچی کہ شوکت نے خواب کی تعبیر پا لی اور کرب و اذیت کے عالم میں اس حیوانِ ظریف زندہ دل انسان نے صحیح معنوں میں یہ ثابت کر دیا کہ ع

مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

شوکت نے ہسپتال سے گھر آ کر دم لیا۔ اور چند روز بعد نہایت سکون و اطمینان کی حالت میں زہرہ اور بچوں سے باتیں کرتے ہوئے دم توڑ دیا۔ ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ زندگی کی اذیتیں تمام ہوئیں۔ دل لگی ہی دل لگی میں زندگی کا کھیل ختم ہو گیا۔ شوکت کو ابدی سکون مل گیا۔ بیوی اور بچوں کو ناقابلِ تلافی صدمہ اور بے اندازہ غم، عزیزوں اور دوستوں کو جدائی کے رنج و الم۔ اور ستم ظریف احباب کو افسانہ طرازی کے مواقع نصیب ہوئے۔ شاید بعض اصحاب جو شوکت سے زندگی میں قربت کا دعویٰ رکھتے تھے وضعداری کو عین ایمان سمجھتے ہوئے اس کے مرنے کے بعد بھی اس لئے ہنستے رہے کہ جس نے ہمیں زندگی بھر ہنسایا ہے اب رو کر اس کی روح کو صدمہ کیوں پہنچائیں اور اخلاص کیشیوں کا ثبوت اپنی مضمون نگاری کے انداز دکھا کر دیتے رہے، کسی نے اس کی نجی زندگی کے پہلو غلط اور انوکھے انداز میں نمایاں کر کے اپنی خصوصیت جتائی۔ تو کسی نے چند ایسے خطوط جو شوکت نے بصیغۂ راز لکھے تھے شائع کر کے بددیانتی کا اظہار کیا۔

شوکت کی علالت کے زمانہ کی کہانیاں تو اکثر حضرات نے عجیب غریب طریقے سے بیان کیں۔ ایک صاحب نے جو شوکت کی بیماری کے زمانہ میں شاید ہی کبھی اس کے پاس آئے ہوں۔ ایک مضمون میں مضحکہ خیز واقعہ لکھ کر خدا جانے کیا ثابت کرنا چاہا۔ فرماتے ہیں کہ ہسپتال میں جب شوکت صاحب گھر چلنے کے لیے ضد کر رہے تھے اسوقت ایک شیعہ دوست نے انہیں سمجھایا۔ اس پر شوکت صاحب نے برجستہ ایک شعر کہا جس کا مطلب تھا کہ "تم چاہتے ہو میرے جگر میں خنجر پیوست ہو۔ میرا نام محمد عمرؓ ہے اور اس طرح تمہارے تعصب

اور انتقام کی آگ بجھے گی۔"

اس کے علاوہ اور بہت سی لغو اور مہمل کہانیاں تراشی گئیں۔ یہ وہ حضرات تھے جو شوکت کے سامنے اس کی بذلہ سنجی کا جواب دینے کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ اور اس خاموش موقعہ کے منتظر تھے۔ حالانکہ شوکت نے عمر بھر کسی سے انتقام نہ لیا ہوگا۔ ہر انسان سہو و خطا کا مرکب ہے۔ شوکت کی ذات میں بھی فطرتاً کچھ خامیاں اور کمزوریاں تھیں۔ سہواً یا عادتاً کسی موقعہ پر اس نے کسی سے زیادتی کی ہوگی۔ ایک سب سے بڑی کمزوری شوکت کی بدگمانی تھی۔ وہ بعض اوقات بے سبب محض شک و شبہ کی بنا پر کسی عزیز یا دوست کے خلاف ہو جاتا اور رنج و غصہ میں اس سے انتقام لینے کی بھی ٹھان لیتا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس کی ذات میں انتقام لینے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ شوکت کی بہت سی کمزوریوں پر اس کے مزاح و ظرافت نے پردہ ڈال دیا تھا۔ اور اس کی شخصیت اس کی فطری لطافتوں میں اس قدر گم تھی کہ اس کی خامیاں بھی پیاری معلوم ہوتی تھیں ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں!

◆

مرحُوم

نادم سیتاپوری

۴- مئی ۱۹۶۳ء کی سہ پہر کو انجمن ترقی اردو پاکستان کے دفتر میں مولانا نصیر الدین ہاشمی حیدرآبادی کا عصرانہ تھا۔ وہیں جناب شان الحق حقی نے شوکت کے انتقال کی خبر سنائی —— حالت تو کئی دن سے تشویشناک تھی اور اخبارات برابر مایوس کن خبروں سے بھرے نظر آ رہے تھے —— مگر جانے کیوں جی چاہتا تھا کہ شوکت ابھی نہ مرتے۔

کوئی ۱۶ سولہ ۱۷ سترہ سال سے شوکت کو نہیں دیکھا تھا۔ شاید ایک بار وہ لکھنؤ آئے تھے لیکن میں لکھنؤ سے باہر تھا۔ بمبئی یا بھوپال میں کہیں ملاقات نہ ہو سکی —— گزشتہ جنوری کے آخری ہفتے میں پہلی بار پاکستان جانے کا اتفاق ہوا۔ لاہور پہنچا تو بیمار ہو گیا۔ بیمار بھی ایسا کہ تقریباً صاحب فراش۔ شوکت راولپنڈی میں تھے اور میرے پاس پنڈی کا ویزا نہیں تھا۔ میں نے شوکت کو لکھا کہ میں لاہور آ گیا ہوں اگر تم ادھر آ رہے ہو تو مجھے اطلاع کر دینا۔ اس خط کا کوئی جواب نہیں آیا —— انہیں خط کا جواب دینا ہمیشہ نقصان کرتا تھا۔ اور غیر ضروری خط و کتابت سے وہ ہمیشہ دور ہی رہتے۔ بہت ہی کم ایسا ہوا ہے کہ شوکت نے بلا ضرورت کسی کو خط لکھا ہو۔ پھر مجھ جیسے انسان کی یہ توقع تو فضول ہی تھی جو ہمیشہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد برسوں کے لیے احباب سے جدا ہو جاتا ہے۔ لیکن شوکت کی اس بداخلاقی پر اب کی طے کر لیا تھا کہ ملاقات ہوتے ہی دو ٹوک فیصلہ ہو جائے گا۔ اور صاف کہہ دوں گا کہ میاں! ——

چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

مگر اس ملاقات کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ موت نے ہم دونوں کے درمیان ایک قطعی فیصلہ کر دیا۔ دو ٹوک فیصلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ——

شوکت "تھانوی" تو برائے نام ہی تھے، ان کا اصل وطن تو لکھنؤ ہی تھا جہاں انہوں نے شعور کی آنکھ کھولی تھی۔ چھوٹے چھوٹے نام تو دو تھے —— تسخیر احمد —— محمد عمر، لیکن مشہور ہوئے "شوکت تھانوی" کے نام سے۔ اور وہ بھی اس شان و شوکت کے ساتھ، کہ ان کی جیسی مقبولیت ان کے ساتھیوں میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ شوکت سے میرا پہلا تعارف کچھ عجیب و دلچسپ طریقہ پر ہوا،

کوئی چونتیس پینتیس سال ادھر کی بات ہے جب میں نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں مضامین لکھنا شروع کیے تھے۔ کوئی معیاری رسالہ تو ان مضامین کو خاک چھاپتا۔ یہی سمجھ میں آیا کہ ہاتھ صاف کرنے کے لیے روزنامہ "ہمدم" ہی پر ہاتھ صاف کیا جائے۔ شوکت اس زمانے میں "ہمدم"

کے ادارہ تحریر سے وابستہ ہو چکے تھے اور "ہمدم" کا فکاہیہ کالم (دو دو باتیں) انہیں سے مخصوص ہو چکا تھا۔ یہی نہیں، شوکت کے مزاحیہ مضامین، افسانے اور غزلیں وغیرہ بھی شائع ہونا شروع ہو چکی تھیں، "دو دو باتیں" کے کالم میں تو شوکت کا نام ہی نہیں ہوتا تھا۔ مگر دوسرے مضامین اور افسانوں میں وہ باقاعدہ قسم کے ساتھ "مولانا شوکت تھانوی" ضرور بن چکے تھے۔

مولانا، مولینا، علامہ، ابوالقلم، ابوالشعرا اور خدا جانے کیا کیا کچھ —— اس زمانے میں ہر نوزائیدہ ادیب، شاعر اور افسانہ نگار خود اپنے نام کے ساتھ ایسا کچھ لکھدیا کرتا تھا مجھے اس قسم کی باتوں سے ہمیشہ الجھن سی رہی۔ اسی لئے جب شوکت نے میرے ایک مضمون کے سلسلے میں شکریہ کے خط پر "جناب مولانا نادم صاحب سیتاپوری۔ محلہ قضیارہ سیتاپور" پتہ لکھ کر بھیجا تو مجھے بے اختیار غصہ آگیا۔ میں نے انہیں ڈانٹ کر ایک کارڈ لکھا کہ براہِ کرم آئندہ سے آپ مجھے "مولانا مولانا" ہرگز نہ لکھئے گا۔

اس وقت تک شوکت سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی اور میں "مولانا شوکت تھانوی" کو بہت ہی مرعوب کن شخصیت سمجھتا تھا۔

بڑی سی جسیم و ضخیم داڑھی ہوگی۔ ٹخنوں سے اونچا پاجامہ اور "زری کا جوتا" پہنتے ہوں گے۔ کرتہ بھی شرعی ہی قسم کا ہوگا۔ پگڑی ——

اور —— اور جانے کیا کیا کچھ ——!

مگر چند ماہ بعد لکھنؤ میں جب ملاقات ہوئی تو ان میں "مولانائیت" کا نام و نشان تک نظر نہ آیا —— اور مولانا یا مولینا ہوتے بھی کیسے! ایک باوضع خوشرو نوجوان کے بارے میں یہ تصور ہی غلط تھا در اصل پہلی ملاقات بہت ہی "باادب باملاحظہ" قسم کی تھی۔ کیونکہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو "معمولی ادیب" ظاہر کرنے پر تیار نہیں تھا۔ اس دور کے ادبی مسائل پر سنجیدہ گفتگو رہی۔ روزنامہ ہمدم کی پالیسی، کچھ سیاسی حالات پر نقد و تبصرہ غرضیکہ ایک گھنٹے کے اندر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو مرعوب کرنے کے لئے جلدی جلدی بہت سی باتیں کر ڈالیں، بے سلسلہ اور بے جوڑ سی —— مگر میں جب شوکت کے پاس سے اٹھا تو بالکل خالی ہاتھ تھا۔ شوکت پر شمہ برابر میری علمی و ادبی دھونس نہیں جمی تھی۔ جس طرح میرا تیر خطا ہو چکا تھا اُس طرح شوکت کے پلّے بھی کچھ نہیں پڑا تھا۔ البتہ میں جب شوکت کے پاس سے اٹھا تو شوکت کی من موہنی شخصیت مجھے کافی متاثر کر چکی تھی۔

اس کے بعد شوکت سے مختصر ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جب لکھنؤ جاتا شوکت سے ضرور ملتا، شوکت اس زمانے میں "چھوٹی شہزادی کی ڈیوڑھی" کے قریب اپنے ذاتی مکان "زرد کوٹھی" میں رہا کرتے تھے۔ آغا باقر کا امام باڑہ بھی زرد کوٹھی کے پاس ہی تھا جس میں مرزا رفیع سودا کی قبر بتائی جاتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب نخاس اور چوک کی رونق میں کمی ہو چلی تھی اور امین آباد کی چہل پہل دن بدن بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ "پیام یار" والے منشی نثار حسین کا دور ختم ہو چکا تھا۔ اب اس علاقے (چوک) میں صرف خواجہ عبدالرؤف عشرت ہی باقی رہ گئے تھے جن کی چھوٹی سی کتابوں کی دکان میں لکھنؤ ہی نہیں ہندوستان بھر کے ادیب اور شعرا کا جمگھٹا رہتا تھا۔ شبلی۔ سرشار۔ شرر۔ منشی سجاد حسین وغیرہ تو باقی نہیں تھے البتہ عزیز، محشر، ریاض اور لکھنؤ کے بہت سے اربابِ کمال اب بھی کسی نہ کسی وقت یہاں ضرور پہنچتے تھے۔ امین آباد کی طرف نیاز فتح پوری کے آجانے کے بعد ایک نیا ادبی مرکز نظیر آباد میں قائم ہو گیا تھا۔ مولوی صدیق احمد کے "صدیق بکڈپو" نے جو اشاعتی پروگرام شروع کیا تھا اس نے لکھنؤ کی ادبی فضا میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ اسی نظیر آباد میں ایک صاحب نے شبلی بک ڈپو بھی قائم کر دیا تھا۔ لیکن لکھنؤ کی اس نئی "ادبی پود" نے "افغانی بسکٹ فیکٹری" کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا۔ بسکٹوں کی یہ چھوٹی سی دکان اس زمانے میں لکھنؤ کے فنِ بسکٹ سازی کا اعلیٰ نمونہ سمجھی جاتی تھی۔ لکھنؤ بھر کی ادبی سوسائیٹیوں

ہیں اس کے بسکٹ خاص طور پر پسند کیے جاتے تھے۔ شام کے وقت امین آباد کے چوراہے پر تانگے والوں اور رؤسا کی موٹریں زعفرانی بسکٹ کے کاغذی پیکٹوں کے انتظار میں کھڑی رہتی تھیں۔ میرے خالو سید انعام حسین مرحوم اس کے مالک تھے اور "زعفرانی بسکٹ" کے موجد —! خالہ زاد بھائی سید الہام حسین اور نسیم انہونوی اسی زمانے میں "اردو مڈل" سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے تھے یہ عہد و پیمان کر کے کہ "لکھنا پڑھنا محض تضیع اوقات ہے" چنانچہ دونوں کے سرپرستوں نے انہیں اپنے اپنے دھندوں پر لگا دیا۔ نسیم کے بڑے بھائی محمد نعیم مرحوم ایک اچھے "ٹیلر" تھے انہوں نے نسیم کو اپنے ساتھ بٹھا لیا اور الہام بھائی انعامی بسکٹ فیکٹری کے منیجر بنا دیئے گئے۔

نسیم کا دل اس "کتربیونت" سے جلد ہی گھبرا گیا۔ وہ بہت ہی باعزم انسان ہیں، انہوں نے "ادارہ عالیہ ایک فنڈ" میں نوکری کر لی۔ لیکن آب و ہوا یہاں کی بھی زیادہ موافق نہیں تھی یہ ادارہ قطعاً ایک غیر شاعرانہ ادارہ تھا جس کا مقصد شکستہ مساجد کی مرمت تھا۔ نسیم کہاں تک ایک ایک کر چندہ بٹورتے۔ انہوں نے بانی ادارہ جلیل صاحب کو گانٹھ ایک ماہنامے کا ڈیکلریشن داخل کرا دیا جو بہت ہی جلد "انکشاف" کی شکل میں سامنے آگیا اور اس رسالے کے سرورق پر نسیم کا نام بحیثیت ایڈیٹر بھی چھپ گیا۔ لیکن یقین فرمائیے اس سلسلے میں یہ بیچارہ بالکل بے قصور تھا۔ شوکت، نسیم کی جدید ترین دریافت تھا۔ نسیم اس سلسلے میں ہمیشہ خوش نصیب رہے ہیں کہ جہاں اپنے مطلب کا آدمی نظر آیا یہ اس کے پیچھے لگ گئے۔ نسیم کی "دیدہ وری" کو شوکت میں وہ سب کچھ نظر آیا جو انہیں ہر حیثیت سے آگے بڑھا سکتا تھا۔ نسیم کا تیر نشانے پر ٹھیک ہی بیٹھا۔ شوکت نسیم کی "دیدہ وری" کا شکار ہو گئے اور باقاعدگی کے ساتھ انعامی بسکٹ فیکٹری پہنچنے لگے جو "فیکٹری" تو نام ہی کی تھی ایک چھوٹی سی دکان ضرور تھی۔ زیادہ پابندی سے نہیں مگر اکثر امین سلونوی بھی آجاتے تھے۔ گھر گرہستی کا سارا کام نسیم کے سپرد تھا "سٹوو" پر چائے بنانا۔ توسٹ پر مکھن لگانا اور نفاست کے ساتھ سب کے سامنے پیش کرنا۔ شوکت کے چبھتے ہوئے فقرے۔ امین کی پروقار سنجیدگی اور الہام بھائی کی روندھی ہوئی ہنسی — مدتوں اس ماحول کا روز مرہ بنی رہی۔

ماہنامہ "انکشاف" نسیم انہونوی کی برائے نام ادارت میں پابندی کے ساتھ نکل رہا تھا اور شوکت کی خداداد صلاحیتوں نے قلیل مدت میں "انکشاف" کے لئے لکھنے والوں کا ایک اچھا خاصا حلقہ پیدا کر دیا تھا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، شمیم طوری، ملا رموزی، باسط بسوانی، محشر عابدی اور ظریف لکھنوی وغیرہ تو کم و بیش طنز نگار اور طنز گو کے زمرے میں آتے ہی تھے، شوکت کی کوششوں نے نیاز فتح پوری، تمکین کاظمی، درد کاکوروی، امین سلونوی یہاں تک کہ اپنے استاد آسی الدنی کو بھی کھینچ کر اپنی صف میں کھڑا کر دیا لاکر ——— جن کا میدانِ عمل طنز و مزاح یقیناً نہیں تھا چنانچہ آج نیاز فتح پوری کا نام انشا پردازی، تنقید اور تاریخ میں تو سرِ فہرست نظر آتا ہے۔ مزاح نگار کی حیثیت سے نہ وہ کبھی سنجیدگی کے ساتھ سامنے آئے نہ اس دنیا میں انہیں شہرت و ناموری حاصل ہوئی۔ یہی حال تمکین کاظمی مرحوم کا تھا۔ فطرت نے انہیں تحقیقی صلاحیتوں سے مالا مال کیا تھا۔ اسی پر ان کا انجام بخیر ہوا ——— امین سلونوی نے "دنیا میں جہنم" جیسی شاہکار تخلیق ضرور کی مگر قسمت کا فیصلہ ان کے حق میں یہی ہے کہ وہ ایک کامیاب صحافی کی حیثیت سے زندہ رہیں۔

"انکشاف" دراصل شوکت کی پہلی اٹھان تھا۔ "ہمدم" کی وہ "دو باتیں" یوپی کی صحافت میں ایک ایسا ہی تموج پیدا کر رہی تھیں جیسا کہ مولانا ظفر علی خاں نے پنجاب میں کر رکھا تھا۔ لیکن شوکت تنہا اپنی صلاحیتوں کے سہارے طنز و مزاح کی نئی راہیں بنانا چاہتے تھے جو "اودھ پنچ" اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کے دور سے بہت کچھ ہٹی ہوئی تھیں۔ لکھنؤ کے اس تاریخی دور پر ایک قرن سے زیادہ بیت چکا تھا ادب و شعر کا مزاج بدل چکا تھا نثر کے اسلوب بدل چکے تھے حتیٰ کہ خود لکھنؤ وہ نہیں رہا تھا جو مرحوم "اودھ پنچ" کے دور ترقی میں تھا۔ پھر طنز و مزاح کی

تبدیلی کیوں نہ بدلتیں ——— شوکت نے بدلے ہوئے حالات میں لکھنؤ کی روایتی زندہ دلی اور روایتی طنز نگاری کی تن تنہا علمبرداری کی جنہیں منشی سجاد حسین اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کے لکھنؤ کا واحد نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

غالباً سنہ ۱۹۳۱ء کے اوائل میں "انکشاف" کا "ظرافت نمبر" نکلا جو کئی اعتبار سے یوپی کا پہلا خاص نمبر تھا۔ اس کی ظاہری خوش نمائی اور دیدہ زیبی میں نسیم کی خوش سلیقگی اور نفاست کا بڑا دخل تھا اور ترتیب و تہذیب کو سنوارنے کے لیے صرف شوکت کا نام لے دینا ہی کافی ہے۔ ادبی رسائل کے شاندار "سالناموں" کا رواج نیا نیا پڑا تھا اور غالباً اس اولیت کا سہرا حکیم یوسف حسن کے "نیرنگ خیال" اور "عالمگیر" سے زیادہ شاندار سالنامے اس زمانے میں کوئی دوسرا ادبی رسالہ شائع نہیں کر سکا ——— اور یوپی میں یہ افتخار "انکشاف" کو حاصل ہوا جس کی ظاہری آراستگی بلاشبہ حسن نسیم انہونوی کی خداداد صلاحیت کی رہینِ منت تھی۔ اس "خاص نمبر" کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ تھی کہ پہلی بار اس سالنامے میں شوکت نے یہ اقرار کیا کہ یہ سارا کیا دھرا انہیں کا ہے لیکن نسیم کی ادارتی لاج رکھنے کے لیے اس اعتراف کا آغاز کچھ اس طرح کیا تھا کہ ——— "کس کی بکری اور کون ڈالے گھاس"

یہ وہی دور تھا جب "سودیشی ریل" کی مقبولیت نے شوکت کی شہرت و ناموری کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ اب ان پر اپنے کارِ منصبی کے علاوہ ادبی رسائل کے لیے مزاحیہ مضامین لکھنے کی ذمہ داریاں بھی آ پڑی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اب وہ "انکشاف" کو اتنا وقت نہیں دے سکتے تھے چنانچہ سال ڈیڑھ سال کے اندر ہی انکشاف بند ہو گیا۔

طنز و مزاح نسیم کے بس کی بات نہ تھی اب ان کے سامنے یہی ایک صورت تھی کہ اپنی ادارتی پیاس بجھانے کے لیے کوئی زنانہ ماہنامہ نکال دیں چنانچہ "حریم" جاری ہو گیا اور جیسے کیسے نکلتا رہا۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں روزنامہ "ہمدم" کے بانی و مؤسس سر مہاراجہ محمد علی محمد خان (آف محمود آباد) کا انتقال ہوا اور "ہمدم" کی بنیاد ڈولنے لگی۔ خان بہادر سید احمد حسن نے اپنے امکان بھر اسے زندہ رکھنے کی کوشش کی لیکن زیادہ دنوں تک ان کی کوششیں بارآور نہ ہو سکیں اور "ہمدم" نواب عبداللہ خان کی ملکیت میں چلا گیا۔ سید جالب دہلوی نے "ہمت" کے نام سے ایک دوسرا روزنامہ جاری کر دیا اور شوکت "اودھ اخبار" میں چلے گئے۔

یہ دور شوکت کی پریشانیوں کا دور تھا۔ نسیم اس نادر موقع کو بھلا ہاتھ سے کب جانے دیتے۔ "سرپنچ" کا اجرا ہوا اور شوکت باقاعدہ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ "سرپنچ" جو مس "نسیم کی ملکیت تھا جس کی طرف سے "سرپنچ" کے علاوہ "حریم" بھی نکلتا تھا۔

"سرپنچ" کا دورِ ادارت شوکت کی زندگی کا سب سے زیادہ اندوہناک دور تھا۔ نسیم کا کاروباری برتاؤ اور شوکت کا عظیم پاسِ وضع! "سرپنچ" کے دفتر میں ایک چھوٹی سی میز پر گھنٹوں سر جھکائے وہ لکھا کرتے تھے جانے کیا کیا کچھ۔ "سرپنچ" اور "حریم" تو ان کے لیے زیادہ سے زیادہ دو تین دن کا کام تھا۔ لیکن نوکر جو تھے، خالی تو نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ دوسروں کے لیے ناول لکھ کر ڈیوٹی کے اوقات پورے کرتے رہتے۔

چاہے آپ اسے شوکت کی کمزوری کہیے چاہے حماقت ——— اس نے اپنے ہر دور و نزدیک دوست کو ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ نباہنے کی کوشش کی۔ یا مروت اور وضعدار ایسا کہ اگر کوئی دوست "سرقہ بالجبر" کی واردات میں انہیں نامزد کر دیتا تو یہ نہایت ہی "سعادت مندی" کے ساتھ اقبالِ جرم کر لیتے ——— یہی وجہ تھی کہ ان کے کئی قریبی دوست ان کے ساتھ "بیرحمانہ" سلوک کرتے رہے۔ اور یہ نہایت ہی صبر و شکر کے ساتھ اسے برداشت کرتے رہے۔ برداشت ہی نہیں کیا بلکہ انہیں فراخ دلی کے ساتھ تمام عمر اس طرح نباہ دیا جیسے وہ اسی لیے پیدا کیے گئے تھے کہ دوستوں کا ظلم و ستم ہنس ہنس کر جھیلتے رہیں۔ "سرپنچ" کا دورِ ادارت المناک تو ضرور تھا لیکن شوکت نے جس

خندہ پیشانی کے ساتھ اِسے نِبایا وہ بھی انہیں کا کام تھا۔ ایسی گھٹی ہوئی فضا میں جہاں ایک خوددار انسان کا سانس لینا محال تھا شوکت کا قلم برابر قہقہے اور مُسکراہٹیں بکھیرا کرتا تھا۔

"سرپنچ" سے شوکت کی علیحدگی آج تک معمہ بنی ہوئی ہے اور شاید ہمیشہ معمہ بنی رہے گی ——— جب اُنہوں نے خود کبھی اِس راز کو طشت ازبام نہیں کیا تو ان کا "رازِ درونِ پردہ" ہی رہنا اچھا ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر وہ "سرپنچ" سے الگ ہو کر اپنی دوسری دُنیا نہ بناتے تو اِن کا حشر بھی وہی ہوتا جو خان محبوب طرزی کا ہوا۔

"بسیار نویسی" شوکت کی زندگی میں کچھ ایسی رچ بس گئی تھی کہ تمام زندگی اِس نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا اور چھوڑتا بھی کیوں ——— ؟ زندہ جو رہنا تھا ان کو ! ایک مرتبہ ان پر "لکھواس" کا شدید دورہ پڑا ہوا تھا "زرد کوٹھی" کے ایک کمرے میں فرش پر لیٹے ہوئے بے تکان لکھنے میں مصروف تھے، مَیں پہنچا تو اُٹھ کر بیٹھ گئے ——— آنکھوں میں تھکن کا خمار اور فاؤنٹین پن انگلیوں کی گرفت میں جم کر رہ گیا تھا۔

کب تک ارادہ ہے ——— ؟

مَیں نے پُوچھا۔

کیا ارادہ ——— ؟

شوکت کا زود فہم دماغ فیل سا ہو گیا تھا جیسے ———

ارے بھئی ——— یہی اِنتقال "فرمانے" کا !

مَیں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

فی الحال تو تم لوگوں کے مرنے کا انتظار کر رہا ہوں ——— مزاحیہ تعزیت نامے لکھنے کے لیے" !

شوکت نے جواب دیا۔

ماشاءاللہ ——— چشمِ بد دُور !

مَیں نے ہنستے ہوئے کہا ———

اور بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی ——— اپنی بے پناہ مصروفیت کا ذکر کرنے لگے اور بڑی دیر تک اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے۔ شوکت تھانوی ہونے کے باوجود لکھنؤ کی زندہ دلی اور طنز و مزاح کے احیاء کا ایک خاص پروگرام لے کر اُٹھے تھے "اودھ پنچ" کے زمانے کا طنز و مزاح اِن کے نزدیک صرف تاریخی اہمیت کا حامل رہ گیا تھا وہ چاہتے تھے کہ "سرپنچ" کے ذریعہ مزاح نگاروں کی ایک ایسی نسل پیدا ہو جائے جو مرحوم لکھنؤ کی روایاتِ قدیمہ کو نئے اسلوب و انداز میں زندہ رکھ سکے لیکن شعر و ادب کی طرح "مزاح" بھی جبراً کسی پر طاری و مسلط نہیں کیا جا سکتا چنانچہ نتیجہ ظاہر "سرپنچ" کی فائلوں پر درجنوں نئے مزاح نگار اُبھرے اور فطری صلاحیتوں کے فقدان نے انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔ دُور کیوں جایئے یار لوگوں نے خود مجھ کو یہ غلط فہمی پیدا کر دی تھی کہ مزاح نگاری "میں میں ایک خاص مقام پیدا کرتا چلا جا رہا ہوں۔

غالباً ۱۹۳۳ء یا ۱۹۳۴ء میں "سرپنچ" کے سالنامے کا اعلان ہوا۔ شوکت بضد ہو گئے کہ تمہیں بھی کچھ نہ کچھ لکھنا ہے۔ چنانچہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کے کردار "مرزا ظاہردار بیگ" کو نئے قالب میں پیش کرنے کا خاکہ بنایا اور اُلٹا سیدھا ایک مضمون لکھ کر بھیج دیا۔ اس مضمون کو طنز و مزاح

میں کونسا مقام حاصل ہوا؟ اس پر دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں ——— مضمون پڑھنے والے ہنسے بھی ہونگے لیکن یقین فرمایئے سو فیصدی ناظرین کو میری اس بدمذاقی پر ہنسی آئی ہوگی کہ مجھے بھی مزاح نگاری کا خبط ہو گیا ہے۔ شوکت نے خواہ مخواہ اس مضمون کی تعریف ہی نہیں کی بلکہ اسی سالنامے میں لکھنے والوں کو جو خطابات دیئے ان میں میرے نام کے ساتھ " ابتسام الدہر" کا دم چھلا بھی لگا دیا تھا۔

شوکت بہت ہی بُرا آدمی تھا ———

اتنا بُرا کہ زندگی بھر سنجیدگی کے ساتھ کبھی اپنے کام نہیں آیا۔ زندگی کا بیش قیمت حصہ " یار باشی " اور دوست نوازی میں گنوا دیا، بلا یہ سوچے ہوئے کہ ان دوستوں نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ دوستوں کے کام آنا شوکت کا خاک و خمیر تھا اور وہ ڈھونڈھ کر ایسے موقعے تلاش کیا کرتے تھے کہ اپنے احباب کے کچھ کام آئیں۔

دوسری جنگِ عظیم چھڑ چکی ہے اور شوکت یو پی کے " سانگ پبلسٹی افیسر (Song Publicity Officer) مقرر ہو چکے ہیں۔ غالباً زرو کوٹھی بک چکی تھی۔ گونگے نواب کے باغ میں رہتے تھے۔ سانگ پبلسٹی آفس کے لئے یہیں ایک بڑا سا ہال اور چند کمرے بھی الاٹ کرا لئے تھے ——— ایک دن امین آباد میں مل گئے " کئی مہینے کے بعد ——— سلام علیکم کے بعد کہنے لگے

اب اتنا بھی نادم نہ ہو ——— لکھنؤ چپکے سے آتے ہو اور چھپ کر نکل جاتے ہو ——— یعنی ملتے بھی نہیں

معاف کیجئے گا ——— " میں نے جواب دیا " میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ بیکار ضائع کروں ——— اگر تمہیں بڑی محبت ہے مجھ سے تو سیتاپور کیوں نہیں آتے۔

جی سبحان اللہ ——— " شوکت بولے " ! گویا میں تمہاری طرح بیکار ہوں ——— خیر! چھوڑو آؤ میرے ساتھ !

زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے ——— چائے منگوائی، کہنے لگے ———

اب تمہاری " منڈلی " کا کیا حال ہے

" منڈلی " ——— میں واقعی چکرا سا گیا مگر جلد ہی ان کی بات سمجھ میں آ گئی ——— جب سے تم نے سرکاری نوکری کر لی۔ مجبوراً منڈلی توڑ دینا پڑی ——— اب اس کام کو طرزی کر رہا ہے۔

شوکت ہنسنے لگے۔ کچھ دیر تک خان محبوب خاں طرزی کی سانگ پارٹی کا ذکر ہوتا رہا۔ ——— چائے اب ختم ہو چکی تھی کہنے لگے ! ———

یہ کاغذ لو ——— ذرا دو چار گیت لکھ ڈالو جلدی سے۔

گیت ——— کیسے گیت ؟

میں نے پوچھا ———

کہنے لگے ———

اماں ایسے ہی فضول سے " فوجی کم پین " کو سنانے والے، جنہیں سن کر وہ جھومنے لگیں۔

میں " فضول سے گیت " لکھنے لگا اور شوکت اپنے کام میں لگ گئے۔

کوئی بیس پچیس منٹ میں میں نے تین چار " فضول سے گیت " لکھ کر شوکت کی طرف بڑھا دیئے۔

شوکت نے گیت دیکھے اور ایک سلپ پر کچھ لکھ کر گھنٹی بجائی۔ چپراسی آیا، اسے یہ کاغذات دے کر کہا:۔

بسمل صاحب (منشی سکھدیو پرشاد بسمل الہ آبادی) کو دے آؤ۔

چپراسی چلا گیا، شوکت پھر باتیں کرنے لگے ——— کوئی دس منٹ کے بعد چپراسی نے ایک چیک لا کر شوکت کی میز پر رکھ دیا شوکت نے اس چیک پر دستخط کئے اور میری طرف بڑھا دیا۔

یہ چیک میرے نام تھا ———

ایں یہ کیا ——— ؟" میں واقعی متحیر ہو گیا" ——— معاف کیجئے گا میں "خرچی پر" مشاعرے نہیں پڑھتا ———

آپ بونے .... ہیں" شوکت ہنستے ہوئے بولے"! لکھنؤ کا خرچ نکل آئیگا۔

اس وقت تک میں نے "ریڈیو" کے علاوہ کسی سے بھی اپنے مضامین کا معاوضہ نہیں لیا تھا۔ مجھے کچھ شرم سی آئی مگر شوکت نے جلد ہی یہ احمقانہ خیال میرے دل سے نکال دیا اور میں چیک لیکر چلا آیا۔

"وہی دہلوی" کے نام سے کم ہی لوگ نا آشنا ہونگے۔ اس فرضی نام سے آج سینکڑوں فحش اور گندے ناول چوری چھپا فروخت ہو رہے ہیں۔ حکومت ہند و پاک نے اس قسم کے اخلاق سوز لٹریچر کو ممنوع قرار دیا، درجنوں کتب فروشوں کے یہاں چھاپے پڑے، مقدمات چلے، سزائیں ہوئیں مگر شاید اب تک یہ پتہ نہیں لگ سکا کہ یہ "وہی دہلوی" ہیں کون صاحب! اور پتہ چلتا بھی تو کیسے؟ اس قسم کا گندہ لٹریچر کسی ایک دماغ تک محدود نہیں ہے جس کا جی چاہا "وہی دہلوی" بن گیا۔

لیکن شاید یہ کم ہی لوگوں کو معلوم ہوگا کہ "وہی دہلوی" کا فرضی نام دراصل شوکت کی جودت فکر کا نتیجہ ہے یہی نہیں! اسی سلسلے میں شوکت نے فی البدیہہ ایک شعر بھی کہا تھا۔

ہم آپ کے "وہی" ہیں ہمیں جان جائیے
پہچان پر ہے ناز تو پہچان جائیے

ہوا یہ ———!

نسیم انہونوی نے جب جنسیاتی افسانوں اور ناولوں کی اشاعت کا دھندہ شروع کیا تو "نسیم بک ڈپو" کے لئے "شرمناک فسانے" "بھنور" اور "دلدل" قسم کی کئی کتابیں لکھوائیں جو جنسیاتی ہونے کے باوجود اتنی گندی، فحش اور اخلاق سوز نہیں جیسی آجکل "وہی دہلوی" کے نام سے شائع کی جا رہی ہیں۔ پھر بھی ہندوستانی ماحول اور اردو زبان کے لئے یہ نیا تجربہ ضرور تھا۔ اسی لئے اس کے لکھنے والوں نے اپنا نام شائع کرنے کی اجازت نہیں دی چنانچہ یہ مسئلہ جب شوکت کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے ان فرضی مصنفین پر "وہی دہلوی" کا نقاب ڈال دینے کا مشورہ دیا اور یہ فرضی نام کچھ ایسا مقبول ہوا کہ درجنوں "وہی دہلوی" پیدا ہو گئے۔

شوکت محض مزاح نگار ہی نہیں تھے بلکہ قدرت نے ان میں ایک اچھے اداکار کی تمام صلاحیتیں بھی کوٹ کوٹ کر بھر دی تھیں۔ ان کے دو تین معرکۃ الآرا مضامین میں "تعزیت" بھی ایک خاص مقام رکھتا ہے جو ان کی انتہائی سنجیدہ اداکاری کا آئینہ دار ہے۔ "مرقع" کے ایڈیٹر سید مقبول حسین وصل بلگرامی مرحوم بھی اسی قسم کی سنجیدہ ایکٹنگ کے ماہر سمجھے جاتے تھے لیکن انہوں نے اگر کسی سے مات کھائی ہے تو وہ شوکت اور صرف شوکت تھے۔

وصل بلگرامی بڑے ہی باوضع انسان تھے۔ ان کی بارعب گھنی ڈاڑھی کے پیچھے ہمیشہ ایک "خانقاہی جاہ وجلال" موجیں مارا کرتا تھا اور مشکل ہی سے کوئی باور کر سکتا تھا کہ یہ بزرگ "صاحبِ کشف و کرامات" نہیں ہیں۔

شوکت جن دنوں "زرد کوٹھی" میں رہا کرتے تھے انہیں آئے دن اللہ کے ایسے نیک بندوں سے سابقہ پڑا کرتا تھا جو خدارسیدہ اور خداشناس اربابِ طریقت کی تلاش وجستجو میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اسی قسم کے ایک صاحب اکثر شوکت کے پاس آیا کرتے تھے۔ اور نجانے کیوں انہیں یقین ہو گیا تھا کہ یہی مردِ حق آگاہ انہیں منزلِ مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔

شوکت نے پیچھا چھڑانے کی بڑی کوشش کی لیکن ان کی "طلبِ حق" نے ہمت نہ ہاری۔ شوکت تو ان سے عاجز ہی تھے، پورا ایک پلان بنا ڈالا۔ ان سے کہا —— دیکھئے صاحب، آپکو لیے تو چلتا ہوں ایک بزرگ کے پاس —— لیکن اس کی ذمہ داری قطعاً نہیں لیتا کہ وہ آپ کو بیعت کی اجازت دیدیں، وہ بزرگ اس پائے کے سالک ہیں کہ کسی قیمت پر کسی کو اپنا مُرید نہیں کرتے۔ یہ بات آپکو ابھی بتائے دیتا ہوں پھر نہ کہیئے گا کہ مجھے دھوکا دیا —— وہ آپکے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے ہیں، مَیں سمجھتا ہوں اس کا انحصار محض آپکی طلبِ صادق پر ہے —— اگر آپ میں سچی طلب ہو گی تو ان کے ٹھکرانے کے باوجود آپ کا سر ان کے قدموں پہ پہنچ جائیگا۔

ان صاحب نے نہایت پُرجوش الفاظ میں اپنی طلبِ صادق کا یقین دلاتے ہوئے کہا ——

شوکت صاحب —— بس آپ تو ایک مرتبہ ان بزرگ سے ملوا دیجئے پھر مَیں خود نپٹ لوں گا۔

یہی تو سوچ رہا ہوں جناب، بعض وقت وہ اتنا جلال میں آجاتے ہیں کہ جو سامنے پڑتا ہے اس کی مرمت کر دیتے ہیں۔ شوکت نے بہت ہی سنجیدگی کے ساتھ انہیں سمجھایا —— مگر انہوں نے ایک نہ سُنی اور شوکت نے اقرار کر لیا ——

آپ کو ان تک پہنچا دوں گا —— آگے آپ خود جانیں۔

سوچے ہوئے پلان کے مطابق دوسرے دن شوکت وصل کے یہاں پہنچے اور نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ مُنہ سکھا کر "ان صاحب" کا تذکرہ کیا —— ان سے کہا کہ ...... صاحب میرے پاس آئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ آپنے کسی "بیوہ" سے ان کا عقدِ ثانی کرا دینے وعدہ کیا تھا، وہ بیچارے بہت پریشان ہیں کہتے تھے کہ کئی مرتبہ وصل صاحب کے پاس گیا، مگر وہ برابر ٹال رہے ہیں۔ وصل نے جیسا کہنا چاہئے اس بات سے قطعاً انکار کیا —— اور کہا کہ مَیں کسی ایسے آدمی سے واقف نہیں ہوں اور نہ میں نے کسی سے اس قسم کا وعدہ کیا ہے اور ...... اور ...... !

لیکن شوکت نے کچھ اس انداز میں وصل سے گفتگو کی کہ وہ برہم ہو گئے۔ شوکت چاہتے ہی یہی تھے بڑی متانت کے ساتھ یہ کہہ کر وصل کے یہاں سے خفا ہو آئے۔

خیر —— مَیں ان کا اور آپکا سامنا کرا دوں گا، آپ جانیں اور وہ —— !

اور یہی ہوا "ان حضرت" کو لے کر شوکت عین اس وقت "بھوڑ وارہ ہاؤس" (قیصر باغ) پہنچے۔ جب وصل نماز پڑھ رہے تھے۔ شوکت نے انہیں اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ آپ کے بارے میں مَیں نے ان بزرگ سے کہہ تو دیا ہے مگر وہ "رجوع" ہوتے نظر نہیں آتے مَیں آپکو وہاں پہنچا تو دوں گا مگر مجھے ایک بہت ضروری کام ہے اس لئے ٹھہر نہ سکوں گا۔ آپ ان سے صرف اتنا کہہ دیجئے گا کہ "شوکت تھانوی" نے بھیجا ہے —— اور اگر وہ "رجوع" نہ ہوں تو آپ بلاتکلف ان کے قدموں پر سر رکھ دیجئے گا، اگر خدا کو منظور ہے تو انشاءاللہ

آپ کا کام ضرور بن جائے گا۔

شوکت انہیں پہنچا کر فوراً ہی وہاں سے کھسک آئے۔ وصل نے نماز پڑھ کر جب سلام پھیرا تو "مردِ حق طلب" نے بعد سلام علیک کے گڑگڑاتے ہوئے ان سے کہا۔

شوکت تھانوی صاحب نے مجھے بھیجا ہے ....!

اور شوکت کا نام سنتے ہی وصل جامے سے باہر ہو گئے یہ "حضرت" دھڑ سے ان کے پیروں پر گر پڑے لیکن وصل کا پارہ اور چڑھ گیا غرضیکہ وہ "درگت" بنائی ان کی کہ انہیں جائے فرار ڈھونڈے نہ ملی۔

شوکت کی زندگی اسی قسم کے دلچسپ واقعات سے بھری پڑی ہے جن میں طنز بھی ہے مزاح بھی اور اداکاری کا آرٹ بھی! "منشی جی" اور "قاضی جی" تو صرف شوکت کی صوتی اداکاری سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن لوگوں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ شوکت سر سے پاؤں تک مجسم اداکار تھے۔

بسیار نویسی اور چند سانحات نے اگرچہ ادھر برسوں سے شوکت کے ارتقاءِ فن کی راہیں روک دی تھیں مگر ان کی فطری ذہانت و ظرافت نے بہت کچھ اس کمی کو پورا کر دیا ——— اور کہنے والے کہتے ہیں کہ مرتے دم تک ان میں وہی زندگی اور زندہ دلی باقی تھی۔

لسان القوم صفی لکھنوی نے اپنے چھوٹے بھائی ظریف لکھنوی کے انتقال پر جو طویل قطعہ کہا تھا اس کا مطلع شوکت کی بیماری اور موت سے بہت کچھ قریب نظر آتا ہے۔

جو اٹھ نہ سکتا تھا بے سہارے وہ شورِ محشر اٹھا کے اٹھا
ذرا یہ دیکھو ستم ظریفی، ہنسانے والا رلا کے اٹھا

مردِ خوش گفتار

نسیم ممتاز سیّد

چند تحریریں - بے بسی کے آنسو - لحد کا کتبہ - مرنے والے کے لیے دنیا کا یہی خراجِ عقیدت ہے - یہ بڑا رسمی انداز ہے - مگر دنیا کا دستور یہی ہے - یہی ہوتا آیا ہے - اور یہی ہوتا رہے گا - کئی ہستیاں ہمیں مر کر عزیز ہو جاتی ہیں - اور بہت سی ہستیوں کو ہم ان کی زندگی میں پرکھنے کی مہلت بھی نہیں پاتے - لیکن کسی کی زندگی ہی میں اُسے سمجھ لینا اور اس میں ڈوب جانا دراصل اُس شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا موزوں ترین طریقہ ہے - اور شوکت صاحب مرحوم کے ساتھ میرے تعلقات اسی انداز کے رہے - وقت کے ساتھ ساتھ تعلقات کے یہ نقوش زیادہ گہرے ہوتے گئے اور آخر وہ مقام آ گیا - جہاں دُوئی مٹ جاتی ہے - ان بھولی بسری باتوں میں جہاں کہیں آپ مجھے پائیں گے - تو اس میں میرا قصور نہیں - بلکہ اس کی تمام تر ذمہ داری مرحوم پر آتی ہے - جن کے خلوص اور جن کی شفقت نے بتدریج مجھے ان سے بہت قریب کر دیا تھا -

۲ مارچ کو راولپنڈی سے آنے والے ایک دوست نے پیغام دیا - کہ شوکت صاحب شام کے جہاز سے ایک مشاعرے میں شرکت کرنے لاہور پہنچ رہے ہیں - چونکہ اگلی ہی صبح وہ واپس چلے جائیں گے - اس لیے ان کی خواہش ہے - کہ میں آج رات کو اوپن ایئر تھیئٹر میں ضرور ملوں - میرا ارادہ مشاعرے میں جانے کا نہ تھا - لیکن شوکت صاحب کا پیغام ملنے کے بعد شرکت ضروری معلوم ہوئی - خصوصاً اس خیال سے کہ ان سے آخری ملاقات کوئی آٹھ مہینے پہلے ہوئی تھی - اور ان کا لاہور آنا کچھ ایسا آسان بھی نہ تھا -

مشاعرے کا وقت غالباً شام کے سات بجے دیا گیا تھا - میں کوئی آٹھ بجے پہنچا - لیکن مشاعرے کی کارروائی نو بجے تک بھی شروع نہ ہوئی - شعرا اسٹیج پر بیٹھے نظر آئے - لیکن ان میں شوکت صاحب کہیں دکھائی نہ دیئے - وقت گزارنے کے خیال سے میں چند احباب کے ساتھ اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا - نہ جانے شوکت صاحب کس وقت پہنچ گئے - میں نے جب دیکھا تو یہ صدرِ مشاعرہ محترم عبدالوحید خاں صاحب کے ساتھ بیٹھے اسٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے -

مشاعرہ کوئی رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے ختم ہوا - تو میں اُن سے ملنے اسٹیج پر پہنچا - ان سے جولائی ۶۲ء کے بعد ملاقات ہوئی تھی - اُس وقت کے شوکت تھانوی اور موجودہ شوکت تھانوی میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہوا - نحیف و نزار شدید کھانسی میں مبتلا اور بجھے بجھے - یوں محسوس ہوا - گویا یہ شوکت تھانوی نہیں - بلکہ وہ پُتلا ہیں جسے کسان کھیتوں میں

اس لیے گاڑ دیتے ہیں۔ کہ پرندے فصل کے قریب نہ پھٹکنے پائیں۔ شوکت صاحب کا شمار گو موٹے تازے اور کسرتی جسم کے لوگوں میں کبھی نہ تھا۔ لیکن بحیثیتِ مجموعی ان کی صحت عام آدمیوں سے ہمیشہ بہتر ہی دیکھنے میں آئی تھی۔ بلکہ یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ اپنی صحت اور اپنے جسم کے اعتبار سے یہ اپنی اصلی عمر سے کم عمر ہی دکھائی دیتے۔ ان کی صحت کو اس درجہ ابتر حالت میں دیکھ کر دل کو دھکا سا لگا۔ منہ سے تو کچھ نہ بولا۔ دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ شوکت صاحب بلا کے ذہین انسان تھے۔ جو بات میری زبان سے نہ نکل سکی۔ وہ انھوں نے میری نظروں سے بھانپ لی۔ کہنے لگے "کیا دیکھ رہے ہو بھی نا کہ میں بہت کمزور ہو گیا ہوں۔ لیکن پریشان نہ ہو۔ میں ابھی زندہ رہوں گا۔ تمھاری شادی میں شرکت کروں گا۔ سہرا پڑھوں گا جس کے چند شعر لکھ بھی چکا ہوں۔"

ان کا دھیان اس طرف سے ہٹانے کو میں نے ادھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ شوکت صاحب نے میرے والد محترم اور بھائی جان کی خیریت پوچھی۔ میں نے کہا "وہ دونوں تو خود مجھ سے اکثر آپ کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ کہ آپ کب لاہور آ رہے ہیں۔ لہٰذا راولپنڈی جانے سے پہلے کھانا ہمارے ساتھ کھائیے۔" اس پر انھوں نے اپنی مجبوریاں بیان کیں اور بتایا۔ کہ اگلی ہی صبح واپسی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چونکہ اگلے دن اتوار تھی۔ اس لیے میں نے سمجھایا۔ کہ "صبح جا کر کیا کیجیے گا شام کے جہاز سے چلے جائیے گا۔" اتنی دیر میں محترم سید محمد جعفری صاحب بھی پہنچ گئے۔ بصد مشکل شوکت صاحب اس بات پر رضامند ہوئے کہ اگر اُنھیں اور جعفری صاحب کو میں ریل کار میں سیٹیں دلا دوں۔ تو وہ دونوں ہمارے ساتھ دوپہر کا کھانا کھا کر تین بجے روانہ ہو جائیں گے۔ رات کے ایک بجے کے قریب ہم تینوں اوپن ایئر تھیٹر کی پہاڑی سے نیچے اُترے۔ پلازا سینما کے چوک تک پیدل پہنچے ہوں گے کہ ایک موٹر رکشا مل گئی۔ میں نے ان دونوں کو اس میں روانہ کیا اور اگلی صبح دس بجے ان سے ملنے کا پروگرام بنایا۔

شوکت صاحب اور جعفری صاحب کو رخصت کر کے میں چہل قدمی کرتا اپنے گھر روانہ ہوا۔ گھر پہنچنے تک میری آنکھوں کے سامنے ۴۷ء سے ۵۷ء تک کا وہ طویل عرصہ بجلی کی سی سُرعت سے گھوم گیا۔ جب میرا بیشتر وقت شوکت صاحب کی پُر لطف صحبت میں گزرتا تھا۔ یاد نہیں آ رہا۔ ان سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی۔ غالباً تقسیم ہند سے ذرا پہلے یہ پنچولی آرٹ پکچرز میں کچھ عرصہ ملازم رہے۔ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ چند ہم جماعتوں نے فلم "شیریں فرہاد" کی شوٹنگ دیکھنے کی فرمائش کی۔ اور میں انھیں مسلم ٹاؤن والے اسٹوڈیو لے گیا۔ اتفاق سے اُسی دن سٹ پر کمپنی کے مالک سیٹھ دلسکھ۔ ایم پنچولی (آنجہانی) بھی موجود تھے۔ انھوں نے میرا تعارف شوکت صاحب سے کرایا۔ جو اس فلم کے مکالمے اور گانے لکھ رہے تھے۔ بحیثیت مزاح نگار میں ان کا نام بچپن سے سنتا چلا آیا تھا۔ اور ان کا مدّاح تھا۔ لہٰذا ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ تعارف ہو جانے کے بعد شوکت صاحب نے میرے متعلق فرمایا۔ کہ میری ان کی کچھ عزیزداری بھی ہوتی ہے اسی طرح چند اور مختصر ملاقاتیں ہوئی ہوں گی۔ جن کی تفصیل مجھے یاد نہیں۔

۴۷ء کے نومبر میں جب ریڈیو پاکستان لاہور سے قومی تعمیر کا ایک پروگرام "پاکستان ہمارا ہے" نہایت پابندی اور باقاعدگی سے روزانہ نشر ہونا شروع ہوا۔ تو بحیثیت مصنف اور "ریڈیو وائس" مجھے ان پروگراموں میں اکثر

حصہ لینے کا موقع ملا۔ شوکت صاحب بھی اس پروگرام سے منسلک تھے۔ لہٰذا ہر دوسرے تیسرے ان سے ملاقات ہوتی۔ لیکن ان ملاقاتوں میں بزرگی اور خوردی کی حدِ فاصل قائم رہی۔

شوکت صاحب انتہائی جامہ زیب انسان تھے۔ عام طور پر شاعروں اور ادیبوں کا خیال آتے ہی ذہن منتقل ہو جاتا ہے کسی ایسے شخص کی طرف جس کی داڑھی بڑھی ہوئی ہو۔ شیو بنا نہ ہو۔ کپڑوں کی طرف سے انتہائی لاپرواہی برتی جا رہی ہو۔ لیکن شوکت صاحب اس اعتبار سے نہ ادیب تھے نہ شاعر۔ کپڑے کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی پہن لی۔ تو وہ ان پر سج گئی۔ سوٹ پہنا تو وہ اُن پر کھل گیا۔ اپنے لباس کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کا خیال رکھتے تھے۔ کسی کھانے پر جانا ہوا۔ کپڑے تبدیل کر لیے۔ لیکن عین وقت پر خیال آیا کہ موزے یا ٹائی کا رنگ سوٹ کے لیے موزوں نہیں۔ اُسی وقت بھاگے بھاگے مال روڈ۔ کمرشل بلڈنگ یا انارکلی پہنچے۔ اور جب تک موزوں ٹائی یا موزہ حاصل نہ کر لیا۔ کھانے پر نہ گئے۔

شوکت صاحب اس قسم کا عملی مذاق بہت کم کرتے تھے۔ ان کی شوخیاں زیادہ تر پھبتی کسنے اور فقرہ چست کرنے تک محدود ہوتی تھیں۔ "قاضی جی" کا پروگرام ریڈیو پر نیا نیا شروع ہوا تھا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ سننے والے اسے غیر معمولی دلچسپی سے سنتے اور قاضی جی کا رول ادا کرنے والے شوکت تھانوی کو دیکھنے اور ان سے ملنے کے خواہشمند رہتے۔ سردیوں کی ایک شام تھی۔ ہم لوگ ریہرسل سے فارغ ہو کر ایک نمبر اسٹوڈیو میں آ گئے۔ پروگرام شروع ہونے میں ابھی پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔ کہ شوکت صاحب کے ایک بہت قدیم اور عزیز دوست اسٹوڈیو میں تین خواتین کو لے کر آن پہنچے۔ فرمانے لگے "بھئی شوکت! تم نے تو مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ "قاضی جی" کا پروگرام کیا شروع کیا۔ کہ میں عذاب میں مبتلا ہو گیا۔ جسے میرے تمھارے تعلقات کا علم ہے۔ وہ بس یہی فرمائش کرتا ہے کہ ہمیں "قاضی جی" سے ملوا دو۔" یہ کہہ کر پہلے تو انھوں نے شوکت صاحب کا تعارف ان خواتین سے کرایا۔ اس کے بعد فرداً فرداً ان خواتین کو ان سے متعارف کراتے ہوئے بولے "ان سے ملو۔ یہ ہیں ممتاز۔ اور یہ ہیں ان کی صاحبزادی امتیاز……" ابھی تیسری خاتون کا نام نہ لینے پائے تھے کہ شوکت صاحب جھٹ بول اُٹھے "ان کا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں۔ بس میں سمجھ گیا۔ ان کا نام ہوگا "دار الاشاعت" (اشارہ میرے دادا جان مرحوم و مغفور شمس العلماء مولانا سید ممتاز علی صاحب۔ ان کے صاحبزادے یعنی میرے چچا سید امتیاز علی صاحب تاج اور ہمارے ادارے "دار الاشاعت پنجاب" کی طرف تھا) وہ خواتین تو غالباً اس نکتے کو سمجھ نہ سکیں۔ لیکن جو صاحب تعارف کرانے آئے تھے۔ وہ چونکہ اس لطیفے کے پس منظر سے بخوبی واقف تھے۔ لہٰذا بے انتہا محظوظ ہوئے۔

شوکت صاحب نے بُلبل کا سا دل پایا تھا۔ دوسروں کی تکلیف سے بہت متأثر ہو جاتے۔ سنہ ۵۸ء کی گرمیوں میں خدا بخشے میری والدہ ماجدہ مرحومہ مرض الموت میں گرفتار ہوئیں۔ اُس تعلقِ خاطر کے پیشِ نظر جو شوکت صاحب کو ہمارے خاندان بھر سے تھا۔ یہ اکثر اُن کی مزاج پرسی کے لیے آتے۔ وہ کینسر کی مریضہ تھیں۔ ڈاکٹر۔ حکیم۔ ہومیو پیتھس جواب دے چکے تھے۔ لیکن شوکت صاحب آتے۔ گھنٹوں بیٹھتے۔ لطیفے سناتے۔ باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتے۔ نتیجہ یہ کہ چارہ گروں کی دوائیں

اور چاہنے والوں کی دعائیں جہاں بے کار ثابت ہوتیں۔ وہاں شوکت صاحب کی شعبدہ گری کام کر جاتی۔ چاہے تھوڑی ہی دیر کے لیے سہی۔ والدہ مرحومہ اپنی بیماری اور تکلیف بھول جاتیں اور ان کی طبیعت بشاش ہو جاتی۔

۲۴ ستمبر ۵۸ء کو والدہ ماجدہ نے رحلت فرمائی۔ میرے دل پر اس صدمے کا شدید اثر تھا۔ خود شوکت صاحب بھی کچھ کم متاثر نہ تھے۔ اتوار کو ان کا انتقال ہوا۔ پیر کو انھیں سپردِ خاک کیا گیا۔ اور پیر ہی کے دن شوکت صاحب کا پروگرام "قاضی جی" نشر ہوتا تھا۔ غالباً براڈکاسٹنگ کی تاریخ میں یہ پہلا دن تھا کہ لاہور میں ہوتے ہوئے شوکت صاحب پروگرام نشر نہ کر سکے۔

چند ہی دنوں بعد اس غم و اندوہ سے نجات دلانے کو انھوں نے اپنے مقبول پروگرام "قاضی جی" میں مجھے بحیثیت ریڈیو وائس باقاعدہ ہر ہفتے بک کرنا شروع کیا اس کے ساتھ ہی مشاعروں اور ادبی محفلوں میں زبردستی اپنے ساتھ لے جانا معمول بنا لیا۔ کسی نہ کسی کام کے بہانے اکثر شام کو اپنے گھر بلا لیتے۔ اور ان کی تمام تر کوشش ہوتی کہ مجھے بہلاتے رہیں۔

مجھے علم نہ تھا۔ کہ ایک زمانے میں والدِ محترم ان کے یہاں اکثر جاتے تھے۔ اس کا ذکر کبھی ابا جان قبلہ نے مجھ سے نہ کیا۔ نہ شوکت صاحب نے مجھے بتانا ضروری سمجھا۔ اتفاق سے میرے اور ان کے جانے کے اوقات مختلف ہوتے تھے۔ گڑھی شاہو میں ایک نیا فلیٹ بنا تھا۔ جس کی بالائی منزل میں شوکت صاحب رہتے تھے۔ ایک شام جو میں وہاں پہنچا۔ تو جگر صاحب مرحوم بھی بیٹھے تھے۔ شوکت صاحب جب موڈ میں ہوتے اور باتوں کا سلسلہ شروع کرتے۔ تو ایک تار سا بندھ جاتا۔ نیچے کسی کار کا ہارن سنائی دیا۔ ہم تینوں باتوں میں ایسے منہمک تھے کہ ادھر دھیان ہی نہ گیا۔ دوبارہ اور سہ بارہ ہارن بجا۔ لیکن ہمیں خیال تک نہ آیا۔ کہ ہارن شوکت صاحب کو بلانے کے لیے بجایا جا رہا ہے۔ چار پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ دیکھتا کیا ہوں کہ ابا جان قبلہ تشریف لا رہے ہیں۔ شوکت صاحب انھیں بھائی جان کہتے اور ان کا بے حد احترام کرتے تھے انھیں جو آتے دیکھا۔ تو بچھ گئے۔ بیگم کو آواز دی۔ "جواد زہرہ کے بجائے وہ انھیں ہمیشہ "جو" کہتے تھے) بھائی جان تشریف لائے ہیں۔ جلدی سے سکوئیش بنا کر لاؤ۔ اور دیکھو پان بھی لگا کر لانا" ابا جان نے جو مجھے بیٹھے دیکھا۔ تو فرمانے لگے "اچھا جناب بھی آئے ہوئے ہیں" ادھر شوکت صاحب تھے۔ کہ کھلے جا رہے تھے۔ کہنے لگے "بھائی جان۔ کچھ نہ پوچھیے آج آپ کے آنے سے کس قدر خوشی ہوئی ہے" اس پر ابا جان بولے "بھئی۔ میرے آنے سے تم کب خوش نہیں ہوئے۔ جو آج کی خوشی کو کوئی خاص اہمیت دوں" شوکت صاحب فرمانے لگے "اس میں تو کوئی شبہ نہیں بھائی جان۔ آپ کے تشریف لانے سے ہمیشہ دلی خوشی ہوئی۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ آج جو خاص خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ وہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی" ابا جان نے اس "خاص خوشی" کی وجہ پوچھی۔ تو وہ بولے "خوشی اس بات کی ہے بھائی جان کہ میں شوکت تھانوی ہوں۔ کوئی طوائف نہیں۔ ورنہ باپ بیٹے آج ایک ہی "کوٹھے" پر پکڑے جاتے۔ شوکت صاحب کا یہ کہنا تھا کہ محفل زعفران زار بن گئی۔ جگر صاحب اور خود ابا جان نے انھیں بہت داد دی۔

شوکت صاحب کو جب کوئی بات سوجھتی۔ کوئی فقرہ چست کرنا چاہتے۔ کوئی پھبتی کسنا چاہتے۔ تو پھر چھوٹے

بڑے کی تمیز نہ کرتے۔ ان کی بات کرنے کا انداز چونکہ ہمیشہ تفریحی ہوتا۔ قصداً کسی کی دل آزاری نہ کرتے تھے۔ لہٰذا ان کے بزرگ بھی ان کی فقرے بازی کو محسوس نہ کرتے۔

لیکن ایک عجیب بات یہ تھی۔ کہ دوسروں سے مذاق کرنے میں تو یہ حد سے بھی تجاوز کر جاتے۔ لیکن خود دوسرے کا مذاق برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی شخصیت کا ایک عجیب و غریب پہلو یہ تھا۔ کہ خود اپنے اوپر بھی خوب پھبتیاں کستے۔ اور جی بھر کے کستے۔ ایک روز میں ان کے گھر شام کو پہنچا۔ برسات کا زمانہ تھا۔ میرے پہنچتے ہی شدید بارش شروع ہو گئی۔ بارش کی حد تک تو شوکت صاحب لطف اندوز ہوتے رہے۔ لیکن جب بہت خوفناک قسم کی کڑک اور بجلی کی چمک شروع ہوئی۔ تو یہ بہت گھبرائے۔ اپنی بیگم کو اور مجھے ہدایت فرمائی۔ کہ کھڑکیوں کے پردے پورے کھینچ دیئے جائیں۔ ان کی بیگم کے لیے تو ممکن ہے یہ کوئی نئی بات نہ ہو گی۔ لیکن مجھے بہت تعجب ہوا۔ میں نے بیگم شوکت سے پوچھا "آخر یہ بات کیا ہے"۔ انھوں نے جواب دیا "یہ ان کی آج کی نہیں ہمیشہ کی عادت ہے۔ کہ جہاں بجلی چمکی اور ان کے اوسان خطا ہوئے"۔ میں نے شوکت صاحب سے وجہ پوچھی۔ تو نہایت معصومیت سے فرمانے لگے۔ "آپ بھی خوب چیز ہیں۔ کیا آپ نے نہیں سنا کہ بجلی ہمیشہ سیاہ رنگ کی چیز پر گرتی ہے"۔ ان کے رنگ کے پیشِ نظر اگر یہی بات کوئی دوسرا کہہ دیتا۔ تو نہ جانے ان کے غصے کا پارہ کہاں پہنچتا۔ لیکن اپنے رنگ کے بارے میں خود فقرہ چست کئے بغیر نہ رہے۔

احمد سلمان صاحب ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان (سابق) نے کراچی میں نئی کوٹھی بنائی تھی۔ انھوں نے دو ایک بار فرمائش کی۔ کہ کسی ذریعے سے انھیں مختلف قسم کے گلاب کے پودے کراچی بھیج دوں۔ میں ابھی اسی فکر میں تھا کہ کوئی جان پہچان والا کراچی جاتا ملے۔ تو اس کے ہاتھ پودے روانہ کر دوں۔ کہ ایک دن بالکل خلافِ توقع سلمان صاحب کی صاحبزادی اور میری عزیزہ بہن زرینہ کا خط پشاور سے بیک وقت مجھے اور شوکت صاحب کو ملا۔ کہ لاہور کی نرسری سے گلاب کی جس قدر اچھی سے اچھی قسمیں مل سکیں۔ ان کے پودے ہم دونوں تیار رکھیں۔ خصوصاً کالے گلاب کے۔ پشاور سے واپس کراچی جاتے ہوئے یہ لوگ لاہور نہ ٹھہریں گے۔ واپسی کی تاریخ اور ٹرین سے یہ ہمیں مطلع کر دیں گی۔ پودے انھیں لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچا دیئے جائیں۔ آخر ایک دن زرینہ کا خط پھر ہم دونوں کو ملا۔ خط پہنچتے ہی شوکت صاحب کا فون آیا کہ میں ان سے فوراً ملوں۔ تاکہ لاہور کے تمام نرسریوں کو کھنگالا جائے۔ اور اچھے سے اچھے گلاب کے جو پودے دستیاب ہو سکیں۔ وہ فراہم کئے جائیں۔ سارا دن ہم دونوں تلاش میں مارے مارے پھرے۔ جس نرسری پر جا کر "کالے گلاب" کے پودے طلب کریں۔ تو نرسری والا ہمارا منہ دیکھے۔ گویا اس سے کوئی ایسی چیز طلب کی جا رہی ہے جس کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ کالے کے علاوہ باقی جس قدر قسمیں ممکن ہو سکتی تھیں ہم نے حاصل کر لیں۔

سلمان صاحب قبلہ تو میرے بے انتہا شفیق بزرگ تھے۔ انھیں سمجھایا جا سکتا تھا۔ لیکن زرینہ سے نمٹنا آسان نہ تھا۔ ایک طرف وہ میری عزیز بہن تھیں تو دوسری طرف شوکت صاحب کی لاڈلی بھتیجی۔ میں نے شوکت صاحب سے کہا۔ کہ "آپ کی اور میری دن بھر کی دوڑ دھوپ رائگاں گئی۔ زرینہ بڑی نٹ کھٹ ہیں۔ اچھے سے اچھے جس قدر پودے

ہم نے حاصل کر لیے۔ ان کی داد تو ملے گی نہیں۔ محض کالا گلاب چونکہ نہیں ملا۔ بس شکایت اس کی کی جائے گی۔" شوکت صاحب بولے "میاں یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

کہنے کو تو شوکت صاحب نے مجھے اطمینان دلا دیا۔ لیکن فی الواقعی میں اس خیال سے سہم رہا تھا۔ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ وقت مقررہ پر ہم دونوں اسٹیشن پہنچ گئے۔ عزیزہ زرینہ جو دیکھا کہ دو تین قلیوں کے سروں پر پودوں کی ٹوکریاں لدی ہوئی ہیں۔ تو بہت خوش ہوئیں۔ اور چھوٹتے ہی انھوں نے سوال کیا "نسیم بھائی! کالے گلاب کے پودے بھی لائے" میں نے فوراً جواب دیا "یہ آپ اپنے شوکت چچا سے پوچھیے" شوکت صاحب نے جو نفی میں جواب دیا۔ تو زرینہ نے ٹھنکنا اور مچلنا شروع کیا "یہ جائیے ہم آپ سے نہیں بولتے۔ ایک ذرا سی فرمائش کی تھی۔ نہ بھائی سے پوری ہوئی۔ نہ چچا سے" شوکت صاحب نے برجستہ جواب دیا "سارا لاہور چھان مارا۔ کالا گلاب کہیں نہیں ملا۔ کالا گلاب کہیں نہیں ملا۔ کالا گلاب دیکھنے کی ایسی ہی خواہش ہے زرینہ تو سمجھ لو میں گملے میں اگا کھڑا ہوں" شوکت صاحب کا جواب سننے سے پہلے کہاں تو زرینہ بسور رہی تھیں۔ کہاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اور ان کی شکایت رفع ہو گئی۔

شوکت صاحب کی متنوع شخصیت کا ایک اور پہلو میں نے دیکھا۔ دوسرے کے کام کرنے کے سلسلے میں یہ ہر وقت تیار رہتے تھے۔ لوگوں کی سفارشیں کرتے پھرتے ہیں۔ ان کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ ان کی ذات سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا۔ بہت سے ضرورت مند انھیں بتائے بغیر کسی دفتر میں چلے جاتے۔ اور ظاہر کرتے کہ شوکت صاحب نے انھیں بھیجا ہے۔ اور اپنا کام نکال لیتے۔ لیکن خود اپنی ذات کے لیے انھوں نے کبھی کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہ کیا۔ ریڈیو کی ملازمت چھوڑنے اور اخبار "جنگ" سے منسلک ہونے کے بعد لاہور میں ان کے لیے ایک بہت اچھی اور معقول سرکاری ملازمت حکومت کے پیشِ نظر تھی۔ یہ کسی نجی کام سے دو ایک دن کے لیے لاہور آئے۔ ایک بڑے سرکاری افسر کو کہیں سے ان کے آنے کا پتہ چل گیا۔ انھوں نے فوراً شوکت صاحب کو بلایا۔ اور اس ملازمت کی پیشکش کی۔ ساتھ ہی مشورہ دیا۔ کہ وہ متعلقہ منسٹر اور حکام سے مل کر زبانی بات چیت کر لیں۔ شوکت صاحب ان سے تو یہ کہہ کر رخصت ہوئے۔ کہ وہ فوراً منسٹر صاحب سے ملتے ہیں۔ لیکن ان سے ملنے کے بجائے سیدھے ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ اور کراچی کا رُخ اختیار کیا۔

۵۴ء کی مارچ میں محمود نظامی صاحب مرحوم لاہور ریڈیو اسٹیشن کے ریجنل ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ ان کی طبیعت میں بھی بلا کی شوخی تھی۔ پھبتی کسنے اور فقرہ چُست کرنے میں کسی سے کم نہ تھے۔ ہم دونوں کے حلقے میں نظامی صاحب بھی شامل ہو گئے۔ اور ہمارا یہ "اتحادِ ثلاثہ" اگست ۵۷ء تک قائم رہا۔ شوکت صاحب اور نظامی صاحب کھانے کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ادھر شام ہوئی۔ اُدھر ہم تینوں اور اُن دونوں کی بیگمات کام و دہن کی سیرابی کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔ کسی نے بتایا۔ کہ چونے منڈی کی کسی دکان پر کباب بہت اچھے بنتے ہیں۔ تو ہم سب بلا سوچے سمجھے ادھر روانہ ہو گئے۔ دہلی دروازے کے اندر داخل ہو کر معلوم ہوا۔ کہ بازار میں کار نہیں جا سکتی۔ تو اسے کسی مناسب جگہ پارک کر کے ہم تینوں پیدل چل کھڑے ہوتے۔ دکان پر پہنچ کر گرم گرم کباب پلیٹوں میں رکھواتے اور کار کا رُخ کرتے۔ کباب کی تیز مرچیں آتشِ زیر پا کرتیں۔ تو اسے رفع کرنے کو کسی مشہور حلوائی کی دکان کا سہارا لیتے۔

اس زمانے میں رمضان بھری گرمیوں یعنی مئی جون کے مہینے میں آیا۔ ہم تینوں نہایت پابندی سے روزہ رکھتے۔ دو چار دن کے بعد گرمی کی شدت ہمت توڑ دیتی۔ لیکن ہم تینوں برابر اس فکر میں رہتے۔ کہ روزہ نہ رکھنے کی پہل کرنے میں بارش کا پہلا قطرہ کوئی اور بنے۔ اور باقی دونوں اس کی تقلید کریں۔ مگر تینوں اپنی ہٹ کے ایسے پکے ثابت ہوتے کہ روزہ رکھتے رکھتے پورا رمضان شریف گزر جاتا۔ گرمیوں کے روزوں میں صبح سے بارہ ایک بجے کا وقت تو جوں توں دفتری مصروفیات میں گزر جاتا۔ لیکن دوپہر سے شام کرنی جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا۔ نہ جانے ہم میں سے کس نے یہ تجویز پیش کی۔ کہ روزانہ سہ پہر کا میٹنی شو دیکھا جائے۔ تجویز کا پیش ہونا تھا۔ کہ وہ منظور ہو گئی۔ اور اگلے ہی دن سے نہایت پابندی اور باقاعدگی سے اس پر عمل درآمد بھی شروع ہو گیا۔ ادھر گھڑی نے تین بجائے۔ ادھر ہم تینوں اور ان دونوں کی بیگمات نے سینما کا رخ کیا۔ مے سے غرض نشاط نہ تھی۔ مقصد صرف وقت گزارنا تھا۔ فلم اچھی ہوئی تو لطف اندوز ہو گئے۔ مزا نہ آیا تو اونگھ کر اور سو کر وقت گزارا۔ فلم ختم ہوتے ہوتے افطاری کا وقت ہو جاتا تھا۔

افطار کے بعد نقاہت اور اضمحلال محسوس ہوتا۔ تو اسے رفع کرنے کو بھی ڈرائیو اور سیر و تفریح کا سہارا لیا جاتا۔ نظامی صاحب نے کولمبس بن کر نہ جانے کیسے ڈھونڈ نکالا کہ دیال سنگھ کالج کے دروازے کے پاس اور دل محمد روڈ کے نکڑ پر ایک آئس کریم بنانے والا اپنی دوکان ایک ریڑھی پر ہر شام سجاتا ہے۔ بقول نظامی صاحب لاہور بھر میں وہ آئس کریم سب سے اچھی اور سب سے سستی تھی۔ یہ معلوم ہونے کی دیر تھی۔ کہ ہم پانچوں نے ہر شام وہاں دھاوا بولنا شروع کر دیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ آئس کریم اچھی بھی تھی اور سستی بھی۔ لیکن نہ جانے وہ اس میں ہر روز ایک ہی ایسنس ڈالتا یا کیا کرتا تھا کہ مزا روزانہ یکساں ہوتا۔ شوکت صاحب کہتے تھے یہی بات علی گڑھ یونیورسٹی کے ہوسٹل کے کھانے میں تھی۔ مرغی سے لیکر ہر موسمی سبزی تک گوشت میں پکتی تھی۔ لیکن کھانے میں مطلق فرق محسوس نہ ہوتا تھا۔

جب روزانہ ایک ہی طرح کی آئس کریم کھا کھا کر تنگ آ گئے۔ تو ہم نے آئس کریم والے سے کہا۔ کہ "بھئی آم کی آئس کریم کیوں نہیں بناتے"۔ لیکن وہ ٹالتا رہا۔ غالباً اس لیے کہ آموں کا سیزن شروع نہ ہوا تھا۔ اور وہ خاصے مہنگے تھے۔ ایک دن جو ہم پہنچے۔ تو آئس کریم کھا کہ واقعی بہت لطف آیا۔ اسے داد دی اور اس سے پوچھا "اس میں خاص بات کیا ہے؟" وہ بولا "صاحب آج میں نے اس میں بہت سے آم "گبرے" ہیں"۔ شوکت صاحب برجستہ بولے۔ "نظامی صاحب۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام کی مثل کا مفہوم دراصل آج سمجھ میں آیا"۔ شوکت صاحب کو اس کے "گبرے" کہنا بہت پسند آیا۔ اور سچ پوچھئے تو آئس کریم سے زیادہ وہ اس اصطلاح سے لطف اندوز ہوئے۔ عرصے تک ہم تینوں ملانے یا ڈالنے کے مفہوم کو "گبرے" ہی کہتے رہے۔

ہم تینوں کی دوستی اور قرب لوگوں کے لیے حیرت کا موجب تھی۔ خصوصاً ان دونوں سے میری قربت۔ کہ میں نہ ان کا ہم سن۔ نہ ان دونوں کی طرح علم و ادب کی دنیا میں میرا نام۔ بہرحال دوستی تھی۔ اور دونوں کے آخری دم تک قائم رہی۔ اب آپ انہیں میرے بزرگ نما دوست یا دوست نما بزرگ کچھ ہی سمجھ لیجئے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں۔ ان کی بیگمات۔ ان کے بچے۔ ان کے بزرگ سب کے سب مجھے "بھائی" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ میں جگت بھائی کیوں کر بن گیا

یہ معمہ آج تک حل نہ ہو سکا۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ کہ شوکت صاحب دوسرے کا مذاق برداشت کرنے میں حوصلے سے کام نہ لیتے تھے۔ لیکن کوئی شخص ان کی ذات پر حملے کئے بغیر اگر کوئی اچھی بات کہتا تو دل بھر کے اس کو داد دیتے۔ ایک دن میں یوں ہی بغیر کسی پروگرام کے ان سے ملنے ریڈیو اسٹیشن پہنچ گیا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ انھیں کہیں دوپہر کے کھانے پر جانا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ خود جلدی میں ہیں۔ تو میں نے اٹھنا چاہا۔ پوچھنے لگے "کیسے آئے ہو؟ کار میں؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ تو کہنے لگے بہت اچھے موقع سے آئے۔ اس گرمی میں کھانے پر جانے کی ہمت تانگے میں نہ ہو رہی تھی۔ کیا اتنی تکلیف کرو گے کہ مجھے لفٹ دیتے جاؤ۔" میں نے فوراً جواب دیا "شوکت صاحب! آپ کو کب لفٹ "نہیں دی ہے"۔ شوکت صاحب بہت ذہین آدمی تھے۔ فوراً سمجھ گئے کہ میری مراد صرف کار کی لفٹ سے نہیں۔ بلکہ دوسری "لفٹ" سے بھی ہے جسے وہ بالعموم "گھاس ڈالنا" کہتے تھے۔ بہت خوش ہوئے۔ اور اکثر دوستوں سے میرے اس جملے کی تعریف کی۔

شوکت صاحب کی طبیعت میں نفاست بہت تھی۔ نہایت صاف ستھرا اور اجلا لباس اور آئینے کی طرح چمکتے جوتے پہنتے تھے۔ ایک مشہور شاعر لباس اور ذوق کے اعتبار سے بالکل اُن کے برعکس تھے۔ عجیب ہیئت کذائی بنائے رکھتے۔ ناتراشیدہ داڑھی۔ اُلجھے ہوئے بال جو نہ جانے کتنے عرصے سے کنگھی سے بے نیاز تھے۔ کوٹ پہننے کے بجائے اکثر کمبل اوڑھ کر مشاعروں میں آتے۔ اُن صاحب کی ایک عجیب عادت یہ تھی۔ کہ کلام کم سناتے اور سامعین سے فالتو باتیں زیادہ کرتے تھے۔ ایک مشاعرے میں مجھے شوکت صاحب کے ساتھ جانے کا اتفاق ہوا۔ اور یہ حسبِ معمول اسٹیج سیکرٹری تھے۔ جب اُن صاحب کو مائیکروفون پر بلایا۔ تو ایک فوٹو گرافر اپنا کیمرہ اور فلیش لائٹ لے کر لپکا۔ کہ ان کی تصویر اتارے۔ شاعر صاحب فرمانے لگے "ہائیں۔ ہائیں۔ یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔ بھئی میری تصویر لے کر کیا کیجئے گا"، شوکت صاحب نے فوراً جملہ چست کیا "تصویر اس لیے اتار رہے ہیں کہ ایک تو بچوں کو دکھا کر ڈرائیں گے۔ دوسرے جو لوگ صفائی کا خیال نہیں رکھتے انھیں دکھا کر عبرت دلائیں گے"۔ اُن کی ہیئت کذائی کے پیش نظر واقعی یہ بات بالکل درست تھی۔ لٹوں کی صورت میں بکھرے ہوئے بال۔ علی الحساب بڑھی ہوئی داڑھی۔ چہرہ اور بال گرد سے اٹے ہوئے۔ نہایت لحیم شحیم۔ اس پہ ایک نہایت موٹا کمبل اوڑھے ہوئے۔ برا ماننے کے بجائے وہ صاحب خود ہی بے اختیار ہنس پڑے۔ اور سامعین کی ہنسی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔

شوکت صاحب نے ڈریس سوٹ بھی بنوا رکھا تھا۔ لیکن بیچاروں کو اس کے استعمال کا موقع بہت کم ملتا۔ پاکستان بن جانے کے بعد ایسے پُر تکلف ڈنر بہت کم ہوتے۔ جہاں ڈنر جیکٹ کی پابندی ہوتی۔ لہذا شوکت صاحب اسے سال میں ایک مرتبہ پہننے کا موقع ضرور نکال لیتے۔ دو تین سال ہمارا یہ معمول رہا۔ کہ ۳۱ر دسمبر کو رات کو شوکت صاحب ڈریس سوٹ زیب تن کرتے۔ اور ہم دونوں ریلوے کے برٹ انسٹی ٹیوٹ جاتے اور وہاں نئے سال کی آمد مناتے۔ ان کی تفریحات بہت معصوم قسم کی تھیں۔ دو تین گھنٹے کے لیے ڈنر سوٹ پہنتے۔ بو باندھتے۔ رات کے ساڑھے بارہ ایک بجے تک برٹ کے ہال میں دوسروں کو ناچتے۔ شراب پیتے۔ اودھم مچاتے اور گرتے پڑتے دیکھ کر خوش ہو جاتے۔

غالباً ۵۵ء میں ایک دن میں شوکت صاحب سے ملنے گیا۔ کہ اُن سے اپنے رسالے "پھول" کو بہتر اور دلچسپ بنانے کے سلسلے میں مفید مشورے لوں۔ شوکت صاحب نے نہ صرف بہت قیمتی مشورے دیئے بلکہ اس کے ساتھ ہی "پھول" میں مضمون لکھنے کا وعدہ بھی فرمایا۔ اس کی کتابت اور طباعت کا پروگرام پوچھا۔ کہ کس دن تک مضمون پہنچ جائے۔ تو اُس ہفتے کے رسالے میں بروقت چھپ سکتا ہے۔ مشوروں کی حد تک تو خیر میں آمادہ تھا۔ کہ ان میں سے جو قابلِ عمل دکھائی دیا۔ اُسے ضرور کام میں لاؤں گا۔ لیکن جب اُنھوں نے مضمون لکھنے کی پیش کش کی۔ تو صاف بات ہے۔ میں ذرا پریشان سا ہو گیا۔ ان کے متعلق لوگوں کا عام تاثر یہی تھا۔ کہ لکھنے لکھانے کے معاملے میں وہ انتہائی "کاروباری" ادیب ہیں اور بغیر معاوضہ لیے اپنے عزیز ترین عزیز کے لیے بھی نہیں لکھتے۔ "پھول" بچوّں کا رسالہ تھا۔ اس کے محدود بجٹ میں سے شوکت صاحب جیسے ادیب کے لیے اُن کے شایانِ شان معاوضے کی ادائیگی میرے لیے ممکن نہ تھی۔ اس سے پہلے کبھی کبھار سالگرہ نمبر یا کسی خاص نمبر کے لیے میں نے اُن سے فرمائش کی تھی۔ تو انھوں نے ازراہِ کرم بغیر معاوضہ لیے مضمون میرے حوالے کر دیا تھا۔ اب جو انھوں نے باقاعدگی سے لکھنے کی سُنائی۔ تو میں ڈر سا گیا۔ مناسب یہی معلوم ہُوا۔ کہ انھیں یاد دہانی نہ کراؤں۔ یہ خود اس درجہ مصروف انسان ہیں۔ کہ خود ان کی طرف سے یاد رکھنے کی توقع ہی نہیں ہو سکتی۔

میں نے مضمون کے لیے جو آخری دن انھیں بتایا تھا۔ اس دن دوپہر کو ریڈیو اسٹیشن سے ان کا فون آ گیا۔ کہ کہاں غائب ہو؟ تمھاری امانت رکھی ہے۔ آ کر لے جاؤ۔" مجھے قطعاً یاد تک نہ تھا۔ کہ اس امانت سے ان کی مراد مضمون ہے۔ میں کچھ مصروف تھا۔ ان سے کہا۔ اگلے دن ملوں گا۔ لیکن انھوں نے تاکید فرمائی۔ کہ "شام کو ضرور گھر آؤ"۔ لہٰذا میں شام کو ان کے گھر پہنچ گیا۔ جاتے ہی انھوں نے اپنے بیگ (جو ان کے مونوگرام کی حیثیت رکھتا، اور ہر وقت ان کے ساتھ رہتا تھا) میں سے پھول کے چار صفحوں کا مضمون نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے ان کا عطیہ سمجھ کر شکریہ ادا کیا۔

اگلے دن خوشنویس کو کتابت کے لیے دیتے وقت جو دیکھتا ہوں تو آخر میں "باقی پھر" لکھا ہے۔ اگلے ہفتے اس مخصوص دن پر میں نے ان سے ملنا عمداً گول کیا۔ لیکن ان کا فون آیا۔ اور انھوں نے پھر بلایا۔ اور مضمون کی دوسری قسط میرے حوالے کی۔ جب مسلسل تین چار قسطیں شائع ہو گئیں۔ تو ایک دن ہمّت کر کے میں نے معاوضے کی بات چھیڑی۔ بات کرنی تھی کہ وہ ایک دم برافروختہ ہو گئے کہ "اگر معاوضہ دے کر مضمون لکھانا ہے۔ تو لاہور میں بے شمار لکھنے والے پڑے ہیں۔ ان سے لکھواؤ۔ صاحبزادے۔ کان کھول کر سُن لو۔ اگر تم نے پیسے کی بات کی تو میں مضمون لکھنا بند کر دونگا۔

اور ۵۵ء سے اگست ۵۷ء تک شوکت صاحب بہت پابندی اور باقاعدگی سے "پھول" کے لیے ہر ہفتے مضمون لکھتے رہے۔ بارہا ایسا ہُوا کہ مصروفیت کے سبب دن میں انھیں لکھنے کا موقع نہ ملا۔ اور آخری دن سر پہ آ گیا۔ چونکہ تکلّف تو درمیان سے اُٹھ چکا تھا۔ لہٰذا میں انھیں مضمون لکھنا یاد دلاتا۔ ریڈیو اسٹیشن سے "قاضی جی" کا پروگرام ختم ہونے کے بعد یہ مجھے شام کو اپنے ساتھ گھر لے جاتے۔ وہاں جا کر مجھے اپنی بیگم اور بچیوّں کے پاس بٹھا دیتے اور خود دوسرے کمرے میں چلے جاتے۔ میں سمجھتا ممکن ہے کپڑے تبدیل کرنے گئے ہوں۔ آدھ پون گھنٹے کے اندر یہ تازہ تازہ

لکھا ہوا مسودہ مجھے دے دیتے۔ اور اس وقت معلوم ہوتا کہ یہ دوسرے کمرے میں بیٹھے مضمون لکھ رہے تھے۔

ان کا مضمون ایک فرضی بچے کی ڈائری ہوتا تھا۔ جس کا عنوان انھوں نے "موتی میاں کی ڈائری" تجویز کیا تھا۔ میں نے بہت کم لوگوں کا حافظہ اس بلا کا دیکھا ہے۔ انھیں ہمیشہ یاد رہتا کہ آخری قسط کس تاریخ پر ختم ہوئی تھی۔ اور اس سے اگلی تاریخ سے ڈائری لکھنا شروع کر دیتے۔ رسالہ چونکہ ہفتہ وار تھا۔ اس لیے شوکت صاحب التزاماً ہفتے بھر کی ڈائری لکھتے۔ کوئی ڈیڑھ سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب یہ خود اس موضوع سے اُکتا گئے تو انھوں نے ایک اور سلسلہ "آڈن طشتری" کے نام سے شروع کر دیا۔ یہ بھی سلسلہ وار ناول تھا۔ اور کوئی سال بھر تک چلتا رہا۔ حتیٰ کہ شوکت صاحب نے ریڈیو پاکستان لاہور سے علیحدگی اختیار کی۔ اور اخبار "جنگ" کے ایڈیٹر ہو کر کراچی چلے گئے۔

اگر شوکت صاحب کو کسی مشاعرے میں لاہور سے کہیں باہر جانا ہوتا تو وہ ایک قسطیں پیشگی لکھ کر دے جاتے۔ اگر غیر متوقع طور پر انھیں باہر زیادہ ٹھہرنا پڑتا۔ تو بذریعہ ڈاک وہاں سے قسط روانہ فرما دیتے۔ کسی مجبوری کے سبب یہ مضمون لینے نہ پہنچ سکتا۔ تو یہ خود اپنے چپراسی کے ذریعے مضمون بھجوا دیتے۔ مجھے یاد نہیں کہ ڈھائی سال کے عرصے میں پھول کی کوئی اشاعت اُن کے مضمون کے بغیر رہ گئی ہو۔

گویا ان سے قربت میں "پھول" کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ جسے یہ خود اپنے بچپن میں پڑھ چکے تھے۔ اور جس میں انھوں نے اپنی مضمون نویسی کی ابتدا کی تھی۔ اس یکجائی اور ہر وقت کے ساتھ نے شوکت صاحب کو مجھ سے اور بھی قریب کر دیا۔ ہم دونوں کو اگر کہیں باہر جانا نہ ہوتا۔ تو گھنٹوں بیٹھتے۔ ساتھ مل کر ایک اشاعتی ادارہ قائم کرنے کے پنج سالہ و شش سالہ پلان بناتے۔ نظامی صاحب مرحوم کو ایک دن بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیا سوجھی۔ کہ ایک ماہوار رسالے کا خاکہ ذہن میں تیار کیا۔ مجھے فون کر کے فوراً دفتر پہنچنے کو کہا۔ اور میرے سامنے ایک اسکیم پیش کی۔ کہ تمام ریڈیو اسٹیشنوں کی چیدہ تقریروں ڈراموں اور دوسرے مضامین سے مزین ایک رسالہ نکالا جائے۔ شوکت صاحب اس کے ایڈیٹر ہوں۔ میں اس کا ناشر اور خود نظامی صاحب اس رسالے اور ریڈیو پاکستان کے درمیان رابطہ افسر ہوں۔ شوکت صاحب نے اُسی وقت اس کا نام "جرس" تجویز فرما دیا۔ اُسی دن محترم ذوالفقار بخاری صاحب کو تمام روئداد لکھی گئی۔ چند دنوں بعد بخاری صاحب کا جواب آیا۔ کہ "خیال اچھا ہے۔ عنقریب لاہور آ رہا ہوں۔ مزید مشورہ اُس وقت ہوگا۔" لیکن بخاری صاحب لاہور جلد نہ پہنچ سکے۔ اور اس طرح یہ اسکیم دھری کی دھری رہ گئی۔

راولپنڈی میں میرے اور شوکت صاحب کے ایک مشترکہ دوست منّان اللہ بیگ ہیں۔ فوج میں تو ان کا عہدہ میجر کا ہے۔ لیکن علم و ادب کے میدان میں اگر فیلڈ مارشل نہیں تو کم از کم انھیں میجر جنرل ضرور کہا جا سکتا ہے۔ خود مضمون نہیں لکھتے لیکن اچھے مضمون کی دل سے قدر کرتے اور داد دیتے ہیں۔ خود شعر نہیں کہتے۔ لیکن اچھا شعر سن کر پھڑک اُٹھتے ہیں۔ سنہ ۵۳ء سے سنہ ۵۷ء تک انھیں ہر سال دورہ پڑتا۔ اور یہ راولپنڈی میں مشاعرہ کرتے۔ مشاعرہ کیا اچھا خاصا سمپوزیم ہوتا تھا۔ کئی نشستوں پر مشتمل۔ ایک غزل کی محفل ہے۔ تو دوسری نشست نظم کی۔ پھر ایک محفل مزاحیہ شاعری کی۔ ایک نشست افسانے کی۔ اور آخر میں ایک تنقیدی محفل۔

منّان صاحب نے لاہور میں مجھے اپنا نمائندہ مقرر کر رکھا تھا۔ جب تاریخ قریب آتی۔ تو یہ مجھے ہفتہ بھر پہلے مطلع کر دیتے اور میں ان کی طرف سے شعرا سے رابطہ قائم کرتا۔ اور ان سب کو گھیر کر راولپنڈی لے جاتا۔ دو تین دن خوب ہنگامے میں گزرتے۔ دن اس لیے کہہ رہا ہوں۔ کہ رات کو بھی ہم لوگ دن بنا لیتے۔ سونا قسم تھا۔ ساری رات شعر و شاعری میں گزر جاتی۔

۵۸ء میں اتفاق سے جگر صاحب مرحوم بھی لاہور آئے ہوئے تھے۔ منّان صاحب نے ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھایا اور ادبی محفل عین اس زمانے میں رکھ دی۔ میرے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی گئی کہ جگر صاحب۔ شوکت صاحب۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اور والد محترم کو لے کر راولپنڈی پہنچوں۔ پروگرام یہ بنا کہ اس محفل سے فارغ ہو کر ہم سب دو تین دن مری بھی گزار آئیں گے۔

اس سے پہلے جو مشاعرے ہوتے رہے اس میں صرف شوکت صاحب ہی جاتے تھے۔ اس مرتبہ منّان صاحب نے اصرار کیا کہ بیگم شوکت بھی ساتھ آئیں۔ گویا ان چاروں کے علاوہ بیگم اور ان کی تین بچیوں کا قافلہ لے کر شام کے چار پانچ بجے روانہ ہوا۔ گوجرانوالہ تک تو کار بہت اچھی چلی۔ لیکن اس کے فوراً بعد اس میں کوئی نقص ہو گیا۔ گجرات پہنچتے پہنچتے رات کے آٹھ بج گئے۔ ورکشاپیں سب کی سب بند ہو چکی تھیں۔ ایک مکینک کو اس کے گھر سے بلا کر کار درست کرائی اور آگے چل کھڑے ہوئے۔ لیکن وہ درستی وقتی ثابت ہوئی۔ گجرات اور جہلم کے درمیان اس میں پھر خرابی پیدا ہوئی۔ جوں توں کر کے جہلم پہنچے اب جو پہاڑی راستہ آیا۔ تو کار کا پانی ابلنا شروع ہوا۔ فرلانگ بھر چل کر رکنا پڑتا۔ پانی کا دور دور نام و نشان دکھائی نہ دیتا۔ اور کار اس وقت تک نہ چل سکتی تھی جب تک یہ ابلتا ہوا پانی ٹھنڈا نہ ہو جاتا۔ چاندنی رات تھی۔ بے انتہا پرفضا منظر۔ اگر صرف میں اور عبادت صاحب ہوتے۔ تو تمام رات وہیں کار میں بیٹھے بیٹھے گزار دیتے۔ لیکن رہ رہ کے جگر صاحب۔ شوکت صاحب۔ بیگم شوکت اور بچیوں کا خیال آتا۔ کہ یہ سب کے سب کس قدر پریشان ہو رہے ہوں گے۔ میں اور عبادت صاحب، جگر صاحب سے معذرت کرتے۔ تو جواب میں وہ فرماتے۔ کہ اس منظر اور اس سفر سے وہ ہم دونوں سے بھی زیادہ لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

اللہ کا کرنا رات کے کوئی ساڑھے گیارہ بجے پیچھے سے کسی کار کی روشنی دکھائی دی۔ ہم نے اسے ٹھہرایا۔ شکر ہے کار بالکل خالی تھی۔ ڈرائیور کی منت سماجت کی۔ کہ وہ جگر صاحب۔ شوکت صاحب اور بچیوں کو راولپنڈی تک ساتھ لے جائے۔ پیچھے رہ گئے میں۔ عبادت صاحب اور ابّا جان۔ گھنٹے بھر بعد کار کا مزاج ٹھنڈا ہوا۔ تو ہم نے پھر سفر شروع کیا۔

ادھر شوکت صاحب نے راولپنڈی پہنچ کر جو منّان صاحب کو بتایا۔ کہ ہم اس پریشانی میں گھرے راستے میں ہیں۔ تو وہ بیچارے رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے کسی دوست کی کار مانگ کر ہمیں لینے جہلم کی طرف روانہ ہوئے۔ ہم گوجر خان سے ذرا آگے پہنچے ہوں گے کہ سامنے سے ایک کار آتی نظر آئی۔ کراس کرنے کے خیال سے جو دونوں کاریں آہستہ کی گئیں تو دیکھا منّان صاحب بیٹھے ہیں۔ گویا گھنٹے بھر میں ہم لوگ بخیریت راولپنڈی پہنچ گئے۔

اگلے روز دن میں محفل جمی۔ نہ جانے اس محفل میں کیا بات شوکت صاحب کو ناگوار گزری۔ کہ ایک دم ان کا موڈ بگڑ گیا۔ مغرب کے قریب ایک مخصوص نشست ہوئی۔ لیکن شوکت صاحب اس میں شریک نہ ہوئے۔ رات کو منّان صاحب نے

ان شعرا کے اعزاز میں ایک بہت شاندار ڈنر کا اہتمام کر رکھا تھا۔ مہمان آنے شروع ہوئے۔ تو شوکت صاحب کی تلاش میں لوگ دوڑائے گئے۔ منان صاحب کی کوٹھی سے ملی ہوئی کوٹھی میں ان کے ایک دوست رہتے تھے۔ اب جو شوکت صاحب کو ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچا ہوں۔ تو دیکھتا کیا ہوں۔ کہ جناب رختِ سفر باندھ رہے ہیں۔ بہت سمجھایا بجھایا۔ لیکن یہ کسی طرح مان کے نہ دیئے۔ میں نے کہا "حضرت۔ آپ نے تو تین چار دن کا پروگرام بنایا تھا۔ مری جانے کا بھی قصد تھا" لیکن شوکت صاحب تھے۔ کہ کسی طرح ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اب یاد نہیں۔ کہ یہ اس کھانے میں بھی شریک ہوئے یا نہیں۔ تانگہ منگوا اس میں سامان لاد اسٹیشن روانہ ہو گئے۔

لیکن شوکت صاحب جس طرح بہت جلدی ناراض ہو جاتے تھے۔ اسی طرح بہت جلدی ان کی ناراضگی رفع بھی ہو جاتی تھی۔ کچھ ہی عرصے بعد منان صاحب سے صلح صفائی ہو گئی۔ اور آخری دم تک منان صاحب سے ان کے تعلقات بہت خوشگوار رہے۔ شوکت صاحب کی علالت کے دوران منان صاحب دو تین مرتبہ لاہور آئے اور ان سے ہسپتال میں ملے۔ شوکت صاحب کی رحلت سے ایک دن پہلے منان صاحب میرے ساتھ ان کے گھر مزاج پرسی کرنے گئے۔ اور کوئی گھنٹہ بھر باتیں کرتے رہے۔

تین چار دن بعد میں راولپنڈی سے واپس آیا۔ شوکت صاحب سے ملنے گیا۔ تو یہ ایسے ملے گویا کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی۔ پوچھنے لگے "کب آئے۔ واپسی میں تو کار نے تنگ نہیں کیا" میں نے جواب دیا "جاتے ہوئے کار کا موڈ خراب ہو گیا تھا اُس نے پریشان کیا۔ واپسی پر آپ کا موڈ بگڑ گیا لیکن کار بالکل ٹھیک آئی" میرے اس جملے سے بہت خوش ہوئے۔

مضمون یہاں تک لکھ پایا تھا۔ کہ شوکت صاحب کی بذلہ سنجی کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔ غالباً ۵۶ء کی جنوری میں مرحوم نے میرے نام کی مناسبت سے ایک مسلسل ناول "نسیم منزل" کے عنوان سے نشر کرنا شروع کیا۔ یہ پروگرام اکتوبر تک جاری رہا۔ اور اس سلسلے کی کوئی چالیس قسطیں باقاعدگی سے ہر ہفتے نشر ہوئیں۔ شوکت صاحب نے اس کے مرکزی کردار کے لیے مجھے منتخب فرمایا۔ پروگرام کے وقت سے کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ہم ریہرسل کرنے جمع ہو جاتے تھے۔ ایک دن جو ہم پہنچے تو معلوم ہوا دو ایک آرٹسٹ موجود نہیں۔ اگر کوئی آرٹسٹ وقت کی پابندی نہ کرتا تو شوکت صاحب جھنجھلا جاتے اور ان کا موڈ بگڑ جاتا۔ انھیں ان کی اپنی اصلی حالت پر واپس لانے کو باقی آرٹسٹ باتوں کا سلسلہ شروع کر دیتے۔ کہ ان کا دھیان ادھر سے ہٹ جائے۔ میری جو شامت آئی تو میں نے یوں ہی برسبیل تذکرہ ایک خاتون کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور بتایا کہ عجیب اتفاق ہے کہ مختلف اوقات میں اُن کے جن مختلف اصحاب سے تعلقات رہے۔ وہ سب کے سب "حمید" نام تھے۔ میری اس "تحقیق" پر آرٹسٹ حیران سے ہوئے۔ کہ واقعی ان میں سے کسی کو کبھی اس بات کا خیال تک نہ آیا تھا۔ شوکت صاحب پروگرام کی طرف سے فکر مند تھے۔ آرٹسٹ پہنچے نہ تھے۔ لہٰذا انھوں نے میری بات پر کوئی دھیان نہ دیا۔ ایک ڈرامہ آرٹسٹ نے ان کی توجہ جو میرے اس "انکشاف" کی طرف دلائی۔ تو ان کا موڈ ایک دم درست ہو گیا۔ مجھے داد دی۔ اور باقی لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا "اس انکشاف کا حق انھیں نہیں۔ تو ادر کیسے پہنچا۔ بات یہ ہے۔ کہ بھائی جان یعنی ان کے والدِ محترم کا نام بھی تو حمید علی ہے۔ صاحبزادے کو فکر یہ لاحق ہوئی ہو گی۔ کہ نگاہِ انتخاب کہیں ان

پورنہ پڑے۔" ان کا یہ کہنا تھا کہ کمرہ قہقہوں سے گونج اُٹھا۔

میں عرض کر چکا ہوں۔ کہ شوکت صاحب زیادہ تر زبانی ہنسی مذاق کرتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اگر عملی مذاق کیے زیادہ عرصہ گذر جاتا۔ تو انھیں ایک عجیب قسم کی بے چینی اور بے کلی محسوس ہوتی تھی۔ ایک روز شوکت صاحب کو عملی مذاق کرنے کا موقع پھر مل گیا۔ اور اس مرتبہ تختۂ مشق بنے ایک قاری صاحب۔ بدقسمتی سے کہیں مولانا ان سے ملنے ریڈیو اسٹیشن پہنچ گئے۔ شوکت صاحب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کہنے لگے "حضرت! بڑی عمر ہے آپ کی۔ بخدا آپ ہی کو یاد کر رہا تھا۔ بلکہ سوچ رہا تھا کہ چپراسی بھیج کر آپ کو بلواؤں" مولانا بیچارے بہت سادہ لوح انسان ہیں پوچھنے لگے "خیریت تو ہے شوکت صاحب۔ میں کیسے یاد آیا" شوکت صاحب بولے "مولانا۔ رات ایک کھانے پر ریلوے کے جنرل مینجر صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے انھیں سمجھایا۔ کہ صاحب پاکستان اسلامی ملک ہے۔ اگر نماز روزے کا خیال یہاں بھی نہ رکھا گیا۔ تو کہاں رکھا جائے گا" جنرل مینجر صاحب نے دریافت فرمایا "کوئی عملی اسکیم آپ کے ذہن میں ہو تو بتایئے" میں نے اُسی وقت جواب دیا۔ کہ "صاحب۔ تمام ٹرینوں کے ساتھ مسجد کا ایک کمپارٹمنٹ چلنا چاہیے۔ کم از کم ایک ہیڈ امام اور دس بارہ اس کے نائب ہوں" جنرل مینجر صاحب کے دل کو یہ بات لگی۔ اور انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد یہ اسکیم تیار کر کے منظوری کے لیے مرکزی حکومت کو بھیج دیں گے۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ میں ہیڈ امام اور نائب اماموں کے نام تجویز کر دوں۔ ظاہر ہے آپ جیسے عالم اور خوش الحان قاری کے ہوتے ہوئے میں کسی اور کا نام کیسے تجویز کر سکتا تھا۔ مولانا اب یوں کیجیے کہ فوراً ریلوے کے ہیڈ کوارٹرز آفس چلے جایئے اور جنرل مینجر صاحب سے مل لیجیے۔ تازہ تازہ معاملہ ہے۔ بڑے افسر ہیں۔ زیادہ عرصہ گزر گیا۔ تو انھیں قطعی یاد نہ رہے گا" مولانا بہت خوش ہوئے۔ فرمانے لگے "جنرل مینجر صاحب کو فون کر دیجیے۔ وہ اجازت دیں تو میں فوراً چلا جاتا ہوں" شوکت صاحب نے یوں ہی ٹیلیفون کا کوئی فرضی نمبر ملایا۔ دیر تک گھنٹی بجی۔ کسی نے فون کا ریسیور نہ اُٹھایا تو شوکت صاحب نے اپنے پرس میں سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکالا۔ اور کہنے لگے "مولانا۔ وقت بہت کم ہے۔ ذرا دیر میں دفتر بند ہو جائیگا یہ لیجیے کارڈ۔ اس پر لکھے دیتا ہوں۔ کہ میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ بس سستی نہ کیجیے۔ اور روانہ ہو جایئے"

چلچلاتی دھوپ۔ شدید گرمی کا زمانہ۔ دوپہر کا بارہ ساڑھے بارہ کا عمل۔ قاری صاحب نے اپنی سائیکل اٹھائی اور سیدھے ریلوے ہیڈ کوارٹرز آفس پہنچ گئے۔ جنرل مینجر صاحب کو کارڈ بھیجا۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ شوکت صاحب کی طرف سے کوئی صاحب آئے ہیں۔ انھوں نے فوراً مولانا کو اندر بلا لیا۔ بہت تعظیم و تکریم سے پیش آئے۔ پوچھنے لگے "فرمایئے قاری صاحب۔ کیسے آنا ہوا۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں" قاری صاحب نے چھوٹتے ہی ان جیسے دردمند اور فرض شناس افسر کی تعریف شروع کر دی۔ فرمانے لگے "صاحب۔ اب اسلام کہاں رہ گیا۔ آپ جیسے پرانی قدروں کو سمجھنے والے چند حضرات اس ملک میں ہیں۔ جن کے دم قدم سے اسلام باقی ہے۔ ورنہ یہاں تو بیشتر افسر وہ مسلمان ہیں جنھیں نہ نماز پڑھنی آئے نہ روزہ رکھیں" جنرل مینجر صاحب ذرا چکرائے۔ کہ ان سب باتوں کا بھلا یہ کیا موقع۔ فرمانے لگے "مولانا دفتر بند ہونے کو ہے۔ ابھی مجھے چند ضروری فائل بھی دیکھنے ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو

تو فرمائیں۔" اب قاری صاحب حرفِ مدعا زبان پر لائے۔ کہ "صاحب۔ کل رات شوکت صاحب سے جس اسکیم کے بارے میں آپ سے بات ہوئی تھی اُسی سلسلے میں حاضر ہُوا ہوں۔" جنرل منیجر صاحب نے اس اسکیم کی ذرا وضاحت چاہی۔ تو قاری صاحب نے من و عن وہ سب باتیں بیان فرما دیں۔ جو شوکت صاحب نے ان سے کی تھیں۔ جنرل منیجر صاحب سُن کر حیران پریشان رہ گئے۔ انھیں تو یہ سمجھا بجھا کے رخصت کر دیا۔ کہ "جب بھی یہ اسکیم عمل میں آئی۔ آپ کا ضرور خیال رکھا جائیگا۔" اور مولانا کے رخصت ہوتے ہی شوکت صاحب کو فون کر کے پوچھا۔ کہ "کیوں حضرت یہ کیا حرکت تھی؟"

مکرم و محترم حکیم نیر واسطی صاحب میرے بے انتہا شفیق بزرگ ہیں۔ اختر شیرانی مرحوم کے مدّاح ہونے کی وجہ سے یہ ہر سال ان کی برسی "یومِ اختر" کے نام سے مناتے تھے۔ اچھے خاصے بڑے مجمع کی ضیافت کرتے۔ کسی خوش گلو مغنّیہ کو بلاتے اور کھانے کے بعد ان کی زبان سے اختر شیرانی کا کلام سُنا جاتا۔ غالباً ۵۶ء کی سردیوں کا ذکر ہے۔ کہ حکیم صاحب قبلہ نے مجھ سے فرمائش کی۔ کہ یومِ اختر کے لیے مشہور گلوکار مختار بیگم کو شرکت کی دعوت دوں۔ چنانچہ مقررہ تاریخ پر میں اور شوکت صاحب مختار بیگم کے ہاں پہنچے۔ ان کا گلا بہت خراب ہو رہا تھا۔ آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کو خیال آیا۔ کہ اگر انھیں اپنے آنے کی غرض و غایت بتاتے ہیں۔ تو وہ گلے کی خرابی کے باعث معذرت خواہ ہوں گی۔ لہٰذا عین وقت پر فیصلہ یہ کیا گیا۔ کہ انھیں اپنی غرض بتائے بغیر ساتھ لے چلیں۔ یہ بیچاری اس حالت میں بھی ہمارے ساتھ چلنے پر رضامند ہو گئیں۔ حکیم صاحب کے مطب کا بورڈ دیکھ کر یہ بہت خوش ہوئیں۔ کہ ہم انھیں علاج کی غرض سے وہاں لائے ہیں۔ اندر جو قدم رکھتی ہیں۔ تو مجمع دیکھ کر گھبرا گئیں۔ اب تو یہ پہنچ ہی چکی تھیں۔ لہٰذا انھیں بتا دیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر ان سے فرمائش کی گئی کہ اختر کا کلام سنائیں۔ ایک تو انھیں اختر کا کلام یاد نہ تھا دوسرے ان کا گلا بھی اس قابل نہ تھا۔ تاہم بہت اصرار کے بعد یہ آغا حشر مرحوم کی ایک غزل سُنانے پر رضامند ہو گئیں۔ حشر کا کلام۔ اس پر مختار بیگم کے غزل گانے کا مخصوص انداز۔ گلے کی خرابی کے باوجود ایک سماں بندھ گیا۔ آغا صاحب کی غزل کا مطلع تھا ؎

میں بدگماں نہیں ہوں بیانِ رقیب سے
تُم سے گلہ نہیں ہے۔ گلہ ہے نصیب سے

جب یہ غزل ختم کر چکیں تو شوکت صاحب جو اُن کے بالکل قریب بیٹھے تھے بولے "مختار بیگم۔ غزل کا ایک مصرع تو آپ بھول ہی گئیں" وہ بہت حیران ہوئیں۔ اور پوچھنے لگیں "کون سا مصرع؟" شوکت صاحب نے فی البدیہہ فرمایا ؎

"پہلے دوا گلے کی تو لے لو طبیب سے"

آغا صاحب کی غزل کی زمین میں یہ مصرع یوں محسوس ہوا۔ گویا انگشتری میں نگینہ۔ شوکت صاحب سے ذرا فاصلے پر میں بیٹھا تھا۔ میں نے عمر بھر کبھی شعر نہ کہا تھا۔ نہ جانے اُس وقت ایک مصرع کیسے سُوجھ گیا۔ میں نے کہا "شوکت صاحب یہ تو پورا شعر تھا۔ مصرع ثانی تو آپ نے یاد دلا دیا۔ مصرع اولے غالباً آپ بھی بھول گئے" شوکت صاحب نے حیرانی

سے پوچھا ”بھئی وہ کون سا مصرع ہے۔ ذرا میں بھی تو سنوں“ میں نے فوراً عرض کیا۔ کہ ؎

”شوکت نے رائے دی ہے مجھے یہ قریب سے“

یہ سننا تھا۔ کہ شوکت صاحب ایک دم اُچھل پڑے۔ بہت داد دی اور فرمانے لگے ”آپ کی یہ چوری آج کھلی۔ کہ جناب شعر بھی کہتے ہیں“ پھر اس شعر کو خود پڑھا۔ کہ ؎

شوکت نے رائے دی ہے مجھے یہ قریب سے
پہلے دوا گلے کی تو لے لو طبیب سے

محفل میں جو حضرات بیٹھے تھے۔ ان سب نے بھی دل بھر کر داد دی۔ شوکت صاحب داد دینے میں بخل سے کام نہ لیتے تھے۔ دوسرے کے منہ سے کوئی اچھا جملہ نکل جاتا۔ کوئی اچھا شعر سنتے۔ تو پھڑک اُٹھتے۔ فرمانے لگے ”صاحبزادے! آپ کی طبیعت شعر کہنے کے لیے بہت موزوں ہے۔ شعر کہا کیجئے۔“ لیکن وہ دن اور آج کا دن۔ پھر شعر نہ کہا گیا۔ ادب سے دلچسپی ضرور ہے۔ برے بھلے شعر میں تمیز بھی کر لیتا ہوں۔ وہی مضمون۔ کہ ؎

پر طبیعت ادھر نہیں آتی

غالباً یہ ان احباب کی صحبت کا فیض تھا۔ کہ میرا دماغ بھی شعر و شاعری کی طرف چل نکلا تھا۔

مشاعروں کا ایک خاص موسم ہوتا ہے۔ اور اس زمانے میں لاہور۔ لائل پور۔ راولپنڈی اور ملتان میں مشاعرے وبائی صورت میں منعقد ہوتے۔ بیرونجات سے شعرا اس میں حصّہ لینے آتے۔ ایسے موقعوں پر شوکت صاحب کے یہاں بھی محفلیں ہوتیں۔ جگر صاحب۔ سیّد محمد جعفری۔ ظریف جبلپوری۔ صابر دہلوی۔ ادیب سہارنپوری۔ سحاب قزلباش۔ زہرہ نگاہ۔ خمار بارہ بنکوی سب کے سب شوکت صاحب کے جمع ہوتے۔ ان میں سے بعض حضرات سے مجھے یوں تو نیاز حاصل تھا۔ لیکن قربت شوکت صاحب ہی کی وجہ سے ہوئی۔ شام کو ان کے یہاں چلا جاتا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے شام کے دھندلکے رات کی تاریکی میں ڈھل جاتے۔

مجھ سے زیادہ لوگوں کے لیے اور لوگوں سے زیادہ خود میرے لیے یہ بات حیرت کا موجب بنی رہی۔ کہ میری اور شوکت صاحب کی دوستی اور قربت میں کیا قدرِ مشترک ہے۔ لوگوں کے بارے میں تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی۔ کہ ایک تو جب بھی میں ان سے ملا۔ میں نے حفظِ مراتب کا خیال رکھا۔ دوسری بڑی وجہ غالباً یہ تھی۔ کہ انھیں مجھ سے کسی قسم کی ”دیرینہ و دراز رقابت“ کا اندیشہ کبھی نہ ہُوا۔ اپنے ہم عصر ادیب اور شاعر دوستوں سے وہ بظاہر ہنس بول کر ملتے۔ لیکن نفسیاتی طور پر ان کے تحت الشعور میں یہ بات ضرور رہتی۔ خدا نہ کرے اس سے میری مراد یہ نہیں۔ کہ وہ منافقانہ طور پر اپنے دوستوں سے ملتے تھے۔ میں نے انھیں اس عالم میں بھی دیکھا ہے۔ کہ اپنے ہم عصروں میں ان سے کسی بہت کم عمر شاعر نے کوئی اچھا شعر کہہ دیا تو دل بھر کے داد دی۔ بار بار وہ شعر سنا۔ اگر فی الواقعی کسی سے متاثر ہوئے تو خلوت و جلوت میں اور ان صاحب کی عدم موجودگی میں بھی ان کی ذہانت کو سراہا۔ ان کے شعروں کی تعریف کی۔ لیکن بعض ایسے ادیب اور شاعر بھی تھے۔ جن سے ان کے مراسم تھے۔ بہت قربت بھی تھی۔ لیکن ان کی تحریروں سے

کبھی متاثر نہ ہوئے۔

اگست ۵۷ء میں شوکت صاحب ریڈیو کی ملازمت چھوڑ کر "جنگ" کراچی کے ادارے سے منسلک ہو گئے محمود نظامی صاحب ترقی پا کر ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان مقرر ہو کر کراچی چلے گئے۔ ان دونوں کے یوں اچانک اور اکٹھے لاہور چھوڑ دینے سے میری زندگی میں اچھا خاصہ خلا پیدا ہو گیا۔ ان کی روانگی سے دو ایک دن پہلے ایک مشترک دوست کی ناعاقبت اندیش اور غیر ذمہ دارانہ حرکت سے میرے اور شوکت صاحب کے درمیان چند غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں اور ان کے کراچی پہنچنے کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے یوں انجان اور بیگانے بن گئے۔ کہ وہ کبھی لاہور آئے تو ملنا تو درکنار مجھے اطلاع تک نہ دی۔ میں کراچی گیا۔ تو اپنے وہاں جانے کی ہوا تک انھیں نہ لگنے دی۔ چونکہ وہ باتیں بے بنیاد تھیں اس لیے مجھے یقین تھا۔ کہ ایک نہ ایک دن شوکت صاحب کو اس بات کا احساس ضرور ہو گا۔ اور اس احساس کے بعد ان کا دل صاف ہو جائے گا تو ملوں گا۔ کوئی ڈھائی برس اسی تعطل میں گزر گئے۔

۲۴ مارچ ۶۰ء کو مجھے ایک خیر سگالی وفد کے ساتھ ہندوستان جانا تھا۔ اس وفد میں ہمارے ساتھ چند شاعر حضرات بھی جا رہے تھے۔ باقی سب تو ہمارے ساتھ واہگہ بارڈر کے راستے جانے پر رضامند ہو گئے۔ لیکن سید محمد جعفری صاحب کے پاس چونکہ صرف دہلی کا ویزا تھا اس لیے انھوں نے کہا کہ وہ ۲۵ مارچ کو بذریعہ ٹرین روانہ ہوں گے۔ میں ان کے پہنچنے سے پہلے لدھیانہ میں ان کے لیے مقامی طور پر عارضی ویزے کا انتظام کر دوں۔

سہ پہر میں ہم لوگوں کی روانگی تھی۔ میں چند ضروری چیزیں خریدنے دس گیارہ بجے انارکلی روانہ ہوا۔ نیلے گنبد کی مسجد کے قریب پہنچا تھا کہ سامنے سے شوکت صاحب آتے دکھائی دیئے۔ صاف بات ہے دل ان کی طرف سے میلا تھا۔ انھیں آتے دیکھ کر میں نے جلدی سے راستہ کاٹا اور داہنے ہاتھ کی پٹری کا رُخ کیا۔ شوکت صاحب نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ انھیں مجھ سے اس بے رخی کی توقع نہ تھی۔ انھوں نے بھی فوراً اپنا رُخ بدلا۔ اور اب جو دیکھتا ہوں تو وہ عین میرے سامنے کھڑے ہیں میں نے انھیں سلام تو کر دیا۔ لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اس کے بعد بات کیا کروں۔ میرا سلام کرنا تھا کہ وہ دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور بولے "اب یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ کہ تم مجھے دیکھ کر نظریں پھیر لو گے۔" میں نے نہایت صفائی سے جواب دیا "جب دِلوں میں مَیل ہو تو محض تکلفاً اور مروتاً ملنا میں منافقت اور ریاکاری سمجھتا ہوں۔" فرمانے لگے "وہ سب غلط فہمیاں رفع ہو چکیں۔ یقین جانیئے آپ کی چچی کا دل بھی آپ کی طرف سے بالکل صاف ہو گیا ہے۔ وقت اور واقعات نے بتا دیا کہ وہ آگ کس کی لگائی ہوئی تھی۔"

اِدھر اُدھر کی متفرق باتیں کرنے کے بعد پوچھنے لگے "اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟" میں نے جواب دیا "سہ پہر میں ہندوستان کی روانگی ہے" انھوں نے دریافت کیا "اکیلے جا رہے ہو۔ یا اور بھی کوئی ساتھ جا رہا ہے" میں نے بتایا۔ کہ "ایک خیر سگالی وفد کے ساتھ جا رہا ہوں۔ چند شاعر حضرات بھی ہمراہ ہوں گے" انھوں نے شاعروں کے نام پوچھے۔ میں نے جب سید محمد جعفری صاحب کا نام لیا تو کہنے لگے "خیر وہ تو آپ کے ساتھ نہیں جا رہے" اس پر میں نے عرض کیا "پروگرام بن چکا ہے۔ وہ وعدہ کر چکے ہیں۔ کیسے نہیں جائیں گے" شوکت صاحب بولے "وہ اور میں ہر جگہ اکٹھے جاتے ہیں۔

چونکہ آپ نے مجھے شامل نہیں کیا۔ صرف انھیں مدعو کیا ہے۔ لہٰذا وہ بھی نہیں جا رہے۔" میں نے عرض کیا: "اگر یہ بات ہے تو بسم اللہ آپ بھی تشریف لے چلیں۔" شوکت صاحب بولے: "آپ خود کسی کے بلاوے پر جا رہے ہیں۔ آپ کے بلاوے پر میں کیسے چل دوں؟"

شوٹنگ بھول کر میں نے انھیں اپنے ساتھ لیا۔ اور وائی۔ ایم۔ سی۔ اے بلڈنگ میں اس وفد کے ممبر کارواں اور اپنے عزیز دوست سید سعید حسن نقوی صاحب کے دفتر پہنچا۔ شوکت صاحب کو ان سے متعارف کرایا۔ اور انھیں بتایا ہماری خوش قسمتی ہے۔ کہ شوکت صاحب بھی دہلی جاتے ہوئے ایک دن کے لیے لاہور ٹھہر گئے۔ لہٰذا یہ بھی ہمارے ساتھ جائیں گے۔ نقوی صاحب نے انتہائی فراخدلی سے دعوت نامہ ان تک بڑھایا۔ لیکن شوکت صاحب بے انتہا خوددار انسان تھے نہ مانے۔ کہنے لگے: "جو لوگ لدھیانہ میں مشاعرہ منعقد کر رہے ہیں جب تک ان کی طرف سے فرمائش نہ ہوگی نہ جاؤں گا۔" نقوی صاحب نے اسی وقت لدھیانہ ٹرنک کال کی اور مشاعرہ کے منتظمین کو یہ خوش خبری سنائی۔ ان لوگوں نے جب اپنی خوشنودی کا اظہار اور شوکت صاحب کو ساتھ لانے کا شدید اصرار کیا۔ تو ٹیلیفون کا رسیور میں نے ان کے ہاتھ سے لے کر شوکت صاحب کو تھما دیا۔ جب انھوں نے خود شدید اصرار سنا۔ تو مان گئے۔ ان کے پاس بھی صرف دہلی کا ویزا تھا۔ لہٰذا طے پایا۔ کہ یہ اور سید محمد جعفری صاحب اگلے دن بذریعہ ٹرین روانہ ہوں گے۔ ہم لوگ ان کے پہنچنے تک چوبیس گھنٹے کے قیام کے عارضی ویزے کا انتظام مقامی حکام کے ذریعے کر دیں۔

حسبِ وعدہ اگلے دن یہ دونوں حضرات پہنچ گئے۔ صورت یہ تھی کہ نہ جانے کب سے دونوں لدھیانہ کے ریلوے اسٹیشن پر بیٹھے تھے۔ ویزے کی پابندی کی وجہ سے باہر نہ نکل سکتے تھے۔ اتفاق سے قتیل شفائی صاحب کا گزر ریلوے اسٹیشن سے ہوا۔ انھوں نے آکر مجھے اطلاع دی۔ اور میں ان دونوں کو اپنے میزبان کی کار میں جاکر لے آیا۔ سہ پہر سے رات کے ایک دو بجے تک ساتھ رہا۔ اور مشاعرے سے فارغ ہو کر یہ دونوں آدھی رات ہی کو کسی ٹرین سے دہلی روانہ ہو گئے۔

اس سرِ راہے ملاقات اور لدھیانہ کے قیام کے چند گھنٹوں نے پرانی رنجشیں بھلا دیں۔ غبار چھٹ چکا تھا۔ اور مطلع صاف ہو گیا تھا۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے سے پہلے سے بھی زیادہ قریب ہو گئے۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ گویا دو مریض کسی بیماری خصوصاً ٹائیفائڈ سے صحت یاب ہونے کے بعد پہلے سے بھی زیادہ صحت مند ہو گئے ہیں۔

مارچ سنہ ۶۰ء سے مارچ سنہ ۶۳ء تک شوکت صاحب راولپنڈی سے اگر ایک دن کو آئے تو اور اگر کئی دن کے لیے آئے تو۔ انھوں نے مجھے کبھی فراموش نہ کیا۔ اکثر آنے سے پہلے تار دے دیتے۔ خط لکھ دیتے۔ اور میں انھیں لینے ریلوے اسٹیشن جا پہنچتا۔ غالباً ۲۵ جولائی سنہ ۶۲ء کو شوکت صاحب کا تار ملا۔ کہ وہ ریل کار سے لاہور پہنچ رہے ہیں۔ اس سے پہلے جو ان سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ تو انھوں نے وعدہ فرمایا تھا کہ آئندہ جب لاہور آئیں گے تو قیام میرے ساتھ کریں گے۔ اس تار کے آنے کے بعد مجھے اس بات کا یقین ہو گیا۔ لہٰذا میں ان کے ٹھہرنے اور کھانے کا انتظام کر کے انھیں لینے کے لیے ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ ٹرین آئی۔ تو نہ صرف یہ بلکہ ان کی بیگم صاحبہ اور بچیاں بھی ہمراہ تھیں۔ ظاہر ہے وہ لوگ ساتھ تھے تو ان کے اپنی سسرال کے علاوہ کہیں ٹھہرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ تاہم میں نے اصرار کیا۔ اور بتایا۔ کہ "میں تو کھانا بھی پکوا

آیا ہوں"۔ کہنے لگے "دو تین دن لاہور ٹھہروں گا۔ اور تمہارا کھانا کھائے بغیر نہ جاؤں گا۔ لیکن اس وقت تو ہمیں گھر پہنچا دو۔ وہاں سب انتظار کر رہے ہوں گے۔"

شوکت صاحب سے تو اُس عارضی بدمزگی کے بعد دو تین ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ لیکن ان کی بیگم سے تقریباً پانچ سال بعد ملنا ہوا۔ لہٰذا اس مختصر سے عرصے میں نہ وہ مجھ سے کچھ کھل کر ملیں اور نہ میں اُن سے۔ اگلی صبح کو شوکت صاحب نے مجھے اپنے یہاں بلایا اور میرے ساتھ اپنے بعض احباب سے ملنے گئے۔ واپڈا کے پبلک ریلیشنز میں ان کے صاحبزادے عزیزی خورشید اسکرپٹ رائٹر ہیں۔ اُن سے ملنے پہنچے۔ چند کام کئے۔ اسی طرح دو تین دن متواتر ملاقاتیں رہیں۔ حتیٰ کہ روانگی سے ایک دن پہلے انھوں نے اور بیگم صاحبہ نے رات کا کھانا میرے ساتھ کھایا۔ اور اگلی صبح شوکت صاحب راولپنڈی روانہ ہو گئے۔

پروگرام کے مطابق ۴ مارچ کی صبح کو دس بجے کے قریب میں شوکت صاحب سے ملنے سید محمد جعفری صاحب کے گھر پہنچا۔ وقت بہت محدود تھا۔ اس میں نہ تو باضابطہ قسم کی دعوت کا اہتمام ہو سکتا تھا۔ نہ میں زیادہ احباب کو جمع کر سکتا تھا۔ دو چار قریبی عزیزوں اور چند بے تکلف احباب کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کر لیا۔ شوکت صاحب کو دہلی والوں کی نہاری بہت پسند تھی۔ لہٰذا میں نے ان کی پسند اور وقت کی تنگی کے پیشِ نظر نہاری کا انتظام کیا۔ میرے عزیز دوست سعید حسن نقوی صبح سے میرے ساتھ تھے۔ شوکت صاحب کے دو ایک ضروری کام تھے۔ وہ کرائے اور ایک بجے کے قریب ہم لوگ کھانے پر جمع ہوئے۔ دو ڈھائی گھنٹے محفل جمی۔ شوکت صاحب اور جعفری صاحب جب اکٹھے ہو جاتے تو لطیفوں کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی آپس میں نوک جھونک اور پھبتیوں کا لطف بھی آجاتا۔

شوکت صاحب میں ایک بڑا کمال یہ تھا۔ کہ اگر کسی محفل میں بے شمار آدمی بیٹھے ہوں۔ تو ان کی چھٹی حِس بیدار ہو جاتی اور یہ ایک نظر میں بھانپ لیتے کہ ان میں سے کون شخص یا کون کون سا شخص اس ماحول کے مطابق نہیں ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مرحوم خود جملے کسنے میں انتہا کر دیتے۔ لیکن دوسرے کے معمولی سے مذاق کی بھی تاب نہ لا سکتے تھے۔ اس محفل کے پندرہ بیس خواتین و حضرات پر نظر دوڑاتے ہی ان میں سے ایک صاحب انھیں ذرا اوپرے سے دکھائی دیئے۔ اُن کی طرف سے انھیں اندیشہ ہوا۔ کہ ان کا کلام سننے کے بعد کہیں غلط موقع پر داد نہ دیں۔ یا داد دینے کے موقع پر خاموش نہ رہیں۔ یا اور کوئی اوٹ پٹانگ حرکت نہ کر بیٹھیں۔ ایسے لوگوں سے شوکت صاحب کے نمٹنے کا طریقِ کار یہ تھا کہ تابڑ توڑ دو چار جملے ان پر کر دیئے۔ کچھ پھبتیاں کس دیں۔ وہ بیچارے کچھ ایسے بوکھلا جاتے۔ کہ پھر تمام وقت ان کے منہ سے کوئی بات ہی نہ نکلتی۔

اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ ان صاحب کی پتلون کے پائینچوں میں سے ان کے موزوں کی جھلک نظر آگئی۔ اب اسے محض اتفاق کہیے یا ان صاحب کی شامتِ اعمال۔ کہ ان کے موزوں کا ڈیزائن اور رنگ بالکل اس قالین سے مشابہ تھا جو اس کمرے میں بچھا ہوا تھا۔ ممکن ہے اوروں نے بھی یہ محسوس کیا ہو۔ لیکن کسی نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ میں شوکت صاحب سے درخواست کر رہا تھا کہ پچھلی رات کے مشاعرے میں انھوں نے غالبؔ کی "دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے"

غزل کا جو ہندی ترجمہ سنایا تھا۔ وہ سنائیں۔ مگر انھوں نے میری بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ ٹکٹکی باندھے ان صاحب کے موزوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بجائے میری درخواست سننے کے ان صاحب سے مخاطب ہوئے "حضرت! یہ فرمائیے آپ نے موزے پہن رکھے ہیں یا اس کمرے کے قالین کا کوئی کونہ لپیٹ رکھا ہے؟" وہ اچانک یہ بات سن کر کچھ کھسیانے ہوئے۔ کچھ ہنسے۔ ابھی ان بیچارے کو کوئی جواب بھی نہ سوجھا تھا۔ کہ شوکت صاحب نے ایک بے ساختہ بے ساختگی کے ساتھ دوسرا وار کیا۔ بولے "صاحب۔ اب تو آپ کے گول کمرے کو جا کر دیکھنا ہو گا۔ ممکن ہے وہاں آپ نے قالین کی جگہ فرش پر موزے بچھا رکھے ہوں۔" ان کا یہ کہنا تھا کہ یک بارگی پندرہ بیس مردانہ زنانہ قہقہے فضا میں گونجے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان قہقہوں میں ان صاحب کا خود اپنا قہقہہ بھی خاصا نمایاں تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی خفیف اس درجہ ہوئے کہ باقی تمام وقت ان کی زبان کو چپکی لگی رہی۔

کھانے سے فراغت پا کر میں اور نقوی صاحب۔ شوکت صاحب اور جعفری صاحب کو ٹرین پر سوار کرانے ریلوے اسٹیشن چلے گئے۔ گھر سے اسٹیشن تک میں نے شوکت صاحب کو تاکید کی کہ وہ فوراً اپنا "میڈیکل چیک اپ" کرائیں۔ یا فوراً لاہور آ کر اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیں۔ تاکہ میں خود ان کے علاج کی طرف توجہ دوں۔ شوکت صاحب مصروفیت کا عذر کرتے رہے۔ ساتھ ہی اطمینان دلایا کہ "میں ایسا شدید بیمار نہیں کہ تم پریشان ہو۔" تاہم وعدہ کیا کہ "جلدی سے جلدی لاہور آنے کی کوشش کروں گا۔ پھر اپنے دل کے حوصلے نکال لینا۔"

شوکت صاحب بات سے بات نکالنے، جملہ چُست کرنے اور پھبتی کسنے میں جواب نہ رکھتے تھے۔ لاہور ہمیشہ بہت مردم خیز خطہ رہا ہے۔ یہاں آغا حشر۔ حکیم فقیر محمد چشتی۔ پطرس۔ مولانا سالک۔ مولانا حسرت اور محمود نظامی جیسے حضرات اپنے اپنے زمانے میں اس فن کے امام رہے ہیں۔ ان لوگوں کے اُٹھ جانے کے بعد محفلیں سُونی ہو کر رہ گئی تھیں۔ ایک شوکت صاحب ہی تھے۔ جو اس فن کے علمبردار بنے رہے۔ بلکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ ان سب حضرات سے شوکت صاحب کا مقام ایک اعتبار سے اس لیے منفرد اور زیادہ بلند تھا کہ وہ لوگ مسلسل گھنٹوں تک جملے بازی نہ کرتے تھے۔ ایک پھبتی کس دی۔ اور پھر دوسری باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد موقع ملا تو پھر کسی تیز جملے کا نشتر لگا دیا۔ لیکن شوکت صاحب کے یہاں صورت ہی دوسری تھی۔ وہ مسلسل گھنٹوں اور پہروں یہ عمل جاری رکھتے تھے۔ دوسرا موقع دے نہ دے ان کے جملوں کی بمباری اور پھبتیوں کے حملے مسلسل اور متواتر جاری رہتے۔ عام طور پر ادیبوں اور شاعروں کی تحریریں زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ پڑھنے والا ان کے طلسم میں پھنس کے رہ جاتا ہے۔ اور ان سے ذاتی طور پر ملیے تو وہ طلسم ٹوٹ کے رہ جاتا ہے لیکن شوکت صاحب کا معاملہ ہی دوسرا تھا۔ ان کی مزاح نگاری سے کہیں زیادہ ان کی صحبت متاثر کرتی۔ جن لوگوں کو ان سے قرب حاصل رہا۔ ممکن ہے وہ میری اس رائے سے اتفاق کریں۔

شوکت صاحب اور ایک عام ادیب میں کیا فرق تھا۔ اس کی ایک مثال پیش کر دوں۔ پورے ایک مہینے بعد یعنی ۲ اپریل کو پھر میرے یہاں چند احباب کھانے پر جمع ہوئے۔ شامتِ اعمال وہ "موزے والے" صاحب بھی اتفاق سے لاہور میں موجود تھے۔ اور میرے یہاں تشریف رکھتے تھے۔ شوکت صاحب شدید طور پر علیل تھے وہ تو آ نہ سکتے تھے۔

احباب کی دلچسپی کے خیال سے میں نے ایک اور بہت مشہور شاعر کو تشریف لانے کی زحمت دی۔ لیکن یہ بیچارے محفل کا رنگ نہ بھانپ سکے۔ اُدھر وہ موزے والے صاحب اپنی طبیعت سے مجبور تھے۔ اس قسم کی محفلوں میں بیٹھنے کے آداب سے ناواقف۔ ان شاعر کا کلام سُننے کے بعد گو اپنی طرف سے انتہائی نیک نیتی کا ثبوت دیا۔ لیکن جس انداز میں شاعر کی تعریف کی اور انھیں داد دی۔ وہ شاعر سے زیادہ کسی گویّے کی تعریف معلوم ہوتی تھی۔ اس قسم کی داد میں تابڑ توڑ وہ کئی باتیں ایسی کہہ گئے جو خاصی معیوب تھیں۔ شاعر سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ بوکھلا گئے۔ اور خفّت کے مارے پسینہ پسینہ ہو گئے۔ اب یہ نہیں کہہ سکتا کہ فی الواقعی ان بیچارے کو کوئی جواب نہ سُوجھا۔ یا محض اس خیال سے خاموش ہو گئے کہ میرے غریب خانہ پر کسی قسم کی بدمزگی نہ ہو۔ اتفاق سے اس محفل میں چند احباب وہ بھی تھے۔ جو مہینہ بھر پہلے ۳ مارچ کی نشست میں بھی موجود تھے۔ محفل برخاست ہوتے ہی ان سب کی زبان پر یہ جُملہ تھا۔ کہ ”نہ ہوئے آج شوکت صاحب اوّل تو اُن کی موجودگی میں ان صاحب کو بولنے کی ہمّت ہی نہ پڑتی۔ اور اگر اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر کوئی اوٹ پٹانگ بات کر بھی بیٹھتے۔ تو شوکت صاحب انھیں ان کے صحیح مقام پر پہنچا دیتے۔“ لطف کی بات یہ ہے۔ کہ یہ رائے ان اصحاب کی بھی تھی۔ جو زندگی میں ان سے صرف ایک یا دو بار ملے۔ میرا اور شوکت صاحب کا تو اچھا خاصا پندرہ سولہ سال کا ساتھ تھا۔ اور میں ان کی متنوّع شخصیت کے ہر پہلو سے آگاہ تھا۔

”لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم“ کے مصداق معاف فرمائیے گا۔ میں روانی میں نہ جانے کیا کچھ لکھ گیا۔ اس کے بعد کی داستان انتہائی اندوہناک ہے۔ بیان کرنا تو درکنار۔ جس کے تصوّر سے بھی ایک عجیب درد و کرب محسوس ہوتا ہے۔ اب تک میں شوکت صاحب کے ساتھ گزرے ہوئے طربیہ لمحات کا ذکر کرتا رہا ہوں۔ ہمّت ہوئی۔ تو اس داستان کا المیہ پہلو آپ کے سامنے پھر کبھی پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

میرے تاثرات

ڈاکٹر میمونہ بیگم انصاری

خزاں کی تعطیلات گزارنے کے لئے میں گھر پہنچی ہی تھی کہ ریڈیو پاکستان سے آتے ہوئے ایک فون سے مجھے اطلاع ملی کہ شوکت تھانوی بیمار ہیں اور ان کے احباب انہیں دیکھنے لاہور جا رہے ہیں۔ اللہ خیر کرے۔ کیا شوکت تھانوی اتنے سخت علیل ہو گئے ہیں۔ کہ پنڈی چھوڑ کر لاہور جا چکے ہیں۔ لیکن وہ تو تمغۂ امتیاز لینے لاہور گئے تھے میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ جی ہاں یہ اعلیٰ اعزاز حاصل کرنے کے بعد وہ واپس پنڈی نہ آسکے۔ علالت نے وہیں شدت اختیار کر لی۔ ڈاکٹروں نے کینسر تجویز کیا ہے۔ اور دنیا کو ہنسانے والا یہ ادیب اس اعلان کا متحمل نہ ہو سکا ایسا دھکا لگا کہ لاعلمی میں جو حالت برسوں میں جا کر ہوتی وہ اس انکشاف سے دنوں میں ہو گئی۔ اللہ رحم کرے۔

واپسی پر ان لوگوں نے بتایا کہ حالت گرتی جا رہی ہے لیکن ابھی تک معالجین پر امید ہیں۔ کچھ اطمینان اور بے اطمینانی کی سی کیفیت تھی۔ دل چاہتا تھا کہ عیادت کے لیے جاؤں۔ لیکن گوناگوں مصروفیات نے اس کا موقعہ نہ دیا۔ پھر یہ بھی تو معلوم نہ تھا کہ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو جائے گا کسے خبر تھی کہ آنے والی عید الضحیٰ اپنے ساتھ اس ظریف کی موت کی خبر لے کر آئے گی۔ اف کس قدر بے کیف عید تھی۔ اردو دنیا کا یہ انجمن بہ داماں ادیب ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

ادیب و شاعر کی حیثیت سے شوکت تھانوی کی کیا فتوحات ہیں۔ میرا یہ موضوع نہیں۔ میں نے یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ ۱۹۴۷ء کے اس بحرانی دور میں اس سراسیمگی و خلفشار کے زمانہ میں انہوں نے اپنے انداز کو کس طرح نبھایا۔ ایک خاص زاویہ نظر سے کام لینا اور اس میں کمال حاصل کرنا کسی کسی کا کام ہوتا ہے۔ وہ پرانے ادیب تھے اور ہمیشہ کے زود نویس، تقسیم سے پہلے ہی کئی درجن کتابوں کے مصنف تھے۔ اپنے مخصوص انداز میں بڑے پتے کی بات کہہ دینے کے عادی "سودیشی ریل" ان کے اس دور کا شاہکار رہے وہ ان چند ادیبوں میں ہیں کہ اس زمانہ میں ان پر جمود و سکوت طاری نہ ہوا بلکہ اس آشوب میں برپا ہونے والا ہر واقعہ ان کی سمند طبع پر تازیانہ ہوا کرتا تھا۔ اور یہ تازیانے انہوں نے "قاضی جی" کی شکل میں مجتمع کر دیئے ہیں۔ اس دوران میں انہوں نے جو کتابیں لکھیں وہ ہمارے قومی کردار کی تشکیل پر تنقید ہی نہیں بلکہ تعمیر میں بڑی معاون ہیں۔ ان تصانیف میں ظرافت و مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کے نشتر بھی چھپے ہوئے ہیں۔ ان آئینوں میں ہم قہقہے لگاتے ہوئے اپنے خط و خال بھی دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن قہقہے کی ایک نئی لہر اس طرح آتی ہے کہ طبیعت کے تمام تکدر کو اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔ یہی ان کا فن ہے اور یہی اسلوب۔

شوکت تھانوی مرحوم ذکی الحس اور ذہین انسان تھے۔ حاضر دماغی کا یہ عالم تھا کہ ہر موقع پر برجستہ لطیفے سننے میں آتے تھے۔ دفتری کارروائی ہو یا مشاعرہ کی محفلیں یا احباب کا مجمع ہر موقع پر وہ کشتِ زعفران بنے رہتے تھے۔ ۱۹۶۱ء کی گرمیوں کی بات ہے۔ روزنامہ جنگ کا دفتر راولپنڈی منتقل ہو گیا تھا۔ شوکت تھانوی اس کے ایڈیٹر کی حیثیت سے پنڈی آ چکے تھے یہ وہ زمانہ تھا کہ بزم اردو راولپنڈی میں نئی نئی قائم ہوئی تھی۔ لوگوں کا اصرار تھا کہ اس کی رسم افتتاح کے لئے کوئی اچھا پروگرام ہونا چاہیئے۔ بہت غور و خوض کے بعد ایک مختصر سے مشاعرے کی تجویز پاس ہوئی۔ کراچی سے منتقل شدہ وزارتوں اور دفاتر میں اچھے ادیب و شعراء اور اصحاب ذوق آ گئے تھے۔

مزاحیہ ادیبوں اور شعراء میں شوکت تھانوی اور سید محمد جعفری کا چرچا۔ بڑی احتیاط سے فہرستیں مرتب کی گئیں سننے والوں اور سنانے والے دونوں قسم کے اصحاب کے انتخاب میں اعلیٰ معیار اور اعلیٰ ذوق کو مدِ نظر رکھا تھا۔ مزاحیہ شعراء میں شوکت تھانوی کا نام سرِ فہرست تھا۔ میں بزم کی جنرل سیکرٹری تھی۔ مہمانوں کو خصوصی اصرار کے ساتھ مدعو کرنا میرا فرض تھا۔ رابطہ ضبط کے معاملہ میں مجھے ہمیشہ الجھن ہوتی ہے مہمان بننا آسان سمجھتی ہوں میزبان کے فرائض ذرا نازک ہوتے ہیں۔ رفقا میں سے کسی نے کہا شوکت تھانوی اور سید محمد جعفری کو بلانے پر کلیم صاحب کو مقرر کرنا چاہیئے۔ کلیم صاحب نے حسبِ معمول کہا۔ شوکت اپنا یار ہے۔ پر کچھ توقف کے بعد فرمانے لگے لیکن، لیکن ڈاکٹر صاحبہ آپ خود فون پر بات کر لیجئے۔ تعارف تو ہو گا نا...... بس بس...... چلیئے چھٹی ہوئی۔ الجھن تو بہت ہوئی لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ ذمہ داری لینا ہی پڑی۔ لاہور میں دو ایک مرتبہ شوکت صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ طالبعلمانہ انداز ریڈیو پروگراموں کا سلسلہ لیکن اب نوعیت اور تھی۔ پھر یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ شاعر کو مشاعرے میں مدعو کرنا اور مشاعرے کی محفل تک پہنچا دینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

شوکت تھانوی ہی سے بسم اللہ کی۔ فوراً پہچان گئے۔ نہ صرف آنے کا وعدہ کیا بلکہ سید محمد جعفری اور چند شعراء کو لانے کا ذمہ بھی لے لیا۔ ۳ جون ۱۹۶۱ء کا یہ مشاعرہ راولپنڈی میں ایک تاریخی مشاعرہ ہے۔ میں اس زمانہ میں ایک مقامی کالج سے وابستہ تھی۔ نشست کا انتظام و اہتمام چونکہ میرے سپرد تھا۔ اس لئے میں نے سہولت اس میں دیکھی کہ کالج کے خوبصورت و شاداب سبزہ زار پر ہی نشست کا اہتمام کیا جائے۔ رفقائے کار نے بھی بخوشی منظوری دے دی۔ راولپنڈی میں کیسی ہی گرمی ہو لیکن اس کے موسم کی یہ خصوصیت ہے کہ شام بڑی خوشگوار ہوتی ہے۔ ۳ جون کی یہ شام بھی دلکش تھی۔ پھر مشاعرے کی کشش شہر کے پڑھے لکھے ارباب ذوق شعراء اور ادباء کے علاوہ حکومت پاکستان کے سیکرٹری اور اعلیٰ افسران کو بھی کھینچ لائی تھی۔ عین سات بجے مہمانوں کو عصرانہ دیا گیا۔ شوکت تھانوی اب تک نہ آئے تھے۔ میں کچھ پریشان تھی۔ لیکن مجلس استقبالیہ کے ممبران نے مجھے بتایا کہ تین کاریں شوکت صاحب کو لینے گئی ہیں۔ اسی وقت مجھے شوکت صاحب مع اپنی بیگم صاحبہ اور تینوں صاحبزادیوں کے کار سے اترتے ہوئے نظر آئے۔ ان کے ہمراہ سید محمد جعفری اور دو تین شعراء بھی تھے۔ بعد کو یہ بات میں نے محسوس کی کہ شوکت صاحب کی یہ عادت تھی کہ وہ ہمیشہ محفل میں تاخیر سے آتے اور مہمانوں کے جانے کے بعد دیر تک قیام کرتے۔

شوکت صاحب کے آتے ہی مشاعرہ شروع ہوا اس کی صدارت ڈاکٹر صفدر حسین صاحب نے کی جو ان دنوں جہلم گورنمنٹ ڈگری کالج میں پرنسپل تھے۔ اور آج کی تقریب میں شرکت کی غرض سے پنڈی آئے تھے۔ شوکت صاحب کی اطلاع کے بغیر ہم نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اسٹیج سیکرٹری کے فرائض شوکت صاحب انجام دیں گے۔ چنانچہ صدر کے تعارف کے بعد مرحوم سے درخواست کی کہ وہ مشاعرہ کی کارروائی انجام دیں ان کے لئے یہ اعلان خلاف توقع تھا۔ لیکن بغیر کسی عذر معذرت کے انہوں نے درخواست قبول کر لی۔ اس مشاعرے

۱۹۶۳ء کی عید سے ایک دن قبل یوم الحج شوکت صاحب کا انتقال ہوا۔

میں مقامی شعراء کے علاوہ ان شعراء نے بھی اپنا کلام پڑھا جو حسن اتفاق سے پنڈی میں موجود تھے۔ اور کل ہند و پاک شہرت کے حامل ہیں۔ مشاعرہ جتنا ستھرا تھا۔ اس کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو شریک محفل تھے۔ اس مشاعرے کی کامیابی کا سہرا منتظمین کے سر نہیں بلکہ شوکت تھانوی مرحوم کی بذلہ سنجی کے سر رہا۔ جنہوں نے ہر شاعر کا کچھ ایسے برجستہ اور ظریفانہ انداز میں تعارف کرایا۔ کہ ساری محفل کشتِ زعفران بن گئی۔ اس وقت قارئین کو مبالغہ معلوم ہوگا۔ کہ دو گھنٹے کی اس نشست نے تقریباً ۵ گھنٹے تک طول کھینچا۔ اور اس دوران میں پورے وقت مرحوم مشاعرے پر چھائے رہے۔ شاعر کے آنے سے قبل اور اسٹیج سے اس کی رخصت کے وقت لوگ کلام سے زیادہ ان فقروں کے منتظر رہتے جو اس کے بارے میں شوکت تھانوی مرحوم کی زبان سے ادا ہوتے تھے۔ گھنٹوں یہ سلسلہ جاری رہا نہ سامعین تھکے اور نہ ہی مرحوم کے پاس بذلہ سنجی اور ظرافت کے گلہائے تازہ کی کمی ہوئی۔ یہاں چند مثالیں بے موقعہ نہ ہوں گی۔

مشاعرے میں نظم اکبر آبادی صاحب بھی تھے۔ شوکت تھانوی نے اعلان کیا۔

"اب میں غزل پڑھنے کے لئے نظم اکبر آبادی کو بلاؤں گا۔"

مشاعرے میں الطاف پرواز اور کرم حیدری نے کلام سنایا۔ ان کے لئے اعلان سنیئے۔

"الطاف کے بعد کرم سے درخواست ہے کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔"

راز مراد آبادی سے جو کہ راولپنڈی کے قریب واہ میں مقیم تھے۔ دوسری مرتبہ کلام کی درخواست اس طرح کی۔

"جناب راز مراد آبادی کا طریقہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ نظم یہ کہہ کر سناتے ہیں کہ میں واہ جا رہا ہوں۔ اور جب ان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مجمع سخن فہموں کا ہے تو وہ واہ جانا ملتوی کر کے دوسری غزل بھی سنا دیا کرتے ہیں۔ تو میں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی وضع کے مطابق دوسری غزل بھی سنا دیں۔

عطا حسین کلیم اسسٹنٹ ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان طویل القامت انسان ہیں۔ مشاعرے میں یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ لوگ کرسی پر بیٹھ کر اپنا کلام پڑھیں۔ کلیم صاحب بیٹھ کر بھی بہت سے کھڑے ہوئے لوگوں سے اونچے ہی رہتے ہیں۔ ان کی تشریف آوری پر مرحوم نے اعلان کیا۔

"چھوٹے منہ سے ایک بڑی بات کرنے والا ہوں۔ اب میں عطا حسین کلیم سے درخواست کرتا ہوں وہ تشریف لائیں۔

محفل قہقہوں سے گونج اٹھی۔ اسی میں کلیم صاحب کرسی پر رونق افروز ہو گئے۔ شوکت صاحب نے پھر کھڑے ہو کر معذرت کی۔

"آپ لوگوں کو یہ بھی شکایت ہوگی کہ سب سے میں نے بٹھا کر پڑھوایا ہے۔ اور کلیم صاحب کو اس سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ لیکن حضرات یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔"

سید محمد جعفری نے اپنی نظم "خلائی سفر" سنائی تھی لوگوں کا اصرار تھا کہ وہ مردم شماری بھی سنائیں۔ اور شوکت تھانوی سے اصرار کیا جا رہا تھا کہ "فیملی پلاننگ" والی نظم سنائیں۔ شوکت صاحب نے سید محمد جعفری سے دوسری نظم سنانے کی درخواست کی اور کہا۔

"خواتین و حضرات! یہ فرمائش ہے خواتین کی اور جعفری صاحب بہت با اخلاق آدمی ہیں۔ یہ خواتین کی فرمائش رد نہیں کرتے.....

سامعین میں سے کچھ نے کہا آپ سے بھی خواتین کی فرمائش ہے۔

کہنے لگے ہاں میں بھی کافی با اخلاق ہوں ان کی فرمائش رد نہیں کرتا۔

حضرت نیر اکبر آبادی سے جب دوسری مرتبہ پڑھنے کی فرمائش کی تو انہوں نے کہا شوکت صاحب مجھے تو معاف کریں آپ

اپنی نظم سنا دیجیے

کہنے لگے اگر آپ کو معاف کر دوں تو اپنے آپ کو معاف نہ کر سکوں گا اور مشاعرے سے اپنی بیوی کو بٹھانا پڑے گا۔ بچوں کو بھی ساتھ لایا ہوں۔ فوراً اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ جب لوگوں کا اصرار بہت بڑھا تو کہا۔

"میں آپ کو چند شعر اور سنائے دیتا ہوں۔ حال ہی میں جب ملکہ الزبتھ نے ہندوستان کا دورہ کیا تو وہاں کے میئر نے ان کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ بھارت کے سب سے بڑے کوی نے ایک چھند کہا ہے ؎

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

میں سمجھ گیا کہ ہندی ساہتیہ سمیلن والے غالب کے اشعار کا ترجمہ ضرور کروائیں گے تو ان کا ہاتھ بٹانے کے لئے میں نے نمونۃً ترجمہ کر لیا ہے۔ ان کو بھیج دیا ہے۔ سنا بھی آیا ہوں۔ ع

یہ کہہ کر اس غزل کا ع
دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے۔

ترجمہ سنایا۔ بہت پسند کیا گیا۔ اور محفل ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔

غرض ایک بجے تک مشاعرہ جاری رہا۔ راولپنڈی کے اطراف و جوانب سے لوگ آئے تھے اور اسی وقت واپسی تھی۔ لیکن نشست اتنی دلچسپ تھی کہ ختم کرنے کو طبیعت نہ چاہتی تھی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ قیامِ پاکستان کے بعد اتنی ستھری نشست دیکھنے میں نہیں آئی۔ اکثر شعراء نے دو دو مرتبہ کلام سنایا ایسے موقعوں پر بہت شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن شوکت صاحب کا یہ متنوع انداز ہی تھا کہ چھوٹے بڑوں میں سے کسی کو شکوہ نہ ہوا۔

۱۵ مارچ ۱۹۶۲ء کا "یوم غالب" بھی راولپنڈی کے ادبی حلقوں میں ایک یادگار تقریب ہے۔ جس کا انعقاد بھی بزمِ اردو راولپنڈی" کے زیرِ اہتمام تھا۔ نشست کی صدارت ہاشم رضا صاحب نے کی جو ان دنوں حکومتِ پاکستان کے انفارمیشن سیکرٹری تھے۔ اس موقع پر بھی شوکت تھانوی مرحوم نے جس نباہی اور حوصلہ افزائی سے کام لیا اس کا تاثر میرے لئے ناقابلِ فراموش ہے۔ تین دن پہلے میں نے انہیں مدعو کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اس نشست کے لئے میں نے ایک بالکل نئی چیز لکھی ہے۔ لیکن روزنامہ جنگ سے معاہدہ کے مطابق اس کا کچھ حصہ اس اخبار کے کالم میں دینا پڑے گا۔ میں نے کہا شوکت صاحب وہی غنیمت ہے۔ بزم کی یہ نشست بڑی کامیاب رہی۔ اوّل تو ہاشم رضا صاحب کا خطبہ صدارت دوسرے یوسف ظفر صاحب کا پُر مغز مقالہ اور پھر شوکت تھانوی کی نئی تخلیق غالب و بیگم غالب خصوصاً اس کو پڑھتے وقت شوکت صاحب کا اندازِ بیان۔

سب سے زیادہ جس چیز نے مجھے متاثر کیا ہے۔ وہ مرحوم کی انکساری تھی۔ بزم میں کام کرنے کے دوران میں میں نے اکثر محسوس کیا اور مجھے خوشی ہوئی ہے کہ رفقائے بزم اور ان فن کاروں کے ساتھ کام کر کے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اگر خواتین اپنے اصولوں کی پابندی کے ساتھ کوئی سماجی کام کرنا چاہیں تو ہمارے مردوں میں آج بھی یہ صلاحیت ہے کہ ان سے قرار واقعی احترام ملنے کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ شوکت صاحب سے راولپنڈی میں اکثر و بیشتر ملنے کا اتفاق ہوا۔ ہر موقع پر مجھے ان کی انسانیت، شرافت، انکساری بذلہ سنجی اور حاضر دماغی کا معترف ہونا پڑا۔ جس محفل میں وہ ہوتے بوریت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ایک دفعہ سنسر بورڈ کی ایک نشست تھی فلم "چراغ جلتا رہا" دکھایا جا رہا تھا۔ سنسر بورڈ کے ممبران جن میں اعلےٰ افسران وغیرہ کے علاوہ وزارتوں کے چند سیکرٹری بھی تھے۔ فضلی صاحب

خود بھی تھے۔ دفعتہ بجلی چلی گئی۔ شوکت صاحب اس بورڈ کے رکن کی حیثیت سے موجود تھے۔ فضلی صاحب کا اضطراب دیکھنے کے لائق تھا۔ بھلا شوکت تھانوی اس موقع کو کیوں ہاتھ سے جانے دیتے لطیفے چل نکلے۔ بجلی تقریباً آدھ گھنٹہ غائب رہی۔ لیکن ان لطیفوں میں وقت گزرتا معلوم نہ ہوا سب لوگ جمے بیٹھے رہے۔

آخری زمانہ میں انہوں نے مرثیہ گوئی کی صلاحیت کا جو اظہار کیا ہے وہ قابلِ ذکر ہے۔ انہوں نے مرنے سے تقریباً ایک سال پہلے ایک طویل مرثیہ واقعہ کربلا پر لکھا تھا۔ جو بڑا کامیاب اور تاریخ مرثیہ گوئی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ اور بلا شبہ مرحوم کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ احباب کی چھوٹی موٹی نشستوں کے علاوہ انہوں نے اسے دبستان انیس" راولپنڈی کے یوم افتتاح کے موقع پر بھی سنایا اور لوگوں نے بہت پسند کیا۔ اس مرثیہ میں نہ صرف ان کا منفرد انداز بلکہ ان کی اہلِ بیت سے جو عقیدت تھی وہ بھی نمایاں ہے۔

شوکت تھانوی عوام میں بڑے ہردلعزیز تھے۔ اس سلسلہ میں ان کو وہ درجہ حاصل تھا جو انگلینڈ اور یورپ کے ادیبوں کو ان کی زندگی میں مل جاتا ہے۔ ورنہ اردو کے ادیب اتنے خوش قسمت کہاں۔ ان کا پروگرام "قاضی جی" اردو ادب کی تمام تاریخ میں ایک خاص نوعیت کا حامل ہے۔ اس پروگرام سے جہاں ان کی طبیعت کی ہمہ گیری اور ان کی فطری ظرافت پر روشنی پڑتی ہے وہاں ان کی تحریری صلاحیتیں بھی اجاگر ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے اس عنوان کے تحت ہر موضوع پر قلم اٹھایا۔ یہ پروگرام پاکستان کی پوری تاریخ پر حاوی ہے اور کمال یہ ہے کہ سننے والوں کو ان سولہ سترہ سالوں میں کبھی تکرار کی شکایت نہیں ہوئی۔ آخری دم تک یہ پروگرام ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتا رہا۔ اس دوران میں وہ اعتراضات کی منزلوں سے گزرے۔ لیکن قبول عام کا سیلاب ان سنگ ہائے گراں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔ اور یقیناً مرحوم اپنی مزاحیہ تصانیف سے زیادہ اس پروگرام کے ذریعہ لوگوں میں مقبول ہوئے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا۔ کہ شوکت تھانوی کی ہردلعزیزی ریڈیو پاکستان کی ہردلعزیزی کا لازمہ بن گئی۔ آج ایسا لگتا ہے کہ شوکت تھانوی کے ساتھ ریڈیو پاکستان کی دلکشی میں فرق آ گیا ہے۔ اس کے پروگراموں پر ایک بے کیفی طاری ہے۔ اور یہ بھی ٹھیک ہے۔ ؎

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔

میں اور شوکت بھائی

بیگم خورشید حفیظ جالندھری

۱۹۴۷ء میں پارٹیشن کے بعد — آٹھ روز ریل میں مر کھپ کر — بُرے حال بانکے وہاڑے، ۲۱ ستمبر کو جب لاہور ریلوے اسٹیشن پر اُتری تو محشر کے میدان سے کچھ کم نظر نہیں آتا تھا۔ خدا وہ منظر کسی دشمن کو بھی اب نہ دکھائے — زخمیوں کی چیخ و پکار جن کے بے کس و مظلوم عزیز ریل میں سفر کے دوران ظالموں کے ہاتھوں کٹ کر مر گئے تھے اور جو کچھ ادھ موئے باقی رہ گئے تھے۔ اُن کے عزیز و اقارب اُن کو اس بُری حالت میں دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے — بہت سی مُردہ لاشیں ریل سے اُتاری جا رہی تھیں۔ اس ہولناک ماتم میں سب شریک تھے — کسی کو اپنا ہوش نہیں تھا — کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی — چاروں طرف افراتفری مچی ہوئی تھی — ریلوے اسٹیشن پر ہزاروں یکے بعد دیگرے ناموں کی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی کہ فلاں نام کا مرد — یا عورت موجود ہو تو وہ ہمارے پاس ویٹنگ روم میں آجائے — اُس کے رشتے دار اُس کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں — میں نے اپنے کانوں سے اپنے نام کی اناؤنسمنٹ ہوتے سُنا مگر کانوں پر یقین نہیں کیا۔ جب کئی بار یہی آواز سُنی کہ اگر خورشید بیگم ڈرامہ آرٹسٹ یہاں موجود ہوں تو وہ فوراً اپنی خیریت کی اطلاع لاہور ریڈیو اسٹیشن پر ٹیلیفون کے ذریعے دیں۔ لاہور میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ مجھے ریل کے سفر کے دوران قتل کر دیا گیا ہے — اس خبر سے میرے ساتھ کام کرنے والوں کو بہت دُکھ ہوا — میرے ڈراما ڈائریکٹر سلیم شاہد نے میرے ساتھیوں کے کہنے پر متواتر کئی روز تک میرے نام کی اناؤنسمنٹ کرائی — یہ آواز سُننے کے بعد بھی میرے حواس مستقل طور پر درست نہیں ہوئے تھے — آٹھ روز کی بھوکی پیاسی اتنے دہشت ناک حادثے ان آنکھوں سے دیکھتی ہوئی ریل سے اُتری تو یہاں بھی کہرام ہی مچا دیکھا — لاکھوں کی تعداد میں لوگ اپنے عزیزوں کا ماتم کرنے کے لیے اسٹیشن پر موجود تھے — میں نے بمشکل اپنے حواس درست کئے اور ریلوے اسٹیشن سے ہی ریڈیو اسٹیشن ٹیلیفون کیا — ٹیلیفون پر شوکت صاحب بولے — میرا نام سُن کر انھوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا — اور فرمایا اسٹاف کے سب فرد آپ کی خیریت چاہتے تھے — خدا کا شکر ہے آپ اور آپ کے سب احباب خیریت سے پہنچ گئے — میں آپ کی خیریت کا پیغام آپ کے سیکشن میں ابھی پہنچائے دیتا ہوں۔

دہلی میں شوکت صاحب اور امتیاز علی تاج صاحب کے بہت سے ڈراموں میں مَیں نے حصّہ لیا ہے — شوکت صاحب کا ڈرامہ "میر صاحب کی بقرعید" اور ان کی کتاب "سودیشی ریل" یہ دونوں مجھے بہت پسند تھے — اکثر امتیاز صاحب اور شوکت صاحب سے ملنے کو دل چاہتا — مگر خدا نے کن ہنگاموں کے بعد ان دونوں ادیبوں کی شکلیں دکھائیں — دہلی سے لاہور تک آنے میں

جن حادثوں سے دوچار ہونا پڑا — اُن کا دل پر کافی گہرا اثر پڑا — میں اپنے گھر اور اپنے وطن والوں کو اس بُری طرح برباد ہوتے دیکھ کر بہت بددل سی ہو گئی تھی — نہ جانے کیوں — مجھے یقین کے ساتھ یہ اُمید بندھ گئی تھی کہ مجھے اب ریڈیو پر ملازم نہیں رکھا جائے گا مگر میرے لاہور آنے کے کوئی پندرہ دن بعد مجھے یہ پیغام ملا کہ بخاری صاحب سب آرٹسٹوں کو جمع کرنا چاہتے ہیں — پیر کے روز مجھے بھی بلایا گیا — خیر میں بخاری صاحب کا نام سُن کر اُن کی میٹنگ میں شامل ہو گئی — بخاری صاحب نے ہم سب برباد شدہ آرٹسٹوں سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا — بہت سی تسلی، تشفی کے بعد ہم سب آرٹسٹوں کو درجہ بدرجہ ملازم رکھ لیا گیا — خدا کے حکم سے دہلی میں بھی ہم سب آرٹسٹوں کی بڑی اہمیت تھی — یہاں بھی ہم کو افضل سمجھا گیا — اس ملازمت کے ذکر کے ساتھ مجھے اپنا ایک چھوٹا سا لطیفہ یاد آ گیا — جب مجھے لاہور ریڈیو پر ملازم رکھ لیا گیا تو بخاری صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ ہم سب کے کنٹریکٹ حفیظ ہوشیارپوری کے پاس ہیں۔ وہ اُوپر کی منزل کے کمرے میں بیٹھتے ہیں ان کے پاس جا کر دستخط کر دیں — اُن دنوں میری بدحواسی کا عالم بھی کچھ کم نہ تھا — میں اُوپر کی منزل میں گئی کمرے میں شوکت بھائی اور حفیظ ہوشیارپوری دونوں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے — میری اُن دونوں سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ ہاں تو میں کمرے میں داخل ہوئی اور حفیظ ہوشیارپوری سے مخاطب ہو کر پوچھا "جی حفیظ شکارپوری کون سے کمرے میں بیٹھتے ہیں مجھے کنٹریکٹ پر دستخط کرنے ہیں۔ حفیظ صاحب نے بہت خشک منہ بنا کر کہا آئیے اندر آ جائیے — اُدھر شوکت بھائی کی بے ساختہ ہنسی نکل پڑی — مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے — کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور حفیظ ہوشیارپوری سے فرمایا۔ آپ نے اپنی تعریف سُن لی اور مجھ سے کہا۔ تھے تو یہ ہوشیارپوری مگر آج سے شکارپوری ہو گئے ہیں — مجھے اپنی اس غلطی پر شرم آئی مگر شوکت بھائی نے اُس شرم کو بھی اپنی چند اور باتوں سے بھلا دیا — ملازمت کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ آج کل ڈراموں کا دورِ خزاں ہے۔ ڈراموں کے بدلے ایک اور فیچر پروگرام روزانہ پیش ہو رہا ہے — جس کا عنوان ہے "پاکستان ہمارا ہے" یہ پروگرام شوکت بھائی، میاں لطیف الرحمٰن اور خود امتیاز علی تاج صاحب لکھتے اور پیش کرتے — اُس پروگرام میں، مَیں خود، امتیاز صاحب اور ان کے بھتیجے نسیم ممتاز اور کبھی کبھی موہنی داس بھی حصّہ لیتی۔ یہ پروگرام رات آٹھ بجے سے ساڑھے آٹھ بجے تک نشر ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور پروگرام براڈکاسٹ ہوتا — لوگوں کے نام پیغام ریڈیو کے ذریعے دوسرے ملکوں میں ان کے عزیزوں کو پہنچانا۔ ان کی خیریت کی اطلاع دینا اور یہ بتانا کون کہاں ہے — مجھے اس پروگرام میں بھی حصّہ لینا پڑتا تھا۔ آخر کار خدا خدا کر کے یہ مصیبت کے دن بھی ٹل گئے تو لاہور ریڈیو میں بھی روشنی کی کرن نظر آنے لگی — وہ کرن تھے شوکت تھانوی — شوکت بھائی نے ایک فیچر پروگرام خود لکھنا اور پیش کرنا شروع کیا — جس کا عنوان تھا "قاضی جی" — عوام نے شوکت بھائی کے قاضی جی کو بہت ہی پسند کیا۔ گھر گھر قاضی جی کی شہرت کا چرچا تھا غرض قاضی جی بہت مقبول ہوا۔ شوکت بھائی قاضی جی کا رول خود کرتے تھے اور ان کی لاڈلی اکلوتی زبیدہ بہن کا کردار میں ادا کرتی — اُن کی بیوی موہنی داس بنتی — اور بیوی کے بھائی کا پارٹ عقیل احمد ادا کرتے — لاہور سے قاضی جی "سات سال تک برابر ہر پیر کی شام سوا آٹھ سے ساڑھے آٹھ بجے رات تک نشر ہوتا رہا۔

اُن ہی دنوں شوکت بھائی نے عورتوں کے پروگرام میں خالہ جان کے نام سے ایک فیچر پروگرام لکھنا اور پیش کرنا شروع کیا۔ جس میں فلم ایکٹریس بتو خالہ جان بنتی تھیں اور ان کی بھانجی کا کردار میں کرتی اور خود شوکت بھائی ایک بیکار نااہل امیدوار لڑکے کا رول کرتے تھے جو خالہ جان کی چہیتی بھانجی سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا۔ لڑکا جب بَر دکھاوے کے لیے پیش کیا گیا تو اُس کی

بہن نے اُس کی ہزاروں خوبیاں بیان کیں مگر برعکس اِس کے لڑکا توتلا اور ہکلا تھا۔ کانوں سے اونچا سنتا تھا۔ اَن پڑھ تھا اور بہت سی ایسی ہی قسم کی خوبیوں کے باوجود اشاروں میں بات کرنے کا ماہر تھا۔ لڑکی کو اُس کی شکل سے ہی سخت چڑ تھی شادی کیا خاک ہوتی۔ یہ پروگرام بھی بہت ہی دلچسپ تھا۔ اور پھر شوکت بھائی کی شرارتیں معاذ اللہ ریہرسل کے دوران بہو سے خوب گاڑھی چھنتی۔ بہو بھی سونے پر سہاگہ کا کام کرتی تھیں۔ وہ بھی شوکت بھائی سے نہ دبتی خوب تڑاخ پڑاخ جواب دیتی۔ ان دونوں کی اس پُرلطف نوک جھونک سے اسٹوڈیو کی فضا بدل جاتی۔ ہر ایک ہنستا کھلکھلاتا نظر آتا۔

مجھے اپنی شادی کے بعد مجبوراً ملازمت چھوڑنی پڑی۔ میری ملازمت چھوڑنے کے کچھ عرصے بعد شوکت بھائی کا دل بھی لاہور سے کھٹّا ہو گیا۔ کیونکہ شوکت بھائی کو اور دوسرے سننے والوں کو میری کمی بھی اچھی خاصی محسوس ہونے لگی تھی بقول شوکت بھائی کے — کچھ دن بعد شوکت بھائی لاہور چھوڑ کر کراچی چلے گئے۔ کراچی سے بھی قاضی جی کافی مدّت تک نشر ہوتا رہا۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہاں قاضی جی کی کاسٹ کیا تھی۔ کیونکہ شادی کے بعد میں گھریلو اُلجھنوں میں کچھ اس بُری طرح مُبتلا ہوئی کہ مجھے سر اُٹھانے کی بھی فرصت نہ ملی۔ جس ماحول میں اتنی طویل مدّت بسر ہوئی تھی وہ سب خواب و خیال ہو کر رہ گیا۔ اگر گاہے گاہے کوئی جانی پہچانی صورت نظر بھی پڑ جاتی تو میں اپنے گھر کے ماحول سے ڈر کر اُس سے بات تک کرنے سے بھی گریز ہی کیا کرتی۔ مگر آج پرانی یادوں کو یاد کر کے دل پر سانپ سا لوٹ رہا ہے۔ ہاں تو بات شوکت بھائی کی تھی اور میں اپنی باتیں لے بیٹھی ہوں۔ شوکت بھائی کراچی ریڈیو سے بھی ملازمت کو خیرباد کہہ کر اخبار جنگ کے ایڈیٹر بن گئے اور کچھ دن کراچی رہ کر پھر راولپنڈی میں آ کر مقیم ہو گئے۔ اور راولپنڈی ریڈیو سے بھی "قاضی جی" برابر براڈ کاسٹ ہوتا رہا۔ میری آنکھوں کے سامنے اس وقت بھی شوکت بھائی ہیں — وہ بہت ہی پیاری شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اعلیٰ درجے کے ادیب، بلند پایہ شاعر، کہانی نویس، ڈراما رائٹر، ڈراما ڈائرکٹر اور طنز و مزاح میں اپنا خاص مقام رکھتے تھے اور وہ حاضر جواب بھی تھے۔ غرض شوکت بھائی میں بہت سی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے وہ ہر دلعزیز تھے۔ وہ ہمیشہ ہم سب سے بہت خلوص اور محبت سے پیش آتے۔ مجھے شوکت بھائی اپنی خوبیوں کی وجہ سے زیادہ عزیز تھے۔ شوکت بھائی زیادہ ریہرسلوں کے قائل نہیں تھے۔ صرف الفاظ درست کرانے کے لیے ایک ریڈنگ ضرور کراتے۔ انھیں ہم سب پر اعتماد تھا، تو ہم سب کو اُن پر ناز تھا۔ وہ پروگرام کے بعد بھی اگر کسی سے میرا تعارف کراتے تو یہی کہہ کر کراتے یہ میری زبیدہ بہن ہیں اور میں بھی اُن کے اس کہنے پر بڑا فخر محسوس کرتی — پیارے شوکت بھائی اپنی مسکراہٹیں بکھیرتے پیر کی شام اسٹوڈیو میں داخل ہوتے۔ ہر وقت اُن کی آنکھوں سے شرارت ٹپکتی تھی۔ اپنے مخصوص انداز میں کسی نہ کسی کو اپنی شرارت کا نشانہ بنا لیتے۔ اُن کا مذاق بھی بہت پُرلطف ہوتا تھا۔ پل بھر میں اپنے دماغ سے گھڑ گھڑ کے لطیفے سناتے کہ ہنستے ہنستے ہم سب لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ شوکت بھائی لطیفوں کا تو بھرا پٹارا تھے۔ ان کے دماغ کی روانی سے انجان تو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ سارے لطیفے خود ہی گھڑ گھڑ کر سنا دیے ہیں۔ جب شرارت پر تُل جاتے تو نہ جانے کہاں سے کہاں بہہ جاتے۔ ان کے دماغ میں ذہانت کا کبھی نہ ختم ہونے والا سیلاب بھرا ہوا تھا — شوکت بھائی نفاست پسند بہت تھے۔ صاف ستھرا لباس پہنتے تھے — کبھی اُن کے کپڑوں پر میں نے شکن تک نہیں دیکھی۔ وہ جو بھی لباس پہنتے اُن پر بھلا معلوم ہوتا — میری شادی کے بعد وہ مجھے کئی بار مختلف جگہوں پہ ملے۔ پہلی مرتبہ وہ مجھے کراچی میں کسی کے گھر ملے۔ یہ ڈنر کسی اخبار والے کے گھر پر تھا۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ اُس میں شامل ہوئی تھی۔ شوکت بھائی سے شادی کے بعد میری یہ پہلی ملاقات

تھی۔ وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ خوشی سے ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اُس وقت مجھے بھی یہ محسوس ہوا کہ مجھے مجھ سے بچھڑا ہوا اپنا سگا بھائی مل گیا۔ شوکت بھائی نے چند باتیں مجھ سے کیں۔ تم نے ریڈیو سے کیوں کنارہ کشی اختیار کر لی وغیرہ وغیرہ۔ میری بچی کی عمر اس وقت ڈیڑھ سال تھی اس کو بہت پیار کیا اور کہا یہ اپنے ابا کی ہو بہو ہم شکل ہے۔ اور مجھے ہمیشہ اپنے گھر میں خوش رہنے کی دعا دی اس کے بعد وہ مجھے دو مرتبہ لائل پور کے مشاعرے میں ملے۔ حفیظ صاحب کو اگر کسی مشاعرے میں شامل ہونا ہوتا تو میری بڑی خواہش ہوتی ہے کہ میں بھی ان کے ساتھ جا کر ان کی زبانی ان کا کلام سنوں ــــ لائلپور کے مشاعرہ کا ایک چھوٹا سا لطیفہ یاد آ گیا۔ جب ہم میاں بیوی لائل پور گئے تو بچی بھی میرے ساتھ تھی۔ اُس وقت اُس کی عمر تقریباً تین سال کی تھی۔ اتنی سی بچی کا رات کے دو بجے تک جاگنا بھی مشکل تھا مگر بچی اپنے ابا جان کا کلام سننے کے شوق میں جاگتی رہی۔ شوکت بھائی مشاعرے کی صدارت فرما رہے تھے۔ جب اُن کی باری آئی پڑھنے کی تو انھوں نے سب سے پہلے اپنی مشہور نظم "اے میرے بچے تو پیدا نہ ہو" پڑھی۔ بچی یہ نظم سُن کر بہت خوش ہوئی ــــ خیر رات تو بچی سو گئی۔ صبح رضا کے ابا جان نے کہا "تم اور تمہاری امی یہاں آنے کی بہت ضد کر رہی تھیں۔ رات بھر تم جاگتی رہیں تمھیں تکلیف ہی ہوئی نا ــ اب تم یہ بتاؤ بیٹی رات تم نے کیا سُنا اور تمھیں کیا پسند آیا۔ رضا نے کہا ابا جان مجھے تو سب سے زیادہ وہ شاعر پسند آیا جو مشاعرے میں بچہ پیدا کرتا تھا۔ بچی کی اس بات پر ہم دونوں خوب ہنسے۔ اتفاق سے کچھ دیر بعد ہی ہمارے کمرے میں شوکت بھائی، ظریف جبلپوری اور سید جعفری یہ تینوں حفیظ صاحب کے پاس آئے۔ حفیظ صاحب نے بچی کی پسند شوکت بھائی کو بتائی۔ اور کہا ہم تو تم کو پسند کرتے ہی ہیں۔ ہماری بچی کے تصورات آپ کے لیے اس سے بھی زیادہ اچھے ہیں۔ شوکت بھائی بھی بچی کی بات سُن کر بہت خوش ہوئے وہ زندہ دل اور شگفتہ طبیعت کے انسان تھے۔ چند بڑے مزے دار لطیفے اسی قسم کے اور سُنائے اور بچی کو بہت پیار کیا۔ اُس کی ذہانت کی تعریف کی۔

جن دنوں شوکت بھائی کو حکومت سے پہلی بار اعزاز ملا۔ یہ خبر پڑھ کر مجھے بھی بہت خوشی ہوئی۔ حفیظ صاحب اُن دنوں کراچی تھے اور میں لاہور ــ کسی کام سے میں نے کراچی حفیظ صاحب کو ٹیلیفون کیا اور ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی سُنا دی کہ حکومت کی طرف سے شوکت بھائی کو بھی اعزاز ملا ہے۔ اس اعزاز کے ملنے کے کچھ دن بعد ہم پھر لائل پور مشاعرے میں گئے۔ حفیظ صاحب نے شوکت بھائی کو یہ کہہ کر مبارکباد دی کہ یہ خبر مجھے سب سے پہلے میری بیوی نے سُنائی تھی کہ شوکت بھائی کو بھی اب کے اعزاز ملا ہے۔ شوکت بھائی یہ سُن کر بے انتہا خوش ہوئے اور فرمایا بہن کا رشتہ بہت بلند ہے انھیں زیادہ خوشی ہوئی ہو گی۔ آپ بہنوئی ہیں آپ کو بھی اس رشتے کی وجہ سے خوش ہونا لازمی ہی تھا۔ یہ کہہ کر اُن کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کچھ شرارت سوجھی۔ حفیظ صاحب سے فرمانے لگے۔ آج بھی میں ہی صدارت کر رہا ہوں۔ میں آپ کے نام کے ساتھ اناؤنس کروں گا کہ اب میرے بہنوئی حفیظ جالندھری آپ کو اپنا کلام سنائیں گے۔ کیونکہ آپ اس رشتے سے کسی صورت بھی مُنکر نہیں ہو سکتے۔ حفیظ صاحب نے فوراً جواب دیا میں بھی کہوں گا یہ میرے سالے ہیں۔ اس بات پر ایک دم سب کے قہقہے بلند ہوئے۔ جتنی دیر شوکت بھائی ہمارے کمرے میں بیٹھے رہے کمرے کی فضا ہی بدل گئی تھی۔ ہر ایک خوش۔ بشاش بشاش نظر آتا تھا۔ روتوں کو ہنسانے والے شوکت بھائی۔ مردہ دلوں میں جان پیدا کرنے والے شوکت بھائی۔ آخری بار جب وہ لاہور کے مشاعرے میں شریک ہوئے تو اُن کی آمد کی اطلاع مجھے اخبار کے ذریعے تھی۔ میں نے سید محمد جعفری کے والد کے مکان پر شوکت بھائی کو فون کیا اور گھر آنے کی دعوت دی۔ مگر شوکت بھائی نے اُس وقت

گھر آنے سے معذرت چاہی کیونکہ انھیں پندرہ منٹ بعد ہی تیز گام سے راولپنڈی جانا تھا۔ فرمایا دو ہفتے بعد ملتان مشاعرے میں جاؤں گا واپسی پر ضرور لاہور آؤں گا۔ تم سے مل کر پھر پنڈی جاؤں گا۔ شوکت بھائی نے گھر آنے کا وعدہ بھی کیا مگر میری بدقسمتی سے اُن ہی دنوں وہ بیمار ہو گئے ظالم موت کی وجہ سے اپنا وعدہ ایفا نہ کر سکے۔ ان کی یاد کے ساتھ بہت سی اور پرانی یادیں وابستہ ہیں۔

مجھے دس اپریل کی صبح موہنی حمید کی زبانی معلوم ہوا کہ شوکت بھائی بہت سخت بیمار ہیں اور میو ہسپتال میں داخل ہیں۔ یہ خبر سُن کر میں بے چین ہو گئی۔ اُسی دن شام کے وقت میں ہسپتال میں شوکت بھائی کو دیکھنے گئی۔ کمرے میں جب داخل ہوئی تو وہاں عشرت بھائی صاحب، نسیم ممتاز صاحب اور اِن کے علاوہ زہرا (یہ ان کی دوسری بیگم کا نام ہے) یہ سب شوکت بھائی کے اِرد گرد کھڑے تھے میں آہستہ سے شوکت بھائی کے پلنگ کے قریب رکھی ہوئی کُرسی پر بیٹھ گئی۔ انھوں نے کچھ دیر بعد اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولیں۔ مجھے غور سے دیکھتے رہے۔ جب پہچان لیا تو آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوؤں کی جھڑی بہہ نکلی۔ شوکت بھائی بیماری کی وجہ سے بہت کمزور اور نحیف ہو گئے تھے۔ رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھوں کے چاروں طرف سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ غرض چہرے اور اُن کے نڈھال جسم سے اچھے آثار نظر نہ آتے تھے۔ اس حالت میں بھی خلوص دیکھئے۔ میری بھانجی رضا کو اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ اُس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے کہا یہ بہت کمزور ہو گئی ہے۔ اس کا علاج کرو۔ میں نے جواب میں کہا۔ علاج کر رہی ہوں اس کا جگر خراب ہو گیا ہے۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھ کر اُداس اور پریشان زہرا سے پھر آنے کا وعدہ کر کے چلی آئی۔ شوکت بھائی کو اس حالت میں دیکھ کر دل پر غم کا بوجھ سا محسوس ہونے لگا۔ کئی مرتبہ میں نے ڈاکٹروں اور نسیم ممتاز صاحب سے ٹیلیفون پر شوکت بھائی کا حال معلوم کیا۔ شوکت بھائی کو جلدی سے دیکھنے کی پھر ہمت نہ ہوئی۔ کیونکہ میں خود دل کے عارضے میں کئی سال سے مبتلا ہوں۔ میرے دل پر ان کی یکلخت مہلک بیماری کا کافی بُرا اثر پڑا۔ میں سولہ اپریل کو کسی ضروری کام سے اپنے شوہر کے پاس کراچی چلی گئی۔ مگر دل پر ہر وقت شوکت بھائی کی بیماری کا کھٹکا لگا ہوا تھا۔ کراچی میں روز صبح آنکھ کھلتے ہی میں اور حفیظ صاحب، ہم دونوں اخبار پڑھنے سے پہلے یہ دعا کرتے یا الٰہی خیر ہو۔ شوکت بھائی کی خیریت کی خبر ملے۔ مگر اخبار میں سوائے ان کی علالت کی خبر کے کوئی نیک خبر پھر نظر نہ آئی۔ چار مئی کی صبح میں غسلخانے میں اپنی بچی کا منہ دُھلا رہی تھی کہ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور حفیظ صاحب نے فون پر غمگین آواز میں دہرایا آج صبح آٹھ بجے فوت ہو گئے ہیں۔ یہ آواز سُن کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میرے دل نے خود بخود کہا۔ ہائے میرے اللہ کیا شوکت بھائی فوت ہو گئے اور میں غسلخانے سے بھاگ کر حفیظ صاحب کے پاس آئی۔ مجھے دیکھ کر وہ آنسو پونچھنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے پوچھا یہ کس کا فون تھا۔ کیا شوکت بھائی فوت ہو گئے؟ حفیظ صاحب نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ یہ احمد سلمان کا فون تھا۔ ان کو اطلاع ملی ہے کہ شوکت ابھی صبح فوت ہو گئے ہیں۔ اس دردناک خبر سے جو کچھ دل پر گذری وہ خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ ہم دونوں میاں بیوی شوکت بھائی کی اس بے وقت کی المناک موت کے غم میں روتے اور آنسوؤں سے منہ دھوتے رہے۔ مگر نتیجہ سوائے صبر کرنے کے کچھ نہ نکلا۔ شوکت بھائی ہم سب کو روتا اپنی یاد میں تڑپتا چھوڑ کر اس فانی دنیا سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

شوکت تھانوی

جب قاضی جی ہوتے

(ریڈیو کی ایک آرٹسٹ کے تاثرات)

اختر جہاں

جب میں کتابوں کی دنیا سے آشنا ہوئی شوکت تھانوی کا نام میرے شعور میں ایک سدا بہار پھول کی طرح لہلہاتا رہا - ان کی تصانیف کے کرداروں کے کاغذی پیکر میرے درمیان ایک خوش باش کنبے کی طرح رہتے - ان کی کتابیں پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے میری رگوں میں بجائے خون کے قہقہے دوڑ رہے ہیں ان کی تحریر کی شگفتگی ان کی شخصیت کی آئینہ دار تھی - وہ اپنی تحریروں میں ہم سے اتنے قریب ہوتے تھے - کہ ان سے کبھی بالمشافہ ملنے کا شدت سے اشتیاق نہیں ہوا - لاہور، کراچی اور آخر میں راولپنڈی سے شوکت تھانوی کا انتہائی مقبول پروگرام "قاضی جی" سنتی رہی پروگرام کے اختتام پر اناؤنسر کی یہ آواز سن کر "یہ فیچر شوکت تھانوی نے لکھا اور وہی پیش کر رہے تھے" مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی - کہ ایک عظیم فن کار کی آواز ہمارے کانوں کو چھو کر گئی ہے - کبھی گمان بھی نہ ہوتا تھا - کہ آخر میں میں بھی اس پروگرام میں حصہ لیا کروں گی - اوائل نومبر ۶۱ء میں ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے میرے نام "بلاوا" آیا "قاضی جی" کے لیے نسوانی آواز کی ضرورت تھی میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ قدرت نے بالکل اتفاقیہ شوکت تھانوی سے بہ نفس نفیس ملنے کا موقع فراہم کر دیا ہے - ریڈیو اسٹیشن پر پہنچ کر معلوم ہوا شوکت صاحب دوسرے کمرے میں تشریف رکھتے ہیں دوسری خواتین کے ساتھ جو آواز کے AUDITION کے لیے آئی تھیں - میں بھی اسی کمرے میں جا کر کرسی پر بیٹھ گئی مجھے یاد ہے شوکت صاحب نے اشارے سے میرے سلام کا جواب دیا میں نے پہلی بار انہیں چوڑی دار پاجامہ اور سرمئی رنگ کی شیروانی میں دیکھا - اس وقت مجھے وہ بہت سنجیدہ باوقار اور ضرورت سے زیادہ بردبار نظر آ رہے تھے - مجھے تھوڑی مایوسی ہوئی کیونکہ میرے ذہن میں ان کی تصویر اس سے مختلف تھی - بہرحال دو چار روز بعد جب مجھے اس پروگرام کے لیے انتخاب کی خبر ملی - تو میں پھولی نہ سماتی تھی - شوکت تھانوی جیسے ادیب و شاعر اور فن کار کے ساتھ ہر ہفتے بولنا میرے لیے ایک مژدۂ جانفزا تھا - پہلے پروگرام میں - میں گھبرا گئی مارے رعب کے زبان لڑکھڑائے جاتی تھی دوسرے ہفتے مسودہ کی ریڈنگ کے بعد شوکت صاحب نے خود بھی کہا "پچھلی مرتبہ آپ کی آواز میں تکلف تھا - گھبرائیے

بالکل نہیں اگر غلطی ہو گئی تو میں سنبھال لوں گا بالکل نڈر ہو کر بولئے" شوکت صاحب کا یہ فقرہ مجھے اس طرح یاد ہے کہ اس وقت بھی جیسے میں اپنے کانوں سے ان کی آواز سن رہی ہوں۔ دوسرا پروگرام پہلے سے بہتر ہوا۔ شوکت صاحب نے اطمینان کا اظہار کیا۔ میری جھجک اور ڈر رفتہ رفتہ دور ہوتا گیا البتہ کبھی کبھی پروگرام کے دوران شوکت صاحب کی اپنے سامنے موجودگی کا احساس بوکھلا دیتا تھا۔ برصغیر کا ممتاز ادیب و فنکار ہیں یہ احساس ہوا۔ اور زبان لڑکھڑائی۔ بہر حال پہلے روز جو مجھے شوکت صاحب کو سنجیدہ دیکھ کر مایوسی ہوئی تھی یعنی میرے خیال میں تو وہ ہر وقت ہنستے بولتے ہاؤ ہو کرنے والوں میں تھے دور ہوتی گئی آہستہ آہستہ ان کی خوش مذاقی بذلہ سنجی اور پُرمزاح طبیعت کے جوہر کھلتے گئے میں سوا سال مسلسل ہر ہفتہ "قاضی جی" میں حصہ لیتی رہی اور ہر ہفتے میرا ایک آدھ گھنٹہ ان کے ساتھ گذرا جہاں تک مجھے یاد ہے۔ میں نے اس عرصے میں انھیں صرف ایک بار قہقہہ لگا کر ہنستے دیکھا ان کے لب بھی کسی ہنسی کی بات پر بہت کم متبسم ہوتے تھے۔ البتہ پیشانی کے ہر شکن سے سیلابِ تبسم امنڈا کرتا تھا۔ غالباً ایسے ہی لوگوں کے لیے خندہ پیشانی کہا گیا ہے۔ جس وقت سے یہ سطریں لکھنا شروع کی ہیں۔ شوکت صاحب کی ہر بات ہر انداز ان کا مخصوص لب و لہجہ اور آواز کا دلنشیں ٹھہراؤ اور ان کا سراپا سب کچھ نظروں کے سامنے ہے۔ چمڑے کا بیگ ہاتھ میں لیے کبھی سوٹ میں کسی دن شیروانی میں گرمیوں میں اکثر ململ کا کرتہ زیبِ تن ہوتا تھا۔ ڈیوٹی روم کے دروازے پر نظر آتے سب کا سلام لیتے ہوئے میز پر بیگ رکھ کر کرسی پر بیٹھ جاتے تھے اور لوگ آ گئے"؟ اگر پروگرام کے ...... پورے کریکٹر موجود ہوئے تو چلئے ریڈنگ کر لیں کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوتے، میں عام طور سے شوکت صاحب سے پہلے ہی ریڈیو اسٹیشن پہنچ جاتی تھی۔ وقت کی پابندی سے بہت خوش ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھے ذرا دیر ہو گئی یا شوکت صاحب کو ڈیوٹی روم میں بیٹھے دیکھ کر مجھے دیر کا احساس ہوا۔ بہرحال میں نے اندر داخل ہو کر جیسے ہی کہا "معاف کیجیے آج مجھے ذرا دیر ہو گئی" شوکت صاحب نے فوراً اپنے مخصوص انداز میں جھک کر جواب دیا "صاحب مجھے معاف کیجیے میں آج جلد آ گیا" بظاہر یہ فقرہ سیدھا سادہ ہے لیکن ان کے کہنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ سب بے ساختہ ہنس پڑے۔ اسی طرح ایک مرتبہ میرے سامنے ایک شخص نے اپنے مکان کی پریشانی بیان کی اچھی طرح یاد نہیں کہ قصہ کیا تھا۔ شاید کسی نے اس کو مکان خالی کرنے کا نوٹس وغیرہ دیا تھا۔ شوکت صاحب نے اس سلسلے میں اس کی مدد کا وعدہ کیا اس شخص کے جانے کے بعد آہستہ سے بولے "لوگ میرے نام کے ساتھ تھانوی سن کر مجھے تھانیدار تو نہیں سمجھ لیتے"

اکثر ایسا بھی ہوتا تھا پروگرام شروع ہونے میں دیر ہے۔ ریڈنگ سے فارغ ہوئے تو باتیں چھڑ گئیں۔ سیاسیات۔ کتابیات۔ اور صحافیات کی باتیں ہوتے ہوتے چھوٹے موٹے قصے اور چٹکلے شروع ہو گئے۔ شوکت صاحب کا طرزِ بیان طنز و مزاح اور بذلہ سنجی معمولی لطیفوں کا لطف دوبالا کر دیتی تھی۔ ان کی باتوں میں ہم لوگ ایسے کھو جاتے تھے کہ ٹائم کا بھی خیال نہیں رہتا تھا۔ کئی بار عین پروگرام کے وقت ہم لوگ چونکے مجھے یاد ہے ایک مرتبہ عید کے موقع پر پروگرام ہو رہا تھا۔ اسی دوران اچانک اسٹوڈیو کا دروازہ زور سے کھلا شاید کوئی شخص غلطی سے ادھر آ گیا تھا۔ واہ رے حاضر دماغی! شوکت صاحب سامنے ہی کھڑے تھے فوراً قاضی جی کی آواز میں بولے "امجد میاں،

دیکھو کوئی عیدی ویدی لینے آیا ہوگا۔ نکال باہر کرو۔ اور دروازہ بند کردو۔ یہ کیا خرافات ہے اس طرح بات بنائی کہ سننے والوں کو شبہ بھی نہ ہوا ہوگا کہ کوئی انجانے پن میں اس طرف چلا آیا تھا۔

ایک دن ایک صاحب سے کہنے لگے "میں اکثر آپ کا پریشان چہرہ بکھرے ہوئے بال دیکھ کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہوں کہ آپ کو کیا تکلیف ہے؟ یہ حالت دو صورتوں میں ہوتی ہے بیوی سے لڑائی ہوگئی ہو یا پھر قبض ہو یا پیچش کا عارضہ لاحق ہو۔ اللہ جانے دونوں کیفیتوں میں سے آپ پر کونسی کیفیت گذر رہی ہے یہ الفاظ بہت سنجیدگی سے بڑے حکیمانہ لہجے میں کہہ کر فوراً طرز بدل کر بولے "ارے میاں پریشانیاں کسے نہیں ہوتیں مگر یہ حالت نہیں بنایا کرتے میں بھی انسان ہوں۔ مجھے بھی پریشانیاں اور بیماریاں ہیں لیکن تم نے مجھے پریشان نہیں دیکھا ہوگا!" یہ حقیقت تھی آخیر گرمی کا ذکر ہے شوکت صاحب کے پیر کے انگوٹھے میں سخت درد تھا کہنے لگے زمین پر پیر رکھنا قیامت ہے اور یہ قیامت وہ کس قدر خندہ پیشانی سے جھیل رہے تھے اتنی تکلیف میں بھی چھڑی کے سہارے بمشکل قدم اٹھاتے ہوئے کرسی تک پہنچتے مگر مجال ہے جو چہرے پر کرب کی ایک بھی شکن ہو۔ بات چیت میں وہی شگفتگی اور بذلہ سنجی مجھ سے سب سے پہلا یہ سوال ہوتا تھا "بچہ کیسا ہے"؟ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک دردمند دل رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ شوکت صاحب کے ہمراہ ان کے چند بے تکلف دوست بھی تھے۔ چند خواتین تھیں جو شوکت صاحب کی پُر مذاق باتوں پر کھلکھلا کر ہنس دیتی تھیں پروگرام شروع ہونے والا تھا۔ شوکت صاحب نے ان سے "بوتھ" میں بیٹھ جانے کو کہا ایک خاتون بولیں آج تو ہم یہیں کھڑے ہو کر سنیں گے،" شوکت صاحب جلدی سے بولے نہیں صاحب! آپ پروگرام کے دوران بھی "کھس کھس" ہنستی رہیں تو سننے والے سمجھیں گے آج قاضی جی کا پیٹ خراب ہے۔ ان صاحبہ پر ہنسی کا وہ زبردست دورہ پڑا کہ خدا کی پناہ۔

سوا سال میں تقریباً ساٹھ ہفتے ہوتے ہیں۔ ساٹھ ہفتوں کا یہ خیالی البم جس میں شوکت صاحب کی ہنستی چہکتی مسکراتی تصویریں ہیں۔ زندگی سے بھرپور زندگی کی تلخیوں کا مضحکہ اڑاتی ہوئی۔ اس البم کی آخری تصویر ۱۶ مارچ ۶۳ء کی ہے۔ اس روز شوکت صاحب مضمحل اور خاموش سے تھے میں نے مزاج پرسی کی، بہت مختصر سا جواب دیا۔ میں ڈر گئی۔ کبھی کبھی شوکت صاحب کراہ کر پہلو بدلتے تھے اور بار بار کھانستے تھے۔ لیکن پیشانی پر کوئی ناگواری کے آثار نہیں تھے۔ پروگرام اکٹھے ریکارڈ کئے گئے۔ ۱۶ مارچ کو ریڈیو اسٹیشن سے شوکت صاحب کے آخری قدم گئے اس کے بعد میں شوکت صاحب کو نہ دیکھ سکی۔ گھریلو جھنجھٹوں کی وجہ سے لاہور بھی نہ جا سکی" ساٹھ ہفتوں کا یہ البم شوکت کی جیتی جاگتی تصویروں کا ہے —— میں نے انھیں بستر علالت پر نہیں دیکھا —— میرے ذہن میں ان کی بیماری یا موت کا کوئی تصور نہیں۔

۴ مئی ہفتے کا دن تھا۔ یعنی قاضی جی کے پروگرام کا دن۔ میں ریڈیو اسٹیشن کے ڈرامہ سیکشن میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک جعفری صاحب کمرے میں آئے میز پر مسودہ رکھا آہستہ سے بولے شوکت صاحب کا انتقال ہوگیا جیسے کسی نے بے خبری میں زناٹے کا طمانچہ کھینچ مارا۔ میرا سر چکرا گیا۔ شوکت صاحب چل بسے کسی اور کی بھی آواز

آئی۔ ۴۔ مئی سے میں یہی سن رہی ہوں۔ ریڈیو پر اخباروں میں۔ لیکن مجھے یقین نہیں آتا۔ میں نے ان کی وہ تصویر بھی دیکھی ہے جس میں شوکت صاحب اپنے آخری سفر پر جانے کے لیے تیار ہیں۔ میں نے اس تصویر کو اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھا۔ دوبارہ دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ دل اس الم ناک اور جانکاہ حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ ظالم موت نے ان کے پیکرِ خاکی سے زندگی کی آخری رمق تک چھین لی۔ لیکن شوکت صاحب ادبی دُنیا میں اسی آن بان اور شان و شوکت سے زندہ رہیں گے۔ ان کے ہاتھوں سجائی ہوئی بزمِ ادب ہمیشہ جگمگاتی رہے گی۔ البتہ ان کے احباب و اعزہ اور پرستاروں کے آنسو پکار پکار کر فریاد کریں گے۔

محفل سے اُٹھ کے انجمن آرا کدھر گیا ”

خطوط

بنام — بڑی بیگم

آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ
۱۰ اگست سنہ ۴۲ء

ڈارلنگ — تمہارا شوکت تمہاری صحت اور زندگی کا خدا سے بھکاری ہے۔ تمہارا خط ملا اور مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ تم نے روپیہ طلب کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جہاں تم ہو وہاں تمہارے پاس کافی روپیہ ہونا چاہئے مگر کیا کروں کہ میں کافی روپیہ کا بندوبست نہیں کر سکتا۔ بہرحال جو کچھ ہو سکا ہے بھیج رہا ہوں۔ خدا کرے پہنچ جائے اس طریقہ پر بھیجنا خطرناک ضرور ہے۔ مگر اس کے علاوہ اور صورت ہی کیا ہے۔ منی آرڈر بھیجنا مناسب نہیں ہے اور نہ رجسٹری بھیجنا۔ بہرحال اللہ مالک ہے انشاء اللہ پہنچ جائے گا۔ تم نے کپڑا خریدا بہت اچھا کیا۔ تنخواہ ملنے پر کچھ اور بھیجوں گا تم خرچ کی فکر نہ کرنا البتہ اپنا دل کسی بات میں نہ مارنا۔ خداوند کریم میری بہو کو پہننا اوڑھنا نصیب کرے اور وہ بہت بڑی عمر ساتھ تندرستی کے پاکر خوب اوڑھے اور پہنے۔

میں بالکل اچھا ہوں اب کھانسی بالکل نہیں ہے اور نہ حرارت ہے مگر گولیاں جو ڈاکٹر نے دی ہیں وہ برابر استعمال کر رہا ہوں تم میری طرف سے بالکل اطمینان رکھو۔ البتہ اپنا حال لکھو کہ اب کیا حال ہے ہاتھ کے زخم کیسے ہیں۔ یہ تم نے ٹھیک لکھا ہے آج کل ٹمپریچر کا کوئی اعتبار نہیں اس تکلیف کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے اور انشاء اللہ العزیز اس تکلیف کے ساتھ ہی ساتھ کم بھی ہو گا۔

اچھا جناب اب یہ فرمایئے کہ تشریف آوری کب ہو رہی ہے۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں بلا رہا ہوں بلکہ اس خیال سے پوچھ رہا ہوں کہ آپ جو کچھ لکھیں اسی کے اعتبار سے پیارے لال کو گھبرا جائے وہ اپنی بیوی کو لینے شاید پہلی ہی تاریخ کو جانے والے تھے میں نے ان سے کہا ہے کہ میں آپ کو خط لکھ رہا ہوں اس کا انتظار کر لیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ نے بھی مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ کو پہلے سے لکھ کر پوچھ لوں۔ اس لیے لکھ رہا ہوں۔

سعید اور خورشید دونوں خدا کے فضل و کرم سے اچھے ہیں اس وقت سو رہے ہیں۔ اگر جاگتے ہوتے تو آپ کو خط لکھتے مگر میں ان کو جگانا نہیں چاہتا بہرحال ان کی طرف سے اطمینان رکھئے۔ خورشید کے دانے پہلے سے کم ہیں۔

ایک ملازم مل تو گیا ہے اور کام بھی کر رہا ہے مگر مرضی کے مطابق نہیں اوّل تو بدصورت ہے۔ دوسرے کچھ سست معلوم ہوتا ہے کھانا پکانا جانتا ہے۔ میں نے فی الحال اسے رکھ لیا ہے۔ اگر کوئی اور اچھا آدمی مل گیا تو اسے رکھ لوں گا۔

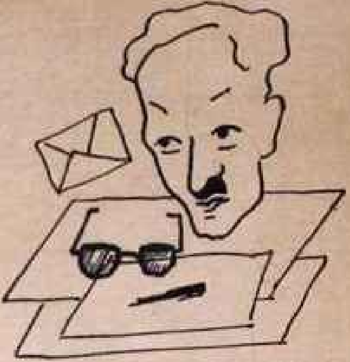

خطوط

(عزیزوں اور دوستوں کے نام)

صدیقہ سے کہہ دیجئے گا کہ اگلے خط میں ان کے خط کا جواب لکھوں گا۔

اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔

تمہارا پرستار
شوکت

آل انڈیا ریڈیو۔ لکھنؤ
۵ر ستمبر سنہ ۴۲ء

سعیدہ ڈارلنگ — کل تمہارا خط میری بے چینی اور تمہاری تکلیف سے انتہائی پریشانی کی حالت میں ملا۔ خدا کرے جو تکلیف تم کو اب باقی ہو وہ بھی دُور ہو جائے اور میرا یہ خط پہنچنے تک میری روح میری جان سے زیادہ عزیز میری محبوب بیوی بالکل تندرست ہو۔ آمین

تمہارے گھبرانے یا پریشان ہونے کی آخر کونسی بات ہے۔ اس کو تو گھبرانا ہی نہ چاہیئے جس کا کوئی چاہنے والا موجود ہو۔ تم نہ سمجھو مگر شوکت تمہارا دیوانہ وار پرستار ہے۔ تم بالکل نہ گھبراؤ میں انشاء اللہ ۸ر ستمبر کو لکھنؤ سے روانہ ہو کر اگر خدا نے چاہا تو ۹ر ستمبر کو تمہارے پاس موجود ہوں گا اور ۱۰ر ستمبر کو وہاں سے ہم سب کی روانگی ہو گی میرا ارادہ تھا کہ ۷ر ستمبر ہی کو روانہ ہو جاتا مگر پیارے لال کل پرتاب گڑھ سے آئے تھے وہ ۸ر ستمبر کو جا سکتے ہیں لہذا ۸ر ہی کو روانگی ہو گی۔

آج عاصم کے والد کا خط مراد آباد سے آیا تھا۔ عاصم غریب کی حالت اچھی نہیں ہے۔ انھوں نے ارادہ کر لیا ہے کہ عاصم کو بھوالی سینی ٹوریم میں داخل کر دیا جائے۔ بھائی زبیر کے نام مجھ سے خط مانگا تھا میں نے خط بھیج دیا ہے۔ اگر عاصم بھوالی جائیں تو آپ پردہ نہ کیجئے گا اور اگر کہہ سکیں تو بھائی زبیر سے کہہ بھی دیجئے گا کہ ان کو ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی جائے۔

معلوم نہیں آپ کو روپے جو اس سے پہلے خط میں بھیجے ہیں ملے یا نہیں اس کا حال تو اب آپ کے کل والے خط میں معلوم ہو گا۔ خدا کرے وہ روپے پہنچ گئے ہوں۔

تمہارے بچے بفضلہ تعالیٰ بالکل اچھے ہیں اور بھوالی جانے کے لیے ایک ایک دن گن رہے ہیں۔

تم ہر ہر طرح اطمینان رکھو تم کو میں انشاء اللہ کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ ایک مسٹر ملا ہے نوکر برکی کے یہاں سے لے کر نوکر رکھ لیا ہے۔ اگر کوئی بہتر نوکر مل گیا تو اسے رکھ لوں گا بہرحال تم اطمینان رکھو۔

میرا یہ خط تم کو ۷ر ستمبر کو ملے گا تم اب اس کا جواب کیا کرو گی دے کر۔ میں خود ہی انشاء اللہ ۹ر ستمبر کو پہنچ جاؤں گا۔

تمہارا — شوکت

پنچولی آرٹ پکچرس۔ مسلم ٹاؤن۔ لاہور
۱۰ر مارچ سنہ ۴۴ء

ڈارلنگ سعدو! خدا خدا کر کے آج ڈاک اور تار کھلے ہیں ورنہ ایک طرف تو لاہور کے ہنگامہ سے طبیعت

پریشان تھی۔ دوسرے نہ آپ کا کوئی خط مل رہا تھا نہ میں آپ کو خط بھیج سکتا تھا اور ڈر رہا تھا کہ کہیں لاہور کے فسادات کا حال ریڈیو پر سُن کر یا کسی اخبار میں پڑھ کر آپ روانہ نہ ہو جائیں۔ فساد کے پہلے دن یہ خط تو جلدی سے آپ کو ڈال دیا تھا کہ روانہ ہونے کا ارادہ نہ کریں مگر ضرورت تھی تار دینے کی اور تار وغیرہ یہاں ایک دم سے بند کر لیے گئے۔ حد یہ ہے کہ ٹیلیفون تک کی اجازت نہ تھی۔ ایک دن تار لے کر میں خود گیا۔ دوسرے دن مولانا کو بھیجا مگر تار نہ لیا گیا۔ وہ قیامت تھی کہ العظمت اللہ۔ ہمارا محلہ شہر سے کافی دُور ہے مگر حال یہ تھا کہ تین رات تک کوئی سو نہ سکا۔ تمام محلہ لاٹھیوں، بندوقوں اور پستولوں سے مسلح ہو کر پھرتا رہتا تھا۔ شہر کی حالت جب بہت خراب ہو گئی تو جگل صاحب اپنی بیوی اور بچی کو لے کر یہاں آ گئے اور بخاری صاحب کنٹرولر بھی آ گئے۔ دوسرے دن جب حالات ذرا اطمینان بخش ہوئے تو یہ لوگ واپس گئے۔ اب خدا کا فضل ہے کہ کوئی خاص تشویش کی بات نہیں۔ آج تار کھلتے ہی آپ کا تار ملا اور ساتھ ہی ساتھ دو خط بھی جن میں سے ایک ۱۱؍ مارچ کا لکھا ہوا تھا اور دوسرا ۷؍ مارچ کا۔ معلوم نہیں بیچ میں کتنے خط غائب ہوئے ہوں گے اور خدا جانے میرے خط کس طرح پہنچے ہوں گے اور نہ جانے پریشانی کی وجہ سے آپ کا کیا حال ہو گا۔ بہرحال آج میں نے خیریت کا تار بھی دے دیا ہے اور یہ خط بھی فوراً لکھ رہا ہوں کہ آپ کو اطمینان ہو جائے ہمارے یہاں سب خیریت ہے اور خدا کا فضل ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ اب آپ تنہا نہ آئیں۔ جب آپ کا آنے کا ارادہ ہو مجھ کو لکھ دیجیے تا کہ مولانا کو بھیج دوں یا وہاں سے اگر کوئی آ سکتا ہو تو ساتھ لیتی آئیں۔ یوں تو اللہ مالک ہے وہی سب سے بڑا نگہبان ہے مگر انسان کو خود بھی احتیاط کرنا چاہیے۔

رابعہ کی حالت معلوم ہو کر تشویشوں میں ایک اور اضافہ ہو گیا۔ خداوند کریم اس پر اپنا فضل کرے اور ہم لوگوں کی پریشانیاں دُور کرے۔ اپنی اور بچوں کی خیریت سے جلد جلد اطلاع دیتی رہیے۔ آج کل دل بہت پریشان ہے۔ کل کا حادثہ سنئے کہ برکت عمرہ ایک دم چل بسے اچھے خاصے، وہی درد اٹھا تھا جو مجھ کو ہوا کرتا تھا یعنی وہی آنت بڑھ جانے سے جو درد ہوتا ہے اپنڈیسائٹس۔ اچھا آدمی تھا غریب۔

اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔ بابا کو پیار۔ سعید کو بھی پیار۔ سعید کا مکمل انتظام کر دیجیے گا اور مکان کے متعلق خدا کے لیے کچھ کیجیے۔

آپ کا۔ شوکت

دفتر روزنامہ "جنگ"
ایڈورڈز روڈ۔ راولپنڈی
۲۲؍ اگست سنہ ۶۱ء

بیگم صاحبہ۔ آداب ــــ آپ کا خط ملا۔ میں نے اس پر غور کیا اور غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آپ کو مبارکباد دوں۔

یہ خاندان ہر اعتبار سے اچھا ہے۔ میں اس کے اکثر حضرات سے واقف ہوں اور ان کی شرافت نسلی اور ذاتی شرافت کا قائل ہوں۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سعید کی مرضی کو میں سب سے مقدم سمجھتا ہوں اور سعید اور عطیہ سلمہا کی راہ میں نا عاقبت اندیش باپ کی

طرح حائل ہونا نہیں چاہتا پھر یہ کہ حائل ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے اوّل تو سعید خود ہی سمجھدار اور عاقبت اندیش ہے دوسرے اس خاندان میں واقعی کوئی خامی نہیں ہے لہٰذا اللہ مبارک کرے۔ آپ بسم اللہ کیجیے۔ میں یہ خط لکھنے کے وقت سعید کی شاد کام اور بامراد زندگی کے لیے دعا کر رہا ہوں۔

میری صحت اب جیسی ہونا چاہیے ویسی ہی ہے اتنی محنت کے بعد آخر کب تک چل سکتا ہوں۔ ڈاکٹر نے ہائی بلڈ پریشر تجویز کیا ہے۔ یہ نہایت شریفانہ بیماری ہے اور عموماً مشاہیر کو ہوتی ہے لہٰذا میں مطمئن ہوں۔

احقر۔ شوکت

دفتر روزنامہ "جنگ"

راولپنڈی۔ ۲۹ مارچ ۶۲ء

سعیدہ،

تمغۂ امتیاز کے خطاب پر آپ کی خوشی قدرتی ہے۔ یہ اعزاز صرف میرا نہیں میرے تمام متعلقین کا ہے۔ خدا سب کو مبارک کرے۔

میں آپ کو تفصیلی خط ذرا فراغت سے لکھوں گا۔ اس وقت رسمی شکریہ ادا کر رہا ہوں۔

خورشید مجھ سے خفا ہے اس کو پیار کر کے منا لیجیے۔ میں نے اس کے لیے اور بابا کے لیے ڈائری حاصل کر لی ہے ذرا موقع ملے تو بھیجوں بابا کو دوسرا پرچہ دے دیجیے۔ اس کا خط آیا۔ یہ اس کا جواب ہے۔

آپ کا۔ شوکت

دفتر روزنامہ "جنگ"

راولپنڈی۔ ۳۱ اگست ۶۲ء

بیگم السلام۔

کمال کر دیا آپ سب نے کہ دیوروں کو بھابی جان مل گئیں اور ساس کو بہو مل گئی لہٰذا اب اس بڈھے کو گھاس ڈالنے کی کوئی ضرورت ہی نہ رہی۔ انتہائی پریشانی کے عالم میں جب انعام الحق اور اقبال سلمہٗ کو خط لکھا تو معلوم ہوا کہ جناب مع دلہن بیٹی کے لاہور پہنچ چکی ہیں۔

آج سڈنی سے سعید کا خط بھی آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُسے ساتھ خیریت کے واپس لائے۔ اس پیارے پیارے احمق نے لکھا ہے کہ ابا اپنے سوٹ کی پیمائش بھیج دیجیے میں آپ کے سوٹ لاؤں گا۔ میں نے اس کو سختی سے منع کر دیا ہے کہ خبردار جو سوٹ لائے اس لیے کہ وہ جب تک سڈنی میں لنگوٹی باندھ کر نہ پھرے، میرے لیے سوٹ لانے کی گنجائش نہیں نکال سکتا۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ جو کچھ لانا ہے وہ میری بیٹی یعنی اپنی دلہن کے لیے لانا مجھے اس کی زیادہ خوشی ہو گی اور یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اپنی امی جان کے لیے

ایک کنگارو کا بچہ ضرور لانا۔

بھئی خدا کے لیے اس اونٹ یعنی خورشید کو بُلا کر اور کسی اسٹول پر کھڑی ہو کر ذرا اُس کے کان تو پکڑ لو یعنی مجھے اُس نے خط ہی نہیں لکھا۔ نہ یہ لکھا کہ میں نے حامد جلال صاحب کو اُس کے متعلق جو خط لکھا ہے اُس کا کیا نتیجہ ہوا۔ میں نے حامد جلال صاحب کو بڑے زوردار الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ خورشید کو رسالہ کے شعبہ میں لے لیں۔ حامد جلال صاحب نے مجھ کو اب تک جواب نہیں دیا ہے لہذا خورشید کو بُلا کر کہو کہ وہ حامد جلال صاحب کو یاد دلائے کہ میرے خط کا جواب اُن کے ذمہ ہے۔

بابا بیچارہ تو امتحان کی تیاریاں کر رہا ہو گا۔ لہذا اگر خط لکھا تو سخت خلل واقع ہو گا۔ کوئی پروا نہیں، کچھ دن کے بعد انشاءاللہ میرا پوتا مجھے خط لکھا کرے گا۔

ان دونوں بدمعاشوں کو خیر دعا تو کہہ دیجیے مگر اصل شفقت آمیز دعائیں اب صرف دُلہن بیٹی کو دی جائیں گی۔

مجھے پچھلے دنوں جو بخار آیا تھا وہ ٹائیفائڈ تھا لہذا وہ اپنی کمزوری چھوڑ گیا ہے۔ ویسے بھی اب یہ کوئی پہلوانی کا زمانہ تو ہے نہیں کہ کمزوری میں اضافہ نہ ہو مگر میں پوتا کھلائے بغیر ہرگز مرنا نہیں چاہتا۔

آپکا ــــ شوکت

بھوپال

۱۴- فروری

میری اپنی سدو ــــ واقعی تم نے میرا خط پہنچنے سے پہلے ہی مجھ کو خط لکھا۔ کیسا پیار بھرا خط۔ ایک ایک لفظ کا وہ کھویا ہوا اعتماد، وہ بھولی ہوئی محبت وہ بچھڑی ہوئی شوہر پرستی نمایاں جس کے لیے تمہارا شوکت ترس رہا تھا۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تم نے پیاسے کی پیاس بجھا دی۔ خدا میری چاہنے والی کو ہمیشہ میرے دل کی ملکہ بنائے رکھے۔ میری سدو شاد و بامراد رہے اس کا شوکت اس کا پروانہ بنا رہے۔ ۔ آمین

تم ناحق گھبراتی ہو، ہیں دُور سہی میرا تصور تو دُور نہیں ہے۔ ہم دونوں پھر مل جائیں گے۔ سدو تم بالکل نہ گھبرانا میری طبیعت بالکل اچھی ہے۔ درد میں کوئی زیادتی نہیں بلکہ مجھے اس دوا سے واقعی کچھ کچھ فائدہ محسوس ہو رہا ہے۔ اب ہر وقت کی کھٹک میں کمی ہے البتہ کھانے کے بعد کچھ تکلیف ہو جاتی ہے انشاءاللہ وہ بھی جاتی رہے گی۔ میرا پہلا خط جب تک تم کو نہ ملا ہو گا تم پریشان رہی ہو گی حالانکہ میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا تھا کہ تم کو خط لکھا۔

اچھا اب سنو یہاں سے کسی طرح ۱۹؍ فروری کی رات سے پہلے نجات نہیں مل سکتی۔ ۱۹؍ فروری کو ہز ہائنس کی طرف سے خاص تقریب ہے بغیر اس تقریب میں شرکت کے میں آزاد نہیں کیا جا سکتا لہذا میں ۲۰؍ فروری کی صبح ڈاک گاڑی سے چل کر رات کو لکھنؤ پہنچ جاؤں گا۔ اسٹیشن سے ٹیلیفون کر کے وقت پوچھ لینا کہ جی۔ آئی۔ پی میل رات میں کس وقت پہنچتی ہے۔ غالباً اس کے پہنچنے کا وقت شام کو سات بجکر چھیالیس منٹ پر ہے۔ میں نے بے حد کوشش کی کہ مجھ کو نجات مل جائے مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

کل رات کو مشاعرہ تو سُنا ہو گا تم نے تو میری آواز سُن لی ہو گی مگر میرے کان سدو کی آواز کے لیے ترس رہے ہیں۔

بابا کو خوب پیار کر لینا۔ سعید خورشید کو بھی پیار۔

تمہارا صرف تمہارا
شوکت

روزنامہ "ہمدم" لکھنؤ
۳۰ اگست ۱۹۲۸ء

سدو، اسلام۔

ہم تو کھاتے بھی نہیں جانی کنہیاتے ہو کچھے
لڈو پیڑے کی آجا بے جھناتے ہو کچھے

آپ کا یہ شعر اس وقت یاد آگیا اور یہ صرف اس لیے کہ آپ اب تک بچپن کی طرح باتیں کرتی ہیں۔ کل تو دفتر میں چھٹی تھی لہٰذا آپ کا خط ابھی آج ملا اور اس کو پڑھ کر میں خوب ہنسا۔ واقعی آپ کی بہت سی باتیں بچوں کی طرح ہوتی ہیں۔ یعنی میرے بخار پر جو آپ نے قلم اٹھایا تو شروع سے آخر تک وہی لکھتی چلی گئیں حالانکہ اب مجھ کو بخار قطعی نہیں ہے اور کل میں نے باوجودیکہ سخت محنت کی۔ دن بھر کمرہ بدلنے میں جس قدر تھکن ہوئی اس سے مجھ کو بخار ہو جانا چاہیئے تھا مگر میں بالکل اچھا ہوں۔ آپ کا کمرہ بدل دیا گیا۔

آپ میری صحت کی طرف سے بالکل مطمئن رہیئے میں قطعاً اچھا ہوں اور آج بفضلہ بہت بشاش ہوں۔ آپ کا محبت بھرا خط میرے جسم میں ایک تازہ روح پھونک دیتا ہے۔ خدا مجھے خوش کرنے والی کو ہمیشہ زندہ اور خوش رکھے ۔ آمین۔

انعام الحق آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ آج رات کو سُنا ہے مظہر الحق بھی بھائی عثمان کے یہاں آئیں گے۔ اماں کی عدت کے دن ختم ہو گئے وہ عیش باغ جانا چاہتی تھیں، میں نے ٹال دیا اس لیے کہ خاک کے ایک ڈھیر کو آخر وہ دیکھ کر سوا پریشان ہونے کے اور کیا کریں گی۔

سدو! تم اس خط کا جواب نہ دینا اس لیے کہ میں دفتر سے باہر ہوں گا۔ اب تم مجھے ۲ ستمبر کو خط لکھنا جو مجھے ۳ ستمبر کو ملے گا۔ آپ بالکل تیار رہیئے۔ میرا خیال ہے کہ میں ۴ ۔ ۵ تک آپ کو لینے آسکوں گا۔ مگر صرف ایک رات قیام کر سکوں گا اس سے زیادہ قطعاً ناممکن ہے بس میں سہ پہر کو پہنچوں گا اور دوسرے دن صبح مع آپ کے واپس ہو جاؤں گا۔

معلوم نہیں جگر بھوپال سے واپس آگئے یا نہیں۔ بہرحال اب تو اس کا جواب بھی آپ دوسری تاریخ کو دیجئے گا۔ اب میں آپ کو یکم کو خط لکھوں گا اگر موقع ملا تو کل ہی شاید خط لکھوں۔

آج کل میں اس خیال سے بہت خوش ہوں کہ میں آپ کی ایک خواہش کے پورا کرنے میں بفضلہ تعالےٰ کامیاب ہو گیا۔ یعنی آپ خدا کے فضل سے اپنی مرضی کے مطابق دو مہینے مین پوری میں گزار چکیں۔

سدو۔ اب ہم بلی کا بچہ نہ پالیں گے اب تو ہم سدو کا بچہ پالیں گے جلدی سے ایک بچہ دو۔ شرماتی کیوں ہو؟ — اچھا یہ خط شروع سے آخر تک نتا کو ضرور دکھا دینا۔

تمہارا اور صرف تمہارا
تمہارے علاوہ کسی کا نہیں
شوکت

روزنامہ "ہمدم" لکھنؤ
۱۱ر اگست ۲۶ء

مظلوم دیوی، اپنے ظالم پرستار کی پرستش قبول کرو۔ کل سے یا تو مجھ میں انقلاب عظیم پیدا ہوگیا ہے اور یا واقعی یہ کیفیت بھی عارضی ہے بہرحال میری تمام رعنائیاں، تمام شگفتگیاں، تمام سکون اور تمام دلچسپیاں ایک دم ختم ہوگئی تھیں۔ اور انفعال کی وہ کیفیت مجھ پر طاری ہے جو بخدا اب تک نہیں ہوئی تھی۔ یہ بھی شاید دل کی کمزوری ہو اور بہت ممکن ہے کہ یہ حقیقی انفعال اور ندامت نہ ہو لیکن فی الحال جو کیفیت مجھ پر طاری ہے اس کو کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ میرے ناجائز برتاؤ کو انگیز کرنے والی، میرے سخت سکون کو برداشت کرنے والی میری حسین مظلومہ! للّٰہ اب مجھ کو معاف کر دے شاید اب تیرا ظالم شوہر وہ نہ رہے جو اب تک اپنے ناروا ظلموں سے بنا ہوا تھا بلکہ شاید اب تو خود اپنے ظالم شوہر شوکت میں زمین آسمان کی تبدیلی دیکھے۔ مجھ پر کل سے ایک سکوت کا عالم طاری ہے اور کسی سے بولنے کو دل نہیں چاہتا۔ رات بھر جو اُلجھن رہی۔ کاش کوئی دیکھتا اور دیکھا نہ جاتا۔

آج ایک رسالہ "ثریا" بھیج رہا ہوں ابا کے نام ایک پرچہ ہے وہ بھی دیکھ لیجئے۔ میں آپ کو اور کیا لکھوں— "ہمدم" روزانہ پہنچتا ہے یا نہیں۔ "ہمدم" میں آپ "دو دو باتیں" ضرور پڑھا کیجئے یہ میں لکھتا ہوں اور جب "دو دو باتیں" نکلیں سمجھ لیجئے کہ شوکت نے لکھی ہے۔ آج کے "ہمدم" میں ہنسی کے فلسفہ پر دو دو باتوں میں بحث کی ہے۔ تنا کو بھی سُنا دیجئے۔

سجاد حسین عطار کی لڑکی زہرہ کل چھ بجے شام کو مر گئی۔

مجھ کو تنخواہ اس مہینہ میں ابھی تک نہیں ملی ہے ورنہ آپ کو ضرور اطلاع دیتا۔ پرسوں ترسوں ملے گی۔ ستمبر کی تنخواہ تو یکم کو میں خاص طور پر حاصل کروں گا اس لیے کہ کانپور جانا ہے۔

اور اب کیا لکھوں مگر شاباش ہے آپ کو کہ آپ اس طرح ہر بات برداشت کرتی ہیں۔ مجھ سے اپنی یہ بات خود ہی برداشت نہیں ہو رہی ہے مگر آپ نے برداشت کر لی۔

شرمسار، گنہگار، سعیدہ کا غلام
شوکت

بنام — چھوٹی بیگم

لندن ۱۷ر جولائی

میری جو!

خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔ میں نظامی صاحب کے ہمراہ آج دن کے ڈیڑھ بجے لندن پہنچ گیا۔ کل شام کے ۵ بجے کراچی سے چلا تھا۔ اب ارادہ ہے کہ ۲۴ر کو یہاں سے چل کر ۲۵ر کو کراچی اور ۲۶ر کو لاہور پہنچوں۔ مگر آج معلوم ہوا ہے کہ جو جہاز ۲۴ر کو جانے والا تھا وہ ۲۵ر کو جائے گا۔ لہٰذا ۲۷ر کو لاہور پہنچوں گا بہرحال کراچی پہنچ کر تار دوں گا۔

جو! تم اُس ملازمت کے سلسلہ میں بالکل رنجیدہ نہ ہو جو تم چاہوگی وہی ہوگا۔ میری زندگی کا مقصد تمہاری خوشی ہے۔ اگر تم ہی

خوش نہ ہو۔ تو میں رنبہ۔ تنخواہ وغیرہ سب کو ہیچ سمجھتا ہوں۔ تم اس سلسلہ میں ذرہ برابر پروا نہ کرو۔ جو تمہارا فیصلہ ہو گا وہی میرا ہو گا۔ اس ہوٹل کی تصویر دیکھ لو جس میں ایک علیحدہ کمرے میں میں ہوں اور ایک علیحدہ کمرے میں نظامی صاحب ہیں۔ سات دن لندن کے لیے کچھ بھی نہیں ہیں مگر جی چاہتا ہے کہ اب پر لگ جائیں اور تم سے جا ملوں۔

اماں۔ بھائی جان اور بھابی کو سلام۔ شوکیہ۔ فوزیہ۔ شدو کو پیار۔ باقی بچوں کو بھی پیار

تار اس لیے نہیں دیا کہ ایک پونڈ یعنی ۱۳ روپے لگتے تھے۔

تمہارا
شوکت

ROOM NO-739
۲۲۔ جولائی ۱۹۵۷ء

میری جو! میری جان! ۔ لندن سے یہ میرا آخری خط ہے۔ اس لیے کہ میں پرسوں صبح انشاءاللہ یہاں سے روانہ ہو کر ۲۶ر ۲۷ کو صبح کو کراچی پہنچ جاؤں گا اور کراچی سے اُسی دن تین بجے چل کر چھ بجے لاہور پہنچ جاؤں گا۔ خداوند کریم ساتھ خیریت کے یہ سفر طے کرلے اور میں لاہور پہنچ کر بخیریت پاؤں۔ اپنی جو سے ملوں، اپنی تینوں بچیوں سے ملوں جن کے لیے سخت اُداس ہوں۔

جو! میں نے تمہارے لیے نہایت خوبصورت کڑے والی گھڑی خرید لی ہے اور کوٹ پہلے ہی خرید چکا ہوں۔ بچیوں کیلئے اب تک کچھ نہیں لے سکا۔ کل انشاءاللہ کوشش کروں گا۔ بس اب تو یہی جی چاہتا ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے، تم تک پہنچ جاؤں۔ بہت دن ہو گئے ہیں۔ طبیعت سخت گھبرا رہی ہے۔ قصہ دراصل یہ ہوا ہے کہ میرے خط تو تم کو ملتے رہے ہیں۔ مگر تمہارا کوئی خط مجھ کو نہ مل سکا۔ جس سے خیریت معلوم ہو سکتی۔ بہرحال تم سب کو خدا کے سپرد کیا ہے۔ وہی میرا مولا تم سب کو بخیریت مجھ سے ملائے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم بھی میرے لیے اُداس ہو گی۔ بہرحال اب یہ جدائی کا زمانہ ختم ہو رہا ہے اور ہم دونوں بہت جلد ایک دوسرے سے مل جائیں گے۔ میرا اماں سے سلام کہنا۔ بھائی جان۔ بھابی۔ خالہ نانی جی کو آداب

شوکیہ۔ فوزیہ۔ شدو کو پیار

سیما۔ جالی۔ چوہیا۔ نعیمہ کو پیار۔ مشتری۔ ناچی۔ شریف اور زرینہ کو دعائیں

تمہارا اور تمہارے لیے اُداس
شوکت

۱۰۔ فروری
یعنی فراق کا پہلا دن

میری جان!

ڈھاکہ پہنچتے ہی تم کو ارجنٹ تار دیا ہے اور تار دینے کے بعد ہی تم کو یہ خط لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔

یہ تمہاری دعائیں تھیں کہ زندہ سلامت ڈھاکہ پہنچ گیا ورنہ آج جو کیفیت گزری ہے وہ خدا کبھی نہ گزارے۔ جس وقت ہوائی جہاز

کے عملے نے ہم سب کو پیٹیاں بندھوا دیں۔ ہوائی جہاز کے مسافروں میں کچھ مولوی قسم کے لوگ بھی تھے۔ انھوں نے اذانیں دینا شروع کر دیں اور تھوڑی دیر کے بعد تو یہ حال ہو گیا کہ خود ہوائی جہاز کے عملے نے بدحواسیاں شروع کر دیں۔ راستہ اتنا خراب اور موسم اتنا وحشت ناک ہو گیا کہ آخر ہوائی جہاز کا راستہ بدلنا پڑا۔ بہرحال بمشکل تمام دو گھنٹے کے بعد یہ کیفیت ختم ہوئی۔ اور جہاز بخیریت تمام شدید بارش میں ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر اتر گیا۔ اور میں نے سجدہ شکر ادا کیا۔ یہاں آ کر یہ پروگرام معلوم ہوا ہے کہ اس وقت ہم لوگ ایک بنگالی فلم دیکھنے جا رہے ہیں۔ کل صبح ڈھاکہ کے تاریخی مقامات دیکھیں گے۔ سہ پہر کو گورنر سے گورنمنٹ ہاؤس میں ملیں گے اور اس کے بعد یونیورسٹی میں وائس چانسلر سے ملاقات ہو گی۔ سہ پہر کی چائے گورنر کے ساتھ ہے اور رات کو ہوٹل میں ڈنر کھا کر اسی وقت سلہٹ میل سے سلہٹ روانہ ہو جائیں گے۔ جس ہوٹل میں اس وقت میں ہوں وہ ڈھاکے کا فلیٹیز ہوٹل سمجھو۔ بہرحال تمہارے لیے خدا کو مجھے زندہ رکھنا تھا۔ چنانچہ میں اپنی معصوم بچیوں کے لیے اور اپنی پیاری بیوی کے لیے زندہ ہوں۔

شوکیہ اور فوزیہ کے اسکول جانے اور آنے میں پوری احتیاط برتنا۔ شدو بابا کو بالکل خفا نہ ہونے دینا۔ اماں کو تسلیم اور سب کو دعائیں۔

تمہارا
شوکت

دفتر روزنامہ "جنگ"
کراچی۔ ۱۱ اگست ۵۸ء

میری روح۔ میری جو!

تم سے رخصت ہو کر میں اس طرح کراچی پہنچا ہوں کہ جیسے روح لاہور میں چھوڑ آیا ہوں۔ یہاں اسٹیشن پر بھی سلمان صاحب مع یاور جی اور جینا وغیرہ کے موجود تھے۔ ان کے ساتھ گھر آ گیا۔ سلمان صاحب نے گھر بدل دیا ہے۔ یہ گھر ڈرگ روڈ پر محمد علی میموریل سوسائٹی میں ہے اور نہایت کشادہ ہے۔

مسز نظامی نے یہاں پہنچتے ہی سلمان صاحب وغیرہ سے میری غیر موجودگی میں سب کچھ کہہ دیا کہ میرے یہاں آنے میں کیا کیا رکاوٹیں تھیں اور آپ کی ساری پریشانی کا ذکر کیا۔ چنانچہ وہ مجھ کو میرے کمرے سے پکڑ کر لے گئے اور کہنے لگے کہ تم زہرہ کو فوراً بلا لو۔ اسے لکھو کہ وہ رہنے کے خیال سے نہیں بلکہ عارضی طور پر آ جائے اور یہاں آ کر خود اندازہ کر لے کہ حالات کیا ہیں اور ہم لوگ اس کا ساتھ کس طرح دیتے ہیں۔ یاور جی نے کہا ہے کہ میں زہرہ کو اسی مکان میں فی الحال رکھوں گی اور اوپر کا کمرہ مع غسلخانہ وغیرہ کے ٹھیک کرائے دیتی ہوں تاکہ وہ یہاں رہ کر یہ فیصلہ کرے کہ اس کو لاہور میں رہنا ہے یا یہاں۔ یہ لکھنا بیکار ہے کہ طبیعت سخت ویران ہو رہی ہے۔ طبیعت اچاٹ ہے اور دل سخت گھبرا رہا ہے کہ نہ جانے لاہور میں کیا ہو رہا ہو گا۔ خدا کرے آپ سب اور میری تینوں گڑیاں بخیریت ہوں — آمین

اماں کو تسلیم کہئے۔ بھائی جان۔ بھابی۔ خالہ وغیرہ کو آداب۔ شوکیہ۔ فوزیہ اور شدو بابا کو پیار۔ جالی۔ چوہی۔ سیما اور نعیمہ کو دعائیں۔ ناجی اور مشتری اور شریف کو دعائیں۔

آپ کو سوائے اس کے اور کیا لکھوں کہ میرے پاس آپ کے لیے سوائے محبت کے اور کچھ نہیں۔ اور یہی محبت بھرا دل ملنے کی دعائیں کر رہا ہے۔ آج پہلا ہی دن ہے اور اس قدر اُداسی ہے۔ اللہ جانے یہ وقت کیسے گزرے گا۔

آپ کا پردیسی اور پریشان
شوکت

دفتر روزنامہ "جنگ"
ایڈورڈز روڈ۔ راولپنڈی
۱۵ر نومبر ۱۹۵۹ء

میری جو!

خدا کرے آپ بخیریت تمام لاہور پہنچ گئی ہوں اور میری بچیوں کے ساتھ بخیریت تمام ہوں۔

اب میرے پورے حالات سنئے۔ میرے لیے جس مکان کا ان لوگوں نے انتظام کیا تھا۔ وہ ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اس میں رہا جا سکے۔ اس میں کل تین کمرے ہیں۔ سب سے بڑا کمرہ اتنا ہی ہے۔ جتنا بڑا اماں کے گھر میں وہ کمرہ جس میں بھابی رہتی ہیں۔ یعنی اماں کا اصل کمرہ۔ دوسرا کمرہ اس سے تھوڑا سا چھوٹا ہے۔ تیسرا بس اتنا ہی سمجھو جیسی آپ کی یعنی اماں کے گھر کی بیٹھک۔ ایک چھوٹا سا صحن ہے اس سے ملا ہوا باورچی خانہ ہے۔ ڈیوڑھی میں ایک غسلخانہ ہے۔ جس میں نل ہے اور اس میں کموڈ رکھ کر پاخانہ بن سکتا ہے۔ کرایہ پچاسی روپیہ ماہوار ہے۔ میں نے اسی مکان کی کنجی تو لے لی ہے۔ تاکہ سامان آجائے تو اسی میں رکھوا دوں اور کسی اور مکان کی تلاش میں ہوں۔ اگر مل گیا تو اچھا ہے ورنہ اسی گھر میں رہنا پڑے گا اور اسی کو درست کیا جائے گا۔ اتنی برائیوں کے بعد اب خوبیاں بھی سُن لو کہ دفتر سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ بس اتنا ہی سمجھو جتنا شاہو کی گڑھی والے مکان سے ریڈیو سٹیشن۔ سول لائنز یعنی میو روڈ پر ہے۔ جہاں کمشنر وغیرہ کے بھی بنگلے ہیں۔ علاقہ اچھا ہے اور مکان لبِ سڑک ہے۔ البتہ اگر اسی مکان میں رہنا پڑا تو بڑھئی لگوا کر اس کے دروازے وغیرہ ٹھیک کرانا پڑیں گے اور بجلی کا سلسلہ دُرست کرانا پڑے گا جو نہایت خستہ حالت میں ہے۔

اب آپ رائے دیجئے کہ کیا کروں۔ اگر آپ کے ساتھ لاہور سے کوئی ملازم آجائے اور زہرہ کی ماں کچھ دن کے لیے آجائے تو بہت اچھا ہے۔ راولپنڈی میں گرانی بہت ہے جس کا اندازہ اخبار سے آپ کو ہو جائے گا۔ جو میں نے بھائی جان کے نام جاری کر دیا ہے۔ امید ہے کہ پہنچ رہا ہو گا۔ میری عجیب حالت ہے۔ نہ کھانے کا ہوش ہے نہ پینے کا۔ کسی وقت کھانا مل گیا تو کھا لیا ورنہ کبھی انگور کھا کر تسکین کر لی۔ کبھی ایک آدھ ٹوسٹ اور ایک آدھ انڈا کھا لیا۔ مثلاً آج ہی صبح چائے پی۔ تین بجے پھر چائے پی اور دو ٹوسٹ اور دو انڈے کھائے۔ رات بھر انگور کھا کر اللہ کا شکر ادا کیا۔

اب آپ مجھے تفصیل خط لکھئے۔ اور یہ بھی لکھئے کہ نزلہ وغیرہ کیسا ہے۔ خدا کرے کہ آپ بالکل ٹھیک ہوں۔ اور میری بچیاں بھی ٹھیک ہوں۔

کتنا اچھا ہو کہ اگر آپ کے ساتھ اماں بھی کچھ دن کے لیے آجائیں اور آپ کا گھر ٹھیک کرا دیں۔ سامان کی بلٹی کہاں ہے؟ وہ سامان کب تک پہنچے گا؟ شریف سے پوچھ کر لکھئے۔

آپ کا پردیسی میاں
شوکت

شوکت تھانوی — ایک صحافی

احمد جمال پاشا

شوکت تھانوی پیدائشی صحافی تھے۔ ۱۹۲۰ء میں ان کی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔ اس وقت وہ گورنمنٹ حسین آباد ہائی اسکول لکھنؤ کی ساتویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ان کی عمر بمشکل ۱۵/۱۶ برس کی ہوگی۔ اپنے اسکولی دوستوں کے لیے ایک "قلمی رسالہ" نکالتے تھے۔ اس کے بارے میں "ما بدولت" میں لکھتے ہیں کہ:-

قلمی رسالہ

"اس زمانے میں ہم نے اپنے اسکولی دوستوں کے لیے ایک "قلمی رسالہ" بھی جاری کیا تھا۔ اس رسالے کو خود نہایت خوشخط لکھتے تھے۔ اس میں کارٹون بھی تھے نقلیں ہوا کرتی تھیں اور احباب پر چوٹیں ہوتی تھیں۔ یہ قلمی رسالہ حلقۂ احباب میں بہت مقبول تھا۔ اس کا ہر نمبر جو صرف ایک ہی ہوتا تھا۔ احباب کے یہاں ایک ایک دن مہمان رہتا تھا اور گشت ختم کر کے پھر ہمارے پاس آجاتا تھا۔ پندرہ دن بعد دوسرا نمبر نکلتا تھا۔ مگر اس کے غالباً چار ہی پانچ نمبر نکل سکے۔"

رسالہ حسن ادب لکھنؤ کی ادارت اس کے ۵ سال بعد ۱۹۲۵ء میں کی، یہ واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ منشی واحد علی لطف لکھنوی اس رسالے کے چیف ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، مشین مین، مصلح سنگ اور خوشنویس، غرض سبھی کچھ تھے۔ پاٹے نالے (لکھنؤ) پر ان کا دستی پریس اور رسالے کا سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔ منشی صاحب موجودہ ایڈیٹر سے مطمئن نہ تھے۔ شوکت تھانوی رسالے میں اشاعت کے لیے مضمون دینے گئے۔ انھوں نے مضمون اتنا پسند کیا کہ ان کو رسالے کا ایڈیٹر بنا دیا۔ شوکت تھانوی اس سے قبل کسی رسالے کے سرورق پر ایڈیٹر کے بجائے "رئیس التحریر" لکھا دیکھ چکے تھے لہذا رسالہ "حسن ادب" کے تازہ شمارے کے سرورق پر ایڈیٹر کی جگہ "ملک التحریر شیخ محمد عمر شوکت تھانوی" لکھا گیا۔ چونکہ اس رسالے کا سر پیر نہ تھا اور منشی صاحب اس پر اس قدر عادی تھے کہ جہاں سے چاہتے رسالہ شروع کر دیتے اور جہاں چاہتے ختم کر دیتے۔ پھر ان کے جیسے سیلانی آدمی کے لیے منشی صاحب کی ناز برداریاں ممکن نہ تھیں لہذا چار پانچ اشاعتوں کے بعد یہ رسالے سے علیحدہ ہو گئے اور رسالہ "حسن ادب" بند ہو گیا۔

تحریک ہفتہ وار

ارشد تھانوی نے سنہ ۱۹۲۳ء میں لکھنؤ سے نکالا تھا مولانا بھوپال سے ترکِ ملازمت کر کے لکھنؤ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ انھوں نے ہفت روزہ "تحریک اخبار" کا فکاہیہ کالم "لالہ زار" شوکت تھانوی کے سپرد کیا۔ اس کالم میں شوکت تھانوی اس زمانے کے لیڈروں کی کمزوریوں کے خاکے اپنے باغ و بہار رنگ میں اڑاتے تھے۔ اس زمانے میں مولانا محمد علی کے ساتھ مولانا شوکت علی بھی میدانِ سیاست میں آ گئے تھے اِن کی بابت "لالہ زار" میں لکھا ہوا شوکت تھانوی کا یہ فقرہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ

"مولانا شوکت علی اپنے چھوٹے بھائی محمد علی کا شاہکار ہیں"

"تحریک" کئی سال جاری رہا اور "ہمدم" میں آنے کے بعد بھی شوکت تھانوی "لالہ زار" میں گل و بوٹے کھلاتے رہے۔

روزنامہ ہمدم لکھنؤ (پہلا دور)

سے شوکت تھانوی سنہ ۱۹۲۶ء میں وابستہ ہوئے۔ ہمدم میں ملازمت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:-

"والد کے انتقال کے بعد فکرِ معاش دامنگیر ہوئی، میرے ماموں مجھے "ہمدم" کے مینجنگ ڈائریکٹر خان بہادر سید احمد حسین رضوی کے پاس لے گئے۔ جو ہمارے عزیز بھی تھے۔ اور سید صاحب نے اُسی وقت پروانۂ تقرری دے دیا اور چالیس روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی۔ (ما بدولت)

"استادی میر بشارت علی جالب دہلوی روزنامہ ہمدم کے ایڈیٹر تھے اور ہمدم کے ڈائریکٹر خان بہادر سید احمد حسین رضوی ایم بی اے نے مجھے ہمدم کے دفتر بھیجا تھا کہ میں مترجم کی حیثیت سے کام کروں۔" (شیش محل۔ جالب دہلوی ص ۷۹)

"قاضی محمد حامد صاحب حسرت ہمدم کے مینجر بھی تھے اور اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی انھوں نے اپنے ہی کمرے میں ہمارے لیے ایک علیحدہ میز لگوا دی۔ اور سب سے پہلے ہم کو یہ کام بتایا کہ آپ ہمدم کے دو مہینے کے فائل لے کر تمام مقالاتِ افتتاحیہ اور شذرات پڑھ ڈالیے تاکہ آپ کو حالاتِ حاضرہ کے علاوہ ہمدم کی پالیسی کا اندازہ ہو جائے اس کے بعد آپ سے کوئی تحریری کام لیا جا سکے۔ . . . ہم نے ۳ دن میں ۲ مہینے کے فائل پڑھ ڈالے اور مزاحیہ کالم "دو دو باتیں" بھی پڑھ ڈالیں، اب قاضی صاحب نے ہم سے چھوٹے چھوٹے شذرات لکھوانا شروع کیے، کچھ ترجمہ کا کام ہمارے سپرد ہوا، خبروں کے ترجمہ میں تو کوئی خاص بات نہ تھی مگر شذرات بید جالب صاحب کے پاس بھیج دیئے جاتے تھے۔" (ما بدولت ص ۹۶، ص ۹۷)

"ہمدم" میں ملازمت اور کالم نگاری کے بارے میں شوکت تھانوی کے معاصر فرقت کاکوروی لکھتے ہیں کہ:-

"جب ۱۹۲۶-۲۷ء میں، میں دسویں جماعت میں تھا تو معلوم ہوا کہ وہ روزنامہ "ہمدم"

لکھنؤ میں، جو سید جالب دہلوی صاحب کی ادارت میں نکلتا تھا ٹائپسٹ ہو گئے ہیں چونکہ وہ ایک فطری انشا پرداز اور مزاح نگار تھے اس لیے ٹائپسٹ کے فرائض کے ساتھ ساتھ مزاحیہ ٹکڑے لکھ لکھ کر سید جالب کو دکھاتے رہے، شروع شروع میں سید صاحب اُن کی ساری عبارت کو سُرخ روشنائی سے قلم زد کر کے نون غنہ[1] میں کہتے کہ ,,جائیں آپ ٹائپ کیجیے یہیں کام آپ کیں جنس کا نہیں ہے'' مگر شوکت تھانوی نے اُن کی اس ڈانٹ ڈپٹ کی پروا نہ کی اور برابر اُن کی ڈانٹ ڈپٹ کے سایہ میں اُن سے اصلاح لیتے رہے۔'' (شوکت تھانوی کے لطائف)

نسیم انہونوی مدیر سرپنچ کے نام چودھری رحم علی الہاشمی سابق مدیر روزنامہ ہمدم، لکھنؤ کے ایک حالیہ خط کی نقل بھی اس سلسلہ میں ملاحظہ فرمائیے:-

مکتوب بنام نسیم انہونوی

احاطہ کالے صاحب قاسم جان اسٹریٹ دلی-۶
۲۳ مئی ۶۳ء

مکرمی نسیم صاحب

سلام علیک، "حریم" میں آپ کے سفر دہلی کا حال پڑھ کر حیرت ہوئی کہ آپ دلّی تشریف لائے اور میرے پڑوس میں قیام فرمایا اور مجھے اطلاع تک نہ ہوئی پھر شوکت مرحوم کی تعزیت جو آپ نے کی ہے اُس میں تمام حالات سے واقف ہونے کے باوجود آپ نے وہ حصّہ حذف کر دیا جس میں میرا کچھ ذکر آجاتا۔

آپ کو معلوم ہے کہ جب جالب صاحب مرحوم کے بعد میں نے "ہمدم" کا چارج لیا ہے اس وقت شوکت صاحب شعبہ اشتہارات کے کلرک تھے میں نے سارے عملہ سے مختلف کام لے کر شوکت صاحب کو صرف دو دو باتیں" کا کالم لکھنے پر مامور کیا۔ اور اسی میں سب سے پہلے "سودیشی ریل" چھپی جس پر میری اصلاحیں بھی تھیں بعد میں پھر اسے اور بڑھا کر شائع کیا گیا۔ اس قدر جلد آپ نے مجھے بالکل ہی اپنی یادداشت سے خارج کر دیا۔

باقی بہرحال اللہ کا شکر ہے۔

نیازمند

رحم علی الہاشمی

ان متضاد بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۲۰ اپریل ۱۹۲۸ء (شوکت تھانوی کے والد کے انتقال کی تاریخ)

---

[1] سید جالب دہلوی افیون کھاتے تھے اس لیے ان کی ساری گفتگو نون غنہ میں شرابور رہتی۔

کے بعد شوکت تھانوی "ہمدم" کے دفتر میں ملازم ہو گئے اور محض ٹائپسٹ یا کلرک شعبۂ اشتہارات پر قانع نہ رہتے ہوئے اپنی محنت، شوق اور قابلیت کی بنا پر ترقی کر گئے ہمدم کے کالم نویس اور ایڈیٹر کے درجہ تک پہنچے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمدم کے پہلے دور میں سیّد جالب اور دوسرے دور میں چودھری رحم علی الہاشمی سے برابر اصلاحیں بھی لیتے رہے۔ سیّد جالب سے اصلاح لینے کے بارے میں خود "شیش محل" میں لکھتے ہیں:-

"ہمارے سیاہ حروف کی عبارت پر اُن کی سُرخ رنگ کی اصلاح ہونے لگی۔ شروع شروع میں تو سیاہ عبارت تمام کی تمام قلمزد ہو جاتی تھی اور اس کی جگہ میر صاحب کی سُرخ عبارت ہماری نالائقی پر خون کے آنسو بہاتی نظر آتی تھی اس کے بعد سیاہ و سرخ عبارت کا تناسب ایسا ہو گیا گویا قتلِ عام تو ہوا تھا مگر کچھ ہندوستانی بچ گئے ہیں غالباً سرکاری گواہ بن گئے تھے رفتہ رفتہ خون کی ایک آدھ چھینٹ اور پھر خال خال سُرخ رنگ کی چمک، مگر یہ کبھی نہ ہوا کہ کوئی چیز بغیر اصلاح کے رہ گئی ہو، شذرہ ہو، مزاحیہ کالم ہو، ہر جگہ اصلاح موجود، اکثر تو اصلاح پر غصہ ہی آجاتا تھا۔ آخر ایک مرتبہ ہمت کر کے لڑ بیٹھے، ہم نے لکھا تھا ایک جگہ "نقطۂ نگاہ" آپ نے اس کو کاٹ کر لکھ دیا "زاویۂ نگاہ" جھلاتے ہوئے وہ اصلاح لے کر میر صاحب کے پاس پہنچے۔

"آپ نے "نقطۂ نگاہ" کاٹ کر "زاویہ نگاہ" بنا دیا۔ اس میں کیا فرق پیدا ہو گیا —؟"

سر جھکاتے ہوئے بولے — "بہت بڑا فرق ہے دونوں میں "نقطۂ نگاہ" تیقن کے موقع پر استعمال ہوتا ہے گویا آپ کی نظر پورے وثوق کے ساتھ ایک خاص نقطہ پر ہے اور "زاویۂ نگاہ" میں شک کا احتمال باقی رہ جاتا ہے۔ گویا نگاہ نے نقطہ تک پہنچنے کا ایک زاویہ تو بنا لیا ہے مگر ابھی وہ نقطہ نہیں دریافت کیا ہے جس موقع پر آپ نے لکھا ہے وہاں "زاویہ نگاہ" زیادہ سجتا ہے آپ نے لکھا ہے کہ "سائمن کمیشن" کے متعلق ہمارا "نقطۂ نگاہ" یہ ہے کہ حکومت نے اپنے تدبر کے فقدان کا ایک اور ثبوت دیا ہے۔ اگر یہاں "زاویہ نگاہ" لکھ دیجیے تو آپ پر نتیجے کی ذمہ داری نہیں رہتی اس لیے کہ بہت ممکن ہے کہ سائمن کمیشن کا مقصد اپنے نتیجے پر پہنچ کر عین تدبر ثابت ہو۔ اس وقت اگر "زاویۂ نگاہ" غلط بھی ہو جائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔ مگر "نقطۂ نگاہ" کا غلط ہونا ایک صحافی کی موت ہے" — اپنا سا منہ لے کر چلے آئے مختصر یہ کہ اس قسم کی اصلاحوں کا سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا۔"

غرض "ہمدم" میں دفتری امور، ترجمہ اور شذرات کے ساتھ ساتھ اخبار کا "مزاحیہ کالم" "دو دو باتیں" بھی لکھنا شروع

کیا۔ سید جالب نے اِن کے کالم کو سراہا اور حوصلہ افزائی کی، رفتہ رفتہ یہ کالم مقبول ہونا شروع ہوا اور پنجاب کے معاصر اخباروں نے محبت سے "دو دو باتیں" لکھنے والے کو اپنے کالموں میں "باتونی" کے نام سے یاد کرنا شروع کیا۔ اس زمانے کے مزاحیہ کالموں میں شوکت تھانوی صرف مولانا عبدالمجید سالک کے "افکار و حوادث" کی قیامت خیز ظرافت سے متاثر ہوئے ہیں کہ انھوں نے جگہ جگہ اپنی تحریروں میں اعتراف بھی کیا ہے۔ "دو دو باتیں" کی مقبولیت اتنی بڑھی کہ دوسرے اخبار اس کالم کو نقل کرنے لگے اور اس کالم کے فقرے لوگوں کی زبان پر چڑھ گئے۔ "دو دو باتیں" کا نمونہ دیکھیے:-

دو دو باتیں (روزنامہ ہمدم لکھنؤ پہلا دور)

"قرطاس ابیض کے متعلق ہم تو یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ آپ کوئی نہایت ہی عالم فاضل باشرع بزرگ ہوں گے۔ بڑی سی داڑھی ہوگی، لمبی سی تسبیح رکھتے ہوں گے بڑا سا عمامہ باندھے عبا وغیرہ پہنے ہوئے بالکل رمضان شریف کی طرح اونٹ پر سوار تشریف لائیں گے اور خود اپنے السلام علیکم سے اپنی آمد کی اطلاع دیں گے لیکن جب ۱۸؍ مارچ کی صبح کو یہ شور بلند ہوا کہ "قرطاس ابیض آگیا۔ قرطاس ابیض آگیا" تو خاکسار باتونی نے ہر شتر سوار کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا مگر جناب مولانا قرطاسِ ابیض کا کہیں پتہ نہ تھا کہ وہ کس راستے سے تشریف لائے اور کہاں گئے، مجبوراً لوگوں سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ آپ اخبار پانیر میں تشریف رکھتے ہیں اب جو پانیر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوا کہ ع

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

بہرحال ہم نے شروع سے آخر تک اس قرطاس کو دیکھا اور سمجھنے کی کوشش کی، اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو ایک معمولی سی سمجھ کے انسان کے ذہن میں نہ آجاتی چہ جائیکہ ہم مختصر یہ کہ ہم نے اس کو ایک مرتبہ رواں اور دوسری دفعہ مع مضمون کے پڑھ کر بخوبی سمجھ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اب چپ رہو ذرا دیکھو تو دوسری بڑی بڑی کھوپڑیوں والے کیا فرماتے ہیں بیچ اس مسئلہ کے اس کے بعد میاں باتونی تم بھی اکثریت کے ساتھ ہاں میں ہاں ملا دینا یہی تمھاری رائے ہوگی اور در اصل یہی محفوظ ترین رائے ہے بلکہ موجودہ زمانے کے تدبر کا راز اسی ایک نکتہ میں پنہاں ہے کہ انسان اقلیت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے بس چپکے سے اکثریت کے ساتھ ہو جائے ورنہ نتیجہ یہی ہوگا کہ تمام دنیا انگشت نمائی کرے گی اور اس انگشت نمائی کی تاب ظاہر ہے کہ صرف وہی لوگ لا سکتے ہیں جو سچ مچ کے پڑھے لکھے ہوں اور بہرحال اپنے لیے امن اسی میں ہے کہ جو سب کی رائے وہی ہماری ورنہ اختلاف

کر کے کون وجہ بتاتا پھرے اور کیا بتائے ؟

پھر جناب دوسرے ہی دن اخبارات میں ہندوستان کے بڑے بڑے مسٹروں، سروں، خان بہادروں، رائے بہادروں، پنڈتوں، مہاتماؤں، مولاناؤں، شریمانوں اور رئیس الاحراروں کے تبصرے آنا شروع ہو گئے۔ گویا اب یہ ہمارے واسطے بالکل آسان تھا کہ تمام اکابرین کی رائے کا ایک معجون مرکب کی صورت میں اپنے لیے بھی تیار کر لیں اور اخبارات کو قرطاس ابیض کے سلسلے میں اپنا ایک بیان دے دیں مگر اکابرینِ ملک کے تبصروں کو دیکھ کر ہم بالکل سوالیہ نشان بن کر رہ گئے، اس لیے کہ ان تمام تبصروں میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ اس مسودہ کا کوئی چھوٹا سا نام تجویز کر لیا جائے اور اس کے بعد اسی نام کی مناسبت سے اس دستاویز کا نسخہ اُڑا دیا جائے۔ چنانچہ کوئی تو کہتا ہے کہ یہ سادہ ورق ہے اور اسی کے ثبوت فراہم کرتا ہے۔ کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ سفید کاغذ نہیں بلکہ سفید ہاتھی ہے اور واقعی قرطاسِ ابیض میں سونڈ تک ثابت کر کے دکھا دیتے ہیں اب بتائیے کہ اس مسخرے پن کی صورت میں ہمارا ایسا سنجیدہ آدمی کیا کر سکتا ہے ——؟

بہرحال ہم کو اس کھلنڈرے پن سے کوئی سروکار نہیں ہم بہرحال سنجیدہ ہیں اور ہماری رائے بہرحال سنجیدہ ہوگی، اور وہ یہ ہے کہ یہ آئینی دستاویز گو کہ اخبار نویسوں کو گورنری یا گورنر جنرلی کا مستحق نہیں بناتی۔ پھر بھی سوائے اس ایک خامی کے ہر طرح مکمل ہے اور ہندوستان کی موسمی حالت کے عین مطابق ہے یعنی نہ یہ مئی اور جون کی گرمی میں ناگوار ہوگی اور نہ دسمبر جنوری کی سردی میں۔"

اسی زمانے میں رسالہ "پیمانہ" میں "امرود" اور "پان" وغیرہ کے عنوان سے ساغر نظامی کی کچھ شوخ نظمیں شائع ہوئیں جن کی تیزی اور بے حجابی پر دوسرے بزرگوں کے علاوہ سیّد جالب نے بھی شدید اعتراض کیا۔ سیّد صاحب نے "ہمدم" میں "ادب کے نام پر فحاشی" کے عنوان سے ایک بہت سخت اداریہ لکھ دیا، جس پر سیّد صاحب اور علامہ سیماب اکبر آبادی میں ان بن ہو گئی"، "اودھ پنچ" لکھنؤ بھی سیماب اور ساغر کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑا ہوا تھا۔ اور دونوں کے کلام کی سخت پیروڈی کر رہا تھا۔ سیّد صاحب کا لکھنا تھا کہ علامہ سیماب ذاتیات پر اتر آئے اور اپنے پرچے "تاج" آگرہ میں اِن کی افیون نوشی پر لکھ مارا کہ "یہ افیونی اپنی پینک سے اس وقت چونکا ہے جب زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے اور اب یہ اعتبارات کی لکیر پیٹ رہا ہے۔" اس پر سیّد جالب نے برافروختہ ہو کر اس معرکہ کی کمان شوکت تھانوی کے سپرد کر دی اور "دو دو باتیں" کا کالم علامہ سیماب کے لیے وقف ہو گیا۔ جس کا تذکرہ "ہمدم" کے دوسرے دَور کے ذیل میں آئے گا۔ اِسی دوران منتظمین "ہمدم" اور سیّد جالب سے پالیسی کے سلسلہ میں اَن بن ہو گئی۔ انھوں نے "ہمدم" سے

استعفیٰ دے دیا اور "ہمدم" کے بعد "ہمت" کر کے خود اپنا ذاتی اخبار "ہمت" نکالا۔

روزنامہ ہمّت لکھنؤ سید جالب نے "ہمدم" سے علیحدہ ہونے کے بعد ۱۹۳۰ء میں جاری کیا اور اس میں "دو دو باتیں" کا مزاحیہ کالم شوکت تھانوی کے سپرد کیا۔ کچھ عرصہ بعد سید جالب کا انتقال ہو گیا، اور "ہمت" اخبار بند ہو گیا۔ "ہمت" میں شوکت تھانوی کی "دو دو باتیں" کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے:۔

دو دو باتیں (روزنامہ ہمّت لکھنؤ)

"یہ سچ ہے کہ جس گھر میں بیری ہوتی ہے اُس میں ڈھیلے آتے ہی ہیں ایک لڑکی کی شادی کرنے کے لیے خدا جانے کتنے پیغامات آتے ہیں اور کس قدر امیدوار امیدواری کرتے ہیں لیکن آخری نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ صرف ایک ہی کامیاب ہوتا ہے باقی سب ناکام رہ جاتے ہیں اس قسم کے واقعات ذرا کم ہوتے ہیں کہ بیک وقت ایک سے زیادہ امیدوار کو اس قسم کے معاملات میں کامیابی حاصل ہو لیکن یہ تو دُنیا ہے یہاں کم واقعات بھی بکثرت ہوتے ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس قسم کے واقعات ہوتے ہی نہیں البتہ کم و بیش کا فرق ہے چنانچہ آج جو قصہ ہم سُنانے والے ہیں وہ اس قسم کے واقعات میں سے ایک ایسا واقعہ ہے جو اگر اپنی نوعیت کا پہلا نہیں تو کم از کم عجیب و غریب ضرور ہے اور آپ یقیناً اس کو سُن کر دنگ رہ جائیں گے۔

اسی مارچ کے مہینے کا واقعہ ہے کہ جموں میں ایک دُلہن کو بیاہنے کے لیے دو مختلف دُولہا اپنی اپنی براتیں لے کر دُلہن کے یہاں آموجود ہوئے قصہ دراصل یہ تھا کہ ایک بیوہ پنڈتانی نے اپنی حسین و جمیل اکلوتی بیٹی کی شادی ایک جگہ طے کی اور یہ سودا سوا دو ہزار روپے پر طے ہوا لیکن اس اثنا میں ایک دیہاتی گاہک بھی پیدا ہو گیا اور اس نے اس جنسِ لطیف کو حاصل کرنے کے لیے چار ہزار روپیہ لگا دیا سچ ہے کہ ع

مال اچھا ہے تو دُنیا میں خریدار بہت

دُلہن کی تجارتی دماغ رکھنے والی والدہ ماجدہ نے دونوں گاہکوں کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اپنی ایک عدد بیٹی کے لیے دو عدد براتیں ایک ہی وقت میں اپنے یہاں لانے کو کہہ دیا تاکہ دونوں امیدوار ایک دوسرے کے سامنے بولی بولیں اور جو زیادہ دام لگائے اسی کے نام نیلام ختم کر دیا جائے ممکن ہے کہ اس طرح قیمت چار ہزار سے بھی بڑھ جائے اور ایک دوسرے کی ضد پر دونوں خریدار قیمتوں میں اضافہ کر دیں۔

خیر صاحب دونوں براتیں بیک وقت دُلہن کے گھر پہنچ گئیں اور ہر ایک امیدوار نے اپنے دوسرے رقیب کو درِ حبیب پر دیکھ لیا۔ لیکن یہ قصہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا اب ذرا ٹیپ کا بند

ملاحظہ فرمائیے کہ ادھر تو یہ دونوں براتیں آئیں اور اُدھر ایک تیسرے صاحب جو بتوسط والدۂ عروس نہیں بلکہ براہِ راست عروس سے دیرینہ امیدواری رکھتے تھے اور کافی راہ و رسم بھی پیدا کر چکے تھے دلہن کو لے کر چل دیئے رہ گئے یہ دونوں بیوقوف دولہا سوائے اس کے اور کیا کرتے کہ اپنا سا منہ لے کر واپس جائیں اس لیے کہ دلہن تو خیر اس طرح غائب ہو چکی تھی لیکن دولہا کی اماں جان بغیر کسی کے بھگائے ہوئے خود ہی بھاگ گئیں تھیں۔ بہرحال مزے میں رہا وہ جس نے اس آپس کے معاملہ میں دلہن کی ماں کو بیچ میں ڈالا تھا بلکہ بالا بالا دلہن ہی سے تمام معاملات طے کر لیے تھے اور پھر اس کے بعد یہ صورت پیدا ہو گئی تھی کہ

میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی

ناکامی کے بعد قدرتی طور پر کھسیانہ پن پیدا ہو جاتا ہے ان دونوں ناکام دولہاؤں نے پہلے تو ایک دوسرے سے کہا کہ ع

تو ہائے دل پکار رہیں چلاؤں ہائے دل

اور اس کے بعد دونوں نے پولیس میں رپورٹ کر دی، پولیس تو گڑے ہوئے مردے بھی اکھاڑ لیتی ہے چنانچہ دلہن کی والدہ محترمہ گرفتار ہو کر پولیس کی حراست میں ہیں البتہ دلہن اور ان کے حقیقی دولہا کا پتہ نہیں ہے اور اگر وہ مل بھی گئے تو اب کیا ہوتا ہے جو کچھ ہونا تھا ہو گیا دلہن جس کی قسمت کی تھی اس کو مل گئی دوسرے اس تمام واقعہ کی کوئی ذمہ داری نہ دلہن پر ہے نہ اس خوش نصیب دولہا پر جو مفت میں اس کو بھگا کر دولہا بن گیا جو کچھ بھی ذمہ داری ہے اس عیارہ بڑھیا پر ہے جس نے ایک لڑکی کے لیے دو نقد دولہا تیار کئے اور ایک اُدھار والا پہلے سے تیار تھا جس کو پیشگی دولہا کہنا چاہیئے۔

روزنامہ ہمدم لکھنؤ (دوسرا دور)

سید جالب کی "ہمدم" اخبار سے علیحدگی کے بعد اخبار کی ادارت ایک ہفتہ تک سابق مدیر "مدینہ" بجنور ملک نصر اللہ خاں عزیز نے کی اِن کے بعد قاضی محمد حامد صاحب حسرت قائم مقامی کرتے رہے اور دو دن کے لیے شوکت تھانوی بھی ہمدم کے ایڈیٹر رہے پھر چودھری رحم علی الہاشمی نے باضابطہ ادارت سنبھال لی۔ ہاشمی صاحب نے آتے ہی "دو دو باتیں" کا مزاحیہ کالم شوکت تھانوی کے سپرد کر دیا۔ علامہ سیماب سے "دو دو باتیں" میں ہمدم کی معاصرانہ نوک جھونک جاری تھی اور اب اس ناخوشگوار بحث نے باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ علامہ نے اپنے اخبار کے علاوہ اپنے ایک شاگرد خواجہ ستار الحسن جمیل مدیر "فرشتہ" ہفت روزہ سے بھی ہمدم کے خلاف آتش فشانی شروع کروا دی "فرشتہ" کی ایک تحریر کا جواب دیتے ہوئے تھانوی نے لکھ دیا کہ "فرشتہ تو فرشتہ اس معلم الملکوت تک کے فرشتوں کو کیا اس کی خبر

نہیں کہ "ہمدم" روزانہ اخبار ہے اور یہ گنڈے دار چھپنے والے ہفتہ وار اخبار اس کی روزانہ کی چوٹوں کا اگر ہفتہ میں ایک بار بھی جواب دے سکیں تو بھی ہفتہ کے باقی چھ دن سہلاتے گزر جایا کریں گے۔" سیماب نے "تاج" آگرہ میں اس کا فوراً جواب دیا کہ —

ادب باقی ہے اور نہ استعداد باقی ہے
فقط طاغوتیوں کی فکرِ یاوہ زاد باقی ہے
کوئی ہمدم کے بانی سے جا کر صرف یہ کہہ دے
کہ شیطاں مر گیا اس کی مگر اولاد باقی ہے

سنجیدہ قسم کے بزرگ اس ناخوشگوار بحث کو ختم کرانا چاہتے تھے چنانچہ چودھری رحم علی الہاشمی مدیر ہمدم نے اس جنگ کو ختم کرنے کے لیے شوکت تھانوی سے اصرار کیا۔ شوکت تھانوی نے رسالہ "پیمانہ" میں سیماب کی تازہ غزل پر سخت تنقید کرتے ہوئے اور ان کے مقطع کو چٹکیوں میں اڑاتے ہوئے (علامہ سیماب کا مقطع یہ تھا۔ ع سیماب حقیقت میں فطرت کا تمسخر ہے۔) لکھ دیا کہ "اب جبکہ مولانا نے خود اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے اب ہم کو مولانا کے متعلق کچھ نہیں کہنا ہے اور آج سے ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔"

رسالہ "انکشاف" لکھنؤ ظریف نمبر

اسی دوران چودھری رحم علی الہاشمی نے ایک آنہ فنڈ لکھنؤ کے ماہنامہ "انکشاف" کے ایڈیٹر نسیم انہونوی کو شوکت تھانوی سے ملوا دیا۔ نسیم انہونوی "انکشاف" کے لیے مضمون لینے آئے تھے اس ملاقات کے بعد دونوں میں پینگیں بڑھنا شروع ہوئیں یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے کے ہمیشہ کے لیے جگری دوست ہو گئے۔ شوکت تھانوی کے مشورے پر نسیم انہونوی نے "انکشاف" کا سالنامہ "ظریف نمبر" کی صورت میں فروری سنہ ۳۳ء میں بڑے دھوم دھام سے نکالا۔ اس نمبر کو شوکت تھانوی نے مرتب کیا تھا اس نمبر میں ہندوستان کے تمام ممتاز مزاح نگار شریک تھے۔ اس زعفران زار نمبر کا اداریہ شوکت تھانوی نے "بیگار" کے عنوان سے لکھا تھا جس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:-

> "کس کی بکری اور کون ڈالے گھاس، یعنی رسالہ ایک آنہ فنڈ کا، ایڈیٹر اس کے میاں نسیم صاحب اور شذرات لکھیں مولانا شوکت تھانوی، گویا مولانا شوکت تھانوی نہ ہوئے کرایہ کے بلکہ بیگار کے ٹٹو ہو گئے۔ کہ چاہے فٹن میں جوت دیا، چاہے تانگہ میں لگا دیا، ہم کو ڈکی چلنے سے کام، یہ رمضان شریف کا زمانہ دیکھئے، یہ عید کی آمد اور اس سلسلہ میں ہندوستان کے رسائل کے عید نمبر میں ہمارے مضامین کا شریک ہونا ملاحظہ فرمایئے اور پھر مرے پر سو درّے یہ شذرات لکھنا دیکھئے، شذرات کیا لکھ رہے ہیں حقِ دوستی بھگت رہے ہیں۔"

انکشاف کا ظریف نمبر بے حد مقبول ہوا مگر اس کے ساتھ پالیسی سے اختلاف کی بنا پر نسیم انہونوی "انکشاف" سے کنارہ کش ہو گئے اور اسی کے سال بھر بعد شوکت تھانوی کے مشورے سے "سرپنچ" ہفتہ وار نکالا اور اس کی

ادارت شوکت تھانوی کے سپرد کر دی۔

شوکت تھانوی کی "سودیشی ریل" روزنامہ "ہمدم" اور "نیرنگ خیال" لاہور کے سالنامہ میں شائع ہو چکی تھی اردو دنیا میں ان کی مزاح نگاری کے جھنڈے گڑ چکے تھے۔ مزاحیہ کالم نگاری بھی مقبول خاص و عام ہو چکی تھی۔ وہ محفل محفل نہ سمجھی جاتی تھی جس میں شوکت تھانوی کو نہ مدعو کیا جائے یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے "دو دو باتیں" کے کالم کو اس قدر باغ و بہار بنا دیا تھا کہ لوگوں کو اس کا انتظار رہنے لگا تھا ہمدم کے اس دوسرے دور کا بھی ایک نمونہ دیکھیے:۔

دو دو باتیں (روزنامہ ہمدم لکھنؤ دوسرا دور)

"ہم تو اب تک صرف یہی سمجھتے تھے کہ ایک ڈارون ایسے انسان گزرے ہیں جن کے مورثِ اعلیٰ بندر تھے اور جنھوں نے اپنے ساتھ تمام دنیا کے انسانوں کو بندر کی اولاد بنایا ہے لیکن دنیا کی ترقی کے ساتھ روز بروز حضرت انسان کی حقیقت کھلتی جاتی ہے اور یہ راز افشا ہوا جاتا ہے کہ وہ انسان بھی اشرف المخلوقات ہونے کے زعم میں مبتلا ہے ورنہ اصل کیا ہے اور کیا سے کیا ہوا ہے واللہ بعض اوقات تو ان نئی تحقیقاتوں کے نتائج معلوم کر کے اپنے انسان ہونے پر بڑا غصہ آتا ہے اور یہ غصہ حق بجانب بھی ہے آپ ہی غور کیجیے کہ وہ انسان جو بندر کی اولاد ہو، اگر انسان بھی ہے تو کس کام کا اس کے آباؤ اجداد تو وہ درختوں پر "اوں اوں" کرنے والے جانور تھے جن کو آج ہم اور آپ بجائے قبلہ و کعبہ کہنے کے "ٹکے ٹکے" کہہ کر بھگا دیتے ہیں اور جو درختوں پر ٹہنیوں ٹہنیوں چھلانگیں مارتے پھرتے ہیں ہمارے اس بیان کی تصدیق اس طرح سے کی جا سکتی ہے کہ کسی بندر کو اپنا بزرگ سمجھ کر دیکھا جائے اور یہ طے کر لیا جائے کہ ہم اس کی اولاد میں سے ہیں پھر دیکھیے کہ خود انسان اپنی نظروں میں کس قدر ذلیل ہو جاتا ہے اور اس کے اشرف المخلوقات ہونے کا غرور کس بری طرح شکستہ ہوتا ہے۔

خیر یہ تو بندر ہی کو آباؤ اجداد بنانے کا قصہ تھا اب ملاحظہ فرمائیے کہ مجمع الجزائر نکوبار کے باشندے اپنے کو کُتے کی نسل سے کہتے ہیں اور اس کی پوجا کرتے ہیں یعنی ڈارون صاحب نے تو انسان کو بندر کی اولاد کہا تھا لیکن نکوبار کے باشندے کُتے کو اپنا جدِ اعلیٰ سمجھتے ہیں ان کا بیان ہے کہ سب سے پہلا انسان جو نکوبار میں آیا وہ مرد تھا اور اس کے ساتھ ایک کُتیا تھی، اس اللہ کے بندے نے نکوبار میں سکونت اختیار کر کے اسی کُتیا کو اپنی اہلیہ محترمہ بنا لیا اور اس کُتیا سے تھوڑے دنوں کے بعد ایک صاحبزادے تولّد ہوئے ان سعادت آثار نے

یہ حرکت کی کہ جب نامِ خدا جوان ہوئے تو اپنی والدہ ماجدہ کو کہیں چھپا دیا اور اپنے والد بزرگوار یعنی کتیّا کے معزز شوہر کو مار ڈالا اور اپنی والدہ کے بلا شرکت غیرے شوہر بن بیٹھے چنانچہ اب جتنے بھی نکوبار کے اصلی باشندے ہیں وہ اسی نسل سے ہیں اور اپنی اوقات کو ابھی تک نہیں بھولے ہیں اور کتّوں، کتیّوں کو نہایت عزت و احترام سے دیکھتے اور ان کی پوجا کرتے ہیں اور وہی سلوک اس جانور کے ساتھ کرتے ہیں جو کوئی سعادت مند فرزند اپنے والدین کے ساتھ کر سکتا ہے ان کے یہاں کتے کو مارنا بڑا گناہ ہے اور واقعی گستاخی بھی ہے۔

ملاحظہ فرمایئے کہ ابھی تک تو صرف ڈارون صاحب نے بندر ہی کو باپ کہا تھا لیکن یہاں کتیّا کو بھی امّاں کہنے والے موجود ہیں لیکن باوجود اس کے انسان ہے کہ اپنے اشرف المخلوقات ہونے کے گھمنڈ میں اکڑا ہی جاتا ہے وہ تو کہیئے کہ نکوبار کے باشندوں نے صرف اپنے ہی کو کتیّا کا جنا کہا ہے ڈارون کی طرح تمام دنیا کو بندر کی اولاد نہیں کہا ورنہ ہم ان نکوباریوں کا بھی کیا بنا لیتے اگر وہ اپنے ساتھ تمام دنیا والوں کا کتیّا کے بطن سے پیدا ہونا ثابت کرتے اس لیے ہم نے تو ڈارون کی اس گالی کو بھی خندہ پیشانی کے ساتھ سنا جب اس نے ہم سب کو ایک سرے سے بندر کا بچہ کہہ دیا اور ہم اس کا بال بھی بیکا نہ کر سکے نہ اس پر کسی نے ہتک عزت کا مقدمہ دائر کیا اور نہ کوئی شرافت اور نجابت کا دعویدار اس پر آمادہ ہوا کہ ڈارون کی اور اپنی جان ایک کر دے تو جناب ہماری شرافت سے یہ کب بعید تھا کہ ہم کو نکوباری کتّے کی نسل سے کہتے اور ہم خاموش ہو جاتے مگر یہ اہلِ نکوبار کی شرافت تھی کہ انہوں نے اس شجرۂ نسب کو اپنے ہی تک محدود رکھا اور باقی تمام دنیا پر یہ عنایت فرمائی کہ کسی کا شجرہ کتّوں اور کتیّوں سے نہیں ملایا۔

انسان کے متعلق یہ دو روایتیں تو خیر ہوئیں لیکن ہم کو اندیشہ ہے کہ ؏
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

اور ہر وقت ہم ڈرتے رہتے ہیں کہ خدا جانے یہ محققین ہم کو کیا ثابت کر دکھائیں اس سے آپ اطمینان رکھیئے کہ ان چھان بین کرنے والوں سے کوئی بات بعید نہیں ہے جب چاہیں گے انسان کو بندر کا بچہ ثابت کر دیں گے اور جب چاہیں گے یہ کہہ دیں گے کہ صرف نکوباری ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسان کتیّا کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں بس ہم کو تو یہ دعا کرنا چاہیئے کہ خدا ان محققین سے ہم کو نجات دلائے اور عزت آبرو کے ساتھ جیسا انسان ابن انسان ابن انسان ابن انسان پیدا کیا ہے اسی طرح انسان ابن انسانِ انسان ابن انسان اس دنیا سے اٹھا لے ورنہ خدا جانے انسان پیدا ہو کر کس جانور کی اولاد بن کر ہم کو دنیا سے اٹھنا پڑے۔

سرپنچ ہفت روزہ۔ لکھنؤ کا پہلا شمارہ شوکت تھانوی کی ادارت میں ستمبر ۳۱ء میں نکلا۔ جب شوکت تھانوی کسی اور اخبار سے وابستہ ہو جاتے اور ان کے نام کی اشاعت پر اس ادارہ کو اعتراض ہوتا تو سرپنچ کی ادارت میں اِن کا نام شائع نہ ہوتا مگر اس کی مشاطگی اور زعفران زاری میں برابر اِن کا ہاتھ رہتا۔

سرپنچ کا پہلا ہی شمارہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا دو ہی چار شماروں میں اس کی اشاعت ہزاروں تک پہنچ گئی اور اس کے اگلے شمارہ کا پڑھنے والے بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔

سرپنچ پر اودھ پنچ کے اثرات اودھ پنچ مائل بہ زوال تھا۔ ظریف لکھنوی، چودھری محمد علی ردولوی، شہباز بلند پرواز اور اس کے دوسرے لکھنے والے سرپنچ کے صفحات پر نظر آنے لگے مگر اسی کے ساتھ یہ حقیقت ہے کہ سرپنچ نے اودھ پنچ سے بہت کچھ سیکھا اور پایا۔ سرپنچ کے سرورق سائز، تہذیب و ترتیب، شذرات، کالم، معرکے، تبصرے اور خطوط کے علاوہ دونوں کے سرورق کے کارٹون کے خیال میں حیرت انگیز مماثلت و مشابہت پائی جاتی ہے۔ لیکن ایک بنیادی فرق بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ دونوں کی ذہنی سطح میں زمین اور آسمان کا فرق ہے شوکت تھانوی میں منشی سجاد حسین اور شیخ ممتاز حسین عثمانی والی گہرائی، علمیت اور باریکی نہیں ہے۔ نہ منشی صاحب کی طرح وہ وطن پرست ہیں۔ سرپنچ کے خاص لکھنے والوں میں رتن ناتھ سرشار، اکبر الٰہ آبادی، مچھو بیگ ستم ظریف، نواب سید محمد آزاد، منشی احمد علی شوق قدوائی، محفوظ علی بدایونی اور ولایت حسین بمبوق تک کوئی بھی نہیں پہنچتا۔ اسی وجہ سے سرپنچ کے پنچوں کے طنز میں صفائی اور نشتریت کے بجائے لاابالی اور بھونڈے پن کی کیفیت ملتی ہے۔ کیونکہ یہ پیر طناز کے بجائے کھلنڈرے ہیں اور اپنی اس کمی کو ذہانت، برجستگی اور خوش مزاجی سے پورا کر دیتے ہیں اور خود ہنس کر دوسروں کو ہنسنے پر مجبور کر دیتے ہیں مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان کھلنڈروں میں مسائل کی سوجھ بوجھ یا حالات و واقعات کا ادراک نہیں ہے مگر سب کچھ ہونے ہوئے بھی ان کا رول محض ایک تماشائی کا سا ہے۔ ان کی صحافت میں گرمی بھی ہے مگر یہ گرمی اودھ پنچ کے آتش فشاں کے لاوے کی صورت میں نہیں نکلتی بلکہ معاصرانہ چشمکوں اور ہنگامۂ بزم کے تنور سے نکلتی ہے۔ اس گرمی کا قوام تجسس، سنسنی خیزی اور دلچسپی سے مل کر بنا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اودھ پنچ کے بعد اردو ادب میں طنز و ظرافت کا سب سے بڑا خزانہ ہمیں سرپنچ ہی میں ملتا ہے۔ سرپنچ، اودھ پنچ کی طرح محض اپنے لکھنے والوں ہی پر قناعت نہ کرتا تھا بلکہ قلمکاروں کا ایک وسیع حلقہ ہونے کے باوجود دوسرے رسائل و اخبارات کی ظرافت کو بھی سرپنچ میں درآمد کر لیتا تھا۔

سرپنچ کے نورتن اس کے پنچوں اور برادری کی صحافت، اِن کے معرکے، اداریے، باغ و بہار کالم، خاص نمبر، گزٹ انتخابات، کارٹون، تبصرے اور خطوط ایک انمول اور انمٹ خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں اور اودھ پنچ کے بعد سرپنچ کا ہمارے مزاحیہ ادب میں سب سے اہم مقام ہے۔ سرپنچ نے مزاح نگاروں کی ایک پوری نسل کو جنم دیا، شائستہ ظرافت اور مزاح کے لیے فضا پیدا کی اور کاروانِ طنز و ظرافت کو ایک نئی منزل عطا کی، سرپنچ کے خس و خاشاک میں بھی زعفران کی آمیزش اور خوشبو ہے، غرض سرپنچ شوکت تھانوی کا ایک ایسا محترم کارنامہ ہے جو ہمیشہ ان کے نام کو زندہ اور

سربلند رکھے گا۔

سرپنچ کی صحافت

بہت جلد سرپنچ میں شوکت تھانوی کے قلم کی دھاک بیٹھ گئی۔ بڑے بڑے سورما اور جغادری چوکنا رہنے لگے کہ معلوم نہیں کب کس کی خبر لے لی جائے۔ سرپنچ میں چٹ پٹا پن پیدا کرنے کے لیے شوکت تھانوی نے طنز و مزاح کے ساتھ ساتھ سنسنی خیزی، گرمی اور تجسس کا عنصر بھی شامل کر دیا۔ مضامین، افسانوں، نظموں، غزلوں اور خبروں کے ساتھ ساتھ معاصرین سے معرکے اور بحثیں چھڑی رہتیں، ہنگامہ خیز تبصرے کئے جاتے جن کے لکھنے والوں میں ہنسوڑپن کے ساتھ ایک بانکپن کی بھی شان تھی، اس کی پالیسی میں اسی وجہ سے کبھی سرفروشی کا انداز پیدا نہ ہو سکا مگر ایک تنک مزاجی ضرور نمایاں ہو گئی۔

سرپنچ پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈال دینے کے لیے کبھی یہ خبر چھپتی کہ "ایڈیٹر سرپنچ کی ڈاک میں دھمکی آمیز خطوط موصول ہو رہے ہیں، کبھی ان فرضی خطوط کی نقلیں شائع کی جاتیں جن سے پڑھنے والوں کے کان کھڑے ہو جاتے کبھی معلوم ہوتا کہ دھمکی دینے والے نے دفتر سرپنچ کی فائلوں میں آگ لگانے کی ناکام کوشش کی ؎

سرپنچ کو جلانے کی کوشش میں تھک نہ جاؤ
چنگاریوں سے اس کو جلایا نہ جائے گا

پھر ہزاروں کے مجمع اور بندوقوں کے سائے میں دفتر کا دروازہ دھمکی دینے والے کو پکڑنے کے لیے کھولا جاتا تو اندر سے کوں کوں کرتا ہوا ایک خارشی کتا برآمد ہوتا۔ اور کبھی ملاقاتی حامد ڈاکو کی جگہ حامد شاہجہانپوری نکلتا، کبھی زنانے پارک میں مردانے جلسے کی خبر چھپتی، کبھی مس کجن دفتر سرپنچ میں رونق افروز ہوتیں شائقین اور طلبا ان سے ملنے کے لیے لے جا کر بٹھا لیے جاتے کہ ابھی چلی ہو گی پھر خاصدان پیش کیا جاتا جس کے کھولے جانے پر پان کی جگہ "اپریل فول" کی بشارت ملتی اور ملاقاتی کھسیا کر خاموشی کے ساتھ دوسرے دروازہ سے نکل جاتا۔

وہی وہانوی کا کردار

اسی ہنسی، دل لگی بازی اور سنسنی خیزی کے بنیادی جذبہ نے سرپنچ کے صفحات پر وہی وہانوی کے رسوائے زمانہ کردار کو جنم دیا۔ شروع میں شوکت تھانوی کے وہی وہانوی غالب پر مصرعے لگانے اور تک بندی کرتے تھے ؎

تقدیر کا لکھا وہی کچھ بھی نہ پڑھ سکے
گویا کہ جو کچھ لکھا ہے بخط شکست ہے
محبت میں کیا جانے کیا کر رہے ہیں
نہ وہ دیکھتے ہیں نہ ہم دیکھتے ہیں
مئے گلرنگ ابھی انگور کی دوشیزہ بیٹی ہے
اڑا لے جو کوئی انگور کا داماد ہو جائے

اس کے بعد وہی وہانوی کا چلن بگڑا، "تگڈم"، "بھنور" اور "گناہ" کی "دلدل" میں ایسے پھنسے کہ الامان الحفیظ،

سرپنچ سے نکلے تو کوک شاستر اور امساک کے نسخے بیچنے لگے بعد میں ان کی آڑ لے کر جنسی کجروی کی جو ڈھول اُڑائی گئی اس سے سب ہی واقف ہیں۔

قصہ مختصر سرپنچ اور اس کے قلمکار بلا کے ذہین، ہنسوڑ، دلگی باز اور نت نئے شوشے چھوڑنے والے تھے سچ پوچھیے تو ان کی پالیسی زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کے سوا کچھ نہ تھی اور ہنسنے ہنسانے کے اس معیار پر سرپنچ پورا اُترتا ہے۔

سرپنچ کے نورتن شوکت تھانوی، نسیم انہونوی، عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ، ملا رموزی، چودھری محمد علی ردولوی، ظریف لکھنوی، احمق پھپھوندوی اور شہباز بلند پرواز تھے۔

شوکت تھانوی سرپنچ کے ایڈیٹر تھے ستمبر ۳۱ء سے ۴۵ء تک لکھنؤ میں رہنے کے دوران اس سے برابر وابستہ رہے۔ اس پرچہ میں ان کی وہی اہمیت تھی جو جسم میں جان کی ہوتی ہے۔ انھوں نے سرپنچ میں مزاح نگاروں کی ایک زبردست فوج بھرتی کی اور بہت جلد سرپنچ کو اُردو کا ایک باوقار مزاحیہ اخبار بنا دیا، اس کے اداریہ کالم اور تبصرے شوکت تھانوی خود لکھتے تھے۔ کارٹونسٹ کو کارٹون کا خیال دیتے تھے۔ سالِ نو کے موقع پر سرپنچ گزٹ شائع کر کے مزاح نگاروں کو خطابات تقسیم کرتے تھے اِس کے علاوہ معاصر رسائل و اخبارات مثلاً اودھ پنچ، اپنچ، چوپنچ، شگفتہ پنچ، ریاست، حقیقت، سرفراز، ملاپ اور جامِ جہاں نما وغیرہ سے برابر چونچیں لڑتے رہتے تھے۔

شوکت تھانوی کے اداریے بڑے ہنگامہ خیز ہوتے تھے۔ لکھنؤ میں حامد ڈاکو کا زور تھا پولیس بھی اس کے سامنے جاتے کتراتی تھی۔ ایک مکان میں حامد ڈاکو کو پولیس نے گھیرا مگر حامد صاف نکل گیا۔ اس پہ سرپنچ میں "نہتی اور مظلوم پولیس اور مسلح اور ظالم حامد ڈاکو" کے عنوان سے بہت سخت اداریہ لکھ دیا۔ جس پہ یہ شعر بھی چسپاں کیا گیا تھا کہ

نامکمل ہے ابھی وردی پولیس کی اے حضور
چوڑیوں کا بھی اضافہ اس میں ہونا چاہیے

اور پولیس کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے یہ شعر بھی چسپت کیا گیا تھا کہ

حامد کا ہر ایک جانب ہُوا نظر آتا ہے
معصوم پولیس کو اب کیا کیا نظر آتا ہے

اس معرکہ کے اداریہ کی دھوم مچ گئی اور پرچہ کی اتنی زیادہ مانگ ہوئی کہ سرپنچ کے اسی شمارہ کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا۔ پولیس نے سرپنچ پر مقدمہ چلانے کی بہت کوشش کی مگر اس میں اُسے کامیابی نہ حاصل ہو سکی۔ پرچہ کی مقبولیت میں سرپنچ اور چوپنچ کے قیامت خیز معرکہ نے بھی بہت اضافہ کیا تھا۔ چوپنچ کجن بائی کا حمایتی تھی اور سرپنچ پنجے جھاڑ کر کجن بائی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ شوکت تھانوی کی ناول "بڑھبس" جب سرپنچ میں قسطوں میں شائع ہونا شروع ہوئی تھی تو اس کی قسطوں کا پڑھنے والوں کو بے قراری کے ساتھ انتظار رہتا تھا۔ اس میں ان کی قلمی تصویروں کا سلسلہ بھی بہت مقبول ہوا تھا، اس کے علاوہ دیوانِ غالب کی مزاحیہ شرح کی قسطیں، مونڈی کاٹے، سودیشی مضامین، موجِ تبسم،

بحرِ تبسم، سیلابِ تبسم، اور طوفانِ تبسم کے مضامین بھی پہلے سرپنچ ہی میں شائع ہوئے تھے۔ امرود کا چور، وہ مارا، قطع کلام، چائے تھوکنا، دو منٹ، سسرال، اگر میں تھانیدار ہوتا، کھجلی، جی ہاں بیٹے ہیں، میں ایک بے روزگار ہوں، اگر میں بادشاہ ہوتا، خدا حافظ، شاعر، شامت، سودیشی مشاعرہ، عاشق بننے کے لیے کسی سند کی ضرورت نہیں، چوری اور سرپنچ کو آنچ وغیرہ بے شمار مضامین، افسانے، ناول اور ان کی مزاحیہ شاعری کے نمونے اس میں برابر شائع ہوتے رہے۔

نسیم انہونوی سرپنچ کے پرو پرائٹر ہونے کے علاوہ شوکت تھانوی کے جانے کے بعد اس کے ایڈیٹر ہوتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہر حال میں سرپنچ کو ہمیشہ جاری رکھا اور شوکت تھانوی کے علاوہ ابنِ سلونوی، اخترِ صدیقی، جلال ملیح آبادی، جمال رضوی اور خان محبوب طرزی کو بھی سرپنچ کا مدیر مقرر کیا۔

سرپنچ کے نورتنوں میں نسیم انہونوی کی ہمیشہ بڑی اہمیت رہے گی، سرپنچ میں ۳۲ء میں ان کا افسانہ "الٹی دنیا" شائع ہوا تھا اسی کی بنا پر بعد میں شوکت تھانوی نے ۳۴ء میں "خدانخواستہ" کے عنوان سے پہلے مضمون لکھا اور بعد میں اسے بڑھا کر ناول بنا دیا۔ "الٹی دنیا" سے متأثر ہو کر "مرزا" نے فلم "الٹی گنگا" بنائی۔ سرپنچ کے صفحات پر نسیم انہونوی کے بے شمار مضامین اور افسانے بکھرے ہوئے ہیں جن کی شیرازہ بندی کی ضرورت ہے۔ ان میں گھوڑوں کی کاشت، دھوکا، عداوت، لاری کا سفر، حواصل، ہما خانم، تانگہ خریدا، شاعر، بدتمیزی، چچا چھکن نے گوشت پکایا، ڈبلیکیٹ شادی، پیروں کا سینچر، اور شریر بیوی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

عظیم بیگ چغتائی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اِن کے مضامین، افسانے، ناول کی قسطیں، شاعری کے نمونے اور "دم چھلے" کے مضامین برابر سرپنچ میں چھپتے رہتے تھے۔ "دم چھلے" سے مراد یہ ہے کہ جیسے مضمون شوکت تھانوی نے شروع کیا جہاں سے انھوں نے ختم کیا وہاں سے عظیم بیگ چغتائی لے کر چلے، غرض اسی طرح سلسلہ جاری رہتا۔

فرحت اللہ بیگ کی چٹخارے دار نثر اور گدگدے دار نظم سے سرپنچ مرصع نظر آتا ہے۔ ان کے بیشتر اہم مضامین اسی میں شائع ہوئے۔

ملا رموزی کی گلابی اردو کے گل بوٹے اور ان کی چھپے دار نثر سرپنچ کے حسن میں اضافہ ہے۔ یہ اس کے انتہائی مستعد قلم کاروں میں سے ہیں۔

چودھری محمد علی ردولوی اودھ پنچ سے ہجرت کرنے کے بعد سب سے آگے آگے سرپنچ میں نظر آتے ہیں۔ آخری دور میں اودھ پنچ برائے نام رہ گیا تھا اور کوئی دوسرا مزاحیہ پرچہ اس کی ٹکر کا نہ تھا، ان کے خاصے کے مضامین اودھ پنچ کے بعد سرپنچ میں ملتے ہیں۔

ظریف لکھنوی اودھ پنچ کی طرح سرپنچ کے بھی سب سے خاص لکھنے والے تھے۔ سرپنچ میں ان کی شمولیت ایک بزرگ کی شرکت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اِن کا بیشتر نمائندہ کلام سرپنچ کی جلدوں میں محفوظ ہے مثلاً سرپنچ کا ایک مشورہ "شیخ جی" سے

زر کمانا ہو تو لکھ پڑھ کے پلیڈر بن جاؤ
جب وکالت نہ چلے، قوم کے لیڈر بن جاؤ

احمق پھپھوندوی کی سیاسی شاعری کے لیے سرپنچ کے صفحات وقف تھے۔ ان کا ظریفانہ کلام سرپنچ بڑے اہتمام سے شائع کرتا ہے۔ "کلام احمق" اور "احمقیات" کے عنوان سے یہ اس میں چھپتے تھے۔

بریگیڈیر الشعرا شہباز بلند پرواز سرپنچ کے بڑے لکھاڑ رن تھے۔ نثر میں بھی خیال آرائی کرتے تھے۔ بلند پروازیاں کا عنوان ان کے کلام کے لیے مخصوص تھا۔ ان کے رنگ کا اس شعر سے اندازہ لگائیے ؎

مجھ کو کہتے ہیں آپ "غلام"
ہتک عزت نہیں تو پھر کیا ہے

سرپنچ کے پنچ علامہ عبدالباری آسی، ابن سلوتری، مجنوں لکھنوی، احتشام ماہلی اور عبداللہ ناصر صلجان تھے۔

علامہ عبدالباری آسی مرحوم صاحب تذکرہ خندۂ گل، آپ شاعری میں شوکت تھانوی کے استاد ہونے کے علاوہ اس رنگ میں بھی خوب لکھتے تھے ان کے تبرکات میں "لغات الظرفا" بڑی یادگار زمانہ قسم کی چیز ہے جو قسطوں میں سرپنچ میں چھپتی تھی۔
اس کا ایک نمونہ دیکھیے:-

لُغاتُ الظُرفا

فیشن	بھیڑ چال
فادر	انگریزی داں کا باپ
فدوی	امیدوار ملازمت
مذہب	حیلۂ جنگ
مشاعرہ	دنگل
مروّت	دل کی کمزوری
مریضِ ہجر	شاعر
مجذوب	دنیا سے باخبر اپنے سے بے خبر
دیوان	شاعر کا اعمالنامہ
روپیہ	قاضی الحاجات
شذرات	سندِ صحافت

ابن سلونوی رسالہ ترچھی نظر، نظر، اودھ اخبار اور انڈیپنڈنٹ نیوز سروس کے ایڈیٹر رہنے کے علاوہ سرپنچ کے مدیر اور منیجر شعبہ اشتہارات بھی تھے۔ ان کی رات کی ڈائری "شب نامچہ" کے عنوان سے سرپنچ میں چھپتی تھی اور "بیوی کے لیکچر" فروغِ اردو لاہور نے "دنیا میں جہنم" کے نام سے چھاپی تھی۔ سرپنچ کے زعفران زار صفحات میں ان کے بے شمار مزاحیہ مضامین بکھرے ہوئے ہیں۔

منور آغا مجنوں لکھنوی سرپنچ کے تقریباً ہر شمارے میں آگے آگے نظر آتے ہیں۔ "تجلیاتِ مجنوں" کے عنوان سے یہ مستقل شائع ہوتے تھے ہر لحاظ سے یہ اس کے اہم شاعر ہیں اور سرپنچ کا کوئی بھی تذکرہ مجنوں کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا۔

احتشام ماہلی سرپنچ کے سلسلہ میں یہ انکشاف بھی خاصا دلچسپ ہے کہ سید احتشام حسین افسانہ نگاری سے قبل سرپنچ کے باقاعدہ مزاح نگار اور اس کے پنچوں میں سے تھے۔ اور مزاحیہ شاعری میں حیران تخلص کرتے تھے۔ ان کے رنگارنگ مضامین مثلاً ہاسٹل کا شیطان، سیاہ پیچ، مشاعرے، فاؤنٹین پن، ہنگامۂ دار و گیر، ایڈیٹر، ہمدردی، وصال ہوگیا اور مصور بیوی وغیرہ اب بھی سرپنچ کی جلدوں میں محفوظ ہیں۔

عبداللہ ناصر بھی اودھ پنچ میں تیار ہوئے اور سرپنچ میں پھلے پھولے یہ سرپنچ کے ہر ہنگامہ میں آگے آگے نظر آتے ہیں۔

سرپنچ برادری میں خواجہ حسن نظامی، نیاز فتح پوری، حکیم ممتاز حسین عثمانی، مولانا عبدالمجید سالک، پطرس، رشید احمد صدیقی، علامہ جمیل مظہری، سلطان حیدر جوش، ایم اسلم، دیوانہ گورکھپوری، فلک پیما، نازش بدایونی، سید بہادر بزم، ارشد تھانوی، آوارہ حیدرآبادی، حامد شاہجہانپوری، ماچس لکھنوی، علامہ مضحک دہلوی، فرقت کاکوروی، حافظ غازی پوری، باسط بسوانی، فخر نظامی، دیوانہ بریلوی، مشیر احمد علوی، خضر تگرامی، رسوا اسیوانی، درد کاکوروی، عنایت دہلوی، ملا حضوری، نظر بریلوی، شمیم بیلوری، سلیم ندوردی، خان محبوب طرزی، علامہ ہنٹر، محب دریابادی، بوم ہاپڑی، سحر عابدی، مظفر احسانی، شوخ لکھنوی، شرف لکھنوی، ناکارہ حیدرآبادی، اور غضنفر محمد خاں وغیرہ اس کی برادری یا "پنچایت" میں شامل تھے۔

سرپنچ کے اداریے بڑے نوکیلے تیز اور دھار دار ہوتے تھے۔ ان میں بلا کا طنز اور گرمی ہوتی تھی۔ کہیں کہیں مزاح کے چھینٹوں کی وجہ سے ان میں دھواں اٹھتا بھی نظر آتا ہے جس سے ایک خوشگواری کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دیکھیے شوکت تھانوی سرپنچ کے اداریہ میں "انگارے" کے بارے میں کیا لکھتے ہیں:۔

انگارے

"یہ انگارے وہ نہیں ہیں جو آگ لگانے کے بعد ..... کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں، بلکہ ہمارا مقصد "انگارے" سے وہ کتاب ہے جو آجکل اخبارات کا دلچسپ ترین اور مسلّم اخبارات

کا اہم ترین مبحث بنی ہوئی ہے .... اس کو دیکھ کر نگاہ سے لے کر دل تک سب جل بھن کر رہ گیا۔ اور ہم منفعل ہیں کہ ہم نے آخر اس دہکتے ہوئے جہنم کو دیکھا ہی کیوں تھا — یہ کتاب دراصل دس چھل اور بے تکے افسانوں کا ایک بے ڈھنگا سا مجموعہ ہے جس کو "ایک عورت اور تین مردوں کی اجتماعی کوششوں نے مرتب کیا ہے، یہ پانچ افسانے، سجاد ظہیر نے لکھے ہیں، دو افسانے احمد علی صاحب کی ادبی بدہضمی کا نتیجہ ہیں، دو افسانے رشید جہاں صاحبہ کی انشا پردازانہ ہیضہ کا نمونہ ہیں اور ایک افسانہ محمود الظفر صاحب نے لکھ مارا ہے۔ اِن دسوں افسانوں کو پڑھ کر اگر پہلی مرتبہ کوئی شخص اس نتیجے پر پہنچ جائے کہ لکھنے والے نے کیا لکھا ہے اور پڑھنے والے نے کیا پڑھا ہے تو دعوے سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بریلی یا آگرے کے پاگل خانے کا مہتمم بننے کا اہل ترین شخص ہوگا ...... اور اگر ان افسانوں کو کوئی شخص بار بار پڑھے تو وہ یقیناً ہماری طرح صرف اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ کتاب صرف ایک صنعت کے تحت لکھی گئی ہے جس کو "صنعت بے دھڑک" کہہ سکتے ہیں یعنی لکھنے والے نے صرف یہ کیا ہے کہ قلم اُٹھا کر کاغذ پر لکھنا شروع کر دیا اور بغیر یہ سوچے سمجھے کے وہ کیا لکھ رہے ہیں لکھتے ہی چلے گئے ہیں، کفر لکھ گئے تو لکھ گئے گالی قلم سے نکل گئی تو نکل گئی۔ مختصر یہ کہ "یاوہ گوئی" کی طرح گویا اِن حضرات نے "یاوہ نگاری" کے کمالات اِن افسانوں میں دکھائے ہیں ...... ہم نے اس جہنمی صحیفہ کو ادبی، اخلاقی، معاشرتی اور دیگر حیثیتوں سے بھی مضرت رساں پایا ہے اس میں تین شرفا اور ایک شریف زادی نے جو حیاسوز مناظر پیش کئے ہیں ان کو دیکھ کر آبرو باختہ ہستی بھی انتہائی نفرت سے لاحول پڑھنے پر مجبور ہو جائے گی خداوندِ کریم اور رسول صلعم کی جو توہین ہوئی اس کا سوال تو اس وقت پیدا ہوگا جب ان مصنفین کی صحیح الدماغی تسلیم کر لی جائے گی لیکن ہمارے خیال میں تو یہ مجموعۂ خرافات سوائے اس کے اور کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ واقعی اِن انگاروں کو خاکستر کر دیا جائے۔"

(سرپنچ ۲۳ر فروری ۳۳ء)

سرپنچ کے شذرات

لکھتے وقت شوکت تھانوی کھل کر اپنے اصلی رنگ میں آجاتے تھے۔ دیکھئے شذرات میں "انگارے پر پانی" کیسے پھیرتے ہیں اور بھی نمونے دیکھئے:-

انگارے پر پانی

جس اوٹ پٹانگ ...... تصنیف کے متعلق گذشتہ کسی پرچہ میں ہم تفصیل کے ساتھ عرض کر چکے ہیں اس کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ خان بہادر حافظ ہدایت حسین صاحب ایم ایل سی نے کونسل میں نہ صرف سوالات کئے بلکہ آنریبل ہوم ممبر صاحب نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ "اس کتاب کے پرنٹر پبلشر کو سٹی مجسٹریٹ لکھنؤ

نے طلب بھی کیا تھا مگر جن حضرات نے یہ شعلہ فشانی فرمائی ہے وہ تو آجکل لندن میں براجمان ہیں بہرحال باقی دو مصنفین اور ایک مصنفہ صاحبہ ہندوستان کے اندر ہیں۔ خیر ان کے متعلق تو حکومت خود کچھ نہ کچھ کرے گی البتہ اُمید ضرور پیدا ہو گئی ہے کہ ...... "اس پانی کے پڑنے کے بعد یہ انگارے ...... کوئلے سے زیادہ کچھ نہ رہ جائیں گے"

تلاشِ گمشدہ

محترمہ و معظمہ جنابہ جمعیتہ اقوام صاحبہ آخر کہاں تشریف لے گئی ہیں...... کہیں پتہ ہی نہیں چلتا نہ تو چین و جاپان کی معرکہ آرائی میں اِن کا پتہ تھا۔ نہ اب یورپ کی اِن جنگی تیاریوں میں سامنے آئیں اگر کسی اللہ کے بندے کو اِن محترمہ کا پتہ معلوم ہو تو ہم کو مطلع فرمائیں تاکہ اِن سے دریافت تو کیا جائے کہ آخر وہ ہیں کس مرض کی دوا؟"

وہائٹ پیپر واقعی سادہ کاغذ ہے

وہائٹ پیپر کی دھمکیوں سے ہندوستان میں دھوم مچ رہی تھی، ہندوستان کے بچّہ بچّہ کی زبان پر "سائمن گو بیک" کے بعد اگر کوئی نیا لفظ چڑھا تھا تو وہ یہی "وہائٹ پیپر" جس طرف دیکھئے اسی کا چرچا تھا اور جس کو دیکھئے اسی کا منتظر تھا۔ آخر وہ صبر آزما دستاویز سب کے سامنے آئی جس کے لیے دن گنے جاتے تھے، لیکن اب حال یہ ہے کہ سب لوگ آنکھیں مل مل کر چشمے لگا لگا کر بلکہ خوردبین کی مدد سے اس مسودہ کو دیکھنا چاہتے ہیں لیکن اِن کو کچھ نظر نہیں آتا اس کا نام وہائٹ پیپر ضرور تھا مگر یہ تو واقعی سادہ کاغذ نکلا...... "اس آئینی دستاویز میں سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ گھما پھرا کر ہندوستان کو وہیں رکھا ہے جہاں وہ غریب اب تک بیٹھا ہؤا منہ بسور رہا تھا۔ لیکن اس سیاسی چال کا جواب..... زبانی احتجاج نہیں بلکہ اس اینٹ کا جواب یقیناً پتھر سے دینا چاہیئے ــــ"

ہندوستان میں بحرِ ہند کی آمد

ہندوستان کے گوشے گوشے سے آجکل سیلاب سیلاب کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں بعض مقامات پر تو طوفان کے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں اگر خدانخواستہ یہی حال کچھ روز اور رہ گیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ ملک بحرِ ہند میں شامل ہو جائے گا اور کوہِ ایورسٹ نام کا کوئی جزیرہ اس ملک کی یادگار کے طور پر باقی رہ جائے گا۔ اڑیسہ، آسام، بنگال اور پنجاب وغیرہ ہر طرف معلوم ہوتا ہے کہ بادلوں نے سمندر انڈیل دیا ہے۔ اڑیسہ کے تین کروڑ باشندے خانماں برباد ہو چکے ہیں اور یہی حال دیگر سیلاب زدہ مقامات کا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ آجکل ہندوستان میں بحرِ ہند مہمان آیا ہؤا ہے حالانکہ مہمان کو کچھ نہ کہنا چاہیئے لیکن مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ

جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو

سرپنچ کے مزاحیہ کالم شوکت تھانوی کا سرپنچ اُردو کا پہلا مزاحیہ اخبار ہے جس میں سب سے زیادہ مزاحیہ کالم تھے۔ سرپنچ کے اِن زعفران زار کالموں کی مزاحیہ کالم نویسی کی تاریخ میں ہمیشہ ایک خاص اہمیت رہے گی۔ سرپنچ کے خاص اور قابلِ ذکر کالم دو دو باتیں، قلمزار، چٹکیاں، تیر بہدف، کھلکھستان، ویلاد، قہقہہ، گرماگرم، عقلمندیاں، بے پرکی، گپ شپ، ٹیلی فون، وکٹ پیس، حضرتِ عشق، الم غلم، پھبتیاں، تو تو میں میں، اِدھر اُدھر کی، ایڈیٹر کی ڈائری (ایڈیٹر کی رام کہانی) ہنسنے کی شرط نہیں اور اقوالِ مولانا سرپنچ تھے۔

دو دو باتیں کا کالم شوکت تھانوی ہمدم، ہمت، اودھ اخبار اور ہند میں لکھتے تھے انھی میں سے یہ سرپنچ میں نقل ہوتا۔

قلمزار صحیح معنوں میں سرپنچ کا مزاحیہ کالم تھا۔ اس کا ایک نمونہ دیکھیے:۔

قلمزار

" ہم اپنی گذشتہ اشاعت میں زبانِ اُردو کی مختلف قسمیں بیان کرتے ہوئے سرکاری اُردو کی نئی پیداوار کا ذکرِ خیر بھی کر چکے ہیں۔ حال میں ہمیں اس " ادبِ لطیف " کے چند تحیر خیز شاہکار دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے جس میں سب سے پہلے ہم ایک پمفلٹ پیشِ کشِ ناظرین کرتے ہیں جس کا نام " رہبرِ حاجیانِ حجاز " ہی سے فصاحت و بلاغت ساون بھادوں کے مینہ کی طرح برس رہی ہے۔

پچھلے دنوں حکومتِ ہند کے شعبہ تعلیم و صحتِ عامہ نے زائرینِ حرم کی سہولت کے لیے زبان انگریزی میں ایک مفید پمفلٹ شائع کیا تھا۔ "رہبرِ حاجیانِ حجاز" خیر سے سرکاری اُردو میں اس پمفلٹ کا ترجمہ ہے۔ ہم حیران ہیں کہ اس عظیم الشان ادبی خزینہ کا کون سا جواہر ریزہ پبلک کے سامنے پیش کریں۔ کونسا پیش نہ کریں۔ کیونکہ جس طرح پنجاب میں چغتائی کا ہر "عمل" اقبال کا ہر "شعر" شاہکار ہے اسی طرح اس پمفلٹ کا ہر لفظ شاہکارِ ادب اور غالب و مومن کی روحوں کو تڑپا دینے والا نشتر ہے۔

منکہ مصنفِ قلمزار بابت اعتراض جڑ دینے پالنے اوپر کتاب " رہبرِ حاجیانِ حجاز " کے اس لیے باز رہ سکتا ہے کہ سرکاری اُردو میں قانونی پہلوؤں کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھا جاتا ہے، اور حکومت نے اس خیال سے کہ لوگوں کو کہیں یہ شبہ نہ ہو یا سرکاری اُردو کے الفاظ میں "یہ شبہ نہ کیا جا سکتا ہو یا یہ شبہ آئندہ نہ کیا جائے گا" مسلمانوں کا فریضۂ حج سوائے سرزمین حجاز کسی اور مقام پر بھی ادا کیا جا سکتا ہے" اسی کتاب کے نام میں "حاجیان" کے ساتھ لفظ "حجاز" کا دُم چھلا لگانا ضروری سمجھا۔

سرورق اُلٹنے کے بعد ہمیں "بابت ولا پانے" کی "ہیچو قسم" زبان میں ایک تمہید ملتی ہے جس میں سب سے زیادہ فصیح و بلیغ یہ جملہ ہے جس کو انگریزی سے ترجمہ کرتے وقت حکومتِ ہند کے فاضل مترجم نے اپنا قلم توڑ دیا ہوگا: "رسالۂ مذکور کی نظرِ ثانی اس وقت تک ملتوی رہے گی جب تک کہ قانون جس کا انحصار کمیٹی کی سفارشات پر موقوف ہے پاس نہ ہو جائے۔"

سبحان اللہ کیا دریائے ٹیمس کے پانی میں دُھلی ہوئی زبان ہے! کس خوبی کے ساتھ قانون کے انحصار کو کمیٹی کی سفارشات پر موقوف کیا ہے! قابلِ ستائش ہے حکومتِ ہند کہ ایسے ایسے باکمال مترجموں کی قدر شناسی کر رہی ہے ورنہ یہ مترجم صاحب اگر کہیں ہمارے دفتر میں ہوتے تو دوسرے دن کان پکڑ کر موقوف کر دیئے جاتے۔

ایک مقام پر حکومتِ ہند کا یہ فاضل مترجم سرکاری اُردو کے جواہر ریزے اس طرح بکھیرتا ہے۔

"ہوٹل مومن مسلمانوں کی زیرِ نگرانی میں حاجیوں کے لیے کھانا تیار کرتے ہیں۔"

"لالہ شاہی اُردو" میں "لیلۃ القدر کی رات" اور "حج قیامت کا دن" تو سنا ہی تھا لیکن اب سرکاری اُردو کے تصدق میں ہمیں "زیرِ نگرانی میں" کی نئی ترکیب معلوم ہو گئی۔

اس سرکاری اردو پمفلٹ کے سرکاری مترجم پر خبر سے وہی مثل صادق آتی ہے کہ "ہر گن پوری، مجھے کون کہے لنڈوری" آپ خدا کے فضل سے زبانِ عربی کے بھی نہ صرف زبردست ماہر بلکہ فن وضع اصطلاحات کے دستار بند۔ اُسے تو یہ "ہیٹ پوش" عالم ہیں چنانچہ آپ نے انگریزی سے اُردو ترجمہ کرتے وقت اپنی علمیت و ہمہ دانی کے جوش میں من کو "مونا" عرفات کو "عراف" عبدہ کو "ابدو" حلیم کو "حالم" نعمت کو "نیامت" جمیل کو "جاہل" ذہب کو "زہاب" اور اسی کے وزن پر وہاب کو "وحب" بنا دیا۔

مترجم صاحب کو اپنے فضل و کمال کی نمائش اور زیادہ منظور ہوئی تو "رمضانی" کے اچھے خاصے مردِ مسلمان سرکاری اُردو کے پنجگوئے سے شدھ کر کے "رام دانی" بنا ڈالا۔ غریب مطوفین کعبہ کو ان کے زورِ قلم سے ڈر کر، "مطو الفان" بننا پڑا، خدا کا شکر ہے کہ "میم" کا پردہ مسلمانوں کے آڑے آیا ورنہ سرکاری مترجم نے تو حجاز کی مقدس سرزمین کو دہلی کا چاوڑی بازار، لکھنؤ کا چوک یا کانپور کا مول گنج بنانے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا تھا۔

قابلِ ستائش ہے وہ قدر شناس حکومت جس کو اپنی مطبوعات کے لیے ایسے ایسے قابل انشا پردازوں کی خدمات حاصل ہوں۔

چٹکیاں بعد میں یہ کالم "تیر بہدف" کے عنوان سے مقبول ہوا۔ اس میں خبروں کی سرخیوں پر حاشیہ آرائی کی جاتی تھی۔

چٹکیاں (تیر بہدف)

ایک خبر کا عنوان ہے ——— "چوری کا مال برآمد کر لیا"

——— پولیس کا یہ کارنامہ زرّیں حرفوں سے لکھنے کے قابل ہے۔

ایک خبر کا عنوان ہے ——— "اطالوی کپتان کی پیشانی پر گولی لگی"

——— خیریت ہوئی کہ آنکھ بال بال بچ گئی۔

ایک خبر کا عنوان ہے "جرمنوں کا ایک چھوٹا سا حملہ رد کر دیا گیا"

——— اور بڑا حملہ؟

کھلکھلستان بعد میں (ہنسنے کی شرط نہیں) اور (دیوارِ قہقہہ) میں تبدیل ہو گیا اس کے تحت لطائف اور ان کا انتخاب چھپتا تھا۔

کھلکھلستان (ہنسنے کی شرط نہیں، دیوارِ قہقہہ)

ایک عورت کا جب ساتواں شوہر مرنے لگا تو اس نے روتے ہوئے پوچھا "تم مجھے کس پر چھوڑے جاتے ہو؟"

"آٹھویں شوہر پر!"

اسکاٹ لینڈ کے باشندے اپنی کنجوسی کے لیے مشہور ہیں۔ ایک اخبار میں اسکاٹ لینڈ کے خلاف مضامین شائع ہو رہے تھے۔ ایک اسکاٹ باشندے نے اس اخبار کے ایڈیٹر کو لکھا کہ "اگر تم اپنے اخبار میں اسکاٹ لینڈ والوں کے خلاف مضامین لکھنا بند نہ کرو گے تو میں تمھارا اخبار مانگ کر پڑھنا بند کر دوں گا۔"

شوہر: میری ٹوپی کہاں ہے؟

بیوی: ٹوپی ہوتی کہاں؟ تمھارے سر پر ہے!

شوہر: اچھا ہوا تم نے بتا دیا، ورنہ میں ننگے سر دفتر چلا جاتا۔

بیوی: (پیانو بجاتے ہوئے) پیارے اب تم کیا چیز سننا چاہتے ہو؟

شوہر: (نیند اچاٹ ہونے اور بے سُرے نغموں سے بیزار ہو کر) پیانو کے بند ہونے کی لطیف آواز!

ایک رحمدل بوڑھے نے ایک لڑکے سے پوچھا "تم رو کیوں رہے ہو؟" لڑکے نے جواب دیا "میرے باپ نے ایک نیا صابن ایجاد کیا ہے جسے ہر گاہک کو دکھلانے کے لیے وہ ہر وقت مجھے دھوتا رہتا ہے۔"

گرما گرم کے عنوان سے حالاتِ حاضرہ پر چٹ پٹا تبصرہ کیا جاتا تھا۔

گرما گرم

ریاست کشن گڑھ کے راجہ صاحب کی صاحبزادی کا عقد ہونے والا ہے اس کے اخراجات کے لیے رعایا سے چندہ لیا جا رہا ہے —— راجہ صاحب کی صاحبزادی نہ ہوئیں جدید قسم کا انکم ٹیکس ہو گئیں۔

لاہور میں ایک نوجوان نے اپنے پڑوسی کی چند چارپائیاں چرا لیں —— چارپائی کا سرقہ تمہید ہے اس لیے کہ اب پورے پورے مکانات چوری ہوا کریں گے۔

اطلاع موصول ہوئی ہے کہ خدا نخواستہ ملک معظم پر سردی کا خفیف سا حملہ ہو گیا ہے —— اس ضعیفی میں انگلستان ایسے ٹھنڈے ملک میں آخر کیوں رہتے ہیں؟

سنتے ہیں کہ چین اور جاپان میں سمجھوتہ ہو گیا ہے —— اب لیگ اقوام کو پردہ سے باہر آجانا چاہیے۔

عقلمندیاں کے تحت اشتہارات، واقعات اور سرکاری احکامات وغیرہ کے مضحک پہلوؤں پر توجہ مبذول کی جاتی تھی۔

عقلمندیاں

ایک برقی کھمبہ پر حسب ذیل اشتہار چسپاں کیا گیا ہے کہ —— "خطرہ —— کھمبہ چھو جانے سے فوراً موت واقع ہو جاتی ہے خلاف ورزی کرنے والا گرفتار کیا جائے گا۔"

بے پر کی اور بعد میں "گپ شپ" کے عنوان سے ادبی ہوائیاں سر کی جاتی تھیں۔

بے پر کی (گپ شپ)

ایک تازہ بے تار برقی پیغام مظہر ہے کہ حضرت خواجہ حسن نظامی اور آغا حشر صاحب کا شمیری میں کوئی ایسا معاہدہ ہو گیا ہے جس کے تحت آغا حشر صاحب اپنے تمام ڈراموں کا حقِ تصنیف خواجہ صاحب کو دے دیں گے اور خواجہ صاحب اپنے تمام مرید آغا صاحب کے سپرد کر دیں گے۔ واضح ہو کہ یہ ایک قسم کا معاصرانہ تبادلہ سمجھا جائے گا۔

معلوم ہوا ہے کہ جناب مشیر احمد علوی کے یکایک داڑھی نکلنا شروع ہو گئی ہے اس مرض کی وجہ خود ان کو بھی نہیں معلوم، ان کا بیان ہے کہ "میں کچھ عرصہ سے امراضِ چشم میں مبتلا تھا لیکن داڑھی کی خودروئی پر خود مجھ کو بھی تعجب ہے۔"

ایک اطلاع مظہر ہے کہ "علامہ اقبال اپنی تمام نظمیں جناب مشتاق سلوتوی کو نظر کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں بشرطیکہ مشتاق صاحب آئندہ علامہ اقبال کی نظموں کو نظم کرنا چھوڑ دیں۔

ایک خاص اطلاع مظہر ہے کہ سید علی نقی صاحب جرنلسٹ امریکہ کے اس سائنسدان پر مقدمہ چلانے والے ہیں جس کا دعویٰ ہے کہ "انسان بندر کی اولاد نہیں بلکہ مچھلی کی نسل سے ہے۔"

ٹیلیفون کے پردہ میں سیاسی معاملات پر اظہارِ خیال کیا جاتا تھا۔

ٹیلیفون

ٹن —— ٹن —— ٹن —— ہلو —— وائسرائیگل لاج نیو دہلی پلیز —— ٹن ٹن —— ہلو —— مسٹر پرائیوٹ سکریٹری —— آداب عرض —— میری طرف سے —— جی ہاں، میں ایڈیٹر سرپنچ ہوں میری طرف سے ہزایکسیلینسی سے بعد ادائے آداب و تسلیمات عرض کر دیجئے کہ میں بخیریت ہوں اور ہزایکسیلینسی کی خیریت درگاہ خداوندکریم سے نیک چاہتا ہوں دیگر احوال یہ ہے کہ ہزایکسیلینسی نے مولانا شوکت علی کی متعدد درخواستوں کے بعد بھی گاندھی جی کو رہا نہ کر کے مولانا شوکت علی سے پبلک کی ہمدردیاں براہِ راست وابستہ کر دی ہیں اگر ہزایکسیلینسی گاندھی جی سے ملاقات کی سہولت ہی بہم پہنچا دیتے تو یہی ہمدردیاں اس وقت حکومت کے ساتھ ہوتیں کاش کہ ہزایکسیلینسی اس نکتہ پر اب بھی غور کر لیں باقی بحمد اللہ سب خیریت ہے۔ ٹن ٹن۔

ٹن —— ٹن —— ٹن —— ٹن —— نمبر دس ڈاوننگ اسٹریٹ لندن پلیز —— ٹن —— ٹن ؟ ٹن —— ہلو —— کون صاحب ہیں؟ —— ہاں ہاں آپ ذرا وزیراعظم بہادر سے میرا سلام کہیے اور یہ کہیے کہ ہندوستان میں اس خبر نے آپ سے خاص عقیدت پیدا کرا دی ہے کہ آپ گاندھی جی کی رہائی کے لیے کوشاں ہیں۔ خدا کرے یہ خبر سچ ہو لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ آپ کوشش کریں اور وہ کوشش رائیگاں جائے۔ اگر ایسا ممکن ہے تو آپ کے وزیراعظمی کے اختیارات سے دلی ہمدردی ہے۔ ٹن ٹن ٹن ٹن۔

ٹن —— ٹن —— ٹن —— صدر جمہوریہ امریکہ کے دولت خانہ میں پلیز —— ٹن۔ ٹن۔ ہلو —— کون —— مسٹر ہوور —— جی آداب عرض یعنی خود آپ ہی فون پر آ گئے ہیں میں نے آپ کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ آپ کی زندگی پر جو قاتلانہ حملہ ٹرین کو تباہ کرنے کی صورت میں ناکام طور پر کیا گیا وہ ہماری نظروں میں حد درجہ کمینہ پن تھا۔ مگر آپ کا اس سے بچ جانا نہایت خوشی کا موجب ہے۔ واللہ آپ خوب بچے۔ جی ہاں زندگی تھی ورنہ ختم تو کر ہی دیا تھا ظالموں نے —— سچ کہا آپ نے کہ موت کا ایک دن معیّن ہے —— " اچھا مبارک ہو —— آداب عرض —— ٹن۔ ٹن۔

کٹ پیس کے عنوان سے دوسرے رسائل و اخبارات کی زبان و بیان کی اغلاط کا پوسٹ مارٹم ہوتا تھا۔

کٹ پیس

لکھنؤ کے ایک ہفتہ وار اخبار کے ایک مضمون کی سرخی ہے "بکار آمد غلطیاں" —

سبحان اللہ! غالباً انھیں قابل ایڈیٹر کے یہ جملے بھی ہوں گے جو عام طور پر مشہور ہیں۔

"لب دریا کے کنارے کی لکڑ بان" — "برگ شریفہ کی پتی" اور "نیم کے درخت کا پیڑ" وغیرہ۔

معاصر پرتاب کی ایک خبر کا عنوان ہے — "عید کے پٹاخوں نے جان لے لی" — اس میں کتابت کی کچھ نہ کچھ غلطی ضرور ہے — یا تو شب برات کے پٹاخے ہوں گے ورنہ عید کی سویاں۔

حضرتِ عشق کے کالم کے تحت عشق کے مضحک پہلوؤں کو لطائف کی صورت میں اجاگر کیا جاتا تھا۔

حضرتِ عشق

پیٹر — تمھاری محبوبہ کے عشق و محبت کا اب کیا حال ہے —؟

پال — محبت کا معاملہ تو ختم ہو چکا۔ اب ہم دونوں کی شادی ہو گئی —!

الم غلم کے عنوان کے تحت معاصرین سے مختلف مسائل پر چھیڑ چھاڑ جاری رہتی تھی۔

الم غلم

"اردو سے دھرم کلیش رکھنے والوں کی سیوا میں پرارتھنا ہے کہ وہ مسٹر بروز امریکی پر مقدمہ چلائیں اِن حضرت نے ایک دلچسپ افسانے میں بیان کیا ہے کہ ایک باشندۂ امریکہ جب مریخ میں پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ وہاں کے رہنے والے ہماری دُنیا کے عالموں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوشیار ہیں، مریخ والوں نے طرح طرح کے عجیب و غریب آلات ایجاد کئے ہیں ان حالات کی مدد سے ان کو پتہ چل گیا ہے کہ باشندگانِ ارض جتنی زبانیں بولتے ہیں، ان میں سب سے اہم صرف چار زبانیں ہیں، اُردو، چینی، انگریزی اور روسی، جن مہاپرشوں اور مہاپرتابیوں کی طرف ہمارا روئے سخن ہے اُن کو اُچت ہے کہ مسٹر بروز کی خبر اچھے پرکار سے لیں تاکہ صاحب بہادر اپنے دونوں کان پکڑ کر پشچاتاپ کر لیں اور مانیں کہ کیول ہندی بھاشا کل بھارت نواسیوں کی ماتر بھاشا ہے اگر مقدمہ چلانے کی ہمت نہ ہوتی کم از کم ایک پتر لکھ کر ان کو قائل معقول کریں ہمارے متروں کو بھلی بھانت یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ سمے چپ رہنے کا نہیں ہے اگر ہمارے متر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے اور یہ اوسر نکل گیا تو پھر امریکہ والوں کی طرح اور جاتیاں بھی اُردو کا پکشن لینے لگیں گی آشا ہے کہ ہماری پرارتھنا پر کل مہاپرش دھیان

دیں گے۔

تُو تُو مَیں مَیں اور بعد میں "پھبتیاں" کے عنوان کے تحت شوکت تھانوی "حلقۂ سرپنچ" کے احباب پر پھبتیاں کستے تھے۔

تُو تُو مَیں مَیں (پھبتیاں)

"سُنا ہے کہ آپ کے دولتکدہ کا "نصف ممبر" کلب بن گیا ہے اور آپ اس کے سکریٹری باجلاس اعجاز منزل مقرر ہوئے ہیں۔ مبارک باشد۔ لیکن جناب ایک بات ذرا غور طلب رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جن صاحب کا سکریٹری دیوانہ ہو گا وہ کلب کہلائیگا یا پاگل خانہ۔؟ ش۔ت

شہر کانپور کی ایک بہت بڑی توپ آجکل بالکل خاموش ہے کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ داڑھی اس پر بالکل چھا گئی ہو۔ بہرحال کوئی صاحب اس کے متعلق مفصل معلومات بہم پہنچا کر ممنون فرمائیں۔

ش۔ت

اِدھر اُدھر کی کے کالم میں مختلف خبروں پر سرپنچ کے رنگ میں شوکت تھانوی تبصرہ کرتے تھے۔

اِدھر اُدھر کی

دھوبی سے جیتے تو گدھوں کے کان لیے

یہ تو تھی ایک مثل لیکن یار لوگوں نے اس کو اصل کر دکھایا۔ ریلوے والوں سے جب کسی کی پیش نہ چلی تو اب یہ طریقہ کار اختیار کیا ہے کہ جہاں موقع پایا ٹیلی گراف کے تار کاٹ لیے لکھنؤ — بنارس، لکھنؤ — فیض آباد کے درمیان متعدد واقعات ہو چکے ہیں اب جس کا یہ نتیجہ ہو گیا ہے کہ گاڑیوں کے اوقات میں خلل پڑنے لگا ہے ہم پوچھتے ہیں کہ بھلا یہ کون سی بات ہے اور اس کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

ایڈیٹر کی ڈائری اس عنوان سے شوکت تھانوی سرپنچ ڈائری لکھتے تھے بعد میں اس کا عنوان بدل کر "ایڈیٹر کی رام کہانی" بھی ہو گیا تھا۔

ایڈیٹر کی ڈائری (ایڈیٹر کی رام کہانی)

۲۳ ستمبر۔ غیر دلچسپ واقعات لکھنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم بھی گویا اپنے وقت کے خواجہ حسن نظامی صاحب مدظلہٗ بن جائیں۔ جبکہ دلچسپ واقعات ہر وقت اور ہر روز پیش نہیں آتے۔

۲۶ ستمبر۔ آج بحمد للہ سب خیریت رہی لہذا کوئی خاص بات قابلِ تحریر پیش نہیں آئی۔

۲۹ ستمبر۔ غیر دلچسپ واقعات تو ہونے ہی رہتے ہیں مگر آج کوئی دلچسپ واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔

۹ر اکتوبر۔ اتوار کا دن ملاحظہ فرمائیے اور آج ہی بخار بھی آگیا۔ بخار کے بعد اور کیا دلچسپ بات آپ سننا چاہتے ہیں۔

اقوال مولانا سرپنچ اس کالم کے تحت مولانا شوکت تھانوی اپنے تیار کرتے تھے۔

اقوال مولانا سرپنچ

○ شادی کے بعد سسرال میں پڑے رہیئے تاکہ کچھ عرصہ کے بعد میکے کی قدر ہو سکے۔

○ دوسروں کی بیویوں کو اپنی والدہ سمجھئے تاکہ آپ کی بیوی کو بھی لوگ والدہ سمجھیں۔

○ پلاؤ زردہ سے کم پر شکر ادا نہ کیجئے ورنہ اللہ میاں سمجھیں گے کہ یہ بندہ دال اور روٹی میں خوش ہے اسے اس سے بہتر کھانے کیوں دیئے جائیں۔

○ وقت کا پابند ہونا حبسِ دوام کی سزا بھگتنے کے برابر ہے۔

○ کھانا خوب چبا کر نہ کھائیے۔ اس سے دانت کمزور ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

○ آج کا کام کل پر ٹالیئے اس لیے کہ ممکن ہے کہ کل کا کام پرسوں پر ٹل جائے۔

سرپنچ کے خاص نمبر سرپنچ اپنے خاص نمبر بڑی دھوم دھام سے نکالتا تھا۔ سرپنچ کے قلم ایڈیشن کے علاوہ "اپریل فول نمبر"، سالِ نو نمبر (سرپنچ گزٹ) اور "عید نمبر" وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "سویاں مبارک" کے عنوان سے "عید نمبر" کا اداریہ لکھا جاتا اور اس پر یہ شعر اپنی بہار دکھاتا ؎

سرپنچ پڑھنے والوں کی ہر روز عید ہے
سرپنچ! عید، اصل میں بس تیری دید ہے

سرپنچ گزٹ۔ سالِ نو کے موقع پر مزاح نگاروں کو باقاعدہ خطابات تقسیم کرتا اور اِن کے دلچسپ کارٹون شائع کرتا۔

سرپنچ گزٹ

(فہرستِ خطاباتِ سالِ نو)
منجانب ادارۂ سرپنچ

بتقریب سالگرہ اعلیٰ حضرت حضور پُر نور ہز ہیومر نس عالی جناب سرپنچ بہادر دام اقبالہٗ وظرافتہٗ

تبسم نواز جنگ۔ شوکت تھانوی
جہنم نواز جنگ۔ امین سلونوی
ظرافت الملک۔ فرحت اللہ بیگ
تمکنت جنگ۔ تمکین کاظمی

عبل القلم۔ رشید احمد صدیقی
قلیل القلم۔ پطرس بخاری
لیئہ القلم۔ ملا رموزی

الدیب الدہر۔ مرزا فرحت اللہ بیگ حیدر آباد۔ مسٹر رشید احمد صدیقی علی گڑھ۔ حکیم ممتاز حسین عثمانی لکھنؤ،

مسٹر سلطان حیدر جوش فتح گڈھ - مسٹر احمق پھپھوندوی پھپھوند -

مزاح یار جنگ - مسٹر پطرس بخاری لاہور، ملا رموزی بھوپال، مسٹر عظیم بیگ چغتائی جودھپور، مسٹر فلک پیما لاہور - مولانا عبدالمجید سالک لاہور، علامہ عبدالباری آسی لکھنؤ، مسٹر محمد فاروق دیوانہ گورکھپور، مولانا نازش بدایوں، چودھری محمد علی ردولوی بارہ بنکی، مسٹر شہباز بلند پرواز حیدر آباد -

مزاح الملک - مسٹر حامد شاہجہانپوری بمبئی، مسٹر ایم اسلم لاہور، مسٹر تمکین کاظمی حیدر آباد، علامہ مضحک دہلوی دہلی، مسٹر حافظ غازیپوری، مسٹر فخر نظامی -

مزاح الدولہ - خان قدرت اللہ خاں دیوانہ بریلوی کانپور، مسٹر ناکارہ حیدر آبادی حیدر آباد، مسٹر لیاقت اللہ خاں تفریح بریلوی کانپور، مسٹر شمیم بلہوری کانپور، غازی خضر محمد نگرامی کانپور -

ظریف بہادر - مسٹر شبیر احمد علوی لکھنؤ، مولوی ایس ایم اے ٹڈبیاں کانپور، ملا حضوری کانپور، علامہ ہنٹر کانپور، مسٹر جمال رضوی لکھنؤ، مسٹر شمشیر بہادر رحمدی لکھنؤ، مسٹر عبداللہ ناصر بمبئی -

فلک الشعرا - سید مقبول حسین ظریف لکھنوی، مسٹر منور آغا مجنوں لکھنوی -

بام الشعرا - مسٹر محب دریابادی، سید حسن جعفر شوخ لکھنوی، مسٹر لوم ہاپڑی میرٹھ، سید بہادر بزم لکھنوی، ڈاکٹر چودھری نذیر احمد شرف لکھنؤ -

سرپنچ اپریل فول نمبر کی سرخیاں دیکھئے :-

سرپنچ اپریل فول نمبر

تاج محل سیاہ ہو رہا ہے

سنگ مرمر نقلی ثابت ہوا

قطب مینار گر پڑا

دہلی میں قیامت خیز آندھی

صدیق بک ڈپو میں علمی کتابوں کی سیل

گراں قدر کتابوں کی مفت تقسیم

کوہ ہمالہ کی مہم

ہوائی جہاز سے کوہ ایورسٹ منہدم

مہاتما گاندھی کی شادی

ہری جنوں سے تعلقات بڑھانے کی ترکیب

اچھوت لڑکی سے نسبت ہو رہی ہے

لارڈ ارون مسلمان ہو گیا

مسجد میں نماز بھی ادا کی

زنانہ پارک میں جلسہ، مردوں کو دعوت عام

ہندوستان کا دار السلطنت بدل گیا

بجائے دہلی کے اوناؤ

قرطاس ابیض آسٹریلیا کے متعلق ہے

ڈاک کی غلطی سے ہندوستان آگیا

ہندوستان کا قرطاس ابیض آسٹریلیا پہنچ گیا

مہاتما گاندھی کی "تازہ غیر مطبوعہ غزل" خاص برائے سرپنچ

اک ہاتھ میں پونی ہے اک ہاتھ میں چرخا ہے پونی مرا عقبیٰ ہے چرخا مری دنیا ہے
میں جیل کے اندر ہوں گھر گھر مرا چرخا ہے بدنام بُرا ہے اور جو بد ہے وہ اچھا ہے
اے بھائی اچھوتو! تم سوراج ہمارے ہو مندر کی حقیقت کیا دل اپنا شوالا ہے
پیر اتنے ہی پھیلاؤ، ہو جتنی بڑی چادر ننگے ہی رہو بھائی کھدر بھی تو مہنگا ہے
میں جیل کے اندر ہوں اور چین سے کٹتی ہے بن ہوں مری کٹیا ہے اِک آم کا بروا ہے
گاندھی کو نہ چھیڑو اؤ گاندھی کو نہ چھیڑو تم
مرتے ہو تو مرجاؤ، وہ چین سے لیٹا ہے

سرپنچ کے انتخابات (پنچایت"، "حلوائی کی دکان") سرپنچ میں دوسرے رسائل و اخبارات کا مزاحیہ ادب منتخب کرنے کے لیے ایک مستقل کالم "پنچایت" کے عنوان سے تھا جو بعد میں "حلوائی کی دکان" ہو گیا تھا۔ سید امتیاز علی تاج، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی اور مولانا عبدالمجید سالک وغیرہ کی تخلیقات خاص طور پر اس عنوان کے تحت منتخب کی جاتی تھی پطرس لکھتے بہت کم تھے اور رشید احمد صدیقی و سید امتیاز علی تاج کے مضامین سرپنچ تک پہنچ نہیں پاتے تھے لیکن سرپنچ ان کے مضامین اس کالم کے تحت اپنے یہاں نقل کرنے میں اپنے کو حق بجانب سمجھتا تھا۔ اس کالم کے اوپر جلی حروف میں لکھا رہتا تھا کہ "اس باب کے ماتحت تمام برادری سے بے تکلفی برتی جائے گی کہ جہاں سے جو چاہیں اپنی چیز سمجھ کر لے لیں۔"

سرپنچ کے کارٹون اودھ پنچ کے بعد ہمیں کارٹونوں کا سب سے بڑا خزانہ شوکت تھانوی کے سرپنچ ہی میں ملتا ہے۔ سرپنچ کے کارٹون بہت نوکیلے، تیکھے، جاندار، بولتے ہوئے اور دلآویز ہوتے تھے۔ کامل لکھنوی اور سمیع فرنگی محلی اپنے فن میں یکتا تھے یہ سیاسی، سماجی، ثقافتی، ادبی، مذہبی، اور معاشرتی موضوعات کو ہدف بناتے تھے۔ خاص نمبروں میں مزاح نگاروں کے کارٹون بھی ہوتے تھے "چوڑیاں پہنے ہوئے پولیس"، "حامد کا ہتوا"، مولانا شوکت علی، افقر موہانی، عنایت دہلوی، مدیر ریاست اور "لیگ اقوام" کے کارٹون اس میں بے حد مقبول ہوئے تھے۔ سرپنچ اکثر انگریزی رسائل و اخبارات کے کارٹون بھی نقل کرتا تھا۔

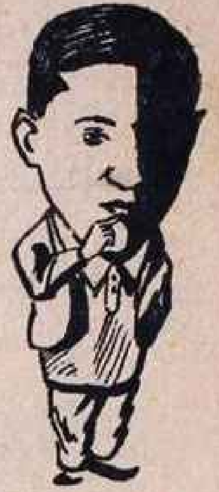

پطرس

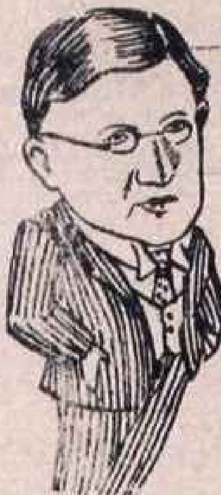

امتیاز علی تاج

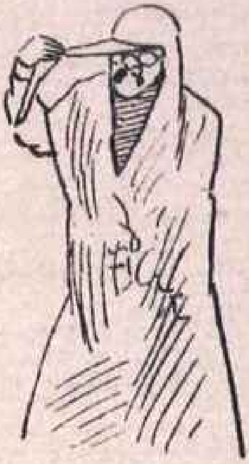

اودھ پنچ کی منطق آرا بیگم

سرپنچ کے معرکے اودھ پنچ، بنگال پنچ، اپنچ، جام جہاں نما، ظریف، حقیقت اور ریاست وغیرہ سے سرپنچ کی معاصرانہ چشمکیں جاری رہتیں۔ "چوپنچ"، "جام جہاں نما" اور "ریاست" سے خاص طور پر سرپنچ کے معرکے خاصے دلچسپ ہیں۔ "جام جہاں نما" کے ایڈیٹر افقر موہانی پر جب فحاشی کے الزام میں مقدمہ چلا تو سرپنچ ان کے پیچھے پڑ گیا اور ان کو 'لٹریچر کے لیے عذاب' کا خطاب دے دیا اسی طرح ریاست کے دیوان سنگھ مفتون سے جب شوکت تھانوی خفا ہوئے تو "ریاست" کو "شرارت" کا خطاب دیتے ہوئے یہ شعر بھی جڑ دیا ؎

نام تو آپ کا ریاست ہے
کام لیکن فقط شرارت ہے

"چوپنچ" کلکتہ سے سرپنچ کی یوں ٹھنی کہ سرپنچ نے چوپنچ کے مدیر عنایت پر یہ الزام لگایا کہ انھوں نے ظریف لکھنوی کی غزل سرقہ کر لی بس پھر شوکت تھانوی کا قلم چوپنچ کے لیے وقف ہو گیا: "سرپنچ نے کلکتہ کے نام نہاد چلبھڑے چوپنچ کی جو مسلسل اور متواتر مرمت کی تھی اس کو از روئے قاعدہ اس قدر جلد اُسے بھولنا چاہیے تھا...... جب تک سرپنچ کا غیظ و غضب قیامت بن کر ان حضرات پر ٹوٹتا رہا اس وقت تک تو آپ خدا جانے.... کہاں پناہ لیتے رہے، ہم کو ہر طرف سے سمجھایا گیا اور ہر ایک نے ہم کو خاموش کرنے کی کوشش کی اور ہم نے اپنے کو عرصہ تک "برہنہ پا" دکھنا مناسب نہ سمجھا اور اِن ذاتِ شریف کے سر سے یہ بلا ٹال دی۔" ابھی یہ قیامت خیز معرکہ جاری تھا کہ مدیر نیرنگِ خیال حکیم محمد یوسف حسن نے کلکتہ جا کر چوپنچ والوں کو ٹھنڈا کیا اور لکھنؤ آ کر سرپنچ والوں کو مجبور کیا۔ غرض بیچ بچاؤ کر کے اس معرکہ کو فرو کیا۔

سرپنچ کے خطوط (ڈاک خانہ) کے عنوان سے سرپنچ کی خط و کتابت شائع کی جاتی تھی۔ یہ خط اصلی بھی ہوتے تھے اور فرضی بھی۔ ان خطوں میں اودھ پنچ کی جھلک ملتی ہے اِن میں والیانِ ریاست کو ریاستی معاملات سے متوجہ کیا جاتا تھا، خوشخبریاں، حادثے اور پیشین گوئیوں کے علاوہ پھلجھڑیاں چھوڑی جاتی تھیں۔ یہ ریاستی سربراہوں

اور قومی رہنماؤں پر نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ نواب رام پور کے نام اسی کالم میں "امرت دھارا" کے عنوان سے بہت ہی دلچسپ خط شائع ہوا تھا۔ سرپنچ میں شائع ہونے والے خطوط کا ایک نمونہ دیکھیے:۔

ڈاک خانہ (سرپنچ ڈاک)

مائی ڈیئر شوکت صاحب،

للہ اب "چوپنچ" کی جان چھوڑ دو۔

کہیں پھڑپھڑا کر نہ رہ جائے۔ بے زبان جانور کو ستانا اچھا نہیں ہوتا۔

رفیع احمد نگر

رفیع احمد صاحب نگینہ تسلیم

"چوپنچ" کو چھوڑ دوں، بہت اچھا مگر وہ تو ہفتہ یا منگل کے روز صدقہ کر کے چھوڑا جا سکتا ہے۔ بہرحال آپ کے علاوہ دوسرے احباب کی بھی یہی رائے ہے، کہ سرپنچ کو چوپنچ کے لیے چڑیمار نہ بننا چاہیے اور ہم خود بھی یہی سوچ رہے ہیں کہ اب پنجرہ کی کھڑکی کھول دی جائے۔

سرپنچ

اودھ اخبار لکھنؤ

۳۳ء میں ہمدم اخبار بند ہونے کے بعد سرپنچ کے ساتھ ساتھ منشی نولکشور کے اودھ اخبار سے بھی وابستہ ہو گئے۔ اس میں بھی انھوں نے اپنے "دو دو باتیں" کے کالم کو جاری رکھا۔ اودھ اخبار مائل بہ زوال تھا۔ اس کے ایڈیٹر سید نور الحسن کے جانے کے بعد شوکت تھانوی اودھ اخبار کے ایڈیٹر مقرر کیے گئے مگر کچھ عرصہ کے بعد اخبار سے علیحدہ ہو گئے۔ اور کچھ دن بعد اودھ اخبار کورٹ آف وارڈ کی تحویل میں چلا گیا۔ اودھ اخبار میں ان کی ظرافت کا نمونہ دیکھیے:۔

دو دو باتیں (روزنامہ اودھ اخبار لکھنؤ)

"چائے پینے والی دنیا لپٹن کمپنی کے نام سے ناواقف نہ ہو گی۔ اس لیے اسی کمپنی کو چائے نوش دنیا کے پیر مغاں کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن اس کمپنی نے جو ادبی خدمات انجام دی ہیں اس کا بہت کم لوگوں کو علم ہے حالانکہ وہ خدمات پردۂ راز میں ہیں بلکہ یہ غیر فانی حیثیت سے علم و ادب کی دنیا میں جگمگا رہی ہیں۔ لپٹن کی چائے نے دوسری زبانوں کے لٹریچر پر جو احسانات کیے ہیں ان سے ہم کو کوئی سروکار نہیں البتہ اب اردو ادب میں اس ادب نواز کمپنی نے جو مفید اضافے کیے ہیں ان کا اعتراف نہ کرنا ہماری انتہائی بے ادبی ہو گی۔ سچ تو یہ ہے کہ لپٹن کمپنی نے اردو کی وہ خدمات انجام دی ہیں کہ اردو زبان اور اردو زبان کو اپنی مادری زبان کہنے والا طبقہ اس کمپنی کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

لپٹن کمپنی کی دیرینہ ادبی خدمات سے وہ لوگ ضرور واقف ہوں گے جو دیواروں پر چسپاں پوسٹروں کو پڑھنے کے عادی ہیں یا کم از کم ریلوے اسٹیشنوں پر ہندو چائے یا مسلمان چائے کے اسٹالوں پر لگے ہوئے پوسٹروں کی زیارت کر چکے ہیں۔ لپٹن کی نثر نگاری کا صحیح اندازہ در اصل ان ہی پوسٹروں سے ہو سکتا ہے جن میں کا ہر لفظ اُردو ادب کے لیے ایک گنجینۂ معانی کی حیثیت رکھتا ہے اور جن کے ہر جملے پر بے ساختہ نعرۂ تحسین بلند کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کیا لپٹن کمپنی کا یہ جملہ موتیوں میں تولنے اور وجد میں جھومنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ "لپٹن کی چائے گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتا ہے" اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کمپنی کی ہر اُردو تصنیف ماشاءاللہ ایسی ہی وجد آفریں ہوتی ہے۔

یہ تو لپٹن کمپنی کی اردو نثر نگاری کا ایک معمولی سا نمونہ تھا۔ لیکن آپ کو یہ معلوم ہو کر حیرت اور حیرت کے بعد مسرت ہوگی کہ یہ کمپنی اُردو شاعری سے بھی دلچسپی رکھتی ہے مگر ایسی نہیں کہ بس سخن فہم ہو کر رہ جائے بلکہ خدا نظرِ بد سے بچائے یہ تو سخن گو بھی ہے اور اگر اس کی مشق کا یہی عالم رہا تو ہمارے دیرینہ کرم فرما دینا ناتھ جی کو اپنے لیے کوئی اور مشغلہ تلاش کرنا پڑے گا اس لیے کہ لپٹن کمپنی کا رنگِ شاعری بہت کچھ دینا ناتھی رنگ سے ملتا جلتا ہے اور ع

ہم سخن فہم ہیں لپٹن کے طرفدار نہیں

لہٰذا ہم کو یہ کہنے میں بھی تامل نہ ہونا چاہیے کہ لپٹن کمپنی اس رنگ میں لالہ دینا ناتھ جی سے زیادہ کامیاب ہے اور اس کے کلام باعثِ نظام سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اگر یہی رفتار رہی تو لالہ دینا ناتھ جی کو بہت جلد لوگ فراموش کر دیں گے۔

حال ہی میں لپٹن چائے کا ایک پوسٹر شائع ہوا ہے اس میں نثر کے جو نادر الوجود نمونے موجود ہیں ان کو تو فی الحال چھوڑیے لیکن لپٹن کمپنی کا تازہ نتیجۂ فکر ملاحظہ فرمائیے کیا خوب فرمایا ہے ؎

یہ شخص اور ان کے بھائی
پیتے ہیں لپٹن چائی

اس شعر کی معنوی خوبیوں کو نظر انداز کر کے اگر کوئی بدمذاق "چائی" پر غور کرنے لگے تو اس کی ذمہ داری لپٹن کمپنی پر نہیں بلکہ خود اس شخص کی محدود استعداد پر ہے یہ سچ ہے کہ صحیح لفظ "چائے" ہے لیکن اوّل تو بھائی کا قافیہ چائے نہیں بلکہ "چائی" ہے دوسرے اگر شاعر چائے کو ردیف رکھتا تو بالائی یا نان خطائی وغیرہ قوافی جن کا براہِ راست چائے سے تعلق ہے نظم نہیں ہو سکتے تھے لہٰذا اس دُور اندیش شاعر کمپنی نے ضرورتِ شعری کے لیے چائے ایسی جنسِ لطیف کی بھی تانیث چائی کی صورت میں بنائی بہرحال اس فنی مسئلہ پر بحث نہ کیجیے بلکہ یہ دیکھیے کہ اس کمپنی نے کس قدر اچھوتے اور کیف آور خیال کو نظم کیا ہے مگر افسوس ہے کہ صرف یہی مطلع شائع ہوا ہے اُمید ہے کہ پوری غزل لپٹن کمپنی لمیٹڈ کی کلیات میں ملے گی اگر کسی صاحب

کو لیپٹن کمپنی کی کلیات کے ملنے کا پتہ اور قیمت معلوم ہو تو بواپسی مطلع فرمائیں۔

روزنامہ ہند لکھنؤ۔ روزنامہ تیج دہلی کے ایڈیٹر مسٹر رام لال ورما نے تیج سے علیحدہ ہو کر لکھنؤ میں "یونائیٹڈ جرنلس لمیٹڈ" کے تحت "ہند" کے نام سے ایک روزانہ اخبار جاری کیا اور ابن سلونوی کے ذریعہ اودھ اخبار سے زیادہ تنخواہ پر بلا کر شوکت تھانوی کو اخبار کا نائب ایڈیٹر مقرر کیا مگر ۳ ماہ کے بعد ۲ نومبر ۳۳ء کو یہ اخبار ساجھے داروں میں پھوٹ پڑ جانے کی وجہ سے بند ہو گیا۔ ہند اخبار میں بھی شوکت تھانوی نے "دو دو باتیں" کے مزاحیہ کالم کو جاری رکھا اس کا ایک نمونہ دیکھیے

دو دو باتیں (روزنامہ ہند لکھنؤ)

"کلکتہ سے ایک ہفتہ وار پھکڑ اخبار "چورپنچ" کے نام سے جاری ہے اور خدا جانے کیوں جاری ہے معلوم نہیں وہ کون لوگ ہیں جو اس اخبار کے ناظرین کہلانے کی تذلیل برداشت کرتے ہیں اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کن بدمذاقوں کو اس اخبار کا مذاق پسند ہے کہنے کو تو یہ ایک مزاحیہ اخبار ہے لیکن اس کا مزاح دراصل مزاح کی توہین ہے یکّہ والوں والا گندہ مذاق اور منہ چڑانے والی ظرافت اس نام نہاد ظریف اخبار کی خصوصیات ہیں اور اخباری دنیا میں اس کو وہی درجہ حاصل ہے جو ہندوستان میں اچھوت اقوام کو حاصل ہے حال ہی میں ہمارے مقامی معاصر سرپنچ نے اس اخبار کا چوراہے پر بھانڈا پھوڑا ہے اور جس بری طرح اس کا شیرازہ بکھرا ہے وہ واقعی ایک عبرتناک سبق ہے۔

قصہ اصل میں یہ ہے کہ ہندوستان کے مایۂ ناز ظریف شاعر اور سرپنچ کے نورتن سید مقبول حسین صاحب ظریف لکھنوی نے ایک بلند پایہ غزل اب سے بہت پہلے کسی مشاعرے کے لیے فرمائی تھی جو مشاعرے میں پڑھنے کے بعد لکھنؤ کے بچہ بچہ کی زبان پر آ گئی اور ہندوستان کے بیشتر اخبارات نے اس غزل کو نقل کیا۔ لیکن اب وہی غزل اخبار چورپنچ میں مدیر چورپنچ جناب عنایت دہلوی کے نام نامی اسم گرامی کے ساتھ چھپی نظر آ رہی ہے۔ اور بقول معاصر سرپنچ کے ہم خود حیران ہیں کہ اس غزل کے جملہ حقوق ملکیت کس طرح یکایک ظریف صاحب سے عنایت صاحب کی طرف منتقل ہو گئے۔ ہم نے نہ تو آج تک ایسا عظیم الشان توارد دیکھا ہے کہ پوری کی پوری غزل لڑ جائے نہ ہم نے ایسا بے نظیر سرقہ دیکھا ہے کہ کسی زندہ مشہور شاعر کا کلام چرا کر شائع کر دیا جائے اور نہ یہ دیدہ دلیری ہماری نظروں سے گزری ہے کہ چوری کی غزل جلی حروف کے ساتھ اپنے ہی اخبار کے سرورق پر اس طرح چھاپی جائے کہ گویا آپ ہی کی تو ہے۔ ع

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

ظریف صاحب کے متذکرہ بالا غزل کے کچھ شعر ہم کو بھی یاد ہیں جو حال ہی میں چوری کی گئی اور جس کا چور معاصر "سرپنچ" نے لکھنؤ سے بیٹھے ہی بیٹھے کلکتہ میں گرفتار کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے وہ اشعار:—

وحشت میں ہر اک نقشہ الٹا نظر آتا ہے   مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے

اعجازِ تخیل ہے بے وصل کی عاشق کو   آغوش میں جاناں کے بچا نظر آتا ہے
سب دیکھ کے کہتے ہیں داڑھی کو تری واعظ
وہ قصرِ تقدس کا چھجا نظر آتا ہے

یہ غزل اس قدر مشہور ہے کہ کچھ دنوں تک لکھنؤ والوں کا قومی ترانہ رہ چکی ہے اور اب بھی لوگ اسی کو گنگناتے پھرتے ہیں اس کے علاوہ اخبارات نے اس کو اس قدر شہرت دی ہے کہ دیکھ لیجئے "مجنابِ جگ" تک بلکہ ان کی بیاض بلکہ ان کے اخبار تک اس کی رسائی ہو گئی یہ اور بات ہے کہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے اس کے مالک کے نام میں تبدیلی پیدا ہو گئی، بہرحال غزل کی مقبولیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو حال ہے اس اخبار کے ایڈیٹر صاحب کا پھر بھلا اخبار کی کیا حالت ہو سکتی ہے۔ ع

قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا

معاصر سرپنچ نے یہ خوب کہا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایڈیٹر صاحب موصوف کسی صاحب سے اپنے لیے نظمیں اور غزلیں لکھواتے ہیں اور ان ستم ظریف صاحب ہی کی یہ شرارت ہے کہ جناب ظریف کی مطبوعہ غزل اٹھا کر عنایت صاحب کو دے دی۔ ان بے چارے کو کیا خبر تھی کہ یہ غزل کیسی ہے وہ تو یہی چاہتے تھے کہ میں نے غزل خریدی ہے لہذا یہ نئی ہوگی لیکن اتفاق سے وہ نکل گئی سیکنڈ ہینڈ اور سیکنڈ ہینڈ بھی نہیں بلکہ چوری کا مال اور اب جناب والا پکڑے گئے ہیں اور باز پرس ہو رہی ہے تو اب آپ کو ہوش آیا ہوگا کہ کرایہ کا ٹٹو کس قدر ناقابلِ اعتبار ہوتا ہے۔ ع

دیکھو انھیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

ماہنامہ شباب لکھنؤ۔ روزنامہ "ہند" بند ہونے کے بعد شوکت تھانوی پھر "سرپنچ" میں آگئے اور اسی دوران "سرپنچ جرنلس" نے "شباب" کے نام سے ایک ادبی ماہنامے کا اجرا کیا اور اس کا ایڈیٹر شوکت تھانوی کو مقرر کیا گیا۔ "شباب" میں اردو کے ممتاز لکھنے والوں کی تخلیقات چھپتی تھیں شوکت تھانوی نے اس کے معرکے کے نمبر نکال کر دنیائے ادب میں دھوم مچا دی مگر ایک سال چل کر یہ رسالہ بند ہو گیا۔

روزنامہ حق لکھنؤ جب ۱۹۳۵ء میں ہفتہ وار سے روزانہ اخبار ہوا تو شوکت تھانوی کو اس میں اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ دفتری امور، ترجمہ اور شذرات کے علاوہ "حق و باطل" کے عنوان سے حق کا مزاحیہ کالم اور "شاعرِ حق" کے نام سے روزانہ ایک مزاحیہ قطعہ یا رباعی بھی لکھتے تھے — دونوں کے نمونے دیکھئے۔

رباعی — شاعرِ حق

ہر راہ گذر پہ ہر قدم پر شاعر
آقا ہی نہیں گھر کا ہے ذکرِ شاعر
اللہ رے شعر و شاعری کی بہتات
بیوی شاعر ہیں اور شوہر شاعر

حق و باطل (روزنامہ حق لکھنؤ)

"لیجئے اور سُنیئے کہ یورپ کے ایک ڈاکٹر صاحب نے یہ جدید تحقیقات فرمائی ہے کہ اکثر بیماریوں کا علاج گانے کے ذریعہ ہو سکتا ہے اور بہت سے ایسے امراض ہیں جن میں بجائے دوائیں استعمال کرنے کے یہ طریقہ بے حد مفید ثابت ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ مستقبل قریب میں لوگ ادویہ کا استعمال بالکل ترک کر دیں گے اور موسیقی کے ذریعہ بیماریوں کا تدارک کریں گے اسی طریقہ کو تمام اطبأ اختیار کر لیں گے۔ موسیقی سے نہ صرف ذہنی اور دماغی بلکہ جسمانی علاج بھی ہوگا۔

اگر ڈاکٹر صاحب کی یہ تحقیق صحیح ہے تو سب سے پہلے ان کو اپنی اور اپنے ہم پیشہ طبقہ کی خیر منانا چاہیئے اور حصولِ معاش کا کوئی اور ذریعہ تلاش کر لینا چاہیئے اس لیے کہ موسیقی سے بیماریوں کا علاج عام رواج پانے کے بعد یہ تمام دُنیا کے ڈاکٹر اور حکیم غریب ٹٹروں ٹوں رہ جائیں گے۔ البتہ ان کی جگہ پر مس زہرہ بائی، مس اللہ رکھی، مس ہین جان، مس نگین جان، مس بے نظیر، مس کجن بائی اور ماسٹر نثار وغیرہ کی پریکٹس خوب چلے گی اور ہر شہر کے چکلوں میں ہر کمرے پر مطب کھل جائیں گے۔ یہی کم خرچ بالا نشین گانے والیاں سول سرجن بھی ہوا کریں گی اور اسسٹنٹ سرجن بھی اور یہی تمام آلاتِ موسیقی آلاتِ طب کا کام دیں گے۔

جب یہ علاج کا طریقہ جاری ہوگا تو غالباً یہ ہوا کرے گا کہ غریب آدمی بیمار ہو کر ڈولیوں میں اور پا پیادہ گانے والوں اور گانے والیوں کے مکانات اور کمروں پر جایا کریں گے اور وہ مریضوں کو دیکھ کر نسخہ تجویز کریں گی کہ اس کو ٹھمری سے فائدہ ہو سکتا ہے یا بھیرویں سے، غزل اس کے لیے مفید ہوگی یا دادرا، اور جیسی بھی مرض کی نوعیت ہوگی ویسا ہی علاج کر دیا جائے گا۔ اسی طرح امرأ اُن مغنّی طبیبوں کو فیس دے کر اپنے گھر پر بلایا کریں گے اور وہ بجائے تھرمامیٹر اور دوسرے آلات کے طبلہ اور سارنگی وغیرہ لے کر موٹر پر نہایت ٹھاٹھ سے اُن کے یہاں جایا کریں گے۔ اُن کی نبض دیکھیں گے کہ کون سا راگ چھیڑ رہی ہے پھر اُسی کے مطابق کوئی چیز اُن کو سُنا کر اپنی فیس لے لیں گے اور کسی دوسرے مریض کے یہاں چلے جائیں گے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ جب یہ طریقۂ علاج رائج ہو جائے گا تو لیڈی ڈاکٹروں کی کثرت ہو جائے گی اور مرد زیادہ تر لیڈی ڈاکٹروں ہی کا علاج کریں گے۔

اگر اس وقت بھی نسخہ لکھنے کا طریقہ رائج رہا تو یہ ہوا کرے گا کہ ڈاکٹرنی صاحبہ مع اپنے سازندوں کے جو اس وقت کمپونڈر کہلائیں گے مریض کے یہاں جائیں گے اور اُس کا معائنہ کرنے کے بعد پہلے تو یہ طے کریں گی کہ کون سا مرض ہے یعنی دق ہے یا ہیضہ، اور اس کے بعد پھر اس طرح نسخہ لکھیں گی:

ھو

نام مریض   چودھری عطا اللہ شاہ ...
مرض   ضعف معدہ
معالج   مس زہرا بائی گھورکھپوری

"مار گیو رے دل پہ برچھی بجر کی" گوش کنند و غضب آں "جیا را ہلے ڈولے ہو" سماعت کنند

یہ تو ہوا یونانی طریقہ علاج، اسی طرح انگریزی میں بھی انگریزی نغمات بہ طور دوا تجویز کیے جا سکتے

اب دیکھیے کون سے ولایتی ڈاکٹر صاحب علاج بالرقص ایجاد فرماتے ہیں۔

ماہنامہ کائنات لکھنؤ۔ روزنامہ "حق" سے شوکت تھانوی تقریباً ۳ سال وابستہ رہے اور ۱۹۳۳ء کے اوائل میں بعض نزاکتوں کے تحت "حق اخبار" سے علیحدہ ہوگئے۔ حق اخبار کی ادارت کے دوران اخبار کے پروپرائٹر مولانا عبدالرؤف کے ایما پر ۱۹۳۳ء میں "ماہ نامہ کائنات" نکالا گیا اور شوکت تھانوی کو اس کا ایڈیٹر بنایا گیا۔ ابھی ۵، ۶ شمارے ہی نکلے تھے کہ رسالہ بند کر دیا گیا۔ کائنات میں ملک کے ممتاز ادیبوں کی نگارشات شائع ہوئیں۔ رسالے ہی کی جانب سے بڑی دھوم دھام سے ایک مشاعرہ بھی (مشاعرۂ کائنات) کیا گیا جس کی صدارت مولانا عبدالماجد دریا بادی نے کی اور مشاعرے کی کارروائی کائنات میں شائع ہوئی تھی اور اس مشاعرے کی یہ طرح تھی:- ؎

تم ہو جس کے ہے اسی کی کائنات

روزنامہ طوفان لکھنؤ۔ روزنامہ حق سے جن حالات میں شوکت تھانوی کو علیحدگی اختیار کرنی پڑی تھی اس سے ان کے سرپرستوں، پرستاروں اور دوستوں کے حلقہ میں زبردست کھلبلی مچ گئی۔ سر ظفر اللہ خاں، نواب چھتاری، نواب سر محمد مزمل اللہ خاں، خان بہادر سید عین الدین، خان بہادر سید احمد حسین، مشیر احمد علوی، شیخ احمد علی اور رفیع احمد خاں وغیرہ کی مدد سے یکم جون ۱۹۳۶ء کو شوکت تھانوی نے اپنا ذاتی اخبار "طوفان" کے نام سے جاری کیا۔

"طوفان" "کانگریس کے مقابلے میں" "زمیندار کانفرنس" اور تعلقداروں کی "نیشنل ایگریکلچرسٹ پارٹی" کا ترجمان تھا۔ شوکت تھانوی تحریر کے بادشاہ تھے مگر منتظم نہ تھے جب مولانا محمد علی جیسے عدیم المثال انسان کا اخبار محض تحریر کی خوبی سے نہ چل سکا تو بھلا طوفان کیا چلتا۔ آزادیٔ جمہور کے چند جھونکے اس پارٹی اور اخبار دونوں کو اڑا لے گئے، اخبار ایک سال چل کر بند ہوگیا اور طوفان گزر گیا۔ طوفان کی پالیسی کا اندازہ لگانے کے لیے اس کی طوفانی ظرافت کا مختصر نمونہ دیکھیے:-

روزنامہ طوفان کی ظرافت

"سنا ہے کہ کانگریس کا اجلاس منعقد کرنے کے لیے کئی صوبے آمادہ ہیں۔ کیا کانگریس ابھی بقیدِ حیات ہے؟"

"انڈیا ہاؤس کی نمائش میں شاہ ٹیپو سلطان کی پگڑی اور بیگم اودھ کا دوشالہ رکھا گیا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد گاندھی جی کی لنگوٹی بھی ان تاریخی چیزوں میں شامل ہو جائے گی بشرطیکہ مجنوں کے گریبان کی

طرح ضائع نہ کر دی گئی۔

روزنامہ جنگ کراچی ۔ شوکت تھانوی تقسیم سے کافی پہلے فلم سے وابستہ ہو کر لاہور چلے گئے تھے۔ اس کے بعد ریڈیو میں ہوئے اور ۱۹۵۸ء میں روزنامہ جنگ کراچی کے کالم نویس ہو کر کراچی چلے گئے جہاں انھوں نے "وغیرہ وغیرہ" کے عنوان سے اس اخبار کا روزانہ مزاحیہ کالم لکھنا شروع کیا۔ اس کالم نے بہت جلد ہر خاص و عام میں بے پناہ مقبولیت حاصل کر لی۔ ان کے اس صحافتی مزاج کا ایک نمونہ دیکھیے۔

وغیرہ وغیرہ (روزنامہ جنگ کراچی)

" آج میرے ایک مستقل دوست عارضی پرمٹ پر ہندوستان سے تشریف لائے تھے اور میں بغلیں جھانکتا پھر رہا تھا اور کوئی چیز جھانکنے کے لیے تھی ہی نہیں کیا کرتا۔ نہ مکان ایسا کہ ان کو ٹھہرا کر فخر سے کھنکھار سکتا نہ ساز و سامان ہی ایسا کہ وہ حیران ہوتے، یہی فکر تھی کہ وہ بھی کیا کہیں گے کہ اتنے دنوں تک کیا محض بھاڑ جھونکتے رہے اور اگر اسی طرح رہنا تھا تو ہنگامہ سے بھی ۲ برس پہلے ہجرت کی آخر کیا ضرورت تھی۔

اسی ڈربے ہر جس کا عالم یہ ہے کہ یا تو ہم خود رہیں یا سامان کو رکھیں اور اگر دونوں کے لیے گنجائش نکالنا ہے تو اپنے میں اپنے سامان میں فرق محسوس نہ کریں اور اس حقیقت کو کبھی ذہن سے نہ نکالیں کہ بابا یہ دنیا سرائے فانی ہے اس میں سو برس کے سامان ہرگز نہ کرو کہ کل کی تمھیں خبر نہیں ہم چنانچہ ہم نے یہی کیا کہ خدا کے مسبب الاسباب ہونے پر پورا ایمان رکھتے ہوئے اسباب جمع کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی اور اگر اسباب جمع بھی کرے تو نتیجہ ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا تھا کہ یا تو اسباب باہر رہتا اور ہم گھر میں یا اسباب گھر میں اور ہم باہر مگر ہم نے یہ صورت ہی پیدا نہ ہونے دی اور ہم اور ہمارا اسباب نہایت مرنجاں مرنج طریقہ پر اسی گھر میں مدت سے رہتے چلے آ رہے ہیں اور چونکہ ہم لامکاں کے بندے ہیں لہذا اس سے مکان کی شکایت بھی نہیں کر سکتے۔

صاحب ہمارے مکان میں دو قلمدان کی نسل کے کمرے ہیں ایک کمرے میں ایک طرف باورچی خانہ ہے دوسری طرف ایندھن رکھنے کی جگہ اور دیوار میں بڑی بڑی کیلیں گاڑ کر کچھ تختے بیوی نے نہایت سلیقے سے لگا دیئے ہیں۔ جن پر برتن رکھے جاتے ہیں ....

دوسرے کمرے میں دو پلنگ بچھے ہوئے ہیں اور ان دو پلنگوں کے بعد جو جگہ بچی ہے اس میں تلے اوپر کپڑوں کے بکس رکھے ہوئے ہیں دو الماریاں بھی اس کمرے میں ہیں .... جن میں سے ایک الماری کے تختے پر ..... کہتے ہیں کہ کبھی ایک کنگھا بھی پایا جاتا تھا مگر امتداد زمانہ کے ماتحت اب اس کے چند دانتے باقی رہ گئے ہیں۔

الماری کے تیسرے تختے کے متعلق مورخ حیران ہے کہ اس کو کتب خانہ کہے یا نعمت خانہ، اس پر کبھی کتابیں بھی دیکھی گئی ہیں اور بسا اوقات ان ہی میں .... میلاد شریف کے آئے ہوئے بتاشے،

اس کی پہچان کا ایک عام طریقہ یہ ہے کہ اگر الماری کے اس خانے کی طرف دیمک دوڑ رہی ہو تو سمجھ لیجیے کہ اس پر کتابیں رکھی ہوئی ہیں اور اگر چیونٹیوں کی قطار نظر آئے تو یقیناً بتاشے ہی ہوں گے اور جب دونوں نہ ہوں تو علم سے بیزاری کا ماتم یا قحط کا رونا جو مناسب سمجھئے اختیار کر لیجیے۔

ان دو الماریوں کے علاوہ اس کمرے میں ایک منٹل پیس بھی ہے جس پر ہم لوگ رات کو لالٹین اور دن کو پاندان رکھا کرتے ہیں اس کے علاوہ صرف یہی جگہ ایسی ہے جس پر ہم لوگ آزادی سے جو چیز چاہیں رکھ سکتے ہیں چنانچہ اس آزادی کا نتیجہ یہ ہے کہ اس منٹل پیس پر تخفے کو اپنا کھویا ہوا جوتا بھی مل جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دنیا حیران ہے اور ہم نے اپنے گھر کا یہ بھید آج تک کسی کو نہیں بتایا ہے کہ اس مختصر سے کمرے میں اور ان دو چارپائیوں پر ہم دو میاں بیوی اور تین بچے کیونکر رات بسر کرتے ہیں۔ بہرحال اب تو بتانا ہی ہے لہٰذا عرض یہ ہے کہ ہوتا یہ ہے کہ ایک چارپائی جیسے ہماری، ایک بیگم صاحبہ کی چھوٹا بچہ ماں کے پاس، منجھلا باپ کے پاس اور بڑا ماں باپ دونوں کے زیر سایہ ان دونوں پلنگوں کے نیچے مگر جب سے گھر میں چوہے بڑھ گئے ہیں اس بچے نے ٹرنک جوڑ کر اپنی خواب گاہ بنالی ہے۔ مختصر یہ کہ زندگی نہایت فراغت میں بسر ہو رہی ہے۔

مگر سوال تو یہ ہے کہ وہ حضرت جو ہمارے محبت کے ہندوستان سے تشریف لا رہے ہیں ان کا کیا بنے گا۔ ایک چارپائی کا خیر انتظام کر لیا ہے۔ مگر اب کسی ماہر اقلیدس کی جستجو ہے جو کوئی ایسا زاویہ سمجھا سکے کہ یہ تیسری چارپائی بھی اس کمرے میں بچھ سکے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عجیب عجیب ترکیبیں ذہن میں آ رہی ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر منٹل پیس خالی کر کے صاف کر دیا جائے تو کروٹ لے کر ایک آدمی اس پر بھی سو سکتا ہے۔ بہرحال جگہ دل میں ہونا چاہیے۔ جو بفضلہ موجود ہے۔ بشرطیکہ آپ دل میں چارپائی بچھانے کی کوشش نہ کریں۔ بہرحال آنے دیجیے ان کو دیکھا جائے گا۔

روزنامہ جنگ راولپنڈی ۔ دارالحکومت کی تبدیلی کے بعد راولپنڈی سے بھی جنگ کا ایڈیشن نکلنا شروع ہوا۔ شوکت تھانوی کو اس کا ایڈیٹر بنا کر بھیجا گیا۔ انھوں نے اس میں ”پہاڑ تلے“ کے عنوان سے جنگ کا مزاحیہ کالم لکھنا شروع کیا۔ اس کا ایک نمونہ دیکھیے:۔

پہاڑ تلے (روزنامہ جنگ راولپنڈی)

ہمارے اسکول کے بچوں سے خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں اگر آپ یہ سوال کریں کہ ”تم کو ہمایوں میں سب سے زیادہ کیا بات پسند آئی“ تو وہ فوراً جواب دیں گے کہ ”ہم کو تو ہمایوں میں سب سے زیادہ پسند یہ گانا آتا ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔

”مرے راجہ کا جنگل میں راج ہے“

ان سے اگر پوچھیں کہ "اکبر اعظم کے عہد کا کوئی ناقابلِ فراموش کارنامہ بیان کرو" تو وہ فوراً کہیں گے کہ "ہم کو تو صرف ایک ہی کارنامہ یاد ہے کہ اکبر کا دربار آراستہ ہے۔ شاہزادہ سلیم ایک زرنگار کرسی پر بیٹھا ہے خود اکبر تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہیں تمام امرائے دربار نہایت ادب سے بیٹھے ہیں کہ مدھو بالا کا جو انار کلی بنی ہوئی ہے ناچ شروع ہوتا ہے اور وہ شہزادہ سلیم کی طرف اشارہ کر کے گاتی ہے۔

جب پیار کیا تو ڈرنا کیا

ان سے اگر آپ دریافت کریں گے کہ "مرزا غالب کون تھے" تو وہ فوراً جواب دیں گے کہ "مرزا غالب وہ تھے جن سے ملنے کو ہتو بیگم نے اپنی بیٹی نور جہاں کو سختی سے منع کیا تھا۔

ہمارے یہ طالب علم اس قسم کے تمام تاریخی اور ادبی حوالے اپنے نصاب سے نہیں بلکہ فلموں سے دیتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کو جو عبور فلموں پر حاصل ہے وہ اپنی درسی کتابوں پر ہرگز نہیں حاصل ہے ان کو اپنے مستند اساتذہ کا کلام تو خیر یاد نہیں ہے البتہ وہ ہر اس موقع پر جہاں پہلے اساتذہ کے کلام کے اشعار پڑھے یا لکھے جاتے تھے اب فلمی گانوں کے بول استعمال کرتے ہیں مثلاً ایک صاحبزادے نے اپنے والدِ محترم کو خط لکھا کہ آپ نے مجھ سے خط نہ لکھنے کی ہدایت کی ہے اور میری طرف سے یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ میں آپ کو بھول گیا ہوں، کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ میں آپ کو کس قدر یاد کرتا ہوں میرا تو یہ حال ہے کہ

آہیں نہ بھریں شکوے نہ کئے کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا
ہم دل کو پکڑ کر بیٹھ گئے جب تیرا کسی نے نام لیا

میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ جلدی سے چھٹی ہو اور میں آپ کی خدمت میں یہ کہتا ہوا حاضر ہو جاؤں کہ:

تم جگ جگ جیو مہاراج ہم تیری نگریا آئے

اسکولوں کے ان بچوں کا کیا قصور ہے جب اُن کے گھر کا ماحول ہی یہ ہو کر رہ گیا ہے کہ والدہ محترمہ کو دیکھتے ہیں کہ درزی کپڑے سی کر لایا اور وہ اس کو ڈانٹ رہی ہیں کہ "تم نے غارت کر کے رکھ دی یہ قمیص، میں نے تم سے کہہ بھی دیا تھا کہ یہ بالکل اس وضع کی ہونا چاہیے جیسی لیلیٰ نے اس وقت پہن رکھی تھی جب وہ گا رہی ہے کہ: تو بین بجا میں ناچوں گی

یہ تو تم نے ڈھیلی ڈھالی بالکل ایسی ہی بنا دی جیسی فلم گلنار میں ہتو بیگم نے پہن رکھی ہے تم سے یہ کس نے کہا تھا کہ میرے لیے رخشی کی پشواز سی لاؤ، میں نے تم کو ٹکٹ کے دام بھی دیئے تھے کہ پہلے جا کر فلم سپیرن دیکھو۔ اس کے بعد لیلیٰ کی نمونے کی قمیص سی کر لاؤ تم نے مجھے بھی کوئی سٹن تن سمجھ رکھا ہے کہ میرے لیے یہ ڈھیلی ڈھالی بدقطع قمیص سی لائے ہو"

دوسری طرف سے ہمشیرہ محترمہ دوڑتی ہوئی آئیں کہ "دیکھئے ممی مجھے سمنی نے حوض میں دھکیل دیا ہے میرے سارے کپڑے بھیگ گئے معلوم ہوتا ہے جیسے :۔

موہے پنگھٹ پہ نند لعل چھیڑ گیو رے

اب آپ ہی بتائیے کہ اس گھریلو ماحول میں پروان چڑھنے والے اور اپنی ہر شام سینما میں گزارنے والے نوجوان اپنی معلومات کا سارا سرمایہ فلمیات کو نہ سمجھیں گے۔

گھر تو گھر ان کے لیے تعلیمی اداروں میں بھی یہ بندوبست ہے کہ آئے دن ان کے اناؤنسر اس قسم کے اعلان کرتے نظر آتے ہیں کہ "اب درجہ نہم کی طالبہ مس کوثر بخشش آپ کے سامنے ایک فلمی نغمہ پیش کرینگی۔

تو لاکھ چلے گوری ٹھُم ٹھُم کے

اور اس کے بعد مس رقیہ خانم "جھنک جھنک پائل باجے" کا ایک رقص سندھیا کے انداز سے پیش کریں گی"۔

اب آپ ہی کہیے کہ ہم اس موقع پر سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ ؎

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملاّ
کارِ طفلاں تمام خواہد شد

شوکت تھانوی "پہاڑ تلے" کے کالم میں آخر تک طنز کی چٹکیاں لیتے اور ہنسی کے جادو جگاتے رہے۔ ان کی اس ہنسی میں ہمیشہ اصلاح و تبلیغ کا پہلو نمایاں رہا۔ "پہاڑ تلے" کا آخری کالم ان کے انتقال کے تیسرے دن ۷ رمئی ۱۹۶۳ء کو جنگ راولپنڈی کی اشاعت میں شامل ہوا تھا۔ جس میں انھوں نے اپنی مختصر غیر حاضری کی معذرت کرتے ہوئے اپنی علالت کا تذکرہ کیا تھا۔ اور قارئین جنگ کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ "بہت جلد وہ اچھے ہو جائیں گے" مگر ۴ رمئی ۶۳ء کو صبح ۸½ بجے لاہور میں اپنے مکان واقع گڑھی شاہو میں اردو ظرافت کے نت نئے جادو جگانے والا سحرِ اعجاز مزاح نگار ان گنت سوگواروں کو روتا پیٹتا چھوڑ کر ہنستا ہوا ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ اردو صحافت و ظرافت کا یہ آفتاب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا الیہ راجعون۔

تصانیفِ شوکتؔ تھانوی

● اُردو کے ایسے منفرد مزاح نگار ہیں۔ جن کا ایک ایک فقرہ اپنی جگہ دل نشین
اور خوبصورت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شوکت تھانوی سب کا محبوب مصنف ہے

بھابی (ناول) ”جتنے میرا بھائی گلی گلی بھوجائی“۔ یہ کہاوت تو نہ جانے کب سے سننے میں آ رہی ہے۔ مگر ناول بھابی کے ہیرو نے اس واقعہ کو سچ کر دکھایا ہے۔ ”ان سے ملئے یہ آپ کی بھابی ہیں“۔ ایسا باغ و بہار کردار اور شوکت تھانوی کا اندازِ بیان۔

غزالہ اس ناول میں مزاح تو ہے ہی اس لیے کہ اس کا مصنف شوکت ہے۔ مگر مزاح کے علاوہ اور بھی کچھ ہے کچھ کشمکش، کچھ جدوجہد، کچھ سراغرسانی اور کچھ مقاماتِ حیرت و استعجاب۔

نیلوفر نیلوفر کا انداز تو غزالہ والا ہی ہے۔ مگر یہ اپنی دلچسپی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ وہی عشق و محبت کی حکایت ہے وہی سراغرسانی کے تانے بانے ہیں۔ وہی دلچسپ چھیڑ چھاڑ ہے جو دل میں اُترتی جاتی ہے

خدانخواستہ (ناول) ذرا تصور تو کیجئے، اگر آپ وہ ہو جائیں جو آپ کی بیگم صاحبہ ہیں اور بیگم صاحبہ وہ ہو جائیں جو آپ ہیں، تو کیا ہو؟ اس کا جواب شوکت تھانوی سے سنئے۔

مولانا (ناول) یہ واحد لکھنے والے ہیں۔ جن کے قلم نے کبھی بھی اپنے معیار سے نیچے اُترنا گوارا نہیں کیا۔ اس ناول میں شوکت تھانوی نے ہم اور آپ ایسے ایک صاحب کو خواہ مخواہ مولانا بنا کر جو اس کی گت بنوائی ہے وہ خدا کسی کی نہ بنائے۔

کُتیا (ناول) کُتیا پالتو ہو یا جنگلی، بھونکتی ضرور ہے۔ اور اگر کاٹ لے تو دماغ پر خاص اثر پیدا کرتی ہے۔ اس کُتیا نے ہمارے دماغ پر یہ اثر کیا کہ ہم مسلسل ہنس رہے ہیں۔ اس لیے کہ نہ یہ پالتو کُتیا ہے نہ جنگلی۔ بلکہ یہ دراصل شوکت تھانوی کے ایک مزاحیہ ناول کا نام ہے۔

سانچ کو آنچ یہ ناول اُن مہاجرین پر ہے جو ہندوستان میں روٹی ٹک کو عاجز تھے اور پاکستان پہنچ کر اپنے آپ کو نواب کہنے اور کہلوانے لگے۔ یہ ناول ایسی ہی دلفریب حکایتوں پر اس انداز میں لکھا گیا ہے کہ پڑھ کر مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے ہیں۔

سسرال اس ناول کا کچھ حصہ ماہنامہ نقوش لاہور میں چھپ چکا ہے۔ جسے سب نے اتنا پسند کیا تھا کہ ہم اسے جلد سے جلد مکمل طور پر کتابی صورت میں شائع کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ ناول اتنا دلچسپ اور لطیف ہے کہ اسے پڑھ کر ذہن جھوم جھوم اُٹھتا ہے۔

کارٹون (ناول) شوکت تھانوی کارٹونسٹ ہیں، اس لیے کہ ان کے ایک لاجواب مزاحیہ ناول کا نام کارٹون ہے۔ اس ناول میں شوکت کا قلم کہیں بھی آورد کا شکار نہیں ہوا ہے، وہی رواں اور سبک، وہی بے ساختہ اور بے تکلف مزاح ہے۔

حکومتِ وقت نے بھی شوکت تھانوی کو ان کی ادبی خدمات
——— کے صلے میں تمغۂ امتیاز سے نوازا ———

بقراط (ناول) یہ یونانی حکیم بقراط کا تذکرہ یا سوانح نہیں بلکہ شوکت تھانوی نے اپنے اس مزاحیہ ناول میں ایک ایسے کردار کو نمایاں کیا ہے جو ہر فن مولا کی حیثیت رکھتا ہے۔

جوڑ توڑ (ناول) جوڑنا ایک مستقل کام ہے توڑنا ایک دوسرا مستقل کام ہے۔ پھر توڑ کر جوڑنا اور جوڑ کر پھر توڑنا۔ یا اللہ یہ سلسلہ کبھی ختم بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے شوکت تھانوی کا مزاحیہ ناول "جوڑ توڑ" ملاحظہ فرمائیے۔

غالب کے ڈرامے آپ حیران ہوں گے کہ غالب کا ڈرامے سے کیا تعلق، غالب کی نظم اور غالب کی نثر کا علم کس کو نہیں مگر شوکت تھانوی نے غالب کے ڈرامے بھی پیش کر دیے ہیں

بارِ خاطر شوکت تھانوی کی وہ معرکۃ آلارا تصنیف، جس کا عرصے سے انتظار تھا۔ خطوط کا یہ مجموعہ ابوالکلام آزاد کے خطوط غبارِ خاطر کی دل نشیں پیروڈی ہے۔ جس میں ادبی، سیاسی علمی اور دیگر معروف شخصیتوں کے نام خطوط درج ہیں۔

نمک مرچ شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ۔ ہر مضمون جانِ ظرافت ہے۔ اتنے چٹخارے دار مضامین اس سے پہلے آپ نے نہ پڑھے ہوں گے۔

سودیشی ریل شوکت تھانوی نے اپنی تمام مزاحیہ کائنات کا نچوڑ اس مجموعہ میں یکجا کر دیا ہے، پرانے مضامین سے اپنے شاہکار خود منتخب کئے ہیں اور نئے مضامین بھی اپنے ہی انتخاب سے شریک کئے ہیں۔ مصنف کا خود اپنا انتخاب کیا ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ کتاب ہے۔

مابدولت شوکت کی زد پر شوکت — شوکت تھانوی نے اپنے کو بھی نہیں بخشا، اپنی خود نوشت سوانح حیات میں اپنا کچا چٹھا پیش کر دیا ہے۔ "مابدولت" میں ایک نہایت نازک موقع پر خود اپنے متعلق لکھتے ہیں — "ادھر سے پسندیدہ نظریں۔ اُدھر سے ان کی پذیرائی۔ آخر شیطان نے دونوں کو بھینچا کہ ہم دونوں ایک ہو گئے۔"

قاضی جی (تین حصے) مشہور ادیب سید امتیاز علی تاج کی رائے یہ ہے کہ: 'قاضی جی' پاکستان کا پہلا مزاحیہ کردار ہے۔ جسے شوکت تھانوی نے پیش کیا ہے۔ ریڈیو سننے والے قاضی جی سے بخوبی واقف ہوں گے۔ شوکت تھانوی نے قاضی جی کی تمثیلوں کا پہلا مجموعہ مرتب ہوا تو تقاضا شروع ہوا کہ دوسرا مجموعہ کہاں ہے۔ اب ہم نے دوسرا تیسرا مجموعہ بھی شائع کر دیا ہے تاکہ اس مقبولِ عام کردار کے کارنامے دستاویزی صورت میں محفوظ رہیں۔

وغیرہ وغیرہ سودیشی ریل کے مصنف شوکت تھانوی نے پھر اس صنفِ ادب کی طرف توجہ کی ہے۔ جو اب سے برسوں پہلے اس کی بے مثال اور غیر فانی شہرت کا سبب بنی۔ "وغیرہ وغیرہ" ان کے تازہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مزاح پاروں میں شوکت تھانوی کا فن نکھرا ہوا ہے اور انھوں نے جہاندیدگی اور گہرے مشاہدے کا مے کر ہنسی کی ایسی پھلجھڑیاں چھوڑی ہیں جن سے قہقہوں کی چنگاریاں رہتی دنیا تک برستی اور انسانی ذہن اجالتی رہیں گی۔

مضامینِ شوکت اگر کوئی شخص صرف شوکت تھانوی کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہے تو وہ بلاشبہ کچھ اور بنے نہ بنے زبان دان تو بن ہی جاتا ہے۔ آب کوثر میں دھلی ہوئی مصفا زبان، پلاٹ کی دلآویزی، شگفتہ و لطیف پیرایۂ بیان —— یہ ہیں وہ خصوصیات، جو شوکت تھانوی کے آرٹ کو زندۂ جاوید بنائے ہوئے ہیں مضامین شوکت میں جو مضامین شامل ہیں وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے ہیں۔

بے قاعدہ شوکت تھانوی کی بہ نئے انداز کی تصنیف، اُردو ادب میں بالکل انوکھی چیز ہے۔ اس قاعدے سے بچے بھی لطف اندوز ہوں گے اور بڑے بھی بچے اسے دلچسپ تصنیف سمجھ کر پڑھیں گے۔ اور بڑے اس سے زندگی کا شعور حاصل کریں گے۔ اس قاعدہ میں آپ کو الف سے آ تو نہیں پڑھایا گیا۔ بلکہ الف سے امتیاز علی تاج پڑھایا گیا ہے۔

شوکت تھانوی کی چند اور نئی کتابیں

ہنسی مُکھ —— افسانوں کا مجموعہ
چٹخارے —— افسانوں کا مجموعہ
قاضی جی (چہارم) —— ریڈیائی فیچر
زیر طبع

قیمتوں میں تخفیف

نام کتاب	سابقہ قیمت	موجودہ قیمت	نام کتاب	سابقہ قیمت	موجودہ قیمت	نام کتاب	سابقہ قیمت	موجودہ قیمت
عزالہ	۶/-	۴/-	مابدولت	۳/-	۲/-	کارٹون	۳/۵۰	۲/۵۰
نیلوفر	۶/-	۴/-	جوڑتوڑ	۴/-	۲/۷۵	بقراط	۲/۵۰	۲/-
بھابی	۴/۵۰	۳/-	وغیرہ وغیرہ	۳/-	۲/-	مضامین شوکت	۲/۵۰	۱/۵۰
مولانا	۳/۵۰	۲/۷۵	غالب کے ڈرامے	۲/۵۰	۱/۵۰	نمک مرچ	۲/-	۲/-
بار خاطر	۴/-	۲/۷۵	بے قاعدہ	۲/-	۱/۲۵	قاضی جی (اول)	۳/۵۰	۲/۵۰
خدانخواستہ	۳/-	۲/-	سودیشی ریل	۳/-	۲/-	قاضی جی (دوم)	۳/۵۰	۲/۵۰
کتیا	۳/۵۰	۲/۷۵	سلاخ کو آنچ	۳/۵۰	۲/۵۰	قاضی جی (سوم)	۳/۵۰	۲/۵۰
سسرال	۲/۲۵	۱/۵۰						

شوکت تھانوی کی کتابیں پڑھیں
اور فکروں سے آزاد ہو جائیں

ادارۂ فروغ اردو۔ ایبک روڈ (انارکلی) لاہور

افسانوی ادب کی ایک ایسی کتاب
جسے مدتوں بھلایا نہ جا سکے گا

نقوش کا آئندہ شمارہ ''آپ بیتی،، نمبر ہو گا۔ جسے نقوش کے نمبروں میں سب سے نمایاں حیثیت حاصل ہوگی۔